منازل العرفان

في تفسير القرآن الكريم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جلد دہم

سورۃ الطور تا سورۃ المرسلت

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ
نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ○ کوئٹہ

نام کتاب: منازل العرفان في تفسير القرآن الكريم

تألیف: شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہ

قیمت:

سن اشاعت: ۱۴۴۴ھ 2023ء

تعداد: 1100

ملنے کے پتے

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

جامعہ فرقانیہ، سریاب روڈ، کوئٹہ

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

اور ملک کے تمام بڑے کتب خانے

ضروری گزارش

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ سہواً جو غلطیاں ہوگئی ہوں ان کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم انسان، انسان ہے، اگر اس اہتمام کے باوجود کسی قسم کی بھی غلطی پر آپ مطلع ہو جائیں، تو برائے مہربانی ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ اور آپ ''تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' کے مصداق بن جائیں۔ شکریہ

واٹس ایپ نمبر: 03022999778-03128588383

ناشر

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

فہرست مضامین منازل العرفان جلد دہم

سورۂ طور۔ سورۂ نجم

سورۂ قمر۔ سورۂ رحمٰن

سورۂ واقعہ۔ سورۂ حدید

سورۂ مجادلہ۔ سورۂ حشر

سورۂ ممتحنہ۔ سورۂ صٰفّٰت

سورۂ جمعہ۔ المنٰفقون

سورۂ تغابن۔سورۂ طلاق

سورۂ تحریم۔سورۂ ملک

سورۂ قلم۔سورۂ حاقہ

سورۂ معارج۔سورۂ نوح

سورۂ جنّ۔سورۂ مزمل

سورۂ دہر۔سورۂ مدثر

سورۂ قیامہ۔سورۂ دہر

سورۂ مرسلات

سُورَةُ الطُّورِ

مکیۃٌ آیاتھا ۴۹ رکوعاتھا ۲

سورۂ طور مکی ہے، اس میں انچاس (۴۹) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الطور ہے، جو اس سورت کی پہلی آیت وَالطُّوْر سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۵۲ ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۷۶ ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ طور پہاڑ کا نام ہے، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام کرنے کا شرف حاصل ہوا، اس لئے بطور علامت کے اس سورت کا نام طور رکھا گیا۔ حدیث میں ہے کہ طور جنّت کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے۔ [قرطبي: جلد ۱۷، ص ۵۲]

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں دو رکوع، ۴۹ آیات، ۳۱۹ کلمات، اور تیرہ سو چونتیس (۱۳۳۴) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں توحید، رسالت، اثباتِ قیامت اور دوسرے احکام وضروری مسائل کا اختصاراً بیان ہوا، اس سورت میں انہی چیزوں کا قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔

مختصر موضوع:

اثباتِ توحید، اثباتِ قیامت، تسلی خاتم الانبیاء ﷺ، اثباتِ رسالت، صداقتِ قرآن مجید، وقوعِ عذاب، مجازاتِ اعمال، ایمان اور کفر کے انجام کا بیان ہے، مؤمنین کے لیے اسبابِ کامیابی، منکرین کے شبہات و جوابات وغیرہ کا بیان ہوگا۔

فضیلت سورت:

آنحضرت ﷺ مغرب کی نماز میں اس سورت کی تلاوت فرماتے تھے۔ [قرطبي]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَ كِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِىۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالۡبَيۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ﴿۵﴾ وَالۡبَحۡرِ
الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۙ﴿۹﴾ وَّتَسِيۡرُ الۡجِبَالُ
سَيۡرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ خَوۡضٍ يَّلۡعَبُوۡنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوۡمَ يُدَعُّوۡنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ
دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحۡرٌ هٰذَاۤ اَمۡ اَنۡتُمۡ لَا تُبۡصِرُوۡنَ ۚ﴿۱۵﴾ اِصۡلَوۡهَا
فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ ؕ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: قسم ہے طور کی ① اور کتاب مسطور کی ② جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہوئی ہے ③ اور بیت معمور کی ④ اور سقف مرفوع کی ⑤ اور بحر مسجور کی ⑥ بلاشبہ آپ کے ربّ کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے ⑦ اسے کوئی دفعہ کرنے والا نہیں ⑧ جس دن آسمان تھرتھرانے لگے گا ⑨ اور پہاڑ چل پڑیں گے ⑩ سو اس دن بڑی خرابی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ⑪ جو بیہودگی میں لگے رہتے ہیں ⑫ جس دن انہیں دوزخ کی آگ کی طرف دھکے دیئے جائیں گے ⑬ یہ دوزخ ہے، جس کو تم جھٹلاتے تھے ⑭ کیا یہ جادو ہے؟ یا تم نہیں دیکھتے؟ ⑮ اس میں داخل ہو جاؤ، صبر کرو یا نہ کرو، برابر ہے تمہارے حق میں، تمہیں انہی اعمال کی جزاء دی جائے گی جو تم کیا کرتے تھے ⑯

معارف و منازل

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم الشان مضمون، یعنی ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ کا تذکرہ فرمایا کہ

اے مخاطب! تیرے ربّ کا عذاب یقیناً واقع ہونے والا ہے، اور قیامت ضرور آئے گی، حساب وسزا وجزاء کا مرحلہ ضرور آنے والا ہے، جو ٹل نہیں سکتا۔ اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر پانچ عظیم الشان چیزوں، یعنی کوہِ طور، کتاب مسطور، بیت معمور، سقف مرفوع اور بحر مسجور کی قسم کھائی، کہ ان عظیم الشان مخلوقات کی عظمت کا استحضار کرتے ہوئے آئندہ آنے والی بات پر یقین کر لیجئے، بغیر کسی تردد اور تأمل کے اس پر ایمان لانا چاہئے، اور وہ قیامت کا وقوع اور جزا وسزاء کا مرحلہ ہے، جو بغیر کسی تردد وشک کے واقع ہونے والا ہے۔

سورت کا آغاز قسموں کے ساتھ ہے ﴿وَالطُّوْرِ﴾ قسم ہے طور کی۔ ﴿وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ﴾ اور قسم ہے لکھی ہوئی کتاب کی۔ اور تیسری قسم: ﴿وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ﴾ قسم ہے آباد گھر کی۔ بیت المعمور ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے، جس کا فرشتے طواف کرتے ہیں۔ روزانہ ستر ہزار فرشتے طواف کرتے ہیں، آئندہ قیامت تک انہیں دوبارہ موقع نہیں ملتا۔ یہ بالکل خانہ کعبہ کے اوپر ہے، اور فرشتوں کا یہی حج ہے۔ ﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ﴾ اور قسم ہے بلند چھت کی، بلند چھت سے مراد آسمان ہے۔

﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ﴾ اور قسم ہے گرم کئے ہوئے دریا کی۔ جب قیامت برپا ہوگی تو دریاؤں میں چاند اور سورج آپس میں ٹکرا کر گر جائیں گے، سمندروں میں آگ لگ جائے گی، اور سمندروں کا پانی بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ ان پانچوں چیزوں کی قسم کھانے، یعنی ان کو گواہ بنانے کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ بیشک تیرے پروردگار کا عذاب واقع ہونے والا ہے۔ اور یہ ایسا عذاب ہوگا:

﴿مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ﴾ کہ اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور یہ حساب وکتاب اور جزاء وسزاء کا مرحلہ اتنا اٹل ہے کہ اسے کوئی روک نہیں سکتا، اور یہ اس دن واقع ہوگا: ﴿يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا﴾ کہ جس دن آسمان لرز جائے گا لرزنا۔ قیامت والے دن زمین کے علاوہ آسمان بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گا، جیسے سورۂ نباء میں فرمایا: ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ [النباء:۱۹] (آسمان کو کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہو جائیں گے) سوراخ ہوں گے۔ آسمان کے بعد زمین کے متعلق فرمایا:

﴿وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ اور پہاڑ چلنے لگیں گے۔ ان کی کیفیت بادلوں یا گرد وغبار کی طرح ہوگی، جو اڑتے پھریں گے۔ فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ سو تباہی اور بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے، جنہوں نے دنیا میں توحید کو تسلیم نہیں کیا، رسالت اور جزاء عمل اور وقوع قیامت کا انکار کیا، یہ وہ لوگ ہیں:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ﴾ جو بیہودہ غلط باتوں میں کھیل رہے ہیں، جن کی ساری زندگی کھیل کود میں ضائع ہوگئی، انہوں نے ایک لحہ بھی آخرت کے متعلق نہیں سوچا۔ ﴿يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا﴾ کہ یہ دھکیل دیئے جائیں گے جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جانا، پوری قوت سے فرشتے انہیں دھکہ دے کر جہنم میں ڈال دیں گے، اوران سے کہا جائے گا: ﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ﴾ یہی وہ آگ ہے جس کو تم جھٹلا دیا کرتے تھے، آج اس کی ذلّت کو خوب برداشت کرو، یہ تمہارے اس جھٹلانے کی سزا ہے کہ تم دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے نبیوں علیہم السلام کو جادوگر کہتے تھے، اور قرآن حکیم کو جادو سے تعبیر کرتے تھے، اب بتلاؤ:

﴿اَفَسِحْرٌ هٰذَا اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ﴾ کیا یہ جادو ہے؟ یا تو تمہیں نظر ہی نہیں آرہا ہے؟ ظاہر ہے کہ تم سب دیکھ رہے ہو، اور جانتے بھی ہو، نہ قرآن جادو تھا، نہ انبیاء علیہم السلام جادوگر تھے، نہ جہنم کی حقیقت کوئی افسانہ تھی، آج تمہیں سب کچھ کا پتہ چلا، اب تمہارا یہ علاج ہے: ﴿اِصْلَوْهَا﴾ اب اس جہنم میں داخل ہوجاؤ، اس کے بغیر تمہیں کوئی چارہ نہیں۔ ﴿فَاصْبِرُوْا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا﴾ اب سزاء پر صبر کرو، یا بے صبری کا مظاہرکرو۔

﴿سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ﴾ تمہارے لئے برابر ہے، تمہیں ہر حالت میں اس سزاء کا مزہ چکھنا ہے، نہ اس سے بچ سکتے ہو، نہ اسے ٹال سکتے ہو، نہ اس سے بھاگ سکتے ہو، بلکہ: ﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ یہ تمہیں اسی چیز کا بدلہ دیا جارہا ہے جو تم دنیا میں عمل کرتے رہے، یہ تمہاری اپنی کمائی ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر کوئی زیادتی یا ظلم نہیں کیا، ظلم وزیادتی کرنے والے تم خود ہی ہو، اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی زیادتی وظلم سے پاک ہے۔ اب دیکھو! جن لوگوں نے تمہارے مقابلے میں ایمان قبول کیا، اور عملِ صالح انجام دیئے ان کا نتیجہ تمہارے سامنے آنے والا ہے۔

❁ ❁ ❁

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿١٧﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿١٨﴾
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٢٠﴾
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ
شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿٢١﴾ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢٢﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا
كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٢٤﴾ وَاَقْبَلَ

بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا
عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: بیشک متقی لوگ باغوں میں اور نعمتوں میں ہوں گے ﴿۱۷﴾ جو کچھ ان کے ربّ نے انہیں دیا ہوگا خوشی کے ساتھ اس میں مشغول ہوں گے، اور ان کا ربّ انہیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا ﴿۱۸﴾ کھاؤ، اور پیو، مبارک طریقہ پر، ان اعمال کا بدلہ جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۹﴾ یہ لوگ ایسے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے جو برابر بچھے ہوئے ہوں گے، اور ہم گورے رنگ والی بڑی آنکھوں والی عورتوں سے ان کا بیاہ کردیں گے ﴿۲۰﴾ اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی ذریت نے ایمان کے ساتھ ان کا اتباع کیا، تو ہم ان کی ذریت کو ان کے ساتھ ملا دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز بھی کم نہیں کریں گے، ہر شخص اپنے اعمال کی وجہ سے محبوس ہوگا ﴿۲۱﴾ اور ہم ان کو میوے اور گوشت بڑھا کر دیتے رہیں گے، جس کی انہیں خواہش ہوگی ﴿۲۲﴾ وہ اس میں جام کی چھینا جھپٹی کریں گے، نہ اس میں کوئی لغو بات ہوگی، اور نہ کوئی گناہ کی بات ﴿۲۳﴾ اور ایسے لڑکے ان کے پاس آتے جاتے رہیں گے گویا کہ وہ چھپے ہوئے موتی ہیں ﴿۲۴﴾ اور یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے ﴿۲۵﴾ وہ کہیں گے کہ بیشک ہم پہلے اپنے اہل وعیال میں رہتے ہوئے ڈرا کرتے تھے ﴿۲۶﴾ سو اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا، اور ہمیں دوزخ سے بچالیا ﴿۲۷﴾ بلاشبہ ہم پہلے اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے، بیشک وہ بڑا محسن ہے، مہربان ہے ﴿۲۸﴾

معارف ومنازل

تکذیب کرنے والوں کی سزاء کا تذکرہ فرمانے کے بعد متقین کی عجیب وغریب نعمتوں کا تذکرہ فرمایا، ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ﴾ بیشک متقی لوگ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بے شمار باغات ہوں گے، وہاں ہر قسم کا آرام وراحت نصیب ہوگی۔

﴿فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ﴾ خوش ہونے والے ہوں گے اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ انہیں عطاء کرے گا۔ جنت کے انعام واکرام پا کر دنیا کی تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کو بھول جائیں گے، اور آپس میں خوش طبعی اور مسرتوں میں تبادلہ خیالات کریں گے۔ فٰكِهِيْنَ کا ایک معنی خوش طبعی بھی ہے، جبکہ دوسرا معنی پھل اور میوہ ہے۔

﴿وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ﴾ اور اصلی خوشی ان کو اس بات پر بھی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں

ایمان کی بدولت دوزخ کے عذاب سے بچالیا ہے، جنت میں داخل ہونے کے بعد ان کا خیر مقدم ہوگا، اور فرشتے انہیں سلام پیش کریں گے، اور مبارکباد دیں گے، اور کہیں گے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ کہ کھاؤ اور پیو، خوشگوار اور مزہ لیتے ہوئے، اپنے ان اعمال کے بدلے میں جو تم دنیا کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ آگے ان کے عیش وآرام کا یہ عالم ہوگا:

﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ﴾ وہ قیمتی موتیوں کے تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھے ہوں گے، جو ترتیب اور قرینے کے ساتھ صف بصف بچھائے گئے ہوں گے۔ جنتی لوگ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے، اور بڑی مسرتوں کے ساتھ خوشگوار موڈ میں آپس میں باتیں کرتے ہوں گے، اور حال یہ ہوگا کہ: ﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ اور ہم ان کا گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورتوں سے نکاح کردیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے معراج والی رات جنّت میں ایک گندمی رنگ نوجوان عورت کو دیکھا، میں نے پوچھا کہ عرب کے لوگ تو عموماً گوری رنگ کی عورتوں کو پسند کرتے ہیں، مگر یہ گندمی رنگ والی ہے؟ تو مجھے فرشتے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص فرمایا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے، اور جنگ موتہ میں شہید ہوئے تھے۔ دوران جنگ آپ رضی اللہ عنہ کے دونوں بازو کٹ گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ان کو جنّت میں فرشتوں کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے دیکھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو بازوؤں کی جگہ دو پر عنایت فرمائے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور ان کی اولادوں نے ایمان کے ساتھ ان کا اتباع کیا، تو ہم ان کی اولادوں کو بھی اہل ایمان کے ساتھ ملا دیں گے خواہ اولاد کا درجہ والدین سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ان کے لیے خصوصی عنایت ہوگی کہ اگر مؤمن اعلیٰ درجہ کا ہے، اور اس کی اولاد کم درجہ میں ہے، تو اس کو بھی اعلیٰ درجہ میں جگہ دے دی جائے گی، تاکہ مؤمن کو ذہنی سکون حاصل ہو، اور انہیں جنّت میں اپنی اولاد کو اپنے درجے میں دیکھ کر مکمل اطمینان حاصل ہو۔

مؤمنوں کی اولادوں کا مؤمنون کے ساتھ یہی مطلب ہے، جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ اپنے فضل وکرم اور لطف وعنایت سے اپنے احسان وانعام کا یوں بیان فرماتا ہے کہ جن مؤمنون کی اولاد بھی ایمان میں اپنے باپ دادوں کی راہ پر لگ جائیں، لیکن اعمالِ صالحہ میں اپنے بڑوں سے کم ہوں، تو ربّ العزت جلّ شانہ ان کے نیک اعمال کا بدلہ بڑھا چڑھا کر انہیں ان کے بڑوں کے درجے میں پہنچا دے گا، تاکہ بڑوں کی آنکھیں اولاد کو اپنے

پاس دیکھ کر ٹھنڈی ہوں، اور چھوٹے بھی اپنے بڑوں کے پاس حشاش بشاش پر سکون ہوں۔ ان کے عملوں کی زیادتی ان کے بزرگوں کے اعمال کی کمی سے نہ کی جائے گی، بلکہ محسن ومہربان ربّ جلّ شانہ انہیں اپنے ماموں خزانوں میں سے عطاء فرمائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں۔ ایک مرفوع حدیث بھی اس مضمون کی مروی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب جنّتی شخص جنّت میں جائے گا، اور وہاں اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کو نہ پائے گا، تو دریافت کرے گا کہ وہ کہاں ہیں؟ جواب ملے گا کہ وہ تمہارے مرتبہ تک نہیں پہنچے، وہ کہے گا: باری تعالیٰ! میں نے تو اپنے لئے اور ان کے لیے نیک اعمال انجام دیئے تھے، چنانچہ حکم ہوگا، اور انہیں اس درجہ میں پہنچادیا جائے گا۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ جنّتیوں کی جن اولاد نے ایمان قبول کیا، اور نیک کام کئے، ان کو ان کے ساتھ ملادی جائے گی، اور ان کے جو چھوٹے بچے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ پہنچادیئے جائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید ابن جبیر، شعبی، ابراہیم، قتادہ، ابوصالح، ربعی ابن انس، ضحاک ابن زید رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ بھی اس کو پسند فرماتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے دو بچوں کی نسبت دریافت کیا، جو زمانۂ جاہلیت میں مرے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ دونوں جہنم میں ہیں۔ پھر جب بیوی صاحبہ کو غمگین دیکھا تو فرمایا: اگر تم ان کی جگہ دیکھ لو تو تمہارے دل میں ان کا بغض ہوگا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دوبارہ پوچھا: یارسول اللہ! پھر میرا بچہ جو آپ سے ہے، وہ کہاں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ جنّت میں ہے، کیونکہ مؤمن ماں باپ اپنی اولادوں کے ساتھ جنّت میں ہوں گے، اور کافر اپنی اولاد سمیت جہنم میں ہوں گے۔ پھر آنحضرت نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

مسند احمد میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کا درجہ جنّت میں دفعتاً بڑھادیتا ہے، اور وہ دریافت کرتا ہے کہ اے اللہ! میرا یہ درجہ کیسے بڑھ گیا؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ تیری اولاد نے تیرے لئے استغفار کیا، اس بناء پر میں نے تیرا درجہ بڑھادیا۔ اس حدیث کی اسناد بالکل صحیح ہے۔ گو بخاری ومسلم میں ان لفظوں سے نہیں آئی، لیکن اس جیسی ایک روایت صحیح مسلم میں اس طرح مروی ہے کہ ابن آدم کے مرتے ہی اس کے اعمال موقوف ہوجاتے ہیں، لیکن تین عمل ایسے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب پہنچتا رہتا ہے: صدقہ جاریہ، اور علم دین جس سے لوگوں کو نفع پہنچے، اور نیک اولاد، جو مرنے کے بعد دعائے خیر کرتی رہے۔ [تفسیر ابن کثیر]

﴿وَمَآ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ﴾ اوران مومنون کے اعمال میں سے کوئی کمی نہیں کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ مؤمنوں کے اجر وثواب میں سے کم کر کے ان کے بچوں کو نہیں نوازا جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے خصوصی رحمت کے ساتھ کم درجے والی اولاد کو زیادہ ثواب دے کر ان کے والدین کے ساتھ شامل فرمائیں گے۔

﴿کُلُّ امۡرِیٍٴۭ بِمَا کَسَبَ رَهِیۡنٌ﴾ ہر شخص اپنے اعمال میں رہن رکھا ہوا ہے، وہ اپنے اعمال میں اس قدر پھنسا ہوا ہے کہ ان سے نکل نہیں سکے گا، بلکہ جو کچھ کیا ہوا تھا وہی کچھ بھگتنا پڑے گا۔ ﴿وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاکِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ﴾ اور ہم ان جنتیوں کو ہر قسم کے پھلوں کی مدد پہنچاتے رہیں گے۔ جنّت میں کسی پھل کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہاں کسی موسم کا انتظار کرنا پڑے، بلکہ ہر قسم کے پھل ہر وقت موجود رہیں گے، جو جنّتی کسی درخت سے پھل اتار کر کھائے گا تو اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل آجائے گا۔ ان پھلوں کے علاوہ اہل جنّت کو ان کی خواہش کے مطابق من پسند گوشت بھی مہیا کیا جائے گا۔ سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہے: ﴿وَلَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ﴾ [الواقعة:۲۱] (ان کے لیے پرندوں کا گوشت ہوگا، جیسا کہ وہ چاہیں گے)۔ لطف یہ ہے کہ جنّتی نے پرندہ کو بلایا، وہ کباب ہو کر سامنے آیا، کچھ کھایا، کچھ چھوڑ دیا، تو وہ بچا ہوا دوبارہ زندہ ہو کر اڑ گیا۔ فرمایا:

﴿یَتَنَازَعُوۡنَ فِیۡهَا کَاۡسًا﴾ اہل جنت جنّت میں ایک دوسرے کو پیالے پیش کریں گے، وہاں ہر شراب طہور کے دور چلیں گے۔ اور جنتی ایک دوسرے کو بخوشی پیش کریں گے، اور اس پر خوشی ومسرت کا اظہار کریں گے، اسی کو ﴿یَتَنَازَعُوۡنَ﴾ سے تعبیر فرمایا کہ دل لگی کی باتیں کریں گے، اور یہ شراب کے پیالے اس طرح ہوں گے:

﴿لَّا لَغۡوٌ فِیۡهَا وَلَا تَاۡثِیۡمٌ﴾ ان میں کوئی بیہودہ چیز نہیں ہوگی، جس سے طبیعت میں گرانی پیدا ہو، یا پیٹ پر کوئی بوجھ ہو، یا کوئی دردسر پیدا ہو، اور نہ ہی ان میں کوئی گناہ کی بات ہوگی۔ جنّت کی کسی نعمت کو دنیا کی فانی نعمتوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، دنیا کی کسی چیز کو اللہ کی رضا شاید حاصل نہ ہو، جبکہ جنّت کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی رضا پنہاں و پوشیدہ ہے۔ جنّت میں ایک اور عظیم نعمت کا ذکر جو حوروں کے علاوہ ہے:

﴿وَیَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ غِلۡمَانٌ لَّهُمۡ کَاَنَّهُمۡ لُؤۡلُؤٌ مَّکۡنُوۡنٌ﴾ ان کے پاس چھوٹے بچے موتیوں کی طرح گھومتے پھریں گے، جن سے اہل جنّت کی خوشیوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اور یہ بچے اس طرح خوبصورت ہوں گے گویا کہ وہ غلاف میں محفوظ کئے ہوئے موتی ہیں۔ یہ ایسے صاف وشفاف اور گرد وغبار سے پاک ہوں گے گویا کہ ان کو غلافوں میں بند کر کے رکھا گیا ہے۔ جس طرح حور جنّت کی مخلوق ہے، اسی طرح غلمان بھی خالص جنّتی مخلوق

ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل جنّت کے لیے پیدا فرمایا۔ اس کی تفصیل سورۃ الدہر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آگے فرمایا: ﴿وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ﴾ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر پوچھیں گے: ﴿قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا قَبۡلُ فِىۡۤ اَهۡلِنَا مُشۡفِقِيۡنَ﴾ اور جنّتی کہیں گے کہ اس سے پہلے ہم دنیا میں اپنے گھروں میں اس بات سے ڈرتے تھے کہ پتہ نہیں آگے چل کر کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ اس طرح ہم اپنے مستقبل سے خوفزدہ تھے، ہمیں ہر وقت آخرت کی فکر پریشان کرتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے معاصی اور نافرمانیوں کی وجہ سے خدانخواستہ کوئی ناکامی ہو۔ جب وہ جنّت میں پہنچیں گے تو انہیں سکون حاصل ہوگا۔ پھر وہ کہیں گے:

﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا﴾ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا، ہم اپنے اعمال کی بدولت جنّت میں نہیں پہنچے، بلکہ یہاں کا پہنچنا خالص اس کے فضل وکرم سے ہوا۔ اس کے علاوہ یہ بھی اس کا کرم کہ: ﴿وَوَقٰٮنَا عَذَابَ السَّمُوۡمِ﴾ کہ اس نے ہمیں جہنم کے گرم عذاب سے بچالیا۔ سَمُوۡم کے معنی ہیں: گرمی، تپش، اور لُو۔ مطلب یہ ہے کہ جنّتی لوگ جنّت میں پہنچ کر اپنی کسی کارکردگی پر فخر کرنے کی بجائے اُسے اللہ تعالیٰ کا احسان وکرم مانیں گے، کہ اس نے ہمیں عذاب سے بچا کر راحت وخوشیوں کے مقام میں پہنچا دیا۔ وہ پھر یہ بھی کہیں گے:

﴿اِنَّا كُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡهُ﴾ اس سے پہلے دنیا کی زندگی میں ہم اسی پروردگار کو پکارا کرتے تھے، ہر مشکل میں اس کی مدد طلب کرتے تھے، اور اسی کی تسبیح وتحمید میں مصروف رہتے تھے، لہٰذا اس نے ہم پر بڑا ہی احسان فرمایا۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الۡبَـرُّ الرَّحِيۡمُ﴾ بیشک وہ بڑا نیک سلوک کرنے والا، اور بے حد مہربان ہے۔ بَرٌّ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ اس کا معنی ہے نیکی کرنے والا، احسان کرنے والا، شفقت کرنے والا، رحمتوں کا فیضان جاری کرنے والا۔

فَذَكِّرۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجۡنُوۡنٍ ؕ‏ ﴿۲۹﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيۡبَ الۡمَنُوۡنِ ﴿۳۰﴾
قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِيۡنَ ؕ‏ ﴿۳۱﴾ اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَآ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ۚ‏ ﴿۳۲﴾
اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ۚ‏ ﴿۳۳﴾ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ؕ‏ ﴿۳۴﴾ اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ
غَيۡرِ شَىۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ؕ‏ ﴿۳۵﴾ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلْ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ ؕ‏ ﴿۳۶﴾ اَمۡ عِنۡدَهُمۡ

خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾
اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾
اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: سو آپ سمجھاتے رہیں، کیونکہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ نہ کاہن ہیں، اور نہ مجنون ﴿۲۹﴾ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے؟ ہم اس کی موت کے حادثہ کا انتظار کر رہے ہیں ﴿۳۰﴾ آپ فرما دیجئے: انتظار میں رہو، سو بیشک میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ﴿۳۱﴾ کیا ان کی عقلیں انہیں اس کا حکم دے رہی ہیں؟ یا یہ ایسے لوگ ہیں جو سرکش ہیں؟ ﴿۳۲﴾ کیا وہ یوں کہتے ہیں کہ آپ نے بات بنالی ہے؟ بلکہ بات یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۳﴾ سو اس طرح کا کوئی اور کلام لے آئے، اگر سچے ہیں ﴿۳۴﴾ کیا وہ کسی خالق کے بغیر پیدا کیے گئے ہیں؟ یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿۳۵﴾ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ لوگ یقین نہیں لاتے ﴿۳۶﴾ کیا ان کے پاس آپ کے ربّ کے خزانے ہیں؟ یا یہ لوگ غلبہ والے ہیں؟ ﴿۳۷﴾ یا کیا ان کے پاس کوئی زینہ ہے؟ جس سے وہ باتیں سنتے ہیں، سو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لے آئے ﴿۳۸﴾ کیا اس کے لیے بیٹیاں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں؟ ﴿۳۹﴾ کیا آپ ان سے کسی معاوضہ کا سوال کرتے ہیں؟ سو وہ تاوان سے گران بار ہو رہے ہیں ﴿۴۰﴾ کیا ان کے پاس غیب ہے؟ جسے وہ لکھ لیتے ہیں؟ ﴿۴۱﴾ کیا وہ لوگ کسی برائی کا ارادہ رکھتے ہیں؟ سو جن لوگوں نے کفر کیا وہ خود ہی برائی میں گرفتار ہوں گے ﴿۴۲﴾ کیا ان کا کوئی معبود ہے اللہ کے سوا؟ اللہ تعالیٰ پاک ہے اس چیز سے جو یہ شرک کرتے ہیں ﴿۴۳﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منکرین کی ذہنیت اور ان کے مختلف بے سرو پا نظریات کی تردید فرمائی ہے۔ پہلے رسالت اور اس کی صداقت کا بیان ہے، اور آگے توحید اور جزاء اعمال کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ﴾ پس آپ لوگوں کو نصیحت کر دے، اور ان کو سمجھا دیں، اور انہیں احکامِ الٰہی سے آگاہ کرتے رہئے۔

﴿فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ﴾ آپ اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہیں، اور نہ

ہی آپ (العیاذ باللہ) دیوانے ہیں۔ کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو سادہ لوح لوگوں کو غیب کی خبریں بتا کر اپنا مقصد نکالتے ہیں۔ علامہ ابن خلدونؒ نے کہا کہ یہ کاہن کبھی تو طبعی چیزوں کے ذریعے کچھ باتیں معلوم کر لیتے ہیں، اور کبھی جنات کے ذریعے، اور کچھ ستاروں کے ذریعے، جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام ان من گھڑت چیزوں سے ہمیشہ بے زار اور پاک رہے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہانت کے متعلق فرمایا کہ شیاطین اور جنات اوپر آسمان کی طرف جاتے ہیں، تو فرشتوں کی بعض باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں، فرشتے ان کو مار بھگاتے ہیں، ان پر شہاب ثاقب پڑتے ہیں، تو ان میں سے کوئی زخمی ہو جاتا ہے، اور کوئی ہلاک ہو جاتا ہے، اور کوئی بھاگ کر زمین کی طرف آجاتا ہے۔

پھر ان میں سے جو کوئی فرشتوں کی کوئی بات سن لیتے ہیں وہ آکر اپنے کاہنوں کو بتاتے ہیں، پھر وہ کاہن اس ایک بات میں سو جھوٹ ملا کر آگے لوگوں کو بتا کر گمراہ کرتے ہیں۔ اس طرح کاہنوں کی ایک آدھ بات درست بھی نکلتی ہے، جس کی وجہ سے لوگ ان کے پاس آتے رہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص کاہن کے پاس گیا، اور اس کی بات کی تصدیق کی، تو گویا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کا انکار کیا۔ اور اگر وہ شخص یقین کر لے کہ کاہن واقعی سچ کہتا ہے، اور اس کی بات درست ہے تو وہ شخص کافر ہو جائے گا۔ اور اگر اس کو سچا نہیں سمجھتا، مگر پھر بھی اس کے پاس جاتا ہے، تو یہ بھی سخت ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا رمل کے ذریعے، ابجد کے ذریعے، یا ستاروں کے ذریعے، یا موسموں کے ذریعے کوئی چیز معلوم کرنا اور لوگوں کو بتانا حرام اور ناجائز ہے۔ ایسے لوگوں سے احتیاط کرنا اور بچنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح سحر و جادو کا حال ہے کہ وہ بھی حرام ہے، اور ناجائز ہے۔ جیسے کہ فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہہ کر پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام و رسوا کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان پر غالب آئے، اور ہزاروں جادوگروں کو ایمان نصیب ہوا۔ انہوں نے جان کی قربانی دے کر ابدی سعادت حاصل کی۔

سورۃ القلم میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو جواب دے کر فرمایا: ﴿ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ [القلم] (قسم ہے قلم کی، اور جو کچھ فرشتے لکھتے ہیں، آپ اپنے ربّ کی مہربانی سے دیوانے نہیں، بلکہ آپ کے لیے تو بے انتہاء اجر ہے، اور آپ بہت اونچے اخلاق کے مالک ہیں)۔ جو لوگ آپ کو دیوانے کہتے ہیں دراصل وہ اپنی دیوانگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

آپ تو علم وحکمت کے علمبردار ہیں، اور ایسے لوگ پاگل نہیں ہوتے، البتہ ان کو پاگل کہنے والے ہی پاگل ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا شاعری کی تردید میں: ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ﴾ یہ لوگ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاعر ہیں۔ اور ساتھ ساتھ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اور گمان کرتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ زمانے کی گردش کا انتظار کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا زعم باطل یہ تھا کہ نبوت کا یہ دعوے دار محض شاعر ہے، جو زمانے کے ساتھ دوسرے شاعروں کی طرح خود ہی ختم ہوجائے گا، پھر اس کا کوئی نام لینے والا نہ رہے گا، اور اس کا پروگرام اس کی موت کے ساتھ خود ہی ختم ہوجائے گا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا پروگرام ابدی ہے، اور ہمارے خیالات پانی پر لکیر کی طرح بے بنیاد ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، فرمایا: ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ [الکوثر: ۳] (بیشک آپ کے بدخواہ بے بنیاد ہی رہیں گے) ان کا نام لیوا کوئی نہیں رہے گا، جبکہ آپ کا پروگرام چار دانگ عالم میں قیامت تک باقی رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ مشرکین کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ﴾ اے پیغمبر اسلام! آپ ان سے فرمادیجئے گا کہ بیشک تم انتظار کرو، اور بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ گویا تم میرے بارے میں انتظار کرو، اور میں تمہارے متعلق انتظار کرتا ہوں۔ عنقریب پتہ چل جائے گا کہ کون کامیاب ہوجائے گا، اور کون ناکام ہوجائے گا۔ کس کا سلسلہ ختم ہوجائے گا، اور کس کا دین قائم ودائم رہے گا۔ پھر فرمایا:

﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ﴾ کیا ان لوگوں کی عقلیں ان کو اس قسم کا حکم دیتی ہیں؟ کہ تم پیغمبر خدا کی طرف ایسی غلط باتیں منسوب کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ باتیں تو عقل کے بھی خلاف ہیں، اللہ کا نبی تو مخلوق میں سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے، ان کی گفتگو اور ان کے اخلاق، اور ان کا کردار، اور ان کی سیرت وصورت، اور ان کے طرز وطریقے سب معیاری ہوتے ہیں، وہ تو پورے جہاں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں، مگر کیا یہ لوگ عقل سے عاری ہوچکے ہیں کہ نبی اور شاعر میں، عقلمند اور دیوانہ میں تمیز نہیں کرسکتے؟ فرمایا: پھر بات یہ ہے:

﴿اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ﴾ کہ یہ سرکش ہوچکے ہیں، اور شرافت کی حدود کو پامال کرتے ہوئے گھٹیا ذہن، گھٹیا باتیں کرتے ہیں۔ درحقیقت ان کی اپنی عقلوں کا جنازہ نکل چکا ہے، سو ان مردوں سے کیا شکوہ؟ پھر فرمایا کہ ان لوگوں کے انکار کی ایک وجہ قرآن پاک سے متعلق بدگمانی بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ استفہامیہ انداز میں فرمایا:

﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ﴾ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن پاک کو خود گھڑ کر اپنی طرف سے مرتب کر کے لے آیا ہے؟ اور خود ساختہ کلام کو اللہ کی وحی قرار دیتا ہے؟ فرمایا: یہ چیز بھی خلاف واقعہ ہے، ہم تو بار بار کہہ چکے ہیں، اور قرآن مجید بانگ دہل اعلان کر چکا ہے، محض عرب نہیں، بلکہ پورے جہاں کو چیلنج کر دیا ہے: ﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ﴾[البقرة:۲۳] (اگر تمہیں ہمارے بندے پر نازل کردہ کلام میں کوئی شک ہے، تو پھر اس جیسی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ) پتہ چل جائے گا کہ یہ خدا کا کلام ہے یا انسان کا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ:

﴿بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اسی لئے طرح طرح کے بہانے کرتے ہیں۔

﴿فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ﴾ اگر اس قرآن کو انسان کا کلام سمجھتے ہیں تو اس جیسی ایک بات ہی بنا کر لے آئیں، اگر یہ واقعی سچے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قرآن پاک کے اس چیلنج کو آج تک بڑے سے بڑے دشمن کو قبول کرنے کی بھی جرأت نہ ہوسکی۔ ﴿اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَىۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ﴾ یا یہ لوگ بغیر کسی چیز کے پیدا کئے گئے ہیں؟ مفسرین نے غَيۡرِ شَىۡءٍ کا معنی یہ کیا ہے کہ کیا یہ لوگ بغیر خالق خود بخود ہی پیدا ہو گئے ہیں؟ کیا یہ والدین کے توسط سے پیدا نہیں ہوئے؟ کیا یہ پتھر اور دھات کی طرح بے جان چیزیں ہیں؟ جن کی پیدائش کے لیے تناسل کی ضرورت نہیں۔ اور غَيۡرِ شَىۡءٍ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ کیا یہ لوگ بے مقصد پیدا کئے گئے ہیں؟ کیا ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى﴾[القیامة:۳۶] (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟ اس کی زندگی کی کوئی غرض وغایت نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو بے کار محض اور فضول پیدا نہیں کیا، تو انسان جیسی اشرف المخلوقات کو کیوں بے مقصد اور بے غرض پیدا فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور دے کر اسے مکلّف بنایا، اور روزِ قیامت اس کا پورا پورا محاسبہ ہوگا۔ فرمایا: کیا یہ لوگ اپنے آپ کو اس لئے غیر ذمہ دار اور غیر مسئول سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں؟ یا یہ محض بے مقصد پیدا کئے گئے ہیں؟ ﴿اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ﴾ یا یہ خود (العیاذ باللہ) پیدا کرنے والے ہیں؟ آخر وہ کونسی چیز ہے جو انہیں وقوعِ قیامت اور محاسبۂ اعمال پر ایمان سے روکتی ہے؟ اور جس کے لئے یہ تیاری نہیں کرتے۔ خالقیت کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ دہریوں کی ایک قلیل جماعت کے علاوہ ہر مذہب وملت کے داعی، حتی کہ مشرکوں

کے تمام طبقات بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔

فرمایا: کیا بحیثیت خالق ﴿اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ﴾ کیا انہوں نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے؟ آخر کچھ تو بتلائیں کہ انہوں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ خالق بھی نہیں ہیں، بلکہ صرف الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔ ﴿بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ﴾ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبرِ خدا کی بات پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ وحی الٰہی اور محاسبۂ اعمال پر بے یقینی اور سرکشی کی وجہ سے یہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، اگر ان میں ذرا بھی شعور ہوتا تو یہ انکار نہ کرتے۔ فرمایا: ان کے انکار کی ایک یہ وجہ بھی ان کے زعم وگمان میں ہوسکتی ہے:

﴿اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ﴾ یا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں؟ لٰہذا وہ اپنے معاملات میں خود کفیل ہیں، اور اپنی ضروریات کی تمام چیزیں ان خزانوں سے نکالتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کو نہ کسی ہدایت کی ضرورت ہے، نہ قرآن کی، نہ توحید کی، اور نہ رسالت کی۔ کیا ان کے پاس خزانے ہیں؟

﴿اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜيۡطِرُوۡنَ﴾ یا یہ دوسروں پر مسلّط ہیں؟ یعنی یہ لوگوں پر داروغہ مقرر ہیں کہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں، اور خود کسی اصول یا قانون کے پابند نہیں ہیں، بلکہ ہر معاملہ میں خود مختار ہیں۔

﴿اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ﴾ یا پھر ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے، جس کے ذریعے یہ عالم بالا پر چڑھ جاتے ہیں، اور اوپر کی باتیں سن آتے ہیں، اور پھر انہیں نافذ کرتے ہیں۔ فرمایا: اگر ایسی کوئی بات ہے:

﴿فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ﴾ تو پھر بات سننے والا اس کے لیے کوئی کھلی سند لے کر آئے اور پیش کرے، تاکہ پتہ چلے کہ واقعی یہ شخص عالمِ بالا سے براہ راست حکم لے کر آیا ہے، اور اب اسے وحی الٰہی، رسالت اور قرآن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی بتائے کہ اب اسے محاسبۂ اعمال سے استثناء حاصل ہے۔ فرمایا: حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لوگ بالکل تہی دست اور تہی دامن ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں، بلکہ یہ محض ضد، عناد، ہٹ دھرمی اور سرکشی کی وجہ سے ہر چیز کا انکار کرتے جارہے ہیں۔

آگے مشرکین کی حماقت کا ذکر ہے:

﴿اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَ﴾ کیا اس پروردگار کے لیے بیٹیاں ہیں، اور تمہارے لئے بیٹے؟ تم نے یہ کیسی بھونڈی تقسیم کر رکھی ہے، کہ جس صنف کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے، اور انہیں زندہ درگور کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہو، حالانکہ وہ ان چیزوں سے پاک ہے، اس کی شان تو یہ ہے کہ: ﴿لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۝۳ وَ

لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [الإخلاص] (نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر و برابر ہے)۔

﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ یا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کرتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ لوگ آپ کی بات کو تسلیم نہیں کرتے، اور وہ اس تاوان کی وجہ سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ تو یہ بات بھی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی رسول نے مخلوق سے نہ کوئی معاوضہ طلب کیا ہے، نہ ان پر کوئی مالی بوجھ ڈالا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ہر نبی نے اپنی امت پر پورے طریقے سے واضح کر دیا: ﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الشعراء:۱۰۹] (میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا، کیونکہ میرا بدلہ تو مخلوقات کے پروردگار ہی کے پاس ہے) اور وہی مجھے عطاء کرے گا، تم پر اس معاملہ میں کوئی مالی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ پھر فرمایا: ان کے انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے:

﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ کہ یا غیب کی کوئی خبر ہے جسے وہ لکھ لیتے ہیں؟ اور پھر ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: ایسی بات بھی نہیں ہے کہ ان کو غیب سے کوئی علیحدہ ہدایت ملتی ہو، یا ان پر کوئی وحی نازل ہوتی ہو۔ اگر ان کے پاس کوئی چیز ہے تو اسے پیش کر دیں۔ ﴿اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا﴾ کیا وہ لوگ کسی بُری تدبیر کا ارادہ رکھتے ہیں؟ کہ کسی مخفی تدبیر کے ذریعے کوئی اسکیم لڑانا چاہتے ہیں۔

﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ﴾ پھر انہیں جان لینا چاہئے کہ کافر لوگ جو اس قسم کی تدبیریں کرتے ہیں، اور جو مکر و فریب بناتے ہیں یہ خود ہی ان تدابیر کا شکار ہو جائیں گے، اور اپنے پھیلائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس جائیں گے، جیسے سورۂ فاطر میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ [فاطر: ۴۳] (یعنی جو شخص کسی دوسرے کے بارے میں بُری تدبیر سوچتا ہے وہ خود اسی پر پڑتی ہے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ حَفَرَ بِئْرًا لِأَخِيْهِ وَقَعَ فِيْهِ۔ جس نے اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودا وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔ [مشکوٰۃ]

الغرض! فرمایا: جو لوگ غلط تدبیریں سوچتے ہیں وہ خود مغلوب ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مکر، کوئی خفیہ تدبیر، کوئی بھی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بنی اسرائیل کی سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۵۴] (اور انہوں نے تدبیر کی، اور اللہ نے بھی تدبیر کی، اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید فرمائی۔

﴿اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ﴾ کیا ان منکرین کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ جس کی وجہ سے یہ اپنے خالق اور مالک کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں۔ فرمایا: ایسا ہرگز نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے: ﴿سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ان تمام چیزوں سے پاک اور منزہ ہے، جن کو یہ لوگ اپنے زعم باطل کے مطابق اس کا شریک بناتے ہیں، اور ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ غلط اور بے بنیاد ہیں۔

وَاِنۡ يَّرَوۡا كِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡكُوۡمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرۡهُمۡ حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ فِيۡهِ يُصۡعَقُوۡنَ ﴿۴۵﴾ يَوۡمَ لَا يُغۡنِىۡ عَنۡهُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ذٰلِكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: اور اگر وہ آسمان سے کسی ٹکڑے کو دیکھ لیں کہ گرتا ہوا آرہا ہے تو کہیں گے: یہ تو تہ بتہ جما ہوا بادل ہے ﴿۴۴﴾ سو آپ انہیں چھوڑیئے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے ملاقات کریں جس میں وہ بے ہوش ہو جائیں گے ﴿۴۵﴾ جس دن ان کی کوئی تدبیر ان کے کچھ بھی کام نہ آئے گی، اور ان کی کچھ بھی مدد نہ کی جائے گی ﴿۴۶﴾ اور بلاشبہ جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے لیے عذاب ہے، اس سے پہلے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۴۷﴾ اور آپ اپنے ربّ کی تجویز پر صبر کیجئے، سو آپ بیشک ہماری حفاظت میں ہیں، اور جس وقت آپ کھڑے ہوتے ہیں اپنے ربّ کی تسبیح اور حمد کیجئے ﴿۴۸﴾ اور رات کے حصہ میں بھی اس کی تسبیح بیان کیجئے، اور ستاروں کے چھپنے کے بعد بھی ﴿۴۹﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی بدبختی کی مثال بیان فرمائی، کہ ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے اگر ان پر عذاب بھی آجائے تو اس کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ فرمایا: ﴿وَاِنۡ يَّرَوۡا كِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا﴾ اور اگر یہ لوگ آسمان کی طرف سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھ لیں تو اس سے خوف کھانے کی بجائے:

﴿يَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡكُوۡمٌ﴾ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بادل کا منجمد ٹکڑا ہے۔ یعنی بادلوں میں برف جم گئی ہے، اور وہ اولوں کی صورت میں آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں مشرکین کا یہ بیان نقل فرمایا ہے کہ ایک طرف

تو معجزات طلب کرتے تھے، اور دوسری طرف اپنے منہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے: ﴿أَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾ [بني إسرائيل: ۹۲] (یا ہم پر کوئی آسمانی ٹکڑا ہی گرادے، جیسا کہ تمہارا خیال ہے) تا کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ جس عذاب سے تو ہمیں ڈراتا ہے وہ واقعی آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ از حد سرکش اور عنادی ہیں، اگر ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی گرادیا جائے تو پھر بھی یہ نہیں مانیں گے، بلکہ اپنی ضد اور کفر پر جمے رہیں گے، اور کہیں گے کہ یہ عذاب نہیں، بلکہ جما ہوا بادل ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ﴾ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، اور ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں، یہ حد سے بڑھے ہوئے لوگ ہیں، جو کسی عقلی اور نقلی دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں، یہاں تک کہ یہ جاہلیں اپنے اس دن سے جس میں ان پر کڑک پڑے گی۔ صَعَق کا معنی ہے: بجلی کا کڑک کے ساتھ گرنا، اور اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ بہر حال! اس کڑک سے مراد دنیا کا عذاب بھی ہوسکتا ہے، اور قیامت کی بے ہوشی بھی مراد ہوسکتی ہے۔ فرمایا: آپ ان سے درگزر کریں، اس وقت تک جب یہ خود اپنی شامت اعمال میں گرفتار ہو جائیں گے۔ فرمایا: وہ دن ایسا ہوگا:

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾ جس دن ان کے مکر وفریب کام نہیں آسکیں گے، اور ان کی ہر تدبیر ناکام ہوجائے گی۔ ﴿وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا نہ ان کے پاس ایسا عمل ہوگا جو انہیں نجات دلائے، اور نہ ہی باہر سے کوئی ان کی مدد کے لیے آسکے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہر طرح بے یار ومدد گار ہوں گے۔ ﴿وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ اور بے شک جن لوگوں نے ظلم کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے ان سے پہلے بھی ایک عذاب ہے، جو دنیا میں ان کو تباہ کر کے رہے گا، اور آخرت کا عذاب تو وقوعِ قیامت کے بعد ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت سے پہلے اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ انہیں مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلاء کرے گا۔ جیسے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی شکست کی صورت میں ان پر عذاب آیا، ان کے ستر سرداروں کو جہنم رسید کیا گیا، اور ان کے ستر لوگوں کو مسلمانوں نے قیدی بنادیا، اور کبھی ان پر سخت قحط سالی اللہ تعالیٰ نے مسلط فرمائی۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ لیکن اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔ آئندہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر کی تلقین فرمارہے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ آپ اپنے پروردگار کے حکم کے ساتھ صبر کریں، دشمنوں کی ایذاء رسانی پر دل برداشتہ نہ ہوں، اور ہر قسم کی تکالیف کو صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کریں، اور یہ

یقین کریں کہ: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا﴾ آپ کے تمام حالات ہماری نظر کے سامنے ہیں، ہم آپ کی کسی تکلیف سے غافل نہیں، اور آپ کے دشمنوں کی فریب کاری، عیاری اور مکاری سے خوب واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ عنقریب آپ کی حوصلہ افزائی فرمائے گا، اور مشرکوں کو ہمیشہ کے لیے مغلوب کردے گا۔ فرمایا: دوسرا علاج یہ ہے کہ:

﴿وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ﴾ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کریں، اس کی تعریف کے ساتھ، جبکہ آپ کھڑے ہوتے ہیں۔ کھڑے ہونے سے قیام مراد ہے، نماز کا قیام بھی مراد ہے، اور عام مجالس میں کھڑا ہونا بھی مراد ہوسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: جو شخص کسی مجلس سے اٹھتے وقت یہ کہے: سُبۡحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِکَ لَا اِلٰهَ اِلَّا أَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُکَ وَأَتُوۡبُ اِلَیۡکَ۔ تو یہ کلمہ اس کی مجلس کی تمام کوتاہیوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ سو کر اٹھنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہئے، اور نماز کے لئے قیام کی ابتداء بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید سے ہی ہوتی ہے۔ یعنی ثناء اور تعوذ وتسمیہ۔ [ترمذی وغیرہ] پھر فرمایا:

﴿وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ﴾ اور رات کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کریں۔ اس سے نماز تہجد بھی مراد ہوسکتی ہے۔ بعضوں نے کہا کہ اس سے مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے۔

﴿وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ﴾ اور ستاروں کے پشت پھیر کر چلے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں۔ بعض مفسرینؒ اس سے نماز فجر مراد لیتے ہیں، کیونکہ اس وقت ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے، گویا وہ غروب ہوتے جارہے ہیں۔ اور اکثر اہل تفسیر کے نزدیک صلوٰۃ فجر سے پہلے کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فجر کی دو رکعتیں، یعنی دو سنتیں دنیا و مافیھا سے بہتر ہیں۔ [مسلم]

سُورَةُ النَّجْمِ

مکیۃ آیاتھا ۶۲ رکوعاتھا ۳

سورۂ نجم مکی ہے، اس میں باسٹھ (۶۲) آیتیں، اور تین (۳) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ النجم ہے، جو اس سورت کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۵۳ ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۲۳ ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

جمہور کے نزدیک یہ سورت مکی دور میں نازل ہوئی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، مگر یہ قول درست نہیں۔ [قرطبي] بخاری و مسلم وغیرہما نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ سب سے پہلی سورت جس میں سجدہ کا ذکر ہے وہ سورۃ النجم ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا، اور سب لوگوں نے سجدہ کیا، مگر ایک شخص نے مٹھی میں مٹی لے کر اس پر سجدہ کیا۔ میں نے اس کے بعد اس شخص کو دیکھا کہ وہ جنگ بدر میں کفر کی حالت میں قتل کیا گیا، اور وہ اُمیّہ ابن خلف تھا، اور احادیث سے یہی ثابت ہے کہ اس سورت میں سجدہ ہے۔ [تفسیر ابن کثیر]

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں تین (۳) رکوع، باسٹھ (۶۲) آیات، ۵۶۵ کلمات، اور ۱۴۰۰ حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت کے آخر میں ستاروں کا بیان تھا، اس سورت کے شروع میں ستاروں کا بیان ہے۔

مختصر موضوع:

قدرتِ باری تعالیٰ، صداقتِ قرآن، واقعہ معراج، فضائل جبرائیل علیہ السلام، مشرکین کے ساتھ طریق مناظرہ، گمراہی کے اسباب، مؤمنین ومشرکین کا انجام، علمِ غیب، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل، مجازاتِ اعمال، کامیابی کے اصول، قربِ قیامت کا بیان، تذکیراتِ ثلاثہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور صبر کی تلقین اس سورت کا مختصر موضوع ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ
یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ﴿۵﴾ ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ فَاسۡتَوٰی ۙ﴿۶﴾ وَہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی ؕ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴿۸﴾ فَکَانَ
قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی ۚ﴿۹﴾ فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی ؕ﴿۱۰﴾ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی
مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ﴿۱۳﴾ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۱۴﴾ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ؕ﴿۱۵﴾ اِذۡ یَغۡشَی
السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ﴿۱۸﴾

ترجمہ: قسم ہے ستارہ کی، جب وہ غروب ہونے لگے ﴿۱﴾ تمہارا ساتھی نہ راہ سے بھٹکا ہے، اور نہ غلط راستہ پر پڑا ہے ﴿۲﴾ اور وہ اپنی نفسانی خواہش سے بات نہیں کرتا ﴿۳﴾ وہ نہیں ہے مگر جو وحی کی جاتی ہے ﴿۴﴾ اس کو سکھایا ہے بڑے طاقت والے نے ﴿۵﴾ وہ طاقتور ہے، پھر وہ اصلی صورت میں نمودار ہوا ﴿۶﴾ اور وہ بلند کنارہ پر تھا ﴿۷﴾ پھر وہ قریب آیا، اور جھک گیا ﴿۸﴾ اس حال میں تھا کہ دونوں کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا ﴿۹﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کی طرف وحی نازل فرمائی جو نازل کرنی تھی ﴿۱۰﴾ دل نے جو کچھ دیکھا اس میں غلطی نہیں کی ﴿۱۱﴾ کیا تم اس سے اس چیز میں جھگڑتے ہو جو کچھ اس نے دیکھا؟ ﴿۱۲﴾ اور یہ تحقیقی بات ہے کہ انہوں نے اس کو ایک بار اور دیکھا ﴿۱۳﴾ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب ﴿۱۴﴾ اس کے قریب جنۃ المأویٰ ہے ﴿۱۵﴾ جبکہ سدرۃ المنتہیٰ کو وہ چیزیں ڈھانپ رہی تھیں جنہوں نے ڈھانپ رکھا

تھا⑯ نہ تو نگاہ ہٹی، نہ بڑھی⑰ یہ تحقیقی بات ہے کہ انہوں نے اپنے ربّ کی بڑی آیات کو دیکھا⑱

معارف و منازل

یہاں سے سورۃ النجم شروع ہے۔ اس کے پہلے رکوع کے اکثر حصہ میں سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت، اور وحی کی حفاظت، اور وحی لانے والے فرشتے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی قوت، اور ان کی رؤیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ارشاد فرمایا: ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾ قسم ہے ستارہ کی، جب غروب ہونے لگے۔ ﴿مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَاغَوٰى﴾ تمہارا ساتھی نہ صراط مستقیم سے بھٹکا ہے، اور نہ غلط راستہ پر پڑا ہے۔

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ اور وہ اپنی نفسانی خواہش سے بات نہیں کرتا۔ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ وہ نہیں ہے مگر جو وحی کی جاتی ہے۔ آیت کریمہ میں جو لفظ ''اَلنَّجْمِ'' واقع ہے۔ بظاہر یہ صیغہ مفرد کا ہے، لیکن چونکہ اسم جمع ہے اس لئے تمام ستارے مراد ہیں۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے ثریا مراد ہے، جو سات ستاروں کا مجموعہ ہے۔ ستارے چونکہ روشنی دیتے ہیں، اور ان کے ذریعے مسافر لوگ رات کو ہدایت پاتے ہیں، اس لئے ان کی قسم کھا کر نبوت اور رسالت اور وحی کو ثابت فرمایا، کیونکہ یہ چیزیں قلوب کے منوّر ہونے کا ذریعہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے پہلے بھی موحّد تھے، اور نبوت کے بعد بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موحد ہونا، توحید کی دعوت دینا قریش کو ناگوار تھا، اور وہ یہ کہتے تھے کہ انہوں نے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا، صحیح راہ سے بھٹک گئے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کاہن یا ساحر یا شاعر کہتے تھے۔

ستاروں کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا کہ تمہارے ساتھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ بتاتے ہیں، اور جو دعوت دیتے ہیں وہ سب حق ہیں، ان کے بارے میں یہ خیال نہ کرو کہ وہ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں۔ ان کا دعویٰ نبوت، اور توحید کی دعوت، اور وہ تمام امور جن کی وہ دعوت دیتے ہیں یہ سب حق اور منجانب اللہ ہیں، اور پوری انسانیت کے لیے سراپا ہدایت ہیں۔ اس میں نہ راہ حق سے ہٹنے کی کوئی بات ہے، اور نہ ہی یہ بات ہے کہ انہوں نے یہ باتیں اپنی خواہش نفسانی کی بنیاد پر کہی ہوں۔ ان کا یہ سب باتیں بتانا صرف وحی سے ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جو ان پر وحی کی گئی ہے۔ اسی کے مطابق سب باتیں بتا رہے ہیں۔

چونکہ ستاروں کے غروب ہونے سے صحیح سمت معلوم ہو جاتی ہے اس لئے وَالنَّجْمِ کے ساتھ اِذَا هَوٰى

بھی فرمایا، یعنی جس طرح ستارہ ہدایت بھی دیتا ہے، اور صحیح سمت بھی بتاتا ہے، اسی طرح تمہارے ساتھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ فرمایا، اور سمجھایا وہ سب حق ہیں، اور عین راہ حق ہے۔ اگر ان کا اتباع کرو گے تو تمہارا سمت قبلہ صحیح رہے گا۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جسے تم بچپن سے جانتے ہو، اور اس کے اعمالِ صادقہ، اخلاقِ حسنہ، احوالِ شریفہ سے تم واقف ہو، اس نے ہمیشہ سچ بولا ہے، جس کی گواہی تم نے خود دی ہے۔ جب تم سارے مل کر کہہ چکے ہو، جَرَّبْنَاکَ مِرَارًا فَمَا وَجَدْنَاکَ إِلَّا صِدْقًا۔ ہم نے بار بار تجربہ کیا، اور ہر موقع پر آپ کو صادق پایا۔ اب تمہارے لئے کوئی جواز نہیں کہ تم اس کی تکذیب کرو۔ جس نے مخلوق سے کبھی جھوٹی باتیں نہیں کیں وہ اللہ تعالیٰ شانہ پر کیسے تہمت رکھے گا؟

اس کے بعد وحی لانے والے فرشتہ کا تذکرہ فرمایا:

﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ﴾ اس کو سکھایا ہے بڑی طاقت والے نے۔ ﴿ذُو مِرَّةٍ﴾ اور وہ واقعی طاقتور ہے۔ یعنی جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآن سکھایا، جو بڑی قوت والا ہے، اور مضبوط پکڑنے والا ہے۔ اس میں اس احتمال کی تردید فرمائی ہے کہ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر چلے ہوں، اور درمیان میں کوئی دوسری مخلوق شیطان وغیرہ پیش آگیا ہو، اور اس کو صحیح طور پر وحی پہنچانے سے باز رکھا ہو۔ ارشاد فرمادیا کہ وحی لانے والا فرشتہ بڑی قوت والا ہے، زبردست طاقتور ہے، اس کے وحی لانے میں اور وحی سپرد کرنے میں کوئی بڑی سے بڑی مخلوق نہ مداخلت کرسکتی ہے، اور نہ اس کے پیغام رسانی میں کوئی رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے۔ یہ وہی فرشتہ ہے جس کے چھ سو بازو (پَر) ہیں۔ قوم لوط کی پوری بستی کو باقی زمین سے کاٹ کر آسمان تک اٹھایا، پھر اسے زمین پر دے مارا، پوچھنے پر بتایا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنے پَر پر کوئی مکھی اٹھائی۔ بھلا ایسے طاقتور فرشتے کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہے؟

پہلی رؤیت: اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ﴾ کہ وہ فرشتہ ایک مرتبہ افق اعلیٰ میں نمودار ہوا۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کی اصلی صورت میں دیکھ لیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام اکثر انسانی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے، اور وحی سنادیتے تھے۔ علامہ قسطلانیؒ نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ زمانہ نزول وحی میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں چوبیس ہزار مرتبہ تشریف لائے، اور آپ کو وحی سنائی۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمائش کی کہ آپ مجھے اپنی اصلی صورت دکھادیں۔ جبرئیل علیہ السلام ایسے وقت اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا سے نیچے اتر رہے تھے، اور وادی میں پہنچ چکے

تھے، تو آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو مشرقی افق میں دیکھا، ان کے چھ سو بازو تھے، اور اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ مغربی افق تک پوری فضاء کو گھیر رکھا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس اصلی صورت میں دیکھ کر بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے، اسی وقت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں آپ ﷺ کے پاس پہنچے، اور آپ ﷺ کو اٹھا لیا، اور آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے گرد وغبار صاف کر دیا۔ اسی نزدیکی کو قرآن حکیم نے:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى﴾ میں بیان فرمایا ہے۔ پھر وہ قریب آیا، پھر وہ نیچے آیا۔ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ اور اتنا قریب ہو گیا جیسا کہ دو کمانوں کے درمیان قرب ہوتا ہے۔ اہل عرب کا طریقہ تھا کہ جب آپس میں معاہدہ کرتے تھے تو دونوں کمانوں کی تانت کو خوب اچھی طرح ملا دیتے تھے، اور اس طرح سے ایک دوسرے کو باور کراتے اور یقین دلاتے تھے کہ اب ہم اور تم ایک ہو گئے، آپس میں کوئی بعد نہیں رہا۔ ﴿اَدْنٰى﴾ میں یہ بتا دیا کہ دو کمانوں کے درمیان جو نزدیکی ہوتی ہے قرب کے اعتبار سے اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا، جو اتحاد روحانی اور اتحاد قلبی پر دلالت کرتا ہے۔ پھر جب آپ ﷺ کو افاقہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی، جسے:

﴿فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴾ میں بیان فرمایا ہے۔ معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ اس موقع پر جو وحی فرمائی تھی وہ: ﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ [الضحیٰ: ۶] (کیا ہم نے آپ کو یتیم پیدا نہیں کیا، اور پھر ٹھکانہ دیا؟) سے لے کر ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ [الشرح: ۴] (اور ہم نے تمہارے لیے تمہارے ذکر کو بلند کر دیا) تک تھی۔ یہ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ اس وقت یہ وحی فرمائی کہ جب تک آپ ﷺ جنّت میں داخل نہ ہوں گے کوئی نبی داخل نہ ہوگا، اور جب تک آپ ﷺ کی امت جنّت میں داخل نہ ہوگی کسی بھی امت کو داخلہ نہ ملے گا۔

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾ یعنی قلب اطہر نے جو کچھ دیکھا اس میں غلطی نہیں کی۔ یعنی جو کچھ دیکھا صحیح دیکھا، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى﴾ کیا تم رسول اللہ ﷺ سے ان کی دیکھی ہوئی چیز میں جھگڑا کرتے ہو؟ انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے صحیح دیکھا ہے، اس میں کسی انکار اور جھگڑے کا موقع نہیں۔ ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى﴾ اور بلا شبہ انہوں نے اس فرشتے کو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا۔

دوسری رؤیت: اس میں دوسری مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رؤیت کا ذکر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو ایک مرتبہ غار حرا کے نزدیک مکہ معظمہ میں اصلی صورت میں دیکھا تھا، جس کا بیان آپ ﷺ نے سنا، اس کے

بعد ایک مرتبہ شب معراج میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ کے قریب اصلی صورت میں دیکھا۔

﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ⑭ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ⑮ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى﴾ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اس کے قریب جنّت الماویٰ ہے، جبکہ سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھی جو چیزیں لپٹ رہی تھیں۔ یعنی ڈھانپ لیا سدرۃ کو اس چیز نے جس نے اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ خاص قسم کے انوار وتجلیات وارد ہورہے تھے، اور اس درخت کے پتوں پر سنہری پروانے جگمگا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے حسن وجمال کی تعریف بیان نہیں کرسکتا، جو اس وقت سدرۃ پر طاری تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ سب کچھ دکھادیا۔

سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنّت المأویٰ کے پاس ہے۔ اس سے واضح ثابت ہوتا ہے کہ جنّت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے، اس کے تمام طبقات درجہ بدرجہ اوپر کی طرف جاتے ہیں، اور آخر میں جنّت الفردوس ہے، جس پر عرش الٰہی کا سایہ پڑتا ہے۔ فرمایا: یہ سارے مشاہدات اس طرح واضح تھے کہ:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ نہ تو نگاہ اِدھر اُدھر ہوئی، اور نہ یہ حد سے بڑھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ یہ پوری کیفیت مشاہدہ کی، اسی لئے فرمایا: ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى﴾ البتہ تحقیق آپ نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ آیات کبریٰ سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں صحیح مسلم، جلد اوّل، صفحہ ۹۸ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نقل کیا ہے کہ اس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دیکھنا مراد ہے، ان کو وہاں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے۔ یہ روایت بخاری میں بھی ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟

سِدرۃ عربی میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں، اور المنتہیٰ کا معنی ہے: انتہاء کی جگہ، آخری ٹھکانہ۔ عالمِ بالا میں جنّت الماویٰ کے قریب سدرۃ المنتہیٰ واقع ہے۔ یعنی بیری کا وہ درخت جس کے پاس چیزیں آکر منتہی ہوجاتی ہیں، اور رُک جاتی ہیں۔ زمین سے جو کچھ اعمال وغیرہ اوپر جاتے ہیں وہ پہلے وہاں ٹھہرتے ہیں، پھر اوپر جاتے ہیں، اور اوپر سے جو کچھ نیچے نازل ہوتا ہے پہلے وہاں ٹھہرایا جاتا ہے، پھر نیچے اترتا ہے۔ [قرطبی، جلد: ۹، ص: ۴۹]

حدیث شریف کی کتابوں میں معراج شریف کا واقعہ تفصیل کے ساتھ مروی ہے، اس میں سدرۃ المنتہیٰ کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ صاحب معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں، واقعہ معراج پوری تفصیل کے ساتھ سورۃ الاسراء میں گزر چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی ملاقات کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا، جسے میں دیکھتا ہوں کہ اس کے پھل اتنے بڑے بڑے ہیں جیسے کہ حجر بستی کے مشکیزے ہوتے ہیں، اور اس کے پتے اتنے بڑے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان۔ اس درخت کو سونے کے پتنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

دوسری روایت میں ہے کہ اسے ایسے اَلوان، یعنی رنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا جنہیں میں نہیں جانتا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب سدرۃ المنتہیٰ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان چیزوں نے ڈھانپ لیا جنہوں نے ڈھانپا تو وہ بدل گیا، یعنی اس کی پہلی حالت نہ رہی، اس میں بہت زیادہ حُسن آگیا، اس وقت اس کے حُسن کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے کوئی بھی اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ [صحیح مسلم ج:۱ ص:۹۳] چونکہ اس کے حُسن، اور سونے کے پتنگوں، اور اَلوان کے ڈھانپنے کی وجہ سے اس کی عجیب کیفیت ہورہی تھی، اس لئے فرمایا: ﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی﴾

جنّت المأویٰ کیا ہے؟

آیت کریمہ میں فرمایا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب جنت المأویٰ ہے۔ مأویٰ لغت میں ٹھکانہ پکڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں، یہاں اس جنّت الماویٰ سے کیا مراد ہے؟

علامہ قرطبیؒ نے اس کے بارے میں متعدد اقوال لکھے ہیں۔ حضرت حسنؒ سے نقل کیا ہے کہ اس سے وہ جنت مراد ہے جس میں متقی حضرات داخل ہوں گے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس جنّت میں شہداء کی ارواح پہنچتی ہیں۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ وہ جنّت ہے کہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام قیام پذیر تھے۔ ایک اور قول یہ بھی ہے کہ جنّت الماویٰ وہ ہے کہ اس میں تمام مؤمنین کی ارواح ٹھہرتی ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جنّت الماویٰ وہ ہے کہ جس میں حضرت جبرئیل ومیکائیل علیہما السلام ٹھکانہ پکڑتے ہیں۔ واللہ اعلم

اور سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ جنّت الماویٰ آٹھ جنّتوں میں سے ایک جنّت کا نام ہے، اور اس کا وقوع سدرۃ المنتہیٰ کے قریب ہے۔ هٰذَا مَا ظَهَرَ لِي وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشِقُوْنَ مَذَاهِب۔

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی ﴿۱۹﴾ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی ﴿۲۰﴾ اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی ﴿۲۱﴾ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی ﴿۲۲﴾ اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ

اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿۲۳﴾ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰهِ
الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ
اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾
وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾

ترجمہ: کیا تم نے لات اور عزّٰی، ﴿۱۹﴾ اور تیسرے منات کے بارے میں غور کیا ہے؟ ﴿۲۰﴾ کیا تمہارے
لئے مذکر ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے مؤنث ہے؟ ﴿۲۱﴾ یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے ﴿۲۲﴾ یہ تو بس کچھ نام ہیں جو تم نے اور
تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، صرف گمان کا اور نفسوں کی
خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں، اور بلاشبہ ان کے پاس ان کے ربّ کی طرف سے ہدایت آچکی ہے ﴿۲۳﴾ کیا انسان کو ہر وہ
چیز مل جاتی ہے جس کی وہ آرزو کرے؟ ﴿۲۴﴾ سو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے آخرت ہے، اور اولیٰ ہے ﴿۲۵﴾ اور بہت سے فرشتے
آسمانوں میں موجود ہیں، ان کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہ دے گی، مگر اس کے بعد کہ جس کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت
دے اور راضی ہوں ﴿۲۶﴾ بیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کے نام مؤنث کے نام پر رکھتے ہیں ﴿۲۷﴾
حالانکہ انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں، صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں، اور بلاشبہ حق کے بارے گمان ذرا بھی فائدہ نہیں
دیتا ﴿۲۸﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں مشرکین عرب کے معبودوں کا رد فرمایا۔ مشرکین عرب نے ملتِ ابراہیمی کو چھوڑ کر شیطان کے کہنے پر بت پرستی اختیار کی۔ قبیلہ بنی خزاعہ کا ایک سردار عمرو بن لحی خزاعی (لعنہ اللہ) نے ملک شام سے بتوں کی ایک کھیپ لا کر مکہ کے لوگوں میں متعارف کرائی، اور انہیں باور کرایا کہ ہمارے اصل معبود یہی ہیں، جن سے صدیوں تک ناواقف اور دور رہیں۔ عربوں میں پھر ان تین معبودانِ باطلہ کا سب سے زیادہ عروج ہوا۔ یعنی لات، منات، عزّٰی۔ آہستہ آہستہ تمام قبائل عرب میں بُت پرستی کا رواج عام ہوگیا۔

طائف کے قبیلہ ثقیف والے زیادہ تر لات کی پرستش کرتے تھے۔ مدینہ کے اوس اور خزرج اور غسانی قبائل منات کے پجاری تھے، جبکہ قریش اور بنی کنانہ عزّٰی کو معبود مانتے تھے۔ ان سب پر ھُبل نامی بت کو ایک خاص مقام

حاصل تھا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں بت جنہیں انہوں نے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم کیا، اور زندگی کے ہر مقصد کے لیے ایک الگ بُت نامزد کیا، چنانچہ انہی بتوں سے انہوں نے کعبۃ اللہ شریف کو بھر دیا، چنانچہ کعبہ شریف میں تین سو ساٹھ بتوں کو سجا سجا کر رکھ دیا۔ ان سب بتوں کو فتح مکہ کے روز جب کفر کا راج مکہ سے ختم ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاکؐ حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ اپنے مقدس گھر کو بتوں سے پاک کیا، اور ان کے ہاتھ مبارک سے ان سارے بتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اس فتح کی برکت سے یہ واضح ہے کہ قیامت تک حجاز میں شرک کا نام ونشان نہ رہے گا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى﴾ کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزّیٰ کو، اور تیسرے منات کو، جو دوسری طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے ان کو معبود خیال کیا ہے؟ جو کہ بہت غلط اور بے بنیاد تصور ہے، جس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے پروردگار! ﴿وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ [ابراھیم: ۳۵] (مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھ)۔ یہ بت بہت سی مخلوق کی گمراہی کا باعث بنے ہیں۔ مشرکین بتوں کی پوجا تو کرتے ہی تھے، لیکن بعض نے جعلی کعبے بھی بنا رکھے تھے، جن کا باقاعدہ طواف کرتے تھے۔

سیرت ابن ہشامؒ میں ہے کہ اس قسم کا ایک کعبہ قبیلہ بنی طے میں تھا، جب مکہ فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس کعبہ کے گرانے پر مامور کیا۔ اسی طرح یمن میں ذی الخلیصہ کے مقام پر بھی ایک کعبہ تھا، لوگ اس کا بھی طواف کرتے تھے، اس کو کعبہ یمانیہ کہا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کو قبیلہ احمس کے ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک جھتہ دے کر روانہ فرمایا کہ اس کو منہدم کرکے مجھے راحت پہنچاؤ، اور میرا غم دور کردو، کیونکہ جب میں سنتا ہوں کہ خانہ کعبہ کے مقابلے میں کسی نے مصنوعی کعبہ بنا رکھا ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت جریرؓ نے جا کر اس مصنوعی کعبہ کو جلا دیا۔ [رواہ البخاری]

سورۂ نوح میں اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کے پانچ معبودانِ باطلہ کا ذکر کیا، وہ بھی ایسے ہی نیک لوگ تھے، یعنی وَدّ، سُواع، یَغوث، یَعوق، اور نَسر۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچوں حضرت شیث علیہ السلام کے بیٹے تھے، اور بڑے نیک پارسا لوگ تھے۔ پوری تفصیل سورۂ نوح میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک اور نظریہ کا رد فرمایا ہے، جو وہ اللہ کے لئے اولاد کے بارے

میں عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور خود ان کا حال یہ تھا کہ بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ فرمایا: ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى﴾ کیا تمہارے لئے بیٹے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں؟

﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰى﴾ یہ کتنی کھوٹی اور غلط تقسیم ہے، جو تم نے ازخود کر رکھی ہے؟ کہ اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹی منسوب کرتے ہو۔

﴿اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ﴾ یہ تو محض نام ہی نام ہیں، جو تم اور تمہارے باپ دادوں نے خود بخود رکھ لئے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ جن لوگوں کے تصور پر تم نے یہ مجسمے بنا کر رکھے ہیں، ان کے پاس تو کوئی اختیار ہی نہیں ہے، جو تمہاری فریادرسی کر سکیں۔ جب وہ کسی چیز کے مالک نہیں، بہرے گونگے اور اندھے ہیں، پھر تمہاری مدد کیا کریں گے؟ فرمایا: ﴿مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے حق میں کوئی سند نہیں اتاری، جس کی بناء پر تم ان کو معبود سمجھ رہے ہو، یہ سراسر شرک اور بے بنیاد عقیدہ ہے، جس کا نتیجہ سوائے ابدی تباہی کے اور دائمی عذاب کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ:

﴿اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ﴾ یہ لوگ تو محض گمان کا اتباع کر رہے ہیں، اور خواہشات نفسانی پر چل رہے ہیں۔ ان کے ان معبودانِ باطلہ کی کوئی حقیقت نہیں، حقیقت یہ ہے: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ کہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے، اللہ تعالیٰ کا آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری آسمانی برحق کتاب قرآن حکیم لاکر ان کے سامنے اس کی ہدایت کو اور رشد و کامیابی کے اصولوں کو صبح و شام بیان کر رہے ہیں، اور ان کو سمجھا رہے ہیں کہ اس ہدایت کو قبول کر کے دائمی فلاح حاصل کرو، مگر وہ اپنے پرانے معبودوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اور ہدایت سے مسلسل اعراض کر رہے ہیں، جس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت تباہ کن ہوگا۔

﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى﴾ کیا یہ ضروری ہے کہ انسان کو وہی کچھ مل جائے جس کی وہ تمنا کرتا ہے؟ فرمایا: ہرگز نہیں۔ کسی دانشمند نے کیا خوب کہا:

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُه ★ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

ایسا ہرگز نہیں کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے اس کو وہی کچھ مل جائے، اور دستیاب ہو، کئی لوگوں کی تمناؤں نے انہیں قبر میں اتارا، مگر اس کی خواہشات اور مقاصد پورے نہیں ہوئے، اور دریائی کشتیوں کے لیے موافق ہوا ہر وقت میسر نہیں ہوتی۔

﴿فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى﴾ آخرت اور اس دنیا کا سارا اختیار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، اس نے یہ اختیار مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا، لہٰذا انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کریں۔

﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ﴾ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے ہیں، بلا شبہ اللہ کے بے شمار فرشتے ہیں، جن کے مختلف درجات ہیں، وہ مقرب ہونے کے باوجود اس حال میں ہیں:

﴿لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں دیتی، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس سفارش کی اجازت دیں، جس کے لئے چاہے، اور اس کو پسند بھی کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضاء کے بغیر کسی شخص کے حق میں سفارش قبول نہیں ہوتی، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو سفارش کی اجازت ہے۔ جب فرشتے مقدس اور پاکیزہ ہوتے ہوئے کسی کی سفارش نہیں کر سکتے تو ان مشرکین کے بے جان بُت تو کسی طرح ان کے لیے سفارش نہیں کر سکتے، اور نہ ہی ان میں سفارش کی استعداد ہے۔

بہرحال! فرمایا کہ آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں، جن کی سفارش کارگر نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے، اور وہ بھی اس شخص کے لیے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو، اور وہ شفاعت کا اہل ہو، تو ان کے معبودانِ باطلہ جو کہ بے جان، بہرے اور گونگے اور اندھے ہیں، جن میں شفاعت تو کیا ایک آدھ بات کرنے کی استعداد نہیں ہے، اور خود مشرکین وہ تو اس پوزیشن میں ہیں کہ بالفرض اگر ان کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام شفاعت کریں تو وہ بھی رد ہوگی۔ تفصیل سورۃ التوبۃ میں گزر چکی ہے۔ آگے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى﴾ بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کے عورتوں جیسے نام رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور ان کی مائیں جنات ہیں۔ فرمایا: یہ ایسی بے بنیاد اور فضول باتیں ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ فرمایا:

﴿وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ﴾ ان کو ان باتوں کا کچھ بھی علم نہیں، یہ لوگ حقیقت سے محروم ہیں۔

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾ یہ تو محض اٹکل اور گمان کا اتباع کر رہے ہیں۔ ﴿وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا﴾ اور گمان کی خاصیت یہ ہے کہ یہ حق کے مقابلے میں کچھ کارآمد نہیں ہوتا۔ اس لئے حدیث شریف میں

ارشاد مبارک ہے: إِيَاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ۔ اے لوگو! اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ، کیونکہ بدگمانی جھوٹی بات ہوتی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾

ترجمہ:۔ سو آپ اس کی طرف سے اعراض کیجئے جس نے ہماری نصیحت سے روگردانی کی، اور دنیاوی زندگی کے علاوہ اس نے کوئی مقصد نہیں بنایا ﴿۲۹﴾ یہ ان کے علم کی حد ہے، بیشک آپ کا ربّ اُسے خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکا، اور وہ اسے خوب جانتا ہے جس نے ہدایت پائی ﴿۳۰﴾ اور اللہ ہی کیلئے ہے جو آسمانوں میں ہے، اور جو زمین میں ہے، تاکہ وہ بدلہ دے بُرے عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کا، اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کی اچھائی کا بدلہ دے ﴿۳۱﴾ وہ لوگ ایسے ہیں جو بڑے گناہوں سے بچتے ہیں، مگر ہلکے گناہ، بیشک آپ کا ربّ بڑی وسیع مغفرت والا ہے، تو تمہیں خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا، اور جب تم ماؤں کے پیٹوں میں تھے، سو تم اپنی جانوں کو پاکباز نہ بتاؤ، وہ تقویٰ والوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مشرکین اور کفار کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ پس آپ ایسے شخص سے اعراض و بے رُخی کرلیجئے جس نے ہماری نصیحت سے رُوگردانی کرلی۔ ﴿وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ اور اس کا کوئی مقصد نہیں سوائے دنیوی زندگی کے۔ تو ظاہر ہے کہ جس کا مقصد اور ارادہ اپنی زندگی میں صرف دنیا اور دنیا کی زیب وزینت ہو، اور وہ آخرت کی کچھ بھی فکر نہیں رکھتا ہو، پس آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔

﴿ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ ان لوگوں کا مبلغ علم یہی ہے۔ یعنی ان کے علم کی رسائی صرف دنیا کے حصول تک محدود ہے، اور آخرت کی انہیں کچھ فکر نہیں۔ ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ بیشک تیرا پروردگار خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا۔ ﴿وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى﴾ اور وہ اس شخص کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جس نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا، اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے، اور وہ اچھے اور بُرے سب کو جانتا ہے، قیامت کے دن ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا، اس لئے:

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہیں، اور جو کچھ زمین میں، ہر چیز اس کی ملکیت اور تصرف میں ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى﴾ تا کہ اللہ تعالیٰ برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کے بُرے اعمال کا بدلہ دے، اور جنہوں نے نیکی کے کام کئے ہیں ان کو بہتر سے بہتر اچھائی کے ساتھ بدلہ دے، جیسے کہ شاعر نے کہا:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنّت بھی جہنم بھی ☆ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

آیت کریمہ کا بھی یہی مطلب ہے، جو ایمان کے بعد اچھے اعمال انجام دیتے ہیں تو وہ ابدی سعادت سے مالا مال ہوتے ہیں، اور جو لوگ بُرے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں ان کا انجام سوائے ذلّت وخواری کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ آگے نیک لوگوں کی ایک خاص صفت بیان کی گئی ہے، جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھے انعامات کے حقدار ہوں گے۔ فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں سے، اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، سوائے کوئی معمولی خطاء ونسیان کے۔ اس کو اصطلاحِ شریعت میں صغائر کہتے ہیں، اور صغیرہ گناہ کے لیے توبہ شرط نہیں ہے، بلکہ حسنات انجام دینے میں وہ خود بخود معاف ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بڑے بڑے گناہوں سے بچ جاتے ہیں، البتہ کچھ چھوٹی چھوٹی خطاؤں کی آلودگی رہ جاتی ہے، تو:

﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ﴾ بیشک تیرا پروردگار بہت وسیع مغفرت والا ہے، وہ صغیرہ گناہوں کو خود ہی معاف فرمائیں گے، کیونکہ: ﴿هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ﴾ وہ تمہارے حالات کو خوب جانتا ہے، جبکہ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے، اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں

بچے کے طور پر پرورش پارہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری زندگی کا کوئی گوشہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں، اگر تم بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچ جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری چھوٹی چھوٹی خطائیں معاف فرمادے گا، کیونکہ وہ بڑی وسیع مغفرت کا مالک ہے، وہ تمہاری اوّلین پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری لمحات (موت) تک تمام نشیب وفراز سے باخبر ہے، اور تو اور ہے وہ تمہارے دلوں کے راز اور بھیدوں سے بھی واقف ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ کے درمیان فرق:

پہلی تعبیر یہ ہے کہ ہر وہ گناہ جس کو شریعت نے کبیرہ کہا وہ کبیرہ ہوگا، اور اگر صغیرہ کہا تو صغیرہ شمار ہوگا۔

دوسری تعبیر یہ ہے کہ ہر وہ گناہ جو نیکیوں سے معاف ہو وہ صغیرہ کہلائے گا، اور وہ جس کے لیے توبہ شرط ہو وہ کبیرہ کہلائے گا۔

تیسری تعبیر یہ ہے کہ ہر وہ گناہ جس کے لئے شریعت نے کوئی سزا مقرر کی ہو وہ کبیرہ، اور جس کے لیے شریعت نے کوئی سزا مقرر نہ کی ہو وہ صغیرہ کہلائے گا۔ محدث ذہبیؒ نے کتاب الکبائر میں کبیرہ گناہوں کو ستر (۷۰) بتایا ہے۔ اس معاملے میں یہ کتاب مفید اور مستند ہے۔ آخر میں فرمایا:

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ اے لوگو! اپنا تزکیہ نہ کیا کرو، اپنے آپ کو پاکیزہ نہ کہو، اپنی پاکی اور بڑائی نہ بیان کرو، جب تمہاری تخلیق مٹی سے ہے، اور ناپاک چند قطروں سے ہے، تو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی بڑائی اور پاکیزگی بیان کیا کرو، بلکہ تمہاری شان یہ ہونی چاہئے کہ تواضع وانکساری کے ساتھ اپنی عاجزی بیان کرو۔ اور یہ یاد رکھو کہ محض اپنے آپ کو کم تر کہنا تواضع نہیں ہے، بلکہ اپنے آپ کو کم تر سمجھنا ہی تواضع ہے۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

خودستائی پیشۂ شیطان بود ☆ ہر کہ خود را کم زند مرد آن بود

﴿هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اس شخص کو جو تقویٰ اختیار کرتا ہے، یا تقویٰ والا ہے۔ اور متقی کی سب سے پہلی خاصیت یہی ہوتی ہے کہ وہ تواضع وانکساری اختیار کرتے ہیں، ان میں نام ونمود، اور خود بینی کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿٣٣﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿٣٤﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿٣٥﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ

صُحُفِ مُوْسٰی ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ﴿۴۸﴾

ترجمہ: اے مخاطب! کیا تو نے اسے دیکھا جس نے روگردانی کی؟ ﴿۳۳﴾ اور تھوڑا سا مال دیا، اور بند کر دیا؟ ﴿۳۴﴾ کیا اس کے پاس علم غیب ہے؟ کہ وہ دیکھ رہا ہے ﴿۳۵﴾ کیا اسے ان مضامین کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے؟ ﴿۳۶﴾ اور جو ابراہیم کے صحیفوں میں ہے، کہ جس نے پوری بجا آوری کر دی ﴿۳۷﴾ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا ﴿۳۸﴾ اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی جو کچھ اس نے کمایا ﴿۳۹﴾ اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھ لی جائے گی ﴿۴۰﴾ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ﴿۴۱﴾ اور یہ کہ تیرے ربّ کے پاس پہنچنا ہے ﴿۴۲﴾ اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا ہے اور رلاتا ہے ﴿۴۳﴾ اور یہ کہ وہی ہے جو موت دیتا ہے، اور زندگی دیتا ہے ﴿۴۴﴾ اور اسی نے جوڑے پیدا کئے، یعنی مذکر و مؤنث ﴿۴۵﴾ نطفے سے، جبکہ وہ ڈالا جاتا ہے ﴿۴۶﴾ اور یہ کہ اسی کے ذمہ ہے دوبارہ پیدا کرنا ﴿۴۷﴾ اور یہ کہ اسی نے غنی کیا، اور سرمایہ باقی رکھا ﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

تفسیر روح المعانی نے حضرت مجاہد تابعیؒ سے نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت سنی تو متأثر ہوا، اور اسلام کے قریب ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس کے اسلام کے قبول کرنے کی اُمید بندھ گئی۔ پھر اُسے مشرکین میں سے ایک شخص نے ملامت کی، اور کہا کہ کیا تو اپنے باپ دادوں کے دین سے ہٹ رہا ہے؟ اور تو سمجھتا ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین قبول نہ کیا تو موت کے بعد عذاب میں مبتلا ہوں گا؟ ایسا کرو، تو اپنے دین پر قائم رہو، تجھے جس عذاب کا ڈر ہے قیامت کے دن تیری طرف سے میں اسے برداشت کرلوں گا، مگر دیکھو، مفت میں نہیں، شرط یہ ہے کہ تو مجھے اتنا اتنا مال دیدے۔

ولید بدنصیب اس پر راضی ہوگیا، اور جو کچھ تھوڑا بہت اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرلیا تھا اس سے باز آگیا، اور جس شخص نے اس سے یہ بات کہی تھی اُسے کچھ مال دیدیا، ابھی اتنا مال نہیں دیا تھا جتنے مال کا معاہدہ ہوا تھا کہ اس پر

کنجوسی سوار ہوگئی، اور باقی مال جس کا وعدہ کیا تھا وہ روک لیا۔ اس پر ان آیتوں کا نزول ہوا۔ [مظہری، روح] فرمایا:

﴿أَفَرَءَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ﴾ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے رُوگردانی کی ہے؟ اس نے نہ تو اپنے اصل پر غور کیا، اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی، اور وہ آخرت سے غافل رہا۔ ﴿وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ﴾ اور بہت تھوڑا دیا، اور بڑا سخت نکلا۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کا یہ معنیٰ کرتے ہیں کہ وہ تھوڑا سا ایمان کی طرف مائل ہوا، مگر اس کا دل پھر سخت ہوگیا۔

﴿أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ﴾ کیا اس کے پاس غیب کی کوئی خبر ہے؟ جسے وہ دیکھ رہا ہے، اور اس کی بناء پر وہ سمجھتا ہے کہ اسے کفر وشرک کی سزا نہیں ملے گی۔ ﴿أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ﴾ کیا اس کو وہ خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے؟ ﴿وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ﴾ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی ہے، جنہوں نے اپنے قول کو پورا کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام و ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہیں، اور مشرکین مکہ اکثر و بیشتر اس قسم کے واقعات سے باخبر ہوتے تھے، خاص کر ولید بن مغیرہ جیسے لوگ جو تجارت کے سلسلے میں سالانہ گرمیوں میں ملک شام کا سفر کرتے تھے، اور وہاں اہل کتاب یہود ونصاریٰ سے ملتے جلتے، اور گزشتہ زمانے کے واقعات معلوم کرتے تھے، اور حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہ السلام کی صحیفوں میں یہ بات لکھی ہوتی ہے کہ:

﴿أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ کوئی بوجھ اٹھانے والا خواہ کتنا ہی بڑا پہلوان کیوں نہ ہو دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اسلام کی رغبت کرتا اور ولید کی طرح وہ ایمان کے قریب ہوتا، تو بڑے بڑے کافر ومشرک اس کو اسلام لانے سے منع کرتے، اور اسے کہتے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو، اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بقول اگر تم پر کوئی گناہ لازم آیا، تو قیامت کے روز اس کا بوجھ ہم اٹھالیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، تو فرمایا: یاد رکھو!

﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ اور نہیں ہے انسان کے لیے مگر وہی کچھ جو اس نے کوشش کی، اور کمایا، اس کو اس کی کوشش کا ثمرہ ملے گا، کسی دوسرے کا عمل اس کو کام نہ آئے گا۔

احادیث شریفہ میں بکثرت ایصالِ ثواب کی ترغیب آئی ہے، جس سے تخفیفِ عذاب، رفعِ عقاب، اور ترقی درجات کی صورتیں سب بیان ہو چکی ہیں۔ تقریباً یہ معاملہ تواتر تک پہنچا ہوا ہے۔ نیز شفاعت انبیاء علیہم السلام وصلحاء، شفاعت حفاظ وشہداء سے رفعِ عذاب اور نجات اور ترقی درجات کا وعدہ دیا گیا ہے، جس سے صاف نمایاں ہے کہ

آخرت میں دوسروں کی سعی وکوشش، دعاء اور صدقات بھی کارآمد ہوں گی، جبکہ اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ جس کا واضح نتیجہ یہ نکلا کہ آخرت میں کسی کے لیے غیر کا کوئی بھی عمل کارآمد نہ ہوگا۔ پس اس آیت اور روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے، اور وہ یہ کہ قرآن مجید تو نفعِ آخرت کو صرف اپنی ذاتی جدوجہد اور سعی میں منحصر بتلا رہا ہے، جس سے غیر کی سعی وکوشش کے نافع ہونے کی نفی ثابت ہو رہی ہے، اور احادیثِ مبارکہ غیر کی جدوجہد اور سعی کو نافع اور مؤثر بتلا رہی ہیں، جس میں نفع آخرت ذاتی جدوجہد میں منحصر نہیں رہتا، جو صراحۃً قرآن کا معارضہ ہے۔

اس کا عمدہ اور سب سے بہتر جواب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید کی آیت میں سعی ایمانی مراد ہے، اور احادیث میں جس نفع کا تذکرہ ہے اس کا تعلق اعمال سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں جو سعی کارآمد نہیں ہوسکتی وہ یہ ہے کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی اور کی ہو جائے، اور احادیث میں سعی مفید کا جو بیان ہے اس سے سعی عملی مراد ہے، جو ایک دوسرے کے کام آسکتی ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں رہا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان ابوطالب اور آزر کو نفع نہیں دے گا، اسی طرح نوح علیہ السلام کے ایمان سے ان کے بیٹے کو نفع نہ ہوگا۔

اور ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگر کوئی شخص نیک کام کرتے وقت نیت کرے کہ اللہ تعالیٰ اس نیکی کا ثواب فلاں شخص کو عطاء کر دے، تو پھر نیکی کا یہ عمل کرنے والا اس دوسرے شخص کا نائب بن گیا، تو اس طرح اس کی نیکی کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچ جائے گا، لیکن اگر نیکی کرتے وقت نیت نہیں کی تو پھر اس دوسرے شخص کو فائدہ نہیں ہوگا۔ صحیح حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین چیزوں کا فائدہ اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ ایک تو صدقہ جاریہ ہے، جسے خود مرنے والے نے جاری کیا ہے، جیسے تعمیرِ مسجد، اسپتال، مسافر خانہ، مدرسہ وغیرہ۔ دوسری چیز علمِ نافع ہے، جب تک اس کے جاری کردہ علم سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس جاری کرنے والے کو برابر ثواب ملتا رہے گا۔

دوسری تیسری صدی ہجری میں جن محدثین کرام نے احادیث کو کتابوں میں جمع کیا ہے، آج تک مسلسل ان احادیث کی کتابوں کا درس لاکھوں مدارس میں جاری ہے۔ یہی حال کتبِ تفسیر اور کتبِ فقہ کا بھی ہے، جن کا ثواب برابر ان علمائے کرام کو ملتا رہے گا۔ اسی طرح ان کے شاگردوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان کی تبلیغ وتعلیم کا ثواب ان کے

تمام اساتذہ کو، اوران کے مشائخ کو برابر ملتا رہے گا۔

تیسری چیز فرمایا: ﴿أَوْوَلَدٌصَالِحٌ يَدْعُوالَهُ﴾ میت کے لیے اس کی نیک اولاد کی دعائیں اور استغفار باعثِ رحمت ہیں، جن کا ثواب مرنے والے کو برابر ملتا رہے گا۔ کبھی کبھی پہاڑوں جتنا ثواب میت کو پہنچ جائے گا، وہ حیران ہوگا کہ اتنا ثواب میرے لئے کہاں سے آیا؟ پوچھنے پر فرشتے اس کو جواب دیں گے: یہ بڑا ذخیرہ تمہارے لئے تمہاری اولاد نے بھیجا ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نوافل اور زوائد میں، اور عام صدقات وخیرات میں ایصالِ ثواب درست ہے، اور یہی احناف کا مسلک ہے کہ اپنی نفلی عبادات، نفلی حج وعمرہ، قربانی، نماز وروزہ، صدقات وخیرات وغیرہ کا ثواب اگر دوسرے مسلمان کو ایصال ثواب کے طور پر دینا چاہے تو بالکل درست ہے۔ دعا کے ثواب کے بارے میں کسی کا کوئی بھی اختلاف نہیں، اور کوئی اس کا منکر نہیں۔ تلاوت قرآن مجید بھی نفلی عبادت میں شامل ہے۔ اس کا ثواب بھی میت کو پہنچتا ہے، اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى﴾ اور بیشک انسان کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ دنیا میں نیک وبد جو بھی عمل ہوگا قیامت کے دن وہ سامنے آئے گا، اور اس کا بدلہ نیکی کی صورت میں اچھائی، اور برائی کی صورت میں برائی کے طور پر مل جائے گا۔ ﴿ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى﴾ پھر اس شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ اور بے شک ہر ایک چیز کی انتہاء تیرے پروردگار کی طرف ہی ہے۔ اس دنیا کی زندگی کو پورا کرنے کے بعد ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں پہنچ کر حساب وکتاب کی منزل طے کرنا ہے، اور پھر اس کے مطابق ہر اچھے اور برے عمل کا بدلہ پانا ہے۔ ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى﴾ یہاں سے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا ذکر ہورہا ہے۔ فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ کی وہی ذات پاک ہے جو ہنساتا بھی ہے، اور رلاتا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم اور خوشی دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو خوشی نصیب کرتا ہے تو وہ ہنستا ہے، اور جب کسی پر غم وپریشانی مسلّط کرتا ہے تو وہ روتا ہے۔ تو ہنسانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے، اور رلانے والا بھی وہی ہے۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی: ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا﴾ اور بے شک وہ وہی ذات ہے جو موت طاری کرتا ہے، اور زندگی بخشتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ تیسری صفت یہ ارشاد فرمائی: ﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ اور بے شک وہ وہی ذات ہے جس نے جانداروں کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ یعنی نر اور مادہ،

بلکہ دنیا بھر کی چیزوں کو متضاد اور متقابل جوڑا جوڑا بنایا، جیسے سردی گرمی، غم اور خوشی، علم اور جہالت، مسلمان اور کافر، نیک اور بد، چھوٹا اور بڑا، دن اور رات، وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا: انسان کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا: ﴿مِنۡ نُّطۡفَةٍ اِذَا تُمۡنٰی﴾ ایک قطرۂ آب سے، جبکہ وہ ٹپکایا جاتا ہے۔ یہ قطرۂ آب مختلف مراحل سے گزر کر انسانی صورت میں ظاہر ہوجاتا ہے۔ دوران حمل نُو ماہ کے مختلف مراحل کی تفصیل متعدد مقامات میں گزر چکی ہے۔ فرمایا: جس اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں انسانی تخلیق ایک قطرۂ آب سے فرمائی تو:

﴿وَاَنَّ عَلَیۡهِ النَّشۡاَةَ الۡاُخۡرٰی﴾ تحقیق دوبارہ اٹھانا بھی اسی کے ذمہ ہے۔ جب قیامت کا دن آئے گا تو وہ سب کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔ تو پہلی اور دوسری پیدائش سب اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغۡنٰی وَاَقۡنٰی﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی چھٹی صفت ہے، کہ بے شک وہی ذات پاک ہے جس نے جس کو چاہا غنی بنادیا، اور جس کو چاہا محتاج بنادیا۔ مطلب یہ ہے کہ خالق بھی وہی ہے، رازق بھی، اور مالک بھی وہی ہے۔ وہ اپنی حکمت کی تحت جس کو چاہتا ہے غنی بنادیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے محتاج بنادیتا ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰی (۴۹) وَاَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَا الۡاُوۡلٰی (۵۰) وَثَمُوۡدَاۡ فَمَاۤ اَبۡقٰی (۵۱) وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّهُمۡ
كَانُوۡا هُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰی (۵۲) وَالۡمُؤۡتَفِكَةَ اَهۡوٰی (۵۳) فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰی (۵۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی (۵۵)
هٰذَا نَذِیۡرٌ مِّنَ النُّذُرِ الۡاُوۡلٰی (۵۶) اَزِفَتِ الۡاٰزِفَةُ (۵۷) لَیۡسَ لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۸) اَفَمِنۡ هٰذَا الۡحَدِیۡثِ
تَعۡجَبُوۡنَ (۵۹) وَتَضۡحَكُوۡنَ وَلَا تَبۡكُوۡنَ (۶۰) وَاَنۡتُمۡ سٰمِدُوۡنَ (۶۱) فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَاعۡبُدُوۡا (۶۲)

ترجمہ: اور یہ کہ وہ شعریٰ کا ربّ ہے (۴۹) اور یہ کہ اس نے عادِ اولیٰ کو ہلاک کیا (۵۰) اور ثمود کو بھی، سو باقی نہیں رکھا (۵۱) اور اس سے پہلے نوح کی قوم کو، بیشک یہ لوگ خوب بڑھ کر ظالم و سرکش تھے (۵۲) اور الٹی ہوئی بستیوں کو پھینک دیا (۵۳) سو ان بستیوں کو ڈھانپ لیا جس چیز نے ڈھانپا (۵۴) تو اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں میں شک کرتا رہے گا؟ (۵۵) یہ ایک ڈرانے والا ہے، پرانے ڈرانے والوں میں سے (۵۶) جلدی آنے والی قریب آپہنچی (۵۷) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کا ہٹانے والا نہیں (۵۸) کیا اس بات سے تعجب کرتے ہو؟ (۵۹) اور ہنستے ہو، اور روتے نہیں ہو؟ (۶۰) اور تم تکبر کرتے ہو (۶۱) سو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرو، اور اسی کی عبادت کرو (۶۲)

معارف ومنازل

شعریٰ بہت بڑا روشن ستارہ ہے، اس کا ایک نام جوزا بھی ہے۔ اس کو شعریٰ غمیسی بھی کہتے ہیں۔ اس ستارہ کو شعریٰ یمانیہ، اور شعریٰ نمانیہ کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ رومی، یونانی، عرب اور دوسری اقوام کے لوگ اس ستارے کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی بات کی تردید کے لیے فرمایا کہ جس ستارے کو تم اُلوہیت کا درجہ دے رہے ہو اس کا پروردگار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ ستارہ کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح اللہ کے حکم سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا ہے، اس میں اُلوہیت کہاں سے آ گئی؟

ماہرین فلکیات نے تحقیق کی ہے کہ یہ ستارہ سورج سے بیس ہزار گنا بڑا ہے۔ علامہ طنطاوی جوہریؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ ستارہ نظام شمسی سے باہر ہے، اس لئے دور ہونے کی وجہ سے سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے۔ شاید یہ زمین سے بارہ تیرہ کروڑ میل دور ہوگا، جبکہ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے واللہ اعلم۔ فرمایا:

﴿وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ۨ الْاُوْلٰى﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نے عادِ اولیٰ کو ہلاک کیا۔ ﴿وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ اَبْقٰى﴾ اور ثمود جو کہ عادِ ثانیہ ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے مکمل طور پر تباہ کیا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ﴾ اور ان سے پہلے قومِ نوح کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا۔ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى﴾ یہ لوگ بڑے ہی ظالم اور سرکش تھے۔ ان کے علاوہ: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى﴾ الٹی ہوئی بستی والے بھی ہلاک ہوئے۔

﴿فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى﴾ پس ڈھانپ لیا اس کو اس چیز نے جس نے ڈھانپ لیا۔ اس سے مراد قومِ لوط ہے۔ فرمایا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى﴾ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت میں شک کرو گے؟ اللہ تعالیٰ نے باغیوں اور مفسدوں کو ہلاک کیا، یہ بھی اسی کا انعام ہے کہ گندہ لوگوں سے زمین کو پاک کیا۔ ﴿هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى﴾ حضرت محمد ﷺ بھی ایک ڈرانے والا ہے، پرانے ڈرانے والوں میں سے۔ آپ ﷺ سارے نبیوں کے سرتاج اور خلاصہ ہیں، آپ ﷺ کی شریعت تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کی جامع ہے، اس کو مانو گے تو بچ جاؤ گے، قیامت کے عذاب سے نجات پاؤ گے، نہیں تو یاد رکھو:

﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ﴾ قریب آنے والی قریب آ گئی، یعنی قیامت۔ اب اللہ تعالیٰ کا آخری نبی ﷺ آچکا ہے، آپ کی تشریف آوری بھی علامات قیامت میں سے ہے، اب آپ ﷺ کے بعد قیامت ہی آنے والی ہے، اور وہ اتنا اٹل ہے کہ: ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کوئی کھول کر دکھانے والا نہیں ہے، اور

اس کو کوئی بھی رد کرنے والا نہیں ہے، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ﴾ وہی اس کو وقت مقرر پر ظاہر کرے گا۔

﴿أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ﴾ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ قیامت اچانک آجائے گی؟ سو خوب سنو، بلاشبہ ایسا ہی ہوگا۔ چونکہ تمہیں اس کا یقین نہیں ہے، لہٰذا: ﴿وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ﴾ تم ہنستے رہتے ہو، اور روتے نہیں۔ اگر تمہیں اس کی ہولنا کی کا ادراک ہوتا تو تم یقیناً رونے لگتے، اور اس کے لیے تیاری کرتے، مگر:

﴿وَأَنتُمْ سَامِدُونَ﴾ تم تو کھیل رہے ہو، تکبر اور سرکشی میں، اور انکارِ قیامت میں حد درجے کو پہنچے ہو۔ یعنی تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو، حق تو یہ ہے کہ توحید، رسالت اور قیامت اور جزاء عمل کا احساس کرتے ہوئے: ﴿فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا﴾ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ، اطاعت گزاری اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔

نماز کے سجدہ کے علاوہ اس آیت کی تلاوت اور سماعت پر سجدۂ تلاوت بھی واجب ہو جاتا ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ سب سے پہلی سورت ہے جس میں سجدۂ تلاوت کا حکم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حرم مکہ، یعنی مسجد میں تلاوت فرمائی، اور پھر آخر میں سجدہ کیا، اس کے ساتھ مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا، اور کافر بھی سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے، اور سب نے سجدہ ادا کیا۔ ایک بوڑھے اُمیہ بن خلف نے سجدہ نہ کیا، بلکہ زمین سے مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی پر لگائی، کہنے لگا: میرے لئے یہی کافی ہے۔ یہ شخص جنگ بدر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کفر کی حالت میں مارا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس وقت سب حاضرین کو ایک غاشیہ الٰہیہ نے گھیر لیا تھا، گویا ایک غیبی اور قہری تصرف سے طوعاً و کرہاً سب کو سربسجود ہونا پڑا۔

کتب تفسیر میں اس موقع پر ایک بے بنیاد قصہ نقل کیا گیا ہے جو کہ جمہور محدثینؒ کے اصول پر درجہ صحت کو تو کیا پہنچے، بلکہ موضوع اور اسرائیلیات کی فہرست میں شامل ہے، اور کسی صورت یہ نبوّت کی شان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ یہ کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت پڑھی: ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ﴾ تو کسی کافر شیطان نے آپ ﷺ کی آواز میں آواز ملا کر، آپ ﷺ ہی کے لب ولہجہ سے یہ الفاظ کہے ہوں گے، جوان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے، وہ یہ ہیں: تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ تو ظاہر ہے کہ نبی کی زبان پر شیطان کو ایسا تسلّط نہ حاصل ہو سکتا ہے، نہ اس کا کبھی امکان ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے تحفظ کا ذمہ خود ہی لے لیا ہے۔

سُورَةُ الْقَمَر

مکیۃ آیاتہا ۵۵ رکوعاتہا ۳

سورۂ قمر مکی ہے، اس میں پچپن (۵۵) آیتیں، اور تین (۳) رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ القمر ہے، جو اس سورت کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۵۴ ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۳۷ ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی دور میں نازل ہوئی، اس کے شروع میں معجزۂ شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں تین (۳) رکوع، ۵۵ آیات، ۳۴۸ کلمات، اور ۱۴۸۲ حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۃ النجم کے آخر میں قیامت کا ذکر تھا: ﴿اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ﴾ اس سورت کی ابتداء میں بھی قیامت کا ذکر ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ﴾ کہ وہ گھڑی قیامت کی قریب آنے والی ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

مشرکین کی شکایات وجوابات، سلوک الرسول ﷺ بالمعاندین، تسلیات خاتم الانبیاء ﷺ، تخویفات مشرکین، حضرت نوح علیہ السلام کی دعا، قومِ نوح اور دیگر کفار ومشرکین کے بُرے نتائج، ووعد ووعید، اور بدءِ خلق، تذکیراتِ ثلاثہ، وغیرہ کا بیان ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۞ وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۞ وَكَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا
اَهۡوَآءَهُمۡ وَكُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ۞ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنَ الۡاَنۡۢبَآءِ مَا فِيۡهِ مُزۡدَجَرٌ ۞ حِكۡمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ
النُّذُرُ ۞ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ ۘ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىۡءٍ نُّكُرٍ ۞ خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ
كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۞ مُّهۡطِعِيۡنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ ۞

ترجمہ: قیامت قریب آپہنچی، اور چاند شق ہوگیا ① اور یہ لوگ اگر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اعراض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوجانے والا ہے ② اورنہوں نے جھٹلایا، اور اپنی خواہشات کا اتباع کیا، اور ہر بات قرار پانے والی ہے ③ بلاشبہ ان کے پاس ایسی خبریں آئی ہیں جن میں باز آنے کے لیے عبرت ہے ④ یعنی اعلیٰ درجے کی حکمت ہے، سوڈرانے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ نہیں دے رہی ہیں ⑤ سو آپ ان سے اعراض کیجیے، جس دن بلانے والا ایسی چیز کی طرف بلائے گا جو ناگوار ہوگی ⑥ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، قبروں سے نکل رہے ہوں گے، جیسے ٹڈیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں ⑦ بلانے والے کی طرف دوڑتے ہوئے جارہے ہوں گے، کافر لوگ کہیں گے کہ یہ بڑا سخت دن ہے ⑧

معارف ومنازل

ہجرت سے پہلے نبی کریم ﷺ منیٰ میں تشریف فرما تھے، کفار کا مجمع تھا، انہوں نے آپ ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی، آپ ﷺ نے فرمایا: آسمان کی طرف دیکھو، اچانک چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا، ایک ٹکڑا ان

میں سے مغرب کی طرف اور دوسرا مشرق کی طرف چلا گیا، بیچ میں پہاڑ حائل تھا۔ جب سب نے خوب اچھی طرح یہ معجزہ دیکھ لیا، تو دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے، کفار کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چاند پر یا ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اس معجزہ کو شق القمر کہتے ہیں، اور یہ ایک نمونہ اور نشانی تھی قیامت کی کہ آگے سب کچھ یوں پھٹے گا۔

امام طحاویؒ، اور ابن کثیرؒ وغیرہ نے اس واقعہ کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے، اور کسی دلیل عقلی سے آج تک اس طرح کے واقعات محال ہونا ثابت نہیں کیا جاسکا، اور محض استبعاد کی بناء پر ایسی قطعی الثبوت چیزوں کو رد نہیں کیا جاسکتا، بلکہ استبعاد تو اعجاز کے لیے لازم ہے، روزمرہ کے معمولی واقعات کو معجزہ کون کہے گا؟

باقی یہ کہنا کہ شق القمر اگر واقع ہوا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا وجود کیوں نہیں ہے؟ تو یاد رکھو کہ یہ قصہ رات کا ہے، بعض ملکوں میں تو اختلاف مطالع کی وجہ سے اس وقت دن ہوگا، اور بعض جگہ آدھی رات ہوگی، لوگ عموماً سوتے ہوں گے، اور جہاں بیدار ہوں گے، اور کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوں گے عادۃً یہ ضروری نہیں کہ سب آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ زمین پر جو چاندنی پھیلی ہوگی، بشرطیکہ مطلع صاف ہو اس میں دو ٹکڑے ہو جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ پھر تھوڑی دیر کا قصہ تھا، جب اس کے دو ٹکڑے آپس میں مل گئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بارہا چاند گرہن ہوتا ہے، اور خاصہ ممتد رہتا ہے، لیکن لاکھوں انسانوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور اس زمانے میں آج کل کی طرح رصد وغیرہ اتنے وسیع و مکمل انتظامات اور تقاویم (جنتریاں) کی اشاعت بھی اس قدر نہ تھی۔ بہرحال! تاریخوں میں مذکور نہ ہونے سے کسی طرح اس کی تکذیب نہیں ہوسکتی۔ بایں ہمہ، تاریخ فرشتہ وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ہندوستان میں مہاراجہ مالیبار کے اسلام کا سبب اسی وقعہ کو لکھتے ہیں۔ [تفسیر عثمانی]

فرمایا: ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ قیامت قریب آگئی ہے، اور چاند پھٹ گیا ہے۔ بعض مفسرینؒ فرماتے ہیں: سَاعَة سے وہ وقت مراد ہے جب دنیا میں منکرین کو سزا ملتی ہے، جیسا کہ کفار مکہ کو بدر کے مقام پر سزا ملی۔ اور ساعۃ سے مراد قیامت کی گھڑی بھی ہوسکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے متعلق سوال کیا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی جوڑ کر فرمایا: أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ۔ میں اور قیامت اس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں جس طرح یہ دو انگلیاں تھوڑا آگے پیچھے ہیں، اس طرح میں اور قیامت آگے پیچھے ہیں۔ تو دنیا کی مجموعی عمر کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری قیامت کی علامات میں سے ہے۔ فرمایا کہ قیامت قریب آگئی ہے، اور چاند پھٹ گیا ہے، اور چاند کا پھٹ جانا بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق جب مشرکین نے یہ معجزہ اچھی طرح سے بار بار دیکھ لیا، اور یہ بھی دیکھا کہ دونوں ٹکڑے پھر سے مل گئے، اور چاند اپنی اصلی حالت پر آ گیا، اس کے باوجود متعصب اور سرکش مشرکین نے ایمان قبول نہ کیا، بلکہ اسے جادو کہہ کر رد کر دیا۔ ابوجہل ہٹ دھرم نے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص پہلے زمین پر جادو کرتا تھا، اب اس کا جادو آسمانی ستاروں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کے متعلق فرمایا:

﴿وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ﴾ اور اگر یہ لوگ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادو ہے، جو قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مالیبار ہندوستان کے آخری سرے میں ایک چھوٹی ریاست ہے، مکہ سے ہزاروں میل دور ہے۔ مالیبار کا مہاراجہ اپنے محل کی چھت پر سو رہا تھا، اچانک اسے شق القمر کا معجزہ نظر آ گیا۔ صبح اس نے تحقیقات شروع کیں کہ یہ کیا واقعہ ہے، اور کیسا عجیب واقعہ ہے، جہاں چاند دو ٹکڑے ہوتا ہے، اور چند لمحوں کے بعد دونوں مل جاتے ہیں۔ تین چار ماہ کے بعد اس کی تحقیقات کا مکمل نتیجہ معلوم ہوا کہ سرزمین عرب شہر مکہ میں ایک نبی سے وہاں کے لوگوں نے ایک اور معجزہ کا مطالبہ کیا تھا، انہوں نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا تھا، جس سے چاند دو ٹکڑے ہوا، اور پھر اس کے دونوں ٹکڑے مل گئے۔ مالیبار کے مہاراجہ نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ شیخ سعدی نے فرمایا:

ع دوران باخبر، نزدیکان بے بصر

یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک معجزہ کو دیکھ کر ہزاروں میل دور ایک پورا خاندان حلقہ بگوش اسلام ہوا، اور چند گز کے فاصلے پر رہنے والے ابوجہل اور اس کے ساتھی اسلام سے محروم رہے۔

﴿وَ کَذَّبُوۡا وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ﴾ قریش مکہ نے معجزہ شق القمر کو جادو کہہ کر جھٹلا دیا، اور اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ دراصل اپنی خواہشات کی پیروی کرنا شیطان ہی کا اتباع ہے، باقی رہی یہ بات کہ اگر قیامت برحق ہے تو پھر برپا کیوں نہیں ہو جاتی؟ اللہ تعالیٰ نے جواب میں اشاد فرمایا:

﴿وَ کُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ﴾ اور ہر کام اپنے وقت پر ٹھہرا ہوا ہے، کوئی بات قبل از وقت نہیں ہو سکتی۔ انفرادی یا اجتماعی کوئی بھی چیز ہو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وقت مقرر کیا، وقت سے پہلے کوئی بھی کام واقع نہیں ہو سکتا ہے۔

﴿وَلَقَدۡ جَآءَہُمۡ مِّنَ الۡاَنۡۢبَآءِ مَا فِیۡہِ مُزۡدَجَرٌ﴾ البتہ اور تحقیق ان کے پاس ایسی خبر آئی ہے کہ جس میں تنبیہ ہے۔ دراصل اگر یہ غور کریں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت ڈانٹ ہے۔ یعنی شق القمر جیسا کہ عجیب وغریب

واقعہ انسان کے لیے زجر وتنبیہ ہے کہ وہ کیسے قیامت کا انکار کرتا ہے۔ ﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ﴾ یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے عین مطابق ہے، جس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اس کے باوجود بات یہ ہے:

﴿فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾ ڈر سنانے والے کام نہیں دیتے، جن لوگوں کے دل سیاہ ہیں ان کی عقلوں پر پردہ پڑا ہے، اور وہ اندھے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ کے نبی کتنا ہی ڈرائیں ان پر اثر کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے آگے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ﴾ آپ ان سے اعراض فرمائیں، آپ ان کے انکار سے دل برداشتہ نہ ہوں، ہم نے ان کے لئے تباہی کا ایک دن مقرر کیا ہوا ہے۔ ﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ﴾ جس دن بلائے گا بلانے والا ایک ناگوار چیز کی طرف۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے، پکارنے والے حضرت اسرافیل علیہ السلام ہوں گے، لوگ اپنی قبروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے اس کی آواز کی طرف جائیں گے۔ اس وقت منکرین قیامت اور منکرین معجزات کی حالت یہ ہوگی:

﴿خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ﴾ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، ندامت کے مارے نظر اوپر نہیں کرسکیں گے۔ ان کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپک رہے ہوں گے، اور اوپر دیکھنے کی قوت سلب ہو جائے گی۔ ﴿يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ﴾ اپنی قبروں سے اس طرح نکلیں گے گویا کہ ٹڈی دل پھیلا ہوا ہے۔ سخت افراتفری کا عالم ہوگا، ان کے چہروں سے خوف وہراس اور ذلت وندامت کے آثار ظاہر ہوں گے۔

﴿مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ﴾ وہ غیر اختیاری طور پر دوڑنے والے ہوں گے پکارنے والے کی طرف، جدھر سے آواز آرہی ہوگی اُدھر دوڑتے ہوئے جائیں گے۔ آج اگر انکار کرتے ہیں تو انہیں انکار کرنے دو، اور انتظار کرو اس دن کا جب: ﴿يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ﴾ کافر کہیں گے: ہائے افسوس! آج تو بڑا سخت دن ہے، معلوم نہیں آج ہمارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔ مگر ہوگا وہی کچھ جو سابقہ اقوام کا حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی سزا دی، اور ہلاک کیا، اور پھر قیامت میں ابدی سزا اور ذلت کا سامنا کریں گے۔

❀ ❀ ❀

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ﴿٩﴾ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ ﴿١٠﴾

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾ وَ

حَمَلْنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰیَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا، سوانہوں نے ہمارے بندہ کو جھٹلایا، اور کہنے لگے کہ یہ دیوانہ ہیں، اور اسے جھڑک دیا گیا﴿۹﴾ سواس نے اپنے ربّ سے دعا کی کہ بیشک میں مغلوب ہوں، میری مدد فرمایئے﴿۱۰﴾ سو ہم نے آسمان کے دروازے خوب زیادہ برسنے والے پانی سے کھول دیئے﴿۱۱﴾ اور ہم نے زمین میں چشمے جاری کردیئے، پھر پانی اس کام کے لیے مل گیا جس کا فیصلہ کردیا گیا تھا﴿۱۲﴾ اور ہم نے نوح کو تختوں اور میخوں (یعنی کیلوں) والی کشتی پر سوار کردیا﴿۱۳﴾ جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی، یہ اس شخص کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا تھا جس کی ناقدری کی گئی﴿۱۴﴾ اور بلاشبہ ہم نے اس واقعہ کو عبرت بنا کر چھوڑ دیا، کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟﴿۱۵﴾ پھر کیسا ہوا میرا عذاب؟ اور میرا ڈرانا؟﴿۱۶﴾ اور البتہ یہ یقینی بات ہے کہ ہم نے قرآن کو حاصل کرنے کے لیے آسان کردیا، سو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟﴿۱۷﴾

معارف ومنازل

یہاں بطور عبرت کے سابقہ اقوام میں سے بعض قوموں کی سزا سطحی طور پر ذکر کی گئی، چنانچہ فرمایا:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ﴾ ان مشرکین عرب سے پہلے قوم نوح نے بھی جھٹلایا۔ ﴿فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا﴾ انہوں نے ہمارے بندے نوح کو جھٹلایا۔ ﴿وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ﴾ اور کہنے لگے: تم اللہ کے رسول نہیں، بلکہ دیوانے ہو (العیاذ باللہ) آپ کو جھڑک دیا گیا ہے، اور کہنے لگے: اگر تم اپنی تبلیغ سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کردیں گے۔ ﴿لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ﴾ [الشعراء: ۱۱۶] (ضرور بضرور تو سنگسار کیے جانے والوں میں سے ہوجائے گا)۔ جب نوح علیہ السلام اپنی قوم سے مایوس ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کی:

﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ پروردگار! میں عاجز آچکا ہوں، لہٰذا اب تو ہی میرا ان سے انتقام لے لیجیے، اور میری مدد فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی دعا قبول کی، فرمایا: ﴿فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ﴾ پھر ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے، زور سے برسنے والے پانی کے ساتھ۔ آسمان نے شدید موسلا دھار بارش شروع کردی، اس کے علاوہ: ﴿وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا﴾ اور زمین کے چشموں سے بھی پانی جاری

کر دیا۔ ﴿فَالْتَقَى الْمَآءُ﴾ ادھر آسمان سے پانی برسنے لگا، اُدھر زمین نے پانی اگلنا شروع کر دیا۔ پس آسمان وزمین کا پانی آپس میں مل گیا، ایک کام پر جو مقدر کیا جا چکا تھا۔ یعنی تقدیر کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ پوری قوم کو اس پانی میں غرق کر دیا جائے گا، چنانچہ پوری قوم تباہی کے کنارے پہنچ کر غرقاب ہوگئی، اور نوح علیہ السلام کا اپنا حال یہ رہا:

﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ اور ہم نے نوح علیہ السلام کو تختوں اور کیلوں والی کشتی پر سوار کرایا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ لکڑی کے تختے کیلوں کے ساتھ جوڑ کر ہی کشتی تیار کی گئی تھی۔ اس کشتی کی تیاری پر تین سو (۳۰۰) سال صرف ہوئے۔ اس کی لمبائی بارہ سو (۱۲۰۰) ذراع، چوڑائی چھ سو (۶۰۰) ذراع، اور اونچائی تیس (۳۰) ذراع تھی۔ اور اس کے تین طبقے تھے: ایک انسانوں کے لیے، ایک جانوروں کے لیے، اور ایک کھانے کے لیے۔

﴿تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا﴾ یہ کشتی ہمارے سامنے ہماری نگرانی میں پانی کی سطح پر تیرتی رہی۔ چنانچہ چھ ماہ تک مسلسل پانی پر چلتی رہی، اور چار مرتبہ کعبۃ اللہ کا طواف کیا۔ یہ بدلہ تھا اس چیز کا جس کی نا قدری کی گئی، یعنی خدا تعالیٰ کی وحدانیت، اور نبی کی رسالت، اور وقوع قیامت کے انکار کا نتیجہ تھا۔ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ البتہ تحقیق، ہم نے اس کشتی کو نشانِ عبرت بنا دیا، تا کہ لوگ اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ﴾ سو کیسا ہوا میرا عذاب اور ڈرانا؟

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، پس ہے کوئی خوش قسمت نصیحت حاصل کرنے والا؟

❁ ❁ ❁

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾
تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ
فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۲۴﴾
ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا
مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ
مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً

وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: جھٹلایا قوم عاد نے، سو کیسا ہوا میرا عذاب، اور میرا ڈرانا؟ ﴿۱۸﴾ بیشک ہم نے ان پر سخت ہوا بھیج دی، ایسے دن میں جو نحوست والا تھا، دیر تک رہنے والا تھا ﴿۱۹﴾ وہ ہوا لوگوں کو اکھاڑ کر پھینک رہی تھی، گویا کہ اکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے ہیں ﴿۲۰﴾ سو کیسا ہوا میرا عذاب، اور میرا ڈرانا؟ ﴿۲۱﴾ اور یہ بات یقینی ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، سو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۲۲﴾ قوم ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا ﴿۲۳﴾ سو انہوں نے کہا کہ کیا ہم ایسے انسان کا اتباع کریں جو ہم ہی میں سے ایک شخص ہے؟ بیشک اس صورت میں تو ہم بڑی گمراہی اور دیوانگی میں جا پڑیں گے ﴿۲۴﴾ کیا ہم سب کے درمیان سے اسی پر وحی نازل کی گئی؟ بلکہ بات یہ ہے کہ یہ بڑا جھوٹا ہے، شیخی باز ہے ﴿۲۵﴾ عنقریب کل کو جان لیں گے کہ کون ہے بڑا جھوٹا، شیخی باز ﴿۲۶﴾ بیشک ہم اونٹنی کو بھیجنے والے ہیں ان کی آزمائش کے لیے، سو آپ ان کو دیکھتے رہیے، اور صبر کیجئے ﴿۲۷﴾ اور آپ انہیں بتا دیں کہ بیشک پانی تقسیم ہے ان کے درمیان، ہر ایک اپنے پلانے کی باری پر حاضر ہوا کرے ﴿۲۸﴾ سو انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، سو اس نے حملہ کر دیا، اور کاٹ ڈالا ﴿۲۹﴾ سو کیسا ہوا میرا عذاب، اور میرا ڈرانا؟ ﴿۳۰﴾ بیشک ہم نے ان پر ایک چیخ بھیج دی، سو وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑ لگانے والے کا چورا ہو ﴿۳۱﴾ اور بلاشبہ یہ بات حق ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، سو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

قوم نوح کے بعد اللہ تعالیٰ نے اجمالاً قوم عاد کا حال بیان کیا ہے:

﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ﴾ قوم عاد نے اللہ تعالیٰ کے نبی ہود علیہ السلام کو جھٹلایا۔ ہود علیہ السلام نے چار سو سال تک اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کی، اور انہیں اللہ کا پیغام سنایا، مگر وہ لوگ کفر و شرک کے علاوہ کبر و غرور میں اتنے منہمک رہے کہ کوئی بھی فرد ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ یہ بڑے قد آور لوگ تھے، ان میں سے ہر ایک کا قد بیس پچیس فٹ کا ہوتا تھا۔ ان کا زمانہ قوم نوح سے دو ہزار چھ سو سال بعد ہے، اور یہ لوگ خالص عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر تند و تیز ہوا بھیج دی، جو سات راتیں آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی۔ تو فرمایا: کیسا ہوا میرا عذاب اور ڈرانا۔

﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ﴾ ہم نے ان پر تند وتیز ہوا بھیج دی، ایک نحوست والے دن میں۔ نحوست سے مراد یہ ہے کہ اس دن کی نحوست صرف نافرمانوں کے حق میں تھی، ورنہ اللہ تعالیٰ کے دنوں میں کوئی دن منحوس نہیں، سارے ایام اللہ کے ہیں۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کسی خاص وقت کو کسی قوم یا فرد کے لیے منحوس بتادے تو یہ الگ بات ہے۔ اس ہوا کی خاصیت یہ تھی:

﴿تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ﴾ جو لوگوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتی تھی، گویا کہ وہ اپنے قدو قامت کے لحاظ سے زمین پر پڑے رہے، جیسے کھجور کے اکھاڑے ہوئے تنے ہوں۔ کھجور سے اس لئے ان کو تشبیہ دی کہ یہ لوگ قد وقامت کے اعتبار سے کھجور کے درخت کی طرح لمبے تڑنگے تھے۔ ﴿فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ﴾ پس کیسا ہوا میرا عذاب، اور میرا ڈرانا۔ آگے پھر اسی جملے کو دہرایا ہے۔

﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ اور البتہ تحقیق، ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنادیا ہے، پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ یاد رہے کہ قرآن مجید کا پڑھنا، اُسے حفظ کرنا، اس کے مطالب کو سمجھنا، یہ تینوں باتیں دشوار ہیں، اور نہایت محنت کے بعد شاید کسی کو ان چیزوں پر عبور حاصل ہو۔ یہاں جو آسانی کا نام لیا وہ صرف نصیحت حاصل کرنے کے لیے کہ قرآن مجید سے نصیحت حاصل کرنا یہ بہت آسان ہے۔ قومِ عاد کے حال کو بیان کرنے کے بعد عادِ ثانی (قومِ ثمود) کا حال بیان فرمایا، ارشاد ہوتا ہے کہ:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ﴾ قومِ ثمود نے ڈرسنانے والوں، یعنی اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ دراصل ایک نبی کی تکذیب مستلزم ہے سارے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کو۔ یہ لوگ بھی عادِ اولیٰ کی طرح بڑے متکبر تھے۔ ﴿فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ﴾ کیا ہم اپنے میں سے ایک آدمی کا اتباع کریں؟ یہ بھی تو ہماری ہی برادری کا آدمی ہے، اس میں کونسی خوبی ہے جو ہمارے اوپر اس کی سیادت اور سرداری ہو؟ اگر ہم نے اس کی بات مان لی تو: ﴿اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ﴾ تو بیشک ہم گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے، لہٰذا ہم اس کی چال میں آنے کی حماقت نہیں کر سکتے، جن لوگوں نے اس پر ایمان لایا وہ دیوانہ اور گمراہ ہی ہیں، ہم لوگ اس دیوانگی اور گمراہی میں نہیں پڑنا چاہتے۔ پھر انہوں نے سرکشی کرتے ہوئے تعجب کی یہ بات کہی:

﴿ءَاُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا﴾ کیا ہمارے درمیان میں سے اس پر نصیحت ڈال دی گئی ہے؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور آدمی نہیں تھا جو نصیحت کا ذمہ دار بنتا؟ اس کے پاس نہ مال ہے، نہ دولت، نہ باغات، اور نہ یہ کسی جتھے

کا مالک ہے، تو یہ کیسی وحی ہے جس کا نزول ایک ایسے شخص پر ہوتا ہے جس کے پاس زندگی کے اسباب میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے مشرکین مکہ نے بھی دہرایا تھا۔ سورۃ الزخرف میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ [الزخرف:۳۱] (مشرکین مکہ کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کی دو بستیوں میں سے کسی بڑے سردار پر کیوں نہ نازل ہوا؟) کیا اللہ تعالیٰ کے پاس نبوت کے انتخاب کے لیے کوئی اور شخص حقدار نہ تھا، چنانچہ قوم ثمود نے کہا:

﴿بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ﴾ بلکہ یہ شخص تو جھوٹا اور اترانے والا ہے، غرور کرنے والا ہے، اسی نبوت کے بہانے وہ اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ﴾ یہ لوگ عنقریب کل ہی جان لیں گے کہ کون جھوٹا اور کون غرور کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غَدًا سے مراد بالکل اگلا دن نہیں، بلکہ اس کا مستقبل قریب ہے کہ چند دن کے بعد جب ہمارا عذاب ان پر مسلط ہوگا، اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ جھوٹا کون تھا، اور غرور کرنے والا کون تھا۔ جب ان کے چہرے بدل جائیں گے تب انہیں پتہ چلے گا کہ صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برحق نبی تھے، اور ہمارا مذہب باطل تھا، جس کے نتیجے میں ہم تباہ ہو رہے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ﴾ ہم ان کے پاس آزمائش کے لیے ایک اونٹنی کو بھیجنے والے ہیں۔ قوم نے خود صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ اس چٹان میں سے ہمارے سامنے ایک اونٹنی نکالو، جو ہمارے سامنے بچہ بھی جنے، پھر ہم آپ کی صداقت پر ایمان لائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مطالبہ تسلیم کیا، اور ان کے سامنے چٹان سے ایک غیر معمولی اونٹنی برآمد ہوئی، یہ بڑی قدآور اونٹنی تھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ میں نے اس اونٹنی کے بیٹھنے کی جگہ کی پیمائش کی تو یہ نوے فٹ مربع نکلی۔ فرمایا:

﴿فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ﴾ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں، اور صبر وتحمل سے کام لے لیں، ہم عنقریب انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ﴿وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ﴾ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا حل فرمایا، اور اپنے نبی کو وحی بھیجی کہ آپ ان کو بتا دیں کہ ان کے درمیان پانی تقسیم شدہ ہے۔ اس تقسیم کے مطابق ہر ایک کو اپنی باری پر پہنچنا چاہیے۔ پانی کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ ایک دن اکیلی اونٹنی پانی پیئے، اور دوسرے دن باقی سارے جانور سیراب ہوں۔ اس طرح پانی کی تقسیم اور لوگوں کی چون وچرا کا مسئلہ حل ہوگیا۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اس قوم میں ایک بدکار عورت تھی، جس کے بہت سے مال مویشی تھے،

جنہیں اس اونٹنی کی وجہ سے پانی پینے میں دقت کا سامنا تھا، چنانچہ اس عورت نے اس اونٹنی کے خاتمے کے لیے ایک فسادی شخص قدار ابن سالف کی خدمات حاصل کیں۔ یہ بدبخت آدمی اس عورت کے جھانسے میں آگیا، اس نے کچھ دوسرے آدمی ساتھ ملائے، اور اونٹنی کے قتل کا منصوبہ بنالیا۔ اس واقعہ کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ﴾ پس انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، پس اس نے ہاتھ اٹھالیا، اور تلوار سے اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب اونٹنی گر پڑی تو ان لوگوں نے تلواریں چلا کر اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بھاگ گیا اسی چٹان پر جا کر زور زور سے چیخیں ماریں، جہاں سے وہ اونٹنی برآمد ہوئی تھی، پھر اسی چٹان میں غائب ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے قوم کو تین دن کی مہلت دی، پہلے دن ان کے چہرے زرد پڑ گئے، دوسرے دن سب کے چہرے سرخ ہو گئے، تیسرے دن ان کے چہرے سیاہ ہو گئے، اور عذاب بھی آپہنچا، جس نے پوری قوم کو ملیامیٹ کر دیا۔ ایک طرف سے فرشتے نے ایسی چیخ ماری کہ سارے لوگوں کے جگر پھٹ گئے، اور نیچے سے زلزلہ بھی آیا، جس سے پوری قوم ہلاک ہوگئی۔ اسی کو فرمایا:

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً﴾ ہم نے ان پر ایک چیخ بھیجی۔ ﴿فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ وہ روندی ہوئی بھاڑ (گھاس) کی طرح ریزہ ریزہ ہوکر رہ گئے۔ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ اور ان تباہ شدہ اقوام کے انجام سے عبرت حاصل کرنے والا؟

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّآ آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ أَنذَرَهُم بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَن ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَآ أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدْ جَآءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٤٢﴾

ترجمہ: لوط کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا ۳۳ بیشک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی تیز ہوا بھیج دی، سوائے لوط کے گھر والوں کے، ہم نے انہیں آخری رات میں اپنے فضل سے نجات دیدی ۳۴ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اس شخص کو جو شکر ادا کرے ۳۵ اور لوط نے ان کو ہماری گرفت سے ڈرایا تھا، سو انہوں نے ڈرانے کی چیزوں میں جھگڑے بازی کی ۳۶ اور بیشک بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے لوط کے مہمانوں کو بُرے ارادہ سے لینا چاہا، سو ہم نے ان کی آنکھیں چوپٹ کردی، سو چکھو میرا عذاب، اور میرے ڈرانے کا نتیجہ ۳۷ اور یہ بات یقینی ہے کہ صبح سویرے ان پر ایسا عذاب آگیا جو برقرار رہنے والا تھا ۳۸ سو چکھو میرا عذاب اور میرے ڈرانے کا نتیجہ ۳۹ اور یہ بات یقینی ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، سو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟ ۴۰ اور یہ بات واقعی ہے کہ آل فرعون کے پاس ڈرانے کی چیزیں آئی تھیں ۴۱ انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا، سو ہم نے انہیں پکڑ لیا، زبردست صاحب قدرت کا پکڑنا ۴۲

معارف ومنازل

آگے چوتھے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔

فرمایا: ﴿كَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ﴾ قومِ لوط نے بھی ڈرسنانے والوں کو جھٹلایا۔ اللہ تعالیٰ کے نبی بہت بڑے عرصہ تک نافرمان قوم کو سمجھاتے رہے، مگر انہوں نے کوئی بات نہیں مانی، اس کے نتیجے میں فرمایا: ﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ﴾ ہم نے ان پر تُند و تیز آندھی بھیجی، جس میں پتھر شامل تھے۔ پتھروں پر ہر شخص کا نام لکھا ہوا تھا، اس طرح اللہ نے ساری نافرمان قوم کو سنگسار کر دیا، سوائے لوط علیہ السلام کے گھرانے کے کہ وہ اس ہلاکت سے بچ گئے۔ ان کی پانچ چھ بچیاں تھیں جو بچ گئیں، مگر نافرمان بیوی نہ بچ سکی۔

﴿نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ شَكَرَ﴾ ہم نے لوط کے گھرانے کو سحری کے وقت بچالیا، اور یہ بچاؤ ہماری طرف سے خاص مہربانی تھی، ہم شکر گزاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں کہ مصیبت کے وقت ان کو بچالیتے ہیں۔ آگے واقعہ کی تھوڑی تفصیل ہے۔ ﴿وَلَقَدۡ اَنۡذَرَهُمۡ بَطۡشَتَنَا فَتَمَارَوۡا بِالنُّذُرِ﴾ تحقیق ہم نے اس قوم کو اپنی گرفت سے ڈرایا کہ شرک سے باز آؤ، ورنہ تو تمہاری تباہی ہوگی، مگر وہ ڈرسنانے والوں کے ساتھ جھگڑا کرنے لگے، اور لوط علیہ السلام کو اپنی بستی سے نکال باہر کرنے کی دھمکی دی۔

﴿وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡهُ عَنۡ ضَيۡفِهٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡيُنَهُمۡ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِىۡ وَنُذُرِ﴾ اور البتہ تحقیق انہوں نے لوط کو ان کے مہمانوں سے پھسلانے کی کوشش کی۔یعنی ان کو اپنے اور مہمانوں کے درمیان حائل ہونے سے روکنا چاہا، تا کہ وہ اپنی قبیح خواہش کی تکمیل کرسکیں، مگر لوط علیہ السلام نے گھر کے دروازے بند کر لئے، تا کہ قوم ان کے مہمانوں کی بے حرمتی نہ کرسکیں۔ وہ مہانوں کو ابھی تک شناخت نہیں کر سکے تھے کہ یہ فرشتے ہیں، اور فرشتوں نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا تھا، مگر وہ لوگ گھر کی دیواریں پھلانگ کر اندر آ گئے۔لوط علیہ السلام اس پر اتنے پریشان ہوئے کہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ جب مہانوں نے لوط علیہ السلام کو اس پریشانی میں دیکھا تو اپنے آپ کو ظاہر کردیا، اور لوط علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم انسان نہیں، بلکہ فرشتے ہیں، یہ کبھی آپ تک رسائی حاصل نہیں کرسکیں گے، اور ہم ان پر عذاب نازل کرنے کے لیے آئے ہیں۔آپ پیچھے ہٹ جائیں ہم خود ان سے نپٹ لیں گے۔

چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا پَر ہلایا تو ان سب کی آنکھیں مٹ گئیں، اور سب کے سب اندھے ہو گئے، مگر پھر بھی اپنی بری حرکت سے باز آنے کی بجائے وہ ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر مہمانوں کو تلاش کرتے رہے۔

﴿فَذُوۡقُوۡا عَذَابِىۡ وَنُذُرِ﴾ پس چکھو میرا عذاب، اور میرا اڈرانا، چنانچہ فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر باقی گھر والوں کو رات کے پچھلے حصے میں لے کر بستی سے نکل جاؤ، اور پیچھے پلٹ کر نہ دیکھو، اس طرح آپ جب بستی سے دور نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر صبح کے وقت عذاب بھیجا۔

﴿وَلَقَدۡ صَبَّحَهُمۡ بُكۡرَةً عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ﴾ اور البتہ تحقیق صبح سویرے ان پر ایسا مستقل عذاب آیا جس سے ابدالآباد تک نہ نکل سکیں گے۔اسی لئے فرمایا: ان پر ہمیشہ کے لیے ٹھہر جانے والا عذاب نازل ہوا۔یہ دنیا کا عذاب، پھر برزخ کا عذاب، اور پھر آخرت کی سزاء۔پھر فرمایا: ﴿فَذُوۡقُوۡا عَذَابِىۡ وَنُذُرِ﴾ پس چکھو میرا عذاب، اور میرا اڈرانا۔یعنی جب تم نے ڈرانے والوں کا مذاق اڑایا، اور ان کی تکذیب کی، جس کا نتیجہ یہی ہوا کہ ابدالآباد تک سزاء میں مبتلاء ہو، تمہارا یہ عذاب آنے والوں کے لیے عبرت ہے۔﴿وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کردیا ہے، پس کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

پانچویں نمبر پر فرعون کی ہلاکت کا ذکر:

﴿وَلَقَدۡ جَآءَ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ النُّذُرُ﴾ اور البتہ تحقیق فرعون والوں کے پاس بھی آئے ڈر سنانے والے۔اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس آئے، انہوں نے آیات بینات

کے ساتھ فرعون اوراس کے حواریوں کو توحید کی دعوت دی، اور ساتھ میں بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا، مگر فرعونیوں نے تسلیم کرنے کی بجائے تکذیب کی، اور مقابلے پر اتر آئے۔فرمایا:

﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا﴾ انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا، اور موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہا، اوران کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہتے ہوئے مسترد کیا، پس نتیجہ یہ ہوا:﴿فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ ہم نے پکڑا ان کو ایک غالب اورزبردست ہستی کا پکڑنا۔تمام قوتوں کا سرچشمہ تو اللہ ہی ہے، اس کا پکڑنا اتنا سخت ہے جس سے کسی طرح نجات ممکن نہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو ایسا سخت پکڑا کہ ان کے پورے لشکر کو جو کہ ستر لاکھ (۷۰۰۰۰۰۰) نفوس پر مشتمل تھا بحر قلزم کی بے رحم موجوں کے سپرد کیا، اور سب غرق ہو گئے۔

❁ ❁ ❁

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝٤٣ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝٤٤
سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝٤٥ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝٤٦ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ
فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝٤٧ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝٤٨ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ
خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝٤٩ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝٥٠ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ
مُّدَّكِرٍ ۝٥١ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝٥٢ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝٥٣ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ
وَّنَهَرٍ ۝٥٤ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝٥٥

ترجمہ: کیا تمہارے کافر بہتر ہیں ان لوگوں سے؟ یا تمہارے لئے کتابوں میں کوئی معافی ہے؟ ۝٤٣ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہماری جماعت ہے جو غالب رہے گی؟ ۝٤٤ عنقریب جماعت شکست کھا جائے گی، اور پشت پھیر کر چل دیں گے ۝٤٥ بلکہ قیامت ان کا وعدہ ہے، اور قیامت بڑی سخت، اور بڑی کڑوی چیز ہے ۝٤٦ بلاشبہ مجرمین بڑی گمراہی اور بڑی بے عقلی میں ہیں ۝٤٧ جس دن وہ دوزخ میں چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے، چکھو لو دوزخ کا عذاب ۝٤٨ بے شک ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا ۝٤٩ اور ہمارا حکم پس یک بارگی ہوگا، جیسے آنکھوں کا جھپکنا ۝٥٠ اور یہ بات یقینی ہے کہ ہم نے تمہارے جیسے لوگوں کو ہلاک کیا، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟ ۝٥١ اور جو کچھ بھی ان لوگوں نے کیا ہے سب کتابوں میں ہے ۝٥٢ اور ہر چھوٹی بڑی چیز کتابوں میں لکھی ہوئی ہے ۝٥٣ بیشک پرہیزگار لوگ

باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے ﴿۵۴﴾ ایک عمدہ مقام میں، بادشاہ کے پاس، جو قدرت والا ہے ﴿۵۵﴾

معارف و منازل

تباہ شدہ اقوام کا حال ذکر کر کے اللہ تعالیٰ مشرکین مکہ اور دیگر اقوام کو خبردار فرما رہے ہیں کہ اگر تم لوگوں نے ہلاک شدہ اقوام کے نقشِ قدم پر چل کر ان کا اتباع کیا، تو تمہارا حشر بھی ان سے مختلف نہ ہوگا۔ فرمایا:

﴿اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ﴾ کیا تمہارے یہ موجودہ کافر سابقہ اقوام کے کافروں سے بہتر ہیں؟ وہ ہر چیز میں، مال و دولت میں، جسمانی طاقت میں، دیگر ساز و سامان میں تم سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے، پھر تم کس بناء پر اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھتے ہو؟ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات سب کے لیے برابر ہے، نافرمانوں پر جب عذاب آجائے گا تو ان کی قوت و طاقت، مال و دولت، جاہ و حشمت کا کوئی لحاظ نہیں ہوگا، تو پھر تم کس بات پر غرور کرتے ہو؟ اور سمجھتے ہو کہ ہم پر گرفت نہیں آئے گی؟

﴿اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ کیا پھر صحیفوں میں تمہیں بری قرار دیا گیا؟ کہ تم جو چاہو کرتے پھرو، کیا تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟ کہ گزشتہ صحیفوں میں تمہارے لئے نجات یا معافی یا کوئی استثناء لکھا گیا ہو کہ تم جو چاہو کرو، تم سے کوئی سوال و جواب نہ ہوگا؟ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ﴾ یا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم سب قوت والے، بدلہ لینے والے ہیں۔ یعنی ہم اتنے طاقتور ہیں کہ کوئی ہم سے بدلہ نہیں لے سکتا، بلکہ بدلہ لینے والے طاقتور صرف ہم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تکبر و غرور میں اتنے مست ہیں کہ یہ کسی دوسرے کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے، مگر ان کا یہ زعمِ باطل اور بے بنیاد ہے، کیا یہ لوگ قوم عاد سے بھی زیادہ طاقتور ہیں؟ جن کا ایک آدمی ان کے دو سو آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا تھا، جب وہ عذاب سے نہ بچ سکے تو یہ کون ہیں جو عذاب سے بچ سکیں گے؟

فرمایا: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ یاد رکھو، عنقریب ان کی جماعت کو شکست دی جائے گی، اور یہ پشت پھیر کر بھاگ نکلیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا، کفار مکہ کی جماعت کو بدر کے میدان میں شکست فاش ہوئی، نہتے بے سر و سامان غیر مسلح تین سو تیرہ کی جماعت نے اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ ان کے ایک ہزار کے مسلح لشکر کو وہ شکست فاش دی جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔ فرمایا: یہ دنیا کی سزاء اصلی سزاء، یعنی آخرت کے عذاب کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا، اصل سزاء تو ان کو آخرت میں ملنے والی ہے، وہ یہ:

﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوۡعِدُهُمۡ وَالسَّاعَةُ اَدۡهٰی وَاَمَرُّ﴾ بلکہ ان کے وعدے کا وقت قیامت ہے، اور یادرکھو، قیامت کی گھڑی بڑی ہولناک، تباہ کن اور کڑوی چیز ہے، اور تمہیں سزاء کا کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا، کیوں نہیں:

﴿اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ﴾ بیشک مجرم لوگ گمراہی اور جنون میں پڑے ہوئے ہیں، شیطان نے انہیں مغالطہ میں ڈال دیا کہ عیش کرو، آزاد رہو، قیامت نہیں آئے گی، بالفرض اگر آبھی جائے تو تم جس طرح اس دنیا میں عیش وعشرت اور آزادی میں ہو، وہاں بھی تمہارا یہی حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب ارشاد فرمایا: ہرگز ایسا نہیں ہوگا: ﴿یَوۡمَ یُسۡحَبُوۡنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ﴾ جس دن یہ لوگ دوزخ کی آگ پر چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے، تو فرشتے انہیں ڈانٹتے ہوئے یہ کہیں گے:

﴿ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ﴾ چکھو آگ کا مزہ۔ دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام سقر ہے۔ فرشتے انہیں کہیں گے: تم لوگ دنیا کی زندگی میں نشے میں تھے، آج تمہارا نشہ اتر جائے گا، دنیا میں تم لوگ اندھے، بہرے، گونگے تھے، آج تمہاری نگاہیں تیز ہوں گی، تمہارے کانوں کا پردہ اتر جائے گا، تمہاری منحوس زبانوں کا عُقدہ کھل جائے گا، کیونکہ ہم نے کائنات کی پیدائش سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، اور اسے حکم دیا: لکھو، قلم نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ فرمایا: مَاکَانَ وَمَایَکُوْنُ میں جو ہوگا وہ سب لکھو، اور اجتماعی وانفرادی ہر قسم کی تقدیر لکھو، مبرم لکھو، معلق لکھو، اور معلق کا علاج وتدبیر بھی لکھو۔ فرمایا:

﴿اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ بیشک ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ پر پیدا کیا ہے۔ یعنی ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے، جو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔ مخلوق کے وجود میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قریش مکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور تقدیر کے بارے میں جھگڑنے لگے، اس پر آیات نازل ہوئیں۔ [صحیح مسلم: ج ۲، ص ۳۳۶] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیروں کو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا، اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ عرش کا پانی پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عرش اور پانی کے درمیان کوئی چیز نہیں تھی۔ [مشکوۃ]

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز مقدر ہے، حتی کہ عاجز ہونا، اور عقلمند ہونا بھی مقدر ہے۔ [صحیح مسلم: ج ۲، ص ۳۳۲] پھر فرمایا:

﴿وَمَآ اَمۡرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ﴾ اور ہمارا امر یکبارگی ہو جائے گا، جیسا کہ آنکھ جھپک جاتی ہے۔ صاحب روح المعانی نے اس کے تین مطلب لکھے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ ہم جو کچھ کرنا چاہیں وہ محض فعل واحد کی طرح سے ہے، ہمیں کوئی مشقت لاحق نہیں ہوتی۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ ہم جو بھی کچھ وجود میں لانا چاہیں اس کے لیے کلمہ واحدہ ''کُنۡ'' ہی کافی ہے۔ یعنی جس چیز کو بھی وجود میں لانا ہو پلک جھپکنے کے برابر ذرا سے وقت میں اس کا وجود ہو جاتا ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا قائم ہونا آناً فآناً ایسے جلدی ہو جائے گا جتنی دیر میں آنکھ جھپکتی ہے۔ اگر یہ معنی مراد ہو تو سورۃ النحل کی آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡهُوَ اَقۡرَبُ﴾ [النحل:۷۷] (اور قیامت کا معاملہ بس آنکھ جھپکنے کی طرح ہے، یا اس سے بھی کم) کے مطابق ہوگا۔

﴿وَلَقَدۡ اَهۡلَكۡنَآ اَشۡيَاعَكُمۡ﴾ اور تم سے پہلے جو تمہاری طرح کے لوگ کفر اختیار کئے ہوتے تھے، ہم نے انہیں ہلاک کر دیا (جن کے واقعات تم خود بھی جانتے ہو) اگر تم بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلو گے تو تمہارا حشر بھی انہی کی طرح ہوگا۔ ﴿فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ﴾ سو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿وَكُلُّ شَيۡءٍ فَعَلُوۡهُ فِي الزُّبُرِ﴾ اور لوگوں نے جو بھی کام کئے وہ سب کتابوں میں درج ہیں، فرشتوں نے لکھ لئے ہیں، اعمال نامے میں محفوظ ہیں، کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میں نے جو اعمال کئے ہوا میں اڑ گئے، لاشئ بن گئے۔ ﴿وَكُلُّ صَغِيۡرٍ وَّكَبِيۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ﴾ اور ہر چھوٹا بڑا عمل لکھا ہوا ہے، تفصیل کے ساتھ لوح محفوظ میں موجود ہے۔

اس کے بعد متقین بندوں کی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا:

﴿اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ﴾ بیشک متقی لوگ باغیچوں اور نہروں میں ہوں گے۔ ان نہروں کا تذکرہ سورۃ محمد میں گزر چکا ہے۔ یعنی چار قسم کی نہریں، جن میں صاف پانی، دودھ، شراب اور شہد رواں دواں ہوگا۔

﴿فِيۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ﴾ سچائی کی جگہ میں ہوں گے۔ مقعد صدق جو فرمایا ہے جس کا ترجمہ سچائی کا مقام، اور عمدہ مقام کیا گیا، حقیقت میں یہ استعارہ ہے۔ لفظ صدق اقوال و اعمال اور عقائد کی سچائی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جو حضرات ان چیزوں میں سچے ہیں انہیں اپنی سچائی کی وجہ سے وہاں بلند مقام ملے گا، جہاں بہت زیادہ خوش ہوں گے، اس لئے اس کا نام مقعدِ صدق رکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی: ﴿عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ﴾ کہ یہ بندے عظیم القدرۃ بادشاہ کے جوار میں ہوں گے۔ یعنی ان کا مرتبہ بلند ہوگا، اللہ تعالیٰ شانہ مکان اور محلِ جہت سے پاک ہے۔ عِنۡدَ سے قرب رتبی مراد ہے۔

سُورَةُ الرَّحمٰن

مدنیۃٌ آیاتھا ۷۸ رکوعاتھا ۳

سورۂ رحمٰن مدنی ہے، اس میں اٹھتر (۷۸) آیتیں، اور تین (۳) رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:

اس سورۃ کا نام سورۃ الرحمٰن ہے، جو اس سورت کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں (۵۵) ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں (۹۷) ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

جمہور کے نزدیک یہ سورت مکی زندگی میں نازل ہوئی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور مقاتلؒ کہتے ہیں کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں تین رکوع، (۷۸) آیات، تین سو اکاون (۳۵۱) کلمات، اور (۱۶۸۳) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

ربط کے متعلق دو باتیں زیر غور رہیں: پہلی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو بہت زیادہ ہیں، مگر دو معجزے بہت بڑے، بلکہ تین معجزات ہیں: ایک معجزہ شق القمر ہے، اور دوسرا معجزہ قرآن حکیم، اور تیسرا معجزہ معراج ہے۔ سورۃ القمر میں معجزہ شق القمر کا ذکر تھا، اب سورۂ رحمٰن میں معجزۂ قرآن حکیم کا ذکر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پہلی

سورت میں نافرمانوں کی تباہی اور بربادی کا ذکر تھا، اس سورت میں نعمتوں کا ذکر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ پہلی سورت میں ترہیب تھی اور اس میں ترغیب ہے۔ [تفسیر کبیر]

مختصر موضوع:

خالقیتِ باری تعالیٰ، انعاماتِ باری تعالیٰ، تصرفاتِ باری تعالیٰ، ربوبیتِ باری تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کی عظمت، ماسوی اللہ کا عجز اور ناتوانی، بنی آدم کے فرائض، احوالِ قیامت، اللہ تعالیٰ کا عدل وانصاف، مجازاتِ اعمال، انسانوں اور جنات پر طرح طرح کی نعمتوں اور نوازشات کا بیان، جنّت کا دلچسپ اور روح افزاء نقشہ، وغیرہ اس سورت کا مختصر موضوع ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۪﴿۵﴾ وَّ
النَّجۡمُ وَ الشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَ السَّمَآءَ رَفَعَہَا وَ وَضَعَ الۡمِیۡزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ ﴿۸﴾ وَ اَقِیۡمُوا
الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَ لَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ﴿۹﴾ وَ الۡاَرۡضَ وَضَعَہَا لِلۡاَنَامِ ﴿ۙ۱۰﴾ فِیۡہَا فَاکِہَۃٌ ۪ۙ وَّ النَّخۡلُ
ذَاتُ الۡاَکۡمَامِ ﴿ۖ۱۱﴾ وَ الۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ وَ الرَّیۡحَانُ ﴿ۚ۱۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: رحمٰن نے ① قرآن کی تعلیم دی ② اس نے انسان کو پیدا کیا ③ اس کو بیان سکھایا ④ سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں ⑤ اور بے تنہ کے درخت اور تنہ آور فرمانبردار ہیں ⑥ اور اس نے آسمان کو بلند کیا، اور ترازو رکھ دی ⑦ کہ تم تولنے میں سرکشی نہ کرو ⑧ اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو، اور تول کو مت گھٹاؤ ⑨ اور اس نے زمین کو لوگوں کے واسطے رکھ دیا ⑩ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، جن پر غلاف ہوتا ہے ⑪ اور دانے ہیں بھوسے والے، اور غذا ہے ⑫ سوائے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ⑬

معارف ومنازل

اس سورت کا آغاز لفظ ﴿اَلرَّحۡمٰنُ﴾ سے ہو رہا ہے، اس سے ارشارہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم اور اس کا نزول

محض اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پیغام اور خوشخبری ہے کہ اس نے مشرق سے لے کر مغرب تک تاریکی میں ڈوبی ہوئی انسانیت کی کشتی، جو دریائے بے کنار میں غوطے کھا رہی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی رحمت سے قرآن کریم کو حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کر کے آفتابِ ہدایت کے ذریعے تاریک جہاں کو روشنی بخشی، اور اسے ہدایت کی تعلیم دی۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ﴾ کو مقدم ذکر کرنیکی یہی وجہ ہے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر اُمی ہونے کے کسی کے شاگرد نہیں رہے، بلکہ وہ صرف خاص رحمٰن جلّ شانہ کے شاگرد ہیں۔ قرآن پاک کا یہ اسلوب ہے کہ بعض سورتوں میں بعض جملوں کو بار بار دہرایا گیا ہے، جس سے سورت میں بیان کردہ مضمون کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۃ القمر میں بار بار یہ آیت تکرار کے ساتھ آئی ہے: ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ [القمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰] (اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنا دیا ہے، تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟)۔ اسی طرح سورۃ الشعراء میں ہے: ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ﴾ [الشعراء: ۹، ۶۸، ۱۰۴، ۱۲۲، ۱۴۰، ۱۵۹، ۱۷۵، ۱۹۱] (بیشک تمہارا ربّ زبردست ہے، رحمت والا ہے)۔

اور سورۃ المرسلات میں ہے: ﴿وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ﴾ [المرسلات: ۱۵، ۱۹، ۲۴، ۲۸، ۳۴، ۳۷، ۴۰، ۴۵، ۴۷، ۴۹] (اس دن ہلاکت ہے جھٹلانے والوں کے لیے)۔ اور سورۂ رحمٰن میں اکتیس (۳۱) مرتبہ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ یہ تکرار فصاحت و بلاغت کے عین مطابق ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے یہاں صرف الفاظ کا تکرار ہے، معانی مختلف ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے: "لِكُلِّ شَيْءٍ عُرُوسٌ وَعُرُوسُ الْقُرْاٰنِ سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ"۔ ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے، اور قرآن حکیم کی زینت سورۂ رحمٰن ہے۔ عُروس دلہن کو کہتے ہیں۔ آگے ارشاد فرمایا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ﴾ رحمٰن جل شانہ جو اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہیں، اسی مہربانی کی روشنی میں اس نے انسان کو قرآن سکھایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے سارے نبیوں کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطاء کیا ہے، لیکن مجھے جو خاص معجزہ عطا فرمایا گیا ہے، وہ "وَحْيٌ أَوْحَى اللّٰهُ إِلَيَّ"۔ وہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کے ذریعے نازل فرمایا، یعنی قرآن حکیم، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے، جو قیامت تک قائم رہے گا، اور خلق خدا کو ہدایت کے چشمے سے سیراب کرتا رہے گا۔ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات تو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے، مگر قرآن حکیم محض یہ نہیں کہ قیامت تک، بلکہ جنّت میں بھی باقی رہے گا۔

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ رحمٰن کی ذات وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا، اور اسے بولنا سکھایا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی عطاء فرمائی، یہ تمام مخلوقات میں انسان کی مابہ الامتیاز مخصوص صفت ہے۔ اگر یہ قوت گویائی نہ ہوتی تو انسان دیگر جانوروں کی طرح گونگا ہوتا، نہ مافی الضمیر بیان کرسکتا، نہ اپنی خوشی اور غمی اور تکلیف بیان کرسکتا، اور نہ اپنی ضروریات طلب کرسکتا۔ تمام علوم وفنون کا اظہار زبان کے ذریعہ سے ہی ہوتا ہے۔ اور عقل کے ساتھ یہی سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے بعد بعض آفاقی نعمتوں کا ذکر فرمایا:

﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ سورج اور چاند ایک مقرر کردہ حساب سے چل رہے ہیں۔ سورج اور چاند کا نظام قدرت کا ایک ایسا مربوط نظام ہے جس کے ساتھ دنیا کا وجود اور اس کی خوشحالی، اور اس کا نشیب وفراز سب مربوط ومنسلک ہے۔ دونوں کا طلوع وغروب، گھٹنا وبڑھنا، یا کچھ ایک حالت پر قائم رہنا، پھر ان کے ذریعہ فصول و مواسم کا بدلنا اور سفلیات پر مختلف طرح سے اثر ڈالنا، یہ سب کچھ ایک خاص حساب وضابطہ اور مضبوط نظام کے ماتحت ہے، مجال نہیں کہ وہ اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھ سکے، اور اپنے مالک وخالق کے دیئے ہوئے احکام سے روگردانی کرسکے۔ اس نے اپنے بندوں کی جو خدمات ان دونوں کے سپرد کردی ہیں، ان میں کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمہ وقت کائنات کی خدمت میں مشغول ہیں، انحراف ونافرمانی کے نام تک سے واقف نہیں۔

﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ﴾ اور پودے اور درخت سجدہ کررہے ہیں۔ رات دن اطاعت گزاری میں ایسے لگے ہوئے ہیں کہ اپنے مالک وخالق کا ہر حکم بجالاتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] (کوئی چیز ایسی نہیں جو ہر لحہ اس کی تسبیح وتحمید میں مشغول نہ ہو، مگر تم اس کی تسبیح وتحمید کو نہیں سمجھتے)، اور نہ ہی ان کے سجدے کو دیکھ پاتے۔ شجر نباتات کی وہ قسم ہے جس کا مضبوط تنا ہوتا ہے، پھر آگے اس کی شاخیں اور پتے وغیرہ ہوتے ہیں۔

نجم سے مراد وہ پودے یا جڑی بوٹیاں ہیں جن کا تنا نہیں ہوتا، یا تو پھر وہ زمین پر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، یا زمین سے کچھ اوپر نازک شاخوں کے ساتھ۔ فرمایا:

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ﴾ اور آسمان کو بلند اور اونچا کیا، اور رکھی ترازو۔ اوپر سے دو دو چیزوں کے جوڑے بیان ہوتے چلے آرہے تھے، یہاں بھی آسمان کی بلندی کے ساتھ آگے زمین کی پستی کا ذکر ہے۔ درمیان میں میزان (ترازو) کا ذکر شاید اس لئے ہوا کہ عموماً ترازو کو تولتے وقت آسمان وزمین کے درمیان معلق رکھنا پڑتا ہے۔

یہ اس تقدیر پر ہے کہ میزان سے مراد ظاہری اور حسّی ترازو ہو۔ چونکہ اس کے ساتھ بہت سے معاملات کی درستی اور حقوق کی حفاظت وابستہ تھی، اس لئے ہدایت فرمادی کہ وضعِ میزان کی یہ غرض جب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ نہ لیتے وقت زیادہ تولو، اور نہ دیتے وقت کم تولو۔ ترازو کے دونوں پلڑے باٹ بٹی میں کمی بیشی نہ ہو، نہ تولتے وقت ڈنڈے ماری جائز ہے، نہ وقت لیتے، بلکہ بنا کسی کمی بیشی کے دیانتداری کے ساتھ بالکل ٹھیک تولا جائے۔

اکثر سلف نے وضعِ میزان سے اس جگہ عدل کا قائم کرنا مراد لیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے زمین تک ہر چیز کو حق وانصاف کی بنیاد پر اعلیٰ درجے کے توازن وتناسب کے ساتھ قائم کیا ہے، اگر عدل وحق ملحوظ نہ رہے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا، اور یہ عالم بازیچہ اطفال کی شکل وصورت پیش کرے گا، لہٰذا ضروری ہے کہ سارے بندے حق وانصاف کے جادہ پر مستقیم اور سیدھے رہیں، اور عدل وانصاف کی ترازو کو اٹھنے یا جھکنے نہ دیں۔ نہ کسی پر زیادتی کریں، نہ کسی کا حق دبائیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ عدل ہی سے زمین وآسمان قائم ہیں۔

﴿اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ۝۸ وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ﴾ ترازو میں سرکشی اختیار نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو، اور تول میں کمی نہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں عدل وانصاف کو قائم رکھو۔ ﴿وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ﴾ اللہ تعالیٰ نے زمین کو مخلوق کے لیے بچھادیا ہے۔ زمین کے منافع وفوائد اتنے بے شمار اور زیادہ ہیں کہ وہ کسی ایک دفتر میں نہیں سما سکتے۔ اگر یہ فوائد اور منافع نہ ہوتے تو انسان کی زندگی اجیرن اور مہمل بن جاتی، اس کو کوئی خوشی، سکون اور آرام نصیب نہ ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے زمین میں اتنے منافع رکھ کر انسانوں پر بڑا احسان فرمایا، اور ان کو زندہ رہنے کا طور وطریقہ سکھایا۔ پھر فرمایا:

﴿فِیۡهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَكۡمَامِ﴾ ان بے شمار منافع میں سے چند منافع یہ ہیں کہ اسی زمین میں ہم نے پھل رکھے ہیں، جنہیں انسان کھاتے ہیں، کھجوریں بھی اس زمین سے پیدا ہوتی ہیں، جن کے پھل پر غلاف چڑھا ہوتا ہے، تاکہ پرندے اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں، اور گرد وغبار سے بھی محفوظ ہوں۔

﴿وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ﴾ اور بھوسا والے دانے بھی اسی زمین کی پیداوار ہیں۔ اناج کی مختلف قسموں کے دانے بھوسے کے اندر بند ہوتے ہیں۔ بھوسہ جانوروں کی خوراک بن جاتا ہے، اور خالص غلہ انسانوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ ﴿وَالرَّیۡحَانُ﴾ اور خوشبودار پودے بھی زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ریحان اگرچہ نازبو کا نام ہے، مگر یہاں ہر خوشبودار پودے مراد ہیں۔

اس تمام علوی اور سفلی انعامات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کی انواع سے خطاب کر کے فرمایا: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ یعنی اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اوپر کی آیات میں تمہارے ربّ کی جو عظیم الشان نعمتیں، اور قدرت کی نشانیاں بیان کی گئیں تم ان میں سے کس کس کو جھٹلانے کی جرأت کرو گے؟ کیا یہ نعمتیں اور نشانیاں کچھ ایسی ہیں کہ جن میں سے کسی کا انکار ممکن ہو؟ ہرگز نہیں۔ ایک حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص یہ آیت: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ سنے تو یوں جواب دے: "لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ"۔ اے ہمارے ربّ! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، سب حمد وثناء تیرے ہی لئے ہے۔

....

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾
مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾
يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ
فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے، جو ٹھیکرے کی طرح سے تھی ﴿۱۴﴾ اور پیدا کیا جنّات کو شعلہ مارتی ہوئی خالص آگ سے ﴿۱۵﴾ سوائے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۶﴾ وہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا ربّ ہے ﴿۱۷﴾ سوائے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۸﴾ اس نے دونوں سمندروں کو ملا دیا ﴿۱۹﴾ ان کے درمیان آڑ ہے، وہ دونوں بغاوت نہیں کرتے ﴿۲۰﴾ سوائے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۱﴾ ان دونوں میں سے لؤلؤ اور مرجان نکلتے ہیں ﴿۲۲﴾ سوائے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۳﴾ اور اسی کے لیے کشتیاں ہیں، جو بلند کی ہوئیں ہیں سمندر میں پہاڑوں کی طرح ﴿۲۴﴾ سوائے جن وانس! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۵﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

یہاں انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ یعنی ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام جو سب سے پہلے انسان ہیں اور سب انسانوں کے باپ ہیں، ان کا پتلا مٹی سے بنایا۔ مٹی میں پانی ملا دیا گیا، تو وہ ﴿طِیْن﴾ یعنی کیچڑ بن گئی، پھر اس سے پتلا بنایا گیا، جب وہ سوکھ گیا، تو ﴿صَلْصَال﴾ ہو گیا، جیسے ﴿فخّار﴾ ہوتا ہے۔ فَخّار اس چیز کو کہتے ہیں جو کیچڑ والی مٹی سے بنائی گئی ہو، جب وہ سوکھ جائے اور آگ پر پکائی جائے تو اس میں انگلی مارنے سے آواز نکلتی ہے، اسی آواز دینے والی مٹی کو ﴿صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل سورۃ الحجر کے تیسرے رکوع میں گزر چکی ہے۔ انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں، ایسے ہی جنّات کا سب سے پہلا باپ ابوالجن، یعنی جنّات کا باپ ہے۔ اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ تمام جنّات کا باپ ابلیس ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکاری ہوا۔ واللہ اعلم

البتہ اتنا تو یقینی ہے کہ انسانوں کی پیدائش مٹی سے ہے، اور جنّات کی پیدائش آگ سے ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی آواز دینے والی مٹی سے پیدا کیا، جو ٹھیکری کی طرح تھی۔ سورۂ صٰفّٰت میں فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ [الصّٰفّٰت: ۱۱] (ہم نے نسلِ انسانی کو چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا)۔

﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ اور جنّات کو اللہ تعالیٰ نے شعلہ مارنے والی آگ سے پیدا کیا، جس میں دھواں نہیں ہوتا۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نورانی مادہ سے پیدا فرمایا۔ پس واضح ہوا کہ انسانوں کی پیدائش مٹی سے، فرشتوں کی پیدائش نور سے، اور جنّات کی پیدائش آگ سے ہے۔ اور باقی مخلوقات، جانور، چرند پرند، کیڑے مکوڑے قرآن مجید اور کسی حدیث میں ان کی پیدائش کا مادہ بیان نہیں ہوا، پس ان کی پیدائش امرِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، بغیر کسی مادہ کے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو دو مشرقوں اور دو مغربوں کا ربّ ہے۔ قرآن حکیم میں مشرق اور مغرب کے لیے واحد، تثنیہ اور جمع تینوں صیغے مستعمل ہیں، یہاں تثنیہ کا صیغہ ہے۔ سورۃ المزمل میں واحد کا صیغہ ہے، اور سورۃ المعارج میں جمع کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موسمِ سرما اور موسمِ گرما میں طلوع وغروب کے

مختلف مقامات ہوتے ہیں، سورج ہر روز نئی جگہ سے طلوع کرتا ہے، اور نئی جگہ میں غروب ہوتا ہے۔ نظامِ شمسی کے مطابق سورج کی بارہ منزلیں، یا بارہ بروج ہیں، اور سورج سال بھر میں اِن بارہ منازل میں چلتا ہے، تو اس لحاظ سے کئی مشرق اور کئی مغرب ہوئے۔ مگر مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق اور مغرب کا پروردگار ہے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ﴾ اس نے دو دریا اکٹھے اور متوازی چلا دیئے ہیں، جو آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ﴾ ان کے درمیان ایک ایسا پردہ ہے کہ ان کا پانی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتا۔ ایک دریا کا پانی میٹھا ہے، اور دوسرے کا کڑوا ہے، مگر ایک کے پانی کا اثر دوسرے پانی پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ اگر کسی کو ان دونوں دریاؤں کو دیکھنا نصیب نہ ہو تو اپنے جانور، یعنی گائے میں دیکھے کہ اس کے بدن میں اور رگوں میں دودھ اور خون دو متضاد چیزیں بیک وقت جاری ہیں، جن کا آپس میں کبھی اختلاط نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک عظیم نشانی ہے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کسی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

اب ان دریاؤں کے فوائد کا بیان ہے۔ فرمایا: ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔ (لؤلؤ اور مرجان) لؤلؤ یعنی موتی۔ یہ تو ایک مشہور و معروف چیز ہے۔ مرجان کی نسبت کہا گیا ہے کہ چھوٹے موتی کو کہتے ہیں، اور کہا گیا ہے کہ بہت بڑے موتی کو کہتے ہیں، اور کہا گیا ہے کہ بہترین اور عمدہ موتی کو مرجان کہتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں سرخ رنگ کے جواہر کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں سرخ رنگ کے مہرے کا نام ہے۔ قرآن کریم کے دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا﴾ [فاطر: ۱۲] (یعنی تم ہر ایک میں سے نکلا ہوا گوشت کھاتے ہو، جو تازہ ہوتا ہے، اور پہننے کے زیور نکالتے ہو)۔

تو خیر مچھلی تو کھارے اور میٹھے دونوں پانی سے نکلتی ہے، اور موتی، مونگے صرف کھارے پانی میں سے نکلتے ہیں، میٹھے میں سے نہیں نکلتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آسمان کا جو قطرہ سمندر کی سیپ کے منہ میں سیدھا جاتا ہے وہ لؤلؤ بن جاتا ہے، اور جب یہ قطرہ صدف میں نہیں جاتا تو اس سے عنبر پیدا ہوتا ہے۔ بارش برسنے کے وقت سیپ اپنا منہ کھول دیتی ہے، تب یہ قطرہ اس میں گرتا اور لؤلؤ بن جاتا ہے۔ [ابن کثیر]

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ﴾ کہ سمندر میں چلنے والے بڑے بڑے بادبانوں والے جہاز، جو دور سے نظر آتے ہیں، اور پہاڑوں کی طرح کھڑے دکھائی دیتے ہیں، یہ بھی تو اس اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اور اسی کے حکم کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ يَسْـَٔلُهٗ
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ
اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾
يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

ترجمہ:۔ جو کچھ بھی زمین پر ہے سب فناء ہونے والا ہے ﴿۲۶﴾ اور آپ کے رب کی ذات باقی رہے گی، جو جلال اور اکرام والا ہے ﴿۲۷﴾ سوائے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۸﴾ اس سے سوال کرتے ہیں جو آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں، ہر دن وہ ایک شان میں ہے ﴿۲۹﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۰﴾ اے دونوں جماعتو! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہوں گے ﴿۳۱﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۲﴾ اے جماعت جنّات کی، اور انسانوں کی! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل سکو تو نکل جاؤ، تم بغیر قوت کے نہیں نکل سکتے ﴿۳۳﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۴﴾ تم دونوں پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا، سو تم اسے نہ ہٹا سکو گے ﴿۳۵﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۶﴾

معارف ومنازل

اب ان آیات میں مزید اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے ضمن میں جزائے عمل کا بیان ہورہا ہے۔ فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ

عَلَيْهَا فَانٍ﴾ جو کچھ بھی زمین پر ہے وہ سب فناء ہونے والا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب زمین پر بسنے والی مخلوقات میں سے کوئی باقی نہیں رہے گی۔ البتہ: ﴿وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ باقی رہنے والی صرف تیرے پروردگار کی ذات ہے، جو بزرگی اور عظمت والی ذات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مخلوقات اور کائنات کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے، ان میں سے کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں، سوائے اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے، کہ وہی باقی رہنے والا ہے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اسی سے مانگتا ہے جو کوئی ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق خواہ ارضی ہو یا سماوی ہو، سب اسی کے محتاج ہیں اور اسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں، اور اسی کے سامنے اپنی حاجات پیش کرتے ہیں۔ جب سارے انبیاء کرام علیہم السلام اسی سے مانگتے ہیں، اور اسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں، تو باقی مخلوقات کا کیا کہنا؟ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مافوق الاسباب چیزوں میں انبیاء کرام علیہم السلام، اولیاء وصلحاء سے کچھ مانگتے ہیں، یہ سراسر شرک اور حرام ہے، اور ایسے لوگ مشرک ہیں۔

انسان اپنی زبان اور قوت گویائی سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے، اور باقی مخلوقات زبان حال سے۔ فرمایا: آسمان وزمین کی ہر چیز اسی سے مانگتی ہے، کیونکہ وہی مالک الملک والملکوت ہے، اور وہ:

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ وہ ہر دن ایک شان اور حالت میں ہوتا ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق ہر لمحہ اور ہر وقت ایک ہی شان کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی کو زندہ کرتا ہے، تو کسی کو موت دیتا ہے، کسی کے لیے جنّت کا حکم دیتا ہے، کسی کیلئے دوزخ کا، کسی کو صحت عطاء کرتا ہے، کسی کو بیمار کرتا ہے، کسی کو بلندی عطاء کرتا ہے، کسی کو پستی دیتا ہے، کسی کو ہنساتا ہے، اور کسی کو رُلاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ اس کی ہر شان میں اس کی صفات کا کمال ظہور ہوتا ہے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

اور فرمایا: ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ﴾ عنقریب ہم تمہارے لئے فارغ ہوں گے، اے دو بھاری قافلو! ان دو قافلوں سے مراد ایک جنّوں کا گروہ ہے، اور دوسرا انسانوں کا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عنقریب تمہارے حساب وکتاب کے لیے متوجہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں صرف ونحو اور تفسیر کے مشہور امام زجاج فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں فراغت دو معنی میں آتا ہے: ایک فراغت تو عام ہے کہ کوئی شخص کسی کام میں مصروف ہو، اور جب اس کو ختم کرلیتا ہے تو فارغ ہوجاتا ہے۔ اور فراغت کا دوسرا معنی کسی کام کا قصد کرنا، یا اس کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اس مقام پر یہی معنی مراد ہے،

اور جملہ کا معنی یہ بنتا ہے کہ اے انسانو اور جنّات! ہم عنقریب تمہارے لئے قصد کریں گے، اور تمہارے حساب و کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے، کیونکہ انسان اور جنّات دونوں مکلف ہیں، اور ہر مکلف کے لیے جزاء وسزا جو مقرر ہے، قیامت آنے پر اللہ تعالیٰ اسی طرف متوجہ ہوں گے، اور انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اس لئے کہ یہ بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا جو کہ دار العمل ہے، بلکہ قیامت میں حساب و کتاب کی منزل کے بعد ہر گروہ کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ تم دونوں گروہ اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ آگے پھر دونوں گروہوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا﴾ اے جنّوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم اس بات کی طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو بھاگ نکلو۔ اللہ تعالیٰ نے چیلنج کیا ہے کہ تم دونوں میری نافرمانی کر کے میری گرفت سے بچ نہیں سکتے، میری بادشاہت اور سلطنت تو آسمانوں اور زمین میں ہے، اگر تم میں ہمت ہے تو میری سلطنت سے بھاگ کر دکھاؤ، تاکہ تم گرفت سے بچ سکو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا:

﴿لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ تم دونوں یاد رکھو کہ تم نہیں بھاگ سکتے، مگر غلبے کے ساتھ۔ سلطان کا معنی سند، دلیل، یا غلبہ۔ اور یہ غلبہ تمہارے پاس موجود نہیں، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے قبضے اور تصرف سے نکل نہیں سکتے، اور یہ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اس کو کوئی غلبہ اور قدرت حاصل ہو، کیونکہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کا حکم محیط ہے۔ اس کے احاطۂ حکم سے نکل کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی، اور جہاں جاؤ اسی کی بادشاہی میں رہو گے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ﴾ تم دونوں پر آگ اور دھویں کے شعلے پھینکے جائیں گے۔ یعنی اگر کوئی جن یا انسان اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بھاگ کر بچنا چاہے گا، تو اس پر آگ اور دھواں پھینکا جائے گا، جس کی وجہ سے کوئی مجرم بھاگ ہی نہیں سکے گا۔ سورۂ صٰفّٰت میں اللہ تعالیٰ نے شیاطین کے متعلق فرمایا ہے کہ ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا، اور ہر سرکش شیطان سے اس کی حفاظت کی ہے، تاکہ یہ شیاطین اوپر چڑھ کر ملاءِ اعلیٰ کی بات نہ سن سکیں۔ ﴿وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا﴾ [الصّٰفّٰت: ۹] (اور ہر طرف سے ان پر انگارے پھینکے جاتے ہیں)۔ یہاں بھی یہی فرمایا کہ جنّوں اور انسانوں میں سے اگر کوئی بھاگنا چاہے گا تو ان پر

آگ اور دھواں چھوڑا جائے گا۔ پس تم دونوں کسی بھی صورت بدلہ نہیں لے سکو گے۔ وہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ سے بدلہ لے؟ اس کا تو امکان تک نہیں۔ وہی قادر مطلق سب سے بدلہ لینے والا ہے، اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے حکم کے نیچے محبوس اور مجبور ہے۔ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۳۷ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۳۸ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ
عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ۳۹ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۴۰ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ
بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۴۱ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۴۲ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۴۳
يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۴۴ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۴۵

ترجمہ: پھر جب آسمان پھٹ جائے گا، سو ایسا ہو جائے گا جیسے سرخ چمڑا ہو ۳۷ سوائے انس وجن! تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ۳۸ سو اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا ۳۹ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ۴۰ مجرم لوگ اپنی نشانی کے ذریعہ پہچانے جائیں گے، سو پیشانیوں اور قدموں سے پکڑا جائے گا ۴۱ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ۴۲ یہ جہنم ہے، جسے مجرمین جھٹلاتے ہیں ۴۳ اس (دوزخ) کے اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان چکر لگائیں گے ۴۴ سو اے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ۴۵

معارف ومنازل

ان آیات میں وقوعِ قیامت، اور جزاءِ عمل ہی کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ جس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔ یہ وقوعِ قیامت کی علامات میں سے ایک بڑی علامت ہے، کہ سارے آسمان سوراخ سوراخ ہو کے پھٹ جائیں گے۔ پس ہو جائے گا سرخ چمڑے کی طرح۔ ﴿وَرْدَةً﴾ گلاب کو کہتے ہیں، اور ﴿دِهَان﴾ دباغت شدہ کھال کو کہتے ہیں، جو سرخی مائل ہوتی ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آسمان پھٹ کر گلابی یا سرخ رنگ کا ہو جائے گا۔ ﴿دِهَان﴾ تیل کی تلچھٹ کو بھی کہتے

ہیں، جو سرخی مائل ہوتی ہے۔ اس وقت تو آسمان نیل گوں نظر آتا ہے، مگر قیامت والے دن سرخی مائل نظر آجائے گا۔
﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ سو اے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مجرموں کی سزا یابی اہل ایمان کے حق میں نعمت ہے، اسی لئے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آیت میں اپنی نعمت جتائی ہے، کوئی تو فی الواقع نعمت ہے، جس سے مخلوق مستفید ہو رہی ہے، اور کسی برے انجام کی خبر دینا بھی نعمت ہے کہ لوگ ڈر کر اس برائی سے باز آجائیں، اور سزا سے بچ جائیں۔ آگے ارشاد ہے:
﴿فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ﴾ اس قیامت والے دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ مجرم سے سوال کبھی تحقیق حال کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ پوچھنے والے کو پوری طرح صورتِ حال معلوم نہیں ہوتی، اور کبھی اسے بتانے اور جتانے کے لیے ہوتا ہے کہ تم نے ایسا ایسا کیا۔ اللہ تعالیٰ جب سب کچھ جانتا ہے، اسے ہر چیز کی ہمیشہ سے خبر ہے، تو مجرمین سے قیامت کے دن پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، اور ان کا ہر کردار نامۂ اعمال میں لکھا ہوا ہوگا۔
﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ سو اے جن وانس! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟
﴿یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ﴾ مجرم لوگ اپنی پیشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کے گناہوں کی آلودگی ان کے چہروں سے ظاہر ہوگی۔ جیسے سورۂ عبس میں فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝﴾ [عبس] (اور کتنے منہ ہوں گے جن پر اس دن گرد و غبار پڑی ہوگی، اور ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی) تو ان سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔
﴿فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ﴾ وہ پیشانی کے بالوں سے پکڑے جائیں گے، اور پاؤں سے پکڑ کے گھسیٹے جائیں گے۔ جس طرح اہلِ ایمان اپنی نشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے، جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ میری اُمت کے لوگ وضوء کے اعضاء سے پہچانے جائیں گے، کہ ان کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں وضوء کرنے کی وجہ سے چمک رہے ہوں گے، لہٰذا میں انہیں آسانی کے ساتھ پہچان لوں گا۔ یہ وضوء کی مخصوص سفیدی اور چمک میری اُمت کے علاوہ کسی نبی کی اُمت میں نہیں ہوگی۔ اور آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اذان دینے والوں کی گردنیں قیامت کے دن تمام لوگوں سے بلند ہوں گی، اسی سے مؤذن کی شناخت ہوگی۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

آنحضرت ﷺ نے بعض دوسرے لوگوں کی پہچان کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ مثلاً متکبر اور مغرور لوگ قیامت کے دن چیونٹی کے برابر اور چھوٹے چھوٹے ہوں گے۔ دنیا میں تو یہ بہت بڑے بڑے بنتے رہے، حسب ونسب، مال و دولت پر غرور کرتے رہے، مگر اس دن ذلیل ہوں گے، اور ان کے موٹے بھاری جسم چیونٹیوں جتنے ہوں گے، اور وہ اسی سے پہچانے جائیں گے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا: ؎

حرِ پرحرص سگِ مردار خوار ☆ صورت خوک بود روز شمار

یعنی حرص کا مریض دنیا میں مردار کھانے والے کتے کی مانند ہوگا، اور وہ قیامت کے دن خنزیر کی شکل و صورت میں ہوگا۔ آپؒ نے یہ بھی فرمایا: ؎

زانی راگندہ اندام نہاں ☆ خمر خوردہ بود گندہ دہان

زناکاروں کے اعضاء تناسل سے اس قدر بدبو آئے گی کہ کوئی پاس نہیں کھڑا ہو سکے گا، اور شراب خور کے منہ سے بھی ایسی بدبو آئے گی جیسا کہ گندہ دہنی کی بیماری ہوتی ہے۔ فرمایا: ﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم جھٹلاتے رہے، جب انہیں دنیا کی زندگی میں بُرے اعمال اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا جاتا تھا، تو وہ مذاق اڑاتے، اور تکذیب کرتے تھے۔ آج انہیں جہنم میں پھینک کر کہا جائے گا کہ یہ وہی جہنم ہے جس کا تم انکار کرتے تھے، اب خوب عذاب کا مزہ چکھو۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہوگی:

﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ﴾ پھر وہ چکر لگائیں گے دوزخ اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان، بہ مجبوری اس پانی کو پئیں گے، تو وہ اس قدر گرم ہوگا: ﴿فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ﴾ [محمد:۱۵] (کہ ان کی آنتوں کو کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک دے گا)۔ چنانچہ یہ سلسلہ اور یہ عذاب ابدالآباد اور دائمی رہے گا: ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ [النساء:۵۶] (جب ان کی کھال جل جائے گی، تو ہم دوسری کھال پہنا دیں گے، پھر وہ بھی جل جائے گی، تو اور کھال چڑھا دی جائے گی)۔ اس طرح ان کو مسلسل سزا ملتی رہے گی۔ زقوم کا درخت اور غسلین اور ضریع، یہ سب کچھ اس کے علاوہ ہیں۔

جب کفار کو عذاب ہوگا تو یہ مسلمان کے لیے نعمت شمار ہوگا، اُسے فرمایا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ سو اے انس وجن! تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ
جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: اور جو شخص اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے، اس کے لیے دو باغ ہیں ﴿۴۶﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۷﴾ یہ دونوں باغ بہت سی شاخوں والے ہوں گے ﴿۴۸﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۹﴾ ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہیں، جو بہہ رہے ہیں ﴿۵۰﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۱﴾ ان دو باغوں میں ہر میوہ کی دو دو قسمیں ہوں گی ﴿۵۲﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۳﴾ (ان جنتوں میں رہنے والے لوگ) ایسے بستروں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے جن کے استر دبیز، ریشم کے ہوں گے اور دونوں جنتوں کے پھل قریب ہوں گے ﴿۵۴﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۵﴾ ان باغوں میں ایسی عورتیں ہوں گی جو نیچی نگاہ رکھنے والی ہوں گی، ان کو ان لوگوں سے پہلے کسی انسان یا کسی جن نے استعمال نہ کیا ہوگا ﴿۵۶﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۷﴾ گویا وہ عورتیں یاقوت اور مرجان ہیں ﴿۵۸﴾ سوتم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۹﴾ نہیں ہے بدلہ احسان کا مگر احسان ﴿۶۰﴾ پس تم دونوں اپنے ربّ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۶۱﴾

معارف ومنازل

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندوں کا ذکر آرہا ہے۔ ان کے آگے پھر دو گروہ بن جاتے ہیں، جن کی جزائے عمل بھی اللہ تعالیٰ نے الگ الگ بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ اور جو شخص ڈر گیا اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے، جس کو وقوعِ قیامت اور جزائے عمل پر یقین آگیا اور اسے علم ہو گیا کہ اس نے ایک دن اللہ ربّ العزّت کی عدالت میں کھڑے

ہوکراپنے اعمال کا حساب دینا ہے، وہ لازماً ایمان اور نیکی کو اختیار کرے گا، اور بدعقیدگی اور بدعملی سے بچ جائے گا۔
سورۃ النازعات میں ارشاد ہے: ﴿وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى﴾ [النازعات:۴۰] (جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا)۔ ﴿فَاِنَّ الۡجَـنَّةَ هِىَ الۡمَاۡوٰى﴾ [النازعات:۴۱] (بلاشبہ اس کا ٹھکانہ جنّت ہوگا)۔

البتہ اس مقام پر فرمایا کہ جو شخص اپنے پروردگار کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈر گیا، اس کے لیے: ﴿جَنَّتٰنِ﴾ دو جنّتیں یا دو باغ ہوں گے۔ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان باغات کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ مفسرین کرام دو باغوں کی مختلف توجیہ بیان فرماتے ہیں۔ اگلی سورۃ الواقعہ میں نیکی کرنے والوں کے دو گروہوں کا ذکر آرہا ہے: ایک گروہ سابقین کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو نیکی میں سبقت کرنے والے ہیں، اور دوسرا گروہ اصحابِ یمین کا ہے، جن کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ یہ لوگ اگرچہ سابقین سے کم درجہ میں ہوں گے، مگر یہ بھی کامیاب ہوں گے۔

تو یہاں پر جن دو جنّتوں کا ذکر فرمایا ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک باغ سابقین کے لیے ہے، اور دوسرا اصحاب یمین کے لئے ہے۔ بعض مفسرین دو باغات یا دو جنّتوں کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں کہ ایک باغ جنّات کے لیے ہوگا، اور دوسرا انسانوں کے لیے، کیونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ان دونوں انواع سے بار بار خطاب فرمایا ہے۔ چنانچہ اس سورت مبارکہ سے مفسرین کرام یہ بھی اخذ فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان جنّت میں جائیں گے، اسی طرح جنّات بھی جنّت میں جائیں گے ان کو بھی ایسی ہی جزاء ملے گی، جس کی تشریح اگلی آیات میں آرہی ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنّات کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے ہوئی اور ان کی آبادی بھی انسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ انسانوں کی طرح ان کی بھی پارٹیاں اور گروہ ہیں، ان میں بھی مؤمن اور کافر ہیں، اور پھر وہ بھی مختلف مذاہب اور فرقے رکھتے ہیں، تو جنّوں میں سے جو کوئی ایمان لائے گا اور نیکی وتقویٰ کا راستہ اختیار کرے گا، وہ بھی جنّت میں جائے گا، اور وہاں کے انعام واکرام کا حقدار ہوگا۔ مزید تفصیل سورۃ الجن میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ دو جنّت ایک ہی شخص کے لیے ہیں، ایک جنّت اسے اس کی نیکیوں کی وجہ سے ملے گی، اور دوسری ترکِ معاصی کے بناء پر ملے گی۔ امام بیضاویؒ اور دوسرے مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ

انسان کو ایک جنّت اس کی جسمانی راحتوں کے لیے ملے گی، جبکہ دوسری جنّت میں اس کے لیے روحانی راحتوں کا سامان ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دو جنتوں میں سے ایک جنّت انسان کو اس کے حُسنِ عقیدہ کی بناء پر ملے گی اور دوسری جنّت اعمالِ حسنہ کی وجہ سے حاصل ہوگی۔ اور اسی طرح بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہر مؤمن کو ایک جنّت اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں ملے گی، اور دوسری جنّت اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام کی وجہ سے حاصل ہوگی، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس: ۲۶] (جن لوگوں نے دنیا میں نیکی کے کام انجام دیئے، ان کا بدلہ نیکی ہے، اور کچھ زیادہ بھی)۔ تو یہ زیادتی اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعام کی وجہ سے ہوگی۔ واللہ اعلم

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

آگے ان باغوں کی کچھ کیفیات بیان کی جارہی ہے۔ فرمایا: ﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ﴾ وہ دونوں باغ گھنی شاخوں والے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ باغ کا حُسن درختوں سے ہوتا ہے، اور درختوں کا حُسن ان کی شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں سے ہوتا ہے۔ اور ان باغات کی دل کشی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس قدر انعام فرمایا ہے: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

پھر آگے ان باغات کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی: ﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ﴾ ان میں دو چشمے بہتے ہوں گے۔ وہ ایسا نفیس پانی ہوگا جو نہ کبھی باسی ہوگا اور نہ اس میں بدبو پیدا ہوگی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دو چشمے سلسبیل اور کوثر ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اس کے علاوہ: ﴿فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ﴾ ان باغات میں ہر قسم کے جوڑا جوڑا پھل ہوں گے۔ جنّتی جس قسم کا پھل چاہے گا تو اُسے مہیا کیا جائے گا۔ جنّت میں مختلف قسم کے پھلوں کا ذکر قرآن حکیم کی متعدد سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اگلی آیت میں جنّتیوں کے عیش وآرام کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَاۗىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ﴾ وہ ایسے بچھونوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے والے ہوں، جن کا استر موٹے ریشم کا بنا ہوا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے بستر نہایت اعلیٰ اور نفیس قسم کے ہوں گے، اور ان کی عمدگی کا تصور کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ پھر فرمایا: ﴿وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ﴾ اور ان باغوں کے پھل بالکل قریب ہوں گے۔ جنتی

بستر پر آرام کر رہا ہے، اور اس کا جی چاہتا ہے کہ کوئی پھل کھائے، تو اسے اٹھ کر کہیں جانا نہیں پڑے گا کہ جا کر پھل توڑ لائے، اور یا کسی خادم کو حکم دے کہ اس کے لیے پھل مہیا کرے، بلکہ ان باغات کا پھل خود بخود اس کے منہ کے قریب آ جائے گا۔ فرمایا:

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اے جن وانس! تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

خوراک، پانی، لباس، مکان، صحت اور تعلیم انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں۔ ان کی وضاحت قرآن وسنت میں کردی گئی ہے کہ یہ چیزیں ہر شخص کو ملنی چاہئیں۔ مگر ان چیزوں کے علاوہ انسان کو اپنے ہمدرد جوڑے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے، اور عورت کو مرد کی۔ ان دونوں ضروریات کی تکمیل اور نسل انسانی کی بقاء کے لیے اللہ تعالیٰ نے نکاح کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ یہ سلسلہ تو دنیا تک محدود ہے، آگے جنّت میں پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کو کم از کم دو بیویاں میسر ہوں گی، فرمایا: ''وَمَا فِي الْجَنَّةِ أَعْزَبُ''۔ یعنی کوئی جنتی مجرد نہیں ہوگا، سارے صاحب اہل ہوں گے۔

سورۃ الطور میں جہاں اہل جنّت کے دیگر انعامات کا ذکر ہے، وہاں فرمایا: ﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ [الطور: ۲۰] (ہم ان کا موٹی آنکھوں والی خوبصورت عورتوں سے نکاح کردیں گے)۔ اسی نعمت کو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر یوں بیان فرمایا: ﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ ان جنّتوں میں نیچی نگاہ رکھنے والی پاکیزہ عورتیں ہوں گی۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا: ﴿وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ [البقرۃ: ۲۵] (جنّت میں اہل جنّت کے لیے پاک بیویاں ہوں گی) جو تمام ظاہری وباطنی عیوب ونقائص اور ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک اور منزہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ اپنے خاوندوں اور محرموں کے علاوہ کسی پر نگاہ نہیں اٹھا سکیں گی، اور ان کی دوسری صفت یہ بیان کی ہے کہ:

﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ اہل جنّت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔ وہ بڑی ہی باحیاء اور باعصمت پاکیزہ عورتیں ہوں گی، اور یہی دو چیزیں عورت کا زیور ہیں۔ عصمت بڑی نازک چیز ہے، اگر کسی عورت میں عصمت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا تذکرہ فرمایا کہ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے آئی تو ﴿تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ﴾ [القصص: ۲۵] (حیاداری کے ساتھ چلتی ہوئی آئی)۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی میں حیاء نہیں اس میں ایمان نہیں۔

حیاء صرف عورتوں کے لیے ضروری نہیں بلکہ یہ مردوں کے لیے بھی ویسے ہی ضروری ہے جیسے عورتوں کے لیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اِذَالَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ''۔ اگر تجھ میں حیاء نہیں ہے تو جو جی چاہے کرتے رہو، کون پوچھنے والا ہے۔ اور بے حیاء کا شمار انسانوں میں نہیں ہوتا۔ حیاء کمال درجے کی انسانی صفت ہے، اسی بنیاد پر ایمان کے شعبوں میں سب سے بڑا شعبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنّت کی عورتیں باحیاء اور باعصمت ہوتی ہیں، اور اہل جنّت میں سے پہلے انہیں کسی انسان یا جن نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہوگا۔

﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿کَاَنَّھُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ﴾ پھر ان حوروں کی یہ تعریف ہو رہی ہے کہ وہ اپنی صفائی اور خوبی اور حسن وجمال میں ایسی ہیں جیسی یاقوت ومرجان۔ یاقوت سے صفائی میں تشبیہ دی ہے، اور مرجان سے بیاض اور حسن میں۔ پس مرجان سے مراد یہاں موتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اہل جنّت کی بیویوں میں سے ہر ایک ایسی ہے کہ اس کی پنڈلی کی سفیدی ستر ستر جوڑے پہننے کے بعد بھی نظر آتی ہے، اور اندر کا گودا بھی''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ﴿کَاَنَّھُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ آیت پڑھی، اور فرمایا: ''دیکھو، یاقوت ایک پتھر ہے، لیکن قدرت نے اس کی صفائی اور جودت ایسی رکھی ہے کہ اس کے بیچ میں دھاگہ ڈال دو تو باہر سے نظر آتا ہے۔ [ابن أبي حاتم] یہ روایت ترمذی میں بھی موقوفاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور امام ترمذیؒ نے صحیح کہا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ پیغمبر مدنی احمد مجتبیٰ سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر جنّتی کی دو بیبیاں اس صفت کی ہوں گی کہ ستر ستر حلے پہن لینے کے بعد بھی ان پنڈلیوں کی جھلک نمودار رہے گی، اور اندر کا گودا بھی بوجہ صفائی کے دکھائی دے گا۔ مسلم میں ہے کہ یا تو فخر کے طور پر، یا مذاکرہ کے طور پر یہ بحث چھڑ گئی کہ جنّت میں عورتیں زیادہ ہوں گی، یا مرد؟ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ پہلی جماعت جو جنّت میں جائے گی وہ چاند جیسی صورتوں والی ہوگی، ان کے پیچھے جو جماعت جائے گی وہ آسمان کے بہترین چمکیلے روشن ستاروں جیسے چہروں والی ہوں گی، اور ان میں سے ہر شخص کی دو دو بیویاں ایسی ہوں گی جن کی پنڈلی کا گودا گوشت کے پیچھے سے نظر آئے گا، اور جنّت میں کوئی بغیر بیوی کے نہیں ہوگا۔ اس حدیث کی اصل بخاری میں بھی ہے۔

﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ سوائے انس وجن! تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ فرمایا: یاد رکھو! نہیں ہے بدلہ احسان کا مگر احسان ہی، یعنی نیکی کا

بدلہ نیکی کی صورت میں ہی ملے گا۔ اگر دنیا میں نیک نیّت کے ساتھ اچھے اعمال انجام دیں گے توان کی جزاء بھی اچھی ہوگی۔ دراصل جنّت اوراس کی نعمتیں کسی عمل کے بدلے میں نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا احسان اوراس کا فضل وکرم ہے۔ سورۃ الم سجدہ میں فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً مبِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدۃ:۱۷] (کوئی نفس نہیں جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ان کی آنکھوں کی کیسی کیسی ٹھنڈک چھپار کھی ہے)۔ یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا جو وہ دنیا میں انجام دیتے رہیں۔ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ سوائے انس و جن! تم دونوں اللہ تعالیٰ کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾
فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي
الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ
اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: اوران دوباغوں سے کم درجے کے اور باغ ہیں (۶۲) سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن
نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۶۳) یہ دونوں باغ گہرے سبز رنگ کے ہوں گے (۶۴) سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن
نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۶۵) ان دونوں باغوں میں خوب جوش مارتے ہوئے دوچشمے ہوں گے (۶۶) سوائے انس وجن! تم
اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۶۷) ان دوباغوں میں میوے، اور کھجور، اورانار ہیں (۶۸) سوائے انس وجن! تم
اپنے ربّ کی کون کونسی نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۶۹) ان باغوں میں اچھی عورتیں ہوں گی (۷۰) سوائے انس وجن! تم اپنے
ربّ کی کن کن نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۷۱) وہ عورتیں حوریں ہوں گی، جوخیموں میں محفوظ ہوں گی (۷۲) سوائے انس جن! تم
اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۷۳) ان سے پہلے کسی انسان یا جن نے انہیں استعمال نہ کیا ہوگا (۷۴) سوائے
انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کوجھٹلاؤگے؟ (۷۵) (ان جنتوں میں داخل ہونے والے) لوگ سبز رنگ کے

نقش ونگار والے خوبصورت بستروں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے ﴿۷۶﴾ سوائے انس وجن! تم اپنے ربّ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۷۷﴾ بڑا بابرکت ہے آپ کے ربّ کا نام، جو عظمت اور احسان والا ہے ﴿۷۸﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں دوجنّتوں کا ذکر فرمایا، اب یہاں سے دوسری دوجنّتوں کا ذکر شروع ہورہا ہے۔ یہ دونوں جنّتیں پہلی دوجنّتوں سے مرتبہ اور فضیلت میں کم ہوں گی۔ یہ جن بندوں کو دی جائیں گی وہ اپنے احوال اور اعمال کے اعتبار سے ان حضرات سے کم درجے کے ہوں گے جن کو پہلی دوجنّتیں دی جائیں گی۔ گویا کہ صفت ایمان سے سب متصف ہوں گے، مگر اعمال میں آسمان وزمین کا فرق ہوگا۔ آئندہ سورۃ الواقعہ میں سابقین اوّلین اور اصحاب یمین جنّت میں جانے والی دوجماعتوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

مفسرین کرامؒ نے فرمایا ہے کہ پہلی دوجنّتیں سابقین اوّلین کے لیے ہیں، اور بعد والی دوجنّتیں جن کا اب ذکر ہورہا ہے، یہ اصحاب یمین کے لیے ہوں گی، جو درجہ کے اعتبار سے سابقین اوّلین سے کم ہوں گے۔ فرمایا:

﴿وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ﴾ ان دو کے علاوہ دومزید باغ ہوں گے، جو پہلے مذکورہ باغوں سے کم درجہ کے ہوں گے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اب ان دو باغوں کی تعریف میں فرمایا: ﴿مُدْهَآمَّتٰنِ﴾ یہ دونوں باغ گہرے سبز رنگ کے ہوں گے۔ اور جب سبز رنگ گہرا ہوجائے تو قدرے سیاہی مائل ہوجاتا ہے۔ یہ دونوں جنتی باغ نہایت سرسبز اور خوشنما ہوں گے۔ جنتی ان باغات کو پاکر بڑے مسرور اور خوشحال ہوں گے، دنیا کے تمام رنج والم، اور ہر طرح کی مصیبتوں کو بھول جائیں گے، اور جنتی مسرتوں میں ڈوب جائیں گے۔ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

آگے ان باغات کے دیگر لوازمات سے متعلق فرمایا: ﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ﴾ ان باغات میں دو ابلتے ہوئے، جوش مارتے ہوئے، جاری چشمے ہوں گے۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ سورۂ محمد میں جنتی چشموں کا بیان ہوچکا ہے، اور آئندہ بھی مختلف سورتوں میں جنتی چشموں کا بیان آنے والا ہے۔ فرمایا:

﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ﴾ ان باغوں میں پھل، کھجوریں اور انار ہوں گے۔ آگے اللہ تعالیٰ جل

شانہ ہی کو معلوم ہے کہ ان پھلوں اور کھجوروں اور انار اور دیگر میوہ جات کی کتنی کتنی قسمیں ہوں گی۔ مسند عبد بن حمید میں ہے کہ یہودیوں نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا جنّت میں میوے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی، اور فرمایا: ہاں! جنّت میں میوے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: کیا جنتی دنیا کی طرح وہاں بھی کھائیں گے پئیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! بلکہ بہت کچھ زیادہ، اور بہت کچھ زیادہ۔ انہوں نے پوچھا: پھر کیا وہاں! فضلہ بھی نکلے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ پسینہ کے ذریعہ سب کچھ ہضم ہوگا۔

ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ جنتی کھجور کے درختوں کے ریشے جنّتیوں کا لباس بنے گا۔ یہ درخت سرخ رنگ کے سونے کے ہوں گے، ان کے تنے سبز زمرد کے ہوں گے، اس کے پھل شہد سے زیادہ میٹھے، اور مکھن سے زیادہ نرم ہوں گے، ان میں گٹھلی بالکل نہ ہوگی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ میں نے جنّت کے انار دیکھے، وہ اتنے بڑے تھے جیسے اونٹ مع ہودج کے۔ یعنی اونٹ اپنے پالان کے ساتھ۔ حوروں کے بارے میں فرمایا:

﴿فِيهِنَّ خَيْرَٰتٌ حِسَانٌ﴾ خَيْرَٰت کا معنیٰ ہے: بکثرت، اور بہت حسین، نہایت نیک خُلق اور بہتر خَلق، یعنی خیر ہی خیر۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ معنی مروی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: حورعین جو گانا گائیں گی ان میں یہ بھی ہوگا: ہم خوش خلق، خوبصورت ہیں، جو بزرگ خاوندوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ پوری حدیث سورۂ واقعہ کی تفسیر میں إن شاءاللہ آنے والی ہے۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿حُورٌ مَّقْصُورَٰتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ حوریں ہیں، جو خیموں میں رہتی سہتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہر مسلمان کے لیے خیرہ ہے، یعنی نیک اور بہترین، خوبصورت، نورانی حور، اور ہر خیرہ کے لیے خیمہ ہے، اور ہر خیمہ کے لئے چار دروازے ہیں، جن سے ہر روز تحفہ، کرامت، ہدیہ اور انعام آتا رہتا ہے، نہ وہاں کوئی فساد ہے، نہ سختی ہے، نہ گندگی ہے، نہ بدبو ہے۔ حوروں کی صحبت ہے، جو اچھوتے، صاف، سفید، چمکیلے موتیوں جیسی ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنّت میں ایک خیمہ ہے، درِّ مجوّف کا، جس کا عرض سات میل ہے، اس کے ہر ہر کونے میں جنتی کی بیویاں ہیں، جو دوسرے کونے والیوں کو نظر نہیں آتیں، مؤمن ان سب کے پاس آتا جاتا رہے گا۔

دوسری روایت میں ان کی چوڑائی تیس میل مروی ہے، یہ صحیح حدیث مسلم میں بھی ہے۔ حضرت ابوالدرداء

رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خیمہ ایک ہی لؤلؤ (موتی) کا ہے، جس میں ستر دروازے موتی کے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جنّت میں ایک خیمہ ہوگا، جو ایک موتی کا بنایا ہوا ہوگا، چہار فرسخ چوڑا، جس کے چار ہزار دروازے ہوں گے، اور سب کی چوکھٹیں سونے کی ہوں گی۔ اور ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ادنیٰ درجے کے جنتی کے اسی ہزار خادم ہوں گے، یعنی غلمان، جو موتیوں کی طرح خوبصورت ہوں گے، اور بہتر (٧٢) بیویاں ہوں گی، اور لؤلؤ زبرجد کا محل ہوگا، جو خاویہ سے صنعاء تک پہنچے۔ پھر فرمایا: ان بے مثال حسینوں کے مزاج کا یہ حال ہوگا۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ اس سے پہلے ان کو کسی انسان یا جن نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ [ابن کثیر]

فائدہ:

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ جنّت میں دو قسم کی عورتیں ہوں گی: ایک تو یہ حوریں ہوں گی، جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے۔ یہ نہایت ہی باحیاء، پاکیزہ، خوبصورت اور باعصمت ہوں گی، اور اللہ تعالیٰ ان کو جنتی مردوں کے لیے جنّت ہی میں پیدا فرمائے گا۔ ان کے علاوہ اس دنیا کی اہل ایمان اور نیکوکار باحیاء، باپردہ عورتیں بھی جنّت میں ہوں گی، جن کا حسن و جمال ستر ہزار مرتبہ حوروں سے زیادہ ہوگا۔

طبرانی شریف کی روایت میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حورعین کو زعفران جیسے پاکیزہ، اور خوشبودار مادے سے پیدا کیا ہے۔ اور مفسر قرآن تابعی جلیل حضرت زید ابن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ: خَلَقَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْ مِسْكٍ وَكَافُوْرٍ وَزَعْفَرَان۔ اللہ تعالیٰ نے جنتی حوروں کو کستوری، کافور اور زعفران کے مادہ سے پیدا کیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حوروں کو جنّت ہی میں پیدا کرے گا، یعنی یہ وہیں کی مخلوق ہوگی، ان کا دنیا سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور وہ نہایت پاکیزہ، خوبصورت، حسین وجمیل، اور بااخلاق مخلوق ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنّت والوں کے آرام وآسائش کا ذکر فرمایا ہے:

﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ﴾ جنتی جنّت میں سبز رنگ کے مسندوں پر تکیہ لگا کر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ رَفْرَفٍ کا معنی فرش بھی ہوتا ہے، اور تکیہ بھی۔ اس کے ساتھ فرمایا: ﴿وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ﴾ اور نہایت نفیس قالینوں

پر۔ عَبۡقَر کمال درجے کی چیز کو کہتے ہیں۔ یعنی بے مثال، جس کی مثال موجود نہ ہو، تاہم عبقر کا اطلاق خود انسان پر بھی ہوتا ہے۔ عربی میں ہر اچھی اور نفیس چیز کو عبقر کہا جاتا ہے، بخاری شریف کی روایت میں یہ لفظ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ پس تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت وجلال کا ذکر فرمایا ہے۔

﴿تَبٰرَکَ اسۡمُ رَبِّکَ ذِی الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ﴾ تیرے ربّ ذوالجلال والاکرام کا نام بابرکت ہے، اگر اس کی برکتوں اور عظمتوں اور عزّ وجلال پر قلم اٹھا کر پوری انسانیت جنات اور فرشتے لکھنا چاہیں تو تھک جائیں گے، ہاتھ شل ہو جائیں گے، قلم گھس جائیں گے، ساتوں سمندروں کا پانی خشک ہو جائے گا۔ نہ اس کی برکتوں کا احاطہ ہو سکتا ہے، نہ اس کی نعمتوں کا، اور نہ ہی اس کی قدرتوں کا، اور کمالات کا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اجلال کرو، اس کی عظمت کو مانو، وہ تمہیں بخش دے گا۔

مسند ابو یعلیٰ میں ہے: یَاذَا الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ الحاح وزاری کے ساتھ، مسکنت وعاجزی اور خلوص کے ساتھ ہمیشہ اور لزوم سے اللہ تعالیٰ کے دامن میں لٹک جاؤ، اور اسی بنیاد پر بعضوں نے کہا ہے کہ یَاذَا الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ اسم اعظم ہے۔ آیت الکرسی کے مقام پر اس پر کلام گزر چکا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے پھرنے کے بعد صرف اتنی ہی دیر بیٹھتے کہ یہ کلمات کہہ لیں: اَللّٰھُمَّ أنتَ السَّلامُ وَمِنکَ السَّلامُ تَبارَکتَ یَاذَالجَلالِ وَالإکرَام۔

ہم بے سروسامان محتاجوں کی یہ دعا ہے کہ یاذالجلال والاکرام! یاحیّ ویاقیوم! یاارحم الراحمین! ہمارے اوپر رحم فرما، ہماری مغفرت فرما، خاتمہ بالخیر کے ساتھ اپنے فضل وکرم سے اپنی ملاقات کا شائق وطالب بنا۔ آمین

الحمدللہ سورۃ الرحمٰن کی تفسیر ختم ہوئی۔ منگل، ۲۹ اگست، ۲۰۱۶

سُورَةُ الْواقِعَة

مكيةٌ آياتها ۹۶ ركوعاتها ۳

سورۂ واقعہ مکی ہے، اس میں چھیانوے (۹۶) آیتیں، اور تین (۳) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الواقعہ ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں یہ لفظ مذکور ہے اسی سے یہ نام ماخوذ ہے، اور اس سورت کا نام التامۃ الکبریٰ بھی ہے، اس سورت کو قارعۃ بھی کہتے ہیں، یہ سورت ترتیب تلاوت میں چھپن (۵۶) ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں چھیالیس (۴۶) ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ واقعہ بمعنی واقع ہونے والی اس سے مراد قیامت ہے، یہ پوری سورت قیامت کے واقع ہونے کی خبر اور قیامت کے حالات و کیفیات پر مشتمل ہے، اس کا نزول سورۂ طٰہٰ کے بعد ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں تین (۳) رکوع، چھیانوے (۹۶) آیات، تین سو چوراسی (۳۸۴) کلمات، اور ۱۷۶۸ (ایک ہزار سات سو اڑسٹھ) حروف ہیں۔

ربط و مناسبت:

سورۃ الرحمٰن میں جنت کی نعمتوں، اور وہاں کے اسباب عیش و آرام کا ذکر سنا تو سامعین کے نفوس مشتاق ہو کر

پوچھتے تھے کہ وہ مبارک دن کب آئے گا جب ہمیں جنتوں کا داخلہ نصیب ہوگا؟ تو فرمایا کہ وہ قیامت آئے گی دوسرے جہاں میں، یہ کوئی دور نہیں، اور واقعہ قیامت کا نام بھی ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں سورۂ یٰسین کی طرح دین کے بنیادی اصول یعنی توحید، رسالت، وقوعِ قیامت، قرآن کی صداقت وعظمت، اور جزاءِ عمل یعنی قیامت کے دن ناجی اور غیر ناجی دونوں طرح کے لوگوں کا اور ان کے انجام وغیرہ کا بیان ہے۔

فضائلِ سورت:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بہت سے تابعینؒ سے منقول ہے کہ اپنی اولاد کو سورۂ واقعہ سکھاؤ، کیونکہ یہ سورۃ الغنیٰ ہے۔ [کنز العمال] حافظ ابن کثیر اور ابن عساکر اور دیگر مفسرین ومحدثین رحمۃ اللہ علیہم سب نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بچوں کو سورۃ الواقعہ سکھایا، مجھے امید ہے کہ وہ کسی کے محتاج نہیں رہیں گے، اور یہ بات درجۂ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے کہ جو شخص پابندی کے ساتھ ہر رات اس سورت کی تلاوت کرے گا اس کا رزق تنگ نہیں ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝٣ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝٤ وَّ
بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝٥ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝٦ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝٧ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ
اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝٨ وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝٩ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝١٠ اُولٰٓئِكَ
الْمُقَرَّبُوْنَ ۝١١ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝١٢ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٣ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝١٤ عَلٰى سُرُرٍ
مَّوْضُوْنَةٍ ۝١٥ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ۝١٦ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۝١٧ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ
وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝١٨ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۝١٩ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝٢٠ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا

يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ
فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ
مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ
وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾
لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: جب قیامت واقع ہوگی ① اس کا جھٹلانے والا کوئی نہ ہوگا ② وہ پست کردے گی، بلند کردے گی ③ جبکہ زمین کو سخت زلزلہ آئے گا ④ اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے ⑤ پھر وہ پراگندہ غبار ہوجائیں گے ⑥ اور تم تین قسم ہوجاؤ گے ⑦ سو جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں ⑧ اور جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے برے ہیں ⑨ اور جو آگے بڑھنے والے وہ آگے بڑھنے والے ہیں ⑩ وہ خاص قرب رکھنے والے ہیں ⑪ یہ لوگ آرام کے باغوں میں ہوں گے ⑫ ان کا ایک بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا ⑬ اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے ⑭ وہ لوگ سونے کے تاروں سے بنے تختوں پر ⑮ تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ⑯ ان کے پاس ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، یہ چیزیں لے کر آمد ورفت کیا کریں گے ⑰ آبخورے اور آفتابے اور ایسا جامِ شراب جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا ⑱ نہ اس سے ان کو دردسر ہوگا، اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا ⑲ اور میوے جن کو وہ پسند کریں گے ⑳ اور پرندوں کا گوشت جوان کو مرغوب ہوگا ㉑ اور ان کے لیے بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی ㉒ جیسا پوشیدہ رکھا ہوا موتی ہو ㉓ یہ ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گا ㉔ وہاں نہ بک بک سنیں گے، اور نہ کوئی بیہودہ بات ㉕ بس سلام ہی سلام کی آواز آئے گی ㉖ اور جو داہنے والے وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں ㉗ وہ ان باغوں میں ہوں گے جہاں بے خار بیریاں ہوں گی ㉘ اور تہ بتہ کیلے ہوں گے ㉙ اور لمبا لمبا سایہ ہوگا ㉚ اور چلتا ہوا پانی ہوگا ㉛ اور کثرت سے میوے ہوں گے ㉜ جو نہ ختم ہوں گے، اور نہ ان کی روک ٹوک ہوگی ㉝ اور اونچے اونچے فرش ہوں گے ㉞ ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے ㉟ یعنی ہم نے ان کو ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں ㊱ محبوبہ ہیں ہم عمر ہیں ㊲ یہ سب چیزیں داہنے والوں کے لیے ہیں ㊳ ان کا ایک بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا ㊴ اور ایک بڑا گروہ پچھلے لوگوں میں سے ہوگا ㊵

معارف ومنازل

سورۃ الواقعہ کی ابتدائی چھ آیات میں وقوعِ قیامت کا بیان اور اس کی ہولناکی اور سختی کا بیان ہے، اس کے ساتھ پھر قیامت کے دن لوگ جو تین قسموں میں منقسم ہو جائیں گے انہی کا بیان اور وضاحت ہے، ایک جماعت عرش کے دائیں جانب ہوگی، اور یہ لوگ وہ ہوں گے جو حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں کندھے سے نکلے تھے، اور ان کے نامۂ اعمال بھی دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور جنت کی طرف دائیں جانب چلائے جائیں گے، یہ جنتیوں کا عام گروہ ہوگا۔ دوسری جماعت عرش کے بائیں جانب ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں کروٹ سے نکالے گئے تھے، اور انہیں نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور بائیں طرف دوزخ کی راہ پر لگائے جائیں گے، اور یہ سب جہنمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ آمین

تیسری جماعت اللہ تعالیٰ جل شانہ کے سامنے ہوگی، یہ خاص الخاص لوگ ہیں، یہ اصحاب یمین سے بھی زیادہ باوقعت اور خاص قرب کے مالک ہیں، یہ لوگ تمام اہل جنت کے سردار ہیں، ان میں رسول ہیں، انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں، صلحاء ہیں، یہ تعداد میں بنسبت اصحاب یمین کے کم ہیں، چنانچہ یہ تین قسم تمام اہل محشر کی ہو جائیں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا کہ ان میں دو گروہ جنتی ہیں، اور ایک جہنمی ہے۔ فرمایا:

﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝٣﴾ جب قیامت واقع ہوگی جس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ اور خلاف نہیں، کیونکہ اس کا واقع ہونا یقینی امر ہے، وہ بعض لوگوں کو پست کرنے والی ہوگی، اور بعضوں کو بلند کرنے والی ہوگی، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دشمن، منکرینِ توحید جو مغرور اور سرکش تھے قیامت ان کو پست اور ذلیل کرنے والی ہوگی، اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو کہ توحید کے زیور سے آراستہ تھے، جو تواضع کرتے تھے اور غرور سے پرہیز کرتے تھے، قیامت ان کو اونچا کرنے والی اور اوپر اٹھانے والی ہوگی۔

﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝٤ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝٥ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝٦﴾ قیامت جس وقت قائم ہوگی اس وقت دنیا کا یہ حال ہوگا جبکہ زمین میں زلزلہ آئے گا شدید اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر وہ پراگندہ غبار کی طرح اڑتے پھریں گے۔ هَبَآء غبار کو کہتے ہیں، روشن دان کے شگافوں میں جو اڑتے ہوئے خاک کی ذرات سورج کی پڑتی شعاعوں کی وجہ سے نظر آتے ہیں ان کو هَبَآء کہتے ہیں۔ آگے فرمایا:

﴿وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝٧ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝٨ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ

اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۹ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۱۲﴾ اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے: کچھ دائیں طرف والے کیسے اچھے ہوں گے دائیں طرف والے، اور کچھ بائیں طرف والے، اور کیسے برے ہوں گے دائیں طرف والے، اور جو اعلیٰ درجہ کے ہوں گے وہ اعلیٰ درجہ کے ہی ہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے، آرام کے باغوں میں داخل کئے جائیں گے۔ ﴿مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ﴾ اور ﴿مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ﴾ دونوں میں استفہام تعجب کے لیے ہے۔

سابقون کون ہیں؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہی لوگ ہیں جو ہجرت میں سبقت کرنے والے تھے۔ حضرت عکرمہؒ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام میں سبقت کر لی۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ وہ مہاجر اور انصار مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ ربیع بن انسؒ نے فرمایا کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق میں سبقت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پانچوں نمازوں کی طرف پیش قدمی کرنے والے مراد ہیں۔ دیگر علماء نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمام حسنات میں سبقت کی، یہ سب سے بڑا جامع قول ہے۔ ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ السّٰبِقُوْن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؒ نے اپنے والد امام باقرؒ کی روایت سے اپنے دادا کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بشارت ہو، بشارت ہو میری امت بارش کی طرح ہے کہ معلوم نہیں اس کا اول حصہ بہتر ہوتا ہے یا آخری حصہ، یا میری امت ایک باغ کی طرح ہے۔ حضرت ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کا بہترین حصہ ابتدائی اور آخری ہے، درمیانی حصہ میں گدلا پن ہے۔ [رواہ الحكيم، الترمذي، مظهري]

﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۴﴾ ان کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا (یعنی امت محمدیہ کے اگلے لوگ) اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے۔ الْاَوَّلِيْن سے مراد صدرِ اول کے مسلمان یعنی قرون ثلاثہ صحابہؓ تابعین اور تبع تابعینؒ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم۔ میری امت کا بہترین قرن میرا قرن ہے، یعنی دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، پھر وہ لوگ ہیں جو میرے قرن والوں سے متصل ہیں یعنی تابعینؒ، پھر وہ لوگ ہیں جو قرنِ دوم کے ساتھ متصل ہیں یعنی تبع

تابعینؒ، ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو بغیر طلب شہادت گواہی دیں گے، اور خیانت کریں گے، امانتدار نہیں ہو ں گے، نذریں مانیں گے مگر نذر کو پورا نہیں کریں گے۔ [متفق عليه]

بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو برا نہ کہو، اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر راہِ خدا میں سونا خرچ کرے گا تو میرے کسی صحابی کے ایک سیر بلکہ آدھے سیر جواری یا غلہ کے برابر نہ ہوگا۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ: ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ﴾ سے مراد ہیں وہ تمام امتیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد نبوت تک گزریں، اور ﴿قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ﴾ سے امت محمدیہ مراد ہے۔

امام زجاج نے کہا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کو دیکھا اور سب کی تصدیق کی ان کی تعداد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے زائد تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا۔ اس قول اور سابق اقوال کا ایک ہی مطلب ہے۔

میں (صاحب مظہری) کہتا ہوں: یہ دونوں تفسیریں بعید از فہم ہیں، اور خلافِ نقل ہیں، اس تفسیر پر تو لازم آتا ہے کہ سابق امتوں کو قربِ الٰہی امت محمدیہ سے بڑھ کر حاصل ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اقوامِ ماضیہ کا مرتبہ اس امت سے اعلیٰ ہوگا، کیونکہ اصحاب فضل کی کثرت امت کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے، لیکن یہ بات آیاتِ قرآنیہ کے بھی خلاف ہے، اور صحیح احادیث کے بھی، اللہ تعالیٰ نے صراحۃً فرمایا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] (تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے پیدا کیے گئے ہو)۔ اور فرمایا: ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة: ۱۴۳] (تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے)۔ اور حضرت بہز ابن حکیمؒ نے اپنے دادا کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے: انيتمتمون سبعين أمة أنتم خيرها وأكرمها على الله۔ [ترمذي وابن ماجة]

امام احمد، بزار اور طبرانی نے صحیح حدیث بیان کی کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ فرمارہے تھے: مجھے امید ہے کہ میری اتباع کرنے والے اہل جنت میں ایک چوتھائی ہوں گے، ہم نے یہ سن کر تکبیر کہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں امید رکھتا ہوں کہ کُل جنتی لوگوں میں میری امت ایک تہائی ہوگی، ہم نے پھر تکبیر کہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں امید رکھتا ہوں کہ کُل جنتی لوگوں میں میری امت

نصف ہوگی۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم پسند کرو گے کہ کُل اہل جنت میں تم ایک چوتھائی ہو؟ ہم نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں امید کرتا ہوں کہ کُل جنتیوں میں تم آدھے ہوں گے۔

امام ترمذیؒ، امام حاکمؒ اور امام بیہقیؒ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اہل جنت کی ایک سو بیس (١٢٠) صفیں ہوں گی، اسی (٨٠) صفیں تمہاری اور چالیس (٤٠) باقی امتوں میں سے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن، اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابوموسیٰ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت معاویہ ابن حیدہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ [مظهري]

فرمایا: ﴿عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ ﴿١٥﴾ مُّتَّكِـِٕيۡنَ عَلَيۡهَا مُتَقٰبِلِيۡنَ ﴿١٦﴾﴾ وہ لوگ سونے کی تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ﴿يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿١٧﴾ بِاَكۡوَابٍ وَّاَبَارِيۡقَ ۙ وَكَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِيۡنٍ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُوۡنَ عَنۡهَا وَلَا يُنۡزِفُوۡنَ ﴿١٩﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوۡنَ ﴿٢٠﴾ وَلَحۡمِ طَيۡرٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴿٢١﴾﴾ ان کے پاس آمد و رفت رکھیں گے ایسے کمسن لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، یعنی ان کی خدمت کے لیے ان کے پاس بار بار آتے جاتے رہیں گے، آبخورے اور آفتابے اور جاری رہنے والی شراب سے بھرے ہوئے جام لیے ہوئے، نہ اس شراب سے ان کو دردِ سر ہوگا، اور نہ عقل میں فتور آئے گا، اور ان کے پسندیدہ میوے اور مرغوب خاطر پرندوں کا گوشت بھی لیے ہوئے ان کے پاس گھومیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مَّوۡضُوۡنَةٍ کا معنی ہے: سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تخت۔ میں کہتا ہوں: آج کل ہمارے ملکوں میں کشیدہ کاری کی صنعت عروج پر ہے، بہت سے لوگوں کے لیے کٹ پوش، پلنگ پوش، تکیہ، بالشت، اور میزوں اور بیڈ شیٹ اور میز شیٹ وغیرہ بنائے جاتے ہیں جو بہت ہی خوبصورت ہوتی ہیں، اور خیر القرون کے زمانے عرب میں اس کا بہت ہی رواج ہوتا تھا جنہیں وَضِين کہا جاتا تھا، اور وضين الناقة بھی۔ بخاری نے اسے صحیح میں نقل کیا ہے۔

اَكۡوَاب کوب کی جمع ہے، کوب وہ آبخورہ ہے جس کا منہ گول ہو، اور اس کا قبضہ نہ ہو۔ اَبَارِيۡق آفتابے یعنی لوٹے جن کے قبضے ہوتے ہیں، رنگ کی صفائی اور چمک کی وجہ سے ان کو اباریق کہا گیا۔ كَاۡس شراب سے بھرے ہوئے جام کو کہا جاتا ہے، اگر اس میں شراب نہ ہو تو اس کو كَاۡس نہیں کہا جاتا ہے۔

﴿وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۝ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۝﴾ گوری چٹی (روشن آبدار) خوبصورت اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتیں بھی ہوں گی ان کے حسن وجمال کا یہ حال ہوگا کہ وہ غلاف میں بند موتیوں کی طرح گردوغبار سے پاک ہوں گی، وہ ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے پاکیزہ اور خوبصورت ہوں گی۔

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ یہ بدلہ ہوگا ان اعمالِ صالحہ کا جو وہ دنیا میں انجام دیتے رہیں۔ فرمایا:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝﴾ وہ لوگ اس جنت میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی کوئی گناہ کی بات، اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں داخلہ سے پہلے ان کے دلوں اور زبانوں کو اور خیالات کو تمام لغو باتوں سے اور بیہودہ اعمال سے اور برے خیالات سے اس طرح پاک فرمائیں گے جیسے فرشتے پاک ہیں، بلکہ وہاں پر یہ:

﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝﴾ وہاں تو ہر طرف سے سلامتی کا پیغام سنتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کو سلام ہوگا۔ سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ [یٰس: ۵۸] (رحمت والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا)۔ فرشتوں کی طرف سے بھی انہیں سلام ہوگا، جب آپس میں ملیں گے تو بھی سلام ہی سلام کہیں گے۔ سابقین کے بعد دوسرے نمبر پر اصحاب یمین کا ذکر فرمایا:

﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝﴾ اور دائیں ہاتھ والے لوگ ان کا تو کیا ہی کہنا! ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے رحمت کے مقام جنت میں بڑے آرام اور راحت کے ساتھ جنت میں داخلہ نصیب ہوگا، ان کی نعمتیں اگرچہ سابقین کی نعمتوں سے کم درجہ کی ہوں گی، مگر اپنے طور پر یہ بھی کمال اور اعلیٰ درجہ کی نعمتیں ہوں گی۔

امام ابن کثیرؒ نے ابن ابی حاتمؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے: ﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں دعا کرنے لگے: أما السابقون فقد مضى ولكن اللّٰهم اجعلنا من أصحب اليمين۔ یعنی سابقین کا گروہ تو گزر گیا، لیکن اے اللہ تعالیٰ! ہمیں اصحاب یمین میں ہی شامل فرمائے، کیونکہ اگر ہم اس گروہ میں بھی شامل نہ ہوسکے تو بڑا خسارہ ہوگا، اور ہم ناکام ہوجائیں گے۔ اصحاب یمین کو ملنے والے انعام واکرام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ﴾ یہ لوگ کانٹے اتاری ہوئی (بے خار) بیری کے درختوں میں ہوں گے۔ بیری کا پھل اگرچہ بہت اچھا پھل ہے مگر اس درخت کی شاخوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں جو طبیعت پر ناگوار گزرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنت کی بیری کے درختوں پر کانٹے نہیں ہوں گے۔ اور فرمایا:

﴿وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ﴾ تہ بر تہ کیلے ہوں گے۔ کیلا نہایت عمدہ پھل ہے، دنیا میں اسے لوگ بہت رغبت کے ساتھ بکثرت کھاتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ﴾ اور یہ جنت والے لمبے سایوں میں ہوں گے۔ وہاں نہ دھوپ ہوگی نہ اندھیرا، اور نہ ہی سردی وگرمی، تجلیات عرش سے تمام جنت روشن اور موسم خوشگوار رہے گا۔ نیز فرمایا:

﴿وَّمَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ﴾ اصحاب یمین بہتے ہوئے پانی میں ہوں گے۔ جنت کا پانی تروتازہ اور مثالی ہوگا جو صاف وشفاف ہر وقت بہتا رہے گا۔ پھر فرمایا: ﴿وَّفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ ۝ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ﴾ اور وہ لوگ بہت کثیر پھلوں میں ہوں گے، جنت کے پھلوں کا کوئی حد وشمار نہیں ہوگا، یہ پھل نہ تو قطع کیے جائیں گے یعنی نہ ختم کیے جائیں گے، اور نہ ہی ان میں کوئی کمی آئے گی، اور نہ ہی روکے جائیں گے، جنتی نعمتوں میں کہیں بھی رکاوٹ نہیں ہوگی، اور یہ بھی فرمایا: ﴿وَّفُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ﴾ اونچے درجے کے بچھونے اور بستر ہوں گے، جن پر جنتی آرام کریں گے، یہ بستر نہایت قیمتی، خوش رنگ اور آرام دہ ہوں گے۔ لطف یہ ہے کہ جنتیوں کا لباس اور بچھونے اور تخت وتکیے ابدی تروتازہ رہیں گے، نہ میلے ہوں گے، نہ انہیں دھونے کی ضرورت ہوگی، جنت کی ہر چیز کا یہی حال ہے۔ آگے خوبصورت عورتوں کی رفاقت کا ذکر ہے:

﴿اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ۝ فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا ۝ عُرُبًا اَتۡرَابًا ۝ لِّاَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ﴾ ہم نے ان عورتوں کو پیدا کیا ہے ایسی پیدائش کے ساتھ کہ ان کو دوشیزہ بنایا ہے، وہ کنواری نہایت ہی خوبصورت ہوں گی، وہ ہمیشہ کنواری ہی رہیں گی، جو محبت کرنے والی اور ہم عمر ہوں گی اصحاب الیمین کے لیے۔

امام ابن کثیرؒ نے طبرانی کے حوالے سے روایت نقل کی ہے کہ جنتی عورتیں وہ عورتیں ہوں گی جن پر دنیا میں بڑھاپے کی حالت میں موت طاری ہوئی، ان کے سارے اعضاء اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ ان کی آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا تھا وہ اٹھنے بیٹھنے سے عاجز رہتی تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے ان عورتوں کو نئی اٹھان کے ساتھ پیدا کرے گا، یہ ساری نوجوان دوشیزہ ہوں گی، اور اپنے خاوندوں کے ساتھ بے حد محبت کریں گی۔

اس حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ: نساء الدنیا أفضل من حور عین۔ یعنی دنیا کی یہ عورتیں جنت کی حوروں سے افضل ہوں گی، عزت وشرف میں بھی اور حسن وجمال میں بھی، ان کی یہ افضلیت ان کی نمازوں، روزوں، زکوٰۃ، حج وصدقات، تلاوت قرآن اور دیگر عبادات ادا کرنے کی وجہ سے ہوگی، اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں حوروں میں نہیں ہیں، اور پاکیزہ حوروں کا دامن ان عظیم الشان عبادات سے خالی ہے۔

اس حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ اُم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ذکر کیا کہ دنیا میں بعض عورتیں دو دو تین تین خاوندوں والی بھی ہوتی ہیں، اگر ایسی کوئی عورت جنت میں چلی گئی اور اس سارے شوہر بھی جنت میں پہنچ گئے تو ایسی عورت کا ملاپ کس خاوند کے ساتھ ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إنها مخيرة۔ ایسی عورت کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس شوہر کے ساتھ رہنا پسند کرے اس کا انتخاب کرے، تو ایسی صورت میں وہ عورت تختار أحسن الخلق۔ ایسے خاوند کو پسند کرے گی جو دنیا میں بہتر اخلاق والا تھا، یعنی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ام سلمہ! عمدہ اخلاق دین و دنیا میں بہتری کا سبب بنتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی فرمان مبارک ہے کہ جنت میں جانے والے مرد و عورتیں ہمیشہ جوانی کی حالت میں رہیں گے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ان میں کوئی تغیر نہیں آئے گا۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جنتی مرد بے ریش (امرد) سرگین آنکھوں والے، تینتیس (۳۳) سال (عمر) پیٹے میں ہوں گے، اور ان کے جسم پر بال بھی نہیں ہوں گے، اور یہ لوگ اپنے جدا مجد حضرت آدم علیہ السلام کی صورت میں ہوں گے، اور قد و قامت انہی کے قد و قامت کے مطابق ہوگا، اور عورتیں بھی ہمیشہ ہم عمر ہوں گی، اور محبت کرنے والی ہوں گی، یہ انعامات ان لوگوں کے لئے ہیں جن کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ پھر فرمایا:

﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۹ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۴۰﴾ ایسے لوگ پہلے لوگوں میں سے کثیر تعداد میں ہوں گے، اور پچھلے لوگوں میں بھی کثیر تعداد میں ہوں گے۔ پہلی امتوں کا ذکر یا اس امت کے پہلے لوگوں کا ذکر ہو اصحاب یمین بکثرت ہوں گے، سابقین کے متعلق تو بیان ہو چکا ہے کہ پہلوں میں زیادہ اور پچھلوں میں کم ہوں گے، مگر اصحاب یمین پہلے اور پچھلوں سب میں زیادہ تعداد میں ہوں گے، اور یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۥ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝۴۱ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝۴۲ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝۴۳ لَّا بَارِدٍ وَّ
لَا كَرِيْمٍ ۝۴۴ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝۴۵ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝۴۶ وَكَانُوْا
يَقُوْلُوْنَ ۥ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۴۷ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝۴۸ قُلْ اِنَّ

الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَیُّهَا الضَّآلُّوْنَ
الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ
الْحَمِیْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: اور جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے برے ہیں ﴿۴۱﴾ وہ لوگ سموم میں ہوں گے، اور کھولتے ہوئے پانی میں ﴿۴۲﴾ اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ﴿۴۳﴾ جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش ہوگا ﴿۴۴﴾ وہ لوگ اس سے پہلے بڑی خوشحالی میں رہتے تھے ﴿۴۵﴾ اور بڑے بھاری گناہ پر اصرار کیا کرتے تھے ﴿۴۶﴾ اور یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے اور ہڈیاں رہ گئے، تو کیا ہم دوبارہ زندہ کیے جائیں گے؟ ﴿۴۷﴾ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی زندہ کیے جائیں گے؟ ﴿۴۸﴾ آپ کہہ دیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے ﴿۴۹﴾ جمع کیے جائیں گے ایک معین دن پر ﴿۵۰﴾ پھر تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو ﴿۵۱﴾ درخت زقوم سے کھانا ہوگا ﴿۵۲﴾ سو اس سے پیٹ بھرنا ہوگا ﴿۵۳﴾ پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا ﴿۵۴﴾ پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کی طرح ہوگا ﴿۵۵﴾ ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ دعوت ہوگی ﴿۵۶﴾

معارف ومنازل

سابقین اور اصحابِ یمین کے حالات بیان کرنے کے بعد اب تیسرے ناکام گروہ اصحاب شمال اور اصحاب مشئمہ کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾﴾ اور بائیں ہاتھ والے اور کتنی بری حالت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی۔ ﴿فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ﴿۴۲﴾﴾ وہ زہریلا تند و تیز ہوا اور گرم پانی میں ہوں گے۔ بادِ سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں جس کے لگنے سے جسم جھلس جاتا ہے۔ تو فرمایا: اصحاب شمال کو تند و تیز اور زہریلے گرم ہوا سے واسطہ پڑے گا، اور جب انہیں پیاس ستائے گی تو انہیں کھولتا ہوا گرم پانی پلا دیا جائے گا، چنانچہ ایک گھونٹ پانی کے ساتھ وہ آنتوں کو کاٹ کر نیچے پھینک دے گا۔

﴿وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾﴾ وہ لوگ دھوئیں کے کالے سایہ میں ہوں گے۔ سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾﴾ [المرسلات] (ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی طرف تین شاخوں والے دھویں کی طرف چلو یہ، دھواں ایسا ہوگا جس کا سایہ ہی نہیں ہوگا، اور نہ یہ کسی تپش اور گرمی سے بچائے گا، بلکہ اس میں سے بڑے بڑے محلات جتنی بڑی

بڑی چنگاریاں نکلیں گی) جو اصحاب شمال کے لوگوں پر پڑیں گی۔ آگے اس دھویں کا مزید حال بیان کیا:

﴿لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيمٍ﴾ یہ دھواں نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی راحت پہنچانے والا، یہاں جس دھویں کا ذکر کیا جارہا ہے وہ دوزخ کی آگ کا سیاہ دھواں ہوگا، جس میں نا قابلِ برداشت حد تک تاریکی اور تپش ہوگی، اور اس سے اس طرح بدبو پھیل جائے گی کہ پناہ بخدا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سزاء کی وجوہات بیان فرمائیں:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ﴾ پہلی وجہ ہے کہ یہ لوگ اس سے پہلے دنیا میں بڑے آسودہ اور خوشحال تھے، اور عیش و عشرت میں پڑے رہتے تھے، ایمان و عمل کا مذاق اڑاتے تھے، اور خرمستی میں زندگی گزارتے تھے، اللہ تعالیٰ کی قدرتوں سے آنکھیں بند کر کے نابینا اور گونگے بہرے رہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بیان فرمائی:

﴿وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ﴾ کہ وہ بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ ﴿حِنْثِ الْعَظِيْمِ﴾ سے مراد کفر اور شرک ہے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ سب سے بڑا گناہ شرک ہے، یہ لوگ اسی شرک میں جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ لقمان میں ظلم عظیم فرمایا مبتلا رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تیسری وجہ یہ بیان فرمائی:

﴿وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٤٧﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ﴾ اور یہ لوگ منکرین قیامت یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی میں ریزہ ریزہ ہوجائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یا ہمارے اگلے باپ دادے بھی دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور نہ ہی یہ کوئی امکانی بات ہے، بلکہ یہ عقلاً محال ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ زندہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ آپ فرمادیجئے: بیشک اگلے بھی اور پچھلے بھی البتہ سب کے سب اکھٹے کئے جائیں گے، ایک مقررہ دن کے وعدے پر، اور یہ وہی قیامت کا دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ سب کو زندہ کر کے اپنے سامنے کھڑا کردے گا، پھر حساب و کتاب کی منزل آئے گی، اور جزاء و سزاء کے فیصلے ہوں گے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے مزید تفصیلات بیان فرمائیں:

﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿٥١﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿٥٢﴾﴾ پھر تو تم اے گمراہ لوگو جو تکذیب کرتے ہو توحید، رسالت، قیامت سب کو جھٹلاتے ہو یاد رکھو! جہنم تمہارے لئے ہے، اور جہنم میں تمہیں یہ سزاء بھی دی جائے گی گزشتہ سزاؤں کے علاوہ کہ تم زقوم کے درخت سے کھانے والے ہوں گے، جب تمہیں بھوک

ستائے گی تو کھانے کے لیے تمہیں تھوہر کا پھل دیا جائے گا۔ تھوہر کے پھل کا بیان سورۂ صافات اور سورۂ دخان میں گزر چکا ہے۔ فرمایا یہ لوگ بہ حالت مجبوری تھوہر کے پھل کو کھائیں گے:

﴿فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ﴾ اس تھوہر کے پھل سے اپنے پیٹوں کو بھر لیں گے، جب انہیں پیاس ستائے گی تو: ﴿فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۚ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ﴾ تو کھولتا ہوا گرم پانی پیئیں گے، پس وہ پیاسے اونٹ کی طرح پینے والے ہوں گے، اونٹ کو ایک مرض لگ جاتا ہے جس کو کہا جاتا ہے استسقاء، استسقاء والا اونٹ جتنا پانی پی لیتا ہے اس کی پیاس نہیں بجھتی، پھر وہ بہ کثرت پانی پیتا ہے تو اس کے حلق (گلے) سے ایک آواز نکلتی ہے جو بڑی خطرناک ہوتی ہے، یہی حال جہنمیوں کا ہوگا (العیاذ باللہ)۔ آگے فرمایا:

﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ انصاف کے دن ایسے لوگوں کی یہی مہمان نوازی ہوگی، اس سزاء کو اللہ تعالیٰ نے تحکمانہ طور پر مہمان نوازی کا نام دیا ہے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [التوبة: ۳۴] (ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادیں) بشارت کا استعمال خیر میں ہوتا ہے، مگر تحکمانہ طور پر شر میں بھی اس کا استعمال ہوا۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ نَحْنُ
قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا
لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ
تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ
مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ
نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ
نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝

ترجمہ: ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ ۵۷ اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو منی پہنچاتے ہو ۵۸ اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟ ۵۹ ہم ہی نے تمہارے درمیان میں موت کو ٹھہرا رکھا ہے، اور ہم اس

سے عاجز نہیں ہیں ﴿۶۰﴾ کہ تمہاری جگہ تم جیسے پیدا کر دیں، اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے بھی نہیں ﴿۶۱﴾ اور تم کو اول پیدائش کا علم حاصل ہے، پھر تم کیوں نہیں سمجھتے؟ ﴿۶۲﴾ اچھا پھر بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو ﴿۶۳﴾ اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟ ﴿۶۴﴾ اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کر دیں، پھر تم متعجب ہو کر رہ جاؤ ﴿۶۵﴾ کہ ہم پر تاوان ہی پڑ گیا ﴿۶۶﴾ بلکہ بالکل ہی محروم رہ گئے ﴿۶۷﴾ اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو ﴿۶۸﴾ اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں؟ ﴿۶۹﴾ اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا کر دیں، سو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ ﴿۷۰﴾ اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو ﴿۷۱﴾ اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿۷۲﴾ ہم نے اس کو یاد دہانی کی چیز اور مسافروں کے فائدہ کی چیز بنا دیا ہے ﴿۷۳﴾ سو اپنے عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح بیان کیجئے ﴿۷۴﴾

معارف ومنازل

قیامت واقع ہونے کے بعد انسان تین گروہوں (سابقین، اصحاب یمین اور اصحاب شمال) میں تقسیم ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کی جزاءِ عمل کی تفصیل بیان کر دی، اب ان آیات میں پہلے توحید اور قیامت کے کچھ دلائل بیان کئے ہیں، اس کے بعد رسالت اور قرآنِ مجید کا ذکر آنے والا ہے، جس کے ساتھ سورت کا اختتام ہوگا۔

فرمایا: ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ﴾ ہم نے تم کو پیدا کیا ہے پس تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ ہر چیز کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے جس سے کوئی بھی صاحبِ عقل انکار نہیں کر سکتا، جب خالق، مالک اور متصرف وہ ہے تو پھر وہ موت طاری کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے، اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، اگر یہ بات سمجھ میں آتی ہے تو پھر تم اس کی وحدانیت اور وقوعِ قیامت اور بعث بعد الموت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ بھلا تم ان چیزوں کا کیسے انکار کر سکتے ہو؟ پھر تخلیق انسانی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ بھلا دیکھو تو کہ تمہارا کام تو صرف اتنا ہے کہ تم عورت کے رحم میں پانی کا قطرہ ٹپکا دیتے ہو، اور اس کے بعد رحم مادر میں پرورش پانے والے بچے کو تم پیدا کرتے ہو، یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسانی کو ایک عام فہم دلیل کے ذریعے سمجھایا ہے کہ آدمی کا کام تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ مباشرت کر کے علیحدہ ہو جاتا ہے، اور پھر نو ماہ کے عرصہ میں اس قطرۂ آب کو مختلف حالتوں سے عجیب وغریب مراحل سے گزار کر اسے گوشت و پوست اور ہڈیوں کے مجموعہ کی صورت میں شکمِ مادر

میں کون پرورش کرتا ہے؟

سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ﴾ [آل عمران:٦] (اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے شکمِ مادر میں تمہاری تصویر کشی کرتا ہے)۔ سورۃ المؤمنون میں یہ ارشاد فرمایا کہ جب مرد نے عورت کے رحم میں قطرۂ آب ٹپکا دیا تو ہم نے اس نطفے کا لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے سے بوٹی بنائی، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اس کو نئی خوبصورت شکل میں بنا دیا۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ١٤] (پس اللہ تعالیٰ بڑا ہی بابرکت ہے جو بہترین بنانے والا ہے)۔

حدیث شریف میں بھی پیدائش کی بعض تفصیلات بیان ہوئی ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ماں کے پیٹ میں مختلف تبدیلیوں کے ذریعے بچے کی تکمیل کرتا ہے، اور ہر تبدیلی چالیس دن کے بعد عمل میں آتی ہے، حتیٰ کہ بچے کے اعضاء جوڑ، ہڈیاں، بال، کھال، اور تمام ظاہری و باطنی قوتیں پیدا ہو کر بچہ مکمل صورت میں باہر آ جاتا ہے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے خود انسانی وجود کو اپنی وحدانیت اور قدرت کی دلیل بنایا ہے، اور دریافت فرمایا ہے کہ کیا تم نے یا کسی حکیم یا ڈاکٹر یا سائنس دان نے انسان کو بنایا ہے یا ہم نے بنایا ہے؟ فرمایا: ہم نے تمہیں پیدا کیا، اور ایک خاص وقت تک تمہیں زندگی دی، اور لطیف و حیرت انگیز طور پر تمہاری تخلیق فرمائی، تم ذرا یہ دیکھو کہ دنیا میں اربوں انسان موجود ہیں مگر کوئی دو اشخاص شکل و صورت میں، آنکھوں میں، ہاتھوں کی لکیروں میں بعینہٖ ایک جیسے نہیں ملتے، یہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہے، پھر فرمایا:

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ﴾ وہ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کر دیا ایک مقررہ وقت پر، ہر شخص موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے، پھر اس شخصی موت کے بعد پوری کائنات کی مجموعی موت کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے، جب یہ پورا سلسلہ کائنات کا ختم ہو جائے، اور علویات و سفلیات چاند سورج ستارے آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے جس کے ساتھ سمندروں میں آگ لگ جائے گی، اور پہاڑ گرد و غبار کا منظر پیش کریں گے، اسی کا نام قیامت ہوگا۔ ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ﴾ اور اس کام سے ہم عاجز آنے والے نہیں ہیں، یہ سارا کام ہمارے ایک کُنْ فَيَكُوْن کا نتیجہ ہوگا۔ پھر فرمایا: ہم اس بات پر بھی قادر ہیں:

﴿عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ﴾ کہ تمہیں ختم کر دیں اور تمہاری جگہ دوسرے لوگ تبدیل کر دیں۔ سورۂ فاطر میں فرمان ہے: ﴿اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ [ابراھیم:١٩] (اگر وہ چاہے تو تم کو نیست و نابود

کر دے، اور تمہاری جگہ نئی خلوق لے آئے)۔ بعض مفسرین نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ تم انسان بنے پھرتے ہو، اگر ہم چاہیں تو تمہاری شکلیں تبدیل کر کے بندروں اور خنزیروں جیسی کر دیں جیسا کہ سابقہ اقوام کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہی سزادی۔ ﴿وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تمہیں ہم ایسی جگہ اٹھائیں جس کو تم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر کے دوسرے جہاں میں حساب و کتاب کے لیے اپنے سامنے کھڑا کر دے۔

پھر فرمایا: ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ اور البتہ تم پہلی پیدائش کو تو جانتے ہو، تمہیں یقین ہے کہ تم خود بھی پیدا ہوئے تھے، اور اپنے سامنے دوسروں کو بھی پیدا ہوتے دیکھ رہے ہو، یہ پہلی پیدائش صرف انسانوں کی نہیں بلکہ تمام حیوانات چرند پرند نباتات کی پیدائش تمہارے سامنے ہے، جس کا صبح شام تم مشاہدہ کرتے ہو، پھر اس مشاہدہ سے نصیحت کیوں نہیں پکڑتے ہو؟ یاد رکھو! شاعر نے کیا ہی خوب کہا: ؎

پندار کے خوگر کو ناکام بھی دیکھو گے ☆ آغاز سے واقف ہو انجام بھی دیکھو گے

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی پہلی تخلیق کا ذکر کر کے دوبارہ تخلیق پر دلیل قائم کی ہے، اگر انسان ذرا بھی غور وفکر کرے تو اسے جزاءِ عمل کی بات اور دوبارہ تخلیقِ قیامت کے وقت دوبارہ اس کو زندہ کرنا سب کچھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝۶۳ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ بھلا بتلاؤ کہ تم جو کچھ زمین میں کھیتی کرتے ہو، اور زمین میں بیج ڈالتے ہو، تو کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہیں اس کے اگانے والے؟ ظاہر ہے کہ زمین کی تہہ میں سے اس تخم کو پھاڑ کر نکالنا، اور پھر ایک گھاس کے تنکے کا نشو ونما کرنا، یہاں تک کہ وہ پلے پھولے اور شاداب ہو، اس پر غلّے کے دانے لگیں، پھر پکیں، پھر ان کو کاٹا جائے، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی شانِ خالقیت ہے، جو ہر مرحلہ اور تغیر پر نظر آرہی ہے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾ [عبس:۲۶] (پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا اور اس میں اناج اگایا) جو تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے خوراک مہیا کیا، یہ سب کچھ کرنے والے ہم ہیں۔

﴿لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا﴾ اگر ہم چاہیں تو تمہاری کھیتی کو پامال شدہ بنادیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے، مگر کوئی ایسی آسمانی یا زمینی آفت آجاتی ہے جو اس کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، یا پکی پکائی فصل آندھی یا سیلاب کی نذر ہو جاتی ہے۔

﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ﴾ اور تم باتیں بناتے ہی رہ جاتے ہو، اپنی فصل کو برباد ہوتے دیکھ کر تم زبان سے اس

پر افسوس کا اظہار ہی کر سکتے ہو، تمہارے اندر اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ اپنی فصل کو بچا سکو سوائے اس طرح کہنے کے:
﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ کہ ہم پر تو تاوان ہی پڑ گیا ہے، ہماری ساری محنت ضائع ہو چکی، بلکہ ہم تو کھیتی کے فوائد سے محروم ہو گئے، ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا، سارے سال کی محنت پر پانی پھر گیا۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں کھیتی باڑی کرنے والے ہم ہیں، اور اس کو اگانے اور تیار کرنے والا اللہ ہی ہے۔ آگے ارشاد فرمایا:
﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾ بھلا اس پانی کو تو دیکھو جو تم روز مرہ پیتے ہو، اور سوچ کر بتاؤ کہ کیا اس پانی کو سفید بادلوں سے تم نے اتارا ہے یا ہم اس کو اتارنے والے ہیں؟ جس پانی پر ہر چیز کی زندگی موقوف ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [الأنبياء: ٣٠] (ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی ہے) اور اس کا کنٹرول ہمارے قبضۂ قدرت میں ہے۔
مطلب یہی ہے کہ پانی اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے جس سے اس کی مخلوق مستفید ہوتی ہے، انسان ایک بوند پانی اتارنے پر قادر نہیں۔ آگے فرمایا:
﴿لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ﴾ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری بنا دے جو نہ پینے کے کام آسکے اور نہ فصلوں کو سیراب کر سکے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں میٹھا پانی مہیا کر کے تم پر بہت بڑا احسان کیا ہے پس تم اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی جیسی عظیم نعمت کے اعتراف میں یہ دعا سکھلائی ہے: **الحمد لله الذي سقانا عذباً فراتاً برحمته ولم يجعله ملحا أجاجاً بذنوبنا**۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمیں اپنی رحمت سے میٹھا اور خوشگوار پانی پلایا، اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اسے کھاری اور تلخ نہیں بنا دیا۔ آگے فرمایا:
﴿اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ﴾ بھلا بتلاؤ تو یہ آگ جس کو تم سلگاتے ہو کیا اس آگ کو جلانے کے لیے درخت تم پیدا کرتے ہو یا ہم؟ ہم ہی اس کو پیدا کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آگ لکڑی جلانے سے پیدا ہوتی ہے، اور لکڑی حاصل کرنے کے لئے درختوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے، علیٰ ہذا القیاس کوئلہ گیس تیل اور توانائی کے اکثر اشیاء اللہ تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے۔ ابن ماجہ شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آگ پانی اور گھاس تین ایسی مشترک اشیاء ہیں جن سے فائدہ اٹھانا ہر شخص کا حق ہے، اور ان اشیاء سے استفادہ کرنے سے کسی شخص کو منع نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں! البتہ ان میں

سے کوئی چیز اگر کسی کی ذاتی ملکیت ہو تو پھر مالک کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہو گی۔

فرمایا: ﴿نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ﴿۷۳﴾﴾ ہم نے اس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنادیا ہے تاکہ انسان اس آگ کو دیکھ کر اس کو دوزخ کی آگ یاد آجائے، اور وہ اپنے بچنے کی کوئی تدبیر عمل میں لائے، ایمان اور توحید اختیار کر کے دوزخ کی آگ سے ہمیشہ کے لیے نجات پائے، اس کے علاوہ یہی آگ صحراؤں اور جنگلوں کے مسافروں کے لیے فائدے کا سامان بھی ہے، جنگلوں اور صحراؤں کے مسافر دورانِ سفر کھانا پکانے اور دوسری ضروریات کے لیے آگ کا استعمال کرتے ہیں، اور رات کی تاریکیوں میں بسا اوقات قافلہ والے اپنے ساتھیوں سے بھٹک جاتے ہیں، پھر آگ جلا کر ان کو اپنے پاس بلانے کی تدبیر کرتے ہیں، ان کے گمشدہ ساتھی آگ کو دیکھ کر سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں، ان انعامات اور دلائلِ قدرت کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ﴾ پس آپ عظمتوں والے پروردگار کے نام کی تسبیح بیان کریں کہ اس نے تمہیں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا، اور وہ سامان جو تمہاری بقاء کے لئے ضروری ہو تمہارے لئے مہیا فرمایا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾
فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا
الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ: سو میں مواقعِ نجوم کی قسم کھاتا ہوں ﴿۷۵﴾ اور بیشک یہ بڑی قسم ہے اگر تم جانتے ہو ﴿۷۶﴾ بیشک وہ قرآن کریم ہے ﴿۷۷﴾ محفوظ کتاب میں ﴿۷۸﴾ اسے نہیں چھوتے ہیں مگر پاکیزہ لوگ ﴿۷۹﴾ یہ اتارا ہوا ہے ربّ العالمین کی طرف سے ﴿۸۰﴾ کیا تم اس کام کو سرسری سمجھتے ہو؟ ﴿۸۱﴾ اور تم نے اپنا حصہ یہی تجویز کر لیا ہے کہ جھٹلاتے رہو؟ ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قرآن کریم کی عظمت بیان فرمائی ہے، اور مواقعِ نجوم کی قسم کھا کر فرمایا کہ بلاشبہ قرآن کریم عزّت والی، عمدہ اور پاکیزہ چیز ہے، بندوں کو نفع دینے والا ہے، اور محفوظ کتاب میں ہے، جیسے سورۃ

البروج میں فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝٢١ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝٢٢﴾ [البروج] (بلکہ وہ قرآن مجید ہے لوحِ محفوظ میں) وہ لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے، اس میں کسی تغیر وتبدل کا امکان نہیں۔

مواقع النجوم سے کیا مراد ہے؟

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے آسمان کے ستاروں کے غروب ہونے کی جگہیں مراد ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مطالع النجوم مراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نجوم سے نجوم القرآن مراد ہیں۔

نجوم نجم کی جمع ہے جو ستارہ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور قسط وار جو کوئی چیز دی جائے اس کی تھوڑی تھوڑی ادائے گی کو بھی نجم کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑا تھوڑا قرآن مجید نازل ہو رہا ہے، جسے فرشتے لوحِ محفوظ سے لے کر آتے ہیں تو ان نجوم اور اقساط کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن جو بالاقساط نازل ہو رہا ہے لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے، اس کتاب محفوظ تک انسانوں اور جنات کی رسائی نہیں ہو سکتی، اور ان کو اس میں تصرف کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ﴾ پس میں قسم اٹھاتا ہوں ستاروں کی غروب ہونے کی جگہوں کی۔

﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ﴾ اور یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانتے ہو۔

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ بیشک البتہ یہ عزّت والا قرآن ہے۔ ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ جو کہ ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا ہوا ہے، اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے آدابِ قرآن کے سلسلے میں اس کو چھونے اور ہاتھ لگانے کا مسئلہ بیان فرمایا:

﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ قرآن کو نہیں چھوتے مگر پاکیزہ لوگ۔ یہ صیغہ اگرچہ اپنے معنی کے اعتبار سے ایک خبر ہے مگر اس کا حکم انشاء کے معنی میں ہے کہ اس کو بغیر وضوء اور طہارت کے ہاتھ مت لگاؤ، اگر خبر کے معنی میں اس کو استعمال کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اس کو پاکیزہ فرشتوں نے چھوا بھی ہے، اور ہاتھ لگایا بھی ہے، اور منتقل بھی کیا ہے۔

قرآن کریم کو ہاتھ لگانے اور چھونے وغیرہ سے متعلق بہت سارے مسائل ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں، وہاں رجوع فرمائیں۔

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا ہوا ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، یہ کوئی جادو کہانت اور شاعری کی پیداوار ہرگز نہیں ہے، اور رہتی دنیا تک اس کا چیلنج برقرار ہے کہ اگر کسی کو اس کی

حقانیت میں شک ہے تو اس کی ایک چھوٹی سورت جیسی سورت کوئی لائے، مگر اس چیلنج کو آج تک کسی نے قبول نہیں کیا، اور نہ ہی کسی کے بس میں ہے۔ پھر فرمایا:

﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ﴾ کیا تم اس بات میں سستی کرتے ہو؟ جو کتاب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے نازل فرمائی ہے، تو یاد رکھو اس بارے میں مداہنت یا سستی کا اظہار بہت بری بات ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا پاکیزہ کلام ہے جو تمہارے لئے فوز و فلاح کا ضامن ہے، اگر اس کو سینے کے ساتھ لگاؤ گے، اس پر عمل کرو گے اور اس کا نظام اپنے معاشرے میں جاری کرو گے تو جس طرح وہ خود محفوظ ہے اسی طرح تمہاری حفاظت کا ضامن بھی رہے گا، ورنہ دنیا ہی کی زندگی میں آخرت سے پہلے پہلے ذلت کا سامنا کرو گے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہوکر ☆ تم خوار ہوئے تارک قرآن ہوکر

آگے فرمایا: ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ اور اس میں تم اپنا حصہ اس طرح ٹھہراتے ہو کہ اس کی تکذیب کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کے حصول پر شکر ادا کرنے کی بجائے اس کو جھٹلاتے ہو، اور ناشکری کرتے ہو، جس کا انجام تمہارے لئے تباہ کن ہوگا۔

❁ ❁ ❁

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا
تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ
مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ
لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّ
تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: سو جس وقت روح حلق تک پہنچتی ہے ﴿۸۳﴾ اور تم اس وقت تکتے رہتے ہو ﴿۸۴﴾ اور ہم تم سے بھی زیادہ اس کے نزدیک ہوتے ہیں، لیکن تم سمجھتے نہیں ہو ﴿۸۵﴾ سو اگر تمہارا احساب و کتاب ہونے والا نہیں ہے ﴿۸۶﴾ تو تم اس روح کو کیوں نہیں لوٹا لیتے؟ اگر تم سچے ہو ﴿۸۷﴾ پھر جو شخص مقربین میں سے ہوگا ﴿۸۸﴾ اس کے لیے راحت ہے اور غذائیں ہیں ﴿۸۹﴾ اور آرام کی جنت ہے ﴿۸۹﴾ اور جو شخص دائیں والوں میں سے ہوگا ﴿۹۰﴾ تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے سلامتی

ہے تو دائیں والوں میں سے ہے ﴿۹۱﴾ اور جو شخص جھٹلانے والوں گمراہوں میں سے ہوگا ﴿۹۲﴾ تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی ضیافت ہوگی ﴿۹۳﴾ اور وہ دوزخ میں داخل ہوگا ﴿۹۴﴾ بے شک یہ تحقیقی یقینی بات ہے ﴿۹۵﴾ سو اپنے عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے ﴿۹٦﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی بے بسی ظاہر فرمائی ہے جو موت کے وقت ظاہر ہوتی ہے، پھر انسانوں کی انہی تینوں جماعتوں (سابقین، اصحاب یمین اور اصحاب شمال) کا ثواب وعذاب بیان فرمایا ہے جن کا شروع میں تذکرہ فرمایا تھا۔ فرمایا: موت اور حیات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں اچھے عمل والا کون ہے، لہٰذا زندگی کے بعد موت بھی ضروری ہے، اور ان دونوں میں سے بندوں کو کسی کے بارے میں کچھ بھی اختیار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی دی وہی موت بھی دے گا، اس نے دونوں کا وقت مقرر اور مقدر فرمایا ہے، اس کے اختیار کے بغیر نہ کوئی زندہ رہ سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے، تو ارشاد فرمایا:

﴿فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ﴾ جب مرنے والے کی روح حلق کو پہنچ جاتی ہے تو تم وہاں موجود ہوتے ہو، اسے حسرت کی آنکھوں سے ٹک ٹک دیکھا کرتے ہو، اور اس پر ترس کھاتے ہو، اور تمہاری آرزو ہوتی ہے کہ اسے موت نہ آئے، یہ چند وقت اور مزید زندہ رہے، اس وقت تم سارے کے سارے بے بس اور بیقرار ہو، نہ تمہارے پاس اختیار ہے، نہ مرنے والے کے پاس، پوری دنیا کی فوجوں کو چوکنا اور تیار رکھو مجال نہیں کہ کوئی اس مرنے والے کی موت کو روک دے، اور اس وقت ہم بنسبت تمہارے مرنے والے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، کیونکہ تم صرف اس کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہو، اور ہم اس کی باطنی حالت پر بھی مطلع ہو جاتے ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے، تو اگر تم یہ سمجھتے ہو اور اپنے خیال میں سچے ہو کہ تمہیں اعمال کے بدلے دیئے جانے والے نہیں ہیں تو مرنے والے کی موت کو روک کر دکھا دو، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی موت کا وقت مقرر فرمایا ہے، وہ اپنے فرشتے بھیجتا ہے جو مرنے والے کی آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے، یہ مجمع عام طور مرنے والے کے قریب اور رشتہ داروں کا مجمع ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مجمع مرنے والے کے محافظ مسلح سپاہیوں کا ہوتا ہے، مگر انہیں سوائے رونے اور حسرت وافسوس کرنے کے کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ مرنے والے کی موت کو روک دیں یا ٹال دیں یا مؤخر کر دیں، قدرت کے فیصلہ کے سامنے دنیا ہو یا آخرت کا

میدانِ حساب وکتاب ہو سب بے اختیار اور بے بس ہوتے ہیں۔ پس چاہئے کہ اس بے اختیاری اور بے بسی کے ہوتے ہوئے اپنے سارے اعمال کا اور زندگی کے احوال کا ملاحظہ کرتے ہوئے اپنے تمام تر معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں، اور اس کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے ابدی سعادت حاصل کریں۔

﴿وَاَنْتُمْ حِیْنَىٕذٍ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور تم اس وقت مرنے والے کی حالت کو دیکھ رہے ہوتے ہو، مگر کسی کا کوئی بس نہیں چلتا۔ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ مگر ہم تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں، مگر تم ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔ ﴿فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ﴾ کہ تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا، اور دنیا کی کارکردگی کے متعلق باز پرس نہیں ہوگی، اور تمہیں سزاء یا جزاء نہیں ملے گی۔ فرمایا: اگر ایسی بات ہے:[

﴿تَرْجِعُوْنَهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ تو پھر اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنے عزیز کے جسم سے نکلنے والی روح کو واپس کیوں نہیں لوٹا لیتے ہو؟ اگر تمہیں ہمت ہے تو آؤ اسے موت کے منہ سے نکال کر دکھاؤ، تو ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے تم بے بس ہو، پس ظاہر ہے کہ قیامت کے دن حساب وکتاب کے وقت سزاء وجزاء کے فیصلے کے متعلق بھی بے بس رہو گے، پس تمہیں چاہئے کہ آج دنیا میں زندہ ہوتے ہوئے بغیر کسی سرکشی اور بغض وعناد کے حق کو تسلیم کرلو تاکہ برے انجام سے بچ جاؤ۔

آگے مقربین کی جزاء کا ذکر فرمایا: ﴿فَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِیْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ پھر اگر وہ مرنے والا اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہے، اس کے عقائد واعمال اعلیٰ درجے کے اونچے ہیں تو راحت خوشی اور روزی اور نعمتوں کے باغ میں ہوگا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے اونچے مقامات پر پہنچایا جائے۔ امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ملک الموت کو حکم ہوتا ہے کہ فلاں آدمی کی جان قبض کرلو تاکہ میں اس کو راحت پہنچاؤں، چنانچہ عزرائیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت (ایک روایت میں پانچ سو فرشتوں کا ذکر آیا ہے) کے ساتھ اس شخص کے پاس آتے ہیں، اور ان کے پاس تین قسم کے رومال ہوتے ہیں جو پاکیزہ خوشبوؤں سے لبریز ہوتے ہیں، مرنے والا ان خوشبوؤں کو پاکر خوش ہوجاتا ہے، اور اس طرح اسے جان قبض ہونے سے پہلے ہی کامیابی کی بشارت مل جاتی ہے، اور فرشتے اسے بشارت سناتے ہیں، اور اسے کہتے ہیں: اے پاکیزہ روح! تو نے اس جسم کو آباد رکھا، اب راحت، پاکیزہ روزی، اور اپنے پروردگار کی طرف نکل چل جو ناراض نہیں ہے (تمہارے آنے پر راضی ہے)۔ اس طرح گویا اس نیک آدمی کو خوش خبری مل جاتی ہے۔

اس حدیث کے راوی براء بن عازب رضی اللہ عنہ ہیں ۔[تفسیر ابن کثیر]

اس کے بعد دوسرے نمبر پر اصحاب یمین کی جزاء کا ذکر فرمایا: ﴿وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۝۹۰ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ اور اگر کوئی شخص دائیں ہاتھ والوں میں سے ہوگا پس سلامتی ہے تیرے لئے دائیں طرف والوں میں سے، ایسے لوگوں کے لیے ہر طرف سے سلام سلام کی آوازیں آئیں گی فرشتوں کی طرف سے بھی جنتیوں کی طرف سے بھی، سورۂ یٰسٓ میں فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِيْمِ﴾ [یٰس:۵۸] (رحمت والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا)۔

تیسرے نمبر پر اصحاب شمال دوزخیوں کے انجام کا بیان فرمایا: ﴿وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ۝۹۲ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ۝۹۳ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ﴾ اگر وہ مرنے والا جھٹلانے والوں میں سے ہوگا اور بھکے ہوئے گمراہوں میں سے ہوگا تو ایسے شخص کا بدلہ کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی کی صورت میں ہوگا اور اس کا انجام جہنم میں ڈالا جانا ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرب کے ایک بہت بڑے اور بے مثال سخی آدمی عبداللہ بن جدعان کے متعلق دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ جہنم میں ہے، کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں ایک دن بھی یہ نہ کہا کہ اے پروردگار! انصاف کے دن میری خطاؤں کو معاف کردینا، کیونکہ وہ وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کا منکر تھا، اور یہ واضح بات ہے کہ پہاڑوں جتنی نیکیاں بغیر ایمان کے کارگر نہیں ہوتیں، اور تمام اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ﴾ بے شک یہ جزاء اور سزاء بالکل سچی اور یقینی ہے، نہ یہ کسی کے جھٹلانے سے ٹل سکتی ہے، نہ کسی کے انکار سے کوئی فرق آسکتا ہے، نیکیوں کے لیے جزاء اور مجرموں کے لیے سزاء ایک اٹل فیصلہ ہے، اسے کوئی نہ ٹال سکتا ہے نہ کم و زیادہ کرسکتا ہے۔ آخر میں پھر ارشاد فرمایا

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ پس آپ اپنے عظمت والے پروردگار کے نام کی تسبیح بیان کریں، جو عظمتوں کا مالک ہے، اور ہر طرح تعریف وتحمید کا حقدار ہے۔

سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم نستغفر اللہ و نتوب إلیہ۔ اللّٰھم اجعلنا من السابقین و من أصحاب الیمین، و لا تجعلنا من أصحاب الشمال الضالین، إنک أنت التواب الرحیم الملک البر الرؤف الرحیم، بجاہ سید المرسلین و سیدنا محمد صلی اللہ علیہ و علی آلہ و أصحابہ أجمعین امین یا رب العالمین۔

سُورَۃُ الحدید

مدنیۃٌ آیاتها ۲۹ رکوعاتها ۴

سورۂ حدید مدنی ہے، اس میں انتیس (۲۹) آیتیں، اور چار (۴) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الحدید ہے جو اس سورت کی ۲۵ ویں آیت میں موجود لفظ الحدید سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۵۷ ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۹۴ ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مدنی ہے، اس کا نزول سورۃ الزلزال کے بعد ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں چار (۴) رکوع، انتیس (۲۹) آیات، پانچ سو چھتّر (۵۷۶) کلمات، اور دو ہزار پانچ سو ننانوے (۲۵۹۹) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

(۱)۔گزشتہ سورت میں شرک کی تردید باللسان کا ذکر تھا، اس سورت میں بالسیف والسنان کا ذکر ہے۔

(۲)۔گزشتہ سورت کے آخر میں تسبیح کا ذکر تھا، اس سورت کی ابتداء میں بھی تسبیح کا ذکر ہے۔

(۳)۔گزشتہ سورت کے آخر میں قیامت کا ذکر تھا، اس سورت کی شروع میں توحیدِ خداوندی کا ذکر ہے۔

مختصر موضوع:

عظمتِ خداوندی، عجزِ ماسوی اللہ، تذکیراتِ ثلاثہ، صداقتِ قرآن، اثباتِ رسالت، نتائجِ فریقین، ترغیبِ انفاق فی سبیل اللہ، ترغیبِ ایمان، ترغیبِ جہاد، اسبابِ گمراہی، دنیا کی بے ثباتی کی مثال، تسلیات اور تخویفات، اہل کتاب کے لیے اصولِ کامیابی، حضرت نوح وابراہیم علیہما السلام کے خاندان کے فضائل، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فضائل اور ان کے متبعین ومخالفین کے نتائج وغیرہ کا بیان ہے۔ اس سورت میں ایک آیت ہے جو ہزار آیتوں سے افضل ہے، یعنی: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ [ابن کثیر]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ② هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ③ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا
يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا
كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ④ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ⑤
يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑥

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے① اسی کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، وہی حیات دیتا ہے اور موت دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے② وہی اول ہے، وہی آخر ہے، اور وہی ظاہر ہے، اور وہی باطن ہے، اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے③ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے، اور جو اس میں سے نکلتی ہے، اور جو آسمان سے اترتی ہے، اور جو اس میں چڑھتی ہے، اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم کہیں بھی ہو، اور وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھتا ہے④ اسی کی سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اور اللہ

تعالیٰ ہی کی طرف سب امور لوٹ جائیں گے ۵ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے، اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور وہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے ۶

معارف ومنازل

اس سورت کے شروع میں حق تعالیٰ شانہ کی عظمت وکبریائی اور اس کی پاکیزہ صفات کا تسلسل سے بیان ہے جو کہ عجیب پر رونق اور دلکش ہے، اور یہ کہ کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح وپاکی بیان کرنے میں مصروف ہے، اور کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کی قدرت وعظمت اور وحدانیت کی گواہی دے رہا ہے، پھر یہ کہ وہ ایسا اول ہے کہ اس کی کوئی ابتداء نہیں، اور ایسا آخر ہے کہ اس کی کوئی انتہاء نہیں، اور وہ ظاہر ہے کہ اس کی قدرت وکمالات کا جلوہ ہر موجود مخلوق میں ظاہر ہے، اور وہ باطن ہے ایسا کہ نگاہوں اور افکار وعقول کی پرواز سے بالاتر ہے، اس کے بعد اہل ایمان کو انفاق وایثار کی دعوت دی گئی ہے، اور تخلیق کائنات کا بھی ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے، فرشتوں کے متعلق سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے: ﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾[الأنبیاء:۲۰] (وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں مگر تھکتے نہیں)۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾[الإسراء:۴۴] (ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے، اس کی تعریف کے ساتھ، مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے) ان کی زبان کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آسمانی وزمینی تمام مخلوقات جاندار، بے جان جمادات، نباتات، الغرض ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح وثناء میں مصروف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سارے فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح ان چاروں کلمات کے ساتھ: **سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر** کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کا کم ازکم اتنا حصہ ضرور ہونا چاہئے کہ دن میں سو مرتبہ ان کلمات کو پڑھا کرے۔ فرمایا: ہر چیز اس کی تسبیح بیان کرتی ہے۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اور وہ ذات غالب زبردست حکمتوں کی مالک ہے۔ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ﴾ آسمانوں اور زمین کی سلطنت بھی اسی کی ہے، کائنات کا کوئی گوشہ اس کی سلطنت سے باہر نہیں ہے، اور پوری کائنات پر اسی کا تصرف ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت طاری کرتا ہے، اور ہر قسم کی بقاء

وفناو جود وعدم، عروج وزوال اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، کوئی بھی چیز اس کے اختیار سے باہر نہیں، اس کی وحدانیت وقدرت کا یہ حال ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ سب سے پہلے بھی وہی ہے، اور سب سے آخر میں بھی وہی ہے، اور ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے۔ ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن کے وقفے میں پیدا فرمایا۔ وہ تو ہر چیز کو ایک لحظہ میں پیدا کرنے پر قادر ہے، مگر چھ دن کے وقفہ میں بھی اس کی خاص مصلحت اور خاص حکمت ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ قرآن مجید میں استویٰ علی العرش کا کئی مقامات پر ذکر آیا ہے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا اس طرح نہیں جس طرح ہم کسی پلنگ، کرسی یا تخت پر بیٹھتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا استویٰ اسی طرح ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے، اور جو ہماری عقل وفہم سے بالاتر ہے، اور یہ متشابہات میں سے ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے استویٰ علی العرش کا مطلب یہ ہے کہ وہ عرش عظیم پر اپنی تجلی اعظم ڈالتا ہے، جس سے سارا عرش اور اس سے نیچے ساری کائنات رنگین ہو جاتی ہے، اور پھر اس تجلی کے تغیرات اور آثار پلٹ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ تجلیات کب سے پڑ رہی ہیں؟ اور کب تک پڑتی رہیں گی؟ اس کو کوئی انسان نہیں جان سکتا۔ آگے اپنے علمِ محیط کے متعلق فرمایا:

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا﴾ وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے، اور جو چیز زمین سے نکلتی ہے، یعنی وہ بے شمار چیزیں جو زمین کے اندر ہیں یا زمین سے باہر نکلتی ہیں ان سب پر اس کا علم محیط ہے۔

﴿وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا﴾ اور وہ ان اشیاء کو بھی جانتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں، اور جو نیچے سے آسمان کی طرف چڑھتی ہیں۔ آسمان سے نازل ہونے والی اشیاء مثلاً بارش، قضا وقدر کے فیصلے، مخلوقات کی روزی، ترقی وتنزل، عزت وذلت وغیرہ، اور نیچے سے اوپر چڑھنے والی چیزیں مثلاً انسانوں کے اعمال اور کرۂ ارض کے وہ تمام حالات جو صبح شام رونما ہوتے ہیں۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ سورۂ مجادلہ میں فرمایا:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [المجادلة:۷] (وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی ہوں)۔

محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ معیت اس کے علم، قدرت اور تصرف کے ساتھ ہے۔ تاہم دوسرے بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ اس معیت سے مراد مطلق معیت ہے، یعنی علم، قدرت اور تصرف کے ساتھ تو ہے ہی، مگر ذاتی معیت بھی ہے، وہ ذاتی اعتبار سے بھی تمہارے ساتھ ہے، جیسا کہ سورۃ ق میں گزر چکا ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق:۱۶] (ہم تو انسان کی شہرگ سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں)۔ یہ معیتِ ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ بے کیف بھی ہے، اس کی کیفیت کو کوئی بیان نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کو مخلوق کی ایک دوسرے کے ساتھ قربت و معیت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے اسی کو کہا: ؎

ہست ربّ الناس را با جان ناس ☆ اتصال بے تکیف بے قیاس

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو لوگوں کی جانوں کے ساتھ اتصال حاصل ہے، مگر یہ معیت کیفیت اور قیاس کے بغیر ہے، ہم اس کی حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں اہل حق اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آخرت میں اہل ایمان کو حاصل ہوگی، مگر آج کوئی بھی اس کی کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال! اللہ کی معیت ہر انسان کے ساتھ ذاتی بھی ہے مگر بے کیف۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ اور جو کام کرتے ہو اللہ دیکھنے والا ہے، تمہارے سارے اعمال اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ آسمان اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے، اس کے تسلط سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، اور تمام معاملات اسی کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں، قیامت کے دن اسی کی بارگاہ میں پیشی ہوگی، اور پھر ہر ایک کی جزاء وسزا کا فیصلہ اسی کے اختیار میں ہوگا۔ یہی مطلب ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [الفاتحة:۳] (روزِ جزاء کا مالک ہے) کا۔

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، کبھی رات بڑی ہوتی ہے اور کبھی دن بڑا ہوتا ہے، اسی وجہ سے سال بھر میں چار موسم: گرما، سرما، بہار اور خزاں آتے ہیں۔ ﴿وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ اور وہ دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے، اس کو علم ہے کہ کس کے دل میں توحید ہے، یا کفر ہے، یا شرک ہے، یا نفاق ہے، یا الحاد ہے، یا شک ہے، وہ ہر ایک کو اس کے عقیدے اور عمل کے مطابق ہی بدلہ دے گا۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ
اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۷ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ
وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۹ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ
اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۱۰

ترجمہ: تم لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور جس مال میں تم کو اس نے دوسروں کا قائم مقام بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو، سو جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور خرچ کریں ان کو بڑا ثواب ہوگا۷ اور تمہارے لئے اس کا کیا سبب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے؟ حالانکہ رسول تم کو اس کی طرف بلا رہے ہیں کہ تم اپنے ربّ پر ایمان لاؤ، اور اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد لیا تھا اگر تم کو ایمان لانا ہو۸ وہ ایسا ہے کہ اپنے بندہ پر صاف صاف آیتیں بھیجتا ہے تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے، اور بے شک اللہ تعالیٰ تم پر بڑا شفیق ہے، مہربان ہے۹ اور تمہارے لئے اس کا کیا سبب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ حالانکہ سب آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ جو لوگ فتح مکہ سے پہلے خرچ کر چکے اور لڑ چکے وہ برابر نہیں ہیں، وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ لڑی، اور اللہ تعالیٰ نے سب سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۱۰

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ایمان کی درستگی کا ذکر فرمایا، پھر جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دی، اور اس میں مال خرچ کرنے کی فضیلت بیان فرمائی۔ فرمایا:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ اے لوگو! بنیادی عمل تو یہ ہے کہ تم سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو صحیح طریقے سے تسلیم کرو، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی سعادت، فوز وفلاح اور ابدی نجات ہرگز ممکن نہیں، اور اسی طرح بغیر ایمان کے کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ ایمان کی درستگی کے بعد

ارشادفرمایا: ﴿وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِيۡنَ فِيۡهِ﴾ اوراس مال میں سے خرچ کروجس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہلے لوگوں کا نائب بنایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس جو مال ودولت ہے وہ تمہارا ذاتی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہلے لوگوں کا جانشین بنا کر یہ سب کچھ عطاء فرمایا ہے۔ یہ مال اللہ تعالیٰ نے گزرے ہوئے لوگوں کو دیا تھا، جن کے بعد تم انؔ کے وارث بنے، اوران کے اموال پر تمہارا قبضہ ہوا، لہٰذا اس مال کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جائز جگہ پر خرچ کرو، اوراپنی مرضی سے خرچ مت کرو، پس اس مال کا بہترین مصرف جہاد فی سبیل اللہ یا نیکی کے دیگر کام ہیں، اگرایسا کروگے تو آنے والی بشارت کا مستحق بنوگے۔

﴿فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَاَنۡفَقُوۡا لَهُمۡ اَجۡرٌ كَبِيۡرٌ﴾ پس تم میں سے جولوگ ایمان لائیں اوراللہ تعالیٰ کی رضاء کے لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال بھی خرچ کیا تو یقین جانو کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے، اور جولوگ اس اجر سے محروم رہے ان کا دامن ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ سے خالی رہا تو وہ قابلِ ملامت بھی ہوں گے اورمحروم بھی۔ فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ‌ۚ وَالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ وَقَدۡ اَخَذَ مِيۡثَاقَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے؟ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کوتسلیم نہیں کرتے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا رسول تمہیں بلا رہا ہے، ترغیب دے رہا ہے کہ اپنے پروردگار پرایمان لے آؤ، رسول کی دعوت کے باوجود تم ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہو، آخر تمہارے پاس ایمان نہ لانے کی کونسی دلیل ہے؟ حالانکہ تم نے عہد بھی کر رکھا ہے، مگراس کو بھی پورا نہیں کررہے ہو۔ اگر تم ایمان نہ لانے والے ہو تو بتلاؤ کہ تم عہد شکنی کرکے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا کیوں انکار کرتے ہو؟

اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے عالمِ ارواح میں پوری بنی نوعِ انسان کی روحوں سے لیا تھا، یہ عہدِ اَلست کہلاتا ہے، جس کی تفصیل سورۂ اعراف میں گزرچکی ہے۔ اس کے علاوہ جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو یہ بھی ایک عہد ہے کہ وہ یہ عہدوپیمان کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کے احکام کی تعمیل میں ہرطرح جانی و مالی قربانی پیش کرنے سے گریز نہیں کرے گا، تواب جبکہ اللہ تعالیٰ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں مالی قربانی کا مطالبہ کررہا ہے تو پھر اگرتم واقعی ایمان دار ہو تو یہ مطالبہ کیوں پورا نہیں کرتے ہو؟ پھرارشادفرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىۡ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبۡدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جواپنے بندے پرکھلی کھلی آیتیں نازل کرتا ہے۔ یہاں بندے سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس

ہے، اور آیات بینات سے مراد قرآن حکیم کی آیات ہیں، جن کے نزول کا مقصد یہ ہے تاکہ وہ تمہیں شرک و گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ یہ مطلب قرآن مجید میں جا بجا بیان ہوا ہے کہ ارسالِ رُسل اور انزالِ کتب کا مقصد یہی ہے کہ ظلمتوں سے روشنی کی طرف اور جہالتوں سے علم کی طرف اور معاصی سے نیکیوں کی طرف ہدایت اور رہنمائی ہو۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ تم پر بہت شفقت کرنے والا اور نہایت مہربان ہے، جس نے تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانے کا انتظام کر دیا ہے، مگر یہ انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ کفر و جہالت کے اندھیروں سے نکل کر علم اور ایمان کے روشنی میں نہیں آتے۔ مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں مالی قربانی کی سخت ضرورت تھی، اسی لئے فرمایا:

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہو؟ ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین کی ساری وراثت تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ انسان مرجاتا ہے تو اس کے پیچھے سب کچھ رہ جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے، اور وہی اس کا وارث ہوتا ہے۔ جب مالکِ حقیقی بھی وہی ہے، اور تمہارے مرنے کے بعد وارث بھی وہی ہے، تو پھر اس کا دیا ہوا مال اس کے حکم کے مطابق خرچ کیوں نہیں کرتے ہو؟ ایسا کرنا تم کو بوجھل کیوں معلوم ہوتا ہے؟ تمہیں چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ مال کو اس کے حکم کے مطابق بخوشی و رضامندی اور رغبت سے خرچ کرو، تاکہ اس کی رضاء تمہیں حاصل ہو، اور جہاد کے مقاصد بھی پورے ہوں۔ آگے انفاق فی سبیل اللہ والوں کا درجہ بدرجہ بیان ہو رہا ہے، فرمایا:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا﴾ تم میں سے وہ شخص برابر نہیں ہے جس نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جنگ لڑی، یہ تو بلند مرتبت لوگ ہیں، ان کی شان و عظمت زیادہ ہے ان لوگوں سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور جنگ بھی لڑی۔

مطلب یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے کا دور بڑا سخت تھا، مسلمانوں پر فقر و فاقہ کا غلبہ تھا، اور ان کے پاؤں اچھی طرح نہیں جمنے پائے تھے، اس پریشان کن دور میں جن لوگوں نے جانی اور مالی قربانی پیش کی ان کے بلند و بالا درجے اور عزت و مرتبہ فتح مکہ کے بعد میں خرچ کرنے اور لڑائی لڑنے والوں سے بدرجہا بلند ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعد والے لوگ خواہ کتنا بھی خرچ کریں وہ اس وقت کے خرچ کو نہیں پہنچ سکتے جب مسلمان سخت مشکلات میں

تھے، اور خرچ کی بھی شدید ضرورت تھی، چنانچہ بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جو اخلاص فتح مکہ سے پہلے والے مسلمانوں میں تھا بعد والے اس کے کروڑویں حصے کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت اسی لئے زیادہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ایمان لایا، اور انہوں نے سب سے پہلے مال خرچ کیا۔ آنحضرت ﷺ کا یہ بھی فرمان مبارک ہے کہ بعض اوقات ایک درہم کا درجہ لاکھ درہم سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ فتح مکہ سے پہلے اور بعد میں ایمان لانے والوں میں بھی بڑا فرق ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور بعد والے جہادوں میں بھرپور حصہ لیا مگر وہ سابقین اولین کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے، البتہ یہ بات ضروری ہے:

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ کہ اللہ تعالیٰ پہلے اور بعد والے سب کو اجر عطاء فرمائے گا، مگر ان کے درجات برابر نہیں ہو سکتے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہے: ﴿وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ [الأنعام:۱۶۵] (اللہ تعالیٰ نے بعض کے درجات کو بعض کے مقابلے میں بلند فرمایا ہے) تاہم نیکی سے کوئی بھی گروہ خالی نہیں ہے، مگر تفاوت درجات میں لازمی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ تم جو بھی کام کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان سے خبردار ہے، قیامت کے دن وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق ہی بدلہ عطاء فرمائے گا۔

آیاتِ مذکورہ میں اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں باہمی درجات کا تفاضل ذکر کیا گیا ہے، لیکن آخر میں فرمایا: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ یعنی باوجود باہمی فرقِ مراتب کے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ، یعنی جنت و مغفرت کا وعدہ سب ہی کے لیے کر لیا ہے۔ یہ وعدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان دونوں طبقوں کے لئے ہے جنہوں نے فتحِ مکہ سے پہلے یا بعد میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا، اور مخالفینِ اسلام کا مقابلہ کیا، اس میں تقریباً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت شامل ہو جاتی ہے، کیونکہ ایسے افراد تو شاذ و نادر ہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے مسلمان ہو جانے کے باوجود اللہ کے لیے کچھ خرچ نہ کیا ہو، اور مخالفینِ اسلام کے مقابلہ اور مقاتلہ میں بھی شریک نہ ہوئے ہوں، اس لئے قرآن کریم کا یہ اعلانِ مغفرت و رحمت پوری جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے عام اور شامل ہے۔

آیات کریمہ میں جو ﴿كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ مذکور ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کی ضمانت دیدی کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، اور توبہ کرلے گا، یا پھر نبی اکرم ﷺ کی صحبت و نصرت اور دین کی خدماتِ عظیمہ اور ان کی بے

شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا۔

آج کل تاریخ کی جھوٹی اور ضعیف روایات کی بنیاد پر جو بعض لوگوں نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو موردِ طعن والزام بنایا ہے، اول تو اس کی بنیاد جو تاریخی روایات پر ہے وہ بنیاد ہی متزلزل ہے، اور اگر کسی درجہ میں ان روایات کو قابلِ التفات مان بھی لیا جائے تو قرآن وحدیث کے کھلے اور واضح ارشادات کے خلاف ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، چنانچہ وہ سب مغفور ومرحوم ہیں، اور انہیں رضاءِ الٰہی حاصل ہے۔

عقائدِ اسلامیہ کی تمام کتابوں میں اس اجماعی عقیدہ کی تصریحات موجود ہیں کہ وہ سب مغفور ہیں، اور ان کے بارے میں یا ان کے اختلافات کے بارے میں، یا ان کے آپس کے مشاجرات کے بارے میں ان کے ہر معاملے میں ہمیں سکوت کرنا اور ان میں سے کسی کو موردِ الزام نہ بنانا لازم اور ضروری ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، مجلس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، انہوں نے ایک عباء پہنا ہوا تھا جو سینہ پر کئی جگہ سے پھٹا ہوا اور پیوند لگا ہوا تھا، انہوں نے اپنا جو کچھ مال تھا وہ قبل از ہجرت اور قبل از فتح اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا تھا، تو جبرائیل امین علیہ السلام اترے اور انھوں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ میں ابوبکر کو اس حالت میں دیکھ رہا ہوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے اپنا سارا مال فتح مکہ سے پہلے مجھ پر خرچ کر ڈالا ہے، جبرائیل امین علیہ السلام کہنے لگے کہ اللہ ربّ العزّت کا ان کو پیغامِ سلام ہے، اور یہ کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم مجھ سے راضی ہو اس فقر کی حالت میں یا ناراض ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ پیغام سنایا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنے ربّ سے ناراض رہوں؟ آپ گواہ رہو کہ میں اپنے ربّ سے راضی ہوں۔ [ابن کثیر]

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ⑪ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑫ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ
فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ
اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ
الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: کوئی شخص ہے جو اللہ کو قرض حسن دے؟ پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لیے بڑھائے، اور اس کے لئے اجر پسندیدہ ہے ﴿۱۱﴾ جس دن آپ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا، آج تم کو بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے ﴿۱۲﴾ جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے کہیں گے کہ ہمارا انتظار کرلو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کرلیں، ان کو جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پھر روشنی تلاش کرو، پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کردی جائے گی، جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب عذاب ہوگا ﴿۱۳﴾ وہ ان کو پکاریں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کہ تھے تو سہی، لیکن تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا، اور تم منتظر رہا کرتے تھے، اور تم شک کیا کرتے تھے، اور تم کو تمہاری تمناؤں نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آپہنچا، اور تم کو دھوکہ دینے والے نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکہ میں ڈال رکھا تھا ﴿۱۴﴾ غرض آج نہ تم سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا، اور نہ کافروں سے، تم سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے، وہی تمہاری رفیق ہے، اور برا ٹھکانہ ہے ﴿۱۵﴾

معارف ومنازل

صحیح مسلم میں ہے کہ روزانہ رات کو جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کون ہے جو مجھ سے دعا کرے میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے میں اس کو دوں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے میں اس کی مغفرت کروں؟ کون ہے جو ایسے کو قرض دے جس کے پاس سب کچھ ہے؟ اور جو ظلم کرنے والا نہیں ہے، صبح تک یوں ہی فرماتے رہتے ہیں۔

یہ جو فرمایا کہ کون ہے جو ایسے کو دے جس کے پاس سب کچھ ہے، اس میں یہ بتادیا کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ضرورت مند کو دے رہا ہوں، بلکہ اپنا فائدہ سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردے، اور یہ جو فرمایا کہ وہ ظلم کرنے والا نہیں ہے اس میں یہ بتایا کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کروگے ضائع نہ جائے گا، اس کے مارے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کا ایک انداز۔ فرمایا:

﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا﴾ وہ کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے؟

﴿فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ﴾ تاکہ وہ اس کو دوگنا کردے۔ ﴿وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ﴾ اور اس قرض حسن کے بدلے میں اس کے لیے عزّت والا اجر ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حقیقت میں یہ فی الواقعہ قرض نہیں ہے، بلکہ کنایہ کی زبان میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا، اس بدلے کا اندازہ احادیث کی رو سے دس سے لے کر سات سو، اور درمنثور کی روایت کے مطابق سات سو سے لے کر بیس لاکھ تک۔

جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض دیتا ہے تو جانبین میں طے ہوتا ہے کہ مقروض اتنی ہی رقم واپس لوٹا دے گا، مگر یہاں پر اللہ تعالیٰ نے قرض سے اضعافاً مضاعفۃ واپس کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ﴾ [البقرۃ:۲۶۱] (اور اللہ بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہے)۔ تجربہ شاہد ہے کہ دنیا کے بادشاہ اپنی شان کے مطابق بہت کچھ دیتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ کی شان کی نہ حد ہے نہ اندازہ، وہ ایک چھوٹے عمل پر اتنا بڑا اجر عطا فرماتا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، نصف کھجور کے عوض پہاڑوں جتنا ثواب دیتا ہے۔ [عمدۃ القاري: ج۷]

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ شرح مشکوۃ میں لکھا ہے کہ کوئی مسافر جارہا تھا کسی بستی کے پاس لوگوں کا ہجوم دیکھا، تو وہاں پہنچا دیکھا کہ لوگ ایک میت کو دفن کرکے فارغ ہوچکے ہیں، اس مسافر نے ثواب کی خاطر ادھر ادھر سے کچھ مٹی جمع کرکے دونوں ہاتھوں سے قبر پر پھینک دی، جس دن اس کی وفات ہوئی تو اس کی مغفرت ہوئی اور فرشتوں نے مغفرت کی بشارت دی، کہنے لگے کہ میری مغفرت کی وجہ کیا ہے جس وجہ سے میری مغفرت ہوئی؟ فرشتوں نے کہا کہ تم نے اخلاص کے ساتھ ایک قبر پر مٹھی بھر کے مٹی ڈالی تھی۔ [مرقاۃ شرح مشکوۃ، بحث أسماء الحسنیٰ، الشکور کے تحت]

﴿یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ جس دن آپ دیکھیں گے مؤمن مرد اور مؤمن عورتوں کو ﴿یَسۡعٰی

﴿نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور دائیں طرف دوڑتی ہوگی، یہ صورت حال حشر کے میدان میں پل صراط پر سے گزرتے وقت پیش آئے گی، اس وقت سخت اندھیرا ہوگا، اور روشنی صرف ایمان اور نیک اعمال کی ہوگی جو مؤمنین کی پیشانی اور ان کے قلوب سے اٹھ رہی ہوگی، تاہم یہ روشنی علیٰ قدر المراتب ہوگی، جس قسم کا کسی کا ایمان ہوگا اسی کے مطابق روشنی ہوگی۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کی روشنی پہاڑ جتنی بڑی ہوگی، اور بعض کی صرف ناخن کے برابر جو کبھی جلے گی اور کبھی بجھ جائے گی، روشنی کا یہ تفاوت ایمان کی پختگی اخلاص اور اعمال میں تفاوت کی وجہ سے ہوگا۔ [ابن کثیر] بہرحال! ایمان کی روشنی تو اہل ایمان کے سامنے ہوگی، اور اعمالِ صالحہ کی روشنی ان کی دائیں طرف سے ہوگی، پس ایسے لوگوں کو فرشتے خوشخبری سناتے ہوئے کہیں گے:

﴿بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ تمہارے لیے بشارت ہے باغوں کی جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، یہ کیسی عجیب کامیابی ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ یہ بہت بڑی کامیابی ہے، جس کو حاصل ہوگی وہ ابدی نعمتوں میں شاداں، فرحان و خوشحال رہے گا، جہاں سے نکالے جانے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہوگا، اور یہ ابدی سعادتوں کا مرکز ہوگا، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ جنتیوں کو اپنا دیدار بھی کرائے گا۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

یہ قیامت والا نور چونکہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے جس سے منافق اور کافر محروم ہیں، اس لئے منافقوں کا کچھ حال بیان فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے: دیکھو! ہم دنیا میں تمہارے ساتھ اکھٹے تھے تمہاری طرح نماز پڑھتے تھے، اور روزہ بھی رکھتے تھے، آج ہم اس نور سے محروم رہے، اور اندھیرے میں مبتلا ہو گئے، ذرا دنیا کی رفاقت کو یاد کرتے ہوئے ہمارے ساتھ مدد کریں، اور ٹھہر جاؤ تاکہ ہم بھی تمہاری روشنی میں سے کچھ لے لیں، اور اس مشکل منزل کو عبور کر لیں۔ ادھر سے جواب آئے گا:

﴿قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ﴾ کہ پیچھے لوٹ جاؤ اور وہاں سے روشنی تلاش کرو، جب وہ لوگ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں گے کہ روشنی کہاں تقسیم ہو رہی ہے تاکہ ہم اپنا حصہ لے لیں اتنے میں: ﴿فَضُرِبَ

﴿بَيۡنَهُمۡ بِسُوۡرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾ ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی، جس کا ایک دروازہ ہوگا۔ ﴿بَاطِنُهٗ فِيۡهِ الرَّحۡمَةُ﴾ اوراس کے اندر کی طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی ہوگی۔ ﴿وَظَاهِرُهٗ مِنۡ قِبَلِهِ الۡعَذَابُ﴾ اور اس سے باہر عذاب ہوگا۔ سورۃ الاعراف میں اس فصیل کو اُعراف کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مشرک اور کافر لوگ تو پل صراط پر سے گزرتے ہوئے پہلے ہی دوزخ میں گر چکے ہوں گے، مگر امتی کہلانے والے خواہ وہ سچے مؤمن ہوں یا منافق آپس میں ملے جلے ہوں گے۔ اُعراف کے مقام تک تو سب اکٹھے آئیں گے، پھر ایمان والے تو اپنے ایمان اور نیکیوں کی روشنی میں اپنے اپنے مراتب کے مطابق تاریکی کو عبور کر لیں گے، مگر دنیا میں فریب کاری سے کام لینے والے منافق لوگوں کے پاس نورِ ایمان نہیں ہوگا، اس لئے وہ سچے ایمانداروں سے درخواست کریں گے کہ انہیں روشنی میں سے کچھ حصہ دیا جائے تاکہ وہ بھی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں، اس وقت یہ کیفیت ہوگی کہ جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ابتداء میں منافقوں کو تھوڑی سی روشنی ملے گی جس کے ذریعے وہ تھوڑی دور چلیں گے، پھر اچانک وہ روشنی چھین لی جائے گی، کیونکہ دنیا میں بھی انہوں نے دھوکہ دہی کے لیے ظاہر میں کلمہ پڑھا تھا، اور کچھ نیکی کے کام بھی انجام دیئے تھے، اس لئے یہاں بھی انہیں تھوڑی سی روشنی دے کر پھر سلب کر لی جائے گی۔

پیچھے روشنی تلاش کرنے کا مطلب منافق لوگ یہ لیں گے کہ شاید یہاں کہیں تھوڑی دور روشنی تقسیم ہو رہی ہے، لہٰذا وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے، لیکن اہل ایمان کی پیچھے سے مراد یہ ہوگی کہ اس روشنی کا منبع تو دنیا میں تھا، جہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی بناء پر روشنی تقسیم ہوتی تھی، وہاں تو تم اسے حاصل نہ کر سکے، اب یہاں تمہیں وہ روشنی میسر نہیں آسکتی۔

الغرض کہ منافق اندھیرے میں پھنس کر پل صراط عبور نہ کر سکیں گے، اور دیگر کافروں کی طرح جہنم میں گر جائیں گے۔ صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ روشنی کی ضرورت میدانِ حشر میں پڑے گی، اس کے حصول کے بہت سے ذرائع اس دنیا میں ہی موجود ہیں، چنانچہ صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اتقوا الظلم۔ اے لوگو! ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم کی وجہ سے آخرت میں بڑے اندھیرے پیش آئیں گے، اس دنیا میں کئے ہوئے ہر گناہ کا الگ الگ اندھیرا ہوگا، جب ان کو جمع کرو تو الظلم ظلمات یوم القیامة۔ گناہوں کی ظلمتیں بہت ساری ظلمتوں میں بدل جائیں گی، ان ظلمتوں کو عبور کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: بشر المشائین في الظلم إلى المساجد بالنور التام یوم القیامة۔ [ترمذي وابن ماجة]

جو لوگ رات کی تاریکی میں مسجدوں کی طرف نماز کے لیے جاتے ہیں انہیں قیامت والے دن مکمل نور کی خوشخبری سنا دو، یعنی قیامت کے روز ان کو پوری روشنی ملے گی، یہ نماز کی برکت ہے، اور مساجد کی فضیلت ہے کہ اندھیریوں میں ان کی طرف چلنے والوں کو مخصوص انوار و برکات کا تحفہ ملے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: من حافظ علی الصلوٰت کانت لہ نورا و برھانا و نجاۃ۔ [مشکوٰۃ]

جس نے نمازوں کی حفاظت کی یعنی انہیں ضائع ہونے سے بچا لیا اس کے لئے قیامت والے دن روشن دلیل اور نجات ہوگی، یہ نمازیں اس کے لیے دلیل بن جائیں گی، جہاں دلیل کی ضرورت ہو جس مقام پر اسے روشنی کی ضرورت ہوگی تو یہ نمازیں اس کے لیے روشنی کا مینار بن جائیں گی، اور اس طرح اس کو عذاب سے نجات حاصل ہو جائے گی، لہٰذا اس کے برخلاف جس شخص نے نمازوں کی پروانہ کی اس کے لیے نہ دلیل ہوگی نہ روشنی اور نہ نجات، اور اس کا حشر فرعون اور ہامان جیسے بڑے مجرموں کے ساتھ ہوگا۔

حدیث شریف میں یہ بھی فرمان مبارک ہے کہ جو شخص بروزِ جمعہ مکمل سورۂ کہف کی تلاوت کرے گا اس کو قیامت والے دن روشنی میسر آئے گی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کے قدموں سے لے کر مکہ مکرمہ تک کی مسافت کی روشنی ملے گی، اور بعض روایات میں ہے کہ زمین سے آسمان تک کی روشنی ملے گی۔

نیز فرمایا کہ جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی یا کم از کم تین آیت تلاوت کرے گا، یا ایک آیت تلاوت کرے گا تو یہ تلاوت اس کے لئے دجال کے فتنے سے بچاؤ کا ذریعہ بنے گی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس شخص نے حج کے موقع پر اپنا سر مونڈوایا تو اس کے ہر بال کے عوض قیامت والے دن اس کو روشنی ملے گی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ شیاطین کو کنکر مارنے کے عوض اللہ تعالیٰ قیامت والے دن روشنی عطاء فرمائے گا۔ اسی طرح جو شخص جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اعمالِ صالحہ بجالائے اس کو بھی قیامت کے دن نور ملے گا۔ اسی طرح جس شخص نے اللہ کے راستے میں کافروں پر تیر چلایا اس کو بھی قیامت والے دن نور ملے گا۔ اسی طرح جو شخص کسی مسلمان کی پریشانی دور کرے گا اس کو بھی پل صراط پر گزرتے وقت نور ملے گا۔ اور جو شخص عید کی قربانی کرے گا یا صدقات یا مسجدوں کی خدمت کرے گا اسے بھی نور ملے گا۔

اسی طرح دیگر اعمالِ صالحہ میں بھی یہ خاصیت ہے کہ پل صراط پر سے گزرتے وقت نور حاصل ہوگا، اور پل صراط پر گزرنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے بڑا نور قرآن حکیم کی تلاوت ہے، جو لوگ قرآن پاک کو

حفظ کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں پل صراط پر گزرتے وقت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار کے بعد ان ہی لوگوں کا نور ہوگا۔

جب منافق لوگ مؤمنوں سے روشنی حاصل کرنے میں ناکام ہوجائیں گے تو پھر انہیں دنیا کی زندگی میں اپنی معیت کی یاددہانی کرائیں گے: ﴿یُنَادُوۡنَهُمۡ اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی﴾ وہ مؤمنوں کو پکار کر کہیں گے کہ آج تم ہمیں اپنے نور کا کچھ حصہ دینے کے لیے تیار نہیں ہو، تو ذرا یاد کرو دنیا والی زندگی میں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ اکٹھے رہتے تھے، مسجدوں میں اکٹھے نماز پڑھتے تھے، رمضان کا اکٹھا روزہ رکھتے تھے، تو پھر آج ہمیں کیوں فراموش کررہے ہو؟ مؤمن جواب دے کر کہیں گے کہ بلاشبہ ہم اکٹھے ہی سکونت پذیر تھے مگر:

﴿وَلٰکِنَّکُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ وَتَرَبَّصۡتُمۡ وَارۡتَبۡتُمۡ وَغَرَّتۡکُمُ الۡاَمَانِیُّ﴾ تم نے اپنی جانوں کو فتنے میں مبتلا کرلیا، اور دل سے ایمان قبول نہ کیا، ایمان کے بجائے نفاق اختیار کیا، اور انتظار کرتے رہے کہ کب سچے مسلمانوں پر کوئی آفت آئے، اور جب مسلمانوں پر کوئی آفت آجاتی ہے تم خوشیاں مناتے، اور تم شک میں پڑے ہوئے تھے کہ پتہ نہیں مسلمانوں کا دین سچا ہے یا جھوٹا، اور غالب گمان تمہارا یہی رہا کہ مسلمان حق پر نہیں ہیں، اور تمہیں جھوٹی خواہشات اور آرزوؤں نے دھوکے میں ڈالا ہوا تھا کہ کفار کے ساتھ مل جائیں گے اور یہود یوں کے ساتھ اتحاد کریں گے، اور فلاں قبیلے کی پناہ حاصل کرلیں گے، پھر ہم مسلمانوں پر غالب آجائیں گے، تو تم اسی طرح شکوک وشبہات اور خواہشات کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔

﴿حَتّٰی جَآءَ اَمۡرُ اللّٰهِ وَغَرَّکُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ﴾ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آگیا، مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہوگئی، ہر محاذ پر انہیں فتح اور غلبہ حاصل ہوا، اور کفر مٹتا چلا گیا، اس سے تمہاری موت واقع ہوگئی، تم سیاسی سطح پر مرگئے۔ اصل بات یہ ہے اے منافقو! تمہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بڑے دھوکہ باز شیطان لعین نے دھوکہ میں رکھا، اور تم نے بجائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے شیطان کی اطاعت اور اس کی پیروی کو ترجیح دیدی، اب ہم سے گلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آج تمہارا انجام یہ ہوگا:

﴿فَالۡیَوۡمَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡکُمۡ فِدۡیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ تم ہمارے ساتھی نہیں ہو، تم کفار اور مشرکین کے حامی ہو، تو آج کے دن تم سے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، جس کے بدلے میں تم عذاب سے بچ جاؤ، اور نہ ہی کفر کرنے والوں سے کوئی فدیہ لیا جائے گا۔ سورۃ المعارج میں ارشاد ہے کہ قیامت والے دن مجرم اپنے بیٹے

بیوی بھائی اور قبیلہ حتیٰ کہ: ﴿وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا﴾[المعارج: ۱۴] یعنی اگر زمین کی ہر چیز کا فدیہ دے کر بھی عذاب سے بچنا چاہے گا تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ فرمایا: تم سے فدیہ بھی قبول نہ ہوگا، اور ہماری رفاقت بھی تمہیں نصیب نہ ہوگی، اور تمہارا ٹھکانہ کافروں کے ساتھ ہوگا۔ ﴿مَاۡوٰىکُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوۡلٰىکُمۡ﴾ اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہوگا، اور وہی تمہارے لئے زیادہ لائق ہے۔ ﴿وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ﴾ اور یہ لوٹ کر جانے کی بہت بری جگہ ہے۔ مولیٰ کے اگرچہ بہت سارے معانی ہیں، مگر یہاں اس کا زیادہ معروف معنی یہی ہوگا، یعنی بمعنی لائق۔

خلاصہ یہ ہے کہ فرمایا: اے منافق مرد اور منافق عورتو! نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا، اور نہ ہی کافروں سے تمہارا اور کافروں کا سب کا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہوگا، کیونکہ وہی تمہارے زیادہ لائق ہے، جیسا عمل ویسا ہی بدلہ، تمہیں ہمیشہ جہنم میں رہنا ہوگا جو کہ لوٹ کر جانے کی بہت بری جگہ ہے۔

❁ ❁ ❁

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ
اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾
اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ
الۡمُصَّدِّقِیۡنَ وَالۡمُصَّدِّقٰتِ وَاَقۡرَضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمۡ وَلَهُمۡ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ وَ
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ
وَنُوۡرُهُمۡ ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں اس سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا، سو ان کے دل سخت ہو گئے، اور ان میں سے بہت سے فاسق تھے ﴿۱۶﴾ جان لو! بیشک اللہ تعالیٰ زندہ فرماتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد، بیشک ہم نے تمہارے لئے آیات بیان کیں تا کہ تم سمجھو ﴿۱۷﴾ بلا شبہ صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیا ان کے لیے اس کو بڑھا دیا جائے گا اور ان کے لیے اجر کریم ہے ﴿۱۸﴾ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، یہ وہ لوگ

ہیں جو بڑی سچائی والے ہیں، اور جو شہداء ہیں اپنے ربّ کے پاس ہیں ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہوگا، اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ دوزخ والے ہیں ⑲

معارف ومنازل

اس آیت میں ان اہلِ ایمان کو خطاب اور عتاب فرمایا ہے جن کے اعمالِ صالحہ میں کمی آگئی ہے، اور جن کے دلوں میں ذکر اللہ اور کتاب اللہ کی طرف توجہ درجہ مطلوبہ میں نہیں رہی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے، وہاں کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چہرہ مبارک سے چادر ہٹائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ انور غصہ سے سرخ ہو رہا تھا، اور فرمایا: تم ہنس رہے ہو؟ (یہ ہنسنا تمہاری شان کے خلاف ہے، یہ دنیا داروں کی خصلت ہے، متقیوں کے لیے عام حالات میں ہنسنا معیوب ہے، چہ جائیکہ مسجد میں ہو) اور تمہارے ربّ کی طرف سے یہ امان نازل نہیں ہوئی کہ اس نے تمہیں بخش دیا، (اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ دنیا سے دل نہ لگائیں، اور ہنسی مذاق میں وقت ضائع نہ کریں)۔ تمہارے ہنسنے کے بارے میں مجھ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے:

﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ﴾۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے اس ہنسنے کا کیا کفارہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس قدر ہنسے ہو اسی قدر روؤ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی، اس وقت یمامہ کے رہنے والے چند لوگ موجود تھے، وہ بہت روئے، ان کی یہ حالت دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی اسی طرح رویا کرتے تھے حتیٰ کہ بعد میں ایسے لوگ آگئے جن کے دل سخت ہوگئے۔ [روح المعانی: ج ۲۷]

معلوم ہوا کہ اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے اور سمجھنے کی طرف پوری طرح متوجہ رہنا چاہئے، جب دل میں خشوع ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی کتاب کی طرف جھکاؤ ہوگا تو ایمان میں پختگی اور نورانیت رہے گی، اگر دل میں خشوع نہ ہو، تو آہستہ آہستہ دلوں میں قساوت یعنی سختی آجائے گی، جب قساوت آجاتی ہے تو دنیا ہی کی طرف توجہ رہ جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو میری امت سے اٹھ جائے گی وہ خشوع وخضوع ہوگا۔ [ابن کثیر]

دنیا کی طرف توجہ ایمان اور تقویٰ کے لیے زہر قاتل ہے، جو شخص دنیا کی طرف مائل ہو اس کے دل و دماغ سے تقویٰ کی روح نکل جائے گی، اور جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کا خوف نہ ہو اس کے دل پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے، اور جس دل پر شیطان مسلط ہو وہ دل پھر خدا کا نہیں رہتا، اور اس میں آخرت کی فکر نہیں رہتی، ایسے لوگ نماز بھی یوں ہی چلتی ہوئی پڑھتے ہیں، ایک منٹ میں دو رکعتیں نمٹا دیتے ہیں، اور نماز میں دکان کے بکری کا حساب لگاتے رہتے ہیں۔

درزبان تسبیح و در دل گاؤ خر ☆ ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ کلام نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ باتیں کرنا قساوتِ قلب یعنی دل کی سختی کا سبب ہے، اور اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور وہی دل ہے جو سخت ہو۔ [ترمذي]

ایک عجیب تاریخی واقعہ:

حضرت فضیل ابن عیاض رحمہ اللہ مشہور محدث ہیں، اور اکابر صوفیاء کرام میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے، پہلے صحیح راستے پر نہ تھے، ڈاکہ زنی کیا کرتے تھے، اسی اثناء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا، ایک رات اس لڑکی کے پاس پہنچنے کے لیے اس کے گھر کی دیواروں پر چڑھ رہے تھے، وقت تقریباً آدھی رات کا تھا، پڑوس میں ایک شخص زور زور سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، تلاوت کرنے والے شخص کی آواز کان میں پڑ گئی، وہ آیت کریمہ یہ تھی: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے ان کے قلوب جھک جائیں؟ لڑکی کے عشق میں ڈوبے ہوئے فضیل نے جب یہ تلاوت سنی تو فوراً اس کے منہ سے یہ نکلا: بلی یارب قد اٰن۔ اے میرے پروردگار! ہاں وہ وقت آ گیا۔ یہ کہہ کر روئے اور دیوار سے اتر کر واپس لوٹے۔

پھر ایک ویران گھر کی طرف چلے گئے، وہاں چند مسافر ٹھہرے ہوئے تھے، ان میں سے ایک شخص نے ساتھیوں سے کہا: چلو سفر شروع کر دیں، دوسرے نے کہا: صبح تک ٹھہرو، کیونکہ یہاں کہیں فضیل ہوگا، وہ بہت بڑا ڈاکو ہے، کہیں ہم پر ڈاکہ نہ ڈالے، جب صبح کی روشنی ہو تب ہمیں یہاں سے جانا چاہئے، یہ سن کر فضیل اپنے دل میں کہنے لگے: ارے میرا یہ حال ہو گیا کہ رات بھر گناہ کے کاموں میں لگا رہتا ہوں، اور مسلمان مجھ سے ڈرتے ہیں، معلوم

ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آج کی رات یہاں اسی لئے بھیجا ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دوں، اس کے بعد بارگاہ خداوندی میں یوں عرض کی: اللّٰهم إني قد تُبتُ إليک و اجعلتُ توبتي مجاورة البيت الحرام۔ اے اللہ! میں آپ کے حضور میں توبہ کرتا ہوں، اور اپنی توبہ میں یہ بھی شامل کرتا ہوں کہ اب مکہ مکرمہ میں زندگی گزاروں گا، اور کعبہ شریف کا مجاور بنوں گا۔

اس کے بعد وہ مکہ معظّمہ چلے گئے اور وہیں پوری زندگی عبادت میں گزاری، اور یہ حال رہا کہ ہرلحہ بار بار اتنا روتے تھے کہ پاس بیٹھنے والوں کو ان پر رحم آتا تھا۔ ابن حبّانؒ نے اپنی کتاب الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ مکہ معظّمہ میں قیام کیا، سخت مجاہدہ اور ریاضت، دائمی پرہیزگاری، اور بہت زیادہ خوفِ الٰہی، بہت زیادہ گریہ وزاری، تنہائی اور لوگوں سے بے تعلق رہنے کے ساتھ اپنے اوقات کو آباد رکھا، دنیا کے اسباب میں سے موت آنے تک ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے ایک مرتبہ علمِ حدیث کا اشتغال رکھنے والوں کو دیکھا کہ آپس میں دل لگی کی باتیں کررہے ہیں اور ہنس رہے ہیں، ان کو پکار کر فرمایا کہ اے انبیاء کرام علیہم السلام کے وارثو! بس کرو، بس کرو، بس کرو، تم لوگوں کے امام ہو، تمہارا اقتداء کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو ہنستے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ بھائی جان! میں تجھے ایک اچھی بات سناؤں؟ اس شخص نے کہا: فرمایئے! آپ نے اس کو یہ آیت پڑھ کر سنائی: ﴿لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ [القصص: ۷۶] (اِتراوانہ کر، بے شک اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

بزرگوں نے یہ فرمایا کہ انسان دنیا میں جتنا زیادہ ہنستا ہے برزخ میں اور قیامت کے دن اتنا زیادہ روئے گا، اور دنیا میں جتنا زیادہ روئے گا آخرت میں وہ اتنا ہنسے گا، پس تقویٰ کا یہی مطالبہ ہے کہ اپنی زندگی کو ہنسی مذاق سے پاک رکھو جتنا اپنے لباس اور بدن کو نجاستوں سے پاک رکھتے ہو۔ [تهذيب التهذيب، سير أعلام النبلاء]

آگے فرمایا کہ اہل کتاب کی طرح نہ ہوجاؤ جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی یعنی یہود ونصاریٰ ان پر ایک زمانہ دراز گزرگیا، وہ اپنی اپنی کتاب اور ان کے احکام سے غافل رہے، غافل تو کیا انہوں نے اپنی کتابوں میں تحریف کرکر کے ان کا حلیہ بگاڑ دیا، اور معاصی میں منہمک رہے، اپنے مقصد کی باتوں کو کتابوں میں لکھ کر ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کردی، اور اللہ تعالیٰ کے وہ احکام جو ان کی خواہشات کے خلاف تھے ان کو مٹادیا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل فرمایا، اور ان کے دلوں کو پتھر سے بھی زیادہ سخت کردیا، یہاں تک کہ نیکی وبدی کا احساس ان

میں نہیں رہا، اور دین حق کو سراسر بھول گئے، جنتی راستوں سے ہٹ کر دوزخی راستوں پر رواں دواں رہے جو کہ آج بھی اسی گمراہی میں مبتلا نظر آتے ہیں، اور قیامت تک ان کا حال یہی رہے گا، یہاں تک کہ وہ مبغوض ہوئے، مغضوب ہوئے، ضالین ٹھہرے۔ تفسیر سورۂ آل عمران، سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

پس مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے دلوں کو خشوع وخضوع والا بنائیں، اور اللہ تعالیٰ کو زندگی بھر یاد رکھیں، قرآن کریم کی تلاوت میں لگیں، اور اس کے احکام پر عمل کرتے رہیں، اور زندگی کے تمام معاملات میں یہود ونصاریٰ کی مشابہت سے پرہیز کریں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من تشبه بقوم فهو منهم**۔ جو کوئی کسی قوم کے ساتھ مشابہت اور اتحاد رکھے گا اور ان جیسا عمل بجالائے گا تو قیامت کے دن اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں غیروں کی مشابہت سے نجات دے، اور اسلامی اعمال پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ ارشاد فرمایا:

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ﴾ کیا اہل ایمان کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل عاجزی کریں اور گڑگڑائیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے؟ ﴿وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ اور اس چیز کے لیے جو حق سے اتری ہے، یعنی قرآن کریم۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور قرآن مجید کے احکام کے لیے نرم ہونے چاہئے، اور انہیں ہر حال میں غفلت سے نکلنا چاہئے جو کہ تباہ کن ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ ہم لوگوں کے ایمان لانے اور اس آیت کے نزول کے درمیان چار سال کا وقفہ حائل ہے، اس دوران میں لوگوں کی یاد الٰہی اور قرآن سے غفلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہ فرمائی، اس لیے کہ یادِ الٰہی سے غفلت قساوت قلبی کا باعث ہے، جس نے اہل کتاب کو مبغوض اور مغضوب بنادیا۔ آگے اسی کا بیان ہے:

﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر ایک مدت دراز گزر گئی، پس ان کے دل سخت ہوگئے جس کی وجہ سے وہ یاد الٰہی سے غافل رہے، اور کتاب الٰہی سے غفلت برتنے لگے۔ سورۂ مطففین میں فرمایا: ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [المطففین: ۱۴] خبردار! لوگوں کے دلوں پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے زنگ چڑھ جاتا ہے، جس کی وجہ سے دلوں میں سختی پیدا ہوجاتی ہے، اس کا علاج سوائے توبہ اور ذکر الٰہی کے

کچھ بھی نہیں، جب آدمی توبہ کرتا ہے تو اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں، اور کثرت ذکر الٰہی سے تاریک دلوں کی تاریکی مٹ جاتی ہے، اور قلوب میں انوار و برکات پیدا ہو جاتے ہیں۔

سورۂ رعد میں فرمایا: ﴿اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ﴾[الرعد:۲۸] (خبردار! اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں میں سکون اور اطمینان پیدا ہو جاتا ہے) اور ہر قسم کی پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہونٹ میری یاد کے ساتھ تر ہوں ایسے ہونٹوں کی حرکت مجھے بہت پسند ہے۔[بخاري]

ذکر الٰہی کی برکت اور فضیلت کا یہ عالم ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی یاد کرے گا، یہ کتنا بڑا شرف اور اعزاز ہے کہ خطاء کار انسان کو ربّ العزّت یاد فرمائے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿فَاذۡكُرُوۡنِىۡٓ اَذۡكُرۡكُمۡ﴾[البقرة: ۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا)۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا کہ اہل کتاب کی طرح سنگدل نہ ہو جانا، کیونکہ:

﴿وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ﴾ ان کی اکثریت نافرمان ہی ہیں، اس سنگ دلی کی وجہ سے انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی، اور آخر ملعون و مغضوب ٹھہرے۔ ﴿سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ﴾ [المائدة:۸۰] (اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو گیا)۔ ﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ﴾ [الفتح:٦] (اور ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے:

﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا﴾ اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مردہ ہو جانے کے بعد، جس طرح مردہ اور خشک زمین کی زندگی کا دارومدار پانی ہے، اسی طرح انسانوں کا دل بھی زمین کی مانند ہے، اور ان کے مردہ دلوں کی زندگی کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہے۔ حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ اے بیٹے! اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کرو، جس سے تمہارا دل اسی طرح زندہ ہو گا جس طرح مردہ زمین موسلا دھار بارش سے زندہ ہوتی ہے۔ فرمایا:

﴿قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ﴾ البتہ سمجھا دیا ہے مثالوں سے تاکہ تم معاملات کو سمجھ لو، اور اپنی زندگی کا رخ سیدھا رکھو، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کو پڑھنے سے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے سے تمہیں روحانی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ آئندہ آیات میں پھر انفاق فی سبیل اللہ کا دوسرے انداز میں بیان ہے:

﴿اِنَّ الۡمُصَّدِّقِيۡنَ وَالۡمُصَّدِّقٰتِ وَاَقۡرَضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا﴾ بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور

صدقہ کرنے والی عورتیں، اور وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیا نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ جہاد اور دوسرے خیر کے کاموں میں محض رضائے الٰہی کے پیش نظر اپنا حلال مال خرچ کیا، تو ان کے متعلق یہ فرمان ہے:

﴿يُضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ ان کو دوگنا ثواب عطاء فرمادے گا، اور ان کے لیے عزت والا اجر ہوگا۔ آگے اہل ایمان کی تعریف کی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر پورا ایمان رکھتے ہیں، یعنی ایمان اور تصدیق کے ساتھ مکمل اطاعت گزار ہیں، اور خواہشات سے مکمل بیزار اور دور ہیں، ایسے ہی لوگ اپنے ربّ کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدیق وشہید ہر مؤمن کو کہا جاسکتا ہے۔ حضرت قتادہؒ اور عمرو بن میمونؒ نے اس آیت کی بناء پر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام پر ایمان لائے وہ صدیق وشہید ہے۔ ابن جریرؒ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤْمِنُوْا اُمَّتِیْ شُهَدَاءُ۔ میری امت کے سب مؤمن شہید ہیں، اور اس کی دلیل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک روز ان کے پاس کچھ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع تھے، انہوں نے فرمایا: کلکم صدیق و شهید۔ یعنی تم میں سے ہر ایک صدیق بھی ہے شہید بھی، لوگوں نے تعجب سے کہا کہ ابو ہریرہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ میری بات پر اگر یقین نہیں آتا تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ﴾۔

لیکن قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدیق وشہید ہر مؤمن نہیں، بلکہ مؤمنین میں سے ایک اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو صدیق وشہید کہا جاتا ہے، وہ آیت سورۂ نساء کی یہ ہے: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ [النساء:۶۹] (پس وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) کیونکہ اس آیت میں انبیاء اکرام علیہم السلام کے ساتھ عام مؤمنین میں سے تین طبقے خصوصیت سے ذکر کئے گئے ہیں، یعنی صدیقین شہداء اور صالحین، اور اس سے ظاہر یہ ہے کہ ان تینوں کے مفہوم اور مصداق میں فرق ہے، ورنہ تینوں کو الگ الگ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ صدیقین اور شہداء تو دراصل مؤمنین کے مخصوص اعلیٰ طبقات کے لوگ

ہیں جو بڑی صفاتِ عالیہ کے حامل ہیں۔ یہاں سب مؤمنین کو صدیق اور شہید فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ ایک حیثیت سے ہر مؤمن بھی صدیقین اور شہداء کے حکم میں ہے، ایک ادنیٰ درجہ کے اعتبار سے ان کے زمرہ میں شامل سمجھا جائے گا۔ الحمدللہ۔ اور روح المعانی میں ہے کہ مناسب یہ ہے کہ اس آیت میں ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد وہ مؤمن لیے جائیں جو ایمان کامل رکھتے ہیں، اور طاعات کے پابند ہیں، ورنہ وہ مؤمن جو شہوات اور غفلت میں منہمک ہو اس کو صدیق و شہید نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **اللعانون لا یکونون شهداء**۔ یعنی لوگوں پر لعنت کرنے والے شہداء میں شامل نہ ہوں گے۔ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوگیا کہ تم دیکھتے ہو کہ کوئی آدمی لوگوں کی عزّت و آبرو کو مجروح کرتا ہے، اور تم اس کو نہ روکتے ہو، نہ کوئی برا مانتے ہو؟ ان حضرات نے عرض کیا کہ ہم اس کی بدزبانی سے ڈرتے ہیں کہ ہم اگر کچھ بولیں گے تو وہ ہماری بھی عزّت و آبرو پر حملہ کرے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو تم لوگ شہداء نہیں ہوسکتے۔ ابن اثیرؒ نے یہ روایت نقل کر کے اس کا مطلب یہ بتلایا کہ ایسی مداہنت کرنے والے لوگ ان شہداء میں شامل نہیں ہوں گے جو قیامت کے روز انبیاء سابقین کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت دیں گے۔ [معارف القرآن بحوالہ روح المعاني]

تفسیر مظہری میں ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد صرف وہ حضرات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایمان لائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے مشرّف ہوئے۔ اور آیت میں لفظ ﴿هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ جو کلمۂ حصر ہے یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ صدیقیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں منحصر ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب کمالات نبوت کے حامل تھے، جس شخص نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیا وہ کمالات نبوت میں مستغرق ہوگیا۔ واللہ اعلم

فرمایا: جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام پر ایمان لائے وہ صدیق ہیں، اور اپنے ربّ کے ہاں شہید ہیں۔ ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ ان کے لیے اجر اور روشنی ہے جس کے ذریعے وہ پل صراط کو عبور کریں گے۔ ان کے برخلاف: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ یہی لوگ جہنم والے ہیں جنہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہوگا۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ
كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْٓا
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو ولعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتانا ہے، جیسے بارش ہے کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خوش ہو جاتے ہیں، سوائے مخاطب! اس کو تو زرد ہونے کی حالت میں دیکھتا ہے، پھر وہ چورہ چورہ ہو جاتی ہے، اور آخرت میں عذاب شدید ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے، اور دنیاوی زندگی محض دھوکہ کا سامان ہے ﴿۲۰﴾ تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو، اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے، وہ ان لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اپنا فضل جس کو چاہے عنایت فرمائے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿۲۱﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں دنیا کی حالت بیان فرمائی ہے، ارشاد فرمایا کہ: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ﴾ دنیاوالی زندگی لہو ولعب ہے، بچوں کے کھیل اور تماشہ کی طرح ہے، اور ظاہری ایک زینت ہے، ٹیپ ٹاپ کی وجہ سے نظروں میں خوبصورت معلوم ہوتی ہے، اور نفوس کو بھلی لگتی ہے، دنیا کی اللہ تعالیٰ سے دوری کی یہ ایک علامت ہے کہ جن کے پاس زیادہ دنیا ہو وہ کبر وغرور کا شکار رہتے ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرتے ہیں، اور اموال و اولاد کی کثرت پر مقابلہ کرتے ہیں، اور نیکی اور حسنات سے نفرت اور گناہوں سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں، ظلم و زیادتی، فسق وفجور، کبر وغرور وغیرہ معاصی کے دلدادہ اور عاشق بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک شان بیان فرمائی کہ دیکھو تمہارے سامنے بارشیں ہوتی ہیں، ان سے زمین سرسبز

ہو جاتی ہے، کھیتی اگتی ہے، پودے نکلتے ہیں، درخت اور سبزہ پیدا ہوتا ہے، ہری بھری زمین دیکھنے میں بڑی اچھی لگتی ہے، کاشتکار اسے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں، کچھ دن بعد وہ ہری بھری ہونے کے بعد پیلی پڑ جاتی ہے، پھر خشک ہو جاتی ہے، پھر وہ چورہ چورہ ہو جاتی ہے، جسے ہوائیں اڑاتی ہیں، یہاں تک کہ کسی کو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی زمین ہے جو کبھی جنت کا منظر پیش کرتی تھی، یہ ہے انجام اس باغ کا جس پر کاشتکاروں نے خوشیاں منائیں، اور آج وہ ویرانی کے عالم میں دیکھنے کے قابل تک نہیں رہی، یہی مثال ہے دنیا کی بوالہوسی اور لہو ولعب کی، جس پر ناعاقبت اندیش لوگوں نے فریفتہ ہو کر اپنی آخرت کو ضائع کیا۔

دلا تا کے دریں کاخ مجازی ☆ کنی مانند طفلان خاک وبازی

بیفشان بال وپر ز آمیزش خاک ☆ بہ پر تا کنگرے ایوان افلاک

(جامیؒ)

ترجمہ: اے دل! تم کب تک اس مجازی محل میں بچوں کی طرح مٹی سے کھیلتے رہو گے؟ سو تم اپنے ہاتھ اور پروں کو مٹی کی آلودگی سے صاف رکھو، اور دنیا کی غلاظتوں سے اڑ کر ملأ اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا یہ ظاہری ساز وسامان چند دن کی رونق ہے، اگر انسان اسی میں پھنس کر رہ جائے اور آخرت کی فکر نہ کرے تو یہ بہت بڑے خسارے کا سودا ہوگا، کیونکہ آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلے میں پوری دنیا کی عمر ایک سیکنڈ سے بھی کم ہے، پس سب سے بڑا فریب خوردہ انسان وہ ہوگا جو ایک سیکنڈ سے کم عمر کی خاطر آخرت کی ابدی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اگر کوئی شخص اس دنیا کی چارروزہ لذتوں اور رنگینیوں میں پھنس کر رہ گیا، اور آخرت کے لیے کوئی سامان تیار نہ کیا تو آگے ایسے شخص کے لیے فرمایا: ﴿وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ﴾ آخرت میں سخت عذاب ہوگا۔ اور اس کے برعکس جس نے دنیا کی رنگینیوں سے اعراض کیا، اور زندگی بھر آخرت کی فکر میں رہا، تو اس شخص کے لیے فرمایا:

﴿وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ﴾ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہوگی، اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام جنت میں پہنچے گا۔ آگے دنیا کی حقیقت کا بیان فرمایا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر فریب اور دھوکے کا سامان۔

آگے جو اصل کام ہے اسی کے متعلق ارشاد فرمایا: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ اپنے پروردگار

سے مغفرت طلب کرنے میں سبقت کرو تا کہ تمہاری مغفرت ہو۔ ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو، اور اس کی طرف خوب سبقت کرو، جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔ ﴿اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ یہ ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام پر ایمان لاتے ہیں۔ دراصل جنت اللہ تعالیٰ کی رضا کا نام ہے جو کہ کافروں پر حرام ہے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا کردے، اور اللہ تعالیٰ کا فضل قیامت کے دن مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑے ہی فضل اور مہربانی والا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۲۲ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝۲۳ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۴

ترجمہ: کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے، قبل اس کے کہ ہم ان کو پیدا کریں (ظاہر کریں) یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آسان ہے ۝۲۲ تا کہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو، اور جو چیز تم کو عطاء فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں، اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے اور شیخی باز کو پسند نہیں کرتا ۝۲۳ جو ایسے ہیں کہ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں، اور جو شخص اعراض کرے گا تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اور حمد وثناء کا سزاوار ہے ۝۲۴

معارف ومنازل

مصیبت اور تکلیفوں کے بارے میں ان آیات میں بتادیا کہ جو بھی کوئی مصیبت پہنچ جائے وہ سب ہم نے کتاب لوح محفوظ میں مخلوقات کے پیدا فرمانے سے پہلے لکھ دی تھی، وہ ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، یہ مصیبت خواہ زمین میں ہو مثلاً قحط سالی، زلزلہ، کھیت اور باغات میں نقصان، تجارتی کاروبار میں نقصان، دوست واحباب کی

موت وغیرہ، یا جو تمہاری جانوں میں مصیبت آتی ہو مثلاً مرض لاحق ہونا، زخمی ہو جانا، لنگڑا لولا اندھا اور بہرا ہو جانا، وغیرہ وغیرہ، یہ سب کچھ لوح محفوظ میں پہلے سے لکھا ہوا ہے، سوان مصائب کا موجود ہونا اور درپیش ہونا لازمی ہے، اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جب قطعی طور پر طے فرما دیا ہے کہ ایسا ہونا ہی ہونا ہے تو ہو کر رہے گا، اس کی وجہ سے اپنے خالق و مالک سے غافل ہو جانا، اور اس کے ذکر و عبادت سے منہ موڑنا سمجھدار بندوں کا کام نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ﴾ زمین میں یا تمہارے نفسوں میں یعنی اندرونی اور بیرونی کوئی مصیبت یا تکلیف نہیں پہنچتی: ﴿اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا﴾ مگر وہ ایک کتاب میں درج ہے، پیشتر اس کے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر اندرونی اور بیرونی طور پر پیش آنے والی تکلیف و مصیبت اچانک نہیں آجاتی، بلکہ یہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی تقدیر اور لوح محفوظ میں درج ہے، اور وہ ہر صورت میں وارد ہو کر رہے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا اور فرمایا: لکھو ما کان و ما یکون۔ یعنی ازل سے ابد تک، قلم نے تقدیر کو مقدر کر دیا اور لکھ دیا، اس وقت اللہ تعالیٰ کے عرش اور پانی کے درمیان کچھ بھی نہیں تھا۔ [مشکوٰۃ]

پس یہ یقین رکھنا چاہئے، اور حدیث کا موضوع بھی یہی ہے کہ جو چیز کسی انسان کو پہنچنے والی ہے وہ اس سے خطاء نہیں کرے گی، اور جو چیز اس کے لیے نہیں لکھی گئی ہے وہ کبھی اس کو نہیں پہنچے گی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ تقدیرِ مبرم بھی ہے اور معلق بھی، تقدیر مبرم کو کسی بھی تدبیر سے مؤخر یا تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اور اگر تقدیر معلق ہو تو اس کو تبدیل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں، مثلاً دعا کرنا، صدقات دینا، والدین کی خدمت کرنا، غریب پروری کرنا، اعمالِ صالحہ بجالانا، یہ وہ اسباب ہیں جن سے معلق تقدیر تبدیل ہو سکتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ سو (۱۰۰) میں سے اسی (۸۰) فیصد تک تقدیر معلق ہوتی ہے، اور بیس فیصد مبرم ہوتی ہے۔

بہر حال! فرمایا کہ کوئی مصیبت نہیں پہنچتی ہے زمین میں یا تمہارے نفسوں میں مگر یہ کہ سب کچھ لوح محفوظ میں درج ہے پیشتر اس کے کہ ہم اس کو ظاہر کریں۔ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ﴾ یہ کام یعنی تمام پیش آنے والے حالات کو پہلے ہی کتاب میں درج کر دینا اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہے، کچھ مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر تکلیف کو پہلے سے کتاب میں درج کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی۔ دراصل حکمت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف مصیبتوں کے

نزول کے بعد رجوع کرنے کی تعلیم ہے، اور صبر و استقامت کا پیغام ہے، اسی کو فرمایا:

﴿لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اس پر افسوس نہ کرو، اور مایوس نہ ہوں، تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور تقدیر میں اسی طرح لکھا ہوا تھا کہ یہ لکھی ہوئی تکلیف ہر حال تمہیں پہنچے گی، اور یہ نقصان تمہیں ہر حال اٹھانا پڑے گا، اگر یہ یقین پیدا ہو جائے تو پھر متاثرہ شخص پریشانی، بے چینی، مایوسی اور جزع فزع کا اظہار نہیں کرے گا، اسی طرح اس کا دوسرا پہلو بھی بیان فرمایا:

﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ اور جو نعمت اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطاء فرمائی ہے اس پر غرور و تکبر کا اظہار نہ کرو، اور شرافت و اخلاق کے دائرے سے باہر قدم مت رکھو۔ تقدیر میں پہلے سے مقدر ہونے کی یہ بھی حکمت ہے کہ جب انسان کو علم ہوگا کہ اسے ملنے والا مال و دولت، اولاد، عزّت وجاہ، سیادت و اقتدار سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اور سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا ہوا ہے، پس اسے چاہئے کہ وہ ان چیزوں کو اپنی محنت اور کوشش اور اپنی لیاقت و استعداد کا ثمرہ نہ سمجھے، قارون کی طرح: ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾[القصص:۷۸] (یہ مال مجھے دیا گیا ہے میری سمجھداری کی وجہ سے) کا نعرہ نہ لگائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مصیبت کے آنے پر مایوسی اور جزع فزع سے پرہیز کرو، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حصول پر شیخی اور تکبر و غرور نہ کرو، کیونکہ: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ ۔سورۂ لقمان میں بھی یہی فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾﴾ [لقمان] (اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی اور تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا)۔ عام طور پر تجربہ ہے کہ مالدار لوگ اور عزّت و اقتدار پر فائز لوگ، بلند اخلاق اور پسندیدہ اعمال سے عاری اور محروم رہتے ہیں، وہ تمام سنجیدہ اعمال سے دور ہوتے ہیں، اور گھٹیا ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں، شاید انہی کے متعلق اقبال نے فرمایا: ؎

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شہ بازی

اور ایسے لوگ عموماً نہایت کنجوس اور بخیل ہوتے ہیں۔ فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں، انہیں تو خود خرچ کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اگر کوئی سخاوت اختیار کرے اور مال خرچ کرنے کا طور طریقہ اپنائے تو یہ لوگ اس پر طعنہ زنی کرتے ہیں، اور اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ بخل سے بڑا مہلک اور تباہ کن کوئی

روحانی بیماری نہیں ہے، بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے، جنت سے دور ہے، اور دوزخ سے نزدیک ہے۔[مشکوٰۃ] فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ﴾ جو شخص سب کچھ ہونے کے باوجود صحیح اور مستحق جگہ پر خرچ نہیں کرتا، بلکہ روگردانی کرتا ہے تو: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ سو بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے، اسے کسی کے مال کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود خرچ کرنے والے کا ہی اس میں فائدہ ہے۔ مال کے متعلق پہلے واضح کر دیا گیا کہ یہ کسی کا ذاتی نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، وہی اصل مالک ہے، وہی اصل متصرف ہے، اس نے تھوڑی دیر کے لیے مجازی طور پر انسانوں کو اس کا مالک بنایا ہے، اور اسے خرچ کرنے کا اختیار بھی دیا ہے، پھر اسے آزمائش بھی کرتا ہے، انسان کی زندگی کا ہر مرحلہ امتحان اور آزمائش کی زد میں ہے، خاص کر مال واقتدار ان کا امتحان وآزمائش بہت ہی سخت ہے، وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس آزمائش پر پورا اترتے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا، اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور ترازو کو نازل کیا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں شدید ہیبت ہے، اور لوگوں کے لیے طرح طرح کے فوائد ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی کون مدد کرتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ قوی ہے، زبردست ہے ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

عجیب بات ہے کہ یہ سنہرا جہاں اپنے عاشقوں کی نظر میں کتنا خوبصورت اور پر لطف اور رنگیلا ہے، اگر اس جہاں میں نبیوں کو خدانخواستہ نظر انداز کیا جائے تو یہ سارا جہاں دو پیسے کا بھی نہیں رہے گا۔ اصل اس جہاں کی خوبصورتی اور نشوونما اور حسن وجمال اور آب وتاب اور رونق ایمان اور عملِ صالح سے ہے، اور ایمان وعملِ صالح کی طرف دعوت

دینے والے وہ عظیم الشان اور جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام ہیں انہی کے بارے میں پوری کائنات پر احسان جتلا کر ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ﴾ البتہ تحقیق ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسولوں کو کھلی اور واضح نشانیوں کے ساتھ، ان کھلی نشانیوں کا یہی مقصد ہے کہ اندھے بہرے گونگے لوگ انہی نشانیوں سے ہدایت والا راستہ معلوم کر کے اپنی روحانی اور جسمانی ظاہری اور باطنی بیماریوں کا علاج تجویز کرلیں۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ بینات سے مراد واضح اصول اور واضح قوانین ہیں، جن کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، اور جن پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے، اور یہ چیزیں ہدایت کے اسباب وذرائع بھی ہیں، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی صداقت کی علامت بھی۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے انہی اصولوں کے ذریعہ خلق خدا کو تبلیغ کی، اور انہیں صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت دی۔ فرمایا:

﴿وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ﴾ اور رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب اور میزان بھی نازل فرمائی۔ ہر نبی اور ہر رسول کو اللہ تعالیٰ نے کتاب یا صحیفہ عطا فرمایا، جو دین کی بنیاد اور اساسی قانون ہوتا ہے، اور پیغمبر کا قول و فعل اس کتاب کی شرح ہوتی ہے۔ اور میزان کا عام فہم معنیٰ ترازو ہے، تاہم اس کے معانی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے، بعض فرماتے ہیں کہ میزان سے مراد شریعت ہے، جس سے صحیح اور غلط کی پہچان ہوتی ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ میزان سے انسانی عقل مراد ہے، جس کے ذریعے انسان حق وباطل میں تمیز کرسکتا ہے۔ تاہم اکثر مفسرین میزان سے مراد ترازو لیتے ہیں، کیونکہ سارے جہاں کے حقوق کی پہچان کی یہی معیار ہے، جس کی تھوڑی تفصیل سورۃ الرحمٰن میں گزر چکی ہے۔

البتہ بعض علماء نے ظاہری حسی چیزوں کے لئے ظاہری ترازو مقرر کیا ہے، اور باطنی ومعنوی چیزوں کے لیے باطنی ترازو مقرر کیا ہے، اس کی اصطلاح اکثر اہل تصوف میں زیادہ مشہور ہے، مثلاً اندازے کے ساتھ کھاؤ، اندازے کے ساتھ پیو، اندازے کے ساتھ سوجاؤ، اندازے کے ساتھ بولو، وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا: میزان کے نازل کرنے کا مقصد یہ ہے: ﴿لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ﴾ تاکہ لوگ انصاف کو قائم رکھ سکیں، کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی جس سے احکام اساسی اصول اور شعائر اللہ وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، اور میزان اس لئے قائم کردی تاکہ لوگ عدل کریں، اور ایک دوسرے کی حق تلفی نہ کریں۔ واضح رہے کہ اسی ترازو کی خیانت سے حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری قوم تباہ ہوگئی، اور قیامت کا تمام حساب وکتاب

اسی ترازو کے ذریعہ ہوگا، جس کی تفصیل سورۂ اعراف اور سورۂ انبیاء میں گزر چکی ہے، اور مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ المطففین میں آنے والی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک مقصد کتاب اور میزان بتایا جن کی افادیت سب کو معلوم ہے۔ آگے ایک اور عظیم نعمت کا تذکرہ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت ہے، یعنی لڑائی، یہاں اَنْزَلْنَا اتارنے سے مراد پیدا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے پہاڑی کانوں سے لوہا برآمد کیا، اور وحی کے ذریعہ سے لوہے کی مصنوعات کی صنعت لوگوں کو سکھائی، اسی طرح کے مفہوم کی مثال سورۃ الزمر میں ہے: ﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ [الزمر: ۶] (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مویشیوں میں سے آٹھ جوڑے نازل کئے) اونٹ گائے، بھیڑ، بکری، نر اور مادہ۔ ظاہر ہے کہ ان جانوروں کا نزول آسمان سے نہیں ہوا، پس اَنْزَلْنَا کا معنی خَلَقْنَا ہوا۔ تاہم ان کی اور ہر چیز کی پیدائش کا حکم ضرور عالمِ بالا سے آتا ہے۔

لوہے کی دریافت اور اس سے استفادہ بڑی پرانی بات ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے پوتے حضرت ادریس علیہ السلام جو کہ پچاس سے زائد چیزوں کے موجد ہیں انہوں نے لوہے سے بہت سی چیزوں کی ایجاد کی، اور لوہے کے بہت سے فوائد معلوم کئے، اور کپڑے سینے کے لئے سب سے پہلے سوئی بنائی۔ قدیم زمانے سے جنگی ہتھیار، تلوار، بندوق، نیزہ، خنجر، تیر، ڈھال، زرہ وغیرہ لوہے سے تیار کرتے تھے۔

۱۷۰۰ء میں لوہے کی پیداوار زیادہ ہوئی، اور ہزاروں چیزوں کی صنعت اور ایجاد کی پوری دنیا میں ترویج ہوئی بڑے زور وشور سے آج بھی بکثرت جاری ہے، اور سائنسی ایجادات سے چھوٹی بڑی لاکھوں چیزوں کی پیداوار ترقی کناں جاری ہے، اور لوہے کو دنیاوی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، دنیا کو اس وقت لوہے کی وہ کثرت اور محیر العقول ترقی حاصل ہے جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ الغرض لوہا ایک نہایت ہی کارآمد دھات ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے لوہے کو اتارا ہے جو سخت ہیبتناک ہے، جس کے اندر لوگوں کے بہت سے فوائد ومنافع ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوہا، آگ، پانی، نمک چاروں کو آسمان سے اتارا ہے۔ [مظھری]

فرمایا: لوہا ایک اہم کارآمد چیز ہے، اس سے مقصود یہ ہے: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کردے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے

دین کے غلبہ کی خاطر قربانی دیتا اور جدوجہد کرتا ہے، اور تلوار اٹھا کر دین کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ میدانِ جہاد میں تمام جنگی ہتھیار جو استعمال ہوتے ہیں وہ سب لوہے کی پیداوار ہیں۔ پھر اپنے استغناء کا ذکر فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا زبردست ہے، وہ کسی کی مدد کا ہرگز محتاج نہیں، وہ صرف تمہارا امتحان لیتا ہے کہ کون میرے دین کے لئے قربانی دیتا ہے، اور کون نہیں دیتا، اور جو قربانی دیتا ہے سو اس کا فائدہ روزِ قیامت اس کو حاصل ہوگا، اور وہ کامیاب ہوگا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا، اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی ﴿۲۶﴾ سو ان لوگوں میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہوئے، اور بہت سے ان میں نافرمان تھے، پھر ہم ان کے بعد دوسرے رسولوں کو یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے، اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا، اور ہم نے ان کو انجیل دی، اور جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا تھا ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور ترحم پیدا کیا، اور انہوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کرلیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا، لیکن انہوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا، سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی، سو ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے ان کو ان کا اجر دے دیا، اور ان میں زیادہ نافرمان فاسق ہیں ﴿۲۷﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیات میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انبیاء ورسل علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا، اور ان کی صداقت کے لیے انہیں نشانیاں اور معجزات عطاء کئے، اب ان آیات میں بطور نمونہ ان

میں سے دو جلیل القدر انبیاء حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کا تذکرہ فرمایا، اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ بھی ہے، تو فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے بھیجا حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کو رسول بنا کر۔ یاد رہے کہ ان دونوں جلیل القدر پیغمبروں کا تذکرہ یہاں اجمالاً صرف نمونہ ونشاندہی کے طور پر ہے، ان کے مکمل تفصیلی واقعات مختلف سورتوں میں تسلی بخش طور پر بیان ہو چکے ہیں، ان دونوں کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ اور ہم نے ان دونوں پیغمبروں کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری رکھا۔ طوفان نوح کے بعد آپ کے تینوں بیٹے سام، حام، اور یافث کی اولاد پورے عالم میں پھیل گئی، اور سلسلۂ نبوت بھی آپ کی اولاد میں ہی رہا، پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور شروع ہوا تو نبوت اور کتاب کی امانت آپ کی اولاد میں منتقل ہوگئی، اور آپ حنیفی دور کے ابوالانبیاء ہیں، آپ کے بعد سلسلۂ نبوت آپ کی اولاد میں جاری رہا، اور حضرت اسحاق علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل کے ہزاروں انبیاء آپ کی اولاد میں ہیں، اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے سلسلے میں صرف حضرت خاتم الانبیاء سید الاولین والآخرین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے جو سلسلۂ نبوت شروع ہوا تھا اس مبارک سلسلہ کا آخری نبی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سارے عالم کے جن وانس سب کے لیے ہے، اور آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی سچا نبی نہیں آئے گا۔ ہاں! شیطان کے گماشتے تیس (۳۰) کے قریب دجال اور کذّاب جو آئیں گے وہ سب جہنمی اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھے جائیں گے۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں، اسی طرح آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن حکیم بھی سب سے آخری کتاب ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سب سے آخری امت ہے، دونوں انبیاء علیہما السلام کی اولاد کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ ان میں سے کچھ لوگ ہدایت یافتہ ہیں تاہم ان کی اکثریت نافرمان ہی ہیں۔

ان دونوں انبیاء علیہما السلام کے بعد ان کی اولاد میں ایمان اور کفر کے دونوں سلسلے جاری رہے، فرمانبردار ہر زمانے میں تھوڑے رہے، اور کافر ونافرمان لوگ زیادہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت سارا جہاں کفر کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، انبیاء سابقین کا کوئی نشان دنیا میں باقی نہیں تھا، سوائے پہاڑوں کے غاروں میں چند راہب

اور تارک الدنیا لوگوں کے، جبکہ وہ بھی ہدایت کے انوار و برکات سے خالی تھے، اور گمراہیوں کا شکار ہو چکے تھے، آنے والی آیات میں اسی کا بیان ہے، فرمایا:

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا﴾ پھر ہم نے نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر دوسرے رسولوں کو بھیجا تا کہ روزِ قیامت کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے پاس کوئی نبی نہیں آیا، اسی اتمامِ حجت کی خاطر دنیا کے ہر محاذ پر ہر قوم کے پاس یکے بعد دیگرے بشیر و نذیر انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے، اسی کو فرمایا: ﴿وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ [فاطر: ۲۴] (یعنی کوئی ایسی امت نہیں جس میں بشیر و نذیر نہ گزرے ہوں)۔ پھر فرمایا: ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ﴾ [یونس: ۴۷] (اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں اپنے رسول بھیجے ہیں)۔ اور سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء: ۱۶۵] (یعنی یہ سارے رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تھے تا کہ لوگوں کی اللہ تعالیٰ کے ذمے کوئی حجت باقی نہ رہے اور وہ روز قیامت یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور نذیر نہیں آیا)۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ پھر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی اسرائیل کے لیے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو نبی بنا کر بھیجا، پھر آپؑ کو: ﴿وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ﴾ ہم نے ان کو انجیل کتاب عطا فرمائی۔ انجیل کا معنی ہی خوشخبری ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک خوشخبری ہیں، جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے، اور آپ کی کتاب کا نام بھی خوش خبری ہے، آپؑ نے آخری پیغمبر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش خبری یوں سنائی: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ [الصف: ٦] (اے میری قوم بنی اسرائیلیو! میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور اپنے بعد ایک عظیم الشان پیغمبر آخر زمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت دینے والا ہوں، جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہوگا) سریانی زبان میں احمد کا معنی سردار جہاں ہے، جسے وہ فارقلیط کہتے ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح پیروکاروں کی خصوصیت بیان فرمائی:

﴿وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً﴾ ہم نے آپ کے پیروکاروں کے دلوں میں نرمی اور مہربانی رکھ دی، وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے، اور آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے، اور کیا ہی بہتر ہے کہ قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق یہی

فرمایا: ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹] (وہ آپس میں بڑے نرم دل اور مہربان ہوتے ہیں) مگر اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے مقابلے میں بڑے سخت ہوتے ہیں۔ دنیا والوں کے سامنے یہ تجربہ ہمیشہ سے رہا کہ جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہوا انہیں مہربان اور رحم دل بنایا، اور جن پر اللہ تعالیٰ کا قہر وغضب ہوا انہیں سنگ دل اور بے رحم بنایا، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں مہربانی اور نرمی مقرر فرمائی مگر:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ مگر انہوں نے رہبانیت یعنی ترکِ دنیا اور ایک نیا عجیب طریقہ خود ایجاد کیا، جو ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا، تاہم رہبانیت سے ان کا مقصد: ﴿إِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللهِ﴾ صرف اتنا تھا اور یہ تھا کہ انہوں نے اس میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کو تلاش کرنے کا ارادہ کیا تھا جو کہ غلط تھا، پھر کیا ہوا:

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ وہ لوگ اپنے اس مقصد کی وہ رعایت نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کا حق تھا، ان کی نیت اگرچہ خالص تھی مگر طریقہ کار نہایت غلط تھا، چنانچہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی بجائے طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کردہ نرمی اور مہربانی کو نبا نہ سکے۔

رہبانیت رہب کے مادہ سے ہے جس کا معنی ترکِ دنیا، ترکِ لذت اور ترکِ نکاح ہے، چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعض پیروکاروں نے دنیا کا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اور شہری زندگی کو خیر باد کہتے ہوئے جنگلوں صحراؤں اور پہاڑوں کے غاروں میں جا کر عزلت کی زندگی اختیار کر لی، اور وہیں کٹیا بنا کر عبادت وریاضت میں مصروف ہو گئے، اگرچہ راہب کا معنیٰ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے، مگر وہ لوگ خوفِ خدا کی بجائے طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہو گئے، جو ان کی گمراہی کا ذریعہ بن گئی۔

یہ کیسی رہبانیت ہے جس میں حلال نکاح کی پابندی ہے اور قوم کی بیٹیوں کی آبروریزی کو ثواب سمجھا جاتا ہے جیسا کہ آج پورے یورپ میں بڑے بڑے پادریوں کا یہی حال ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کو رہبانیت سے منع فرمایا ہے، آپؐ کا ارشاد مبارک ہے: **لا رهبانية في الإسلام ولا صيرورة في الإسلام**۔ اسلام میں نہ ترکِ دنیا کی گنجائش ہے، اور نہ ہی قطع تعلقی کی، اسلام تو دنیا میں رہ کر صلۂ رحمی کی تلقین کرتا ہے، اور چاروں طرف چالیس گھروں تک پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی اور تعلقات قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد بھی ہے: **لكل نبي رهبانية ورهبانية هذه الأمة الجهاد في سبيل الله**۔ ہر نبی یعنی اس کی امت کے لیے رہبانیت ہوتی ہے، اور میری امت کی رہبانیت جہاد میں ہے۔

مسند احمد کی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ گھر بار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگل میں علیحدگی کی زندگی گزارنا رہبانیت نہیں، بلکہ ہماری اس امت کی اصل رہبانیت یہ ہے کہ وہ گھر بار اور دیگر لوازمات، کاروبار وغیرہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی دین کی سربلندی کی خاطر جہاد میں شامل ہوجائے، یعنی دنیا سے کفر و شرک اور شر و فساد کو ختم کیا جائے، اور اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے۔ رہبانیت اور اس جہاد میں آسمان و زمین کا فرق ہے، راہب نے زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچایا، اور مجاہد کے عمل اور اس کی رہبانیت سے پوری دنیا کو اقامتِ دین کا ثواب پہنچا، اور مسلمانوں کو سکون نصیب ہوا، اور اسلام کو پورے ادیان پر غلبہ حاصل ہوا۔

مسند احمد ہی کی روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیں، آپؓ نے فرمایا کہ تم نے مجھ سے ایسی بات پوچھی ہے جو میں نے اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کی تھی، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: **أوصیک بتقوی اللہ وعلیک بالجھاد فإنہ رھبانیۃ الإسلام۔** میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ یہ ہر شئی کی بنیاد ہے، نیز جہاد کو لازم پکڑو، کیونکہ اسلام کی رہبانیت یہی جہاد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ ذکر کو لازم پکڑو، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت پر مداومت اختیار کرو، کیونکہ یہ تمہارے لئے آسمانوں سے پاکیزہ رزق اور بلند روحانیت کا ذریعہ ہے، جب تم یہ دو کام کروگے تو زمین میں تمہارا تذکرہ ہوگا۔ [مسند احمد] بہرحال! اس حدیث مبارکہ میں رہبانیت جہاد کو قرار دیا گیا ہے۔

مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ رہبانیت کی تین صورتیں ہیں: پہلی صورت رہبانیت کی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی حلال یا مباح چیز کو حرام سمجھتا ہے، یا اس کو عملاً چھوڑ دیتا ہے، تو یہ دین میں تحریف شمار ہوگی، جو قطعاً حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾[المائدۃ:۸۷] (جو پاک چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال قرار دی ہیں ان کو حرام نہ ٹھہراؤ)۔

رہبانیت کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی حلال یا مباح چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام تو نہیں سمجھتا مگر کسی دینی یا دنیوی مصلحت کی بناء پر اس کو ترک کر دیتا ہے، مثلاً طبی لحاظ سے بعض مریضوں کو چند حلال چیزوں سے بطور پرہیز منع کیا جاتا ہے، یا ایک شخص تقویٰ اور دینی لحاظ سے غیبت سے بچنے کی خاطر لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیتا ہے، تو ان دونوں مصلحتوں کی وجہ سے کسی جائز چیز کو ترک کرنا رہبانیت میں شمار نہیں ہوگا، بلکہ یہ تقویٰ کا ایک حصہ ہے جو شریعت میں

مطلوب ہے۔

رہبانیت کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی جائز اور مباح چیز کو حرام تو نہیں سمجھتا لیکن اس کے ترک کرنے کو ثواب سمجھتا ہے، اس کو بدعت کہا جاتا ہے، جس کی شریعت مطہرہ نے مذمت کی ہے، اور جس سے منع کیا گیا ہے، یہ صورت خالص رہبانیت ہے اور مذموم ہے۔

بدعت ایک بڑی مذموم چیز ہے جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: **من عمل عملاً ليس عليه أمرنا فهو رَدٌ۔** جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں ہے (قولاً اور عملاً حدیث سے ثابت نہیں ہے) تو وہ مردود ہے۔ تمام بدعات کو لوگ ثواب سمجھ کر ہی انجام دیتے ہیں، لہٰذا یہ بڑی خطرناک چیز ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر افتراء ہے، اور شریعت میں زیادتی ہے جو کہ حرام ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ ''تضرر مبتدع زیادہ است از تضرر کافر''۔ یعنی بدعتی کا نقصان دین کے معاملہ میں کافر سے زیادہ ہوتا ہے، کافر کو تو ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ کافر ہے، لہٰذا اس سے بچنے کی تدبیر کرتا ہے، مگر بدعتی آدمی ہر بدعت کو نیکی اور افضل کام سمجھ کر کرتا ہے، لہٰذا اس کا بدعت سے بچ نکلنا بڑا ہی مشکل ہے، اور بدعتی کو کبھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بدعت کو گناہ ہی نہیں سمجھتا، تو توبہ کیوں کرے؟ بخلاف کافر کے کہ اس کو توبہ نصیب ہو جاتی ہے۔

﴿فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ پس دیا ہم نے ان کو جو ایمان لائے ان میں سے ان کا بدلہ، اور بہت سے لوگ ان میں سے نافرمان ہیں۔

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا
تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی
شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: اے ایمان رکھنے والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے دو حصے دے گا، اور تم کو ایسا نور عنایت فرمائے گا کہ تم اس کو لیے ہوئے چلو پھرو گے، اور وہ تم کو بخش دے گا،

اور اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے ﴿۲۸﴾ تا کہ اہل کتاب کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل کے کسی جزء پر بھی دسترس نہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں فضل ہے، وہ اسے جس کو چاہے دے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿۲۹﴾

معارف ومنازل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر سابقہ اُمتوں میں سے کوئی شخص اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا، اور پھر اس نے میرا زمانہ بھی پایا اور مجھ پر ایمان لایا تو اس کو دہرا اجر ملے گا۔ اس آیت کریمہ میں ایمان والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے اپنے دور میں سابقہ انبیاء حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے، اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ بھی پایا، تو انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا ایسا حکم ہے جیسے انہوں نے اپنے اپنے نبیوں علیہم السلام پر ایمان لائے تھے، چنانچہ ان آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے سابقہ انبیاء علیہم السلام پر تو ایمان لا چکے ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے ساتھ تمہارے سابقہ ادیان منسوخ ہو گئے، اب تمہاری نجات نہ یہودیت میں ہے نہ نصرانیت میں ہے، اب تمہارے ایمان اور نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں علیہم السلام پر ایمان لانا بلا تفریق ضروری ہے، اور کسی ایک نبی کا انکار سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے انکار کو مستلزم ہے، تو ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ، جس کے بغیر تمہارا مومنوں میں کبھی شمار نہیں ہوگا، اور تمہارا پرانا دین تمہاری نجات کے لیے کافی نہیں ہوگا، پس اگر تم اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ گے:

﴿یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دو حصے عطا کرے گا: ایک حصہ پہلے نبی کی نبوت پر ایمان لانے کے بدلے میں اور دوسرا حصہ آنحضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرنے کے عوض میں ہوگا، اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بدلے میں ﴿وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ایمانی روشنی فراہم کرے گا، جس کو لے کر تم چلو گے، اور تمام چیزوں میں تمہیں حق اور صراط مستقیم پر چلنے کا نور میسر ہوگا، تمہیں اپنی زندگی میں کوئی تاریکی نظر نہیں آئے گی، اور ہر موقع پر حق تمہاری نظروں

میں ایسا معلوم ہوگا جیسے چمکتا ہوا ستارہ، جس کی بدولت تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور تمہاری تمام مشکلات حل ہوتی چلی جائیں گی، اور تمہیں یہ تیسرا انعام بھی ملے گا:

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو بھی معاف کردے گا، کیونکہ یہ ایک عام اصول ہے کہ ایمان لانے پر تمام سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور بہت زیادہ مہربان ہے۔

سابقہ آیت میں اہل کتاب کے مؤمنوں کے لیے تین انعامات ذکر ہوئے: دہرے اجر اور نور اور مغفرت کا وعدہ، اب آنے والی آیت میں اس کی توجیہ بیان فرمائی: ﴿لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ تاکہ اہل کتاب ضرور جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے۔

مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر دو طریقے سے کرتے ہیں: ایک صورت میں لا نافیہ ہے، دوسری صورت میں لا زائدہ ہے۔ حضرت شاہ عبد القادر اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں لِئَلَّا میں لا نافیہ ہے، اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے، اور یہ صرف دوسروں کے لئے ہے، نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بھی مکمل گنجائش رکھی ہے، اگر وہ پہلے نبی کے بعد نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لے آئیں گے تو وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کے مستحق ہوں گے بلکہ ان کو دہرا اجر ملے گا۔ مگر اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ لِئَلَّا کا لا زائدہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں عطاء فرمائیں تاکہ قیامت کے دن اہل کتاب پر اپنے بارے میں یہ واضح ہوجائے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل کے کسی جزء پر بھی دسترس اور تصرف نہیں ہے، اور تاکہ یہ بھی معلوم ہوجائے کہ سارا فضل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، پھر فرمایا:

﴿وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ وہ جس کو چاہے عطا کردیتا ہے۔ دراصل اہل کتاب اس گھمنڈ اور غرور میں مبتلا تھے کہ ہمارے علاوہ کوئی بھی اللہ کے فضل کا مستحق نہیں ہوتا، اس آیت کریمہ نے ان کے اس زعم باطل کی ہوا اڑادی، فرمایا: اگر اہل کتاب فضل خداوندی کو محض اپنے لئے مخصوص کرتے ہیں تو انہیں جان لینا چاہئے کہ اس فضل کا انہیں کوئی استحقاق حاصل نہیں، اور فضل تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ جس کو چاہے عطا کردے، اس میں اللہ تعالیٰ کو کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ لوگ وہی گمراہ لوگ ہیں جو کبھی کہتے ہیں: ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ [البقرة:١١١] (ہرگز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا، مگر وہ جو

یہودی ہو، یا نصرانی ہو)۔اور کبھی کہتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾[المائدة:۱۸](ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)۔اور حال یہ ہے کہ ایمان باللہ و برسلہ کے اقدار میں سے کوئی حصہ ان کے پاس نہیں، اور فسق و فجور و دیگر فحشاء و منکرات میں اتنے آگے نکلے ہوئے ہیں جس سے ابلیس کو بھی پیچھے چھوڑ چکے ہیں، اور موجودہ دور میں تو اتنے گمراہ ہیں کہ تمام مذہبی و دینی و اخلاقی اور انسانی شرافتوں سے عاری ہیں، یہاں تک کہ نکاح کے نام سے واقف نہیں، اور ہم جنس پرستی جیسے فواحش و بدکاریوں میں بطور فخر یہ ملوث ہیں۔فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے، اس کے فضل و کرم کا نہ حد ہے اور نہ اندازہ و شمار، وہ جس کو چاہے نوازے، وہ مالک و خودمختار ہے۔

سُورَةُ الْمُجَادَلَةِ

مدنيةٌ آياتها ٢٢ ركوعاتها ٣

سورۂ مجادلہ مدنی ہے، اس میں بائیس (۲۲) آیتیں، اور تین (۳) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ المجادلہ ہے جو اس سورت کی پہلی آیت کے لفظ "تُجَادِلُكَ" سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۵۸ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۱۰۵ ویں نمبر پر ہے۔

نزول:

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے، جمہور علماء اسی کے قائل ہیں، اس کا نزول سورۃ المنافقون کے بعد ہے۔

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں تین (۳) رکوع، بائیس (۲۲) آیات، چار سو نواسی (۴۷۹) کلمات، اور دو ہزار تین سو ایک (۲۳۰۱) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

(۱)- دونوں سورتوں میں اسلام کے بنیادی اصول توحید ورسالت، صداقتِ قرآن اور اثباتِ قیامت کا یکساں بیان ہے۔

مختصر موضوع:

ظہار کے شرعی احکام، کفارہ کی صورتیں، آدابِ مجلس میں سرگوشی کا قانون، منافقین کی جھوٹی قسموں پر تنبیہ، لوگوں کی اقسام وصورتیں، جزاء اعمال اور اچھے برے لوگوں کے انجام ونتائج، آنحضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تسلی، مؤمنین کی کامیابی اور کفار کی مغلوبیت، حزب اللہ وحزب الشیاطین کا بیان وغیرہ۔

﴿الجزء الثامن وعشرون﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ
بَصِيْرٌ ① اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ
وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ② وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ
ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ③ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ
سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ④

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملہ میں جھگڑتی تھی، اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کر رہی تھی، اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، اور بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے ① تم میں جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے، اور وہ لوگ بلاشبہ ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں، اور یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے ② اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنی کہی ہوئی بات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے، قبل اس کے کہ دونوں باہم ایک دوسرے کو چھوئیں، اس کی تم کو نصیحت کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے ③ پھر جس کو میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ لگا تار دو مہینے کے روزے

ہیں، قبل اس کے کہ دونوں باہم ایک دوسرے کو چھوئیں، پھر جس سے یہ بھی اگر نہ ہو سکے تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، یہ حکم اس لئے ہے تا کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔﴿۴﴾

معارف و منازل

آیاتِ ظہار کا شان نزول:

اس سورت کا نام سورۃ المجادلہ معروف اور مشہور ہے، پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام سے پہلے اہل عرب میں طلاق کے علاوہ عورت کو اپنے اوپر حرام کرنے کے دو طریقے اور بھی رائج تھے: ایک ایلاء اور ایک ظہار۔

ایلاء اس بات کو کہتے تھے کہ شوہر بیوی کو خطاب کر کے قسم کھالیتا تھا کہ میں تیرے پاس نہیں آؤں گا، اس کا بیان سورۂ بقرہ کی آیت نمبر (۲۲۶) میں گزر چکا ہے، اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ بیوی کو خطاب کر کے یہ کہتے تھے کہ: **أَنتِ عَلَيَّ كَظَهر أُمِّي**۔ تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ یعنی کمر، مطلب یہ ہوتا تھا کہ تو مجھ پر حرام ہے، اس کو ظہار کہا جاتا تھا، اس میں لفظ ظہر آتا تھا، جو پشت کے معنی میں ہے، اس لئے اس کا نام ظہار مشہور ہو گیا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بھی اس کو ظہار ہی کے عنوان اور نام سے یاد اور ذکر کیا جاتا ہے۔ اب اس آیت کا سبب نزول معلوم کرنا چاہئے جس سے پتہ چلے گا کہ یہ عورت کون تھی جس کا واقعہ یہاں ذکر فرمایا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا اوس ابن صامت رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، ایک دن ان کے شوہر نے اپنا مخصوص کام کرنے کا ارادہ کیا، حضرت خولہؓ نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ ان کے شوہر کو کچھ تکلیف تھی، اور شوہر کی خیر خواہی ان کے پیش نظر تھی، جیسے ہی بیوی نے انکار کیا شوہر نے یوں کہا: **أَنت عَلَيَّ كَظَهرِ أُمي**۔ یہ کہہ تو دیا لیکن بعد میں پشیمان ہوئے، اور اپنی بیوی سے کہا کہ میں تو یہی سمجھ رہا ہوں کہ اب تو مجھ پر حرام ہو گئی ہے، یہ سن کر حضرت خولہؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم یہ طلاق نہیں ہے۔

اس کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب میرے شوہر نے مجھ سے نکاح کیا تھا اس وقت میں جوان تھی، اور مال دار تھی، میرے شوہر نے میری جوانی بھی فنا کر دی، اور میرا مال بھی کھالیا، اب جبکہ میرے خاندان والے منتشر ہو گئے، اور میری عمر بڑی ہو گئی، تو اس نے مجھ سے

ظہار کرلیا، اب اسے اس بات پر ندامت ہے، تو کیا ایسی کوئی صورت ہے کہ میں اور وہ مل کر رہتے رہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس پر حرام ہوگئی، اس لئے کہ ظہار کے متعلق پہلے کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حضرت خولہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے، میرے شوہر نے طلاق کا لفظ نہیں بولا، اس سے میری اولاد بھی ہے، اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب بھی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی بات ارشاد فرمائی کہ تو اس پر حرام ہوگئی، خولہؓ نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرتی ہوں، میں اپنے شوہر کے ساتھ عرصۂ دراز تک رہی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تو اس پر حرام ہوگئی، اور تیرے بارے میں مجھ پر ابھی کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔

خولہؓ اسی طرح اپنی بات کرتی رہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح جواب دیتے رہے، آخر میں خولہؓ نے یہ کہا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اگر انہیں شوہر کے پاس چھوڑ دوں تو ضائع ہوجائیں گے، اور اگر اپنے پاس رکھ لوں تو بھوکے مرجائیں گے، یہ کہا: اور آسمان کی طرف سر اٹھایا، اور کہنے لگی کہ اے پروردگار! اے میرے ربّ! میں آپ کی بارگاہ میں اپنی تکلیف کو پیش کرتی ہوں، آپ اپنے نبی پر کوئی ایسا حکم نازل فرمایئے جس سے میری پریشانی دور ہوجائے۔

یہ زمانہ اسلام میں ظہار کا پہلا واقعہ تھا، اس موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پاس بیٹھی ہوئی تھیں، انہوں نے خولہؓ سے کہا کہ تو اپنی بات بس کردے، تو دیکھتی نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک پر کیا آثار ظاہر ہورہے ہیں؟ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہونی شروع ہوگئی تھی، آپؐ پر جب وحی کا نزول ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہلکی سی نیند میں ہوں، اور چہرۂ مبارک سرخ ہوجاتا، اور آپؐ کے چہرہ مبارک سے غیر اختیاری طور پسینہ ٹپکتا تھا، بالکل موتیوں کی طرح، جب وحی ختم ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خولہؓ سے فرمایا کہ تم اپنے شوہر کو بلا کر لاؤ، جب وہ آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا﴾ سے آیات پڑھ کر سنائیں، جن میں ظہار اور کفارۂ ظہار کا حکم ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ بابرکت ہے وہ ذات جو تمام آوازوں کو سنتا ہے، جو عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کررہی تھی میں گھر میں ان سے قریب ہوتے ہوئے اس کی پوری باتیں نہ سن پائی، حالانکہ میرے سامنے میری موجودگی میں یہ باتیں ہورہی تھیں، اور اللہ تعالیٰ جل شانہ نے عرش پر اس کی باتیں سن

لیں، اور آیت کریمہ نازل فرمائی۔ فسبحان من سمع الأصوات۔

اب پہلی آیت کا ترجمہ دوبارہ پڑھئے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملہ میں جھگڑ رہی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کر رہی ہے، اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا﴾ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ کے ساتھ اپنے خاوند کے بارے میں گفتگو اور تکرار کرتی ہے۔ ﴿وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ اور وہ اللہ کے سامنے اپنی بے بسی کی شکایت کر رہی تھی۔ ﴿وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا﴾ اور تمہارے دونوں کے درمیان جو گفتگو جاری ہے اللہ تعالیٰ اس کو سنتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

بیوی سے ظہار کرنا طلاق کی طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ عمل ہے، اس لئے فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ﴾ وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں یعنی انہیں اپنی ماں کی پشت یا کسی دوسرے عضو کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جس کا دیکھنا حرام ہے، ﴿مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ﴾ وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، بلکہ ان کی مائیں تو وہ ہیں جنہوں نے ان کو جنم دیا ہے، کیونکہ حقیقی ماں کے علاوہ دوسری عورت کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا﴾ اور بے شک وہ لوگ ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں، اور اس طرح کہنا نہایت قبیح ہے، اس لئے کہ اس طرح کہنے والا شخص کسی حلال چیز کو خود ہی اپنے اوپر حرام قرار دے دیتا ہے، اور جھوٹی بات اس لئے ہے کہ حقیقی ماں کے علاوہ کوئی عورت ماں کی طرح نہیں بن سکتی، اور یہ چار وجوہات کی بناء پر ایک ناپسندیدہ فعل ہے: (۱) بیوی کو ماں کہنا (۲) ناپسندیدہ بات کہنا جو لغو ہے (۳) جھوٹی بات کہنا (۴) گناہ کا ارتکاب کرنا۔

مسئلہ: ظہار صرف مرد ہی کرسکتا ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، عورت جس طرح طلاق نہیں دے سکتی تو ظہار بھی نہیں کرسکتی۔

مسئلہ: ﴿مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ﴾ سے واضح ہوتا ہے کہ ظہار کے لیے اپنی ماں یا کسی محرم عورت کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دینا ضروری ہے جس کا دیکھنا جائز نہ ہو، اگر بغیر کسی تشبیہ کے کوئی یہ کہے: أنتِ کأمي تو میری ماں کی مانند

ہےتو اس سے ظہار لازم نہیں آئے گا۔ باقی مسائل آئندہ آئیں گے۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ﴾ اور بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے، وہ اپنے بندوں کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے، بشرطیکہ وہ توبہ کرلیں، اور قانون الٰہی کی بے احترامی نہ کریں۔ اس سے پہلے ظہار کی شرعی حیثیت بتائی، اب آئندہ کفارۂ ظہار کا بیان ہوگا، تو ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ جو لوگ اپنی عورتوں کے ساتھ ظہار کرتے ہیں پھر پلٹتے ہیں اپنی کہی ہوئی بات پر نادم ہوکر، بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی صورت یہ ہے کہ جو کہ پشیمانی کا کفارہ ہے جس کی تین صورتیں ہیں بالترتیب:

(۱) پہلی صورت یہ ہے: ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا﴾ کہ وہ ایک غلام آزاد کرلے، اور غلام آزاد کرنے سے پہلے میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کو ہاتھ نہ لگائیں، یعنی نہ جماع کریں اور نہ بوس وکنار و تقبیل کریں۔ ﴿ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ﴾ یہ وہ چیز ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جاتی ہے، مقصد نصیحت کرنے کا یہ ہے کہ گزشتہ کا کفارہ دے کر کام چلاؤ، اور آئندہ ایسے الفاظ بولنے سے پرہیز کرو۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے، لہٰذا محتاط رہو، اور ہر قسم کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔

(۲) دوسری صورت اگر کسی کو غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں تو فرمایا: ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا﴾ سو جو شخص غلام نہ پائے تو پھر اس کے لیے کفارہ یہ ہے کہ وہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے، پیشتر اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ مطلب یہ ہے کہ دو ماہ یعنی ساٹھ دن متواتر روزہ رکھے، یہاں تک کہ درمیان میں عذر یا بغیر عذر کے ایک دن بھی افطار نہ کرے، اگر درمیان میں کسی دن روزہ چھوٹ گیا یا بیماری کی وجہ سے رہ گیا تو تسلسل ختم ہوجائے گا، اب جتنے دن روزے رکھے تھے وہ شمار میں نہیں آئیں گے، اس کو پھر شروع سے روزے رکھنا پڑیں گے، خواہ آخری دن ہی کیوں نہ ہو، دو ماہ کے اندر اگر بیوی کے ساتھ میل ملاپ رکھا تو سارے روزے ختم ہوجائیں گے۔

(۳) کفارہ کی تیسری صورت علیٰ سبیل التنزل یہ ہے: ﴿فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا﴾ پس جو شخص مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو بیماری کی وجہ سے یا جسمانی کمزوری کی وجہ سے تو پھر ساٹھ مسکینوں کو دو وقت اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہوگا، یعنی جو عام طور پر لوگ اپنے گھر والوں کو جو کھانا کھلاتے ہیں، نہ

بہت اعلیٰ نہ نہایت معمولی، بلکہ درمیانہ۔

فرمایا: ﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یہ حکم اس لئے دیا جارہا ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ ﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جو اس نے مقرر کر دی ہیں، یہ تمہارا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی حدود کو صدق دل سے تسلیم کرو، حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو، احکام شریعت کی پاسداری کرو، کسی بھی شرعی حکم کو پامال نہ کرو، تاکہ حدود اللہ کی خلاف ورزی سے سلامت رہو، اور ہر طرح کے عذاب سے بچ سکو۔ ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴﴾ اور کفر کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

مسئلہ: غلام آزاد کرنے میں غلام اور لونڈی دونوں برابر ہیں، ان کا مسلمان ہونا یا بالغ ہونا ضروری نہیں ہے۔

مسئلہ: کفارہ میں دو مہینے کے روزے رکھے، تو اس میں رمضان کے روزے حساب میں نہیں لگا سکتے، کیونکہ وہ تو پہلے سے فرض ہیں، ان ساٹھ (۶۰) روزوں میں شرط ہے کہ رمضان کے روزوں سے علاوہ ہوں۔

مسئلہ: کھانا کھلانے کی صورت میں اگر ایک مسکین کو ساٹھ ۶۰ دن تک کھانا کھلائے تو اس سے بھی کفارہ ادا ہوگا۔

مسئلہ: اگر ظہار کے بعد عورت کو طلاق دی، یا عورت مرگئی تو کفارہ ساقط ہوجائے گا لیکن توبہ کرنا پھر بھی لازم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ
اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۵ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ
بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۶

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل ہوں گے، جیسے وہ لوگ ذلیل ہوئے جو ان سے پہلے تھے، اور ہم نے کھلے کھلے احکام نازل کئے ہیں، اور کافروں کو ذلت کا عذاب ہوگا۵ جس روز ان سب کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ فرمائے گا، پھر ان کا سب کیا ہوا ان کو بتلادے گا، اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ کر رکھا ہے، اور یہ لوگ اسے بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہے۶

معارف ومنازل

ان آیات کا مطلب نہایت واضح ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں وہ

ذلیل ہوں گے، جس طرح گزشتہ اقوامِ عالم نے اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں علیہم السلام کی تکذیب کی، وہ سب ہلاک ہو گئے، اب قیامت تک آنے والوں کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ایسے لوگوں کے نقشِ قدم پر چلو گے تو تمہارا حشر بھی ان کی طرح ہوگا، دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل و خوار ہو جاؤ گے۔

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ بے شک پکی بات ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں جیسے اہل مکہ اور کفارِ قریش وہ اسی طرح ذلیل و خوار ہوں گے، جس طرح ان سے پہلے مخالفین ذلیل و خوار ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کو کبھی عزّت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ عذابوں میں تباہ و ہلاک ہوئے۔ یہاں مخالفت سے مراد عمومی مخالفت ہے، خواہ اعتقاد میں ہو، خواہ اقوال و افعال میں ہو، خواہ اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ قوانین میں ہو۔

یہ ذلت و خواری سب کے لیے ہے، دنیا و آخرت دونوں میں، آج کے زمانہ میں شاید ہی کوئی خوش نصیب ہو گا جو اللہ تعالیٰ کے قانوں کی مخالفت نہ کرتا ہو، مگر حقیقت یہی ہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ آج ہم اپنے گرد و پیش پر نظر مارتے ہیں تو دنیا میں کہیں بھی کسی اسلامی ملک میں اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے دین کی عملداری نظر نہیں آتی، اللہ تعالیٰ کے قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بہت پرانے قوانین ہیں، موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں، لہٰذا ہمیں خود جدید قانون وضع کرنے ہوں گے۔ بہر حال! یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح مخالفت ہے، یہ قانون اپنے بنانے والوں کو جہنم میں لے ڈوبے گا، صرف مرنے کی دیر ہی ہے۔

فرمایا: یاد رکھو! ﴿وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ تحقیق ہم نے واضح اور کھلے احکام واضح دلائل اور معجزات نازل کر دیئے ہیں، اور ان کے نہ ماننے والے کافروں کے لئے ہمارے ہاں ذلت والا عذاب موجود ہے، جو لوگ اپنی خواہشات کو مقدم رکھتے ہیں، اور حدود اللہ کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے قوانین کی جگہ بندوں کے قوانین نافذ کرتے ہیں، انہیں اپنے انجام بد سے خبردار ہونا چاہئے، جس دن عذاب انہیں چاروں طرف سے ڈھانپ لے گا، اور ان کا کوئی بھی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا، ان کا یہ بُرا انجام کب ہوگا؟ فرمایا: سنو!

﴿یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ﴾ جس دن ان سب کو اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے گا، جب قیامت برپا ہوگی اور حساب و کتاب کا مرحلہ شروع ہوگا، تو اللہ تعالیٰ ان سب کو ان کے اعمال سے آگاہ کر دے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے تمام اعمال نیک و بد لکھ کر محفوظ کر رکھے ہیں،

جہاں ذرہ برابر عمل بھی مخفی نہیں رہے گا، جبکہ وہ اپنے اعمال خود بھول چکے ہیں، اب انہیں یاددہانی کرائی جائے گی، ان سے کہا جائے گا: لو اپنا اعمال نامہ اپنے ہاتھ میں، چنانچہ وہ اپنے تمام اعمال کو اس کتاب میں پائے گا، اور اب اسے وہ سارے اعمال یاد آئیں گے جنہیں وہ بھول چکے تھے، چنانچہ نہایت افسوس اور حسرت کے ساتھ یوں کہے گا: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾[الکہف:۴۹] (یہ کیسی یہ کتاب ہے جو نہ چھوٹی بات چھوڑتی ہے، نہ بڑی بات)۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگہبان، محافظ اور گواہ ہے، وہ ہر جگہ حاضر و ناظر بھی ہے، اور ہر چیز پر گواہ بھی ہے، یہاں تک کہ دلوں کے بھید سے بھی باخبر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا
خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا
عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۞ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ
لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ
يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ
فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ
الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۞ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ
لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞

ترجمہ: کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، جو بھی خفیہ مشورہ تین آدمیوں کا ہوتا ہے وہ ضرور چوتھا ہوتا ہے، اور جو پانچ آدمیوں کا مشورہ ہو تو وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے، اور اس سے کم افراد ہوں یا زیادہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں، پھر وہ انہیں قیامت کے دن ان کے اعمال سے باخبر کر دے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۞ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی سے منع کیا گیا پھر وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے ان کو روکا گیا؟ اور وہ گناہ کی اور زیادتی کی

اور رسول کی نافرمانی کی، سرگوشیاں کرتے ہیں، اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو ایسے لفظ سے آپ کو سلام کہتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا، اور وہ اپنے نفسوں میں یوں کہتے ہیں کہ ہمارے اس کہنے پر اللہ تعالیٰ ہمیں سزا کیوں نہیں دیتا؟ کافی ہے ان کے لیے جہنم، وہ اس میں داخل ہوں گے، سو وہ برا ٹھکانہ ہے ۸ اے ایمان والو! جب تم سرگوشی کرو تو گناہ کی اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو، اور نیکی اور تقویٰ کی سرگوشیاں کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، جس کی طرف تم سب جمع کئے جاؤ گے ۹ بات یہی ہے کہ سرگوشی شیطان کی طرف سے ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو رنجیدہ کرے، اور وہ بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کے انہیں کچھ بھی نقصان نہیں دے سکتا، اور مؤمنین بندے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کریں ۱۰

معارف و منازل

یہودی اور منافق ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں مصروف رہتے تھے، اور بری بری حرکتیں کرتے تھے، منافقین کی ایک خصلت یہ ہوتی تھی کہ جب وہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آکر بیٹھتے تھے تو آپس میں سرگوشی اور خفیہ باتیں کرتے تھے، مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے، اور ان کی طرف آنکھوں سے اشارہ بھی کرتے تھے، اور ان پر طعنہ زنی کرتے تھے، اور عیب جوئی بھی کرتے تھے، اور بسا اوقات گلیوں اور راستوں پر بیٹھتے تھے، جب وہاں سے کسی مسلمان کا گزر ہوتا تو گہری نظروں سے دیکھتے، اور آنکھوں سے اشارہ بازی بھی کرتے تھے، اور کبھی کبھی وہ یہودیوں کے ساتھ ملتے اور طعنہ زنی کا بازار گرم کرتے تھے، اس طرح یہودی بھی ان کی سرگوشیوں سے راضی ہو جاتے، اور ان کا ساتھ دیتے۔ چنانچہ مخلص مسلمانوں کو ایسی ناشائستہ حرکتوں سے جب سخت کوفت ہوئی تو انہوں نے خدمت گرامی میں شکایت کی، اس پر ان آیات کا نزول ہوا جس کے بعد ایک حد تک وہ لوگ دب گئے، اور انہیں خوف بھی دامنگیر ہوا کہ کہیں مسلمان ہمارے خلاف جہاد نہ کریں، فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، پس جو لوگ خفیہ میٹنگیں کرتے ہیں، اور اسلام کے خلاف منصوبے بناتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ نہیں ہوتا مشورہ تین آدمیوں کا مگر اس میں چوتھا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے، اور نہ پانچ آدمیوں کا

خفیہ مشورہ ہوتا ہے مگر وہاں چھٹا اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔

﴿وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا﴾ اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، یہ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی تمام سرگوشیاں ان کی باتیں ان کے خفیہ مشورے اور ان کی اسکیمیں خواہ جہاں کہیں بھی ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کی موجودگی میں ہوتی ہیں، کائنات میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جو (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی پہنچ سے باہر ہو، اور یہ وہاں جا کر سرگوشی کرلیں، اور اللہ تعالیٰ سے چھپنے کی کوشش کریں، ایسا قطعاً ممکن نہیں۔ انسان جب کوئی ارادہ کرتا ہے، اور اپنے دل کے ارادہ کو ابھی تک زبان پر ظاہر نہیں کیا ہے، تب بھی اللہ تعالیٰ انہیں جانتا ہے، جب اللہ تعالیٰ ایسے مخفی ارادوں کو جانتا ہے تو خفیہ میٹنگوں کا کیا کہنا۔

نجوٰی خفیہ بات چیت کے لیے بولا جاتا ہے، یعنی کانا پھوسی کرنا۔ لفظ مناجات بھی اسی سے لیا گیا ہے، چنانچہ خفیہ دعا کو مناجات کہا جاتا ہے۔ فرمایا: جب اللہ تعالیٰ ہر خبر کو جانتا ہے تو:

﴿ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ پھر وہ قیامت کے دن ان سارے انسانوں کو ان کے اعمال سے باخبر کردے گا، اور ان کے اعمال سب ایک ایک کر کے ان کے سامنے رکھ دے گا، پس حجت پوری کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہر انسان کے لیے جزا و سزا کا فیصلہ فرمادے گا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ ہر خبر کو جاننے والا ہے، اور کوئی چیز اس کے علمِ محیط سے باہر نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ اگر تین آدمی کسی جگہ موجود ہوں یا سفر کر رہے ہوں تو ان میں سے دو آدمی الگ بیٹھ کر آپس میں مشورہ نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تیسرے آدمی کو شک گزرے کہ علیحدگی میں مشورے سے اس کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے، لہٰذا ایسا کوئی کام نہ ہو جس سے تیسرے آدمی کی دل شکنی ہو۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ سرگوشی کی ممانعت سے دنیوی یا دینی معاملات میں مشورہ کرنا بھی ممنوع ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مسلمانوں کی تعریف فرمائی، اور ان کو مشورے کا حکم بھی دیا، فرمایا: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ:۳۸] (اور ان کا معاملہ ان کے درمیان مشورہ ہوتا ہے)۔ اور لطف یہ ہے کہ اس سورت کا نام ہی سورۃ الشوریٰ ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ [آل عمران:۱۵۹] (اور ان کے ساتھ معاملہ میں مشورہ کریں)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جارہا ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات وصول نہیں ہوئیں آپ ایسے امور میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرلیا کریں، اور مشورہ کے بعد کوئی فیصلہ کریں، پھر

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کام کو شروع کریں۔

فائدہ:

مشورہ ایک بہت اچھا عمل ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ بغیر مشورہ کے کوئی معمولی عمل بھی انجام نہ دیں، انسان جتنا بھی عقلمند اور تجربہ کار ہو اس کے کاموں میں غلطی کا امکان ضرور رہو، جبکہ مشورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ہوتی ہے، اور چنداں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ مشورہ میں اگر صرف دو شخص ہوں تو بصورتِ اختلاف ترجیح دشوار ہوتی ہے، اسی لئے عموماً معاملاتِ مہمّہ میں طاق عدد رکھتے ہیں، اور ایک عدد کے بعد پہلا طاق عدد تین تھا، پھر پانچ قرآن پاک میں شاید اس لئے ان دو کو اختیار فرمایا، اور آگے: ﴿وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ﴾ سے تعمیم فرمادی، تو یہ بات ظاہر ہے کہ اگر تین میں سے دو ایک طرف اور ایک دوسری طرف ہوگا، تو دو کو ترجیح ہوگی، اسی طرح پانچ میں تین ایک طرف اور دو ایک طرف تو تین کو ترجیح ہوگی۔ واللہ اعلم

باقی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شوریٰ کہ خلافت کو چھ بزرگوں میں دائر کردیا، حالانکہ چھ کا عدد طاق نہیں، یہ اس لئے ہوگا کہ اس وقت یہی چھ خلافت کے سب سے زیادہ اہل اور مستحق تھے، جن میں سے کسی کو چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ نیز خلیفہ کا انتخاب انہی چھ میں سے ہورہا تھا، تو ظاہر ہے کہ جس کا نام آتا اس کے سوائے رائے دینے والے تو پانچ ہی رہتے ہیں، پھر بھی احتیاطاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصورتِ مساوات ایک جانب کی ترجیح کے لیے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا نام شامل کیا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ فرمایا تھا کہ یہ مشورہ تو دے سکتے ہیں مگر خود خلافت کے امیدوار نہیں بن سکتے، چنانچہ یہ سارے حضرات تین دن تک باہمی مشورہ کرتے رہے، اور اس دوران حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ بطور قائم مقام خلیفہ نماز پڑھاتے رہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق آپؓ کا جنازہ بھی صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے پڑھایا۔ بہرحال! تین دن کی مشاورت کے بعد مذکورہ کمیٹی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرلیا۔ الغرض! مشاورت کی اپنی اہمیت ہے، جس کے لیے نبی اور امت دونوں کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشی کرنے سے منع کیا گیا ہے، مگر وہ پلٹ کر پھر وہی بات کرتے ہیں جن سے ان کو روکا گیا تھا؟

﴿وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ اور سرگوشی کرتے ہیں گناہ کی زیادتی کی، اور رسول کی مخالفت کے ساتھ، ایک تو یہودی تھے جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے، دوسرا گروہ منافقین کا تھا جو

بظاہر تو ایمان قبول کر چکے تھے، مگر ان کی ہمدردی یاں یہودیوں اور مشرکین کے ساتھ تھیں، اس سے پہلے انہیں سورۂ نساء میں اس طرح کی سرگوشیوں سے اور عیب جوئیوں سے منع کیا جا چکا تھا، لیکن یہ موذی بے حیاء انسانیت وشرافت سے خالی لوگ پھر بھی اپنی حرکتوں اور زیادتیوں سے باز آنے والے نہ تھے، اسی پر ان آیتوں کا نزول ہوا، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور مسلمانوں کی ایذاء رسانی میں منافقین کے ساتھ یہودی بھی شریک تھے، آیت کے اگلے حصے میں یہودیوں کی خیانت کا بیان ہے، فرمایا:

﴿وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ﴾ جب یہ یہودی آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بدبخت جب آپ کے پاس آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سلام نہیں کرتے، یہ السلام علیکم نہیں کہتے، بلکہ اس کی جگہ السام علیک کہتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہ دعائیں دی ہیں: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [الصافات:۱۸۱] (اور سلام ہو رسولوں پر) اور ﴿وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى﴾ [النمل:۵۹] (اور سلام ہو اللہ کے ان بندوں پر جن کو اس نے چن لیا ہے)۔ اور مؤمنین کی زبانوں سے **السلام عليك أيها النبي ورحمة الله وبركاته**۔ مگر بعض یہود جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تو بجائے السلام علیک کے دبی زبان سے السام علیک کہتے، جس کے معنی ہے: تجھے موت آئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جو سلامتی کی دعا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی تھی اس کے خلاف یہود بددعا دیتے تھے، اور پھر آپس میں یہ کہتے کہ اگر یہ واقعی رسول ہے تو اس طرح کہنے سے ہم پر فوراً عذاب کیوں نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا:

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ﴾ یعنی جلدی نہ کرو، ایسا کافی عذاب آئے گا جس کے سامنے دوسرے عذاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ احادیث میں یہود کے متعلق آتا ہے کہ السلام کی جگہ السام کہتے تھے، لیکن ممکن ہے کہ بعض منافقین بھی ایسا کہتے ہوں گے، کیونکہ منافق عموماً یہودی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی یہودی یہ کہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جواب میں صرف وعلیک فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ لفظ سن کر برداشت نہ کر سکیں، اور السام علیک کے جواب میں یہودی کو **عليك السام واللعنة** کہا، تم پر خدا کی لعنت اور ہلاکت ہو، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کمالِ خلق سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ جواب پسند نہ آیا، اور آئندہ اسے اس طرح کہنے

سے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا: درشتی نہ کرو نرمی اور شفقت سے کام لو۔ [بخاري]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بدبخت اپنی حرکات سے باز آنے کی بجائے: ﴿وَيَقُولُونَ فِيٓ أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُولُ ۚ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ اور کہتے ہیں اپنے نفسوں میں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر جو ہم کہتے ہیں ہم کو کیوں سزا نہیں دیتا؟ ارشاد فرمایا: جہنم ان کے لئے کافی ہے، جس میں وہ داخل ہوں گے، اس سے بڑھ کر اور کیا سزا ہو سکتی ہے، اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو صحیح مشاورت کی ہدایت فرمائی:

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ﴾ اے ایمان والو! تم آپس میں کوئی خفیہ مشورہ کرو تو کوئی ایسا مشورہ نہ کرو جس میں گناہ کی یا زیادتی کی یا رسول ﷺ کی مخالفت کی کوئی بات ہو، بلکہ: ﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ بلکہ ہمیشہ نیکی اور تقویٰ کا مشورہ اور سرگوشی کرو، جس میں ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی کی بات ہو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی طرف تم سب اکھٹے کیے جاؤ گے، اور اس کے حضور تمہاری پیشی ہوگی، اور یہ یاد رکھو! جن مشوروں میں گناہ کی زیادتی کی اور رسول ﷺ کی مخالفت کی بات ہو تو: ﴿إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا﴾ تو یہ شیطانی مشورے ہوتے ہیں، اور شیطان چاہتا ہے کہ شر و فساد کا بازار گرم ہو، اور شیطان کا مقصود اس سے یہ ہوتا ہے تاکہ اہل ایمان کو غم میں ڈالا جائے، ان میں پریشانی اور تکلیف عام ہو، اور وہ اسلام سے بدظن ہو جائیں، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ کہ یہ لوگ اہل ایمان کو شیطانی وساوس کے ذریعہ کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو، ہر طرح ضرر و نفع کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ یہودیوں اور منافقوں کی حیلہ سازیاں ناکام بنا دیں گے۔ سورۂ فاطر میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾ [فاطر: ۴۳] (جو شخص کسی کے بارے میں بری تدبیر سوچتا ہے اللہ تعالیٰ خود اسی کو اس تدبیر میں پھنسا دیتا ہے)۔

حدیث شریف میں ہے: من حفر بئرا لأخيه وقع فيه۔ جو شخص اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودتا ہے اس میں وہ خود گر جاتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تسلی ہے کہ اگر تم اللہ و رسول ﷺ کے اتباع پر ثابت قدم رہو گے، تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ آخر میں ارشاد فرمایا: کسی کی مخالفت سے بددل نہ ہوں: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴿ اور ایمان والوں کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کریں، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ کبھی کسی شکست سے دو چار نہیں ہوتے۔

آج اگر ہو ہم میں ایمان ابراہیم پیدا ☆ آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑪

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں جگہ کھول دو، تو تم جگہ کھول دیا کرو، اللہ تعالیٰ تم کو کھلی جگہ دے گا، اور جب یہ کہا جائے گا کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو، جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ ان کے اور ان لوگوں کے درجات بلند فرمائے گا جنہیں علم عطا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سب اعمال کی پوری خبر ہے ⑪

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں منافقین اور یہود کا بیان تھا جو مجلسوں میں بیٹھ کر سرگوشیاں کرتے تھے، اور اہل ایمان کی اذیت کا باعث بنتے تھے، اب اس آیت کریمہ میں اہل ایمان کو آداب مجلس کے متعلق دو باتوں کا حکم دیا:

اول یہ ہے کہ مجلسوں میں بیٹھے ہوں تو بعد میں آنے والوں کو بھی جگہ دیا کریں، اور کھل کر بیٹھ جایا کریں، تاکہ کسی آنے والے کو زحمت نہ ہو، اور بیٹھے ہوئے لوگ بھی پریشان نہ ہوں، جب ایسا عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں انعام ملے گا، اور وہ اپنے کرم سے تم پر رحمتوں اور مغفرتوں کا دروازہ کھول دے گا، اسی طرح آنے والوں کو بھی چاہئے کہ وہ بھری ہوئی مجلس میں زبردستی گھسنے کی کوشش نہ کریں، اور کسی پہلے سے بیٹھے ہوئے شخص کو نہ اٹھائیں۔

بہرحال! یہ آداب دونوں فریق کے حق میں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس کی بیٹھنے کی جگہ سے اٹھا کر خود اس کی جگہ پر نہ بیٹھ جائے، ہاں! فرمایا: کھل جایا کرو، اور مجلس میں وسعت نکال لیا کرو۔ [بخاري جلد: ۲]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **خیر المجالس أوسعها**۔ سب مجلسوں میں سے بہتر مجلس وہ ہے جو سب سے زیادہ وسیع ہو۔ اور حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے تو جہاں جگہ مل جاتی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ [مشکوٰۃ صفحہ:۴۵۵] حضرت واثلہ بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس نے کہا: یا رسول اللہ! جگہ میں گنجائش ہے، آپ کو تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بلا شبہ مسلمان کا یہ حق ہے کہ اس کا بھائی اسے آتا ہوا دیکھے تو اس کے لئے ہٹ جائے۔ [مشکوٰۃ صفحہ:۴۵۴]

تو فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ﴾ اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو پس تم کشادگی کرو، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کشادگی پیدا فرمائے گا، وہ تمہاری تنگی دور کر کے رزق میں وسعت پیدا کر دے گا، اور تم پر اپنی رحمت اور مہربانی کے دروازے کھول دے گا۔

دوسری نصیحت یہ فرمائی: ﴿وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا﴾ اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کر چلے جاؤ، یعنی مجلس کے اختتام کے ساتھ تم سے کہا جائے، یا اس سے پہلے کہ تم چلے جاؤ، پس تم کوئی حیلہ و حجت نہ کرو، بس روانہ ہو جاؤ، مزید بیٹھ کر لوگوں پر بوجھ مت بنو، کیونکہ اعلان ہو جانے کے بعد مزید بیٹھے رہنا ایک قسم کی نافرمانی ہے، اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ کچھ لوگوں کے مجلس سے اٹھ جانے میں یہ فائدہ ہے کہ دوسرے آنے والوں کے لیے جگہ خالی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس مبارک میں تو ہر شخص بیٹھنے کا خواہشمند ہوتا تھا، جس کی وجہ سے جگہ کی تنگی ہوتی تھی، یہاں تک کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی قریب جگہ نہیں ملتی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نازل فرمائے۔

بعض علماء نے اس کی یوں تفسیر بیان کی ہیں کہ جب نماز اور جہاد اور دیگر امور خیر کے لئے اٹھنے کو کہا جائے تو بغیر کسی حیلہ و حجت کے اٹھ کھڑے ہوا کرو، اور روانہ ہو جاؤ، یہ عمدہ معنی بھی ہے اور نصیحت بھی۔

فرمایا: ﴿يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا اللہ تعالیٰ ان کو درجات کے اعتبار سے بلند فرما دے گا، یعنی جو احکام اوپر بیان کئے گئے ان پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے اور اہل علم کے درجات بلند فرما دے گا، اگر چہ اہل علم بھی اہل

ایمان میں داخل ہیں، لیکن ان کا مستقل تذکرہ فرما کر ان کی شان کو بڑھا دیا۔ نیز آیت کریمہ میں یہ بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان کے ذریعہ رفعِ درجات ہوتا ہے، پھر علم کی وجہ سے مزید درجات بلند ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے قرآن وحدیث اور اس سے متعلقہ علوم مراد ہیں۔

علماء دین کی فضیلت نہ صرف عام ایمان والوں پر بلکہ ان عبادت گزاروں پر بھی ہے جو نوافل میں لگے رہتے ہیں، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو عالم نماز فرض پڑھ کر بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کو خیر سکھاتا ہے اس کی فضیلت اس عابد پر جو دن بھر روزہ رکھتا ہے، اور راتوں رات کو قیام کرتا ہے ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ کسی شخص پر ہے۔ ایک اور حدیث میں یوں ہے کہ جسے اس حال میں موت آ گئی کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا کہ اس کے ذریعہ وہ اسلام کو زندہ کرے تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں ایک درجہ کا فرق ہوگا۔ [مشكوٰة: ص ٣٦ عن الدارمي]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرات انبیاء علیہم السلام پھر علماء، پھر شہداء شفاعت کریں گے۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے باخبر ہے، تم جو بھی اچھے اور برے کام کرو گے اس کا بدلہ ضرور پاؤ گے۔

❁ ❁ ❁

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ
خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا
بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑬

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اور پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے، سو اگر تم نہ پاؤ تو اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے ⑫ کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات دیا کرو، سو جب تم نے نہ کیا، اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے حال پر مہربانی فرمائی، سو نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے باخبر ہے ⑬

معارف ومنازل

دربارِ رسالت کے پروانوں کا امتحان اور پھر اس کی منسوخی کا بیان۔ پہلی آیت میں حکم دیا ہے کہ جب کوئی دربارِ رسالت میں کوئی بات کرنے کے لئے آئے اور سرگوشی کے طور کوئی خفیہ بات کرنا چاہے تو اس سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرے۔ دوسری آیت میں اس حکم کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے۔ مفسر قرطبیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بکثرت سوالات کیا کرتے تھے، جب سوالات کا سلسلہ بہت زیادہ ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاق گزرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے ان سوالات میں تخفیف کرانے کے لئے یہ حکم دیا کہ صدقہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا کریں، جب ایسا ہوا تو غربت کی وجہ سے بہت سے لوگ سوال کرنے سے رک گئے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس میں وسعت دے کر بغیر صدقہ خدمت گرامی میں حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اور علامہ قرطبیؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وجہ سے نازل ہوئی کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خلوت میں گفتگو کرنے کی درخواست کرتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی کرتے تھے تو دوسرے مسلمانوں کو خیال ہوتا تھا کہ شاید ہمارے بارے میں کوئی بات چیت ہو رہی ہے، جب عامۃ المسلمین کو تنہائی میں وقت لینے والوں کا طریقہ کار ناگوار گزرا تو اللہ تعالیٰ شانہ نے حکم دیا کہ جنہیں سرگوشی کرنا ہو وہ صدقہ دے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا کریں، تا کہ خلوت میں وقت مانگنے والوں کا سلسلہ ختم ہو، اور لوگوں کے شبہات دور ہوں۔ [تفسیر قرطبي: جلد ۱۷]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ ایک آیت ہے جس پر مجھ سے پہلے کسی نے عمل نہیں کیا، اور نہ میرے بعد کوئی اس پر عمل کرے گا، میرے پاس ایک دینار تھا میں نے اس کو دس درہم میں تڑوا لیا تھا، جب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر خفیہ مشورہ کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو ایک درہم صدقہ کر کے آتا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ فرما دیا۔ [ابن کثیر: جلد ۵]

فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ اے ایمان والو! جب تم اللہ تعالیٰ کے رسول کے ساتھ سرگوشی کرنے کا ارادہ کرو تو اس گفتگو سے پہلے صدقہ دے دیا کرو۔

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ایسا کرنا تمہارے لئے بہتر بھی ہے اور پاکیزہ بھی، اور صدقہ کرنے کے لیے اگر تم کوئی چیز نہ پاؤ پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور از حد مہربان ہے۔

بعض علماء کرام نے کہا ہے کہ اس حکم کا مطلب صرف یہ تھا کہ منافقین کا بے مقصد آنا جانا اور خدمت گرامی میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنا بند ہوجائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، منافقین اپنی کنجوسی کے باعث آنے جانے سے رک گئے۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ﴾ کیا تم اس بات سے ڈر گئے ہو کہ اپنی سرگوشیوں سے پہلے صدقہ ادا کرو؟ تو کوئی بات نہیں۔ ﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ پھر اگر تم یہ کام نہیں کر سکے یعنی صدقہ نہ دے سکے تو سن لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے تمہاری طرف رجوع کیا ہے، اور صدقے کی ادائیگی کی شرط منسوخ کر کے تمہارے اوپر آسانی فرمائی ہے، پھر فرمایا:

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ہر حالت میں نماز کو قائم رکھو۔ ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ اور تمام امور میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال سے باخبر ہے، اسی طرح تمہاری نیتوں اور ارادوں سے بھی واقف ہے، لہٰذا تمام احکام میں اس کی فرمانبرداری بجالاؤ۔

۞ ۞ ۞

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً
فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٦﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا
يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٨﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ
فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢١﴾

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا؟ نہ وہ تم میں سے ہیں نہ ان

میں سے اور وہ جانتے ہوئے جھوٹ پر قسم کھاتے ہیں ⑭ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار فرمایا ہے، بے شک وہ برے کام کیا کرتے تھے ⑮ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا، سو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روک دیا، لہٰذا ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ⑯ ہرگز کچھ بھی ان کے اموال اور اولاد اللہ تعالیٰ سے بچانے کے لیے کچھ کام نہ آئیں گے، یہ دوزخ والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہیں گے ⑰ جس روز اللہ تعالیٰ ان کو دوبارہ زندہ فرمائے گا سو وہ اس کے لیے بھی ایسی قسمیں کھائیں گے جیسی قسمیں تمہارے سامنے کھاتے ہیں، اور وہ خیال کر رہے ہیں کہ ہم کسی اچھے حال میں ہیں، خبردار! بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں ⑱ شیطان نے ان پر غلبہ پالیا ہے، سو انہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا دیا، یہ شیطان کا گروہ ہے، خبردار! بے شک شیطان کا گروہ خسارے میں پڑ جانے والا ہے ⑲ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتے ہیں یہ لوگ بڑی ذلت والوں میں ہیں ⑳ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے: میں ضرور ضرور غالب رہوں گا، اور میرے رسول، بے شک اللہ تعالیٰ قوی ہے، زبردست ہے ㉑

معارف ومنازل

ان آیات میں منافقین کا بدترین طریقہ کار اور ان کی جھوٹی قسمیں کھانے اور یہودیوں کو مسلمانوں کی خبریں پہنچانے کا بیان ہے۔ معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ یہ آیات منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں، جنہوں نے ظاہراً اسلام کا دعویٰ کیا، لیکن اندر سے یہودیوں سے دوستی جاری رکھی۔ مؤمنین کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے جو ان کے راز اور مخفی حالات معلوم ہو جایا کرتے تھے منافقین ان کو یہودیوں تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

اس کے بعد ایک قصہ یوں نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن نبتل نامی ایک یہودی تھا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر بیٹھا کرتا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں جو عام کرنے کی نہ تھیں یہودیوں کو پہنچا دیتا تھا، ایک دن یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے حجرہ مبارک میں تشریف رکھتے تھے، آپؐ نے خود ہی فرمایا کہ ابھی ایک شخص آئے گا اس کا قلب جبار ہے، اور وہ شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ آئے تو اس سے بات نہ کرنا، اس شخص کی آنکھیں نیلی تھیں، جب یہ پہنچ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تو اور تیرے ساتھی مجھے برے الفاظ میں کیوں یاد کرتے ہو؟ وہ قسم کھا گیا کہ نہیں ایسی بات تو نہیں ہے، اور اپنے ساتھی کو بھی لے کر آ گیا، وہ بھی اسی طرح جھوٹی قسمیں کھا گیا کہ ہم میں سے کسی نے آپ کی کوئی بے ادبی نہیں کی، اس پر یہ آیت اتری کہ یہ جھوٹے ہیں، یہی حال مشرکوں کا بھی دربار

الٰہی میں ہوگا کہ قسمیں کھا جائیں گے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی قسم جو ہمارا ربّ ہے کہ ہم نے دنیا میں کوئی شرک نہیں کیا۔

فرمایا: ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ﴾ کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہوں نے ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات کر رکھے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا؟ یہ مغضوب علیہ قوم سے مراد یہودی ہیں، جن کے ساتھ منافقوں کا دوستانہ گٹھ جوڑ تھا، یہ منافق لوگ دراصل: ﴿مَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلَا مِنۡهُمۡ﴾ نہ تو تم میں سے ہیں نہ ان میں سے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو یہ پکے یہودی ہیں، اگرچہ ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں، اور نہ یہ تم میں سے ہیں مسلمان ہیں، کیونکہ ان کی مسلمانی زبانی دعوؤں تک محدود ہے۔

﴿وَيَحۡلِفُوۡنَ عَلَى الۡكَذِبِ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴾ جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں تاکہ تم ان کو مسلمان سمجھو، حالانکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، جبکہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ سورۂ توبہ میں ان کی جھوٹی قسموں کی داستان گزر چکی ہے، اور آئندہ مزید تفصیل سورۃ المنافقون میں آنے والی ہے، جبکہ سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی کچھ تفصیلات بیان ہوئیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، وہ عذاب بدترین قسم کا ہوگا، جسے سورۃ النساء میں یوں بیان کیا: ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ۱۴۵] (بے شک منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے اور خطرناک طبقے میں ہوں گے) کیونکہ ان کی کارگزاری بہت ہی بری ہے، اور ان کا مکر وفریب دھوکہ دہی دورخی پر چلنا اور لمبی لمبی جھوٹی قسمیں کھانا اسی کا متقاضی ہے کہ ان کا عذاب جہنم میں بدترین نوعیت کا ہو، وہ اس لئے بھی:

﴿اِتَّخَذُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ جُنَّةً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ﴾ انہوں نے اپنی قسموں کو اپنے دفاع کے لئے ڈھال بنا رکھا ہے، بات بات پر قسمیں اٹھا کر مسلمانوں کو اپنے ایمان اور اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے ہیں، پس انہوں نے اس کے ساتھ پوشیدہ طور پر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی کوشش کی ہے، تاکہ مسلمان اسلام سے بدظن ہوجائیں، اور آئندہ کوئی کافر اسلام قبول نہ کرے، تو ان کے انجام کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے ذلت ناک عذاب ہے۔ مزید فرمایا:

﴿لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا﴾ ان کے مال اور ان کی اولادیں اللہ تعالیٰ کے روبرو کچھ بھی کام نہیں آئیں گے، مال ودولت، قبیلہ وبرادری، بیٹے وبھائی دنیا میں کسی حد تک کام آجاتے ہیں، مگر

آخرت میں ان میں سے کوئی بھی کام نہیں آئے گا۔ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہ تو دوزخ کی آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ فرمایا: ان کی جھوٹی قسمیں اس دنیا تک ہی محدود نہیں، بلکہ ان کی بدبختی کی انتہاء یہ ہے کہ:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو دوبارہ اٹھائے گا اور حساب وکتاب کے لیے اپنے سامنے کھڑا کردے گا، تو وہاں بھی جھوٹی قسمیں اٹھائیں گے جس طرح آج تمہارے سامنے اٹھا رہے ہیں، ان کی فطرت ہی بگڑی ہوئی ہے۔ ﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ﴾ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کسی راہ پر ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اصل راستے سے بھٹک چکے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ خبردار رہو کہ یہ لوگ سرتاپا جھوٹے ہیں، اور جھوٹ ہی ان کا ایمان ہے۔

آگے اس کی وجہ یہ ہے کہ: ﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ ان پر شیطان نے قابو پالیا ہے، اور ان کو اپنا ہمنوا بنالیا ہے، پس انہیں اللہ کی یاد فراموش کرادی ہے۔ دراصل یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد جو کرتے ہیں صرف اپنے بچاؤ کے لیے، نماز جو پڑھتے ہیں صرف مسلمانوں کو دکھانے کے لیے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا یہ ان کا کوئی مقصود نہیں، بلکہ مسلمانوں سے مراعات حاصل کرنے کی خاطر۔ دراصل بات یہ ہے کہ جو لوگ صدق واخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد کرتے ہیں تو ذکر الٰہی ان کے تحفظ کا ذریعہ بن جاتا ہے، پس ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط کبھی نہیں ہوسکتا، اور شیطان کا تسلط ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوتے ہیں، یا برائے نام اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ان کا ذکر اخلاص سے خالی ہوتا ہے، تب ان پر شیطان کا غلبہ ہوتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیطان انفرادی طور پر بھی غلبہ پالیتا ہے، اور اجتماعی طور پر بھی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں پر شیطان کا انفرادی غلبہ ہے وہ تو بے شمار ہیں، اور بہت سے ممالک بھی ایسے ہیں جن پر بحیثیتِ مجموعی شیطان کا غلبہ ہے، اور وہ شیطان کی اطاعت میں مصروف ہیں، پس ایسے لوگ سزا کے مستحق ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ فوری گرفت نہیں کرتا، بلکہ ایک مقررہ وقت تک مہلت دے دیتا ہے۔

اگر آج بغور دیکھا جائے تو سارے اسلامی ممالک پر شیطان کا غلبہ ہے، ہر جگہ اسی کی اطاعت ہو رہی ہے، کوئی بھی دین اور شریعت کا پروانہ نظر نہیں آتا، سب شیطان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اگر ان کے سامنے اسلامی نظام کا اور شرعی قوانین کا نام لیا جائے تو وہ کھلم کھلا مذمت اور نفرت کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کہیں کسی

جگہ تین آدمی بستے ہوں اور نماز باجماعت کا اہتمام نہ کریں تو شیطان ان پر قابو پالیتا ہے۔[أبو داؤد]

آپ اس سے اچھی طرح اندازہ لگائیں کہ صرف جماعت کے ترک کرنے پر شیطان لوگوں پر غلبہ پالیتا ہے، تو جہاں تمام احکامِ شریعت متروک اور مبغوض ہوں تو وہاں شیطان کے تسلط کا کیا کہنا، یہی حال تمام مسلمان ممالک کے معاشرے کا ہے، سو اللہ تعالیٰ ہی ہمارے اوپر رحم فرمائے۔ آمین

فرمایا: یاد رکھو! ﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ یہی شیطانی گروہ ہے، خبردار! شیطانی گروہ کے لوگ ہی نقصان اٹھانے والے ہیں، یہ دنیا میں تو جیسا کیسا وقت گزار لیں گے، مگر آخرت میں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کی:

﴿أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ﴾ یہی لوگ ہی بہت ذلیل و خوار ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا ہے: ﴿كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ میں اور میرے رسول ﷺ ہی غالب رہیں گے۔ دنیا میں رسولوں علیہم السلام کو آزمائش میں ضرور ڈالا جاتا ہے، کفار اور مشرکین کے ہاتھوں ان کو تکلیفیں بھی پہنچی ہیں، ان کے ساتھ ان کے پیروکار بھی مصائب جھیلتے ہیں، لیکن آخری غلبہ اور استحکام اور اچھا انجام اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کے حصے میں ہی آئے گا۔ فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا ہے، زبردست ہے، وہ کمال قدرت کا مالک ہے، ساری کائنات کا تصرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

❁ ❁ ❁

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: آپ نہ پائیں گے ایسے لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں کہ دوستی رکھتے ہوں اس شخص سے جو مخالفت کرتا ہو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی، اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں، یا بیٹے ہوں، یا بھائی

ہوں، یا کنبہ کے لوگ ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو لکھ دیا ہے، اور اپنی رحمت کے ذریعہ ان کی تائید فرمادی، اور وہ ان کو داخل فرمائے گا ایسی بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں، یہ جماعت اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے، خبر دار! بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے ﴿۲۲﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں مؤمنین مخلصین کی ایک صفت خاصہ کا بیان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد کسی غیر کے ساتھ قطعاً محبت نہیں کرتے، اگرچہ وہ غیر ان کے والدین ہوں، یا بھائی بیٹے یا خاندان کے دوسرے لوگ ہوں۔ ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے یہ لوگ اس سے دوستی کریں، جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے جو ان کا خالق ہے، سب سے بڑا ہے، اور ان کا معبودِ برحق ہے، تو اس کے مخالفوں سے (یعنی کافروں سے) دوستی کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا، کیونکہ سچے مؤمن کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان لائے، اور اس کے دشمنوں سے بھی دوستی کا تعلق رکھے۔ یہ بات واضح ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا ہو گیا وہ اور کسی کا نہیں رہا، اس کی دوستی اور دشمنی سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، وہ جیئے گا اللہ تعالیٰ کے لیے اور مرے گا بھی اللہ تعالیٰ کے لیے، تعلق رکھے گا بھی اللہ تعالیٰ کے لیے اور تعلق توڑے گا بھی اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کا ہر کام اور ہر عمل بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ۔ [أبو داؤد]

یعنی جس نے محبت کی اللہ تعالیٰ کے لیے اور بغض رکھا اللہ تعالیٰ کے لئے، اور دیا اللہ تعالیٰ کے لئے، اور روک لیا اللہ تعالیٰ کے لیے تو اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔ آیت کریمہ میں یہی فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور یومِ آخرت پر ایمان لے آئیں، اب وہ اس شخص سے محبت نہیں رکھ سکتے جو اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مخالف ہو، اللہ تعالیٰ کے تعلق اور محبت کی وجہ سے اگر انہیں اپنے خاص عزیزوں اپنے باپوں اور اپنے بیٹوں

اور اپنے قبیلوں سے تعلق توڑنا پڑے تو بخوشی ان سے تعلق توڑ دیں گے، اور نہ صرف یہ کہ تعلق توڑ دیں گے بلکہ اگر قتل وقتال کی نوبت آجائے تو اپنے عزیزوں کو قتل بھی کردیں گے، جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہوں، وہ اہل ایمان کا بھی دشمن ہے، کیونکہ دینی دشمنی کے سامنے رشتہ داری کی کوئی حقیقت نہیں۔

غزوۂ بدر میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کافر رشتہ داروں کو قتل کردیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسے متعدد واقعات میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے دشمنِ اسلام کو یہ جانتے ہوئے قتل کردیا کہ یہ میرا باپ ہے، یا بھائی ہے، یا قبیلہ کا فرد ہے، چنانچہ غزوۂ بدر میں حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ جراح کو قتل کردیا تھا، اور حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید ابن عمیر کو قتل کردیا تھا، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے ایک قریبی رشتہ دار کو قتل کردیا تھا۔ مفسر ابن کثیر نے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں یہ مثالیں لکھی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے والد سے کہا: ابا جان! جنگ بدر کے موقعے میں کئی بار ایسا موقع پیش آیا کہ میں آپ کو قتل کرسکتا تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میرا موقع لگ جاتا تو میں تجھے قتل کردیتا، تجھے زندہ چھوڑ کر ہرگز آگے نہ بڑھتا۔ یہ واقعہ سیرت ابن ہشام میں بھی ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا، یعنی ثابت فرمادیا اور جمادیا۔ ﴿وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ انہیں اپنی روح کے ذریعہ قوت دے دی۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ روح سے نور القلب مراد ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتا ہے نور ڈال دیتا ہے، اس کے ذریعہ اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور معارفِ تحقیق پر عروج نصیب ہوتا ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ اور انہیں داخل فرمائے گا ایسی جنتوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں۔ ﴿أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہیں۔

﴿أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ خبردار! اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی کامیاب ہے۔ انسانوں کے دو گروہ ہیں: حزب اللہ یا عباد الرحمٰن، دوم حزب الشیطان، ابلیس کے کارندے اور گماشتے۔ تفصیل سورۃ الفرقان میں گزر چکی ہے۔

سُورَةُ الْحَشْر

مدنيةٌ آياتها ۲۴ رکوعاتها ۳

سورۂ حشر مدنی ہے، اس میں چوبیس (۲۴) آیتیں، اور تین (۳) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الحشر ہے جو اس سورت کی دوسری آیت میں موجود لفظ الحشر سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۵۹ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۱۰۱ نمبر پر ہے۔ اس کا نزول سورۃ البینہ کے بعد ہے، اس کو سورۂ بنی نضیر بھی کہتے ہیں۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے۔ [قرطبی وغیرہ]

وجہ تسمیہ:

حشر کے معنی ہیں: لوگوں کو اکٹھا کرنا، جمع کرنا اور ان کو گھیرنا، چونکہ اس سورت میں یہود کے گھیرنے اور جمع کرنے کا بیان ہے، اس لئے بطور علامت یہ نام رکھ دیا گیا ہے۔

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں تین (۳) رکوع، چوبیس (۲۴) آیات، چار سو پچپن (۴۵۵) کلمات، اور دو ہزار سولہ (۲۰۱۶) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں زیادہ تر منافقین کی دورخی، اور اسلام دشمنی کا ذکر تھا، اس سورت میں ان کے رفقا اور یہودیوں کا ذکر ہے۔

مختصر موضوع:

تسلی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، داستان بنی نضیر، اور مؤمنین کے لئے ضروری احکام، احکامِ مال فئی، مہاجرین و انصار کے اوصاف، منافقین کے انجام، عظمتِ خداوندی وغیرہ۔

فضیلت:

ترمذی شریف میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ: أعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم۔ اس کے بعد تین مرتبہ سورۃ الحشر کی آخری آیات: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾﴾ آخر سورت تک پڑھے تو حق تعالیٰ شانہ ستر ہزار فرشتے مقرر فرماتے ہیں جو شام تک اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں، اگر اس دن وہ مر گیا تو شہادت کی موت حاصل ہوگی، اور جس نے شام کو بھی اسی ترتیب سے پڑھ لیا تو یہی درجہ اس کو حاصل ہوگا۔ [مظهري وغيره]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۲﴾ وَلَوْلَاۤ

اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ؕ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ④

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو بھی آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور وہ عزیز ہے، حکیم ہے ① اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے کافروں کو یعنی اہل کتاب کو پہلی بار گھروں سے نکال دیا، تمہارا گمان نہ تھا کہ وہ لوگ نکلیں گے، اور انہوں نے گمان کیا تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ تعالیٰ سے بچالیں گے، سو ان پر اللہ تعالیٰ کا انتقام ایسی جگہ سے آگیا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے، سوائے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو ② اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں جلاوطن ہونا نہ لکھ دیا ہوتا تو انہیں دنیا میں عذاب دیتا، اور ان کے لئے آخرت میں آگ کا عذاب ہے ③ اور وہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرے گا سو اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے ④

معارف ومنازل

یہودیوں کی ذلت اور مدینہ منورہ سے جلاوطنی:

یہاں سے سورۃ الحشر شروع ہو رہی ہے۔ حشر عربی میں جمع کرنے کو کہتے ہیں، اپنی جگہ چھوڑ کر جب کسی جگہ کوئی قوم جمع ہو جائے تو اس کو حشر کہا جاتا ہے، قیامت کے دن کو بھی حشر اس لئے کہا جاتا ہے کہ دنیا کے مختلف اطراف واکناف کے لوگ جمع ہوں گے۔ یہاں اول الحشر سے یہودیوں کے قبیلہ بنی نضیر کا مدینہ منورہ سے نکالا جانا اور خیبر میں جمع ہونا مراد ہے، جو مدینہ منورہ سے سو (۱۰۰) میل کے فاصلہ پر شام کے راستہ میں پڑتا ہے۔

ان لوگوں کا یہ ترکِ وطن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہوا تھا، پھر دوبارہ ان کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خیبر سے بھی نکال دیا، پھر یہ شام کے علاقہ اَرِیحاء اور تیما اور اذرعات میں جا کر بس گئے تھے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اول الحشر سے ان کا پہلی بار مدینہ منورہ سے نکل جانا مراد ہے، اور حشرِ ثانی وہ اخراج ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوا، اسی لفظ اول الحشر کی وجہ سے اس سورت کو سورۃ الحشر کہا جاتا ہے۔

اور چونکہ اس میں بنو نضیر کے اخراج کا ذکر ہے اس لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کو سورۃ بنی نضیر کے نام

سے موسوم کرتے ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں کے بڑے بڑے تین قبیلے موجود تھے جو بڑے مالدار بھی تھے، اور قوت والے بھی، اور تقریباً ایک ہزار سال سے یہاں پر رہ رہے تھے، یہ لوگ بڑے جنگجو اور شریر بھی تھے، جن کی شرارت کی وجہ سے مدینہ منورہ کے عرب قبائل اوس اور خزرج والے ان سے مرعوب تھے۔

ان کے بڑے قبائل یہ تین تھے: قبیلۂ بنی نضیر، قبیلۂ بنی قریظہ، قبیلۂ بنی قینقاع۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کرلیا تھا کہ ہم آپ سے جنگ نہیں کریں گے، اور اگر کوئی فریق حملہ آور ہوگا تو آپ کے ساتھ مل کر ہم اس سے دفاع کریں گے، پھر ان لوگوں نے معاہدہ کو توڑ دیا، جن میں سے قبیلۂ بنی قریظہ کا انجام سورۃ الاحزاب کے رکوع نمبر تین (۳) میں گزر چکا ہے، اور قبیلۂ بنی قینقاع کا انجام سورۂ آل عمران رکوع دوم میں گزر چکا ہے، اور اسی سورت کے دوسرے رکوع میں بھی ان شاء اللہ ان کا ذکر آئے گا۔ ان آیات میں قبیلہ بنی نضیر کا ذکر ہے۔

قبیلۂ بنی نضیر کی جلاوطنی کا سبب:

۲ سنہ ھ میں غزوۂ بدر کا، اور ۳ سنہ ھ میں غزوۂ احد کا واقعہ پیش آیا، اور قبیلۂ بنی نضیر کی جلاوطنی کا واقعہ کسی نے غزوۂ احد سے پہلے اور کسی نے غزوۂ احد کے بعد لکھا ہے۔ بنو نضیر کی جلاوطنی کا واقعہ یوں ہوا کہ قبیلۂ بنی عامر کے دو شخصوں کی دیت کے بارے میں بنو نضیر کے یہود کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے، ان دو شخصوں کو عمرو ابن امیہ ضمری نے غلط فہمی میں قتل کر دیا تھا، آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان دونوں شخصوں کی دیت ادا کرنی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو نضیر سے فرمایا کہ دیت کے سلسلے میں مدد کرو، ان لوگوں نے کہا کہ آپ تشریف رکھئے ہم مدد کریں گے۔ ایک طرف تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات کہی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گھروں کی ایک دیوار کے سایہ میں بٹھا کر یہ مشورہ کرنے لگے کہ اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا، کوئی شخص اس دیوار پر چڑھ جائے اور ایک بھاری پتھر اوپر سے نیچے اس طرح پھینک دے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک پر لگ جائے، جس سے ان کی موت واقع ہو جائے تو ہماری ان سے جان خلاصی ہو جائے۔

ان میں سے ایک شخص عمرو ابن جحاش تھا، اس نے کہا: یہ کام میں کروں گا، لہٰذا وہ پتھر پھینکنے کے لیے اوپر چڑھا، اور ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مشورہ کی آسمان سے خبر آگئی کہ آپ جلدی یہاں سے اٹھیں، کیونکہ ان

لوگوں کا ایسا ارادہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں کو ان کے اس غلط اقدام سے اطلاع دے کر وہاں سے اٹھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر جلدی سے اٹھے، اور شہر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

بنونضیر کا علاقہ مدینہ منورہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر تھا، شہر میں تشریف لا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت محمد ابن مسلمہؓ صحابی کو یہودیوں کے پاس بھیجا کہ ان سے کہہ دو کہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تو یہ حکم پہنچا، ادھر منافقین نے یہودیوں کی کمر ٹھونکی اور ان سے کہا کہ تم یہاں سے مت جانا، اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور اگر تمہارے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر لڑیں گے، (اس کا ذکر سورت کے دوسرے رکوع میں ہے)۔ اس بات سے یہود بنونضیر کے دلوں کو وقتی طور پر تقویت ہوگئی، اور انہوں نے کہلا بھیجا کہ ہم کبھی نہیں نکلیں گے، جب ان کا یہ جواب پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو جنگ کی تیاری کا اور ان کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابن ام مکتومؓ کو امیر مدینہ بنا کر صحابہ کرامؓ کے ساتھ تشریف لے گئے، اور وہاں جا کر ان کا محاصرہ کر لیا، وہ لوگ اپنے قلعوں میں پناہ گزیں ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے کھجور کے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا حکم دے دیا، جب بنونضیر کے پاس کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا اور ان کے درخت بھی کاٹ دیئے گئے، اور جلا دیئے گئے، اور ادھر انتظار کے بعد منافقین کی مدد سے بھی ناامید ہو گئے، تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہوں نے سوال کیا کہ ہمیں جلاوطن کر دیں، اور ہمارے لوگوں کو قتل نہ کریں، اور ہتھیاروں کے علاوہ جو مال ہم اونٹوں پر لے جا سکیں ہمیں اس کی اجازت ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی یہ بات قبول کر لی، پہلے تو انہوں نے تڑی دی تھی کہ ہم نہیں نکلیں گے، پھر جب مصیبت میں پھنسے تو خود ہی جلاوطن ہونا منظور کر لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، اور بہادری کے دعوے اور مقابلے کی ڈینگیں سب دھری رہ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھ دن ان کا محاصرہ فرمایا۔

مؤرخ واقدی کا بیان ہے کہ پندرہ دن ان کا محاصرہ رہا، بعض کہتے ہیں کہ بیس روز محاصرہ رہا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی کہ ہر تین آدمی ایک اونٹ لے جائیں، جس پر باری باری سواری کریں۔ مؤرخ ابن اسحاقؒ نے بیان کیا کہ وہ لوگ اپنے گھروں کے اتنے سامان لے گئے جسے اونٹ برداشت کر سکتے تھے، سامان ساتھ لے جانے کے لیے اپنے گھروں کو اور گھر کے دروازوں کو توڑ رہے تھے، اور

مسلمان بھی ان کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے، اسی کو آیت کریمہ میں: ﴿يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِأَيْدِيْهِمْ وَ أَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے تعبیر فرمایا ہے۔

یہ لوگ اونٹوں پر سامان لے کر روانہ ہوگئے، ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں مقیم ہوگئے، خیبر کی پوری آبادی پہلے سے یہودیوں کی رہی، یہ لوگ ان میں ضم ہوگئے، اور ان کے بعض لوگ شام کے علاقے میں داخل ہوگئے، جب یہ لوگ خیبر میں داخل ہوئے تو وہاں کے لوگ بہت خوش ہوئے، اور گانوں اور باجوں سے ان کا استقبال کیا۔ یہ سب تفصیل حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں لکھی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ سارے بنو نضیر جلاوطن ہو کر مدینہ منورہ سے نکل گئے مگر ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر محفوظ و مامون رہے، ان دو میں سے ایک وہی عمرو ابن جحاش تھا جو بھاری پتھر اٹھا کر چھت پر چڑھ گیا تھا، دوسرے ان کا چچا یامین ابن عمرو ابن کعب تھے۔

اسلام اور مسلمانوں کی رواداری موجودہ اہل سیاست کے لیے ایک سبق آموز واقعہ ہے:

آج کے بڑے حکمران اور بڑی حکومتیں جو انسانی حقوق کے تحفظ پر بڑے بڑے لیکچر دیتے ہیں، اور اس کے لیے ادارے قائم کرتے ہیں، اور دنیا میں تحفظِ حقوقِ انسانیت کے چودھری کہلاتے ہیں، ذرا اس واقعہ پر نظر ڈالیں کہ بنو نضیر کی مسلسل سازشیں، خیانتیں اور قتل رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منصوبے جو آپ کے سامنے آتے رہے، اگر آج کل کے حکمران یا کسی سربراہ مملکت کے سامنے آئے ہوتے تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا، آج کل تو زندہ لوگوں پر پیٹرول چھڑک کر میدان صاف کر دینا کسی بڑے اقتدار وحکومت کا بھی محتاج نہیں، کچھ غنڈے شریر جمع ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں، شاہانہ غضب کے کرشمے کچھ اس سے آگے ہی ہوتے ہیں، مگر یہ حکومت اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے۔

جب خیانتیں اور غداریاں انتہاء کو پہنچ گئیں تو اس وقت بھی ان کے قتلِ عام کا ارادہ نہیں فرمایا، ان کے مال و اسباب چھین لینے کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ اپنا سب سامان لے کر صرف شہر خالی کر دینے کا فیصلہ کیا، اور اس کے لیے بھی دس دن کی مہلت دی کہ آسانی سے اپنا سامان ساتھ لے کر اطمینان سے کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جائیں، جب اس کی بھی خلاف ورزی کی تو قومی اقدام کی ضرورت پیش آئی، اس لئے کچھ درخت تو جلائے گئے، کچھ کاٹے گئے تا کہ ان پر اثر پڑے، مگر قلعہ کو آگ لگا دینے کا یا ان کے قتل عام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا گیا۔

پھر جب مجبور ہو کر ان لوگوں نے شہر خالی کر دینا منظور کر لیا، اس فوجی اقدام کے باوجود ان کو یہ اختیار دیا گیا

کہ ایک اونٹ پر جس قدر سامان ایک آدمی لے جاسکتا ہے لے جائے، اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے مکانوں کی کڑکیاں، تختے، دروازے اور کواڑ تک اتار کر لے گئے۔

اس ساز وسامان کے ساتھ منتقل ہونے والوں کو کسی بھی مسلمان نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا، امن وعافیت اور پورے اطمینان کے ساتھ سامان لے کر رخصت ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ معاملات اس وقت کے ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے دشمن سے انتقام پورا پورا لینے کی مکمل قدرت وطاقت حاصل تھی، ان غدار، خائن اور سازشی دشمنوں کے ساتھ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معاملہ اسی کی نظیر ہے جو فتح مکہ کے بعد اپنے قدیمی دشمنوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تنزیہہ سے ہوتا ہے، فرمایا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے جو بھی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتنزیہہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ قادر مطلق اور معبود برحق ہے، خالق اور مالک ہے، نافع اور ضار ہے، نگران اور محافظ ہے، وحدہٗ لاشریک ہے، ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے، تمام قوتوں کا سرچشمہ اور موجد ہے، تمام صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے، اس کی نہ کوئی بیوی ہے نہ اولاد، نہ کوئی کنبہ ہے نہ خاندان، وہ کھانے پینے سے بھی پاک ہے، سونے اور آرام کرنے سے بھی پاک ہے، کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کی تسبیح وتحمید میں مصروف ہے، پس اگر کوئی نافرمان انسان یا جن اس کی تسبیح وتحمید سے منکر اور اعراض کرنے والا ہے تو اس کے لیے ابدی جہنم اور ذلت وخواری ہے۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اور وہی ہے زبردست کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے کفر کرنے والے نافرمانوں کو نکالا ان کے گھروں سے لشکر کے پہلے اجتماع کے موقعے پر۔ اول الحشر کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ان کو ترک وطن کے لیے اکٹھا کیا گیا، اور وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہوگئے، یہ یہود کے قبیلۂ بنی نضیر کے بارے میں جن کا تفصیلی بیان گزر چکا۔

ان کے قلعے اور مکانات اتنے مضبوط تھے جن کے بارے میں فرمایا:

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کہ تم نہیں خیال کرتے تھے

کہ یہ طاقتور لوگ آسانی سے نکل جائیں گے، اور وہ لوگ خود بھی یہی گمان کرتے تھے کہ ان کے مضبوط قلعے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کی حفاظت کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے طریقے سے سزا دی، اور ان پر اس طرح عذاب آیا جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

﴿فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُوۡا ۚ وَقَذَفَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ﴾ پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا عذاب آیا جو ان کے گمان میں نہ تھا، وہ اتنے مغرور اور سرکش تھے کہ مسلمانوں سے کبھی ان کو خوف محسوس نہیں ہوتا تھا، وہ اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے کبر وغرور اور غداری اور سازشوں کے نتیجے میں ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا جو انہیں برداشت نہ ہوسکا، اور وہ خوف زدہ ہوکر خود مسلمانوں سے درخواست کی کہ ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دی جائے، پھر ان کی یہ حالت تھی کہ اجازت ملنے کے بعد:

﴿يُخۡرِبُوۡنَ بُيُوۡتَهُمۡ بِاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَيۡدِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ کہ خود وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے، اور ان کے منہدم کرنے میں مصروف تھے، اور اہل ایمان کے ہاتھوں سے بھی ان کی گھروں کی تباہی آئی۔ جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کرلیا تھا تو ان کو باہر نکلنے پر مجبور کرنے کی خاطر ان کے کچھ مکانات اور کھجوروں کے درخت اور ان کے قلعوں کو توڑنے کے لیے کچھ کام کیا تھا، اسی کو فرمایا: ﴿فَاعۡتَبِرُوۡا يٰۤاُولِى الۡاَبۡصَارِ﴾ اے آنکھیں رکھنے والو! ایسے واقعات کو دیکھ کر مغرور اور متکبر قوموں کا انجام دیکھ کر ذرا عبرت حاصل کرلو، اور سرکشی اور بدعہدی اور کفر وشرک وظلم وغیرہ کا انجام دیکھو۔

جہاں انہوں نے اپنے آپ کو اس قدر طاقتور سمجھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے باوجود آپ ﷺ کو دیواروں کے سائے میں بٹھا کر پیچھے سے آپ ﷺ پر بھاری پتھر گرانے کا منصوبہ بنایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی بدعہدی کی یہ سزا دی کہ انہیں اپنے علاقے سے جہاں وہ ہزار سال سے آباد تھے، ہمیشہ کے لیے نکلنے پر مجبور کردیا، فرمایا: ﴿وَلَوۡلَاۤ اَنۡ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا﴾ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ لکھی ہوتی یعنی سزا دے دیتا وہ سب مارے جاتے اور ان کا خاتمہ ہوجاتا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی جلاوطنی کا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں زندہ سلامت نکل جانے کی اجازت دے دی، اور اس فیصلے کے بعد کسی مسلمان نے ان کی کسی چیز کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ یہ اہل ایمان کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار وعمل کا نمونہ تھا، کیوں نہیں؟ وہ سارے کے سارے نبوت کے پروانے اور پروردہ تھے۔

فرمایا: ﴿وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ﴾ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ معاندین دنیا و آخرت دونوں کے عذاب سے بچ گئے، فرمایا: ایسا نہیں، اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا تباہ کن عذاب تو بہر حال ہے جس سے انہیں نجات ہرگز نہیں مل سکتی۔ فرمایا: یہ سزا ان لوگوں کو اس لئے ملی:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرتا ہے پس بے شک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سخت سزا دینے والا ہے، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتے، وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٥ وَمَآ اَفَآءَ
اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ
الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٧

ترجمہ: تم نے جو بھی کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے یا تم نے انہیں ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا اور تا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ذلیل کرے ۝٥ اور جو کچھ مال فیٔ ان سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مال دلوایا سو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ دوڑائے اور لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۝٦ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے رسول کو بستیوں کے رہنے والوں سے بطور فیٔ مال دلوادیا سو وہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور رسول کیلئے اور قرابت داروں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں کیلئے اور مسافروں کیلئے تا کہ یہ مال ان لوگوں کے درمیان دولت بن کر نہ رہ جائے جو مال دار ہیں اور رسول جو کچھ عطاء کریں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے ۝٧

☆☆☆

معارف ومسائل

بنونضیر کے محاصرے کو (دس یا پندرہ یا بیس دن مختلف اقوال کے مطابق) گزر چکے تھے، مگر یہودی نہ تو باہر نکل کر جنگ کرتے تھے، اور نہ ہی صلح کی درخواست کرتے تھے، لہٰذا ان کی املاک کو نقصان پہنچانا ناگزیر ہوگیا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بامر مجبوری ان کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا حکم دیدیا، اس پر یہودیوں نے کہا: اے ابوالقاسم! آپ تو زمین میں فساد سے منع کرتے ہیں، کیا یہ درختوں کو کاٹنا فساد نہیں ہے؟ اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے کھجوروں کے درختوں کو کاٹنے کی اجازت دے دی تھی، اور اس پر تھوڑا سا عمل بھی ہو چکا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمادیا، اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان درختوں کو کاٹنے میں کوئی گناہ ہے، یا ان کے چھوڑ دینے پر کوئی مؤاخذہ کی بات ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ [ابن کثیر: جلد ۵] آئندہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اعتراض کا جواب ارشاد فرمایا:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ تم نے جو بھی کھجور کے درخت کاٹے ہیں یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے، جب یہ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہوا تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا، یہ واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم دراصل اللہ تعالیٰ کا ہی حکم سمجھا جائے گا، لہٰذا یہودیوں کا اعتراض درست نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے اور عزّت وذلت دونوں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

﴿وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ تا کہ اللہ تعالیٰ غدر کرنے والوں عہد شکنی کرنے والوں سرکشوں اور نافرمانوں کو رسوا کردے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ان درختوں کو کاٹنے اور جلانے میں کافر یہودیوں کو ذلیل کرنا مقصود ہے، یہودی منقولہ اور غیر منقولہ زمین، باغات، مکانات وغیرہ جو چھوڑ گئے آئندہ ان کی تقسیم کا قانون بھی بیان کیا جارہا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ ان یہودیوں کے اموال میں سے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لوٹا دیا ہے، لفظ اَفَآءَ فَآءَ یَفِیءُ باب افعال سے ماضی کا صیغہ ہے۔ فَاءَ بمعنی لوٹا، أفَاءَ بمعنی لوٹایا، چونکہ کافروں کا مال جو مسلمانوں کو مل جاتا ہے ان کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے، اور ان میں مسلمانوں کی ملکیت آجاتی ہے، اب یہ مال جو جنگ کئے بغیر بطور صلح مسلمانوں کو ہاتھ آجائے تو اس کو مالِ فَیٔ کہتے ہیں، اور کافروں کا جو مال جنگ کرنے کے بعد

مسلمانوں کے ہاتھ آئے اس کو مالِ غنیمت کہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے مصارف الگ الگ ہیں، مالِ غنیمت کے مصارف دسویں پارے کے شروع میں: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ [الأنفال: ۴۱] کے تحت بیان فرما دیئے گئے ہیں۔ اور مال فئی کے مصارف یہاں بیان فرمائے ہیں۔

بنو نضیر کے مال چونکہ بطور صلح مل گئے، اور اس میں کوئی جنگ نہیں لڑی گئی، لہٰذا اموال میں کسی کو کسی حصہ کا استحقاق نہیں تھا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ بات آئی کہ ہمیں ان اموال میں سے حصہ دیا جائے، اس وسوسہ کو اللہ تعالیٰ نے یوں دفع فرمایا:

﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ﴾ تم نے تو کوئی گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے۔ یعنی تمہیں اس مال کے حصول میں کوئی مشقت اٹھانی نہیں پڑی، اور نہ تم نے کوئی جنگ لڑی ہے، بلکہ یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کی وجہ سے بغیر جنگ کے یہ مال مل گیا تھا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ: ﴿وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط فرما دیتا ہے، یعنی پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رسولوں علیہم السلام کو جس پر چاہا مسلط فرما دیا، اور اب اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو نضیر پر مسلط فرما دیا، جس مال کے حصول میں تمہاری کوئی خاص مشقت شامل نہیں، لہٰذا ان اموال کا اختیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ آگے اس مال فئی کی تقسیم کا اصول بیان کر دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے رسول کو بستیوں کے رہنے والوں سے بطور فئی دلوادیا: ﴿فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ سو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اور رسول کے لئے، اور قرابتداروں کے لیے، اور یتیموں کے لیے، اور مسکینوں کے لئے، اور مسافروں کے لیے ہے۔ اموال بنی نضیر کے علاوہ بعض دیگر بستیاں بھی بطور مالِ فئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آ گئی تھیں، جن میں سے فَدَک زیادہ مشہور ہے۔ خیبر کے نصف حصہ کا اور بنو عرینہ کے اموال کا ذکر بھی مفسرین نے لکھا ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں اموال فئی کے یہ مصارف بتائے ہیں:

(۱) ﴿فَلِلّٰهِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے۔ بعض مفسرین حضرات نے فرمایا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر تبرک کے لیے ہے، جیسا کہ دسویں پارہ کے شروع میں خمس کے بارے میں فرمایا: ﴿فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ﴾ [الأنفال: ۴۱] (تو اللہ کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے)۔ اور بعض حضرات نے اس کی یوں تفسیر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ

کو حق ہے کہ وہ جسے چاہے ان کو خرچ کرنے کا حکم دیدے، اس میں کسی اور کو اپنی طرف سے کچھ تجویز کرنے یا کسی کا حصہ مقرر کرنے اور طے کرنے کا کوئی حق نہیں۔

(۲) دوسرا مصرف بتاتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلِلرَّسُوْلِ﴾ مال فیٔ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے۔ یعنی ان اموال کا اختیار اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو دے دیا گیا ہے، اور آپؐ کو ان کے مصارف بتادیئے ہیں، مالِ غنیمت کی طرح یہ مال صرف نہیں کئے جائیں گے، اور نہ ان میں سے خمس نکالا جائے گا، یہی حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ مال فیٔ پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو مالکانہ اختیار حاصل تھا، پھر ان کے جو مصارف بیان فرمائے یہ اسی طرح کی بات ہے جیس مالکوں کو ان کو اموال کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ پر خرچ کرو۔

(۳) تیسرا مصرف بتاتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلِذِی الْقُرْبٰی﴾ مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اہل قرابت مراد ہیں، یعنی اس حصہ کے حقدار ان بنو عبد المطلب اور بنو ہاشم کے پانچ خاندان ہیں، یعنی آل علیؓ، آل جعفرؓ، آل عقیل، آل عباسؓ اور آل حارث۔ یہ حصہ مقرر کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ خاندان آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے تھے، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان پر صدقات وزکوٰۃ حرام تھے، چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ مال فیٔ میں مقرر فرمادیا۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان پانچوں خاندانوں کو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں حصہ ملتا رہا، آپؐ کے وصال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

(۴، ۵، ۶) اس کے بعد چوتھا، پانچواں اور چھٹا مصرف بتاتے ہوئے فرمایا: ﴿وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ﴾ یعنی اموال فیٔ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر بھی خرچ کئے جائیں، حسب فرمانِ باری تعالیٰ شانہ اموالِ فیٔ کو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اپنے ذوی القربیٰ پر اور یتمیٰ اور مساکین اور مسافروں پر اپنی صوابدید سے خرچ کر دیتے تھے، اسی سلسلہ میں یہ بھی تھا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم مال فیٔ میں سے اپنے گھر والوں کے لیے ایک سال کا خرچہ نکال لیتے تھے، (یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لئے) ایک متوسط گزارہ کے طور پر، اور جو مال بچ جاتا تھا اسے مسلمانوں کی عام ضروریات میں خاص کر جہاد کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کے لئے خرچ فرمادیتے تھے، گویا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ان اموال پر مالکانہ اختیار حاصل تھا، لیکن چونکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وفات شریفہ سے پہلے یہ فرمایا تھا: **نحن معشر الأنبیاء لانُورَثُ ماترکنا صدقۃ۔** [بخاری] کہ ہماری میراث مالی طور پر جاری نہ ہوگی، ہم جو کچھ چھوڑیں گے وہ صدقہ

ہوگا، اس لئے ان اموال میں میراث جاری نہیں کی گئی۔

اموال فئ کے مصارف بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ یعنی اموالِ فئ کے مصارف واضح طور پر بیان فرمادیئے گئے تاکہ یہ مال ودولت تمہارے مالداروں کے درمیان دولت بن کر نہ رہ جائیں، یعنی آسودہ حال لوگوں تک ہی محدود نہ رہے۔ دَولۃ دال کے فتحہ کے ساتھ اور دُولۃ دال کے ضمہ کے ساتھ دونوں طرح عربی زبان کی لغت ہے، ان الفاظ میں تنبیہ فرمادی کہ اموالِ فئ کی تقسیم خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادی، اس میں یہ حکمت ہے کہ یہ اموال مالداروں کے ہاتھوں میں آکر نہ رہ جائیں، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا، اور اب بھی ایسا ہی ہے کہ عامۃ الناس کی امداد کے لیے حوادث ومصائب کے مواقع میں بعض مالداروں اور حکومتوں (مقامی وبیرونی حکومتوں) کی طرف سے جو امدادی مال ملتا ہے اس میں سے تھوڑا سا آٹے میں نمک جتنا اہل حاجات پر، زلزلہ زدگان پر، سیلاب زدگان پر دکھاوے کے طور پر خرچ کرکے باقی ڈھیروں کے ڈھیر مال کو منتظمین اور ذمہ دار افسران شیر مادر کی طرح ہڑپ کر جاتے ہیں۔

یہ لوگ پہلے سے بھی مالدار ہوتے ہیں، اب اس مال کے ہڑپ کرنے کے نتیجے میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوجاتا ہے، چونکہ تقویٰ نہیں، اور جوہر ایمان مفقود ہے، غریب پروری کی بجائے غریبوں کو مارنے کا منصوبہ بناتے ہیں، خوف خدا نہیں، دنیاداری غالب ہے، اور مال کی محبت دلوں میں بسی ہوئی ہے، اس لئے یہ سارے مظالم ہوتے رہتے ہیں، جس مالک الملک نے انسانوں کو خزانہ بنانے کی اجازت نہیں دی اس نے اپنے براہ راست قبضۂ قدرت کی چیزوں کو اس طرح تقسیم فرمایا ہے کہ اس میں ادنیٰ واعلیٰ کا کوئی فرق نہیں، اور یہ کہ کوئی ادنیٰ واعلیٰ ان سے محروم نہیں رہتا، مثلاً ہوا، فضاء، سورج، چاند، ستارے، بارش، دریا، سمندر وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ شانہ نے مخلوق میں سے کسی کے قبضے میں نہیں دیا، تمام انسان، جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ درخت اور نباتات اور پھل اور پھول سب ان چیزوں سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں۔

مالِ فئ کے احکام کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز تمہیں دیدے وہ لے لو، اور اسے قبول کرلو، اور جس چیز سے منع کرے اس کو چھوڑ دو، اس میں یہ بتادیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی اللہ تعالیٰ شانہ کے فرمانِ عالی سے جدا نہیں ہے، ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ۝﴾ [النجم] (آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، بلکہ وہ وحی ہی ہے جو بھیجی

جاتی ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی ادنیٰ حکم بھی نہیں دیا، جس کی رہنمائی وحی کے ذریعہ نہ ہو۔ اس آیت کریمہ میں منکرین حدیث جیسے ملحدوں کی سخت تردید ہے جو حدیث کا انکار کرتے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ضروری سمجھتے ہو اور اس کی نافرمانی کو اپنے لئے ہلاکت سمجھتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو بھی ضروری سمجھو، اور اس کی نافرمانی کو ہلاکت اور گمراہی سمجھو، اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے احکام کی خلاف ورزی سے مکمل پرہیز کرو، ورنہ یاد رکھو:

﴿اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ [البروج:۱۲] (بے شک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے)۔

❁ ❁ ❁

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا
وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ
يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۹﴾

ترجمہ: اموالِ فئی فقراء مہاجرین کے لیے بھی ہیں جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکالے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضامندی طلب کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو سچے ہیں ﴿۸﴾ اور اموالِ فئی ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جنہوں نے ان سے پہلے دار ہجرت کو اور ایمان کو ٹھکانہ بنالیا، جو شخص ان کی طرف ہجرت کر کے آئے اس سے محبت کرتے ہیں، اور اپنے سینوں میں اس مال کی وجہ سے کوئی حاجت محسوس نہیں کرتے، جو مہاجرین کو دیا جائے اور وہ ان کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انہیں حاجت ہو، اور جو شخص اپنے نفس کی کنجوسی سے بچا دیا گیا سو یہ وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۹﴾

معارف ومنازل

اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ اموالِ فئی میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو فقراء مہاجرین ہیں، اور ان لوگوں کا

بھی حصہ ہے جو کہ انصار ہیں۔ پہلے مہاجرین کا بیان ہے، یعنی وہ لوگ جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے، مشرکین مکہ کی ایذاء رسانیوں کی وجہ سے اپنے گھر بار، کاروبار اور اموال ومتاع سب چھوڑ کر اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر مدینہ منورہ چلے آئے، جب مدینہ منورہ پہنچے تو حاجت مند اور تنگدست تھے، بعضوں کے پاس تو لباس تک نہیں تھا، فرمایا: ان پر بھی مالِ فئی خرچ کئے جائیں، گھر بار اور اموال سب کچھ چھوڑ کر ان کا مدینہ منورہ آنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضا مندی مطلوب تھی، ان کی ہجرت کسی اور مقصد کے لیے نہیں تھی۔

مکہ میں بے شمار تکلیفوں کو برداشت کر کے جب مدینہ منورہ پہنچے تو یہاں فوراً آتے ہی جہاد میں شریک ہونے کا سلسلہ جاری رکھا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرتے رہے، یہ لوگ اپنے ایمان اور ایمان کے تقاضوں میں سچے تھے۔ پہلی آیت میں جو یتمیٰ، مساکین اور ابن السبیل کا ذکر فرمایا اس کے عموم میں یہ فقرائے مہاجرین بھی داخل تھے، لیکن خصوصیت اور عظمت شان کی خاطر ان کا مستقل استحقاق ظاہر فرما دیا، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہت زیادہ اور بے نظیر قربانی پیش کی کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دیا، اور خالی ہاتھ مدینہ منورہ آئے۔

فرمایا: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ مال فئی میں غریب مہاجرین کا بھی حصہ ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، قریش مکہ نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا تھا، آخر وہ مجبور ہو کر اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر خالی ہاتھ مدینہ پہنچے، ان کی صفت یہ ہے کہ:

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں، یعنی انہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے، اس کے فضل کے ساتھ، اور ان کی دوسری صفت یہ ہے: ﴿وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی مدد کرتے ہیں، اور جہاد میں حصہ لیتے ہیں تا کہ اللہ جل شانہ کا دین دوسرے ادیان پر غالب ہو، اور اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ یہی لوگ سچے اور راست باز ہیں۔

(۱) مہاجرین کے بعد انصار مدینہ کا تذکرہ فرمایا کہ وہ بھی مال فئی کے حقدار ہیں، فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اس کا مہاجرین پر عطف ہے، اور ان سے حضرات انصار مدینہ مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے جگہ پکڑی گھر میں اور ایمان میں، ان سے پہلے فرمایا کہ مال فئی کے جو اموال ہیں انصار بھی اس کے مستحق ہیں کہ اموال فئی میں سے ان پر بھی خرچ کیا جائے، انصار کی تعریف کرتے

ہوئے اولاً یہ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ کو پہلے ہی سے اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا، دار سے مراد دار الہجرۃ مدینہ منورہ ہے، تو خلاصہ یہ ہوا کہ اس مال میں سے وہ لوگ بھی حقدار ہیں جو مہاجرین کی آمد سے قبل یمن سے آکر مدینہ منورہ میں رہائش اختیار کرکے آباد ہوگئے تھے، اور وہ ایمان کی دولت سے بھی مالا مال تھے، اور یہ وہ لوگ تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اور حج کے موقع پر منیٰ کے عقبہ میں ان کی آپ ﷺ سے ملاقات ہوگئی تو انہوں نے ایمان قبول کرلیا۔

شروع میں یہ آٹھ افراد تھے، وہاں سے چل کر جب مدینہ پہنچے تو اوس وخزرج کے لوگوں کو چھپکے چھپکے ایمان کی دعوت دی، چنانچہ ان کی دعوت سے تین سو سے زائد لوگ مسلمان ہوئے، آئندہ حج کے موقع پر ان میں سے بیاسی آدمیوں نے حج ادا کیا، اور اسی عقبہ کی گھاٹی میں آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی اور بیعت کی، یہ عقبہ ثانیہ کہلایا، اس موقع پر انہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیں، ہم مال وجان ہر اعتبار سے آپ کی مدد کریں گے، اور آپ کے لیے قربانی دیں گے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے انتظار میں رہوں گا، جب وہ مجھے ہجرت کا حکم دیں گے تب میں ہجرت کرکے تمہارے پاس آؤں گا۔

(۲) دوسری صفت انصار کی یہ بیان فرمائی کہ جو لوگ ہجرت کرکے ان کے پاس آتے ہیں یہ ان مہاجرین سے محبت کرتے ہیں، ان کے دلوں میں یہ بات نہیں آتی کہ دوسرے علاقہ کے لوگ ہمارے یہاں آکر بستے ہیں، تو ان کی وجہ سے ہماری معیشت پر اثر پڑے گا، یہی نہیں کہ ان کے آنے سے دل گیر نہیں ہوتے، بلکہ سچے دل سے ان سے محبت کرتے ہیں، اور اپنے اموال میں ان کو شریک کرتے ہیں۔

(۳) انصار کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ ہجرت کرکے آنے والوں کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے اپنے سینوں میں کوئی حسد اور کوئی جلن کی کیفیت اور کوئی ناخوشگواری محسوس نہیں کرتے، یعنی اس کا وہ کچھ اثر نہیں لیتے کہ مہاجرین کو یہ کچھ دیا گیا اور ہمیں نہیں دیا گیا۔

(۴) انصار کی چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ دوسروں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ چیز خود انہیں ضرورت ہوتی ہے مگر ان کا ایثار وقربانی نہایت مستحکم ہیں، دوسروں کو پہناتے ہیں اور کھلاتے ہیں، اور خود بھوکے رہتے ہیں۔ فرمایا:

﴿يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ﴾ فرمایا: انصار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی طرف ہجرت کرکے آنے

والوں کے ساتھ محبت کی ہے، فرمایا: ان کی محبت اس قدر پر خلوص ہے: ﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا﴾ کہ مہاجرین کو ملنے والی اشیاء کی وجہ سے انصاری لوگ اپنے دلوں میں کوئی خلش یعنی حسد اور بوجھ محسوس نہیں کرتے، ان کے دل بغض اور حسد کے مادہ سے پاک ہیں، اور انہوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ مہاجرین کو تومل رہا ہے اور ہم محروم رہے ہیں، انہوں نے اندازہ لگایا کہ مہاجرین کا حق اس لئے زیادہ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر یہاں آگئے، اگر ہم ان کے لئے اپنے مال ومتاع قربان کریں گے تو یہ ہماری سعادت ہوگی، اور اگر مالِ غنیمت و مال فئی میں ان کو کچھ ملتا ہے اور ہمیں محروم رکھا جاتا ہے تو یہ عین انصاف اور عین صواب ہے۔

جب بنونضیر کی جائیدادیں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں تو آنحضرت ﷺ نے انصارِ مدینہ کے سرداران حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو طلب فرمایا، یہ دونوں حضرات قبیلہ اوس اور خزرج کے سردار تھے، آپ ﷺ نے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں ان دونوں سرداروں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہمیں بنونضیر سے بہت سارا مال واسباب حاصل ہوا ہے، مہاجرین کی مالی حالت بہت کمزور ہے، اگر تم اجازت دو تو یہ مال صرف مہاجرین میں تقسیم کر دیا جائے، اس طرح آپ لوگوں پر مہاجرین کا بوجھ بھی کم ہو جائے گا، ان انصاری سرداروں نے بڑے شوق اور بصد خوشی اجازت دیدی کہ یہ سارا مال صرف مہاجرین میں تقسیم کر دیا جائے، انہوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ ہم نے مہاجرین کی امداد کے طور پر اس سے پہلے جو کچھ ان کو دے رکھا ہے وہ بھی انہی کے پاس ہی رہے گا، اور یہ مال بھی انہی میں تقسیم کر دیا جائے، ہمیں اس سے بڑی خوشی ہوگی، یہ بھی انصار کے ایثار کا ایک نمونہ تھا کہ کس طرح انہوں نے مہاجرین کو ہر بارے میں خود پر ترجیح دی۔ آگے انصار کے بارے میں اور فرمایا:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ وہ ان مہاجرین کو خود پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود حاجتمند ہوں۔ صحیحین میں مرفوع حدیث ہے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: انصار مدینہ کے ساتھ محبت ایمان کی نشانی ہے، اور ان کے ساتھ بغض وعداوت رکھنا منافقت کی علامت ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی گواہی دی ہے پس جو کوئی ان سے عداوت رکھے گا وہ مؤمن نہیں، بلکہ منافق ہوگا۔

انصار کے مہاجرین کے ساتھ خلوص، محبت، اور ایثار کے بہت سے واقعات کتب احادیث اور کتب سیرت میں موجود ہیں، انہوں نے ایثار وقربانی کی وہ بیش بہا نمونے قائم کئے ہیں کہ شاید قیامت تک کوئی مسلمان اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ ایسا سلوک پیش نہیں کر سکے گا، اور انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی دل کھول کر مدد کی، انہوں نے

اپنے مکانات، زمینیں، باغات اور کاروبار سب کچھ مہاجرین میں برابر تقسیم کر دیا، یہاں تک کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف مہاجری رضی اللہ عنہ نے جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور حضرت سعد بن الربیع انصاری رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخاۃ (بھائی چارگی) قائم کی، تو سعدؓ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر لے گئے، اور وہ اچھے خاصے مال دار بھی تھے، تو انہوں نے کہا: آپ میرے بھائی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اپنے پورے مال کو دو حصوں میں تقسیم کروں آدھا تمہارا ہو اور آدھا میرے لئے ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جہاں عورتوں کے حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، پس انہوں نے اپنی دونوں بیویوں کو بلایا جب وہ آگئیں تو مجھے کہا: ان دو میں سے جو آپ کو پسند ہو میں اس کو طلاق دے دوں گا، عدت گزرنے کے بعد اس کے ساتھ تم نکاح کر لینا۔

اس کی یہ بات کہنے سے میں اتنا متاثر ہوا کہ اپنی آنکھوں پر کنٹرول نہ کر سکا، مسلسل روتا رہا، پھر میں نے اس سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کا ایثار قبول فرمائے، مجھے آپ کے مال اور بیویوں میں سے کوئی نہیں چاہیے، صرف اتنا کرو کہ خرید و فروخت کی منڈی میں مجھے پہنچاؤ، میں تاجر آدمی ہوں میں اپنے رزق و روزی کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کام کروں گا، چنانچہ ایسا ہی ہو گیا، اس نے کچھ تاجروں کے ساتھ میرا تعارف کرایا، پھر میں اپنے کام میں لگ گیا اور تجارت شروع کی۔ اسی سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ کا بہترین نظام قائم کیا، اور ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا، ان دینی بھائیوں نے اپنا آدھا مکان زمین اور باغ مہاجر بھائیوں کو پیش کر دیا، اور ان کو کاروبار میں شریک کر لیا، اور اس طرح اخوت اسلامی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

بخاری شریف میں آیا ہے کہ ان کی یہ بھائی چارگی اس قدر پختہ تھی کہ ابتدائی دور میں ایک دینی بھائی فوت ہو جاتا تو دوسرے دینی بھائی کو اس کی وراثت میں حصہ ملتا۔ اور ترمذی شریف میں آتا ہے کہ مہاجرین زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ تھے، جو کھیتی باڑی کرنا نہیں جانتے تھے، جب انصار نے مہاجرین کو اپنی زمین اور باغات میں شریک کیا تو مہاجرین نے کہا: ہم تو کھیتی باڑی کرنا جانتے ہی نہیں، ہم سے یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا، اس پر انصار نے فراخ دلی کے ساتھ کہا کہ تم کام نہ کرو، باغات اور کھیتوں میں ہم کام کریں گے، مگر اپنے مہاجر بھائیوں کو پیداوار کا نصف حصہ ضرور دیں گے۔

پھر مہاجرین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں عرض کیا کہ انصار نے ہمارے ساتھ اس قدر ایثار کا سلوک کیا ہے کہ سارا ثواب سمیٹ کر لے گئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم فکر نہ کرو، اور اپنے انصاری بھائیوں

کے لئے دعا کر دیا کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ان جیسا اجر عطا فرمائے گا، چنانچہ مہاجرین اپنے انصاری بھائیوں کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

جس طرح عام اوقات میں ایثار و قربانی کا سلسلہ جاری رہتا تھا یہ سلسلہ میدانِ جنگ میں موت و حیات کی کشمکش میں بھی جاری رہا، کئی زخمی میدان میں پڑے تھے ان میں سے ایک نے پانی کا پیالہ طلب کیا، پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، تو اس نے دوسرے زخمی مجاہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ پیالہ اس کو پیش کرو، جب وہ آدمی پیالہ لے کر اس دوسرے کے پاس پہنچا تو اس نے تیسرے زخمی مجاہد کی طرف اشارہ کر کے، اور تیسرے نے چوتھے کی طرف اشارہ کیا، اور چوتھے نے پانچویں کی طرف اشارہ کر کے کہا: اس کو پلا دو۔

یہ پیالہ گھومتا رہا اور چکر کاٹتا رہا، اور پانچویں نے چھٹے کی طرف اشارہ کیا، اور چھٹے نے ساتویں زخمی کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس کو پانی پلاؤ، مگر کسی نے بھی پانی نہیں پیا، اور سب کے سب پیاس کی شدت کے باوجود شہید ہو گئے، گویا کہ انہوں نے پانی کی بجائے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

یہ ان کے مردوں کا حال تھا، اس طرح کے واقعات ان کی خواتین کے بارے میں بھی مشہور ہیں۔ واحدی نے بروایت محارب بن دثار حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک صحابی کے پاس بکری کی سری بطور ہدیہ بھیجی گئی، انہوں نے کہا: میرا فلاں بھائی اور اس کے بچے اس کے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ انہوں نے وہ سری پڑوس والوں کو بھیج دی، پھر اس دوسرے نے تیسرے کے گھر بھیج دی، اور تیسرے نے چوتھے کو، اور چوتھے نے پانچویں کو، اسی طرح وہ سری سات گھروں کا چکر کاٹ کر پھر وہیں لوٹ آئی جہاں سے چلی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ یعنی خود ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

(قیاس کن ز گلستان من بہار مرا)

آج ہمارے ملک میں نہ سیاسی جماعتوں کی کمی ہے، اور نہ دینی تنظیموں کی کمی ہے، سیاستدانوں کو چھوڑیے ان کا راستہ اسلام نہیں، اور نہ ہی قرآن و حدیث ہے، وہ مغربی جمہوریت کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، ان سے کیا گلہ کرنا، وہ تو ہیں دنیا کے پجاری اور اقتدار کے بھوکے، ذرا دینی جماعتوں سے پوچھئے کہ کہیں تمہاری لغت اور تمہاری زبان میں ایثار کا لفظ ہے؟ إنا لله وإنا إليه راجعون

اگر ایثار کا لفظ ہوتا تو ایک ایک مسلک کے ذیل میں پینتالیس تنظیمیں نہ ہوتیں ہر ایک دوسرے کا دشمن ہے، اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے بھی لگاتے ہیں، اور دعویٰ ہر ایک کا یہ ہے کہ میں حق پر ہوں، اور میں ہی انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چل رہا ہوں، اور میں ہی انبیاء علیہم السلام کا وارث ہوں۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ اور جو کوئی اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا تو یقین جانو کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سچے ایماندار کے دل میں بخل نہیں ہوتا، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے بخل سے بچالیا اسی طرح بخل کے بھائی حرص سے تو ایسے لوگ آخرت میں کامیاب ہوں گے، ان کی مثال مہاجرین وانصار کی دونوں گروہ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمام گناہوں سے بچالیا تھا، خاص کر حسد وبغض اور بخل سے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سارے مسلمانوں کا تحفظ فرمائے۔ آمین

مفسر قرطبی لکھتے ہیں کہ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ شح بخل سے زیادہ بڑھ کر ہے، پھر صحاح لغت کی کتاب سے نقل کیا ہے کہ شح اس بخل کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم سے بچو، کیونکہ قیامت کے دن ظلم اندھیرے بن کر سامنے آئے گا، اور شح (کنجوسی) سے بھی بچو، کیونکہ کنجوسی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا، اس نے انہیں آپس میں خونریزی کرنے پر اور حرام چیزوں کو حلال کرنے پر آمادہ کر دیا۔ [مسلم]

یہ قدرتی بات ہے کہ انسان کے مزاج میں کنجوسی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے اس کی نسبت ارشاد فرمایا:

﴿وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ اور ایک حدیث میں ہے کہ کنجوسی اور ایمان کبھی کسی بندے کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے، یہی حال بد اخلاقی کا بھی ہے۔ اور بعض لوگوں نے بخل اور شح میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ بخیل اور کنجوس اسے کہتے ہیں جو صحیح مصرف میں مال خرچ کرنے کو اچھا نہیں سمجھتا، اور شحیح وہ ہے جو بخیل سے دو قدم آگے ہے، جب وہ دوسروں کو مال خرچ کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، اور وہ خرچ کرنے والوں کو خرچ کرنے سے منع کرتا ہے، تو یہ بخیل سے بڑھ کر بخیل ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں نجات دینے والی ہیں، اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں، نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں: (۱) تنہائی میں اور لوگوں کے سامنے ہر حال تقویٰ کے تقاضوں پر چلنا۔ (۲) رضا مندی میں اور ناراضگی میں حق بات کہنا۔ (۳) مالداری اور تنگدستی میں میانہ روی اختیار کرنا۔ اور تین چیزیں ہلاک

کرنے والی یہ ہیں: (۱) نفسانی خواہشوں کا اتباع کرنا۔ (۲) کنجوسی اور بخل اختیار کرنا۔ (۳) گھمنڈ اور غرور کرنا، یعنی خود کو سب سے اچھا سمجھنا۔ [مشکوٰۃ: ص ۴۳۴]

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ⑩

ترجمہ: اور ان لوگوں کے لئے ہیں جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! بخش دے ہم کو، اور ان لوگوں کو جو ہمارے بھائی ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر گئے، اور مت کر دے ہمارے دلوں میں کوئی کھوٹ ایمان والوں کے لیے، اے ہمارے ربّ! بے شک آپ رؤف ہیں، رحیم ہیں ⑩

معارف ومنازل

اکثر علماء کے نزدیک ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ یہ بھی الْمُهَاجِرِيْنَ پر عطف ہے، اور اس میں بعد میں آنے والے حضرات کا اموالِ فئی میں حصہ بتایا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ مہاجرین کے بعد دیگر مسلمان جو قیامت تک آئیں گے ان سب پر مالِ فئی میں سے خرچ کیا جائے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ باہر سے آنے والے مال دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک مالِ غنیمت جس میں شریکِ جنگ مجاہدین کے علاوہ کسی کا حصہ نہیں ہوتا، اور دوم مالِ فئی جس کے متعلق پہلے بتایا گیا تھا کہ مہاجرین اور انصار کا حق ہے، اور اب اس آیت کی رو سے قیامت تک آنے والے سارے مسلمانوں کا مالِ فئی میں حصہ ہے۔

مفسر ابن کثیر نے تفسیر ابن جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت شریفہ: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ [التوبة:٦٠] (بیشک صدقات فقراء اور مساکین کے لیے ہیں) اس آیت شریفہ کی آخر تک تلاوت کی، پھر فرمایا: یہ صدقات ان لوگوں کے لئے ہیں جن کا آیت میں ذکر ہوا، اس کے بعد آیت کریمہ: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ﴾ [الأنفال:٤١] (جان لو کہ تم نے کوئی چیز غنیمت میں حاصل کرلی تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے) آخر تک تلاوت کی، اور فرمایا کہ اموال غنیمت ان لوگوں کے لئے ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں، پھر آپ نے: ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ سے ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ

بَعْدِهِمْ ﴾ تک تلاوت کی اور یوں فرمایا کہ یہ آیات تمام مسلمین کو شامل ہیں، جو بھی کوئی مسلمان ہوگا تو اموالِ فئی میں اس کا حق ہوگا۔ پھر فرمایا: اگر میں زندہ رہا تو ایک بکریاں چرانے والا جو سرِ حمیر میں چرا رہا ہوگا (یہ ایک قبیلہ کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے دور رہتا تھا) اپنے حصہ کو وہیں پالے گا، اس کے حاصل کرنے میں اس کی پیشانی میں پسینہ تک نہ آیا ہوگا۔ [ابن کثیر: جلد ۵]

مفسر ابن کثیرؒ نے آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اموالِ فئی کے مستحقین کی یہ آخری قسم ہے، تینوں قسموں میں سے ان میں سے جو فقراء ہوں گے وہی مالِ فئی کے مستحق ہوں گے، اول مہاجرین دوم انصار تیسرے وہ لوگ جو ان کے بعد آنے والے ہیں، جو صفت احسان کے ساتھ مہاجرین وانصار کا اتباع کریں۔ اس سے یہی معلوم ہوا کہ اموالِ فئی میں روافض کا بالکل حصہ نہیں، یہ لوگ حضرات مہاجرین وانصار کا اتباع تو کیا کرتے یہ تو ان سے بغض رکھتے ہیں، اور سوائے چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باقی سب کو کافر کہتے ہیں۔

پھر ان کے بعد آنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بیان کی ہے کہ یہ اپنے سے پہلے والوں کے لیے اس طرح دعا کرتے ہیں: ﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری غلطیوں کو معاف فرمادے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جنھوں نے ہم سے پہلے ایمان میں سبقت کی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے جو ایماندار بھائی جو ہم سے پہلے گزرے ہیں ان کے گناہوں، کوتاہیوں اور لغزشوں سے بھی درگزر فرما۔ ﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ دوسری دعا یہ ہے کہ اے پروردگار! ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کھوٹ پیدا نہ فرما، یہ کھوٹ لفظ غل کا ترجمہ ہے، جس کے معنی میں عموم ہے، کینہ، بغض، عناد، حسد، عداوت، جلن ان سب کو شامل ہے، اور یہ مسلمان کی صفتِ لازمہ ہے کہ وہ سارے مسلمانوں کے ساتھ محبت ودوستی اور رواداری قائم کرے، کسی بھی مسلمان کے ساتھ بغض وعناد نہ رکھے۔

صحیح بات یہ ہے کہ گناہ سے نفرت ضروری ہے، مگر گنہگار سے نفرت نہیں کرنا چاہئے، ہوسکتا ہے کہ وہ کل کو توبہ کرکے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوئی۔ باقی رہا معاملہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا، تو ان کا شمار امت کے اعلیٰ ترین اور مقدس طبقات میں ہے، ان کے ساتھ محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت ہے، اور ان سے بغض رکھنا یا نفرت کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عداوت رکھنے کے مترادف ہے، اور وہ لوگ جیسے دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفیق رہے اسی طرح جنت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفیق

رہیں گے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا اعلان فرمادیا ہے، یہ بات قرآن کریم میں جگہ جگہ موجود ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [المائدة:۱۹۔التوبة:۱۰۰۔المجادلة:۲۲۔البينة:۸] (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے)۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتا ہے اور ان کی بدگوئی کرتا ہے اس کے لیے مال فیٔ میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور اس کا شمار ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں نہیں ہوگا۔

روافض گر زند طعنہ بہ یار غار پیغمبر ☆ مکن عیبش کہ او لعنت ز میراثِ پدر دارد

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام عامر شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ روافض یہود ونصاریٰ سے بھی بدتر ہیں، کیونکہ اگر یہودیوں سے پوچھا جائے کہ تمہاری جماعت میں سب سے بہترین لوگ کون ہیں؟ تو جواب دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی پوری امت میں بہترین لوگ ہیں، اسی طرح جب نصاریٰ سے دریافت کیا جائے کہ تمہاری امت میں بہترین لوگ کون ہیں؟ تو کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہماری امت میں بہترین لوگ ہیں، اور اگر رافضیوں سے یہی سوال کیا جائے تو وہ یہی کہیں گے کہ بدترین لوگ وہ ہیں جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت واطاعت میں رہے، لا حول ولا قوة إلا باللہ۔ [معالم التنزيل]

یہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکرین میں شمار ہوتے ہیں، جیسے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ قرب قیامت میں آسمان سے نہیں اتریں گے، بلکہ آسمان سے اترنے والا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے، اور قرآن کریم کے بارے میں بھی ان کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن اصلی قرآن نہیں، یہ شرابی خلفاء کا ترتیب دیا ہوا قرآن ہے، اصل قرآن تو امام غائب کے پاس ہے جو عراق میں ایک پہاڑ کے غار میں رہتے ہیں، اور قرب قیامت میں وہاں سے نکل کر دنیا میں عدل وانصاف پھیلائیں گے، اور اصلی قرآن جو سترہ ہزار آیات پر مشتمل ہے اور اونٹ کے ران جتنا موٹا ہے، اس کی تعلیمات سے دنیا میں روشنی پھیلائیں گے۔

نیز حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے قبور کو اکھاڑ کر ان کی نعشوں کو نکالیں گے، اور سولی پر لٹکائیں گے، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی انتقام لیں گے، کیونکہ رافضیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے نفرت کرتی تھیں، العیاذ باللہ۔ [معالم العرفان: جلد ۱۷، ص ۵۱]

آخر میں فرمایا: ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ اے ہمارے پروردگار! تو بہت ہی شفقت کرنے والا اور ازحد مہربان ہے۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

ترجمہ: کیا آپ نے منافقوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کافر بھائیوں سے کہہ رہے تھے جو اہل کتاب میں سے ہیں کہ یقین جانو اگر تم نکالے گئے تو ضرور ضرور ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے، اور ہم تمہارے بارے میں کبھی بھی کسی کی بات نہیں مانیں گے، اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور ضرور تمہاری مدد کریں گے، اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ⑪ یہ یقینی بات ہے کہ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے، اور یقینی بات ہے اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے ⑫ اور اگر ان کی مدد کریں گے تو پشت پھیر کر چلے جائیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی، یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کے سینوں میں تمہارا ڈر اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھی زیادہ ہے، اس وجہ سے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں ⑬ وہ تم سے جنگ نہیں کریں گے اکھٹے ہو کر مگر ایسی جگہوں میں جو محفوظ ہوں، یا دیواروں کی آڑ میں، آپس میں ان کی لڑائی سخت ہے، آپ خیال کرتے ہیں کہ وہ اکھٹے ہیں حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے ⑭

معارف ومنازل

جیسا کہ ابتداء سورت میں سبب نزول بیان کرتے ہوئے عرض کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہود کے قبیلۂ بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا تو یہودی قلعہ بند ہو گئے، ان کو مدینہ منورہ چھوڑنے کا حکم دیا گیا، تو ان لوگوں نے انکار کر

دیا، اور رئیس المنافقین عبداللہ ابن اُبی ابن سلول اور اس کے دیگر منافق ساتھیوں کو مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے کا موقع مل گیا، اس نے بنونضیر کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا، اور نہ ہی کوئی جلاوطنی قبول کرنا، اگر مسلمان تمہیں ملک بدر کریں گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے، اور اگر وہ تمہارے ساتھ جنگ کریں گے تو ہم تمہاری پوری مدد کریں گے، محض یہ نہیں کہ ہم تمہارے ساتھ مل کر لڑیں گے بلکہ قبیلۂ غطفان کو بھی تمہاری مدد کے لیے دعوت دیں گے۔

دراصل یہ سب کچھ جھوٹے وعدے اور غلط بیانی کا ایک پروپیگنڈا تھا، انہوں نے جھوٹ موٹ سے کام لے کر اپنے گھروں میں چھپ گئے تو ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا﴾ کیا تم نے ان منافقین کے طرف نہیں دیکھا؟ ﴿یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِہِمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ﴾ وہ اہل کتاب میں سے اپنے کافر بھائی بندوں سے کہتے ہیں یعنی بنونضیر کے یہودیوں سے جو رسمی طور پر ان کے بھائی کہلاتے تھے: ﴿لَئِنۡ اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ﴾ اگر تمہیں تمہارے گھر بار سے نکالا گیا تو بھائی بندی کے پیش نظر ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے۔

﴿وَلَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ اَحَدًا اَبَدًا﴾ اور تمہارے بارے میں کسی کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ ﴿وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ﴾ اور اگر مسلمان تم سے جنگ کریں گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں کا جواب دے کر ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں، آگ بھڑکانے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ مزید سنو:

﴿لَئِنۡ اُخۡرِجُوۡا لَا یَخۡرُجُوۡنَ مَعَہُمۡ ۚ وَلَئِنۡ قُوۡتِلُوۡا لَا یَنۡصُرُوۡنَہُمۡ﴾ پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہودیوں کو ملک بدر کیا گیا تو یہ منافق ہرگز ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہودیوں سے جنگ کرنے کا موقع آیا تو منافق ان کی کوئی مدد نہیں کریں گے، بلکہ خود پیچھے رہیں گے اور تماشہ دیکھیں گے، اور ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں مروا دیں گے۔ ﴿وَلَئِنۡ نَّصَرُوۡہُمۡ لَیُوَلُّنَّ الۡاَدۡبَارَ ۟ ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ﴾ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کبھی یہ بادلِ نخواستہ ان کی مدد کے لیے میدان میں آ گئے تو وہ منظر دور نہیں کہ یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، یہ تھی تیسری بات، اور چوتھی بات یہ ہے کہ پھر کہیں بھی کہ ان کی مدد نہیں کی جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا جب یہودی مجبوراً جلاوطنی پر راضی ہو گئے اور اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے برباد کرتے ہوئے تھوڑا بہت سامان لے کر مدینہ منورہ سے روانہ

ہو گئے تو اس موقع پر منافقین نے ان کا ساتھ نہ دیا، بلکہ بالکل طوطا چشمی سے کام لیا، اور جان بچا کر اپنے گھروں میں جم کر چھپے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اے مسلمانو! ایک زبانی وعدہ ہے، وہ تمہارے مقابلہ میں بالکل نہیں آسکتے، دیکھو! جو شخص ایماندار ہو وہ تو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، لیکن یہ منافقین اتنا اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے جتنا کہ تم سے ڈرتے ہیں، ان کے دلوں پر تمہارا رعب ایسا جما ہوا ہے کہ وہ کبھی یہودیوں کی مدد کے لیے تیار نہیں ہوں گے، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ پھر ہماری بھی خیر نہیں ہوگی۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ اور منافقوں کا تم سے ڈرنا اور اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنا وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ سمجھتے نہیں ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت وقوت کو نہیں سمجھتے، اور تم سے ڈرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر یہودیوں کا ساتھ دیں گے تو ہمارا ایمان کا دعویٰ دھرا رہ جائے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی کہ یہ سب لوگ بنونضیر اور منافقین اکٹھے ہو کر بھی تمہارے خلاف لڑنے کی ہمت نہیں کریں گے، تو الگ الگ ہو کر کیا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ لہٰذا تم مطمئن رہو۔ فرمایا:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ وہ سارے مل کر بھی تم سے جنگ نہیں کریں گے، اگر انہیں مجبوراً مقابلہ کرنا پڑا تو کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں کریں گے، بلکہ محفوظ بستیوں، قلعوں اور دیواروں کی آڑ میں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان پر جنگ مسلط ہوئی تو یہ قلعہ بند ہو جائیں گے، یا دیواروں، پہاڑوں اور درختوں کی آڑ لے کر تیر چلائیں گے، یہ اتنے بزدل ہیں کہ میدان میں نکل کر دست بدست لڑائی نہیں لڑیں گے، کیونکہ وہ تم سے اتنا زیادہ ڈرتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بیٹھ چکا ہے۔

آگے فرمایا کہ ان کا اندرونی حال یہ ہے:

﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى﴾ ان کی آپس کی لڑائی شدید ہے، یہ ایک دوسرے کے خلاف بہت لڑتے ہیں، کیونکہ وہ ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے، اور تمہارے بارے میں ان کا حال یہ ہے کہ آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ لوگ آپس میں اکھٹے اور متحد ہیں، حالانکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، یہ بظاہر تو ایک دوسرے کے ساتھ متفق نظر آتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کے دل اور خیالات ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا ہے، اس لئے یہ تمہارے ساتھ جم کر نہیں لڑ سکتے، اور آپس

میں بڑی بہادری سے لڑتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ ان کے قلوب کا منتشر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے، اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: ان کی مثال ان لوگوں کی سی مثال ہے جو ان سے کچھ پہلے تھے، انہوں نے اپنے کردار کا مزہ چکھ لیا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۵﴾ اور ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کافر ہو جا، سو جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ میں تجھ سے بیزار ہوں، میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں جو ربّ العٰلمین ہے ﴿۱۶﴾ سو ان دونوں کا انجام یہ ہوا کہ بلاشبہ دونوں دوزخ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ظالموں کی سزاء ہے ﴿۱۷﴾

معارف ومنازل

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ مدینہ منورہ میں یہود کے تین بڑے قبیلے آباد تھے: ایک بنونضیر جن کی جلاوطنی کا تذکرہ ابھی گزرا، دوسرا قبیلہ بنوقریظہ جن کے مردوں کو قتل کیے جانے اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنائے جانے کا تذکرہ سورۂ احزاب کے تیسرے رکوع میں گزر چکا ہے، تیسرا قبیلہ بنوقینقاع تھا جس کی جلاوطنی کا قصہ اسی آیت میں بیان فرمایا ہے (اشارۃً)۔ ان تینوں قبیلوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معاہدہ تھا کہ وہ نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جنگ کریں گے، اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی دشمن کی مدد کریں گے، چنانچہ ان تینوں قبائل نے غدر کیا، اور اس کا انجام بھگت لیا۔

قبیلۂ بنوقینقاع پہلا قبیلہ ہے جسے سب سے پہلے مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں کفار مکہ کو شکست دے کر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو سوق بنی قینقاع میں انہیں جمع کیا، اور فرمایا کہ اے یہودیو! تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مسلمان ہو جاؤ، ورنہ تمہارا حال بھی وہی ہوسکتا ہے جو قریش مکہ کا ہوا، تم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا آخری برحق رسول ہوں، تم اس بات کو اپنی کتاب میں بھی پاتے ہو،

اور تمہیں اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ میں خاتم الانبیاء اور صادق الامین ہوں، اور اللہ تعالیٰ کا تورات میں تم سے عہد ہے کہ اس نبی آخرزمان پر ایمان لاؤ، اور یہ سب کچھ تمہاری کتاب میں مذکور ہے۔

انہوں نے ڈھٹائی کے ساتھ اس کا یہ جواب دیا کہ اے ابوالقاسم! آپ اس دھوکے میں نہ رہیں کہ قریش مکہ کو شکست دینے کے بعد ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے، وہ لوگ تو اناڑی اور بے تجربہ کار تھے، جنگ کرنا نہیں جانتے تھے، آپ نے موقع پا کر انہیں شکست دے دی، اللہ تعالیٰ کی قسم! اگر تم نے ہم سے جنگ کی تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم تو ہم ہیں، آپ یہ بھول جاؤ کہ تم ہم کو شکست دے سکو گے، ہمیں مزید ایمان کی دعوت مت دو۔

اسی دوران ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک عورت ایک یہودی سنار کے پاس دودھ بیچنے آئی، یہودیوں نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی جو یہود بنی قینقاع اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی چڑھ جانے کا ذریعہ بن گئی، جب آنحضرت ﷺ کو اس مسلمان خاتون کی بے عزتی کا پتہ چلا تو یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ اپنی تیاری میں رہو، مسلمان تمہارے ساتھ جہاد کے ارادے سے تمہارے علاقے میں آنے والے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ فرمایا، بالآخر انہوں نے پیغام بھیجا کہ جو آپ فیصلہ فرمائیں وہ ہمیں منظور ہے۔

قریب تھا کہ ان کے قتل کا حکم دے دیا جاتا کہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی ابن سلول زاری و منت کرنے لگا، اور آنحضرت ﷺ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا، اور کہنے لگا: یہ بنوقینقاع والے سات سو آدمی میری مدد کرتے رہے ہیں، آپ انہیں قتل کرنے سے بچائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اچھا ان کو تمہاری رائے پر چھوڑ دیتا ہوں، البتہ ان کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کرنے کا فیصلہ کر دیتا ہوں، چنانچہ صحیح سلامت انہیں اذرعات علاقہ شام کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ [البدایة والنهایة، وغیرہ]

مطلب یہ ہے کہ قبیلۂ بنونضیر کا وہی حال ہوا جو کچھ عرصہ پہلے ان کے بھائیوں کا یعنی بنوقینقاع کا حال ہو چکا تھا، جنہوں نے بڑے گھمنڈ میں آکر کہا تھا کہ ہم تو ہم ہیں، فرمایا:

﴿كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ بنونضیر کے یہودیوں کی مثال قریب زمانے کے لوگوں کی سی ہے، اس سے مراد بنوقینقاع ہیں، انہوں نے اپنے غرور کا وبال چکھ لیا، اسلام دشمنی کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیا، اور آخرت کے عذاب الیم کی سزا اس کے علاوہ ہوگی، جو کہ بہت دردناک ہوگی۔

آگے اسی بارے میں دوسری تمثیل ہے: ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ

﴿قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ان کی مثال شیطان کی سی ہے، وہ انسان کو اکساتا ہے کہ توحید کا انکار کر کے کفر اختیار کرو، پھر جب انسان اس کے کہنے پر کفر اختیار کرتا ہے تو شیطان ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بیزار ہوں، تو جان اور تیرا کام، مجھے تیرے اس کفر اور اس کے نتیجے سے کوئی تعلق نہیں، میں تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں جو ربّ العالمین ہے، اور سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ پوری تفصیل سورۂ ابراہیم میں گزر چکی ہے کہ شیطان اپنے پجاریوں سے برأت کا اظہار کر کے کہے گا: ﴿فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ [ابراھیم: ۲۲] (مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو ملامت کرو)۔

فرمایا: منافقین کی مثال شیطان کی سی ہے کہ جب وہ انسانوں سے کفر کروالیتا ہے پھر قیامت کے دن ان سے برأت کا اعلان کر دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی گرفت کا خوف ہے۔ یہ وہ ابلیس ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر سردارانِ قریش کے پاس قبیلۂ بنوکنانہ کے سردار کی شکل میں آیا، اور ان کی ناک کٹوا کر طرح طرح کی تدبیروں سے انہیں جنگ پر اکسایا، پھر جب دیکھا کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتے اتر رہے ہیں تو دم دبا کر بھاگا، اور کہنے لگا کہ مجھے خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں میری اپنی جان ہی نہ ضائع ہو جائے، مشرک پیچھے سے آوازیں دیتے رہے کہ بڑے میاں کہاں جا رہے ہو؟ مگر وہ یہی کہتے ہوئے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں بھاگ گیا۔

آگے فرمایا کہ شیطان اور اس کے مریدوں کا انجام سنو: ﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ خَالِدَیْنِ فِیْهَا﴾ پس ان دونوں یعنی شیطان اور اس کے مریدوں کا انجام یہ ہوا کہ دونوں جہنم رسید ہوں گے، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا رہیں گے، اور وہاں سے کبھی نہیں نکالے جائیں گے، اور عذاب میں کسی طرح تخفیف نہیں پائیں گے: ﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ﴾ اور ظلم کرنے والوں کا بدلہ یہی ہوتا ہے۔ یہاں ظالم سے مراد کافر، مشرک اور منافق ہیں، جیسا کہ سورۂ لقمان میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ [لقمان: ۱۳] (بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے) اور مشرک و کافر بڑے ظالم ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ

الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾
لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ
الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور ہر نفس یہ غور کر لے کہ اس نے کل کے لئے کیا بھیجا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے ﴿۱۸﴾ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ کو بھول گئے، سو اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی جانیں بھلا دیں، یہ لوگ فاسق ہیں ﴿۱۹﴾ برابر نہیں ہیں دوزخ والے اور جنت والے، اہل جنت ہی کامیاب ہیں ﴿۲۰﴾ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب! تو اسے دیکھتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے دب جاتا، اور پھٹ جاتا، اور وہ مضامینِ عجیبہ ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں ﴿۲۱﴾

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ میں سات چیزوں کا بیان ہے:

اولاً فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو، گزشتہ گناہوں سے توبہ کرو، اور فرائض وواجبات کو پابندی کے ساتھ ادا کرو۔

ثانیاً یہ فرمایا کہ دنیا میں رہتے ہوئے غفلت اختیار نہ کرو، اور غور کرلو کہ تم نے آخرت کے لئے کیا بھیجا، اگر کچھ نہیں بھیجا تو ہمت کر کے نیکیاں بھیجو، اور گناہوں سے توبہ کرو، اگر نیکیاں کم بھیجی ہیں تو ہمت کر کے ان میں اضافہ کرو اور، اپنی زندگی کے لمحات کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔

ثالثاً یہ فرمایا اور دوبارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، گناہ کرنا چھوڑ دو، اور نیکیوں کو اختیار کرو، اس کے ساتھ حقوق اللہ وحقوق العباد کی پاسداری کرو۔

رابعاً یہ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے بے خبر ہیں، بلکہ یہ یقین کرو کہ اس کو ہمارے اعمال تو کیا کائنات کے ہر ہر ذرہ کا علم ہے، ایسا کیوں نہ ہو؟ اسی نے تو اس جہاں کو پیدا فرمایا، پس خالق کو اپنے مخلوق کے ہر ہر ذرہ کا علم حاصل ہے، اسی کے مطابق تو قیامت کے روز انہیں ہر خیر وشر کی جزاء اور سزاء دے گا۔

خامساً یہ فرمایا: تم سے بہت بڑی دنیا پہلے گزر چکی ہے، ایسے ایسے بڑے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے پورے جہاں پر بادشاہت کی ہے، ان کا اقتدار مشرق ومغرب پر پھیلا ہوا تھا، انہوں نے ہزاروں شہر آباد کیے،

ہزاروں سال عمر پائی، فلک بوس عمارتیں تعمیر کیں، ہزاروں ریاستوں سے خراج وصول کیا، بیش قیمت جواہرات اور موتیوں کے تاج پہنے، اور دنیا میں ہر طرح کے عیش وعشرت سے زندگی گزاری، اور اتنی غفلت اور گھمنڈ میں رہے کہ اُلوہیت کے دعوے دار رہے، اور اللہ تعالیٰ کو بھول گئے، دنیا میں انہیں یہ سزاء ملی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی جانوں ہی کو بھلا دیا، انہیں یہ خیال نہ رہا کہ ایک دن ہم مرجائیں گے، پھر موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے، تو میدانِ محشر میں ہمارا کیا بنے گا، وہ دنیا کی لذّتوں میں پڑکر آخرت کی نعمتوں سے محروم ہوئے، پس سوچو کہ یہ لوگ فاسق اور نافرمان ہیں، اور ابدی جہنمی ہیں، جب جہنم میں اوندھے گرائے جائیں گے تو دنیا کی ساری لذّتوں کو بھول جائیں گے، اور ابدی طور پر جہنم کی سزاؤں میں مبتلا رہیں گے، اس لئے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم ان جیسے لوگوں کے انجام سے ڈرتے رہو، نہ اپنے پروردگار کو بھول جاؤ، نہ ان کے احکام سے انحراف کرو، اور نہ ہی قرآن حکیم کے حکموں سے غافل رہو، جس کی عظمت کا ابھی بیان آنے والا ہے۔

سادساً یہ فرمایا کہ جنتی اور دوزخی برابر نہیں ہیں، نہ اعمال کے اعتبار سے اور نہ ہی انجام کے اعتبار سے، اور نہ ہی شکل وصورت اور کردار کے اعتبار سے، قیامت سے پہلے آج ہی لوگ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ نمازوں میں، روزوں میں، زکوٰۃ وصدقات میں، حج وعمرہ اور دوسرے حسنات میں، تلاوت قرآن اور اذکار وطاعات وغیرہ میں صبح وشام ہر لمحہ مشغول نظر آتے ہیں، یہ کس کی علامت اور نشانی ہے؟ یہ جنتی ہونے کی علامت ہے۔

بخاری میں حدیث ہے کہ جن کی تخلیق جنت کے لئے ہوئی ہے دنیاوی زندگی میں انہیں جنتی اعمال کے راستے پر چلایا جاتا ہے۔ دوسری طرف غور کرکے دیکھا جائے تو بہت سارے لوگ ہمیں ایسے ملیں گے جن کی سوچ، حواس ظاہرہ، آنکھیں، زبان، کان، ہاتھ پاؤں اور نشست وبرخاست کا دامن حسنات سے خالی نظر آتا ہے، جبکہ سیئات، معصیات اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور ہر طرح کے گناہوں کا ان کے پاس انبار لگا رہتا ہے، یہ کس چیز کی نشانی ہے؟ اور کس بات کی علامت ہے؟ بخاری کی حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جنہیں دوزخ کے لئے پیدا فرمایا ہے تو وہ دوزخی اعمال میں منہمک اور لت پت ہی رہیں گے۔

سب سے بڑی بنیادی نیکی توحید ہے، یہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے، اس لئے فرمایا کہ جنتی اعمال والے کامیاب ہیں، وہ جنت میں اپنی نیکیوں کا پھل ضرور پائیں گے، اور دوزخی اعمال والے اپنے برے اعمال کا برا انجام ضرور حاصل کریں گے۔ اے اللہ پاک! آپ اپنی رحمت سے ہمیں اور سارے مسلمانوں کو جنتی اعمال کی توفیق دیکر

محض اپنے فضل وکرم سے جنت عطاء فرمائیں، اور دوزخی اعمال سے بچائیں اور دوزخ سے نجات دیدیں۔آمین

سابعاً یہ فرمایا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ کے عرش سے اترا ہے، زمین پر تمہاری ہدایت ورہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے، جس زمین پر تم رہتے ہو یہ جہنم کا ایریا ہے، ساتوں زمین جہنم کا ایریا شمار ہوتے ہیں، جنتیوں کا ایریا ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے، ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کنویں میں گرجاتا ہے تو لوگ رسی لٹکا کر اسے کہتے ہیں کہ رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی کمر پر باندھو، پھر لوگ رسی کو کھینچ کر اس گرے ہوئے شخص کو کنویں سے باہر نکال لیتے ہیں، اسی طرح قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ مضبوط رسی ہے جو عرش معلیٰ سے لٹک کر زمین پر آئی ہے، پس دنیا کے کنویں میں گرے ہوئے جہنم کے ایریا میں پھنسے ہوئے جو لوگ اس رسی کے ساتھ چمٹ جائیں گے اور اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیں گے تو یہ انہیں جہنم کے ایریا سے نکال کر اوپر جنت کے ایریا تک پہنچا دیتا ہے، اس لئے سورۂ آل عمران میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] (اے ایمان والو! تم سارے مل کر اللہ تعالیٰ کے رسی (قرآن) کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو، اور انتشار واختلاف سے بچو) جس کے نتیجے میں وہ تمہیں گناہوں سے نکال کر نیکیوں کی طرف کفر وشرک اور نفاق سے نکال کر ایمان کی طرف اور جہنم کے ایریا سے نکال کر جنت کے ایریا تک پہنچانے کا ضامن اور ذمہ دار ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن پڑھنے کی اس کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے، اور اس کو سینوں کے ساتھ لگانے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور ہر نفس کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل کے لئے، یہاں کل سے مراد آخرت ہے، کہ اس نے آنے والے جہان کے لئے کیا بھیجا ہے۔﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، ہر طرح کے معاصی سے بچتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔ یہاں غَدٍ کا لفظ مطلق زمانے کے لئے ہے، اور اس سے قیامت کا دن مراد ہے، اور قیامت کو کل کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا گیا کہ جس طرح آنے والا کل یقینی ہے اسی طرح وقوع قیامت بھی یقینی ہے۔

مسلم شریف اور مسند احمد میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی منذر ابن جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے تھے، آپ کے پاس ایسے لوگ آئے جن کے پاس کپڑے

نہیں تھے، انہوں نے اون کی چادریں پہنی ہوئی تھیں، اور ان کے پاؤں بھی برہنہ تھے، گردنوں میں تلواریں لٹکائی ہوئی تھیں، ان کی اکثریت قبیلہ مضر کی معلوم ہوتی تھی، ان کی حاجتمندی کا حال دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا، انہوں نے ان مسلمان مجاہدوں کا یہ شکستہ حالت دیکھا کہ نہ بدن پر کپڑا، نہ پاؤں میں جوتا، آپ ﷺ شدتِ غم میں ڈوبے ہوئے گھر میں تشریف لے گئے، پھر باہر آئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ زوال ہو چکا ہے آذان کہو، آذان کے بعد اقامت کہی گئی اور آپ ﷺ نے نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا اور سورۂ نساء کی پہلی آیت تلاوت فرمائی: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ [النساء: ۱] (اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں سے ڈرو، یقیناً اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے) تک تلاوت کی۔

اس کے بعد سورۂ حشر کی یہی آیت تلاوت فرمائی:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو ترغیب دلائی کہ ان مساکین کے لئے صدقہ پیش کرو، جس کے پاس درہم ہے وہ درہم دے، جس کے پاس اناج ہے وہ اناج دے، چنانچہ لوگوں نے حسبِ توفیق بہت کچھ پیش کیا، مجمع میں سے ایک شخص اپنے گھر سے نقدی کی ایک تھیلی بھر لایا، وہ اتنی بھاری تھی کہ اس کا ہاتھ اس کے اٹھانے سے کانپ رہا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو ڈھیر لگ گئے: ایک ڈھیر کپڑوں اور اور دوسرا کھانے کی چیزوں کا۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کا چہرۂ مبارک چمک رہا تھا جیسا کہ سونے کا ٹکڑا ہوتا ہے، آپ ﷺ بڑے خوش ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے، اور ارشاد فرمایا کہ جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کر دیا اسے اس کا ثواب ملے گا، اور جس نے اس کے بعد اس پر عمل کیا اسے اس کا بھی ثواب ملے گا اور دوسروں کے ثواب میں سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ آگے فرمایا:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ﴾ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا، پس اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی جانوں کو فراموش کر دیا، چنانچہ وہ اپنی سعادتوں کو بھول

گئے، اور شقاوتوں میں تباہ ہو گئے۔

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ یہی لوگ نافرمان ہیں، ان کی نافرمانی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک اور پروردگار کو بھول چکے ہیں، پھر فرمایا: ﴿لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ دوزخ والے اور جنت والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے، کیا فاسق و فاجر اور متقی و پرہیزگار برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، پس یقین جانو کہ جنت میں جانے والے کامیاب ہیں، اور جہنم میں جانے والے ناکام ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ اگر ہم اس قرآن مجید کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو آپ اسے اس حال میں دیکھتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے دب جاتا، اور ریزہ ریزہ ہو کر پھٹ جاتا، گرد و غبار کی طرح فنا ہو جاتا۔ مطلب واضح ہے کہ پہاڑوں میں بھی شعور و ادراک ہے، وہ کبھی بھی تسبیح و تحمید سے غافل نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے بڑے بڑے پہاڑوں سے، چٹانوں سے پتھر ٹوٹ کر نیچے لڑھکتے ہیں، اور پہاڑوں سے پانی کے چشمے پھوٹ کر جاری ہوتے ہیں، اور کچھ پہاڑ ایسے ہیں جو پھٹ کر سوراخ ہو جاتے ہیں، جن سے نہریں جاری رہتی ہیں، جیسے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ پہاڑ ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں، ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ آج تمہارے اوپر کسی اللہ والے کا گزر ہوا یا نہیں؟ وہ پہاڑ جواب دیتا ہے کہ آج میرے اوپر ایسے ایسے نیک لوگوں کا گزر ہوا، تو وہ پہاڑ خوش ہو جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ افسوس بھی کرتا ہے کہ آج مجھ پر کسی نیک آدمی کا گزر نہیں ہوا۔ تو بات درست ہے کہ اگر قرآن حکیم کا نزول پہاڑوں پر ہوتا تو وہ خوفِ الٰہی سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ احزاب کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ آسمان اپنی بلندی اور وسعتوں کے باوجود اور دنیا کے سارے پہاڑ اپنی بلندی اور سختیوں کے باوجود امانتوں کے اٹھانے سے انکار کر گئے، اور اس چھوٹے قد کے ضعیف العمر، ضعیف البدن، کمزور اور ناتواں انسان نے نتائج سے بے خبر ہو کر امانتوں کے اٹھانے کا اعلان کیا، تو انسان اگر سخت دل، ناعاقبت اندیش اور خواہشات کا غلام نہ ہوتا تو نزولِ قرآن کو بصد خوشی اور فخر و مباہات کے ساتھ قبول کرتا۔

صاحب روح المعانی اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے انسان کی قساوتِ قلبی اور تلاوتِ قرآن کے وقت خشوع اور تدبر کی کمی پر متنبہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں جھنجوڑنے والی جو آیات ہیں انسان ان کی طرف پورے طور پر متوجہ نہیں ہوتا، حالانکہ اگر یہی قرآن کسی پہاڑ پر اتارا جاتا، اور اسے عقل دے دی جاتی تو وہ خشوع

اختیار کرتا، اور ریزہ ریزہ ہو کر پھٹ جاتا۔ صاحب معالم التنزیل نے بھی یہی بات لکھی ہے، اور ایک بات اور بڑھا دی ہے کہ پہاڑ اپنی سختی کے باوجود اس ڈر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے کہ قرآن کریم کا جو حق اللہ تعالیٰ نے لازم فرمایا ہے وہ مجھ سے ادا نہ ہو سکے گا، یہ انسان ہی ہے جو قرآن کو پڑھتا ہے اور سنتا ہے اور اس کی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا، حالانکہ یہ مضامینِ عجیبہ اللہ تعالیٰ اس لئے بیان فرماتا ہے تاکہ لوگ فکر کریں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے علاوہ روئے زمین پر چھ ہزار چھ سوستر (۶۶۷۰) بڑے بڑے پہاڑ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ان میں سے کسی بھی بڑے پہاڑ پر وہ اپنا کلام نازل فرماتا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا، مگر افسوس کا مقام ہے کہ صاحب شعور و عقل انسان جس کے پاس حواسِ خمسہ ظاہرہ اور حواسِ خمسہ باطنہ کا ڈھیر ہے اس کے دل پر قرآن مجید کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ کافر تو ویسے ہی سنگدل ہیں، مگر عام طور پر اہل ایمان بھی ایسے ہی ہیں کہ کلامِ الٰہی کو سن کر وہ اثر نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے۔ فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ غور و فکر کریں، اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور نیکیوں کے اختیار کرنے کے ساتھ اور گناہوں سے بچنے کے ساتھ اپنے سنگدل دلوں کی اصلاح کریں۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنے دل کی سختی کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جاؤ کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر دو جس سے تمہارا دل موم ہو جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ [مشکوۃ]

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: وہ اللہ ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ غیب کا اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے، وہ رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے، وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، بہت پاک ہے، باسلامت ہے، امن دینے والا ہے،

عزیز ہے، جبار ہے، بڑی عظمت والا ہے، اور اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو لوگ شرک کرتے ہیں، وہ اللہ ہے، پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک بنانے والا ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں، اور وہ عزیز ہے، حکیم ہے ﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ شانہ کی شانِ اُلوہیت بیان کی ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ایک ہزار تورات میں ہیں، ایک ہزار انجیل میں، ایک ہزار زبور میں، اور ایک ہزار قرآن وسنت میں، یہ چار ہزار اسمائے حسنی ہوئے، اور جو قرآن وسنت میں ہیں وہ سارے عربی میں ہیں، اور جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں تھے وہ انہی زبانوں اور لغات میں تھے۔

ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی کوئی ایسی آیت نہیں جس میں اسمائے حسنیٰ میں سے کسی ایک کی خوشبو اور مہک نہ ہو، ہر آیت میں ان پاکیزہ اسماء کا رنگ واثر اور جھلک ضرور موجود ہے، جو شخص ہر آیت میں ادنیٰ غور اور توجہ مبذول کرے گا وہ اس مقصد کو ایسا پائے گا جیسے کوئی کسی شیشہ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی شکل وصورت دیکھے، اسی طرح کائنات کی تمام مخلوقات میں خواہ علویات ہوں یا سفلیات، جمادات ہوں یا نباتات، اسی طرح خشکی اور دریائی حیوانات حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کی تخلیق میں بھی اسمائے حسنی کا رنگ اور جھلک نہایت واضح نظر آئے گا۔

الغرض کوئی ایسی مخلوق نہیں کہ جس میں یہ رنگ وجھلک واضح طور پر موجود نہ ہو، اور اگر کوئی اشرف المخلوقات انسان میں یہ دیکھنا چاہے تو سب سے زیادہ نزدیک اور واضح ربوبیت کی تصویر نمایاں ہے۔

آپ دیکھیں شکمِ مادر میں چند قطرے ٹپکائے جاتے ہیں تو ان سے یہ خوبصورت انسان پیدا ہوجاتا ہے، اور شکمِ مادر میں ایک حساس اور طاقتور عضو بھی ہے جو ان قطروں کی نگہداشت اور تربیت کرتا ہے، اور ان پانی کے قطروں کی حفاظت کرتا ہے، اور ہر چالیس دن کے بعد ان کی حقیقت کو تبدیل کرتا ہے، یعنی قطرہ سے جما ہوا خون اور خون سے گوشت کا لوتھڑا، اس کے ساتھ ساتھ انہیں خون پلاتا رہتا ہے، اور ایک خاص مدت تک اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے، اور پھر تکمیل کے بعد اسے باہر پھینک دیتا ہے، یہ عضو نہ تو خود مختار رہے، نہ تخلیق کا کام انجام دے سکتا ہے، اور نہ مادر وپدر کو یہ پتہ چلتا ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہے یا نہیں، اور نہ انہیں اس کے اندرونی انقلابات اور تبدیلیوں کا حال معلوم ہوتا ہے، اور نہ

وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ بچہ کب اور کس وقت کس نوعیت کے ساتھ پیدا ہو جائے گا۔

اور جب پیدا ہوتا ہے تو اپنا رزق ساتھ لاتا ہے جس میں مناسب شکر و نمک، وٹامن، ذائقہ اور قوتِ نشوونما شامل ہوتا ہے، اور ماں کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ دودھ جو پلا رہی ہے کب اور کیسے بنا؟ اور کتنی مقدار میں بنا، اس کے سرخ خون نے سفید و براق دودھ کی شکل کیسے اختیار کی، اس میں مٹھاس کہاں سے آئی، اور بغیر علم و کوشش اور جد و جہد کے اس خشک سینے سے دو فوارے جوش ماتے ہوئے کیسے پیدا ہوئے۔

پھر اس بچے کے اعضاء بغیر اس کے والدین کی کوشش اور اختیار کے دن رات کیسے تناسب کے ساتھ بڑھتے رہے کہ ہر عضو کو اس کی مناسب غذاء پہنچتی رہی، کسی کو خون، کسی کو پانی، کسی کو بلغم، کسی کو سودا، کسی کو صفرا، اور ہر غدود کو اس کی مناسب مقدار میں غذاء پہنچتی رہی، اور ہر رگ و ریشہ کو مناسب رزق ملا، بچے کو صرف ایک غذاء پلایا گیا، اس دودھ نے اندر جا کر کتنی شکل و صورت پیدا کر لی، اور یہ غذا ہضم ہو کر ایک جگہ جمع شدہ فضلات کیسے الگ الگ ہوئے، اور ہر ایک اپنے راستے سے کیسے خارج ہوا، اور اس دودھ سے آنکھوں کی روشنی کے لئے بیٹری کیسے تیار ہوئی، قوتِ سماعت کیسے پیدا ہوئی، رگوں کو خون اور بدن کو گوشت کیسے مہیا ہوئے، وغیرہ۔

اگر کوئی مغرب زدہ یورپ کا پجاری یہ کہے کہ یہ سارے کام دل اور جگر، گردے اور تلی نے انجام دیئے تو اسے بتائیے کہ ان اعضائے رئیسہ نے یہ کام کہاں سے سیکھا؟ اور خود یہ اعضائے رئیسہ کس کی پیداوار اور مخلوق ہیں؟ اور وہ کوئی اور کام کیوں انجام نہیں دیتے؟ انہیں اس کام کی انجام دہی کی قوت اور استعداد کس نے مہیا کی؟ سفید دودھ میں سرخی کہاں سے آئی؟ اور سرخ خون کو کس نے سفید دودھ میں تبدیل کیا؟ اور کھانے کی چیزوں میں خون بننے کی استعداد کس نے پیدا کی؟

تم ایک تیار لوہے کو جس طرح چاہو جیسے چاہو ہزاروں مختلف اشیاء کی شکل وصورت میں تبدیل کر کے اوزار، پرزے، اسلحہ وغیرہ بناؤ، پھر اپنی عقل و دانش اور کاریگری پر ناز کرو، مگر ذرا یہ بتاؤ کہ یہ لوہا کس نے پیدا کیا؟ اور یہ عقل تم کہاں سے لائے؟ اور اس کاریگری میں تمہارے بدن کے ہر عضو نے ایک ایک کام ضرور انجام دیا، ذرا بتاؤ یہ اعضاء کس نے بنائے؟ اور جس عقل سے تم سب کچھ کر سکتے ہو یہ عقل تمہیں کس نے دی؟ اور حیوانات کو چھوڑ کر یہ عقل تمہیں کیوں عطا ہوئی؟ مگر یہ بتاؤ کیا تم لوہے پر محنت کر کے اسے سونے میں تبدیل کر سکتے ہو؟ سونے کو چھوڑیئے وہ بہت قیمتی دھات ہے، ایک دھات سے دوسرا دھات بنا سکتے ہو؟ لوہے پر محنت کر کے اس کو گوشت، ہڈی، خون، بلغم اور

صفراء میں تبدیل کر سکتے ہو؟ مٹی پر، لکڑی پر، پتھر پر محنت کر کے اس کو منی، خون یا ہڈی یا جگر یا دل یا گردہ بنا سکتے ہو؟ ان سب کو چھوڑیئے کیا ان بے شمار مصنوعات میں جان اور روح ڈال سکتے ہو؟ اپنے بدن اور وجود سے موت کو ٹال سکتے ہو؟ ان سب کا جواب نفی میں ہوگا۔

تو ماننا پڑے گا کہ اوپر سے ایک ماوراء مخفی قوت موجود ہے جس کے حکم اور چاہنے سے یہ سارا نظام اور دستور العمل چل رہا ہے، اسی کا نام نامی، اسم گرامی، روح کائنات اللہ تعالیٰ رب العالمین جل شانہ ہے، جس نے مٹی سے منی بنائی، منی کے قطروں کو خون بنایا، خون سے گوشت پوست، بال، ہڈی رگ و ریشہ، دل، جگر، دماغ، عقل، آنکھیں، سماعت اور بے شمار متضاد اعضاء جواہرات و اعصاب اور ایک سو سے زائد عناصر اس چھوٹے بدن میں ترتیب دیئے جس سے عالم صغیر انسان بنا، اور بنانے والا وہی ذات واحد لاشریک ہے جس کے چار ہزار اسمائے حسنیٰ میٹھے نام ہیں۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر دنیا کے آخری انسان تک سارے مل کر ایک مچھر، ایک لنگڑی چیونٹی اور ایک مکھی تک نہیں بنا سکتے۔

گلشن میں پھروں کہ سیر صحراء دیکھوں ☆ یا معدن وکوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے ☆ حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے میں کیا کیا دیکھوں

فرمایا: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ وہ ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جاننے والا ہے۔ لفظ غیب مخلوق کے اعتبار سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز غائب نہیں ہے۔

﴿هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ وہ نہایت مہربان ہے، اور نہایت رحم کرنے والا بھی ہے۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ وہی معبود برحق ہے کہ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ﴾ وہی حقیقی بادشاہ ہے جس کی سلطنت کے لیے کوئی زوال نہیں، وہ تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے۔ ﴿السَّلٰمُ﴾ وہ سلامتی دینے والا ہے، اور خود بھی قائم و دائم ہے۔

﴿اَلْمُؤْمِنُ﴾ وہ امن دینے والا ہے، اور نبیوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ ﴿اَلْمُهَيْمِنُ﴾ ہر چیز پر نگرانی کرنے والا ہے، اور حفاظت کرنے والا ہے۔ ﴿اَلْعَزِيْزُ﴾ وہ زبردست ہے، کمال قدرت کا مالک ہے۔ ﴿اَلْجَبَّارُ﴾ وہ قوت والا ہے، اور تلافی کرنے والا ہے۔ ﴿اَلْمُتَكَبِّرُ﴾ ساری بڑائی اور کبریائی اور عظمت والا ہے۔

﴿سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ﴾ اس کی ذات پاک ہے ان چیزوں سے جو یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں۔

﴿هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ﴾ وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، اور تمام اشیاء کو بہترین شکل وصورت میں بنا دیتا ہے، اور انسانوں، جانوروں، چرندوں، پرندوں سب کی شکل وصورت کو کمال درجے پر بنانے والا ہے۔

﴿لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى﴾ اس کے سارے نام اچھے اور بابرکت ہیں، لذیذ اور میٹھے ہیں، پڑھنے والوں کو اونچے مقامات پر پہنچانے والے ہیں۔ ﴿يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہیں وہ سب اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ ﴿وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ﴾ وہی زبردست ہے، غالب ہے اور کمال قدرت کا مالک ہے، اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔

سُورَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

مدنيةٌ آیاتها ١٣ رکوعاتها ٢

سورۂ ممتحنہ مدنی ہے، اس میں تیرہ (١٣) آیتیں، اور دو (٢) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الممتحنہ ہے جو اس سورت کی دسویں آیت میں موجود لفظ "فَامْتَحِنُوْهُنَّ" سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ٦٠ ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ٩١ نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے، اور اس کا نزول سورۃ الاحزاب کے بعد ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں دو رکوع، تیرہ آیات، تین سو ستر کلمات، اور پندرہ سو تریسٹھ (١٥٦٣) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

(١)۔گزشتہ سورت میں منافقین اور یہود کی بدعہدی کا بیان تھا، اب اس سورت میں مقاطعة عن جميع الكفار کا ذکر ہے۔

مختصر موضوع:

مقاطعة عن الكفار ، اسبابِ مقاطعہ، ترک موالات، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استقلال اور تبلیغ،

تذکیر بمابعد الموت، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ادعیات اجازت مدارات طریق بیعت اور مسلمانوں کے حقوق، تسلی مؤمنین اور برکاتِ اسلام وغیرہ حقوق واحکام۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّىۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِيَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَيۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَقَدۡ كَفَرُوۡا
بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَـقِّ‌ ۚ يُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَاِيَّاكُمۡ‌ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ
جِهَادًا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِىۡ‌ ‌ۖ تُسِرُّوۡنَ اِلَيۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ ‌ۖ وَاَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَيۡتُمۡ وَمَاۤ
اَعۡلَنۡتُمۡ‌ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ①اِنۡ يَّثۡقَفُوۡكُمۡ يَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً
وَّيَبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ ②لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ
وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ‌ ۚ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ‌ۚ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ③

ترجمہ: اے ایمان والو! میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کرتے ہو، حالانکہ وہ حق کے منکر ہو چکے ہیں، وہ جو تمہارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور تمہیں اس وجہ سے نکال چکے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے جو تمہارا ربّ ہے، اگر تم نکلے ہو جہاد کرنے کے لئے میری راہ میں اور میری رضاء تلاش کرنے کے لئے تم ان کی طرف چپکے سے دوستی کی باتیں کرتے ہو، اور میں ان باتوں کو خوب جانتا ہوں جنہیں تم چھپاتے ہو، اور تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا سو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا① اگر وہ تمہیں پالیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں، اور تمہاری طرف برائی کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو اور اپنی زبانوں کو بڑھادیں، انہیں اس بات کی خواہش ہے کہ تم کافر ہو جاؤ② ہرگز تمہیں نفع نہ دیں گی تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد قیامت کے دن، اللہ تمہارے درمیان جدائی فرمائے گا، اور اللہ تمہارے سارے کاموں کو دیکھتا ہے③

معارف ومنازل

ابتدائی آیات میں کافروں کی دوستی سے منع کیا گیا ہے، اور ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس سے

مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان معاہدۂ حدیبیہ دس سال کی لمبی مدت کے لئے کیا گیا تھا، مگر مشرکین اسے ایک سال تک بھی نہ برداشت کر سکے اور اس کی خلاف ورزی شروع کر دی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ان عہد شکنوں کو سبق سکھانے کا ارادہ کیا، اور اس بات کو عام لوگوں تک پہنچائے بغیر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ چپکے سے مکہ مکرمہ پر اچانک حملہ کر دیا جائے تاکہ مشرکینِ مکہ کو تیاری کا موقع نہ مل سکے، اور بغیر کسی خون وخرابے کے مکہ مکرمہ فتح ہو جائے۔

اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حاطب ابن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے ایک شدید غلطی ہوگئی، یہ صحابی خاندانِ قریش میں سے تو نہیں تھے مگر مکہ کے باشندے تھے، یہ خود تو ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے مگر ان کے بیوی بچے اور مال واسباب مکہ میں ہی رہے۔ اکثر مہاجرین کے رشتہ دار تو مکہ میں موجود تھے جو ان کے مفادات کی نگرانی کرتے تھے، مگر حاطب رضی اللہ عنہ کا کوئی رشتہ دار مکہ میں موجود نہیں تھا جو ان کے مفادات کی نگرانی کرتا، چنانچہ انہوں نے قریش کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ان کو مسلمانوں کے ارادے سے بذریعہ خط آگاہ کرنا چاہا۔

ان دنوں بنو عبد المطلب کی ایک آزاد کردہ لونڈی مدینہ منورہ آئی ہوئی تھی، جب وہ واپس مکہ مکرمہ جانے لگی تو حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے اسے قریش مکہ کے نام خط لکھ کر دے دیا، اس خط میں مسلمانوں کے بعض راز افشا کئے گئے تھے جن میں مکہ مکرمہ پر مسلمانوں کے حملہ کا ذکر بھی تھا۔ بخاری ومسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: يُخْبِرُ بِبَعْضِ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ یعنی اس خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض امور کی خبر دی گئی تھی۔

بہر حال! مسلمانوں کے مکہ مکرمہ پر حملہ کی اطلاع تو دے دی مگر ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا بھی آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو غالب کر دے گا۔

جب وہ عورت خط لے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وحی کے ذریعے مطلع فرمایا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم کو اس عورت کے پیچھے جانے کا حکم دیا، اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ عورت تمہیں روضہ خاخ کے مقام پر ملے گی، اس سے وہ خط لے کر آؤ، اور اسے کچھ نہ کہو۔ یہ حضرات گھوڑے دوڑاتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو عورت کو جالیا، اس کا نام سارہ تھا، اور وہ اونٹنی پر سوار تھی، انہوں نے اس سے خط کا مطالبہ کیا کہ تمہارے پاس جو خط ہے وہ ہمارے حوالے کر دو، تو اس نے انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سختی سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے کہ وہ

خط تمہارے پاس ہے، اگر تو نے ہمیں یہ خط بخوشی نہ دیا تو تمہاری جامہ تلاشی لینا پڑے گی، وہ عورت اس بات سے خوف زدہ ہوگئی اس نے اپنے بالوں کے نیچے چھپا ہوا خط دے دیا، جسے لاکر ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے خدمت گرامی میں پیش کر دیا۔

اس وقت آپ ﷺ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اور آپ ﷺ کے اردگرد بڑا مجمع تھا جس میں حاطبؓ بھی موجود تھے، جب خط کا مضمون پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو آپؐ نے حاطبؓ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اور تم نے ایسا کام اور اقدام کیوں کیا؟ اتنے میں حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ سرکار! آپ اجازت دیں تو میں اس منافق کا سر قلم کردوں، مگر آپ ﷺ نے منع کر دیا۔

اس اثناء حضرت حاطبؓ کہنے لگے کہ حضورا! آپ جلدی نہ کریں، مجھے موقع دیں، پہلے میری بات سن لیں، اس کے بعد جو چاہیں حکم دیں۔ حضرت حاطبؓ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ جب سے میں ایمان لایا ہوں اس کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سوچی، میں نہ کافر ہوا ہوں نہ مشرک نہ منافق اور نہ مرتد، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین پر پوری طرح قائم ہوں، بات یہ ہے کہ قریش مہاجرین کے تو مکہ شریف میں عزیز و اقارب ہیں جن کی وجہ سے مکے والے اُن کے مفادات کا، ان کے بیوی بچوں کا تحفظ کرتے ہیں، مگر میرا وہاں کوئی عزیز نہیں جس کی بنائی پر مجھے خطرہ ہوا کہ وہ کہیں میرے بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں، میں نے مکہ والوں کو ممنون احسان بنانے کے لئے یہ خط لکھا ہے، میرا دوسرا کوئی مقصد نہیں ہے، مجھے اسلام کی حقانیت میں کوئی شبہ نہیں، بلکہ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور فتح عطاء فرمائے گا، لہٰذا آپ میری خطاء کو معاف کردیں۔

آنحضرت ﷺ نے اس کی صفائی اور معذرت کو قبول کیا، اور فرمایا کہ یہ بدری صحابی ہے، اہل بدر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے ان کی تمام لغزشیں (اگلی اور پچھلی) معاف کر دی ہیں، اس بشارت کو سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آئے، اور وہ اس عظیم بشارت پر رو پڑے، اور پھر اس کے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا۔

سو اسی واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اس صحابی کو اور عمومی لحاظ سے سب لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی، اور انہیں کفار کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرمایا، چاہے کسی کی نیت ٹھیک ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ کسی غلط کام میں صحیح نیت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اور نہ ہی صحیح نیت سے ناجائز کام جائز ہوسکتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی اشارہ ہے کہ کسی قرابتداری کی وجہ سے ایمان میں ضعف نہیں آنا چاہئے، بلکہ ایمان پر سب کچھ قربان کر کے اس کا

تحفظ کیا جائے، نہ یہ کہ خدانخواستہ ایمان کو کسی چیز پر قربان کر دیا جائے، یہ دنیا وآخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ نعوذ باللہ

فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر مشرکین، کفار، یہود اور نصاریٰ وغیرہ کی دوستی سے بڑی شدت کے ساتھ مسلمانوں کو منع فرمایا ہے، اسی بنیاد پر الحب في الله و البغض في الله ایمانِ کامل کی نشانیوں میں سے ہے۔ فرمایا: ﴿تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ تم ان کی طرف دوستی کا پیغام روانہ کرتے ہو جو کہ سراسر اسلام کی بدخواہی ہے، اور اسلام کے ساتھ صراحۃً غداری ہے۔

﴿وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾ اور بلاشبہ انہوں نے اس دینِ حق کا انکار کیا ہے جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی کارروائی تمہارے بارے میں بہت ہی ظالمانہ ہے، وہ یہ کہ: ﴿يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ﴾ یہ رسول کو بھی ان کے وطن سے نکالتے ہیں اور تمہیں بھی، اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ پر اپنے پروردگار پر ایمان لائے، تمہارا اور کوئی قصور نہیں تھا سوائے اس کے کہ تم نے حق کو تسلیم کیا، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا، اس پر انہوں نے تمہیں بہت ہی اذیتناک سزائیں دیں، اور کتنے ہی مسلمان مردوں اور عورتوں کو شہید کیا، اور تمہیں مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا اور نکال ہی دیا۔

یہاں سے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کو خصوصی خطاب فرمایا: ﴿اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۚ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ اگر تم جہاد کرتے ہوئے میرے راستے میں نکلے، ہو اور میری خوشنودی کی تلاش میں ہو، تو پھر تم کس طرح پوشیدہ طور پر کفار کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو؟

﴿وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ﴾ حالانکہ میں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، اور یاد رکھو: ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ تم میں سے جس کسی نے کبھی ایسا کام کیا تو سمجھ لو کہ وہ صراط مستقیم سے بہک گیا اور گمراہ ہو گیا۔ آگے فرمایا:

﴿اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً﴾ اگر وہ خدانخواستہ تم پر قابو پالیں تو پھر تمہارے دشمن ہی ثابت ہوں گے، یہ نہ سمجھو کہ تمہاری حیلہ سازی سے اور خط لکھ کر انہیں خوش کرنے سے وہ تمہارے دوست بن سکتے ہیں، نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ تمہارے دشمن ہی رہیں گے۔ ﴿وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝﴾ اور اپنے ہاتھ اور زبانیں تمہاری ایذاء رسانی کے لئے ہی بڑھاتے رہیں گے، اور ان کا مقصد یہ ہے

کہ تم کسی طرح ایمان کو ترک کر کے کفر میں واپس آجاؤ۔

کافر خواہ یہودی کی شکل میں ہو یا نصرانی کی شکل میں ہو، یا مشرک ہو، یا دہریہ ہندو ہو، یا سکھ اور قادیانی ہو، کوئی بھی نہیں چاہتا کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں، اور اپنے قرآن پر عمل پیرا ہوں، اور اپنے نبی ﷺ اور اس کی سنت پر اور اسلامی قانون پر عمل کرنے والے ہوں، اور ان کا معاشرہ اسلامی طرز پر قائم ہو۔ غیر مسلم اقوام کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ اگر مسلمان کافر یا مشرک نہ بھی ہوں تو کم از کم دینِ اسلام پر بھی قائم نہ رہیں۔ انگریز برصغیر میں ڈھائی تین سو سال رہ کر مسلسل اسی کوشش میں رہے کہ مسلمان صرف نام کا مسلمان رہے، کام کا نہ رہے، کم از کم اس کی شکل وصورت اور لباس اگر مسلمان کا رہا تو کوئی بات نہیں، دل ودماغ اور نظریہ اس کا اسلامی نہ رہے، چنانچہ وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب ہوگئے، سوائے محدود چند مسلمانوں کے طبقات کے باقی لوگوں کا حال دنیا کے سامنے ہے کہ وہ ذہنی طور پر مغربی تہذیب کے دلدادے ہیں، اور اسلامی تعلمات سے بیگانے ہیں۔

بہت بڑے صدمے کی بات ہے کہ آج مسلمانوں کا لیڈر جلسے میں کھڑے ہو کر یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کا فرق معلوم نہیں، تو ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ انگریز اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے، ہم سوائے إنا لله وإنا إليه راجعون کے کیا کہہ سکتے ہیں؟ فرمایا:

﴿لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۚ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ يَفۡصِلُ بَيۡنَكُمۡ﴾ تمہاری قرابتداری اور اولاد تم کو ہرگز فائدہ نہیں پہنچائے گی قیامت کے دن۔ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے کہ تم بیوی بچوں کی خاطر اور ان کی نگہداشت اور نگرانی کی خاطر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف کام کرتے ہو، اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ جو راز چھپانا چاہتے تھے اس کو طشت ازبام کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ یاد رکھو! یہ بیوی بچے اور قرابتداریاں آخرت میں تمہارے کچھ کام نہ آسکیں گے، وہاں تو ایمان، نیکی، اخلاص اور اسلام کی خیر خواہی اور صداقت ہی کام آئیں گی، اس دن اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے گا، اور ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اور یہ بھی یاد رکھو: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ﴾ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا
عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۴ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا
رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ
وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶

ترجمہ: تمہارے لئے ابراہیم میں اور ان لوگوں میں جو ان کے ساتھ تھے ایک عمدہ نمونہ ہے، جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم تمہارے منکر ہیں، اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا، جب تک تم اللہ تعالیٰ واحد لاشریک پر ایمان نہ لاؤ، لیکن ابراہیم کی اتنی بات جو اپنے باپ سے ہوئی تھی کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا، اور تمہارے لئے مجھ کو اللہ تعالیٰ کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم آپ پر توکل کرتے ہیں، اور آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے ۴ اے ہمارے پروردگار! آپ ہم کو کافروں کا فتنہ نہ بنایئے، اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف فرما دیجئے، بیشک آپ زبردست حکمت والے ہیں ۵ بیشک ان لوگوں میں تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لیے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا اور قیامت کے دن کا اعتقاد رکھتا ہو، اور جو شخص روگردانی کرے گا سو اللہ تعالیٰ بالکل بے نیاز اور مستحق حمد ہے ۶

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں کافروں کی دوستی سے منع فرمایا گیا تھا کہ مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے کہ کافروں سے دوستی کریں، اب ان آیات میں اس کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طرز وطریقہ بطور نمونہ اور مشعلِ راہ بیان فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر ہر چیز کی قربانی پیش کر دی، اور اپنی پوری قوم سے بیزاری کا اعلان کر دیا، اور ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ البتہ تحقیق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور

ان کے رفقاء میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی اختیار کی۔ ﴿اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ﴾ جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم بیزار ہیں تم سے اور تمہارے ان باطل معبودوں سے جن کی تم عبادت کرتے ہو، ہم تمہارا انکار کرتے ہیں، کیونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کیا ہے، اور تمہاری مخالفت کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا ہے، یہاں تک کہ تم ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ، ہماری اور تمہاری دوستی کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ تم توحید کا اقرار کرو، اور اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک مانو تو بہتر اور دوستی کا راز صرف یہی تھا، ورنہ تمہارے اور ہمارے درمیان بغض وعداوت اور نفرت و بیزاری ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گی، یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے کسی کافر کے ساتھ دوستی کریں، ہمارے نزدیک اگر کوئی رشتہ قابل قبول ہے اور قابل ستائش بھی ہے تو وہ صرف روحانی رشتہ ہے، اس کے علاوہ کسی بھی رشتے کا ہمارے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں، ماں باپ ہوں یا بہن بھائی، یہ اس وقت رشتے کے قابل رہیں گے جب ان میں روحانیت ہو، بغیر روحانیت کے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

جب ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے آپ کی دعوت قبول نہ کی تو آپ نے ان سے علیحدہ ہوتے وقت یہ کہا:
﴿اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ہاں! ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے یہ وعدہ ضرور کیا کہ میں تیرے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کروں گا، اور یہ میری صرف اللہ تعالیٰ کے حضور ایک درخواست ہوگی، ورنہ میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میری حیثیت ایک درخواست گزار کی ہے، مالک تو سب کچھ اللہ تعالیٰ ہے، اگر وہ چاہے تو دعا قبول کر لے، اور اگر نہ چاہے تو قبول نہ کرے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ عداوت اور دشمنی کے باوجود ابراہیم علیہ السلام میں شفقت کا مادہ موجود تھا، اور وہ یہ امید باندھے ہوئے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ میرے باپ کا دل پھیر دے، اور وہ ایمان قبول کرے، اور اللہ تعالیٰ کی عداوت سے باز رہے، لیکن جب اسے پختہ معلوم ہوا کہ میرا باپ ازلی بدبخت ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی دشمنی سے باز آنے والا نہیں تو دعا مانگنا بھی چھوڑ دیا، اور اس سے بیزاری کا اعلان بھی فرمایا جیسا کہ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾

[التوبة: ۱۱۴] (کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا مانگنا ایک وعدے کی وجہ سے تھا، پھر جب آپ پر واضح ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو اس سے بیزاری کا اعلان کر دیا)۔ آگے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی دعا کا بیان ہے:

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم تیری ہی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں، اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں، اور سب کو تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ آپ کی دوسری دعا یہ ہے: ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ اے ہمارے پروردگار! ہمیں کافروں کے لئے آزمائش نہ بنا، ایسا نہ ہو کہ ہم کافروں کا تختہ مشق بن جائیں، ان کے ہاتھوں سے ہمیں آزمائش میں نہ ڈالنا، اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے، بے شک تو زبردست اور حکمت والا ہے۔ آخر میں دوبارہ تاکید فرمارہے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ البتہ تحقیق تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقاء میں اچھا نمونہ ہے، مگر یہ اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور قیامت کے دن جزائے عمل کی امید رکھتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے اور قیامت کے محاسبہ سے جو شخص ڈرتا ہے تو فائدہ اسی کو ہوتا ہے، اور جو نہیں ڈرتا ایمان وعمل سے بیگانہ رہتا ہے وہ نقصان ہی میں رہے گا۔ آگے اسی کو فرمایا:

﴿وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ اور جو شخص روگردانی کرے گا، اسوۂ حسنہ سے فائدہ نہیں اٹھائے گا، اور اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے، اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہے، اور اس کو کسی کی روگردانی سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، البتہ ایسا شخص خود ہی خسارے میں رہے گا۔

عَسَى اللَّهُ أَن يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُم مِّنْهُم مَّوَدَّةً ۚ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ۚ وَاللَّهُ
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۞ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم
مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۞ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ
اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ

اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان دوستی فرمادے گا جن سے تمہاری عداوت ہے، اور اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے ⑦ اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ⑧ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ کی، اور جنہوں نے تمہیں تمہارے گھر سے نکالا، اور تمہارے نکالنے میں مدد کی، اور جو شخص ان سے دوستی کرے گا سو یہ وہ لوگ ہیں جو ظالم ہیں ⑨

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں کفار سے دوستانہ تعلق رکھنے کی سخت ممانعت وحرمت کا بیان ہوا، اگر چہ وہ کفار رشتہ و قرابت میں کتنے ہی قریب ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے معاملہ میں نہ ذاتی خواہش کی پرواکرتے تھے، اور نہ کسی رشتہ دار وعزیز کی، اس کے نتیجے میں ہر ہر گھر میں یہ صورت حال پیش آئی کہ باپ مسلمان اور بیٹا کافر یا اس کے برعکس، اسی طرح ایک بھائی مسلمان دوسرا کافر، تو ان کے دوستانہ تعلقات منقطع ہوگئے، ظاہر ہے کہ انسانی فطرت اور طبیعت پر یہ عمل اور قطع تعلقات کوئی آسان کام نہ تھا، اور کبھی کبھار دونوں جانب سے حسرت وافسوس کا اظہار بھی ہوتا تھا، آیات مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خوشخبری سنادی کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ دشمنیاں اور عداوتیں دوستی اور محبت میں تبدیل ہوجائیں گی۔

بعض روایات حدیث میں ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ اللہ تعالیٰ کی رضاء جوئی کے لیے اپنی کسی محبوب چیز کو چھوڑتا ہے تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس چیز کو حلال بنا کر اس تک پہنچادیتے ہیں، بعض اوقات اس سے بہتر چیز عطا فرمادیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں یہ ارشاد فرمایا کہ آج لوگ کفر پر ہیں، اور اس کی وجہ سے وہ تمہارے دشمن ہیں، اور تم ان کے دشمن ہو، جبکہ تم دونوں فریق آپس میں قرابتدار اور عزیز ہو، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عداوت کو دوستی سے اور اس دوری کو نزدیکی سے تبدیل فرمادے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارے رشتہ دار کافروں کو ایمان کی توفیق عطا فرما کر تمہیں آپس میں جوڑ دے، اور

تمہارے تعلقات کو از سرنو ہموار کردے، اس قرآنی پیشینگوئی کا ظہور فتح مکہ کے وقت اس طرح ہوا کہ بجزان کفار کے جو قتل کئے گئے تھے یا اپنی موت مرے تھے باقی سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ [مظهري]

جس طرح سورۃ النصر جو کہ نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورۃ ہے اس میں فرمایا: ﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ [النصر: ۲] (آپ یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ بڑی تعداد میں فوج درفوج اللہ تعالیٰ کے دین اسلام میں داخل ہوجائیں گے)۔

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کی والدہ قتیلہ بنت عبد العزیٰ بحالت کفر مکہ مکرمہ سے چل کر مدینہ منورہ پہنچی، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ غزوۂ حدیبیہ کے بعد قریش مکہ سے معاہدہ صلح ہوگئی تھی، یہ عورت اپنی بیٹی اسماء رضی اللہ عنہا کے لیے کچھ تحفے تحائف لے کر مدینہ پہنچی، تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان کے تحفے قبول کرنے سے انکار کردیا، اور اپنے گھر میں آنے کی بھی اجازت اس وقت تک نہ دی جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت نہ کرلیا، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میری کافرہ والدہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہے، میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو، اس کا تحفہ قبول کرو، اور اس کو اپنے گھر میں رکھو، اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ یاد رہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ قتیلہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قبل از ہجرت مکی زندگی میں طلاق دے دی تھی، ہوسکتا ہے اس بات پر طلاق دی ہو کہ اس نے اسلام لانے سے انکار کیا ہو، حضرت سیدہ طاہرہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی والدہ کا نام اُم رومان ہے، انہوں نے نبوت کی ابتدائی دنوں میں اسلام قبول کیا تھا۔ اس آیت میں فرمایا:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً﴾ ہوسکتا ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی کی فضاء پیدا کردے، اور تمہارے وہ دشمن ایمان قبول کرکے تمہارے دوست بن جائیں، اور تمہارے درمیان جو کفر کی دیوار کھڑی ہے وہ منہدم ہوجائے۔ ﴿وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے، اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ آگے فرمایا:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ

﴿وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ﴾ اللہ تعالیٰ تم کو ان کافروں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اس سے مراد وہ کافر ہیں جو ذمی ہیں، یا وہ جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کی ہے، تو مسلمانوں کو ایسے بے ضرر کافروں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنا جائز ہے۔

اس عدل وانصاف سے مراد محسنانہ برتاؤ ہے، عام عدل مراد نہیں، کیونکہ عام عدل وانصاف کا برتاؤ تو کافروں کے ساتھ بھی ضروری ہے، بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی ضروری ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ البتہ حربی کافروں کے ساتھ محسنانہ برتاؤ جائز نہیں ہے، اسی کو آگے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قٰتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَاَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰٓى اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے تم کو ان کافروں سے جو تم سے دین کے بارے میں لڑتے ہیں، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اور انہوں نے تمہارے نکالنے میں دوسروں کی مدد کی ہے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں منع کرتا ہے ان کے ساتھ دوستی کرنے سے، یہ حربی کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں، اور تمہارے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ فرمایا: اس حکم کے برخلاف:

﴿وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ جو شخص ایسے لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ ظالم شمار ہوں گے۔

❁ ❁ ❁

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا جَآءَكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامۡتَحِنُوۡهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِهِنَّ ۚ فَاِنۡ عَلِمۡتُمُوۡهُنَّ مُؤۡمِنٰتٍ فَلَا تَرۡجِعُوۡهُنَّ اِلَى الۡكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمۡ وَلَا هُمۡ يَحِلُّوۡنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوۡهُمۡ مَّاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اَنۡ تَنۡكِحُوۡهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمۡسِكُوۡا بِعِصَمِ الۡكَوَافِرِ وَسۡـَٔلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ وَلۡيَسۡـَٔلُوۡا مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ ذٰلِكُمۡ حُكۡمُ اللّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝١٠ وَاِنۡ فَاتَكُمۡ شَىۡءٌ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ اِلَى الۡكُفَّارِ فَعَاقَبۡتُمۡ فَاٰتُوا الَّذِيۡنَ ذَهَبَتۡ اَزۡوَاجُهُمۡ مِّثۡلَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اَنۡتُمۡ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ۝١١

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان کر لیا کرو، ان کے ایمان کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے، پس اگر ان کو مسلمان سمجھو تو ان کو کفار کی طرف واپس مت کرو، نہ تو وہ عورتیں ان کافروں کے لئے حلال ہیں، اور نہ وہ کافران عورتوں کے لئے حلال ہیں، اور ان کافروں نے جو کچھ خرچ کیا ہوا ان کو ادا کردو، اور تم کو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کچھ گناہ نہیں ہوگا، جبکہ تم ان کے مہران کو دیدو، اور تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو، اور جو کچھ تم نے خرچ کیا وہ مانگ لو، اور جو کچھ ان کافروں نے خرچ کیا ہو وہ مانگ لیں، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑا علم اور حکمت والا ہے، اور اگر تمہاری بیویوں میں کوئی بیوی کافروں میں رہ جائے پھر تمہاری نوبت آجائے تو جن کی بیویاں ہاتھ سے نکل گئیں جتنا انہوں نے خرچ کیا تھا اس کے برابر تم ان کو دے دو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو (۱۱)

معارف ومنازل

معاہدہ حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کافروں کا کوئی آدمی بھاگ کر مدینہ آجائے گا تو مسلمان اسے واپس کر دیں گے، اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی مکہ چلا جائے گا تو مشرکین اسے واپس نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ تو مردوں کے لئے تھا، مگر جب کچھ عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئیں تو ان کے اقرباء ان کے پیچھے آگئے، تو سوال پیدا ہوا کہ ان کو ٹھہرانے یا واپس کرنے کے متعلق کیا احکام ہیں؟

مشرکین مکہ نے عورتوں کو بھی مردوں پر محمول کیا، اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، کیونکہ واپسی کی شرط معاہدہ میں عام تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ معاہدۂ حدیبیہ کی مذکورہ شرط صرف مردوں کے لئے تھی، اور عورتوں پر یہ شرط عائد نہیں ہوتی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ شانہ نے اس سلسلے میں احکام نازل فرما کر مسئلے کا فیصلہ صادر فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ﴾

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان لے لیا کرو، اور خوب تحقیق کر کے ان کی آمد کا مطلب ومقصد اچھی طرح معلوم کرو، اور اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کا حال خوب جانتا ہے، مگر تمہارا بھی فرض ہے کہ اچھے طریقے سے معلوم کر لو کہ کیا واقعی وہ دین کی خاطر آئی ہیں یا پس پردہ کوئی دوسرا مقصد کارفرما ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بعض عورتوں سے سوال جواب کئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اس کام پر

مامور کیا۔ آگے فرمایا کہ تحقیق کرنے کے بعد:

﴿فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾ اگر تم جان لو اور اس نتیجے پر پہنچو کہ یہ واقعی مؤمنہ ہیں، اور انہوں نے صرف دین کی خاطر ہجرت کی ہیں تو پھر انہیں کافروں کی طرف مت لوٹاؤ، بلکہ اپنے ہاں پناہ دو، کیونکہ اب یہ کافروں کے لئے حلال نہیں ہیں، اور نہ وہ کافران عورتوں کے لئے حلال ہیں، ایمان لانے کے بعد ان عورتوں کا نکاح کافر مردوں کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ہاں! اگر خاوند بھی مسلمان ہو جائے یا اس کی توقع ہو تو پھر ایسی عورت اپنے خاوند کی طرف پلٹا دی جائے گی، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئیں، جبکہ ان کا خاوند ابو العاص رضی اللہ عنہ مشرکین مکہ میں سے تھے، کئی سال بعد وہ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آگئے، تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سابق نکاح کو برقرار رکھتے ہوئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند کے حوالہ فرمایا۔

اس سلسلے میں مزید فرمایا کہ جب کوئی عورت کافر شوہر کو چھوڑ کر تمہارے پاس آجائے تو:

﴿وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا﴾ تو کافروں کو وہ مہر وغیرہ کا خرچہ دے دو جو انہوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرتے وقت خرچ کیا تھا، اور پھر اگر تم ان سے نکاح کرنا چاہو پس: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾ تو نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ تم ان کو مہر ادا کرو، کیونکہ مہر نکاح کے تابع ہے، اگرچہ بغیر مہر کے نکاح ہو سکتا ہے، مگر شرعی حکم یہی ہے کہ نکاح بغیر مہر کے نہ ہو۔

اس کے برعکس اگر کوئی مؤمنہ عورت مرتد ہو کر کفار کے پاس چلی جائے تو: ﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا﴾ تو کافر عورتوں کے ناموس اور عزّت کو اپنے پاس مت روکو، کیونکہ مرتد ہونے کے بعد ان کا مؤمن آدمی کے ساتھ نکاح خود بخود فسخ ہو گیا ہے، لہٰذا ان کو روکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ ان عورتوں پر تم لوگوں نے مہر کی صورت میں جو خرچ کیا ہے وہ کافروں سے طلب کر لو، اور کوئی کافر خاوند کی بیوی جو ایمان لا کر تمہارے پاس آجاتی ہے تو چاہئے کہ وہ کافر لوگ بھی مانگ لیں، وہ مال جو انہوں نے ایسی عورتوں پر خرچ کیا ہے یہ دوطرفہ معاملہ ہے کہ مرتد عورت کا حق مہر تم واپس ان سے لے لو، اور مسلمان عورت کا مہر تم ان کو واپس کر دو۔

﴿ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو تمہیں دیا گیا ہے جس پر عملدرآمد ضروری ہے۔

﴿يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان فیصلہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ

سب کچھ جاننے والا اور حکمتوں والا ہے۔ مسلمان تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے پابند تھے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا کافر بھی اس قسم کے تبادلۂ مہر کے لئے تیار ہوں گے؟ ہوسکتا ہے کہ جو عورت مرتد ہوکر ان کے پاس چلی جائے وہ اس کا خرچہ ادا نہ کریں، اس مسئلہ کے حل کے لئے یہ فرمایا:

﴿وَاِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا﴾ اور اگر تمہاری بیویوں میں سے کچھ کفار کی طرف چلی جائیں پس تم ان پر گرفت کرو، یعنی اگر ادھر سے کوئی عورت مسلمان ہوکر آجائے جس کا خرچہ تم پر کافروں کو واجب الادا ہو تو اس کو روک لو، اور یہ رقم ان مسلمانوں کو ادا کرو جن کی بیویاں مرتد ہوکر چلی گئی ہیں، اور کافروں نے ان کا خرچہ ادا کرنے سے انکار کیا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عَاقَبْتُمْ یعنی گرفت کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کافروں کے خلاف جہاد کرو، اور وہاں سے حاصل ہونے والا مال بیت المال میں جمع کرو، اور بیت المال میں سے پھر اس مسلمان شخص کا خرچہ ادا کرو جو اس نے اپنی مرتد ہوجانے والی بیوی پر خرچ کیا تھا، فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یعنی اس کے قوانین پر پابندی سے عمل کرو جس پر تم ایمان لاچکے ہو، اس کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرو، بلکہ خوشی اور غم ہر حال میں اس کے ہر حکم اور قانون کی پابندی کرو۔

❁ ❁ ❁

يٰۤاَيُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اے نبی! جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں آئیں جو آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گی، اور نہ چوری کریں گی، اور نہ زنا کریں گی، اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لے کر آئیں گی، جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے تراشیں، اور یہ کہ کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی، سو انہیں بیعت کرلیجئے، اور ان کے لئے استغفار کیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ غفور ہے،

رحیم ہے ⑫ اے ایمان والو! ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا، وہ لوگ آخرت سے ایسے ناامید ہو گئے جیسے کافر لوگ ناامید ہو گئے جو قبروں میں ہیں ⑬

معارف ومنازل

صلح حدیبیہ کے اگلے سال مکہ مکرمہ فتح ہوا اہل مکہ تو ڈر رہے تھے کہ دیکھو ہماری زیادتیوں کے بدلہ میں ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ [یوسف:۹۲] (آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں) پڑھ کر سب کچھ معاف فرمادیا، اِکادکا بعض افراد کے سوا عموماً اہل مکہ سب ہی مسلمان ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ نے مردوں سے بھی عہد لیا، اور عورتوں سے بھی، عورتوں سے جو عہد لیا تھا وہ اس آیت میں بیان فرمایا ہے، عام طور پر عورتیں جو ہجرت کر کے آتی تھیں آنحضرت ﷺ ان سے ان چیزوں پر عہد لیتے تھے، اور زبانی بیعت فرما کر رخصت فرمادیتے تھے۔ آیت بالا میں چھ چیزیں مذکور ہیں جن پر بیعت کرنے کا حکم ہے، علماء نے بتایا ہے کہ گزشتہ آیت میں جو فَامْتَحِنُوْهُنَّ فرمایا ہے اس میں ان چیزوں پر عہد لینا مراد ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ ہجرت کرنے والی اور آنے والی عورتوں سے قسم لیتے تھے کہ وہ اپنے شوہر کے بغض وناچاقی کی وجہ سے آئی ہے، اور نہ کسی مسلمان کے عشق میں مبتلا ہے، اور نہ کسی سرزمین سے بے رغبت ہو کر آئی ہے، اور نہ کوئی ایسی حرکت کی ہے جس کی وجہ سے مواخذہ کی مستحق ہو، اور نہ دنیا کے لئے آئی ہے، بلکہ محض اسلام میں رغبت کرنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی وجہ سے آئی ہے، جب وہ قسم کھا کر یہ بیان دیتی تھی تو آنحضرت ﷺ اس کو مشرکین کی طرف نہیں لوٹاتے تھے، اور مشرکین کی طرف سے مشرکین کو مہر یا جو کچھ اس پر خرچ ہوا وہ دے دیتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب مؤمنہ عورتیں ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں تو ان سے آیت کریمہ: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ﴾ کے ذریعہ امتحان لیتے تھے، جو چیزیں آیت کریمہ میں مذکور ہیں جب وہ ان سب کا اقرار کر لیتی تھیں تو اسی سے ان کا امتحان ہو جاتا تھا، اس اقرار کے بعد آنحضرت ﷺ فرماتے تھے: جاؤ میں نے تمہیں بیعت کر لیا، اللہ تعالیٰ کی قسم! آنحضرت ﷺ کے دست

مبارک نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ نہیں چھوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف زبان مبارک سے بیعت فرما لیتے تھے۔ [مسلم]

آیت کریمہ میں جن چیزوں پر بیعت لینے کا ذکر ہے بظاہر وہ چھ چیزیں ہیں: پہلی پانچ چیزوں میں منفی پہلو بیان فرمائے ہیں جن میں یہ ہے کہ ایسا ایسا نہ کریں گی، اور چھٹی چیز کے الفاظ بھی بظاہر نہی کے الفاظ ہیں، لیکن ان کا عموم دین کے سب کاموں کو شامل ہے، اور اس میں پورے دین پر چلنے کا عہد لیا گیا ہے۔

پہلا عہد اس بات کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کریں گی، دوسرا عہد یہ ہے کہ چوری نہ کریں گی، تیسرا عہد یہ ہے کہ زنا نہ کریں گی، چوتھا عہد یہ ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، یہ عہد اس زمانے میں لینا ضروری تھا، کیونکہ اہل عرب اس وجہ سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے کہ ان کو کہاں سے کھلائیں گے، اور اگر لڑکی پیدا ہو جاتی تو شرماتے ہوئے منہ چھپاتے پھرتے تھے اور اسے زندہ دفنا دیتے تھے، اس کا تذکرہ سورۂ اعراف، سورۃ الاسراء، سورۃ النحل وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ اولاد کو قتل کرنے میں حمل گرانا بھی داخل ہے جو کہ آج کل مروّج ہے، اور یہ بہت بڑا گناہ کبیرہ ہے۔

پانچواں عہد یہ تھا کہ بہتان کی اولاد نہ لائیں گی، جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے تراش لیں، یعنی جھوٹ نہ بنائیں، علماء کرام نے اس کے دو مطلب لکھے ہیں:

اول یہ کہ زنا سے جو حمل ٹھہرا ہو اسے شوہر کی اولاد نہ بتائیں گی، دوم یہ کہ کوئی بچہ کہیں پڑا مل جائے تو اس کو اٹھا لیں اور شوہر سے کہیں کہ یہ میرا بچہ ہے جو تجھ سے پیدا ہوا ہے، ایسا نہ کریں جن عورتوں کے شوہر پردیس میں رہتے ہیں ان کی عورتوں کو ایسا کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں، مثلاً شوہر ایک سال میں آیا اور بچہ زنا سے پیدا ہوا تو اس کو بتا دیا کہ اس کا حمل تم ہی سے قرار پایا تھا۔

چھٹا عہد جو عورتوں سے لیا جاتا تھا وہ یہ ہے کہ کسی معروف کام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی نہ کریں گی، لفظ معروف میں ہر وہ خیر داخل ہے جسے مسلمان آدمی کو اپنی زندگی میں اپنانا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو بھی حکم فرمائیں درجۂ فرض وواجب میں ہو یا درجۂ استحباب واستحسان میں ہو مؤمن مرد اور مؤمنہ عورت کو اس پر عمل کرنا اس پر ایمان کا اہم تقاضا ہے۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت کریمہ: ﴿أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْـًٔا﴾ تلاوت فرمائی، اور ہمیں کسی کے مرجانے پر نوحہ کرنے سے منع فرمایا۔ [بخاري]

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی روایت جو بھی نقل کی گئی اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے یہ عہد بھی لیا کہ کسی کی موت پر نوحہ نہ کریں گی، اس سے معلوم ہوا کہ بیعت کی بہت سی قسمیں ہیں، عمومی بھی اور خصوصی بھی، مثلاً یہ کہ صرف اس بات پر بیعت لینا کہ علم پڑھیں گے، اور اس پر عمل کریں گے، یا صرف جہاد پر، یا صرف تقویٰ اختیار کرنے پر، یا صرف اس بات پر کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کریں گے، یا صرف باجماعت نماز پڑھنے کی پابندی کریں گے، یا صرف اس بات پر کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے، سینکڑوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس بات کی بیعت کی کہ زندگی بھر کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں کہ جن پر بیعت لیا جا سکتا ہے۔

ہمارے بعض مشائخ نے دور حاضر میں بیعت کرنے کی چیزوں میں یہ بھی اضافہ کر دیا ہے کہ پابندی کے ساتھ سنت کے مطابق داڑھی رکھیں گے، اور کبھی بھی داڑھی نہیں مونڈیں گے۔ ذرا یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ اگر اور کوئی گناہ پھیل جائے اور کوئی عالم یا پیر بیعت کرنے لگے تو چاہئے کہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید کے لیے اس کا بھی اضافہ کر لیا جائے، جیسے کہ مروجہ بدعتوں سے اجتناب وغیرہ۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے زمانے میں لوگوں نے پیری مریدی اور بیعت کو ایک پیشہ بنا کر مال جمع کرنے کا ذریعہ بنایا، نہ پیروں کی کمی ہے اور نہ ہی مریدوں کی، مگر تقویٰ، اتباع سنت، اعمالِ حسنہ سب کا خدا حافظ، اور آپ کو آج کل ایسے پیر نظر آئیں گے کہ ان پر نماز روزہ سب معاف ہیں، انگریزی لباس میں ہیں، کوٹ پتلون ٹائی ننگے سر گدی نشین دنیا دار پیر بنے ہوئے ہیں، دنیا سمیٹنے کے لیے اور دنیا داری کی زندگی گزارنے کے لئے گدیاں سنبھالے ہوئے ہیں، وہ اپنے ناداں اور دین وایمان سے بے بہرہ اتباع سنت سے محروم جاہل مریدوں کو خوب لوٹ رہے ہیں جو کہ سر سے پاؤں تک جھوٹے ہیں، اور شیطان کے پیروکار ہیں۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسے لوگوں سے دور رہیں، اور بندوں کے دروازوں پر سجدہ ریز ہونے کی بجائے اپنے رب کے حضور اخلاص کے ساتھ سجدہ ریز ہوں، اور اسی ذات پر بھروسہ کریں۔ امام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان تربیت کے بغیر خود بخود درجۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتا، چنانچہ بیعت اس شخص کی کرنی چاہئے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں، یعنی تمام خوبیوں کا وجود اور تمام غیر شرعی امور سے اجتناب فرماتے ہیں، کہ مرشد کامل کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل علم رکھتا

ہو، بے علم اور کتاب وسنت سے ناواقف پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہرگز جائز نہیں۔

فرماتے ہیں کہ دوسری شرط یہ ہے کہ بیعت کنندہ میں عدالت اور تقویٰ اور مکمل اتباع سنت ہو، اگر تم دیکھو کہ کوئی فضاء میں اڑ رہا ہے مگر اس میں اتباع سنت نہیں تو یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہے، جس طرح شیاطین فضاؤں میں اڑتے رہتے ہیں۔

اور تیسری شرط یہ ہے کہ بیعت کرنے والا آخرت میں رغبت رکھتا ہو، اور مکمل تارک دنیا ہو، اور جو شخص مالدار ہو اور مال کی محبت رکھتا ہو وہ ہرگز بیعت کے قابل نہیں۔ فرماتے ہیں کہ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو، اس کی مجلس میں ان دونوں باتوں کے علاوہ کوئی دنیوی بات نہ ہو، پس ذکر واذکار اور تعلیم وتربیت کی مکمل پابندی ہو۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ اس نے یہ طریقہ سالہا سال کی محنت کے بعد فقر وفاقہ میں رہتے ہوئے مشائخ اور بزرگوں سے سیکھا ہو، نہ یہ کہ خود بخود پیر بن کر بیٹھ گیا ہو، یا موروثی پیر بنا ہوا ہو، جو کہ ولی ابن ولی کا رواج ہے کہ پیر کے مرنے کے بعد ہر حال میں اس کے ناکارہ بے علم صاحبزادہ کی دستار بندی کی جاتی ہے، اور باپ کی مسند پر بٹھایا جاتا ہے، جس بے چارے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

یہ پانچ شرائط ہیں، اگر یہ شرائط کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا جائز ہے۔ البتہ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ اس قسم کی بیعت کو سنت کا درجہ حاصل ہے، اس کی وجہ سے معاصی اور گناہوں سے بچاؤ ہوگا، اور روحانی ترقی نصیب ہو جائے گی، بشرطیکہ عمل اور پابندی احکام ہو، بایں ہمہ یہ بیعت کوئی فرض یا واجب نہیں ہے۔ بعض لوگ تو ظاہری شکل وصورت میں قبہ وجبہ کے ساتھ تو بڑے اچھے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر وہ حقیقت میں روحانیت سے خالی ہوتے ہیں، مولانا رومیؒ نے فرمایا: ؎

گر بصورت آدمی انسان بدے ☆ موسیٰ وفرعون ہم یکساں شدے

اے بسا ابلیس وآدم روئے ہست ☆ پس بہر دست نباید داد دست

انسانیت کا تعلق شکل وصورت کے ساتھ نہیں ہے، تو کیا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ایک جیسے شکل وصورت کے نہیں تھے؟ انسانیت ایک باطنی امر کا نام ہے جو بہت اونچا ہے، اس سے فرعون خالی تھا، اور وہ انسانیت موسیٰ علیہ السلام میں بدرجۂ کمال موجود تھا۔ بعض لوگ شکل وصورت میں انسان ہوتے ہیں مگر ان کے باطن اور ضمیر پر شیطان مسلط ہوتا ہے، لہٰذا بغیر سوچ وفکر کے ہر کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔ فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ﴾ اے پیغمبر! جب آپ کے پاس مؤمنہ عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں تو ان کی بیعت کے لئے شرائط یہ ہیں: ﴿عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، نہ ذات میں نہ صفات میں۔ دوسری شرط:

﴿وَلَا يَسْرِقْنَ﴾ کہ وہ چوری نہیں کریں گی۔ تیسری شرط: ﴿وَلَا يَزْنِيْنَ﴾ وہ بدکاری نہیں کریں گی۔ چوتھی شرط: ﴿وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔ پانچویں شرط: ﴿وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ یعنی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان بہتان نہ باندھیں گی، یعنی یہ کہ بدکاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کو اپنے خاوند کی طرف منسوب نہیں کریں گی۔ چھٹی شرط یہ کہ:

﴿وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ﴾ نیکی کے کام میں وہ آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ معروف کی قید لگانے کی حکمت کیا ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہمیشہ معروف ہی میں ہوگی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معروف کے علاوہ کسی منکر بات کا حکم تو نہیں دے سکتے، پھر بالمعروف کی قید لگانے کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے یہ بات متصور نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معروف کے سوا کسی اور بات کا حکم دیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنے والے حکمرانوں کو یہ تعلیم دیدی کہ (کیونکہ بیعت ان حکمرانوں کو بھی اپنی رعایا سے لینی ہوتی ہے) وہ بیعت کے اندر بالمعروف کا لفظ شامل کریں، اور پہلے دن سے اس بات پر متنبہ ہو جائیں کہ ان لوگوں پر جو اطاعت ہے وہ معروف میں ہے، اور اگر کسی منکر کا حکم دیں گے تو ان کے ذمے اطاعت واجب نہیں، گویا کہ نبی کے معاملے میں یہ قید اتفاقی ہے، اور دوسرے حکمرانوں کے معاملے میں احترازی ہے۔ فرمایا: اگر عورتوں نے ان شرائط کو قبول کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کرنے کا مطالبہ کیا تو:

﴿فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ﴾ سو آپ ان سے بیعت کرلیں، اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے بخشش بھی طلب کریں کہ مالک الملک ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمادیں۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

جو مضمون سورت کی ابتداء میں بیان کیا گیا تھا اب آخر میں دوبارہ اسی کو دہرایا جارہا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ اے ایمان والو! مغضوب علیہم لوگوں سے

دوستی نہ کرو، یعنی ان لوگوں سے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا، جیسے سورۂ فاتحہ میں ارشاد فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ [الفاتحة:٧] (نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے، اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں)۔ فرمایا: ان لوگوں کا حال یہ ہے:

﴿قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ﴾ کہ یہ آخرت سے اس طرح مایوس ہو چکے ہیں جس طرح کافر لوگ قبروں میں جا پڑنے والوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کافر لوگ مردوں کی دوبارہ زندگی اور جزائے عمل سے مایوس ہیں کہ نہ دوبارہ زندہ ہوں گے اور نہ ان کا حساب وکتاب ہوگا، اسی طرح یہ بھی سمجھتے ہیں، یعنی یہوذ کہ وہ خود بھی دوبارہ نہیں اٹھیں گے، اور نہ کوئی جزائے عمل کی منزل آئے گی۔

یہودی اہل علم تھے، اور آخرت کا تصور بھی رکھتے تھے، مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے مغضوب علیہم ہو کر وہ بھی کفار کی طرح آخرت کی منکر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے آج کے دور میں بہت سارے مسلمانوں کی بھی حالت یہی ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں اس طرح کے شکوک وشبہات سے اور ہر طرح کی مایوسی سے بچائے۔ آمین۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّكِّ فِي الْحَقِّ بَعْدَ الْيَقِيْنِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اٰمين

سُورَةُ الصَّفِّ

مدنيةٌ آياتها ۱۴ رکوعاتها ۲

سورۂ صف مدنی ہے، اس میں چودہ (۱۴) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الصّف ہے جو اس کی چوتھی آیت میں آمدہ لفظ "الصّفّ" سے ماخوذ ہے۔ صف قطار کو کہتے ہیں، چونکہ اس سورت میں جہاد کے لئے صف بندی کا ذکر ہے لہٰذا اس سورت کا نام الصّف رکھا گیا۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ٦١ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۱۰۹ نمبر پر ہے۔

نزول:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدنی زندگی میں سورۃ التغابن کے بعد نازل ہوئی، اور ترتیب تلاوت میں اس سے پہلے ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں دو رکوع، چودہ آیات، دو سو تیئس (۲۲۳) کلمات، اور نو سو اکیانوے (۹۹۱) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں کفار ومشرکین کی دوستی سے منع فرمایا تھا، اس سورت میں ان سے قتال کرنے کا حکم ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

جانبازی اور سرفروشی کا حکم ہے، عظمتِ خداوندی، طریقِ جہاد، ترغیبِ جہاد، نتائج وفوائدِ جہاد، استدلال کا طرز وطریق، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ، غلبہ اسلام کا بیان، کفر وشرک کے نتائج، مؤمنین کی فلاح وکامیابی، وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③ اِنَّ اللّٰهَ
يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی ان سب چیزوں نے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور وہ عزیز ہے، حکیم ہے① اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے نہیں کرتے؟② اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم ایسی باتیں کہو جن پر عمل نہ کرو③ بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بنا کر لڑتے ہیں، گویا کہ وہ ایسی عمارت ہیں جس میں سیسہ پلایا گیا ہو④

معارف ومنازل

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم چند صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے آپس میں اچھے اعمال کا تذکرہ کیا، اور ہم نے کہا کہ اگر ہمیں پتہ چل جاتا کہ اللہ تعالیٰ کو کونسا عمل زیادہ محبوب ہے تو ہم اس عمل کو اختیار کر لیتے، اس پر اللہ تعالیٰ شانہ نے یہ آیات نازل فرمائی: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ﴾ سے ﴿مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ تک۔

[ترمذي تفسير سورة الصف]

اور معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب عمل کیا ہے تو ہم اسی عمل کو اختیار کر لیتے، اور ہم اپنے جان ومال قربان کرتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿اِنَّ

اللہ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ﴾ نازل فرمائی۔ پھر قریب ہی میں غزوۂ احد کا واقعہ پیش آ گیا، جب اس میں ابتلاء ہوا تو لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ كَبُرَ مَقْتًا﴾ نازل فرمائی کہ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے کرتے نہیں؟ جس جہاد کے لئے تم لوگ خواہشمند رہے اور انتظار میں رہے، لیکن جب اس کی فرضیت نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے بزدلی دکھائی۔

سورت کا آغاز توحید کے بیان سے ہوتا ہے جو دین کی بنیاد اور جڑ ہے، اور بغیر توحید کے کوئی عمل مفید نہیں اور مقبول نہیں۔ فرمایا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ پاکی بیان کرتی ہیں تمام مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور زمین اور ان میں جو مخلوقات ہیں سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں کہ ذات خداوندی تمام صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے، اور ہر عیب، کمزوری اور نقص سے پاک ہے، اور ہر طرح کے شریکوں اور اضداد انداد سے پاک ہے، پس تمہیں چاہئے کہ دیگر مخلوقات کی طرح ہر لمحہ اس کی تسبیح بیان کرتے رہو تا کہ بندگی کے حق ادا ہونے کے ساتھ تمہیں قرب الٰہی حاصل ہو، اور سعادتِ دارین تمہیں نصیب ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں یوں کہوں: سبحان الله والحمد لله و لا إله إلا الله والله أكبر تو مجھے یہ ان سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ [مسلم]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سبحان الله العظيم وبحمده کہے اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ [ترغیب وترہیب]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس رات مجھ کو سیر کرائی گئی (یعنی معراج کی رات) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملا، تو انہوں نے فرمایا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دیجئے، اور ان کو بتلا دیجیو کہ جنت کی اچھی مٹی ہے، اور میٹھا پانی ہے، اور وہ چٹیل میدان ہے، اور اس کے پودے یہ ہیں: سبحان الله والحمد لله و لا إله إلا الله والله أكبر۔ [مشکوۃ] حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان چاروں کلمات کا ایسا پختہ التزام کرنا چاہئے کہ کم از کم روزانہ سو مرتبہ پڑھ کر بے شمار ثواب کمائیں۔ فرمایا:

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب ہے، اور وہ حکمتوں والا ہے، اس کی ہر بات

حکمت پر مبنی ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جب تک جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا بعض لوگوں کی خواہش تھی کہ اجازت ملے تو ہم اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کریں، پھر جب جہاد کی فرضیت کا حکم نازل ہوا تو بعض لوگوں نے کمزوری دکھائی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی سخت مذمت بیان فرمائی۔ سورۃ النساء میں تفصیل گزر چکی ہے۔ فرمایا: یہ بہت نامناسب اور بری بات ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفۡعَلُونَ ۝٢ كَبُرَ مَقۡتًا عِندَ ٱللَّهِ أَن تَقُولُواْ مَا لَا تَفۡعَلُونَ﴾ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات باعثِ نفرت ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو خود نہیں کرتے، جب ایک چیز کا دعویٰ کرتے ہو تو پھر اس کے مطابق عمل کر کے دکھاؤ، اگر جہاد کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو پھر بزدلی نہ دکھاؤ، کیونکہ درحقیقت قول وفعل کا یہ تضاد منافقت کی علامت ہے، اور عملی منافق وہ ہے کہ جھوٹ بولتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے، امانت میں خیانت کرتا ہے، اور باتوں باتوں میں لڑائی کرتا ہے۔ آگے جہاد کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلَّذِينَ يُقَٰتِلُونَ فِي سَبِيلِهِۦ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنۡيَٰنٌ مَّرۡصُوصٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں، گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار ہیں۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہایت مضبوط ہوتی ہے جس میں کسی قسم کا دراڑ اور رخنہ نہیں ہوتا، تو مجاہدین کے لئے بھی ایسا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ دشمن کی بڑی قوت اور اجتماعی طاقت سے مقابلہ کرسکیں۔ حدیث شریف میں ارشاد نبوی ہے کہ دو مواقع کی صفیں اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں: ایک نماز کے موقع پر، اور دوسری جہاد کے موقع پر۔ [مشکوۃ]

وَإِذۡ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ يَٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُونَنِي وَقَد تَّعۡلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُمۡۖ فَلَمَّا زَاغُوٓاْ أَزَاغَ
ٱللَّهُ قُلُوبَهُمۡۚ وَٱللَّهُ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡفَٰسِقِينَ ۝٥ وَإِذۡ قَالَ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ إِنِّي
رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيَّ مِنَ ٱلتَّوۡرَىٰةِ وَمُبَشِّرَۢا بِرَسُولٖ يَأۡتِي مِنۢ بَعۡدِي ٱسۡمُهُۥٓ
أَحۡمَدُۖ فَلَمَّا جَآءَهُم بِٱلۡبَيِّنَٰتِ قَالُواْ هَٰذَا سِحۡرٞ مُّبِينٞ ۝٦

ترجمہ: اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ کو کیوں ایذا پہنچاتے ہو؟ حالانکہ تم کو

معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا آیا ہوں، پھر جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۵ اور جبکہ عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا آیا ہوں، مجھ سے پہلے جو تورات ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والا ہے جن کا نام احمد ہوگا، ان کی بشارت دینے والا ہوں، پھر جب ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ صریح جادو ہے۶

معارف ومنازل

پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے، دوسری آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے، یہ دونوں حضرات بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے، البتہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھی ہوئی۔ بنی اسرائیل ایک ناشکرا اور نافرمان قوم تھی، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت زیادہ تکلیفیں دیں، سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ اور سورۂ احزاب میں ان تکلیفوں کا ذکر گزر چکا ہے۔

اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کا حال رہا، تقریباً اس نافرمان قوم نے چار سو انبیاء کرام علیہم السلام کو شہید کر دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی، اور انہیں سخت دل وسنگدل بنا دیا، اور ان کو مغضوب وملعون بنا دیا، ساتھ ساتھ انہیں بندر وخنزیر بھی بنا دیا، ارشاد ہوا:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں اذیت پہنچاتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا سچا رسول ہوں، فرعون کے زمانہ سے لے کر آج تک تم نے مجھے دیکھا اور میرے معجزات کا مشاہدہ کیا مگر تمہیں ہدایت نصیب نہیں ہوئی۔

﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ جب وہ ٹیڑھے رہے، کج فہم وکج رفتار رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا، اور ان کے قلوب سخت ہو گئے، اور ان کے قلوب پر مہر لگا دی گئی، کیونکہ وہ ہدایت سے بیگانہ اور متنفر رہے۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نافرمان قوم کی راہنمائی نہیں کرتا، اور جو لوگ ہدایت کے طالب نہ ہوں انہیں ہدایت نہیں ملتی۔

دوسری آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے، انہوں نے بنی اسرائیل سے فرمایا: ﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأْتِى مِنۢ بَعْدِى ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَآءَهُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ یقین جانو میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تمہارے پاس جو پہلے سے کتاب ہے یعنی تورات اس کی تصدیق کرتا ہوں، اور میرے بعد جس رسول کی آمد ہوگی ان کی آمد کی خوشخبری دیتا ہوں، ان کا نام احمد ہوگا۔

آیت کریمہ میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نقل کیا ہے اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ میں بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا ہوں، یہ بات انجیل متیٰ میں بھی لکھی ہے جسے نصاریٰ پڑھتے پڑھاتے اور پھیلاتے ہیں، تحریف اور تبدیلی کے باوجود اب تک اس میں یہ بات موجود ہے، نیز یہ بھی فرمایا کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا، اس کے باوجود عیسائیوں نے اس کی مخالفت کی اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق طرح طرح کے غلط عقائد میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ بشارت دینا کہ میرے بعد احمد نامی ایک رسول آئیں گے، ان کا نام نامی احمد ہوگا، اس میں انہوں نے اپنے بعد آخر الانبیاء احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارت دی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے بہت سے نام ہیں، میں محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی ہوں، میرے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، اور میں حاشر ہوں، جب میں اپنے قبر سے نکلوں گا تو اللہ تعالیٰ ساری خلقت کو میرے قبر سے نکلنے کے بعد قبروں سے نکالے گا، اور میں عاقب بھی ہوں یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ [مسلم]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں عیسیٰ ابن مریم سے قریب تر ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تمام انبیاء کرام علیہم السلام آپس میں ایسے ہیں جیسے باپ شریک بھائی ہوں اور مائیں مختلف ہوں، ان سب کا دین ایک ہی ہے یعنی توحید اور رسالت اور وقوع قیامت پر ایمان لانا، آپ نے مزید فرمایا کہ ہمارے اور عیسیٰ ابن مریم کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ [مسلم: ج ۲]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی وہ ان کے ماننے والے راہبوں میں مشہور تھی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو متعدد راہبوں میں سے (جن کے پاس یکے بعد دیگرے انہوں نے

وقت گزارا) آخری راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارت دی تھی، جوان کے درمیان آپس میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی چلی آرہی تھی، اسی لئے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مدینہ میں آکر بس گئے تھے، اور اس راہب نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامات بتائیں تھیں وہ علامات دیکھ کر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے تھے جس کی تفصیل سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظَّالِمِينَ ۞ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۞ هُوَ الَّذِي
أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۞

ترجمہ: اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے حالانکہ وہ اسلام کی طرف بلایا جاتا ہو اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۞ یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنے منہ سے بجھادیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو کمال تک پہنچائے گا گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں۞ وہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۞

معارف ومنازل

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ☆ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

پہلی آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے: ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ کہ جو کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے حالانکہ اسے اسلام کی دعوت دی جارہی ہے اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ فرمایا کہ جنہیں اسلام قبول کرنا نہیں ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنے منہ کے پھونکوں سے بجھادیں، ان کے ارادوں سے کچھ بھی نہ ہوگا، ان کے نہ چاہتے ہوئے اسلام بڑھ چڑھ کر ترقی کرے گا، اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا فرمادے گا، خواہ کافروں کو برا کیوں نہ لگے، اور انہیں اسلام کی ترقی اور اس کا عروج اگرچہ ناگوار ہو ان کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی

فرق نہیں پڑے گا، بلکہ ان کی اس ناگواری کا اسلام کی رفعت اور بلندی پر بجائے کچھ اثر پڑنے کے اور ہی اسلام کا عروج ہوگا۔علامہ اقبال نے فرمایا:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ☆ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

انسانی منصوبے مخالف لوگوں سے دب جاتے ہیں، اور دین اسلام کا شعار یہ ہے کہ اس کی جتنی مخالفت ہوگی اتنا ہی اس کو عروج ہوگا، جب سے دنیا میں اسلام آیا ہے دشمنانِ اسلام نے اس کی روشنی کو بجھانے اور اس کی ترقی کو روکنے کے لیے کبھی بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اور آج بھی کفار اور اعداء اسلام اسلام اور مسلمانوں کے مٹانے کی پوری طرح کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، سارا جہاں ایک طرف جبکہ اسلام ایک طرف تمام کفار کا آپس میں اتحاد اسی بات پر ہے کہ ہم آپس میں نہیں لڑیں گے، اور ہم سب متحد ہو کر صرف اسلام کے خلاف لڑیں گے، مگر الحمد للہ اسلام بڑھ رہا ہے، روز روز دشمنوں کے ممالک میں پھیل رہا ہے، عورتیں، مرد، بوڑھے، جوان، بچے سب اسلام قبول کر رہے ہیں، اور سارے مخالفین دشمنانِ اسلام اپنی آنکھوں سے اسلام کا پھیلاؤ دیکھ رہے ہیں، اور اسلام کو روکنے کے لیے اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں، مگر اسلام بڑھتا جا رہا ہے، اور ان کے پیسے ضائع ہو رہے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا سبب نزول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ چالیس (۴۰) دن تک وحی نہیں آئی، اس پر کعب ابن اشرف یہودی نے کہا کہ اے یہودیو! خوش ہو جاؤ اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور بجھا دیا، اور اندازہ یہ ہے کہ ان کا یہ دین پورا نہ ہوگا، اس پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رنج ہوا، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اس کے بعد وحی کا تسلسل جاری ہوگیا، اور اسلام کا غلبہ مسلسل بڑھتا گیا۔علامہ قرطبیؒ نے اس بارے میں پانچ قول نقل کئے ہیں کہ نور اللہ سے کیا مراد ہے۔

پہلا قول: اس سے قرآن مراد ہے۔

دوسرا قول: اس سے دین اسلام مراد ہے۔

تیسرا قول: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔

چوتھا قول: اللہ تعالیٰ کے دلائل مراد ہیں۔

پانچواں قول: جس طرح کوئی شخص اپنے منہ سے اگر سورج کے نور کو بجھانا چاہے تو نہیں بجھا سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کو ختم کرنے اور پھیلاؤ کو روکنے والے اور اس کا رادہ کرنے والے اپنے مقصد میں

کامیاب نہیں ہوسکتے۔ دراصل یہ پانچواں قول قولِ ثانی کی تشریح ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے انسانوں کے بنائے ہوئے تمام دینوں پر غالب کردے، اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا ہے اس کے مطابق دینِ اسلام کا غلبہ سارے دینوں پر ہو کر رہے گا، مشرکین جو اس کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام نہ پھیلے ان کے یہ سارے ارادے ناکام ہوں گے، اور دشمنوں کی ناگواری کے باوجود اسلام پھیل کر رہے گا۔ اس آیت کی ایک تشریح سورۂ توبہ رکوع ۳ میں گزر چکی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے ﴿۱۰﴾ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو ﴿۱۱﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے، یہ بڑی کامیابی ہے ﴿۱۲﴾ اور ایک دوسری نعمت بھی ہے جسے تم پسند کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی، اور آپ مؤمنین کو بشارت دیجئے ﴿۱۳﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دو باتوں کی تلقین فرما کر باور کرایا ہے کہ اگر تم یہ دو کام شوق وذوق کے ساتھ کرو گے تو تم ہمیشہ کے لئے عذاب سے بچ جاؤ گے، ان دو امور میں سے ایک ایمان ہے جس سے انسان کی

انفرادی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے، اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ ہے، جان و مال کے ساتھ جس سے اجتماعی اصلاح اور دینی غلبہ حاصل ہوتا ہے، تو ارشاد فرمایا:

﴿يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتلاؤں جو تمہیں آخرت کے دردناک عذاب سے بچالے؟ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں عام دنیاوی تجارتوں کی طرح کبھی نقصان نہیں ہوگا، بلکہ اس تجارت کو اختیار کرنے والا ہمیشہ کامیاب اور فتحیاب رہے گا، اس نفع بخش تجارت کا پہلا اصول یہ ہے:

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر، اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان لائے، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، اس کو واجب الوجود خالق و مالک یقین کرے، اور اس کو تمام عیوب و نقائص سے منزہ اور پاک سمجھے، اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور برگزیدہ نبی و رسول تسلیم کرے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر جو عظیم کتاب قرآن کریم نازل فرمائی ہے اس کی تصدیق کرے، اور روز قیامت پر پورا پورا یقین کرے، بلکہ آنحضرت ﷺ نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا اور بتایا ان سب پر اجمالاً و تفصیلاً ایمان لائے۔

اور دوسرا اصول جس پر غلبۂ دین کا دارومدار ہے اور دردناک عذاب سے بچانے کا سبب ہے وہ یہ ہے:

﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ کہ یہ بھی عذابِ الیم سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر سلیم الفطرت دانش مند انسان کی انتہائی تمنا یہی ہوسکتی ہے کہ وہ دوزخ کے عذاب سے بچ جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام جنت میں داخل ہوجائے، یہ وہی کامیاب اور درخشندہ عمل ہے جس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر اپنے پیغمبر کی مخالفت پر کمربستہ ہونے کے بعد یہود و نصاریٰ نے نہ محض یہ کہ آخرت کی کامیابی اور نجات کھو بیٹھے، بلکہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہو کر مغضوب و ضالین ٹھہرے۔

ان کے برخلاف اس آخری امت نے جب جہاد کا عَلَم بلند کیا، اور کمزور، نہتے اور بے سرو سامان ہونے کے باوجود بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لی تو اس کی بدولت انہوں نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو تہ و بالا کر کے پورے جہاں

پر اسلام کا غلبہ ثابت کر دیا، اور انہوں نے اسلام کا وہ روشن مینار بلند کیا کہ جس کے سائے میں سارے جہاں میں امن قائم ہوا، اور دنیا کے اس کونے سے اس دوسرے کونے تک اسلامی تعلیمات کے انوار و برکات پھیل گئے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان قوم اور ان کے حکمرانوں کا فرض تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کے جو عمومی غلبہ عطا فرمایا تھا اس کو قائم رکھتے، مگر بدقسمتی سے ساتویں صدی ہجری کے بعد تاتاریوں کی یلغار نے لاکھوں مسلمانوں کو اس لئے تہہ تیغ کیا کہ مسلمان مجموعی طور پر عملی جہاد سے محروم ہو چکے تھے، اور فضول عیش و عشرت نے انہیں جہاد سے محروم کیا تھا، اور جو قوم جہاد کا منکر ہو یا اس سے غفلت برتے یا اس سے اعتراض کرے تو اس کو ہر محاذ پر ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑے گا، اور وہ کبھی کامیابی کا منہ تک نہیں دیکھنے کو ترسے گا۔ آخر میں فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یہی چیز تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ فرمایا: اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ: ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے سابقہ گناہوں کو معاف کر دے گا، اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جس کے سامنے نہریں بہتی ہیں، اور وہاں تمہارے لئے رہنے کے باغوں میں پاکیزہ محلات ہوں گے جو ہمیشہ رہیں گے، کیونکہ جنت کی ہر چیز پر دوام کی مہر لگ چکی ہے، جہاں زوال اور نقصان کا نام و نشان تک نہیں، بلکہ ہر چیز دائمی ہوگی۔ ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے جس خوش قسمت کو یہ نصیب ہو جائے۔

فرمایا: اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس کو تم پسند کرتے ہو: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت و مدد کے ساتھ قریبی فتحیابی تمہیں نصیب ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایمان اور جہاد کو زندگی کا دستور العمل بنالو گے تو پھر دنیا میں بھی تم کو غلبہ حاصل ہوگا، تمہیں فتح و نصرت اور ہر طرح کی کامیابی نصیب ہوگی، اور آخرت میں بھی ہیشگی کی جنتوں میں ہمیشہ خوشحال رہو گے، فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ آپ ایمان والوں کو اس بات کی خوشخبری سنا دیں کہ ایمان اور جہاد کے اصول کو اپنالیں، جس کے نتیجے میں دنیا و آخرت کی کامیابی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے اعلان ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ

إِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ

طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۠ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کے مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا: کون لوگ اللہ کی طرف میرے مددگار ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے مددگار ہیں، سو بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت ایمان لے آئی، اور دوسری جماعت نے کفر اختیار کرلیا، سو جولوگ ایمان لائے ہم نے ان کے دشمن کے مقابلہ میں ان کی مدد کی سو وہ غالب ہو گئے ﴿۱۴﴾

معارف ومنازل

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر آن اور ہر لحظہ جان و مال، عزّت وآبرو، قول وفعل، نقل وحرکت سے دل اور زبان سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تمام تر باتوں کی قبولیت میں رہیں، بال برابر انحراف نہ کریں، پھر مثال دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابع داروں کو دیکھو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آواز پر فوراً لبیک کہا، اور ان کے اس کہنے پر کہ کوئی آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کی باتوں پر میری مدد کرے؟ انہوں نے بلا غور و سوچ علی الفور کہہ دیا کہ ہم سب آپ کے ساتھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر امداد کرنے میں آپ کے تابع ہیں، چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان حواریوں کو اسرائیلیوں اور یونانیوں میں مبلغ بنا کر شام کے علاقوں میں بھیجا۔

حج کے دنوں میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی فرمایا کرتے تھے کہ کوئی آدمی ہے جو مجھے جگہ دیدے تا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رسالت کو پہنچا دوں؟ قریش تو مجھے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے روک رہے ہیں، چنانچہ مدینہ کے قبیلہ اوس اور خزرج کو اللہ تعالیٰ نے یہ ابدی سعادت بخشی کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بیعت کی، آپ کی باتیں قبول کیں، اور مضبوط عہد و پیمان کیا کہ اگر آپ ہمارے پاس آجائیں تو پھر کسی سرخ وسیاہ کی طاقت نہیں جو آپ کو تکلیف پہنچائے، ہم آپ کے لئے مال وجان قربان کریں گے، آپ کے دشمنوں سے لڑیں گے، اور چاروں طرف سے آپ کی حفاظت کریں گے، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ ہجرت فرمائی تو انصارِ مدینہ نے جن جن قربانیوں کا عہد و پیمان کیا تھا اس کے مطابق انہوں نے وہ سب کچھ کیا جس طرح نبی علیہ السلام چاہتے تھے، انہوں نے وہ تاریخی قربانیاں دیں جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی، اس کی تھوڑی سی تفصیل گزشتہ سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔

آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو جب ان علاقوں تک رسائی حاصل ہوئی تو بنی اسرائیل کے کچھ

لوگ ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ایمان لے آئے، اور دوسرے اکثر لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو انسانوں کا دین کہہ کر اس سے منحرف ہو گئے، کیونکہ بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے۔

اس کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو کار اور اس کے حواریوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ایمان لانے والے لوگ بگڑ گئے، اور مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک فرقے نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہہ دیا، یہ فرقہ یعقوبیہ کہلایا، دوسرے فرقے نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا تو نہیں بلکہ خدا کے بیٹے تھے، وہ ہمارے درمیان کچھ عرصہ کے لیے آئے تھے پھر چلے گئے، یہ فرقہ نسطوریہ کہلاتا ہے، تیسرا فرقہ تثلیث کا قائل تھا، اس نے باپ، بیٹا اور روح القدس کا عقیدہ بنالیا۔

البتہ ان تینوں کے علاوہ ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے، نہ کوئی تینوں میں سے تیسرا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول تھے، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ان کو زمین پر رکھا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے چاہا ان کو آسمان پر اٹھالیا، یہ فرقہ اہل ایمان کا تھا، جو حواریوں کا فرقہ تھا، جنہیں حواریین کہا جاتا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہو جاؤ۔

﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں میرا مددگار کون ہے؟ اس کے جواب میں: ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مددگار ہیں۔ ﴿فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ﴾ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لے آیا جس کے افراد نہایت قلیل تھے۔

﴿وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ﴾ اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا جو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ﴿فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ﴾ پس ہم نے تائید کی ان لوگوں کی جو ایمان لائے ان کے دشمنوں کے مقابلے میں، پس وہ ہو گئے، غالب آنے والے یعنی بلحاظ دلیل اور بلحاظ اجتماعیت دونوں طریقوں سے اہل ایمان کو ہی غلبہ حاصل رہا، کیونکہ ان کا عقیدہ درست تھا، اور ان کا غلبہ عقیدہ کے اعتبار سے تھا، نہ کسی دوسرے لحاظ سے۔

سُورَةُ الْجُمُعَةِ

مدنيةٌ آياتها ١١ ركوعاتها ٢

سورۂ جمعہ مدنی ہے، اس میں گیارہ (١١) آیتیں، اور دو (٢) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الجمعہ ہے جو اس کی نویں (٩) آیت میں الجمعة کے لفظ سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ٦٢ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ایک سودسویں (١١٠) نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے، اور اس کا نزول سورۃ الصف کے بعد ہے۔

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں دو رکوع، گیارہ آیات، اور ایک سو چھتر (١٧٦) کلمات، اور ٧٨٧ حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا ذکر تھا، اس سورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر ہے۔

مختصر موضوع:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، نمازِ جمعہ کی مشروعیت، ترغیب تعلیم وعلم، مجازاتِ اعمال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

چار فرائض کا بیان: (۱) تلاوت آیات قرآنی (۲) تزکیہ نفس (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت، اور یہی چاروں فرائض آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علماء کرام کو منتقل ہو گئے، کیونکہ علماء کرام انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث کہلاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جمعہ میں یہ سورت اور سورۃ المنافقون پڑھتے تھے۔[تفسير روح المعاني]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝١ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٢ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝٤

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں جو بادشاہ ہے اور بہت زیادہ پاک ہے، غالب ہے، حکمت والا ہے ۝١ وہ ہی ہے جس نے بے پڑھے لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اور بلاشبہ وہ لوگ پہلے کھلی گمراہی میں تھے ۝٢ اور دوسروں کے لئے بھی جو ان میں سے ہونے والے ہیں جو ابھی ان کے ساتھ نہیں ملے، اور وہ عزیز ہے، حکیم ہے ۝٣ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۝٤

معارف ومنازل

یہاں سے سورۃ الجمعہ شروع ہو رہی ہے، ابتداء میں ارشاد فرمایا کہ ہر بے زبان اور ناطق چیز اللہ تعالیٰ عزوجل تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی رہتی ہے، اور جگہ بھی فرمایا کہ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ نہ کرتی ہو، تمام مخلوقات خواہ آسمان کی ہوں یا زمین کی اس کی تعریفوں اور پاکیزگیوں کے بیان میں مصروف و مشغول ہیں، وہ آسمان وزمین کا بادشاہ ہے، پوری کائنات پر اس کا تصرف ہے، ہر نشیب وفراز میں اس کا حکم جاری ہے، وہ ہر قسم کے نقصانات سے پاک ہے، تو ارشاد فرمایا:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ پاکی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے لیے جو کچھ بھی ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الإسراء: ۴۴] (ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے مگر تم اس کی تسبیح نہیں سمجھ سکتے)۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح کو سو مرتبہ سبحان اللہ کہے، اور شام کو سو مرتبہ سبحان اللہ کہے اس کو سو (۱۰۰) حج کا ثواب ملے گا، اور جو شخص سو مرتبہ صبح کو الحمد للہ کہے، اور سو مرتبہ شام کو اسی طرح الحمد للہ کہے تو اسے مجاہدین کو سو گھوڑے دینے کا ثواب ملے گا (جبکہ جہاد میں ایک گھوڑا یا ایک اونٹ دینا ۷۰۰ کے برابر ہوتا ہے)۔ اور جس شخص نے سو مرتبہ صبح کو اور سو مرتبہ شام کو لا الہ الا اللہ کہا اس کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے سو غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا، اور جس نے سو مرتبہ صبح کو اور سو مرتبہ شام کو اللہ اکبر کہا تو اس دن کو دوسرا شخص اس کے برابر عمل کرنے والا نہ ہوگا سوائے اس شخص کے جس نے اس کے برابر یا اس سے زیادہ مذکورہ کلمات کہے ہوں۔ [مشكوٰة من الترمذي: ص ۲۰۲]

﴿الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ﴾ یعنی بادشاہ ہے پوری کائنات میں بادشاہی اسی کی ہے، اور وہی شہنشاہ حقیقی ہے، اور وہ ہر عیب ونقص سے پاک ہے، مخلوقات کی کوئی ایسی صفت نہیں جو اس کی ذات میں موجود ہو، اور اس کی کوئی ایسی صفت نہیں جو علیٰ وجہ الکمال مخلوقات میں موجود ہو۔ الْعَزِيْزِ جو کمال قدرت اور کمال قوت کا مالک ہے۔ الْحَكِيْمِ حکمتوں کا مالک ہے، اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔ فرمایا: اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے جو اس کی مہربانی اور شفقت بھی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ وہ وہی ذات پاک ہے جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک عظیم رسول انہی میں سے۔ امیین سے مراد عرب کے لوگ ہیں جو ناخواندہ ہونے کی وجہ سے امی کہلاتے تھے، اور یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ اس نے اپنا آخری برگزیدہ نبی انہی میں سے بھیجا، حالانکہ اردگرد کے ممالک جیسے ایران، روم، شام اور مصر وغیرہ میں بکثرت پڑھے لکھے لوگ موجود تھے، اور ان کے اپنے دفتری نظام تھے، ان کے یہاں کتابیں بھی تھیں، ان کے اندر تعلیم و تعلم کا بھی رواج تھا، جبکہ عربوں میں ان چیزوں میں سے کسی بھی چیز کا وجود تک نہیں تھا، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو فرمایا: ؎

یتیمے کرنا کردہ قرآن درست ☆ کتب خانہ چند ملت بشست

ایک ایسا یتیم جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا اس نے دنیا کی ملتوں کے سارے کتب خانے دھوڈالے، اور علم و حکمت کے وہ موتی وجواہرات بکھیرے کہ تمام قوموں کے کتب خانے ماند پڑ گئے، گویا کہ انہیں پانی سے دھوڈالا گیا، پھر فرماتے ہیں: ؎

نگارمن کہ بمکتب نہ رفت وخط نہ نوشت ☆ بغمزہ مسئلہ آموخت صدر مدرس شد

میرے محبوب عجیب ہیں کہ انہوں نے پڑھنا لکھنا تو سیکھا نہیں مگر وہ ایک اشارے کے ساتھ ساری کائنات کے صدر مدرس بن گیے۔ اس میں کیا شک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے نابینا قوموں کو بینائی نصیب ہوئی، ناخواندہ اور جاہلوں کو وہ علوم نصیب ہوئے جن کو سمندر کے ساتھ تشبیہ دینا بھی آسان ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک بھی ہے: **بعثت معلما،** مجھے سب سے بڑا معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

الغرض! فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے امیوں میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا، اور پھر ان امیوں کو وہ علم وحکمت نصیب ہوا جو دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوسکا۔ ایک یورپی مؤرخ سرولیمی لکھتا ہے کہ اگر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ دنیا میں مزید دس سال زندہ رہتے تو پوری دنیا سے کفر و بے دینی کا جنازہ اٹھا کر سمندروں میں پھینک دیتے، تعجب اس بات کی ہے کہ یہ شخص اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کی بدولت وہ سب کچھ حاصل کر چکے تھے جو دنیا کے کسی بڑے مدبر، مفکر، منتظم، فلاسفر اور پروفیسر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات بیان فرمائیں، جو کہ چار ہیں جن کی مفصل تفسیر و تشریح سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، یہاں مختصر اشارات سے کام لیا جائے گا۔ فرمایا:

﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ وہ اپنی امی قوم کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ دوسری صفت:

﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ان کا تزکیہ کرتا، اور انہیں ہر غیر شرعی عمل سے پاک صاف کرتا ہے۔ تیسری صفت:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ وہ انہیں کتاب کا علم سکھاتا ہے۔ اور چوتھی صفت حکمت اور دانائی کی باتیں سکھاتا ہے:

﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ اور بیشک وہ لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔ صریح گمراہی کا کیا کہنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے سارا جہان کفر وشرک اور معاصی کی ظلمتوں میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ جس سے خالق ومخلوق کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، لوگوں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے بتوں کے حضور دھوم دھام کے ساتھ سجدہ

ریز ہوتے تھے۔ پھر فرمایا:

﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے یہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کے لیے بھی مبعوث ہوئے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ابھی نہیں ملے، اس سے مراد وہ عجمی لوگ ہیں جن کی ملاقات عربوں سے نہیں ہوئی، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب وعجم سب کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، یہ کلام پاک کی ایک بشارت ہے۔

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول ہوا، اور آپ نے ہمیں سنائی، جب آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ تو ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں جن کا ذکر آخرین کے لفظ سے کیا گیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت سکوت فرمایا، تین بار سوال کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا، اس وقت وہاں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر ہاتھ رکھ دیا اور اس طرح بتا دیا کہ وہ لوگ ان میں سے ہوں گے، پھر فرمایا کہ اگر ایمان ثریا ستارہ کی بلندی پر بھی ہوگا تو ان کی قوم کے کچھ لوگ وہاں سے بھی ایمان کو لے آئیں گے: لو كان الإيمان بالثريا لناله رجال من أبناء فارس۔

اس حدیث میں اہل علم کی بڑی فضیلت ہے، چنانچہ اس پیشین گوئی اور اس شرف وعزّت کا جو مقام تھا اسے عرب کے علاوہ اہل عجم نے بڑی دیانت اور متانت اور تقویٰ کے ساتھ اس طرح حاصل کیا کہ اپنے علم وعمل کا پورے جہاں میں لوہا منوالیا، ان میں سب سے پہلی شخصیت حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جن کی فقہ تین چوتھائی عالم اسلام میں اس وقت رائج ہے، اور بقول علامہ بدرالدین عینی کہ صرف فقہ حنفی میں جو مسائل ہیں اور احکام ہیں ان کی تعداد بارہ لاکھ چالیس ہزار ہے، مسلمانوں کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل فقہ حنفی میں نہ ہو۔

ان کے علاوہ امیر المؤمنین فی الحدیث ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری جن کی کتاب صحیح البخاری کے متعلق علماء امت کا اجماع ہے کہ یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، اسی طرح اصحاب صحاح ستہ میں سے سوائے امام مسلم اور نسائی کے باقی حضرات جیسے امام ترمذی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم یہ حضرات فارسی النسل عجمی ہیں، اور عرب کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی اسلام کی جو خدمات عجمی بادشاہوں نے انجام دی ہیں وہ ایک حد تک قابل تعریف اور باعث اطمینان ہیں۔ پھر یہ بات معروف ومشہور ہے کہ قرآن مجید کا نزول حجاز میں ہوا، اور اس کو پڑھا گیا مصر میں، اور

اس کو سمجھا گیا ہند میں، ہندو خراسان کے لوگوں نے اسی طرح ترک نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ عرب کے لوگوں سے زیادہ ہیں۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ وہی زبردست عزت والا اور حکمت والا ہے۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞۵ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞۶ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۞۷ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞۸

ترجمہ: مثال ان لوگوں کی جنہیں تورات اٹھانے کا حکم دیا گیا، پھر انھوں نے نہیں اٹھایا گدھے کی سی مثال ہے، جو کتابوں کو لادتا ہے، بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۞۵ آپ کہہ دیجئے: اے وہ لوگو جنہوں نے یہودیت اختیار کی! اگر تم نے یہ خیال کیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دوست ہو، دوسرے لوگ اس میں شریک نہیں، تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۞۶ اور یہ لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے جو انہوں نے آگے بھیجے ہیں کبھی بھی اس بات کی تمنا نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ظالموں کو۞۷ آپ فرما دیجئے کہ بے شک موت جس سے تم بھاگ جاتے ہو وہ ضرور تم سے ملاقات کرے گی، پھر تم لوٹا دیئے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کی طرف جو غیب اور شہادۃ کا جاننے والا ہے، سو وہ تمہیں تمہارے اعمال سے باخبر کر دے گا۞۸

معارف ومنازل

سابقہ آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ونبوت امیین میں ہونا، اور آپ کی بعثت کے چار مقاصد کا ذکر جن الفاظ میں آیا پچھلی آسمانی کتاب تورات میں بھی آپ کا ذکر تقریباً انہی الفاظ وصفات کے ساتھ آیا ہے، جس کا

تقاضا یہ تھا کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی آپ پر ایمان لے آتے، مگران کو دنیا کے جاہ و مال نے تورات کے احکام سے اندھا کر دیا، اور باوجود تورات کے علم کے یہ لوگ عمل سے خالی رہے، اور جاہل و ناداں بنے، لہٰذا ان کی مذمت اس آیت میں اس طرح کی گئی کہ یہ لوگ جن پر تورات لادی گئی تھی مگرانہوں نے اس کے اٹھانے کا حق ادا نہ کیا اوراس سے انحراف کیا، فرمایا: ان کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کے پشت علوم وفنون کی بڑی بڑی کتابیں لاددی جاتی ہیں، یہ گدھا ان کا بوجھ تو اٹھاتا ہے مگر کتابوں کے اندر کے مضامین کے متعلق اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا، نہ ان سے کوئی فائدہ اس کو پہنچتا ہے، علماء یہود کا بھی یہی حال ہے کہ دنیا کی خاطر تو تورات کو سر پر لیے پھرتے ہیں، اور لوگوں میں اس کے ذریعے سے اپنا مقام ومرتبہ بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگراس کی ہدایات سے فائدہ نہیں اٹھاتے، اور علم کے باوجود گدھے کی طرح احمق پھرتے رہتے ہیں۔

مفسرین نے فرمایا: یہ نہ سمجھو کہ یہ مثال یہود کے علماء کی دی گئی ہے، بلکہ یہ مثال ان تمام علماء دین کی ہے جو اپنے علم پر عمل نہ کریں، لہٰذا ہمارے علماء کو چاہئے کہ اپنے عمل کی اصلاح کریں، جب تورات کا عالم بے عمل ہوکر گدھا بن سکتا ہے تو قرآن حکیم کا عالم بے عمل ہو کر بطریق اولیٰ گدھا بن جائے گا، بلکہ گدھے سے بھی بدتر شمار ہوگا۔

یہاں لفظ اسفار سِفرٌ کی جمع بکسر السین ہے، بڑی کتابوں کو کہا جاتا ہے، صاحب قاموس کی ایک کتاب ہے سفر السعادۃ کے نام سے۔ فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ مثال ان لوگوں کی جن پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا، مراد حاملینِ تورات علماء یہود ہیں، پھرانہوں نے اس بوجھ کو اٹھایا نہیں، یعنی اس کی حفاظت کی، نہ اس پر عمل کیا، ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھاتا ہے، جس طرح گدھا کتابیں اٹھانے سے عالم فاضل مفتی اور کتابوں کا عامل نہیں بن جاتا اسی طرح وہ انسان بھی گدھے کی مانند ہے جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے، مگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے، پس ان میں اور گدھوں میں کیا فرق رہا؟ اسی کو شیخ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا: ؎

نہ محقق شود نہ دانشمند☆ چار پائے براو کتاب چند

مولانا رومیؒ نے عالم باعمل اور عالم بے عمل کی یوں ترجمانی فرمائی: ؎

علم را بر دل زنی یارے بود☆ علم را بر تن زنی مارے بود

چوں بدل خوانی زحق گیری سبق ☆ چوں بگل خوانی شماری بر ورق

﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلا یا دنیا میں، یعنی دنیا میں سب سے بڑا ناپاک اور نجس انسان خواہ وہ دنیا کے ظاہر کروفر کے اعتبار سے کتنا ہی باوقار ہو وہ شخص ہے جو اپنے خالق کی آیات کی تکذیب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا نہ احاطہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی شمار، ان کا حق تو یہ ہے کہ اپنے بدن کے بالوں سے زیادہ اس کا شکر بجالا یا جائے، چہ جائے کہ اس کی آیات کی تکذیب کی جائے، یہ تو بہت بڑی حماقت ہے۔اس جرم میں صرف بنی اسرائیل متہم نہیں، آج بے شمار نام نہاد مسلمانوں کا بھی یہی طریقہ رہا ہے جو ہمارے سامنے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا، ہاں! اگر کوئی توبہ کرے اور ہدایت کا طلبگار ہو تو پھر اسے ہدایت حاصل ہوسکتی ہے۔اہل کتاب کا یہ دعویٰ تھا: ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ [البقرة: ۱۱۱] (ہرگز کوئی بھی جنت نہیں جائے گا مگر وہ جو یہودی ہو، یا نصرانی ہو)۔اگلی آیت میں ان کی تردید کی ہے:

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ آپ فرمادیجئے: اے یہودیو! اگر تم دوسروں کے سوا اللہ تعالیٰ کے دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ صرف تم ہی جنت کے وارث ہو، تو بڑی اچھی بات ہے، تم لوگ موت کی تمنا کرو، دنیا کی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے جلدی اپنی جنت میں پہنچنے کی کوشش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص مرنے سے پہلے جنت نہیں جاسکتا، جنت تک پہنچنے کا راستہ صرف موت ہی ہے، تو آؤ موت کی تمنا کرو تا کہ تم جلدی جنت میں پہنچ جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں، یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ موت کے آنے کے بعد ہمارا ٹھکانہ جہنم ہی ہوگا۔فرمایا:

﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ یہ کبھی بھی موت کی خواہش نہیں کریں گے ان کاموں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں، ان کی سیاہ کاریاں ان کے سامنے ہیں، اور یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد انہیں جنت نصیب نہیں ہوگی، بلکہ یہ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے

کہ یہ یہود مشرکین سے بھی زیادہ زندگی پر حریص ہیں اور یہی چاہتے ہیں: ﴿لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ [البقرة:٩٦] (کاش انہیں ایک ہزار سال زندگی مل جائے)۔ یہ قدرتی بات ہے اور حقیقت ہے جو آدمی اپنے دعوے میں سچا ہوگا اور اپنی نیکیوں سے مطمئن ہوگا اور گناہوں سے پاک ہوگا وہ کبھی موت سے نہیں ڈرے گا، بلکہ موت کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھ کر اس کا استقبال کرے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی بنیاد پر موت سے محبت کی، اور جہادوں میں ہاتھ پاؤں اور سر کٹوائے، اور کہتے رہے کہ کیا اچھا ہوگا غدا نلق الأحبة محمدا و حزبه۔ کل ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے گروہ کے ساتھ جا ملیں گے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو تاریخی خط اپنے مدمقابل عراقی طاقت کو لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک موت اس قدر محبوب ہے جس قدر تمہارے نزدیک شراب اور رقص وسرود محبوب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو یہ دعا سکھائی اور اسے خود بھی پڑھتے رہے: اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ إِلٰى مَنْ يَعْلَمُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ۔ اے اللہ تعالیٰ موت کو اس شخص کے نزدیک پسندیدہ ٹھہرا دے جس کو یقین ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو خوب جانتا ہے، اور لوگ اپنی کرتوتوں کی وجہ سے موت سے خائف رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اچھی طرح جانتا ہے، اور انہیں ان کے اعمالِ بد کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔ ﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَإِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ﴾ آپ ان سے فرمایئے: بیشک جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ اتنا اٹل اور یقینی ہے جو ہر حال تم سے ملنے والی ہے، تم اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتے، دنیا کے بڑے بڑے ظالم وجابر بادشاہ جو اُلوہیت کے دعوے دار رہے ہیں، وہ بھی موت کی یلغار سے نہیں بچ سکے، تو عام لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ ﴿ثُمَّ تُرَدُّوْنَ إِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ پھر تم ظاہر و باطن کو جاننے والے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر وہ تمہیں بتلادے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے، پھر اسی کے مطابق وہ تمہیں بدلہ دے گا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے آذان دی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ لگاؤ، اور بیع وشراء کو چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۹ پھر جب نماز کی ادائیگی ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے تلاش کرو، اور اللہ تعالیٰ کو خوب زیادہ یاد کرو تاکہ تم فلاح پاجاؤ۱۰

معارف ومنازل

اس سورت مبارکہ کا نام سورۃ الجمعہ اسی لئے ہے کہ اس میں جمعہ کے مسائل بیان ہوئے ہیں، جمعے کے دن اور اس کی نماز کو دین اسلام میں بڑی فضیلت اور خصوصیت حاصل ہے، اس دن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی عبادت کے لیے مختص فرمایا ہے، اس دن کی بہت بڑی فضیلت ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، ان کا آخری دن یہی جمعے کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے اس دن کو عالم اسلام کے لئے اس لئے مختص فرمایا کہ یہود نے اس کی بجائے ہفتے کے دن کا انتخاب کیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا دن، اور مسلمانوں کے لئے جمعے کا دن منتخب ہوا، جیسے ماہ رمضان مہینوں کا سردار ہے اسی طرح جمعے کا دن ہفتہ کے دنوں کا سردار اور سید الایام ہے۔ جمعے کے دن کی فضیلت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی، اسی دن آپ کو جنت میں داخل کیا اور اسی دن جنت سے نکال کر خلافت ارضی کی خاطر اسے زمین پر اتارا، اور قیامت کا دن بھی جمعے کا دن ہوگا، اور جو شخص جمعے کو وفات پائے گا وہ قبر کے سوال وجواب سے آزاد رہے گا۔ [مشکوٰۃ]

آنحضرت ﷺ کو ایک آئینہ دکھایا گیا جس کے درمیان میں ایک نقطہ تھا، آپ ﷺ کو بتلایا گیا کہ یہ جمعہ ہے، جمعے کے دن میں ایک ایسی مبارک گھڑی آتی ہے کہ اس دوران ہر قسم کی مناجات اور دعا قبول ہوتی ہے، اگرچہ وہ ساعت کسی کو اسم اعظم کی طرح معلوم نہیں مگر راجح قول یہی ہے کہ وہ عصر ومغرب کے درمیان ہے۔ مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے سے لے کر نماز کے اختتام تک اس درمیان میں ہوتی ہے، مگر پہلا قول راجح ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی عصر ومغرب کے درمیان میں ہو، اور کبھی خطبہ ونماز کے درمیان میں، اور جو

شخص جمعے کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرتا ہے تو آئندہ جمعہ تک اس کے لئے نور ہوگا، جو اسے دنیا میں بھی امان میں رکھے گا، اور قیامت کے دن پل صراط پر عبور کرنے میں اس کا معاون رہے گا، اور دجال کے فتنے سے بھی اس کی حفاظت کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کا ہر وقت اہتمام کرنا چاہئے، مگر جمعہ کے دن خاص اہتمام کے ساتھ، سنن ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ مجھ پر ہر وقت درود پڑھا کرو، تمہارے درود مجھے پہنچ جائیں گے، لیکن جمعے کے دن خصوصیت کے ساتھ کثرت سے درود پڑھا کرو کہ اس کی خاص فضیلت ہے، نماز جمعہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ کام کاج چھوڑ کر، دو تین گھنٹہ پہلے مسجد میں آنا چاہئے جو سب سے پہلے مسجد میں آتا ہے اس کو اونٹ صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے، دوسرے نمبر پر آنے والے کے لیے گائے صدقہ کرنے کا ثواب ہوگا، تیسرے نمبر پر آنے والے کو بکرے کا ثواب ہوگا، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ مرغی اور انڈے تک کی فضیلت رہ جاتی ہے، یہ سب کچھ فرشتے لکھتے رہتے ہیں۔ جب امام منبر پر بیٹھ جاتا ہے تو فرشتے نام لکھنا بند کر دیتے ہیں، اور خطبہ سننے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعہ کے دن دو خطبے ہوتے ہیں، ان کے درمیان میں مختصر وقفہ بھی ہے، اور بغیر خطبہ کے نماز جمعہ بالکل صحیح نہیں ہوتی، اور خطبوں کے لئے شرط ہے کہ نماز سے پہلے ہوں اور عربی میں ہوں، کسی دوسری زبان میں خطبہ پڑھنا جائز نہیں، اور بیٹھ کر خطبہ دینا بھی جائز نہیں، چاہئے کہ امام کھڑے ہو کر خطبہ دیدے، دوران خطبہ لوگوں کو نفل اور سنت پڑھنے کی اجازت نہیں، بلکہ خطبہ کا سننا فرض ہے، چاہے مطلب سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اور اس دوران بات قطعاً حرام ہے۔

نمازِ جمعہ تمام مسلمان بالغ مردوں پر فرض ہے، البتہ عورتیں، مسافر، نابالغ، بیمار یا معذور ان لوگوں پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے، لیکن اگر یہ ادا کرلیں تو درست ہے، اور انہیں ظہر کی نماز پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کا خطبہ خاموشی کے ساتھ سنو، جو شخص خطبہ کے دوران بات کرتا ہے اس کی مثال گدھے کی ہے جو ابھی چند آیت پہلے گزرا: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ اس کی مثال اس گدھے کی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لادا ہوا ہے، اگر کوئی شخص کسی دوسرے بات کرنے والے شخص کو بول کر کہتا ہے کہ خاموش رہو تو اس کا جمعہ بھی باطل ہو جاتا ہے، یعنی جمعہ کی نماز کا مخصوص اجر و ثواب اس کو حاصل نہیں ہوگا، پس بہتر یہ ہے کہ انگلی منہ پر رکھ کر اشارہ سے اس کو سمجھائے کہ بات نہ کرو۔

نماز جمعہ کے لیے بہتر یہی ہے کہ مخصوص بڑی مسجدوں میں ادا کی جائے تاکہ مسلمانوں کا بڑا اجتماع دیکھنے میں آئے، ویسے تو ہر مسجد میں نماز جمعہ درست ہے، چاہے مسجد بڑی ہو یا چھوٹی، مگر جتنا اجتماع جہاں زیادہ ہوگا تو وہاں ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ نماز جمعہ کے لئے احناف کے نزدیک یہ شرط ہے کہ بڑے شہروں میں بڑی بستی اور قصبوں میں نماز جمعہ اور نماز عید کا اہتمام کیا جائے، جنگلوں، صحراؤں اور دیہات میں نماز جمعہ درست نہیں، اور یہی حکم نماز عید کا بھی ہے، باقی مسائل کتب فقہ میں دیکھیں۔ تو ارشاد فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾

اے ایمان والو! جس وقت آذان پکاری جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑو، اس دوڑ سے مراد بھاگنا نہیں ہے، بلکہ آرام کے ساتھ تیاری کر کے جانا مراد ہے، اور خرید و فروخت کا ترک کر دینا مقصود نہیں، بلکہ نماز کی تیاری کے اور اہتمام کے علاوہ تمام دیگر کاموں کو چھوڑ دینا مطلوب ہے۔ کھانا پینا گپ شپ لگانا کسی اور کام میں مصروف ہونا علاج و معالجہ کرنا غرض یہ ہے کہ تمام کاموں کو چھوڑنا چاہئے، صرف نماز کا اہتمام ہو اور بس۔

البتہ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آذان سے پہلی آذان مراد ہے یا دوسری آذان؟ جب امام خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھ جاتا ہے اس سلسلے میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس آذان سے دوسری آذان مراد ہے، اس کی توجیہہ یہ ہے کہ پہلی آذان نزول قرآن کے زمانے میں مروج نہ تھی، یہ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوئی، جبکہ مذکورہ حکم یعنی ترک بیع و شراء یہ نزول قرآن کے زمانہ کا ہے، تاہم دیگر امور کے علاوہ خرید و فروخت کی ممانعت پہلی آذان سے شروع ہو جاتی ہے، کیونکہ دونوں آذانوں کی علّت ایک ہی ہے، البتہ دوسری آذان یعنی خطبے والی کا حکم قطعی ہے، جبکہ پہلی آذان کا حکم ظنی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمعہ کی صرف ایک آذان ہوتی تھی، جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا، جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو نمازیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ اس خطبہ والی آذان کو نہ کوئی سن سکتا تھا نہ وہ آذان لوگوں تک پہنچ جاتی تھی، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بامرِ مجبوری مدینہ منورہ کے بازار کے وسط میں مقامِ زَورا پر پہلی آذان دینے کا حکم جاری کر دیا، مگر کسی صحابی نے اس پر اعتراض نہیں کیا، لہٰذا یہ آذان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاق سے شروع ہوئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میری اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کو لازم پکڑو، کیونکہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ [مشکوٰۃ]

اب پورے عالم اسلام میں پچاس سے زائد اسلامی ممالک میں نماز جمعہ سے پہلے دو آذانیں ہو جاتی ہیں، ان دونوں آذانوں کی مشروعیت میں چاروں ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے تمام مقلدین کا عمل جاری ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے آپ کو غیر مقلدین کہتے ہیں وہ چونکہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو ہدایت یافتہ نہیں مانتے، اور ان کے عمل کو واجب الاطاعت نہیں سمجھتے ہیں، جیسے کہ تراویح کی بیس رکعت کے، وہ اس لئے قائل نہیں کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے مشروع ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انہیں چاہئے کہ قرآن کریم کو بھی روافض کی طرح کتاب اللہ نہ مانیں، کیونکہ اسے بھی تو انہیں خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جمع کیا تھا، تو غیر مقلد ابھی بھی صرف دوم اذان پر اکتفاء کرتے ہیں، پہلی اذان کو نہیں مانتے، اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم پر تنقید کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو، اس بہتری سے مراد آخرت کی بہتری ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص دنیا کا نفع بخش کاروبار چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے نماز جمعہ کے لیے جلدی اور فوری طور پر حاضر ہوگا وہ نصیحت بھی سنے گا، اور مسلمانوں کے خیر و شر میں بھی شریک ہوگا، تو یہ چیزیں دنیا کے تمام فوائد سے بلند و بالاتر ہوں گی، پھر ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ اور جب نماز پوری کر لی جائے تو نماز کی ادائے گی کے بعد زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ زمین میں پھیلنے کا مطلب یہ ہے کہ اذان سنتے ہی جو کاروبار چھوڑ گئے تھے اب نماز کے بعد دوبارہ اسی کام میں لگ جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے مراد یہی اسباب معیشت ہیں خواہ تجارت کی صورت میں ہوں، خواہ ملازمت کی صورت میں، اور خواہ زراعت کی صورت میں۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نماز جمعہ کے لئے کاروبار چھوڑ گئے تھے اور ادائے گی نماز کے بعد دوبارہ کاروبار میں لگ گئے تو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے غافل رہو، تجارت، زراعت اور ملازمت کے باوجود ہر لحہ ذکر اللہ میں مصروف رہو، یہی بندگی کی شان ہے، اور اسی میں تمہاری فلاح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والی چیزوں میں ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے، ذاکرین سے اللہ تعالیٰ راضی ہو کر انہیں عذاب سے بری کر دیتا ہے۔

پسندیدہ کلمات ذکر کے سلسلے میں یہی چار ہیں: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر۔ اس کی تفصیل

پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بازار میں داخل ہوا اور اس نے یہ کلمات پڑھے: لا إله إلا الله وحده لا شريک له، له الملک وله الحمد يحي ويميت وهو حيٌ لا يموت، بيده الخير، وهو على كل شيء قدير۔ تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ دس لاکھ نیکیاں لکھ دیں گے، اور دس لاکھ گناہ معاف فرمادیں گے، اور دس لاکھ درجے بلند فرمائیں گے، اور اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادیں گے۔ [ترمذي وابن ماجة]

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿١١﴾

ترجمہ: اور جب وہ کسی تجارت یا لہو کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ جاتے ہیں، اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ ایسے لہو اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے ﴿١١﴾

معارف ومسائل

اس آیت کے نزول کے متعلق یہ روایت موجود ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز جمعہ پڑھ رہے تھے اچانک مدینہ منورہ میں اونٹوں کا ایک قافلہ آگیا جن پر کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا، جب حاضرین کے کانوں میں قافلہ والوں کی آواز پڑگئی تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے، اور بے سوچے سمجھے بازار کی طرف روانہ ہوگئے، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بارہ (۱۲) آدمی رہ گئے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوگئی۔ [بخاري: ص ١٢٨]

اور صحیح مسلم میں اس روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے تھے، چونکہ جمعہ کا خطبہ بھی نماز کے حکم میں ہے، اس لئے کسی راوی نے خطبہ پڑھنے کو نماز پڑھنے سے تعبیر کردیا۔ صحیح مسلم میں یہ بھی ہے کہ جو بارہ (۱۲) افراد رہ گئے تھے ان میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ مراسیل ابوداؤد صفحہ نمبر ۷ میں مقاتل ابن حیان سے نقل کیا کہ پہلے یہ طریقہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عیدین کی طرح جمعہ کا خطبہ

بھی نماز کے بعد دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر خطبہ میں مشغول تھے کہ ایک شخص اندر مسجد میں آیا اور اس نے کہا کہ دحیہ ابن خلیفہ کلبی اپنی تجارت کا سامان لے کر مدینہ پہنچ گیا ہے (دحیہ اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے) جب وہ باہر سے تجارت کا سامان لے کر آتے تھے تو ان کے گھر والے دف بجا کر استقبال کیا کرتے تھے، اس وقت جو لوگ خطبہ سن رہے تھے انہوں نے یہ سمجھا کہ خطبہ چھوڑ کر مسجد سے باہر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی خیال کے مطابق وہ مسجد سے باہر نکل گئے، اس پر اس آیت کریمہ کا نزول ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بعد جمعہ کے خطبہ کو نماز سے مقدم کر دیا، اور نماز سے پہلے خطبہ پڑھا جانے لگا جو کہ ابھی بھی معمول بہا ہے۔

مراسیل ابوداؤد کی روایت بالا سے معلوم ہوا کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس موقع پر مسجد سے باہر نکل گئے تھے انہوں نے یہ خیال کر لیا تھا کہ نماز تو ہو ہی گئی ہے، خطبہ نماز کا جزء نہیں ہے وہ نصیحت کی باتیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتے ہی رہتے ہیں، اس لئے خطبہ چھوڑ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، ان کی یہ اجتہادی غلطی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش فرمائی، اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ تجارت کو دیکھتے ہیں یا کسی لہو کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چل دیتے ہیں، اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔

معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ لہو سے طبل مراد ہے یعنی ڈول (جسے مراسیل ابوداؤد میں دف بتایا ہے)۔

معالم التنزیل میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ مسجد میں کتنے لوگ رہ گئے؟ عرض کیا گیا کہ بارہ مرد اور ایک عورت باقی رہ گئی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ بھی باقی نہ رہتے تو ان پر آسمان سے پتھر برسا دیئے جاتے (اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے)۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم سب یکے بعد دیگرے چلے جاتے اور کوئی بھی مسجد میں نہ رہتا تو یہ وادی آگ بن کر بہہ پڑتی۔

بات یہ ہے کہ وہ زمانہ خوراک کی کمی کا بھی تھا، اور بھاؤ کے مہنگے ہونے کا بھی، دحیہ ابن خلیفہ تجارت کا سامان لے کر آئے جس میں کھانے پینے کی چیزیں بھی تھیں، اس ڈر سے کہ ممکن ہے کہ دوسرے لوگ جلدی میں سب کچھ خرید کر لے جائیں اور ہم کو کچھ بھی نہ ملے اس خوف سے مسجد والے مسجد سے نکل گئے، ایک تو چیزوں کی نایابی کا زمانہ تھا، دوسرے انہوں نے یہ سمجھا کہ نماز کے بعد خطبہ چھوڑ جانے میں کوئی گناہ نہیں ہے، اور مال کو جلدی خریدنے میں یہودی اور منافق پیش پیش رہتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے لئے کچھ نہ بچے، اگر معاملہ کی ساری صورت حال سامنے رکھی

جائے تو بات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن چونکہ غلطی غلطی ہوتی ہے، اسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے تنبیہ فرمادی، فرمایا:

﴿وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَۃً اَوۡ لَہۡوَاۨ انۡفَضُّوۡۤا اِلَیۡہَا وَ تَرَکُوۡکَ قَآئِمًا﴾ اور یہ لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں، اور آپ کو خطبہ دیتے ہوئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ﴿قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ مِّنَ اللَّہۡوِ وَ مِنَ التِّجَارَۃِ﴾ آپ ان خطبہ چھوڑ کر چلے جانے والوں سے کہہ دیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ تجارت اور کھیل وکود سے بہتر ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

سُورَةُ الْمُنٰفِقُون

مدنيةٌ آياتها ۱۱ رکوعاتها ۲

سورۂ منافقون مدنی ہے، اس میں گیارہ (۱۱) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ المنافقون ہے، اس سورت کی پہلی آیت میں یہ لفظ موجود ہے یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۶۳ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول ۱۰۴ نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مدنی زندگی میں نازل ہوئی، اس کا نزول سورۃ الحج کے بعد ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں دو (۲) رکوع، گیارہ (۱۱) آیات، اور ایک سو تراسی (۱۸۳) کلمات، اور آٹھ سو اکیس (۸۲۱) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر تھا، اور آپ کے ماننے والوں کا ذکر تھا، اس سورت میں منافقوں کا ذکر ہے جو زبان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے تھے مگر دل سے نہیں مانتے تھے، اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ سورت میں فرمانبرداروں کا بیان تھا، اور اس سورت میں نافرمانوں کا بیان ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں منافقوں کی خباثت، مؤمنین کی دیانت وامانت، فرائض اہل دولت، ترغیب انفاق فی سبیل اللہ، صداقت رسالت، اثباتِ قیامت کا بیان اور منافقین اور مؤمنین کے انجام ونتائج کا بیان ہے۔

فائدہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۃ الجمعہ پڑھتے، ایمانداروں کو بیدار اور ہوشیار کرنے کے لیے، اور دوسری رکعت میں سورۃ المنافقون پڑھتے تھے، منافقوں کی سرزنش کے لیے۔ [روح المعاني: ج۲۸]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشۡهَدُ
اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ ۚ‏ ۱ اِتَّخَذُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ جُنَّةً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا
يَعۡمَلُوۡنَ ۲ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُوۡنَ ۳ وَاِذَا رَاَيۡتَهُمۡ
تُعۡجِبُكَ اَجۡسَامُهُمۡ ؕ وَاِنۡ يَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِهِمۡ ؕ كَاَنَّهُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحۡسَبُوۡنَ كُلَّ
صَيۡحَةٍ عَلَيۡهِمۡ ؕ هُمُ الۡعَدُوُّ فَاحۡذَرۡهُمۡ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ۴

ترجمہ: جب منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بیشک آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں ۱ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا، سو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا، بیشک یہ لوگ جو کرتے ہیں برا عمل کرتے ہیں ۲ یہ اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر ان کے دلوں پر مہر ماردی گئی، لہٰذا وہ نہیں سمجھتے ۳ اور جب آپ انہیں دیکھیں گے تو ان کے جسم آپ کو اچھے معلوم ہوں گے، اور اگر وہ باتیں کرنے لگیں گے تو آپ ان کی بات سننے کی طرف دھیان دیں گے، گویا کہ وہ لکڑیاں ہیں جو ٹیک لگا کر رکھ دی گئیں ہیں، وہ ہر چیخ کو اپنے اوپر خیال کرتے ہیں کہ یہ دشمن ہی ہیں، سو آپ ان سے ہوشیار رہیے، اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے، کہاں پھرے جارہے ہیں؟ ۴

معارف ومنازل

بخاری شریف، ترمذی شریف اور بعض دوسری کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ بنی المصطلق کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے باہر سفر پر تھے، راستے میں ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان غالباً پانی کے معاملے میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا، جس کے نتیجے میں مہاجر نے انصاری بھائی کو کچھ مارا اور پیٹا، چنانچہ انصاری نے مدد کے لئے انصار کو پکارا، تو مہاجر نے مہاجرین کو بلا لیا، انصاری رئیس المنافقین عبداللہ ابن اُبی ابن سلول کے خاندان کا آدمی تھا، اس نے اس واقعہ کو خوب اچھالا، اور مہاجرین کے متعلق کہا کہ ہم واپس مدینہ پہنچ کر ان ذلیل لوگوں کو شہر سے نکال دیں گے۔

یہ باتیں ایک کمسن صحابی زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ نے سن لیں اور اپنے چچا کے سامنے بیان کر دیں، چچا نے یہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت عرض کیں، آپ نے عبداللہ ابن ابی کو طلب کر کے اس واقعہ کی تصدیق چاہی، مگر وہ منافق صاف مکر گیا کہ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی قسموں پر اعتبار کرتے ہوئے حضرت زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ کو ملامت کی، کیونکہ وہ اپنی بات ثابت نہیں کر سکے تھے، کیونکہ ان کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا، اور یہ اصول ہے کہ مدّعی کا دعویٰ بغیر گواہ کے ثابت نہیں ہوتا۔ زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ کو ان کے چچا نے بھی ملامت کی کہ تم نے ایسی بات کر کے ہمیں شرمسار کیا ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے مذکورہ باتیں اپنے کانوں سے سنی تھیں، مگر ثابت نہ کر سکنے پر سخت پریشان ہوا، بیان کرتے ہیں کہ دورانِ سفرات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس سے گزرے تو میرا کان مروڑا، اور مسکرائے اور پھر آگے چل دیئے، پیچھے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجھ سے کیا بات کی؟ میں نے کہا: بات تو کچھ نہیں ہوئی البتہ میرا کان مروڑا اور مسکرا کر آگے نکل گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: زید تمہیں خوشخبری ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی گزر ہوا، تو انہوں نے بھی مجھ سے وہی سوال کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، اور میں نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، پھر انہوں نے بھی مجھے بشارت دی۔

اس کے بعد صبح کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پاس بلا کر ارشاد فرمایا: زید! اللہ تعالیٰ نے تمہاری تصدیق کے لئے قرآن حکیم میں سورت نازل فرمائی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سورت مجھے پڑھ کر سنائی۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کان کو ہاتھ لگایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تھے تو اس وقت مجھے اس قدر راحت حاصل ہوئی کہ اس کے مقابلے میں ساری دنیا بھی ہیچ ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے ذریعے منافقوں کی برائیوں کو ظاہر کر دیا تا کہ سچے مسلمان ان سے بچ سکیں۔

سورۃ المنافقون میں منافقین کی قباحت، ان کی سازش، ان کی دورخی اور ان کی بزدلی کا بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں منافقوں کی بداعمالیوں کی قلعی کھول دی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنوں کو ان کی شرارتوں، سازشوں اور خباثتوں سے آگاہ کیا ہے۔ اس سورت کے علاوہ سورۃ البقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، سورۃ المائدہ، سورۃ الاعراف، سورۃ التوبہ، سورۃ الاحزاب اور دیگر بہت سی سورتوں میں بھی منافقوں کا حال بیان ہوا ہے۔

نفاق کی دو قسمیں ہیں: ایک اعتقادی نفاق، اور دوسرا عملی نفاق، جن منافقوں کا ذکر اس سورت میں آرہا ہے یا دیگر سورتوں میں ہوا ہے وہ منافقین کی اعتقادی قسم ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں زیادہ تر اعتقادی منافق تھے، جنہوں نے زبان سے تو کلمہ پڑھا مگر دل سے اسلام کو انہوں نے قبول نہ کیا، سب سے پہلے ان کا بیان سورۃ البقرہ کے شروع میں ہوا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرة:۸] (اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ایمان لایا ہے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالانکہ وہ مؤمن نہیں ہیں)۔

تیرہ آیتوں میں منافقین کی بے ایمانی، مکر وفریب، دھوکہ اور دغابازی کا مکمل بیان ہوا۔ دراصل اعتقادی منافق کافروں کی ایک قسم ہے جو کہ کافروں سے زیادہ خطرناک ہے، اور کافروں کی بنسبت ان کی سزا بہت زیادہ سخت ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ۱۴۵] (بیشک منافق آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے)۔

منافقین کی دوسری قسم عملی منافقوں کی ہے، جن سے دنیا بھری پڑی ہے، یہ عمل کے طور پر منافق کہلاتے ہیں کہ ان میں خصلت منافقوں کا موجود ہے، مگر عقیدہ کے اعتبار سے یہ کافر نہیں ہیں، کیونکہ ان کا ظاہر و باطن دونوں مسلمانوں جیسا ہے، لہٰذا یہ مسلمان کہلاتے ہیں، مگر ان میں منافق کی خصلت موجود ہے۔ منافقوں کی خصلتیں چار ہیں: نمبر ایک جھوٹ بولنا، نمبر دو وعدہ خلافی کرنا، نمبر تین امانت میں خیانت کرنا، اور نمبر چار یہ ہے کہ معمولی باتوں پر بدزبانی کر کے جھگڑا کرنا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ اے پیغمبر! جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک البتہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا (یہ جملہ معترضہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بیشک آپ البتہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ منافقین البتہ جھوٹے ہیں، کیونکہ وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتے ہیں، اور نہ آپ کی رسالت پر یقین رکھتے ہیں، وہ زبان سے بہت کچھ میٹھی میٹھی باتیں کہہ رہے ہیں مگر ان کے دلوں میں تو کفر ہی بھرا ہوا ہے، یہ اعتقادی منافق ہیں جو کہ کافروں سے بدتر ہیں، اسی کی اللہ تعالیٰ خود گواہی دے رہے ہیں، ان کے دل اور زبانیں متضاد ہیں، یہ مال غنیمت اور اپنے تحفظ کی خاطر ایمان کا اقرار کر رہے ہیں، وہ اس لئے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ان لوگوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، قسمیں اٹھا کر اہل ایمان کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم تمہاری طرح سچے مسلمان ہیں، گویا ان قسموں سے وہ مسلمانوں کی طرف سے کسی ممکنہ کارروائی کو ٹالتے ہوئے اپنی قسموں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں، نئے مسلمان ہونے والوں کو اسلام سے متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ بیشک یہ بہت ہی برا کام ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں، یہ ہر زمانہ میں دستور ہے کہ لوگ اپنے تحفظ اور براءت کی خاطر اور اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی خاطر لمبی چوڑی قسمیں کھاتے ہیں، اور یہ قدرتی بات ہے کہ مجرم اور ملامت انسان اپنے بچاؤ کے لیے طرح کی قسمیں کھاتا ہے، اور کبھی کبھار حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے روتا ہے اور نوحہ خوانی بھی کرتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ ان کی یہ کارگزاری اس وجہ سے ہے کہ پہلے انہوں نے ایمان کا اظہار کیا اور پھر کفر کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، اب ان کے دلوں میں ایمان وصداقت نیکی اور حق کبھی سرایت نہیں کر سکتا، گویا کہ انہوں نے فطری استعداد کو ضائع کر کے ہمیشہ کے لئے کفر اپنایا، پس یہ سمجھتے ہی نہیں۔

﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ﴾ جب آپ ان کی طرف دیکھیں گے تو ان کے جسم آپ کو بڑے اچھے معمول ہوں گے، ان کی ظاہری ڈیل ڈول اور وضع قطع ٹھیک ٹھاک متاثر کن ہے۔ دراصل یہ سارے خوبصورت

لوگ ہوتے تھے مگر اندران کا دل سیاہ ہوتا تھا۔

﴿وَاِنۡ يَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِهِمۡ﴾ اوران کی بات چیت بھی ایسی ہے کہ آپ کوفوراً اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے، یہ عجیب خوش لسانی میں بات کرنے والے لوگ ہوتے تھے، ان کا طرز بیان بڑا عجیب ومسحور کن ہوتا تھا، وہ باتوں باتوں میں ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے، مگر حقیقت میں یہ لوگ بڑے مکار ہوتے تھے۔ فرمایا: ان کی مثال ایسی ہے: ﴿كَاَنَّهُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ﴾ گویا وہ ایک لکڑی ہیں جسے دیوار کے سہارے کھڑا کردیا گیا ہو، وہ لوگ عقیدے اور ایمان کے لحاظ سے باطن میں اس قدر کھوکھلے اور بے مغز ہوتے تھے کہ بغیر سہارے کے کھڑا بھی نہیں ہوسکتے، ان کا سہارا یہی قسمیں کھانا، رونا، نوحہ کرنا اور منت وزاری کرنا ہیں، انہی چیزوں پر ان کا گزراوقات ہوتا تھا۔

امام بخاری نے لکھا ہے: کانوا رجالاً أجمل شيءِ۔ یہ لوگ شکل وصورت کے لحاظ سے خوبصورت تھے، مگر باطن کے لحاظ سے سیاہ اور کالے تھے۔ ایسے لوگوں کی آج ہمارے معاشرے میں بھی کوئی کمی نہیں ہے، بہت سارے وضع قطع میں خوشنما خوش لباس اور خوش گفتار جنہیں لوگ دیکھ کر ہش ہش کر اور واہ واہ کرتے ہیں، مگر قریبی تعلقات رکھنے کے بعد وہ انسان کتوں سے بھی بدتر معلوم ہوتا ہے۔ آگے منافقوں کی بزدلی کا بیان ہے۔

﴿يَحۡسَبُوۡنَ كُلَّ صَيۡحَةٍ عَلَيۡهِمۡ﴾ وہ ہر چیز کو اپنے خلاف ہی گمان کرتے ہیں۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے منافقوں کو ہر وقت خوف رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کوئی سورت نازل کرکے ان کا سب کچھ نہ کھول دے، مسلمانوں کو تو وہ بظاہر دھوکہ دیتے رہتے تھے، لیکن ان کو مسلسل ڈر لگتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کوئی سورت یا آیت نازل کرکے ان کا مکروفریب اور جھوٹ وخیانت کا پردہ کھول نہ دے۔ ﴿هُمُ الۡعَدُوُّ فَاحۡذَرۡهُمۡ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ﴾ یہ مسلمانوں کے پکے دشمن ہیں، لہٰذا ان سے بچتے رہو، اللہ تعالیٰ ان کو غارت کرے کہ یہ کدھر پھرے جارہے ہیں؟ نہ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، اور نہ ان کا کوئی عہد وپیمان ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے منافقوں کی کچھ علامات بیان کی ہیں جن سے ان کو پہچاننا آسان ہے، فرمایا: میل وملاقات کے وقت ان کی زبان پر برائی ہی ہوتی ہے، ان کا کھانا لوٹ مار اور چوری کا ہوتا ہے، یعنی حلال نہیں ہوتا ہے، وہ مال غنیمت میں خیانت کرتے ہیں، نماز کے لئے مساجد کی طرف نہیں آتے ہیں، بلکہ نماز ہوچکنے کے بعد محض نمازیوں میں نام لکھوانے کے لئے آتے ہیں، جماعت کا خیال نہیں کرتے، نماز کی فکر نہیں ہوتی، غرور میں مبتلا ہوتے ہیں، بھائی بندوں سے الفت نہیں ہوتی، رات کو خشک لکڑی کی

طرح سوئے رہتے ہیں، اور دن کے وقت شور وشرابہ کرتے ہیں۔ [مسند أحمد]

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝٥ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝٦ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا ۗ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝٧ يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝٨

ترجمہ: اور جب ان سے کہا گیا کہ آجاؤ اللہ تعالیٰ کا رسول تمہارے لئے استغفار کرے، تو وہ اپنے سروں کو موڑ لیتے ہیں، اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ وہ تکبر کرتے ہوئے بے رخی کر رہے ہیں ۝٥ برابر ہے کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں، بلا شبہ اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا، بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا فاسقوں کو ۝٦ یہ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں خزانے آسمانوں میں اور زمین کے، لیکن منافقین نہیں سمجھتے ۝٧ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس ہو گئے تو عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا، اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے عزت اور رسول کے لیے اور مؤمنین کے لئے، لیکن منافقین نہیں جانتے ۝٨

معارف ومنازل

معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ جب عبد اللہ ابن ابی منافق کے بارے میں آیتِ قرآنیہ نازل ہوگئی جس سے ان کا جھوٹا ہونا اور حضرت زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ کا سچا ہونا ثابت ہوگیا تو اس سے کسی نے کہا کہ دیکھو تمہارے بارے میں کیسی سخت بات نازل ہوئی ہے، اگر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا کہ وہ تیرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تاکہ تمہارا یہ گناہ معاف ہو جائے، اس پر اس نے انکار کرتے ہوئے اپنے سر کو حرکت دی اور کہنے لگا کہ تم لوگوں نے مجھ سے ایمان لانے کو کہا تو میں ایمان لے آیا، تم لوگوں نے زکوۃ دینے کے لئے کہا تو میں نے زکوۃ بھی

دیدی، اب اتنی سی بات رہ گئی ہے کہ محمد رسول اللہ کو سجدہ کرلوں! اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ﴾ اور جب کہا گیا کہ آجاؤ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ تمہارے لئے استغفار کریں تو انکار کرتے ہوئے اپنے سروں کو پھیر دیتے ہیں اور تکبر کرتے ہوئے بے رخی اختیار کر لیتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ﴿لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے: حركوا رؤوسهم استزؤوا بالنبي ﷺ۔ کہ یہ لوگ سر کو حرکت دیتے ہیں اور یہ حرکت دینا اس انداز میں ہوتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا مذاق اڑانا ان کا مقصود ہوتا ہے۔ ﴿وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴾ اور آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین میں آنے سے روکتے ہیں، اور وہ غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور بعض بدبخت تو صاف طور پر یہ کہہ دیتے تھے کہ ہمیں دعا و استغفار کرانے اور خدا تعالیٰ سے معافی طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے:

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل ☆ کہ خضر از آب حیوان تشنہ لب آرد سکندر را

آنحضرت ﷺ کی دعا وہ لازوال اور عظیم سرمایہ ہے جس کی مثال نہیں، اگر کسی کو نصیب ہو جائے تو زہے سعادت! آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے خوش قسمت لوگ تھے جن کے لئے صبح شام آپ کی دعائیں ہوتی تھیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرے لئے ایک رات میں پچیس ۲۵ مرتبہ دعا مانگی، اسی طرح دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی حال ہوتا تھا کہ ان کی پریشانیاں آپ کی دعاؤں سے دور ہو جاتی تھیں، اور وہ آپ کی دعاؤں کے لئے ترستے تھے، جبکہ منافقوں کی قسمت میں جب ایمان نہیں ہوتا تھا تو پیغمبر کی دعاؤں کی انہیں کیا ضرورت محسوس ہوتی، ازلی شقاوت نے سوائے محرومی کے کسی کو کچھ نہیں دیا، اسی لئے فرمایا:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ ان کے لئے برابر ہے آپ ان کے لئے بخشش کی دعا کریں یا نہ کریں، اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ سورۂ توبہ میں ارشاد فرمایا تھا: ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾[التوبة:۸۰] (آپ اگر ان کے لئے ستر مرتبہ بخشش کی دعا کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھاتا،

خاص کر ایسے لوگوں کو جنہیں ہدایت سے نفرت ہو۔

اگلی آیتوں کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ اسی غزوۂ بنی مصطلق کے سفر کے دوران منافقین نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم خواہ مخواہ مہاجرین کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، یہ ہمارے گلے پڑ گئے ہیں، اگر ہم ان سے ہاتھ روک کر ان کا پانی دانہ بند کر دیں تو یہ منتشر ہو جائیں گے، ان سے ہماری ہمیشہ کے لئے جان خلاصی ہو گی، اللہ تعالیٰ نے اسی کو فرمایا:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا﴾ یہ وہی منافق لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ کے رسول کے پاس بیٹھے ہیں تا کہ یہ متفرق ہو جائیں، ادھر ادھر چلے جائیں تا کہ ان سے ہماری ہمیشہ کے لئے جان خلاصی ہو جائے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات پر ان کی مذمت فرمائی کہ تم کون ہو ان پر خرچ کرنے والے؟ تمہارے پاس جو کچھ مال ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، وہ جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عطا کر دے، اس کی حکمت میں کسی کو دخل اندازی کی گنجائش نہیں ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، اس کی ملکیت ہیں، اس کے لئے بہت آسان ہے کہ تم سے یہ مال چھین لے اور کسی اور قوم کو عطا کر دے، پس وہ اس کے حکم کے مطابق خرچ کر دے، مگر منافق اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، ورنہ وہ خرچ کرنے میں بخل نہ کرتے، اور کسی کو عار نہ دلاتے، اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾[محمد:۳۸] (اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ بدل دے گا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو، پھر وہ تمہاری نہیں ہوں گے)، اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ کسی بے عمل قوم کو ختم کر دے، اور اس کی جگہ ایک ایسی قوم کو پیدا کر دے جو اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، فرمایا:

﴿يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ وہ کہتے ہیں جب ہم مدینہ کی طرف واپس لوٹیں گے تو ہم میں سے عزت والے ان ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے۔ منافق چونکہ مدینہ کے پرانے باشندے تھے اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو عزت والا قرار دیا، اور مہاجرین کے لئے ذلیل کا لفظ استعمال کیا، تو رئیس المنافقین کے کہنے پر اس کے حواریوں نے یہ کہا کہ یہ مہاجرین باہر سے آئے ہوئے ہیں انہوں

نے ہماری معیشت کو خراب کر دی ہے، ہم ان کو اپنے شہر مدینہ میں نہیں رہنے دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے برحق فرمایا: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ [الروم:۱۹] (اللہ تعالیٰ وہ قادر مطلق ذات ہے کہ مردوں سے زندوں کو اور زندوں سے مردوں کو پیدا کرتا ہے) اس کی ایک مثال یہ ہے کہ رئیس المنافقین کا بیٹا جس کا نام بھی عبداللہ ہے اس کا شمار جان نثار صحابہ میں ہوتا تھا، جب اس نے اپنے باپ کا یہ غلط مشورہ سنا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی تلوار سے اپنے باپ کا سر اتار کر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں، جس نے ایسے غلط کلمات کہے ہیں، آپ ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

پھر وہاں سے چل کر اپنے باپ کے پاس پہنچے، اور منافقوں کی محفل میں اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو تو مدینہ میں واپس نہیں جا سکتا جب تک اس محفل میں بلند آواز سے تین مرتبہ یہ اقرار کر لو کہ میں ذلیل ہوں، ذلیل ہوں، ذلیل ہوں، اور اللہ کے رسول ﷺ اور اس کے سارے صحابہ کرام عزّت والے ہیں، چنانچہ وہ مجبور ہوا سب کے سامنے تین مرتبہ یہی اقرار کیا کہ ذلیل میں ہوں اور میرے ساتھی ہیں، اور صحابہ کرام سارے عزّت والے ہیں، تب بیٹے نے اس کو مدینہ منورہ آنے کی اجازت دیدی۔ [درمنثور]

اور وہ کلمات یہ ہیں: واللہ إني ذليل ورسول الله وأصحابه عزيز۔

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ اصل میں عزّت تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور عام مؤمنوں کے لیے ہے، اصل عزّت تو اللہ تعالیٰ کی ہے جو کمال قدرت اور کمال قوت اور کمال تصرف کا مالک ہے، اور پھر اس کے رسول ﷺ کی جو اس کا نائب ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو نافذ کرنے والے ہیں، اور خلق خدا کو گمراہی اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لانے والے ہیں، اور اس کے بعد ایمانداروں کا نمبر ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں، اور قرآن کریم کے پروگرام کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں، اور اسے سارے جہاں میں پھیلاتے ہیں۔

عزّت کا دراصل معیار مال و دولت نہیں ہے، بلکہ عزّت کا معیار تو دین، ایمان، اخلاق اور اچھے کردار ہیں، جس میں یہ چیزیں موجود ہوں وہی عزّت کا مالک ہے، اور جو شخص برے اخلاق، برے اعمال ہی انجام دیتا ہے، اور برا عقیدہ رکھتا ہے وہ کبھی باعزّت نہیں ہو سکتا، وہ تو ذلیل ہی ہوگا، اگرچہ سونے اور جواہرات کے کارخانے کا مالک ہو۔

﴿وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ مگر منافقین اس بات کی سمجھ ہی نہیں رکھتے، وہ تو مال اور دولت کو عزّت سمجھتے ہیں، یہ ان کی نادانی ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف وکرامت اور عزّت ووقار کا معیار ایمان اور تقویٰ ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان جو نانِ شبینہ کا محتاج ہو وہ ان ہزاروں لوگوں سے بہتر ہے جن کے پاس دنیا کا اقتدار بھی ہو، اور مال بھی ہو، مگر وہ ایمان اور تقویٰ سے خالی ہوں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ
الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰
وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے اموال اور اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کردیں، اور جو شخص ایسا کرے گا سو یہ لوگ وہ ہیں جو نقصان میں پڑنے والے ہیں۝۹ اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تمہیں موت آجائے، سو وہ کہے گا کہ اے میرے ربّ! آپ نے تھوڑی مدت کے لئے مجھے کیوں مہلت نہ دی؟ میں صدقہ کرتا اور صالحین میں سے ہوجاتا۝۱۰ اور اللہ تعالیٰ ہرگز کسی جان کو مہلت نہ دے گا جب اس کی اجل آجائے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے باخبر ہے۝۱۱

معارف ومنازل

دنیا میں مال اور اولاد دو ایسی چیزیں ہیں جن میں مشغول ہوکر انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے، فرائض اور واجبات کو چھوڑنا، نوافل واذکار سے دور رہنا، زبان سے دنیاوی دھندوں میں پھسار ہنا یہ سب امور ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والے ہیں، آدمی مال کمانے میں لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے، اولاد کو مالدار بنانے کے لئے، اور موت کے بعد بہت سا مال چھوڑنے کے لئے کمائی کرتا ہے، حلال وحرام کا خیال نہیں کرتا، زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، واجباتِ شرعیہ میں خرچ نہیں کرتا، اگر کوئی شخص حلال مال ہی کمائے تب بھی کمانے کا

انہماک اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے، پھر اولاد کے غیر ضروری اخراجات، غیر ضروری پیار ومحبت اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو گناہ پر لگاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتی ہیں۔ اس لئے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ اے ایمان والو! تمہارے اموال اور اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت میں نہ ڈال دیں۔ ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ اور جو کوئی ایسا کرے گا، احکام شریعت کو پس پشت ڈال کر زندگی کے لمحات کو صرف مال و دولت کے جمع کرنے میں لگا دے گا پس یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں، اور وہ بڑے بے سمجھ ہیں جو باقی زندگی پر فانی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر مال و اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر امت کا کوئی نہ کوئی فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ [رواه الترمذي]

بہر حال! طالب آخرت فائدہ میں رہے گا، اور طالب دنیا خسارہ میں رہے گا، چونکہ طالب دنیا اس لئے بھی خسارہ میں رہا کہ وہ دنیا کا طلبگار رہا، اور اس کے خسارے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بخل میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا میں اور امور خیر میں مال خرچ نہیں کرتا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ میں رہے گا۔ اس لئے آگے فرمایا:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو، تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جسے عارضی طور پر چند روز کے لئے تمہارے ہاتھ میں دیدیا، اور تمہیں مالک بنا دیا، حقیقت میں تمہارے اموال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، بلکہ وہ تمہاری جانوں کا بھی مالک ہے، خرچ کرو اس کی راہ میں پہلے اس سے کہ تم میں سے کسی پر موت وارد ہو جائے۔

﴿فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ پھر وہ یوں کہے کہ اے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی مزید مدت کے لئے مہلت کیوں نہیں دی؟ تاکہ میں صدقہ و خیرات اور ذکر و عبادت کر کے تیرے نیک بندوں میں شامل ہو جاتا۔ مگر یہ یاد رکھو:

﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ فرمایا: اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں مہلت دے گا کسی جان کو، جبکہ اس کے وعدے کا وقت آن پہنچا، اور دفتر بالا سے موت کا پروانہ جاری ہوا، کیا وہ ساٹھ ستر سالہ زندگی اور اسی نوے سالہ عمر جو تمہیں عطاء کی گئی تھی وہ صدقات و حسنات کے لیے کافی نہیں تھی؟ جو مزید مہلت مانگ رہے ہو، جو لوگ خبردار رہتے

ہیں عقل وسوچ سے کام لیتے ہیں وہ مختصر عمر میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتے ہیں، پھر انہیں مزید مہلت مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اور جو لوگ عقل وسوچ سے عاری ہوتے ہیں وہ سو سالہ زندگی میں بھی اس مقام تک نہیں پہنچتے ہیں جہاں انہیں پہنچنا چاہئے تھا، پھر وہ کس منہ سے خیرات وصدقات کے لئے مزید مہلت مانگتے ہیں جو کہ ناممکن ہے؟

بالفرض اگر ان کو مہلت مل بھی جائے تو یہ مہلت کے اوقات کو بھی اسی طرح غفلت میں اور لہو ولعب میں گزاریں گے جو مہلت سے پہلے اصلی عمر کو غفلت میں گزارا تھا، اور جو مہلت مانگتے ہیں وہ اپنی مہلت مانگنے کی طلب میں جھوٹے ہیں۔﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں کی پوری طرح خبر رکھتا ہے جو تم انجام دیتے ہو، پس قیامت کے روز اچھے لوگوں کو بہتر جزاء اور برے لوگوں کو ان کی برائیوں کا بدلہ مل جائے گا، اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔

سُورَۃُ التَّغابُن

مدنیۃٌ آیاتھا ۱۸ رکوعاتھا ۲

سورۂ تغابن مدنی ہے، اس میں اٹھارہ (۱۸) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ التغابن ہے، یہ لفظ اس سورت کی نویں آیت میں موجود ہے، یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۶۴ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۱۰۸ نمبر پر ہے۔

نزول:

حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں سورۃ التحریم کے بعد نازل ہوئی، تاہم کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ اس کی کچھ آیات مکی ہیں اور کچھ مدنی ہیں۔

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں دو رکوع، اٹھارہ آیات، ۲۴۷ کلمات اور ۱۱۳۲ حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں منافقوں کا بیان تھا، جو اصولِ ثلاثہ کے منکر تھے، اس سورت میں اصولِ ثلاثہ توحید و رسالت اور قیامت کا بیان وتذکرہ ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

آیاتِ نفسی اور آفاقی کا بیان، اتباعِ رسول اکرم ﷺ اور اس کی برکات اور فلاحِ عظیم کا بیان، اور اصولِ دین یعنی توحید، رسالت، قیامت اور رسالت کے سلسلے میں انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا ذکر، مشرکین کی حماقت و بے راہ روی کی مذمت اور ان کے انجامِ بد کا تذکرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④

ترجمہ: سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہیں، اسی کی سلطنت ہے اور وہی تعریف کے لائق ہیں، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ① وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، سو تم میں بعض کافر ہیں اور بعض مؤمن ہیں، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے ② اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، اور تمہاری صورتیں بنادیں سو اچھی بنائیں، اسی کی طرف لوٹ جانا ہے ③ وہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور وہ سب اعمال کو جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور وہ سینوں کی باتوں کا جاننے والا ہے ④

معارف ومنازل

یہاں سے سورۃ التغابن شروع ہو رہی ہے، التغابن قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کے معنی ہیں: خسارہ اور نقصان۔ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: "ہار جیت کا دن"، جن کے پاس ایمان اور نیکی ہوگی وہ جیت جائیں گے (اے ہمارے مہربان ربّ! ہمیں جیت والوں میں شامل فرما، آمین ثم آمین

آمین)۔طبرانی کی روایت میں آتا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی پانچ آیتیں ہر شخص کی پیشانی پر لکھی ہوئی ہیں، چنانچہ ابتداء میں بچہ فطرتِ سلیمہ پر ہی پیدا ہوتا ہے، جیسے ارشاد فرمایا: **کل مولو دیو لد علی الفطرة، فأبواه یهوّ دانه أو ینصرانه، أو یمجسانه**۔ ہر بچہ صحیح اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اگر چہ وہ بچہ خواہ کسی یہودی، نصرانی، ہندو، سکھ، بدھ، دھریہ یا مجوس کے گھر پیدا ہوا ہو، اس کی پیدائشی فطرت بالکل صحیح ہوتی ہے، پھر بعد میں اس کے والدین اوراس کا ماحول اسے یہودی، عیسائی، ہندو، مجوسی وغیرہ بنادیتے ہیں۔

اس سورت کے شروع میں پانچ آیات کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے کنایۃً بات سمجھائی ہے کہ نومولود بچہ ہمیشہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اگر اس پر ماں باپ اور ماحول کا اثر نہ ہو تو وہ ان پانچ آیات میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی مذکورہ صفات پر مکمل یقین رکھنے والا ہوگا۔

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ پاکی بیان کرتی ہے اللہ تعالیٰ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہوتی ہے۔ کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کی تسبیح وتحمید میں ازل سے ابد تک بغیر کسی انقطاع اور رکاوٹ کے مسلسل تسبیح خواں ہے، کبھی کسی مخلوق نے اپنے فرضِ منصبی اور عبادت میں کوئی سستی اور غفلت نہیں کی، سوائے حضرت انسان اور جنات کے، اسی وجہ سے جنت ودوزخ کی تخلیق انہی دو کے لیے ہوئی ہے، اور روزِ قیامت حساب کے وقت ہی دونوں اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال میں تقسیم ہوں گے۔

فرمایا: ﴿لَهُ الْمُلْكُ﴾ بادشاہی اور سلطنت بھی اسی کی ہے جو معبود برحق ہے، جس کی تنزیہ وتقدیس بیان کرنا کائنات کے ہر ذرہ پر فرض ہے، حقیقی بادشاہ وہی ہے جس کی بادشاہی کو نہ کوئی زوال ہے نہ خطرہ، اور یہ بادشاہی علویات وسفلیات سب پر محیط ہے۔

﴿وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ اور تعریف بھی اسی کی ہے، تمام صفات کمال کا مالک وہی ہے، اگر کسی بادشاہ کے پاس کچھ آپ کو نظر آتا ہے تو وہ بھی اسی کا دیا ہوا ہے، اور چند روزہ ہے، جب چاہے دیدے اور جب چاہے لے لے، وہ اس پر قادر ہے کہ رات کے بادشاہ کو صبح فقیر بنادے، اور دن کے بادشاہ کو رات سولی پر چڑھادے۔

آنرا کشی از بت کدہ سر کردہ رندان کنی ☆ این را کشی از صومعہ دردار گبران افگنی

چون وچرا با کار تو عقل زبون را کے رسد ☆ بس قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

یہی مطلب ہے: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ کا کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا

يُرِيْدُ﴾[البروج:۱۶] (کرگزرتا ہے جس چیز کا ارادہ کرے)۔مٰلِكُ الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ﴾ (حکومت اور بادشاہت کا مالک) ہے، صَاحِبُ الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ (عزّت اور غلبہ والا) ہے، نہ جس کا کوئی شریک ہے، نہ مشیر اور نہ ہی کوئی وزیر، پس انسانوں کا فرض ہے کہ اس کو احکم الحاکمین تسلیم کرلیں، اور اس کی توحید کو حرض جان بنائیں، چنانچہ فرمایا: ﴿هُوَالَّذِيْ خَلَقَكُمْ﴾ وہی ذات پاک ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، وہ خود ازلی وابدی ہے، باقی سب کچھ مخلوقات ہیں، اور اسی کی درگاہ میں سوالی بھی ہیں، اور سجدہ ریز بھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دو صفات ایسی جامع ہیں جس کو سب ہی مانتے ہیں، کٹر سے کٹر کافر بھی ان صفات کا منکر نہیں ہے: پہلی صفت یہ کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے جس کی ذات خود بخود ہے، اس کے علاوہ کسی چیز کا وجود ذاتی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، اور دوسری صفتِ خلق ہے، جس پر تمام مذاہب والے متفق ہیں کہ کائنات کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، البتہ اگر اختلاف ہے تو باقی صفات میں ہے، ان دونوں میں کسی کا اختلاف نہیں۔تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا۔

﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ پھر تم میں سے کوئی تو کافر بن جاتا ہے، اور کوئی مؤمن بن جاتا ہے۔ ایمانیات کا انکار کرنے والا کافر شمار ہوگا، اور ایمانیات پر یقین رکھنے والا مؤمن شمار ہوگا جو کہ بہت ہی کم ہیں، جیسے سورۂ سبأ میں ارشاد فرمایا: ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ [سبأ:۱۳] (میرے شکر گزار بندے تھوڑے ہی ہیں) چنانچہ ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ساڑھے چھ ارب آبادی میں مسلمان صرف ایک ارب کے قریب ہیں، باقی سب کافر ہیں، چونکہ آگے قیامت آنے والی ہے ہوسکتا ہے کہ چند وقت کے بعد مسلمان ایک ارب سے بھی کم ہوں، اور کافر کئی ارب زیادہ ہوں۔

اس آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانوں کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے دو ہی چیزوں پر رکھی ہے: ایمان اور کفر، اس کے علاوہ کوئی تقسیم نہیں ہے۔عرب وعجم، سرخ وسفید، رنگ ونسل کے اعتبار سے، وطن اور زبان کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی کوئی حیثیت نہیں ہے، موجودہ زمانے میں جو وطن اور زبان اور معاشرہ، رنگ ونسل کی جو تفریق نظر آتی ہے یہ سب شیطانی حربے ہیں جس کے ذریعہ وہ ایک نسل کے مسلمانوں کو دوسری نسل کے ساتھ، ایک زبان والوں کو دوسری زبان والے کے ساتھ، ایک وطن والوں کو دوسرے وطن والوں کے ساتھ دست وگریبان کرکے اپنا مقصد پورا کرتا ہے، اور لوگوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محروم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

آج کل جو لوگ نسل، زبان اور قومیت پر آپس میں دست وگریبان ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور شیطان کی جماعت کہلانے کے حقدار ہیں۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام امور کو دیکھنے والا ہے، تمہارے سارے اعمال سے باخبر ہے، تمہاری ہر چیز اس کی نظر میں ہے، کیوں نہیں وہ سب کا خالق و مالک ہے۔ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، یعنی بامقصد اس کو پیدا فرمایا، اس کی تخلیق مہمل و بے سود نہیں ہے، اور خاص مصلحت وحکمت پر مبنی ہے۔ فرمایا: تمہیں پیدا کرنے کے علاوہ صورت بخشی، اور بہت اچھی شکل وصورت عطا فرمائی، سورۃ التین میں ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ [التین: ۴] (ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان جیسی خوبصورت شکل کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کی، ذرا غور کریں کہ انسان کا چہرہ صرف چھ سات انچ مربع جگہ میں ہے، مگر اربوں چہروں میں ہر چہرہ دوسرے چہرے سے مختلف ہے، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی پہچان ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صناعی اور کاریگری کا بہت بڑا شاہکار ہے، گاڑیوں کو دیکھا جائے تو اسٹیل کے پرزہ گھس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں، اور بار بار ان کی تبدیلی کی نوبت آتی ہے، مگر ذرا انسان کے ہاتھوں کو دیکھو! نرم و نازک ہڈیوں سے اور گوشت ورگوں سے قدرت نے اپنے کمال کا جوہر دکھا کر ان نرم ونازک ہاتھوں کو اس ترکیب سے پیدا فرمایا ہے کہ سو سال تک نہ گھستے ہیں، نہ ٹوٹ جاتے ہیں اور نہ ہی ان کی تبدیلی کی کوئی نوبت آتی ہے۔

وہ الگ بات ہے کہ کسی حادثہ یا کسی خاص مرض کے سبب سے وہ ناکارہ ہوں، اسی کے ساتھ انسان کا دماغ ایک چھوٹا سا پیچیدہ عضو ہے، جس نے پوری کائنات پر تحقیق کر کے ہر چیز کی حقیقت معلوم کی ہے، موجودہ کمپیوٹر اس دماغ کا ایک ادنیٰ عکس ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے دماغ کی آخری ایجاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ دماغ آئندہ کسی ایسی چیز کی تخلیق یا ایجاد کرے جو کمپیوٹر سے بھی زیادہ کارآمد ہو۔ فرمایا:

﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ اور بالآخر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور اپنی ساری کارکردگی کا حساب دینا ہے۔ فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ وہ علیمِ کُل ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اور وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو، اور ان کو بھی جانتا ہے جن کو تم ظاہر کرتے ہو، وہ تمہارے اور سارے جہاں کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ وہ تمہارے سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے، یعنی موجودہ اور آئندہ دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۶ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰

ترجمہ: کیا تمہارے پاس ان کافروں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے تھے؟ سو انہوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھ لیا (یہ تو دنیا میں ہوا)، اور آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۝۵ یہ اس وجہ سے کہ بیشک ان کے پاس ان کے رسول کھلے ہوئے معجزات لائے تھے، سو انہوں نے کہا: کیا ہمیں آدمی ہدایت دیں گے؟ سو انہوں نے کفر اختیار کیا، اور اعراض کیا، اور اللہ تعالیٰ نے بے نیازی کا معاملہ کیا، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور حمد کا مستحق ہے ۝۶ کافروں نے یہ خیال کیا کہ وہ ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے، آپ فرمادیجئے کہ ہاں! قسم ہے میرے ربّ کی کہ تم ضرور بضرور اٹھائے جاؤ گے، اور تمہیں ضرور بضرور تمہارے اعمال سے باخبر کیا جائے گا، اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ۝۷ سو ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر، اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے ۝۸ جس دن تم کو جمع ہونے کے دن میں جمع فرمائے گا، یہ وہ دن ہے جس میں لوگ نقصان میں پڑیں گے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرمادے گا، اور اسے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہ بڑی کامیابی ہے ۝۹ اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہ برا ٹھکانہ ہے ۝۱۰

معارف ومنازل

کفار نے اسلام کے بنیادی اصول سے یعنی توحید، رسالت اور قیامت کے بارے میں جو شکوک وشبہات کا اظہار کیا کرتے تھے انہی پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سخت سرزنش فرمائی ہے، پہلے رسالت کے بارے میں فرمایا:

﴿اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے کفر کیا؟ اس سے پہلے کہ انہوں نے اپنے کام کی سزا کا مزہ چکھ لیا۔ مشرکین مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم رسالت کا انکار کر رہے ہو اسی طرح تم سے پہلے لوگوں نے بھی اپنے نبیوں کا انکار کیا، پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر آسمانی عذاب کا نزول ہوا، سو اللہ تعالیٰ نے انہیں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا، یہ ان کا عذاب تو دنیا تک محدود رہا، قومِ عاد وثمود، قومِ ابراہیم، قومِ لوط، قومِ فرعون، قومِ نوح یہ سب توحید ورسالت کے منکر گزرے ہیں، پس ان کا حشر کیا ہوا کہ تباہ ہو گئے، یہ ان کی دنیوی سزا تھی، جبکہ:

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ مطلب یہ ہے اگر تم لوگ گزشتہ اقوام کے نقش قدم پر چلو گے تو تمہارا حشر بھی انہی کی طرح ہوگا، ان کی تباہی اور بربادی کی وجہ یہ ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا﴾ یہ سزا ان کو اس وجہ سے ملی کہ رسول ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے، بینات میں نشانیاں، معجزات، واضح دلائل اور شرعی احکام سب ہی چیزیں شامل ہیں، اللہ تعالیٰ کے نبی یہ سارے چیزیں لے کر ان کی ہدایت کے لئے آتے رہے، تو وہ کہنے لگے: یہ ہماری طرح کے انسان ہیں، یہ کوئی فرشتے نہیں آئے، سو کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ گویا انہوں نے رسولوں کی بشریت پر اعتراض کیا کہ جو شخص رسالت ونبوت کا دعویٰ کر رہا ہے وہ تو ہماری طرح کا انسان ہے، بھلا ہمارے جیسا انسان ہمیں ہدایت دے سکتا ہے؟

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر زمانے میں لوگ اسی ضد وعناد پر قائم رہے کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہئے، نہ کہ ہماری طرح کا انسان، وہ جس طرح وقوعِ قیامت کو محال سمجھتے تھے اسی طرح اپنی ہٹ دھرمی پر پیغمبروں کا انسان ہونے کو ناممکن اور محال سمجھتے تھے، یا اپنی بیوقوفی کی بنیاد پر، یا تو محض ضد اور عناد کی بنیاد پر، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ [الکہف: ۱۱۰] (آپ ان سے کہہ دیں کہ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں، البتہ مجھ پر وحی کا نزول ہوتا ہے) اور یہی میری نبوت کی

نشانی ہے، لہٰذا ضد وعناد چھوڑ کر یہ تسلیم کرلو کہ انسان ہونا ہرگز نبوت کے منافی نہیں ہے، جس انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے وہ منصبِ نبوت پر فائز ہوتا ہے جوکہ انسانیت کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے، وہ اس مرتبے کے ساتھ تمام گناہوں سے معصوم ہوتا ہے، اس کو اپنی طرح کا انسان سمجھنا یہ تمہاری حماقت ہے۔

دیکھو! یاقوت بھی پتھر ہے، مگر اس عام پتھروں پر اس کو وہی فوقیت حاصل ہے جو نبی کو عام انسانوں پر حاصل ہے، اور جو لوگ افضل البشر انبیاء کو بشر نہیں مانتے وہ نبی کی توہین کر رہے ہیں، اور اس کے انسان ہونے کے منکر ہیں، جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں سوائے اس کے کہ وہ گزرے ہوئے کافروں کی تقلید کر رہے ہیں، اور قرآن وحدیث کے صریح نصوص کا انکار کر رہے ہیں۔

بزرگانِ دین اس طرح سے بات کو سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! سارے پتھر یکساں نہیں ہیں، اگرچہ وہ پتھر ہی ہوتے ہیں، مگر کچھ پتھر وہ ہیں جو ہیروں کی شکل میں زیورات میں لگائے جاتے ہیں، اور کچھ پتھر وہ ہیں کہ جنہیں کوٹ کر سڑکوں پر بچھاتے ہیں یا تعمیرات میں لگاتے ہیں، اسی طرح سارے انسان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے، کہاں نبی کی معصوم اور بلند وبرتر ذات، اور کہاں عام انسان بنی آدم، کوئی احمق آدمی بھی نبی کے برابر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور کوئی شاگرد اپنے استاذ کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اسی طرح عام لوگوں کو بشر ہونے کا مرتبہ حاصل ہے، لیکن سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض بشر نہیں، بلکہ سید البشر ہیں، اور سید الاولین والآخرین ہیں، انہیں انسانیت اور بشریت سے نکالنا یہ کافروں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ کافروں نے انسانیت کو نبوت ورسالت کے منافی سمجھا، اور اسی بہانے سے وہ ایمان سے ہمیشہ کیلئے محروم رہے۔

پس آج اگر کوئی کافروں والا دعویٰ کرے کہ انبیاء بشر نہیں ہوتے، یہ صریح نص قرآنی کے خلاف ہوگا، اور ایسے لوگ کافروں کے زمرے میں شامل ہوجائیں گے، اس مسئلہ کی وضاحت سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ فرمایا:

﴿فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ﴾ پس انہوں نے نبی کی نبوت کا انکار کردیا، اور اس سے منہ موڑ لیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر انہوں نے یہ روش اختیار کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے بے پروائی برتی ہے، اللہ تعالیٰ کو کسی کافر، کسی فاسق کی کوئی پروا نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو مانے گا اس میں اس کا اپنا فائدہ ہوگا، اور جو منہ موڑ کر اعراض کرے گا اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔

﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور تعریفوں والا ہے۔ ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا﴾

کافروں نے کہا (یہ لفظ زعم) یقین اور گمان دونوں کے معنی میں مستعمل ہے) کہ مرنے کے بعد ان کو ہرگز نہیں اٹھایا جائے گا، انہوں نے بڑی تاکید کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ مرنے کے بعد نہ دوبارہ زندگی ہے اور نہ قیامت، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ آپ ان سے فرما دیجئے: کیوں نہیں، میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تم کو بتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کام کیا کرتے تھے، اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے، جس اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اس کے لئے دوبارہ اٹھانا کوئی مشکل نہ ہوگا، تاہم ہر کام اپنے مقررہ وقت پر ہوگا، تم جو کہتے ہو کہ قیامت اگر برحق ہے تو پھر کیوں نہیں آتی؟ ذرا انتظار کرو، جب اس کا وقت پورا ہوگا تو وہ فوراً برپا ہوگی، جب قیامت کا وقوع اور اعمال کا حساب و کتاب اور آخری منزل لازمی آنے والی ہے تو اس کے لئے تیاری کرو۔ فرمایا:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا﴾ سو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اگر اللہ تعالیٰ کا قرب اور بلند مرتبہ اور ابدی نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کی یہی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، جب نبی پر ایمان لاؤ گے تو تمہیں پوری شریعت پر ایمان لانے کا ثواب اور بدلہ ملے گا، اس لئے کہ نبی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ نبی جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا، خواہ وہ اجمالاً ہو یا تفصیلاً ان سب پر ایمان لانا ضروری ہوگا، حتیٰ کہ اگر کسی جزئی کا کوئی انکار کرے گا تو اس کا ایمان ثابت نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لانے کے ساتھ اس نور پر بھی ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل کیا ہے، اس سے مراد قرآن حکیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، جس کے بہت سے القاب میں سے ایک لقب نور مبین ہے، جیسے سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾[النساء: ۱۷۴] (ہم نے تمہاری طرف ایک واضح نور نازل فرمایا ہے)۔

اسی طرح سورۃ المائدہ میں بھی ارشاد ہے: ﴿قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾[المائدۃ: ۱۵] (اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور اور کتاب مبین یعنی قرآن حکیم آ گیا ہے) قرآن حکیم کی نورانیت میں کسی بھی قسم کا شبہ نہیں ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے خود بھی کافر تھے، اور ان کے ماں باپ بھی، جب انہوں نے قرآن حکیم پر ایمان لایا تو کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر نورانی فرشتوں کے ساتھ برابر ہو گئے، بلکہ ان کے کچھ لوگ فرشتوں سے بھی افضل ہو گئے۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور تمہارے تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھنے والا ہے، اور وہ تمہارے ہر چھوٹے بڑے عمل کو دیکھتا ہے۔ آگے قیامت والے دن کا ذکر فرمایا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ جس دن اللہ تعالیٰ تمہیں اکٹھا ہونے والے دن جمع فرمائے گا، یعنی میدانِ حشر میں جب اولین وآخرین سب کو جمع فرمائے گا، یہ ہار جیت کا دن ہوگا، بعض لوگ اپنے اعمالِ سیئہ اور کفر وشرک کی وجہ سے ہار جائیں گے، اور بعض لوگ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی بدولت جیت جائیں گے۔

امام بیضاویؒ اور دوسرے مفسرین اس کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص کے دو دو ٹھکانے ہیں: ایک جنت میں اور دوسرا جہنم میں، ایک کافر آدمی کا ٹھکانہ دوزخ کے علاوہ جنت میں بھی ہے، اگر وہ ایمان لے آتا تو اس کو جنت والا ٹھکانہ مل جاتا، اور دوزخ والا ٹھکانہ بند ہو جاتا لیکن ایمان نہ لانے کی وجہ سے اس کا جنت والا ٹھکانہ مؤمن کو مل جائے گا، مؤمن کا اپنا ٹھکانہ بھی جنت میں ہوگا، اور اس طرح اس کو دو ٹھکانے مل جائیں گے: ایک اپنا والا اور دوسرا کافر والا، تو گویا کافر ہار گیا اور مؤمن جیت گیا، اس لئے اس کو ہار جیت کا دن کہا گیا ہے۔ آگے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور اس نے نیک عمل انجام دیا تو اللہ تعالیٰ اس کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا، اور اسے جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں، ایسے لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اور وہاں سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے، اور نہ ہی وہاں کی نعمتیں کم ہوں گی، کیونکہ جنت کی ہر نعمت پر بقاء اور دوام کی مہر لگ چکی ہے۔ ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے جس کو نصیب ہو جائے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام جنت میں پہنچ جائے گا تو یہ اس کے لئے فوز وفلاح کا بلند ترین مقام ہوگا جس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی، اس کے بعد مخالفین کے بارے میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی یہی دوزخ میں جانے والے لوگ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کافر اور مشرک کو دوزخ سے نہ کبھی رہائی نصیب ہوگی اور نہ ہی اس کے عذاب میں کوئی تخفیف ہوگی، اور یہ دوزخ لوٹ کر جانے کی بہت ہی بری جگہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی برا مقام نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ⑪
وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ⑫ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ⑬ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ
فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ⑭ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ
فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ⑮ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا
لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ⑯ اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ
لَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ⑰ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ⑱

ترجمہ: جو بھی کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، اور جو بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان
لائے وہ اس کے قلب کو ہدایت دیدیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے⑪ اور فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی، اور
اطاعت کرو رسول کی، سو اگر تم اعراض کرو تو ہمارے رسول پر پہنچا دینا ہے واضح طور پر⑫ اللہ تعالیٰ ہے، کوئی معبود نہیں
مگر وہی، اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کریں مؤمن بندے⑬ اے ایمان والو! بیشک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد
میں سے تمہارے دشمن ہیں، سو ان سے ہوشیار رہو، اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو، اور بخش دو، سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ
غفور ہے، رحیم ہے⑭ سو تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جہاں تک تمہاری طاقت ہے، اور بات سنو اور فرمانبرداری کرو، اور اچھے
مال اپنی جانوں کے لئے خرچ کرو، اور جو شخص اپنے نفس کی کنجوسی سے بچا دیا گیا سو یہ وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں⑮
اگر تم اللہ تعالیٰ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ تمہیں اس کو بڑھا کر دے گا، اور تمہاری مغفرت فرمادے گا، اور اللہ تعالیٰ قدر
داں ہے، بردبار ہے⑯ غیب اور شہادت کا جاننے والا ہے، عزیز ہے، حکیم ہے⑰

معارف ومنازل

یہ ساتوں آیتیں متعدد مواعظ ونصائح پر مشتمل ہیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ ہے کہ تمہیں جو بھی کوئی مصیبت پہنچ جائے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتی ہے، لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر راضی رہے، اور جو تکلیف پہنچ جائے اس پر صبر کرے۔

حدیث شریف میں فرمایا:إن ما أصابک لم یکن لیخطئک، وإن ما أخطئک لم یکن لیصیبک۔ [ابن ماجۃ] یعنی یہ بات اچھی طرح جان لو کہ تمہیں جو تکلیف پہنچ گئی وہ تم سے خطاء کرنے والی نہ تھی، اور جو تکلیف نہیں پہنچی وہ پہنچنے والی ہی نہ تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو تسلیم کرو، اور اس پر راضی رہو، تو فرمایا:

﴿مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَمَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ﴾ کوئی مصیبت یا تکلیف نہیں پہنچتی مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی پہنچتی ہے، اور جو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک پر ایمان رکھنے والا آدمی ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کی راہنمائی فرماتا ہے، لوگ آنے والی مصیبت کو دور کرنے کے لئے بہت سی غلط کارروائیاں کرتے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تکلیف آتی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور دور ہوتی بھی اسی کے حکم سے ہے، اس لئے ایک ایماندار آدمی کی شان یہ ہے کہ وہ تکلیف کی آمد اور روانگی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع سمجھتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ ہر چیز تقدیر میں پہلے سے لکھی جاچکی ہے، جو بات لکھی ہوئی ہے اس کو ہر حال میں آنا ہے، اور جو نہیں لکھی گئی ہے وہ کبھی نہیں آئے گی، مگر مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کے پاس ایمان کے بعد سب سے بڑا سرمایہ تسلیم ورضا ہونا چاہئے۔

﴿وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اللہ تعالیٰ کا مقصد ہر چیز میں دراصل بندہ کا امتحان ہوتا ہے، نعمت وخوشحالی میں شکر کا امتحان مقصود ہے کہ بندہ شکر کرے گا یا نہیں، تکلیف ومصیبت اور ہر طرح کی پریشانی میں صبر کرنے کا امتحان مقصود ہے کہ بندہ صبر کرے گا یا نہیں، اس لئے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اس کو اپنے بندوں کا شکر اور صبر دونوں کا علم ہے، اور انہی پر جزا مرتب ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

(۲)-دوسری نصیحت: ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ﴾ اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول کی، سو اگر تم اطاعت سے روگردانی کرو گے پس ہمارے رسول کے ذمے تو وضاحت کے ساتھ کھول کر بیان کردینا ہے، نبی کی ذمہ داری اتنی ہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے، اور خود اس پر عمل کر کے دکھا دیتا ہے، پھر اگر کوئی نہیں مانتا تو یہ رسول کی ذمہ داری نہیں ہے، اور اس سے باز پرس نہیں ہوگی، ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہوگا۔

(۳)-فرمایا تیسری نصیحت یہ ہے: ﴿اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ معبود

برحق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور ایمان والے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ فرمایا: دنیا کی ہر چیز عارضی اور فانی ہے، لہٰذا ان میں سے کسی چیز پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، پس اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو جو دائم قائم ازلی اور ابدی ہے، وہی خالق اور مالک ہے، لہٰذا ساری چیزوں کو چھوڑ کر صرف اسی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

(۴)- چوتھی نصیحت یہ فرمائی: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ کہ تمہاری بیویوں اور اولاد میں ایسے بھی ہیں جو تمہارے دشمن ہیں، لہٰذا ﴿فَاحْذَرُوهُمْ﴾ تم ان سے ہوشیار رہو، فطری اور طبعی طور پر انسان کو نکاح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جب نکاح ہو جاتا ہے تو اولاد بھی پیدا ہوتی ہے، میاں بیوی کے درمیان آپس میں محبت ہوتی ہے، اور اولاد سے محبت ہونا طبعی امر ہے، اسلام نے بھی ان محبتوں کو باقی رکھا ہے، لیکن اس کے لئے ایک حد بندی بھی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حق سب پر مقدم ہے، بیوی ہو یا شوہر، بیٹا ہو یا بیٹی ہر ایک سے اتنی ہی محبت کی جا سکتی ہے جس کی وجہ سے اسلامی احکام پر چلنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اور حقوق اللہ وحقوق العباد کی مکمل پاسداری ہو، کیونکہ ساری محبتیں اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہیں، جس طرح سورج کے طلوع کرنے سے ستارے غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل کی گہرائی میں اتر جاتی ہے تو باقی ساری محبتیں مٹ جاتی ہیں، اس لئے فرمایا کہ تمہاری بیویوں اور اولاد میں ایسے بھی ہیں جو تمہارے دشمن ہیں، لہٰذا تم ان سے ہوشیار رہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بیوی اور اولاد کی محبت کو اگر اتنی اہمیت دے دیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت خدانخواستہ مغلوب ہو جیسے اکثر لوگوں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں بیوی کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو پس پشت ڈال کر چھوڑ دیتے ہیں، تو ایسا کرنا سوائے ہلاکت اور تباہی کے کچھ نہیں، اسی کو: ﴿عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ فرمایا، اور یہاں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری بیویاں اور ساری اولاد انسان کے دشمن نہیں، ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کی محبت سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے، تو اسی طرح کی اولاد کو: ﴿قُرَّةَ الْأَعْيُنِ﴾ کہا گیا ہے، اور طبعی وفطری طور پر بعض بیویوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان کی محبت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے معاون اور مددگار بن جاتی ہے، پس ایسے لوگ ﴿عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ سے مستثنیٰ رہیں گے۔

معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مکہ معظمہ میں چند لوگ مسلمان ہو گئے تھے، جب انہوں نے مدینہ منورہ کے لئے ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی ازواج اور اولاد نے انہیں ہجرت کرنے سے روک دیا،

اور یوں کہا کہ ہم نے تو تمہارے مسلمان ہونے پر صبر کر لیا، لیکن تمہاری جدائی پر صبر نہیں کر سکتے، پس بیوی بچوں کی یہ بات سن کر انہوں نے ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور دوسرا سببِ نزول یہ لکھا ہے کہ حضرت عوف ابن مالک الاشجعی رضی اللہ عنہ بال بچہ دار تھے، وہ جب جہاد کے لئے جانے کا ارادہ کرتے تو یہ لوگ روتے اور یوں کہتے کہ آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ یہ سن کر انہیں ترس آجاتا تھا، بڑے رحم دل تھے، اور جہاد کی شرکت سے رہ جاتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ بتادیا کہ بیوی بچے تمہیں ایک نیک کام کرنے سے روکتے ہیں، لہٰذا ان کی طرف سے ہوشیار رہو، اور ان کی ہر بات نہ مانو۔

دونوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں، ایک آیت کے متعدد شانِ نزول ہو سکتے ہیں، ان میں تعارض نہیں ہوتا، پس چاہئے کہ میاں بیوی جو کہ لفظ ازواج دونوں کو شامل ہے۔ اس آیت کریمہ پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کریں، اور کسی بھی حکمِ شرعی کی خلاف ورزی نہ کریں، اس کے ساتھ بیوی اور شوہر اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق چلیں، اور اولاد کو بھی اسی پر چلائیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ شوہر کرے نہ بیوی کرے اور نہ ہی اولاد کو کرنے دیں۔

اگر ازواج اور اولاد سے اتنی محبت کی کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض اور واجبات چھوٹنے لگے تو ان لوگوں کی محبت خود اپنے حق میں دشمن بن جائے گی، پھر اس دشمنی کا مظاہرہ میدانِ حشر میں ہوگا، ان کی محبت کی وجہ سے جو گناہ کیے ان پر مؤاخذہ اور عذاب ہوگا، یہ انسان کی بے وقوفی اور حماقت ہے کہ بیوی بچوں کے لئے کمائے اور انہیں کھلائے پلائے، لیکن اس میں حلال وحرام کا خیال نہ رکھے، حرام کمانے کا بھی گناہ اپنے سر لے اور حرام کھانے اور کھلانے کا بھی، پھر قیامت کے دن اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ بیوی بچوں کی خواہش اور ان کی ضد کی وجہ سے گناہ کر لیتے ہیں، سود پر قرض بھی لیتے ہیں، اور چوری چھپکے دوسروں کے مال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، اور دوسروں کے اموال میں خیانت بھی کر لیتے ہیں، فضول خرچی بھی کرتے ہیں، اور ہر تقریب میں بیوی بچوں کو نیا جوڑا لباس پہنانے کے لئے ادھار بھی لیتے ہیں، اور بے تحاشہ رشوت لے کر بیوی بچوں کو ان کی خواہش کے مطابق کھلاتے پلاتے ہیں اور خوشحال رکھتے ہیں، اور ان سب کا وبال اپنے سر پر لیتے ہیں۔

بیوی بچوں کو اس سے بحث نہیں کہ ہمارے ذمہ دار کا آخرت میں کیا بنے گا، انہیں تو اپنے نفس کے تقاضے پورا کرنا ہے، پس نتیجہ سے اور انجام بد سے غافل رہتے ہوئے بیوی بچوں کی ہر فرمائش جائز و ناجائز پورا کرنا بڑی نادانی

اورحماقت ہے، اسی بارے میں فرمایا کہ بیوی بچے تمہارے دشمن ہیں، اور بعض بیوی بچوں میں اللہ تعالیٰ نے سلیقہ دانشمندی اور تقویٰ اجاگر کیا ہوا ہے کہ وہ اپنے ذمہ دار بڑوں کو کسی بھی ناجائز کام کا امر اور فرمائش نہیں کرتے، بلکہ انہیں تاکید کے ساتھ کہتے ہیں کہ نہ ہماری آخرت خراب کرو، اور نہ اپنی آخرت خراب کرو، اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر چل کر ہر طرح کی نافرمانی سے خود بھی بچو اور ہمیں بھی بچاؤ۔ سبحان اللہ! پھر ایسے بیوی بچوں پر ﴿عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ کا کبھی اطلاق نہیں ہوگا، اور وہ انسان کتنا خوش قسمت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے ایسے بیوی اور بچے عطاء فرمائے گا۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست ☆ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذرا دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالیے، کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے بھی تھے کہ جہاد پر جاتے وقت جب بیوی اور بچے ان سے چمٹ جاتے کہ ہمیں کس کے بھروسے پر چھوڑ کر جارہے ہو؟ تو وہ لوگ بیوی بچوں پر سختی کرتے اور انہیں دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیتے، اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین کو ان کی یہ سختی اور درشتی پسند نہیں آئی، تو فرمایا:

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اگر تم ان کی غلطی کو معاف کردو گے اور تم درگزر کرو گے اور بخش دو گے تو اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے، بیوی بچوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو، اور انہیں پیار و محبت سے سمجھاؤ، اور ان کو مایوس نہ کرو، اور ان سے نفرت نہ کرو، اور انہیں پیار سے سمجھاؤ اور راضی رکھو، اسی ضمن میں اپنا مقصد پورا کرو اور جہاد پر روانہ ہو جاؤ۔

اس کے علاوہ بعض اوقات بیویوں کی اور اولاد کی فرمائشیں ایسی ہوتی ہیں کہ کبھی تو نفس کو ان فرمائشوں سے ناگواری ہوتی ہے، اور کبھی ان کے پورا کرنے کا موقع نہیں ہوتا، ایسی صورت میں بھی طبیعت کو ناگواری ہوتی ہے، تو ارشاد فرمایا: اگر تم انہیں معاف کردو اور درگزر کرو اور بخشش کرو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے، جہاں تم انہیں معاف کرو گے وہاں اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۵)- پانچویں نصیحت یہ فرمائی: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ بات یہی ہے کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں، اس میں واضح طور پر تنبیہ فرمائی کہ تمہارے اموال، تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں، یعنی آزمائش کا ذریعہ ہیں، مال کمانے میں اور مال خرچ کرنے میں بھی آزمائش ہے، اسی طرح اولاد کی پرورش کرنے میں اور ان کے ساتھ رہنے سہنے میں بھی امتحان و آزمائش ہے، پس اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو، اور مال کی تحصیل اور اولاد کی محبت اور دیکھ بھال کو

زندگی کا مشغلہ نہ بنا لیا جائے، منفعت وفائدہ کی خاطر صراط مستقیم سے ہٹنا خسارہ ہے، اور حقوق اللہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق بندوں کے حقوق کو پورا کرنا اجر عظیم ہے، اور وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس اجر عظیم کو حاصل کر لیتے ہیں۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر امت کا کوئی نہ کوئی فتنہ ہوتا ہے، اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں جتنی اہمیت مال کو حاصل ہے وہ اور کسی چیز کو حاصل نہیں، اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ آج اقتدار مال ہی کو حاصل ہے، اور اصل حاکم مال ہی ہے، جس کی وجہ سے لوگ اللہ تعالیٰ کو اس کے احکام کو پس پشت چھوڑ کر مال ہی کی محبت میں اتنے گرویدہ اور بدحواس ہیں کہ انہیں سوائے مال کے کسی چیز کی خبر تک نہیں۔ اب سورت کے آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مذکورہ غفلت کو دور کرنے اور امورِ خیر میں دل کھول کر خرچ کرنے کی تاکید کی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس قدر تم میں طاقت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق اتقیٰ کا معنی یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے کفر و شرک اور نفاق سے اور کبیرہ گناہوں سے بچ جائے، اگر ان سے بچ گیا پھر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی محفوظ رہے گا، تو اس کو کامل درجے کا تقویٰ حاصل ہو جائے گا، اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ کا معنی عاجزی بھی ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ **اَلَّا تریٰ نفسک خیراً من أحدٍ** کہ تو اپنے آپ کو کسی دوسرے سے بہتر نہ سمجھے، بلکہ عاجزی اختیار کریں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ: ﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ [التوبة: ۱۱۲] (اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے) یعنی شریعت کی حدود کی حفاظت کرنے کا نام تقویٰ ہے، حدود شروع میں چونکہ اعتقاد اور عمل سب کچھ شامل ہے، لہٰذا ان سب کی حفاظت اور درستگی ضروری ہے۔ یہ بات ضروری ہے کہ سورۂ آل عمران میں جس تقویٰ کا حکم ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا ڈرنا اس کا حق ہے)۔ اس تقویٰ سے مراد عقیدے کا تقویٰ ہے، یعنی ایمان اور توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آنی چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کفر اور شرک کو بالکل معاف نہیں کرے گا، اس لئے فرمایا کہ عقیدے میں اس طرح تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے، پس انسان کا عقیدہ ہر قسم کی آلائش سے پاک ہونا چاہئے، اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ:

﴿مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ جس قدر تمہاری طاقت ہے تو اس سے مراد اعمال کا تقویٰ ہے، کیونکہ اعمال میں کوتاہی قابلِ معافی اور قابلِ رعایت ہے، مثلاً اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھ لے جس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون بھی یہی ہے، سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة:۲۸۶] (اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔ غرض یہ کہ سورۂ آل عمران میں تقویٰ سے مراد عقیدے کا تقویٰ ہے، جبکہ اس آیت میں تقویٰ سے اعمال کا تقویٰ مراد ہے، لہٰذا دونوں آیات میں درحقیقت کوئی تعارض نہیں ہے۔ فرمایا: حسب استطاعت اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ﴾ اور سنو، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی بات کو سنو، قانون پر عملدرآمد کے لئے سماعت پہلی منزل ہے، جو شخص سنے گا پھر سمجھے گا تو اس پر عمل بھی کرے گا، اور اطاعت اختیار کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو بسر و چشم قبول کرو، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں بدنی عبادتوں کے ساتھ ساتھ مالی عبادتوں کو بھی ادا کرو، اور خیر کے کاموں میں خرچ کرو، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہیں روزی دی ہے اس کے عطا کردہ مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو، یہ انفاق فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقات سب کو شامل ہے، فرمایا کہ ایسا کرنا تمہارے لئے بہتر ہے، کیونکہ بخل اچھا نہیں ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور جس کسی کو اس کے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا سو یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بخل بدترین بیماری ہے، اس بیماری سے نجات کا واحد ذریعہ تقویٰ ہے، جب انسان میں تقویٰ راسخ ہو جاتا ہے تو اس میں سخاوت کا مادہ پیدا ہوتا ہے، اور بخل کا مرض خود بخود چھوٹ جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ زکوٰۃ کی فرضیت میں دو مصالح ہیں: ایک مصلحت تو خود زکوٰۃ دہندہ کے لیے ہے کہ اس کے نفس سے بخیلی کا مادہ یعنی جراثیم خارج ہو جاتے ہیں، اور اس کی بجائے فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے، اور دوسری مصلحت محتاجوں کی ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے ان کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں، اسی لئے فرمایا کہ مال خرچ کرو تا کہ تمہاری طبیعتوں میں سے بخل کا مادہ نکل جائے۔

آگے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض حسنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دو گے تو اللہ تعالیٰ اسے دگنا کر کے تمہیں لوٹائے گا، اور تمہاری غلطیاں بھی معاف فرما دے گا، جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ اس آیت

میں انفاق سے مراد بالخصوص جہاد کے لئے خرچ کرنا ہے، عام انفاق کے متعلق تو یہ ارشاد ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الأنعام: ۱۶۰] (جو شخص کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لیے اس کا دس برابر ثواب ہے)۔ البتہ جہاد کے لئے خرچ کرنے کا اجر و ثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے، اور جس کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بیس لاکھ تک اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ [تفسیر در منثور]

﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ بہت قدر داں اور برد بار ہے، بندوں کے اعمال کی قدر دانی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے اعمال پر لاکھوں گنا زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔ آگے اپنی صفت علم محیط کا ذکر فرمایا:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ وہ مخفی اور ظاہر سب چیزوں کو جاننے والا ہے، یہ ظاہر اور پوشیدہ مخلوق کے اعتبار سے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز مخفی نہیں ہے، وہ انسان کی نیت اور ارادے سے بھی واقف ہے، وہ زبردست اور کمال قدرت اور کمال قوت کا مالک ہے، اور حکمت والا ہے، اس کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ سورۃ التغابن کی ابتداء بھی اللہ تعالیٰ کی مخصوص ذاتی صفات سے ہوئی تھی، اور اس کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات کے ساتھ ہو رہا ہے، علمائے کرام نے فرمایا ہے جو شخص بے اولاد ہو اس کو چاہئے کہ چالیس روز تک اس مبارک سورت کی تلاوت کرے، اور اپنے لئے اولاد کی دعا کرے، ان شاء اللہ اس کا مطلب پورا ہوگا۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السميع العليم

سُورَۃُ الطّلاقِ

مدنیۃٌ آیاتہا ۱۲ رکوعاتہا ۲

سورۂ طلاق مدنی ہے، اس میں بارہ (۱۲) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الطلاق ہے، یہ لفظ اس سورت کی پہلی آیت میں موجود ہے، یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۶۵ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۹۹ نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مدنی زندگی میں نازل ہوئی، اس کا نزول سورۃ الدہر کے بعد ہے۔

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں دو رکوع، بارہ آیتیں، ۲۹۸ کلمات، اور ۱۲۳۷ حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سابقہ سورت میں فرمایا تھا: تمہاری بیویاں اور بچے تمہارے لئے فتنہ ہیں، اور بعض بیویاں دشمن بھی، چونکہ دشمنی کا ایک سبب طلاق بھی ہے لہٰذا یہ سورت طلاق جس میں طلاق کا بیان ہے ماقبل سے مربوط ہے۔

مختصر موضوع:

حقوق العباد، طلاق کے احکام، تدبیرِ منزل، فرائضِ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ،

توحیداور رسالت کا بیان، نتائجِ اعمال کا بیان اور عائلی قوانین وغیرہ کا بیان۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ۚ
لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَ لَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ
وَ مَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ۝١ فَاِذَا
بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّ اَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ
وَ اَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمۡ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۬ وَ مَنۡ يَّتَّقِ
اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝٢ وَّ يَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ وَ مَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ قَدۡرًا ۝٣

ترجمہ: اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انہیں عدّت سے پہلے طلاق دو، اور عدّت کو اچھی طرح شمار کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارا ربّ ہے، ان عورتوں کو تم ان کے گھروں سے نہ نکالو، اور نہ وہ خود نکلیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کرلیں، یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرے سو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اے مخاطب! شاید تو یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا فرمادے ① پھر جب وہ عورتیں اپنی عدّت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو انہیں روک لو بھلائی کے ساتھ، یا چھوڑ دو بھلائی کے ساتھ، اور عدل والے دو آدمیوں کو گواہ بنالو، اور اللہ تعالیٰ کے لئے گواہی کو قائم کرو، اور یہ وہ چیز ہے جس کی اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لائے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو وہ اس کے لئے مشکل سے نکلنے کا راستہ بنادیتا ہے ② اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں اسے ملنے کا گمان بھی نہ ہو، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرلے سو وہ اس کے لئے کافی ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا ہی کر کے رہتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر فرمایا ہے ③

☆☆☆

معارف ومنازل

شریعت اسلام ایک مکمل اور پاکیزہ اور حکیمانہ نظامِ حیات کا نام ہے، اس میں نکاح کو صرف ایک معاملہ اور معاہدہ نہیں بلکہ ایک گونہ عبادت کی حیثیت بخشی ہے، جس میں خالق کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں رکھے ہوئے شہوانی جذبات کی تسکین کا بہترین اور پاکیزہ سامان بھی ہے، اور مرد وعورت کے ازدواجی تعلقات سے جو عمرانی مسائل بقاء نسل اور تربیت اولاد کے متعلق ہیں ان کا بھی معتدلانہ اور حکیمانہ بہترین نظام موجود ہے۔

نکاح وطلاق کا اور ازدواجی حالات کا جو طرز وطریقہ دیگر مذاہب میں کم وبیش موجود ہیں وہ اکثر وبیشتر غیر معیاری ہیں، اور افراط وتفریط اور ظلم وزیادتی کا شکار ہیں، اسلام چونکہ دین الٰہی ہے اس سلسلے میں قرآن وحدیث نے افراط وتفریط سے ہٹ کر نکاح وطلاق کی شرعی حیثیت اور ان کا حکیمانہ نظام جو مرتب فرمایا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے، اس سلسلے میں چونکہ معاملہ ازدواج کی درستی پر عام نسل انسانی کی درستی موقوف ہے اس لئے قرآن کریم نے ان عائلی مسائل کو تمام دوسرے معاملات سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

قرآن کریم کو بغور پڑھنے والا یہ عجیب وغریب مشاہدہ کرے گا کہ دنیا کے عام معاشی مسائل میں سب سے اہم تجارت، شرکت، اجارہ وغیرہ ہیں، قرآن حکیم نے ان کے تو صرف اصول بتلانے پر اکتفاء فرمایا ہے، ان کے فروعی مسائل قرآن میں شاذ ونادر نہایت قلیل ہیں، بخلاف نکاح وطلاق کے کہ قرآن کریم نے ان کے صرف اصول بتلانے پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ ان کے اکثر فروعی مسائل اور بیشتر جزئیات کو براہ راست حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نازل فرمایا ہے۔ یہ مسائل قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں متفرق طور پر اور سورۂ نساء میں کچھ زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ سورت جو سورۂ طلاق کے نام سے موسوم ہے اس میں خصوصیت سے طلاق اور عدت وغیرہ کے احکام کا ذکر ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس سورت کو سورۂ نساء صغریٰ کہتے ہیں، یعنی چھوٹی سورۂ نساء۔ [بخاري]

اسلامی اصول کا رخ یہ ہے کہ جن مرد وعورت میں اسلامی اصول کے مطابق ازدواجی تعلق قائم ہو وہ پائیدار اور عمر بھر کا رشتہ ہو، جس سے ان دونوں کا دین ودنیا بھی درست ہو، اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد کے اعمال و اخلاق بھی درست ہوں، اسی لئے نکاح کے معاملے میں شروع سے آخر تک ہر قدم پر اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ اس تعلق کو تلخیوں اور رنجشوں سے پاک وصاف رکھا جائے، اور اگر کبھی کوئی تلخی پیدا ہو جائے تو ان کے ازالہ کی پوری کوشش

کی گئی ہے، لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بعض اوقات طرفین کی فلاح وکامیابی اسی میں مضمر ہو جاتی ہے کہ یہ تعلق ختم کر دیا جائے، تو اس کی وضاحت بھی موجود ہے۔

جن مذاہب میں طلاق کا اصول نہیں ہے ان میں ایسے اوقات میں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اور بعض اوقات انتہائی برے نتائج سامنے آتے ہیں، اس لئے اسلام نے قوانینِ نکاح کی طرح طلاق کے بھی اصول وقواعد مقرر فرمادیئے، مگر ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دیدی کہ طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت مبغوض اور مکروہ عمل ہے، جہاں تک ممکن ہو اس سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تزوجوا ولا تطلقوا فإن الطلاق يهتز منه عرش الرحمن۔ یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ طلاق سے عرش رحمٰن ہل جاتا ہے۔ [قرطبي برواية ثعلبي]

اور دار قطنی نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جو کچھ پیدا فرمایا ہے ان سب میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین چیز غلاموں کو آزاد کرنا ہے، اور ان سب میں مبغوض اور مکروہ ترین چیز طلاق ہے۔ [قرطبي]

بہر حال! اسلام نے اگر چہ طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی، اور حتی الامکان لوگوں کو طلاق دینے سے روکا، لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر بامر مجبوری طلاق کی اجازت دیدی، لیکن اس کے لئے کچھ اصول وقواعد بھی بنا کر اجازت دیدی، جن کا حاصل یہ ہے کہ اگر اس رشتہ ازدواج کو اور سلسلہ محبت کو اگر ختم کرنا ہی ضروری ہو جائے تو وہ بھی خوبصورتی اور حسن معاملہ کے ساتھ انجام پائے، محض غصہ نکالنے اور انتقامی جذبات کا کھیل بنانے کی صورت نہ بننے پائے۔

اس سورت طلاق میں طلاق کو اس طرح شروع کیا گیا کہ اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ﴿يَآيُّهَا النَّبِيُّ﴾ کے عنوان سے خطاب فرمایا گیا، جو امام قرطبی کے بیان کے مطابق ﴿يَآيُّهَا النَّبِيُّ﴾ ان مواقع میں استعمال ہوتا ہے جہاں حکم تمام امت کے لئے عام ہو، اور جس جگہ کوئی حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے متعلق ہوتا ہے تو وہاں ﴿يَآيُّهَا الرَّسُولُ﴾ سے خطاب کیا جاتا ہے، لہٰذا اس جملہ ﴿يَآيُّهَا النَّبِيُّ﴾ کا تقاضا یہ تھا کہ آگے بھی بصیغۂ مفرد احکام کا بیان

ہوتا، مگر یہاں اس کے خلاف بصیغۂ جمع خطاب فرمایا: ﴿اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ جو اگرچہ بلا واسطہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، اور بصیغۂ جمع خطاب کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتکریم بھی ہے، ساتھ ہی اس طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص نہیں تمام امت اس میں شریک ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ ایک محذوف عبارت یہ بیان کی ہے: ﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اے نبی! آپ مسلمانوں کو بتلادیں کہ جب وہ طلاق دیا کریں تو آگے بیان کئے ہوئے قانون کی پابندی کریں، آگے بعض احکام طلاق کا بیان ہے۔

﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ پہلا حکم: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں طلاق دو کہ اس کے متصل بعد عدّت شروع ہوجائے، طلاق کے بعد جو پہلا حیض آئے گا وہ حیض اور اس کے بعد دو حیض آنے پر عدّت تمام ہو جائے گی، جب عدّت گزارنے کے لیے تین حیض پورے کرنے ہوتے ہیں تو طلاق ایسے وقت پر دی جائے جو حیض شروع ہونے سے پہلے ہو، اور یہ وقت طہر کا ہے، اور بموجب حکم حدیث طلاق میں طہر میں دینی چاہئے، جس میں میاں بیوی کا ملاپ نہ ہو، یا عورت کو حمل ہو۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی حیض کے اندر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدمت گرامی میں اس کا تذکرہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر ناراض ہوئے اور آپ کو غصہ آگیا، فرمایا: جاکر اپنے بیٹے سے کہو کہ رجوع کرلے، پھر پاک ہونے تک اسے روکے رکھے، پھر جب ایک حیض آجائے اور اس کے بعد پاک ہوجائے اور طلاق دینے کا ارادہ ہو تو طلاق دیدے، یہ طلاق طہر کی حالت میں ہو جس طہر میں جماع نہ کیا ہو، فرمایا: یہ ہے وہ عدّت جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ [بخاري]

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے، تو ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ طہر ہی میں طلاق دی جائے تاکہ اس کے بعد پورے تین حیض آجانے پر عدّت ختم ہوجائے۔

حضرات شوافع کے نزدیک چونکہ عدّت کا تعلق طہر سے ہے، کیونکہ انہوں نے قروء سے طہر مراد لیا ہے، جبکہ حنفیہ نے حیض مراد لیا ہے، اس لئے ان کے نزدیک آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ طہر کے شروع میں طلاق دیدو، تاکہ عدت وہیں سے شروع ہوجائے۔ پھر فرمایا:

﴿وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ دوسرا حکم: معنی یہ ہے کہ عدّت کو اچھی طرح سے شمار کرو، کیونکہ اس سے متعدد

مسائل متعلق ہیں، اس میں سے ایک تو رجعت کا مسئلہ ہے، جب کسی عورت کو رجعی طلاق دیدے تو عدّت کے اندر اندر رجوع کرنا جائز ہے، اور زمانہ عدّت کا خرچہ بھی طلاق دینے والے مرد کے ذمہ ہے، عدّت گزرنے تک اس کا خرچہ دے، اگر عدّت کے اندر شوہر نے رجوع نہ کیا تو عورت کو عدّت گزرنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے کی اجازت ہے، اگر اچھی طرح عدّت کو شمار نہ کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ ان احکام میں فرق پڑ جائے، مثلاً عدّت کے اندر دوسرا نکاح کرلے، یا عدّت گزرنے کے بعد بھی شوہر سے خرچہ مانگتی رہے، یا عدّت ختم ہونے کے بعد شوہر یہ سمجھ کر کہ ابھی عدّت پوری نہیں ہوئی رجوع کرلے۔ فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ﴾ **تیسرا حکم:** تم ان مسائل کے صحیح پورا کرنے کے متعلق اپنے ربّ سے ڈرتے رہو، عورت جھوٹ نہ کہے کہ میری عدّت گزرگئی، اور مرد عدت گزرنے کے بعد بھی رجوع کا دعویدار نہ ہوجائے، یا مرد عدّت کے اندر مکان اور خرچہ دینے سے انکار کرے، یا عورت عدّت گزرنے کے بعد بھی خرچہ کا مطالبہ کرے۔ فرمایا:

﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ﴾ **چوتھا حکم:** فرمایا: ان کو دورانِ عدّت زبردستی ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ مطلب یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کے گھر میں ہی عدّت کے ایام پورے کرے، طلاق دینے کے بعد فوراً اسے گھر سے نہ نکالو، اور عورتیں خود بھی اس گھر سے نہ نکلیں۔

بسا اوقات مرد اس کو گھر میں رکھنا چاہتا ہے مگر عورت غیض وغضب کی بنیاد پر وہاں عدّت گزارنا نہیں چاہتی، تو یہ اس کے لئے کبھی بہتر نہیں، بلکہ اسے چاہئے کہ صبر کر کے وہیں بیٹھی رہے یہاں تک کہ عدّت کے دن پورے ہوجائیں، پھر وہ آزاد ہے۔ فرمایا: ہاں! ایک صورت میں عورت کو گھر سے نکالا جاسکتا ہے کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عورت کا گھر سے خود بخود چلا جانا یہ بھی بے حیائی کی تعریف میں آتا ہے، اسی طرح چوری کرنا یا زنا کا مرتکب ہوجانا یہ بھی بے حیائی میں شمار ہے۔ البتہ اگر وہ کسی ایسے جرم میں ملوث ہوجائے تو پھر اس پر حد جاری کرنے کے لیے گھر سے نکالا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی کئی عذر ہوسکتے ہیں، مثلاً گھر میں بالکل اکیلی ہے اور حفاظت کا معقول انتظام نہیں ہے تو دوسری جگہ جاسکتی ہے، یا گھر کا ماحول ایسا ہے کہ صبح شام وہاں لڑائی ہوتی ہے۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کا یہی مسئلہ تھا کہ وہ تلخ کلامی اور بدزبانی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے حکم دیا کہ وہاں اپنے خاوند کے گھر سے نکل کر اپنے رشتہ داروں کے پاس جائیں اور وہیں عدت گذ لدے۔

﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود ہیں کہ صحیح وقت پر طلاق دیدو، پھر عدّت کی گنتی پوری کرو، اور مطلقہ عورتوں کو گھروں سے مت نکالو وغیرہ، اور جس نے اللہ تعالیٰ کی حدوں سے تجاوز کیا سو بیشک اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سزا کا مستحق ہوگا، فرمایا: عورت کا اسی گھر میں رہنا اور وہیں عدت گزارنا اس لئے ضروری ہے:

﴿لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ کیونکہ ان کو علم نہیں، شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی صورت پیدا کردے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک یا دو طلاقیں ہوئی ہیں تو رجوع کا امکان ہوسکتا ہے، یا طلاق بائنہ ہوتو دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، اس لئے وہاں رہنے میں جانبین کا فائدہ ہے۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ طلاق اگر بائن ہوتو اس میں عدّت کے اندر یا عدّت کے باہر سوائے نکاح جدید کے اور کوئی صورت نہیں، اور نکاح جدید میں عورت کی رضامندی ضروری ہے، اور طلاق بائن میں رجعت کا کوئی امکان ہی نہیں، رجعت مخصوص ہے طلاق رجعی کے ساتھ، وہ بھی ایسی صورت میں کہ رجعت عدّت کے اندر ہو، عدّت گزرنے کے بعد طلاق رجعی میں بھی رجعت کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، جب رجعت طلاق رجعی میں عدّت کے اندر ہوتو عورت کی رضامندی ضروری نہیں، پھر ایک یا دو طلاقوں کے بعد عدّت کے اندر رجوع ہوسکتا ہے۔

البتہ اگر تینوں طلاقیں دے دی جائیں تو پھر مرد وزن میں مکمل جدائی ہوجاتی ہے، اور تجدید نکاح کا امکان بھی ختم ہوجاتا ہے، تاہم نکاح ثانی سے پہلے مغلظہ طلاق کے بعد عورت کے لئے عدّت پوری کرنا ضروری ہے، رجعی طلاق کے بعد عدّت کی مدّت قریب الاختتام ہوتو اس وقت کیا کرنا چاہئے؟ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ پھر جب وہ عورتیں جن کو ایک یا دو طلاقیں دی جا چکی ہیں اپنی مدّت کو پہنچ جائیں، یعنی ان کی عدّت قریب الاختتام ہو پس ان کو روک لو دستور کے مطابق۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر طلاق رجعی ہے تو رجوع کرلو، اور اگر طلاق بائن ہے تو نکاح کی تجدید کرو، یہ پہلی صورت بہت ہی بہتر ہے تاکہ جدائی کا دروازہ بند ہوجائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پھر جدا کردو دستور کے مطابق، یعنی مرد وعورت دونوں نے یا صرف مرد نے یہ سوچا کہ ہمارے درمیان جو ناچاقی ہے وہ کسی صورت ختم نہیں ہوسکتی، اور نکاح کو ختم کرنا ہی بہتر ہے، تو پھر عدّت پوری

ہونے پر عورت کو شریفانہ طریقے پر رخصت کرو، مرد کو دونوں صورتوں پر عمل کرنے کا اختیار ہے، یعنی طریقہ پر اس کو رخصت کرنا، رخصتی کی صورت میں کسی طرح کا ظلم وزیادتی ہرگز جائز نہیں۔

جاہلیت میں عورتوں کو بڑا تنگ کرتے تھے، روز روز طلاق بھی دیتے تھے، اور پھر رجوع کر لیتے تھے، اس طرح گویا کہ نہ عورت کو باقاعدہ آباد کرتے اور نہ اسے آزاد کرتے کہ وہ دوسری جگہ جاکر نکاح کر سکے، مگر اسلام نے واضح حکم دیا کہ یا تو دستور کے مطابق رجوع کر کے عورت کو روک لو، یا پھر مکمل طور پر آزاد کر دو، فرمایا: ایسا کرتے وقت ﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ اپنے لوگوں میں سے دو عادل گواہ بنالو، گواہ ایماندار بھی ہوں اور سچے اور انصاف پسند بھی ہوں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دو گواہ بنانا مستحب ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر بعد میں کوئی تنازع پیدا ہو جائے تو گواہوں کی گواہی کی روشنی میں فیصلہ آسان ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات لوگ گواہوں کی گواہی کو لکھ کر تحریر کرتے ہیں، تو یہ بھی درست ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے گواہوں کو نصیحت فرمائی کہ:

﴿وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ سو گواہوں کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے گواہی دیں، یعنی ضرورت پڑنے پر اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوئے سچائی کے ساتھ گواہی دیں، کیونکہ گواہی میں ردوبدل کرنا بھی حرام ہے، اور کسی فریق کا لحاظ رکھنا بھی حرام ہے، سچی گواہی دینے سے کسی کا فائدہ ہوتا ہے، یا نقصان اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں ہونی چاہئے، اور بعض لوگ سوچتے ہیں کہ اگر صحیح گواہی دیں گے تو لوگ ہم سے ناراض ہو جائیں گے، اگر جھوٹی گواہی دیں گے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا، پس بہتر ہے کہ سرے سے گواہی ہی نہ دو، قرآن حکیم نے اس کو بھی بڑا گناہ اور ظلم قرار دیا۔ سورۂ بقرہ میں وعید نازل فرمائی: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾[البقرة:۱۴۰] (اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کو چھپاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس پر لازم آتی ہے)۔ یہ گواہی چھپانا بڑا گناہ ہے، گواہ طلاق کے معاملے میں ہو، یا رجعت کے معاملے میں ہو، یا اور کسی معاملے میں ہو، یا بیع وشراء کے معاملے میں ہو، یا اور کسی معاملہ میں ہو، کیونکہ گواہی کے چھپانے میں لوگوں کے حقوق ضائع ہو جاتے ہیں، اور یہ نہایت عظیم جرم ہے۔

فرمایا: ﴿ذٰلِكُمْ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ان باتوں کے ذریعے جو اوپر بیان ہوئیں اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اوپر جو احکام مذکور ہوئے سراپا ہدایات ہیں، ان کے ماننے میں خیر ہی خیر ہے، اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں، اور بغیر کسی اُجرت اور پیسے کے مفت گواہی دیں، کسی عزیز وقریب یا کسی دوست کی رعایت نہ کریں، اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کا

حساب وکتاب سامنے رکھ کر گواہی دیں، نہ کسی کی حق تلفی کریں اور نہ کسی کا نقصان۔

طلاق کے مسائل میں کبھی مرد کو پریشانی ہو جاتی ہے کہ پتہ نہیں میرا مستقبل کیا ہوگا، اور کبھی یہی پریشانی عورت کو بھی لاحق ہو جاتی ہے، اور کبھی دونوں کے رشتہ داروں کو اگلی آیات میں اسی کا علاج بتادیا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝٢ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝٣﴾ سو جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے، اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے رزق ملنے کا بھی خیال نہ ہو، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے سو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر ہی دیتا ہے، یعنی اس شخص کا کام نمٹا دیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ جو ارادہ فرمائے گا اس کے ارادہ کے مطابق بندہ کا کام ہو کر رہے گا، بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

انسان اپنی زندگی میں کئی مسائل سے دوچار رہتا ہے، بسا اوقات مسائل اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ ضعیف و ناتواں انسان پریشانیوں میں ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے، وہ اپنے خواب واستراحت سے اور آرام وسکون سے محروم ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات عزیز وقریب اسے چھوڑ دیتے ہیں، یہ آیت کریمہ ایسی پریشانیوں کا اکسیری علاج ہے۔

حضرت عوف ابن مالک رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے لڑکے کو کافر پکڑ کر لے گئے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ اونٹ اور بھیڑ بکریاں تھیں وہ بھی لے گئے ہیں، اور ہم میاں بیوی اس کے بارے میں سخت پریشان ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صبر کرو، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرو، اور ساتھ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم دونوں: لاحول ولاقوۃ إلا باللہ بکثرت پڑھا کرو، چنانچہ دونوں نے لاحول ولاقوۃ إلا باللہ بکثرت پڑھنا شروع کیا، تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ دشمن ان کے لڑکے کی طرف سے غافل ہو گئے اور لڑکا دشمن کے قبیلے کی بکریوں کا ریوڑ ہنکا کر اپنے والدین کے پاس پہنچ گیا۔ امام بغویؒ نے لکھا ہے کہ وہ چار ہزار بکریاں تھیں، یہ آیت کریمہ اسی واقعہ پر نازل ہوئی۔ [مظهري]

تفسیر مظہری نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ تمام دینی اور دنیاوی مشکلات کے حل کے لئے لاحول ولاقوۃ إلا باللہ کا وِرد اکسیر کا درجہ رکھتا ہے، بشرطیکہ اس کو کثرت سے پڑھا جائے، اول وآخر سو سو مرتبہ درود شریف اور درمیان میں پانچ سو یا ہزار مرتبہ لاحول ولاقوۃ إلا باللہ پڑھے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ یہ مذکورہ دعا جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور نسائی کی روایت میں ہے کہ لا حول و لا قوۃ إلا باللہ ننانوے بیماریوں کا علاج ہے جن میں سے ادنیٰ بیماری غم اور پریشانی ہے۔ حضرت عوف ابن مالک رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس کا لڑکا کافروں کا بہت بڑا مال لے کر آیا ہے، وہ ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، یعنی:

﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ اس میں یہ اشارہ ہے کہ لڑکا جو زائد مال لے کر آیا ہے یہ مال حربی کفار کا ہے سو تمہارے لئے مباح ہے، فقہائے کرام نے اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ حربی کافر کا مال مسلمانوں کے لیے حلال ہے، اس مسئلے کی بہت سی تفصیلات فقہائے کرام نے بیان کی ہیں، فقہ کی کتابوں میں تو وہاں دیکھا جائے، فرمایا:

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ اللہ تعالیٰ اپنے علم میں ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ﴾ [الرعد:۸] (اس کے ہاں ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے)۔ اور سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [الحجر: ۲۱] (ہر چیز کے خزانے ہمارے ہی پاس ہیں، اور ہم ہر چیز کو اندازے کے مطابق نازل کرتے ہیں)۔

توکل کے بہت سے درجات ہیں، سب سے اونچا درجہ وہ ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، ان پر تجلی ربانی کا پرتو ہے، وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اسباب کو چھوڑ دیتے ہیں، اس سے کم درجہ یہ ہے کہ اسباب کو اختیار کرتے ہوئے کام کرنا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے نتیجہ اس پر چھوڑ دینا، یہ بھی بڑا کارآمد درجہ ہے جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا۔ ایک اعرابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں آیا اور اپنے اونٹ کو بغیر باندھے میدان میں چھوڑ کر حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا: اپنے اونٹ کو باندھ کر آئے ہو؟ کہنے لگا: اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر چھوڑ کر آیا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جا کر اونٹ کو باندھ لو، اسباب کو ترک نہ کرو۔

گفت پیغمبر بآواز بلند ☆ بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

(رومیؒ)

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لو أنکم توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدوا خماصاً وتروح بطاناً۔ اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے جیسا کہ اس کا حق ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق دے دیتا جیسا پرندوں کو دیتا ہے

کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس ہوتے ہیں۔

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہوں گے، ان کے اوصاف میں ایک یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے ہوں گے۔

توکل کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اسباب و آلات کو چھوڑ دے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب اختیار تو ضرور اختیار کرے مگر بھروسہ اسباب پر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر کرے کہ جب تک اس کی مشیت وارادہ نہ ہو جائے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

فائدہ:

رزق کی فراوانی، قضائے حاجات، شفاء بیماران، مسائلِ مہمہ کی آسانی کے لیے اس آیت کریمہ کو ستر مرتبہ پڑھنا مغرب وعشاء کے درمیان اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔

وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا ④ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ⑤ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰى یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَیْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ⑥ لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَیَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا ⑦

ترجمہ: اور تمہاری بیویوں میں سے جو عورتیں حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہیں، اور اسی طرح جن عورتوں کو حیض نہیں آتا، اور حاملہ عورتوں کی مدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا④ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری

طرف نازل فرمایا ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرمادے گا، اور اس کو بڑا اجر دے گا۵ تم ان عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو، اور تم ان کو تنگ کرنے کے لیے ضررمت پہنچاؤ، اور اگر وہ عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان پر خرچ کرو، پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لئے دودھ پلائیں تو تم ان کو اُجرت دو، اور باہم مناسب طور پر مشورہ کرلیا کرو، اور اگر باہم کشمکش کروگے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلا دے گی۶ وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہئے، اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے، اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے، اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی خوشحالی دے دے گا۷

معارف ومنازل

یہاں سے عدّت کے متعلق چند احکام ومسائل کا بیان ہے جس میں مطلقہ حاملہ، حائضہ اور آئسہ کی عدّت کا بیان ہے، وہ یہ کہ: ﴿وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ تمہاری مطلقہ بیبیوں میں سے جو عورتیں بوجۂ زیادتی عمر کے حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو ان کی عدّت کے تعین میں شبہ ہو یعنی اگر تمہیں شک ہو، شک سے مراد یہ ہے کہ اصل عدّت حیض سے شمار ہوتی ہے اور ان عورتوں کا حیض تو بند ہے تو پھر عدّت کی شمار کیسے ہوگی، یہ تردد مراد ہے، تو ان کی عدّت بجائے تین حیض کے تین مہینے ہے۔

﴿وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ﴾ اور اسی طرح جن مطلقہ عورتوں کو بوجۂ کم عمری کے اب تک حیض نہیں آیا تو ان کی عدّت بھی تین مہینے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں نابالغ لڑکی کا نکاح بھی جائز ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ اور حاملہ عورتوں کی عدّت یہ ہے کہ وہ بچہ جن لیں، یعنی ان کے حمل کا پیدا ہونا خواہ کامل ہو یا ناقص بشرطیکہ کوئی عضو بن گیا ہو، اگرچہ ایک انگلی ہی سہی، آگے وضع حمل میں یہ ضروری نہیں کہ طلاق کے بعد کئی مہینے گزر جائیں، بسا اوقات طلاق کے بعد ایک ہی دن میں وضع حمل ہو جاتا ہے بس عدّت گزر گئی۔ ان مسائل پر عمل کرنے کے لئے تقویٰ کا ہونا اور اتباعِ شریعت کا ہونا جاہلیت کے رسم ورواج سے دور ہونا ضروری ہے، اسی لئے دوبارہ فرمایا:

﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا﴾ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ان مسائل کی پابندی

کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دے گا، تو یہ ظاہر ہے کہ جو شخص سوچ سمجھ کر سنت کے مطابق طلاق دے گا تو اسے رجوع کا حق حاصل ہوگا، اور وہ مزید کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوگا، اس کے برخلاف اگر طلاق بائن دے گا، یا بیک وقت تین طلاقیں دے گا تو پھر پشیمانی کی صورت میں لازماً پریشان ہوگا۔ آگے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف اتارا ہے، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے گا اللہ تعالیٰ اس کی کوتاہیاں معاف کر دے گا، اور اس کو بڑے سے بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ فرمایا:

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ﴾ اس آیت کا تعلق اس پہلے حکم سے ہے جو اوپر گزر چکا ہے کہ مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو، اس آیت میں اس کا ایجابی پہلو ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو عدّت پوری ہونے تک اپنی وسعت وقدرت کے مطابق رہنے کا مکان دیدو جہاں تم خود رہتے ہو، اسی مکان کے کسی حصہ میں ان کو رکھو، اگر مطلقہ بطلاق رجعی ہے تو باہم کسی پردہ کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ نکاح ختم نہیں ہوا، البتہ اگر طلاق بائن دی ہے یا تین طلاق دے دی ہیں تو اس صورت میں نکاح کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، تو عورت کے لئے پردہ کا انتظام ضروری ہے، کیونکہ اب رجوع کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی، اور مرد وزن میں مکمل جدائی ہو چکی ہے۔

فرمایا: یہ بھی ضروری ہے کہ ایامِ عدّت میں جب مطلقہ عورت تمہارے گھر کے کسی حصہ میں رہے تو قانون اور اخلاق کی پاسداری کرتے ہوئے اس کو طعن وتشنیع کرنے سے اور بری باتوں سے اجتناب کرو تاکہ وہ تمہاری بداخلاقی اور سختیوں سے تنگ آکر نکلنے پر مجبور نہ ہو، چنانچہ یہ مسئلہ پہلے گزر چکا کہ انہیں دستور کے مطابق یا روک لو یا شریفانہ طریقہ پر رخصت کر دو، لہٰذا ایذاء رسانی اور فحش اور بدزبانی کے ساتھ اسے تنگ کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ اگر مطلقہ عورتیں بوقت طلاق حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک کہ ان کا بچہ پیدا نہ ہو جائے۔ مطلقہ حاملہ کے متعلق پوری امت کا اجماع ہے کہ اس کا نان ونفقہ اس کی عدّت جو کہ وضع حمل ہے پوری ہونے تک شوہر پر واجب ہے، باقی جو مطلقہ حاملہ نہیں اگر اس کو طلاق رجعی دی گئی ہے تو اس کا بھی نان ونفقہ عدت پوری ہونے تک باجماع امت شوہر پر واجب ہے۔

باقی وہ مطلقہ جس کو طلاق بائن یا تین طلاق دی گئی ہیں، یا وہ عورت جس نے خلع وغیرہ کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرایا ہو اس کے متعلق امام شافعی، امام احمد اور بعض دوسرے ائمہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول یہ ہے کہ اس کا نان ونفقہ شوہر پر واجب نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا نفقہ بھی شوہر پر واجب ہے، ان کے نزدیک جس طرح حق سکنیٰ (مکان رہائش کے لئے) تمام مطلقات کے لئے واجب ہے اسی طرح نفقہ بھی ہر قسم کی مطلقات کے لئے واجب ہے، دلیل یہی آیت ہے جس میں عام مطلقات کے لئے حق سکنیٰ (رہائش مکان) دینے کو لازم کیا گیا ہے، یعنی:

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ اور قرآن مجید میں یہ دستور ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے، اور ایک قرأت بھی دوسری قرأت کے لئے مفسر ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ کی مشہور قرأت جس میں لفظ اَنْفِقُوا مذکور نہیں، اس میں بھی یہ لفظ محذوف ہے، اور اس نے جس طرح تمام مطلقات کا حق سکنیٰ شوہروں پر لازم کیا ہے اسی طرح حق نفقہ بھی ایامِ عدّت تک واجب کر دیا ہے، اور اس کی تائید حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور دوسرے متعدد صحابہ کرام کے اس قول سے ہوتی ہے کہ انہوں نے فاطمہ بنت قیس کی جن کو ان کے شوہر نے تین طلاق دے دی تھی ان کی اس روایت کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نفقہ انکے شوہر پر لازم نہیں کیا حضرت فاروق اعظم اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کو رد فرمایا، اور انہوں نے پرزور انداز سے کہا کہ ہم فاطمہ بنت قیس کی روایت کی بناء پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قطعاً نہیں چھوڑ سکتے جس میں تمام مطلقات کا نفقہ دوران عدّت شوہروں پر واجب کیا گیا ہے۔ [بخاري، ومسلم]

اس میں کتاب اللہ کے حوالہ سے بظاہر یہی آیت مراد ہے، اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک مفہوم آیت میں سکنیٰ کی طرح نفقہ بھی داخل ہے، اور سنت سے مراد وہ حدیث ہے جو خود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے امام طحاوی دار قطنی اور طبرانی نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے مطلقہ ثلاثہ کے لئے بھی نفقہ اور سکنیٰ واجب کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حمل والی عورتوں کا نفقہ دورانِ عدّت تو صراحۃً اس آیت نے واجب قرار دیا ہے، اسی لئے اس پر نکاح ابھی تک ٹوٹا نہیں، تو اس کا نفقہ بھی بالاتفاق واجب ہے، مطلقہ بائنہ یا ثلاثہ وغیرہ کے معاملہ میں فقہائے امت کا اختلاف ہے جس کا بیان ابھی ہوا، جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کا بھی نفقہ واجب ہے، اس مسئلے کی مکمل تفصیل اسی آیت کے تفسیر میں تفسیر مظہری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [معارف القرآن]

اب یہاں دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطلقہ حاملہ ہونے کی صورت میں جب بچہ پیدا ہوگا تو بچے کی پیدائش کے ساتھ اس کی عدّت پوری ہو جائے گی، اب اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ کیونکہ پیدا ہونے والا بچہ باپ ہی کا ہوتا ہے، تو فرمایا:

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾ یعنی مطلقہ عورتیں اگر حاملہ ہوں اور پھر حمل سے بچہ پیدا ہوگیا تو ان کی عدّت وضع حمل کے ساتھ پوری ہوگئی، اب نفقہ شوہر پر لازم نہیں رہا، مگر جو بچہ پیدا ہوا ہے اگر یہ مطلقہ ماں اس کو دودھ پلائے تو دودھ پلانے کا معاوضہ لینا اور دینا جائز ہوگا، اسی کو فرمایا کہ: ﴿فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾ مطلقہ عورت جب بچے کی پرورش کرے گی تو باپ کو اس کا خرچہ بھی برداشت کرنا پڑے گا، یعنی بچہ کے خرچہ کے علاوہ نہ صرف بچہ کا خرچہ بلکہ دودھ پلانے والی مرضعہ کا بھی خرچہ دینا پڑے گا۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ [البقرة: ۲۳۳] (اور مائیں اپنی اولاد کو کامل دو سال دودھ پلائیں)۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت شوہر کے نکاح میں ہو اس وقت بچوں کو دودھ پلانا خود ماں کے ذمہ ہوگا، اور جو کام کسی کے ذمہ خود واجب ہو اس پر معاوضہ لینا رشوت کے حکم میں ہوگا جو کہ ناجائز ہے، اور ایامِ عدّت بھی اس معاملے میں نکاح کے حکم میں ہے، کیونکہ عورت کا نفقہ جس طرح بحالتِ نکاح شوہر پر لازم ہے عدّت میں بھی واجب ہے، لیکن جب وضع حمل کے ذریعہ عدّت ختم ہوگئی اور عورت آزاد ہوگئی اب اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں رہا، اب اگر یہ عورت (اجنبیہ کی طرح) اس بچہ کو دودھ پلائے تو آیت مذکورہ نے اس کا معاوضہ لینے اور دینے کو جائز قرار دیدیا، اس معاملہ میں فرمایا:

﴿وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ﴾ اِئتمار کے لفظی معنی ہیں: باہمی مشورہ کرنا، اور ایک دوسرے کی بات قبول کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ دودھ پلانے کی اُجرت میں زوجین کو اس کی ہدایت دی گئی ہے کہ باہمی نزاع کی نوبت نہ آنے دیں، مطلقہ بیوی عام اُجرت سے زیادہ نہ مانگے، اور شوہر عام اُجرت کے مطابق دینے سے انکار نہ کرے، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں۔ آگے فرمایا:

﴿وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ﴾ اور اگر تم آپس میں ضد اور سختی کرو یعنی عورت اگر اپنے بچہ کو معاوضہ لے کر بھی دودھ پلانے سے انکار کردے تو اس کو قضاءً مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ ماں کی شفقت بچے پر سب سے زیادہ ہونے کے باوجود جب وہ انکار کر رہی ہے تو واقعی کوئی عذر ہوگا، لیکن اگر فی الواقع اس کو

عذر نہیں محض غصہ و ناراضگی اور ضد کی وجہ سے انکار کرتی ہے تو عند اللہ وہ گنہگار ہوگی، کیونکہ اس کی طرح کوئی مشفق اور مہربان دودھ پلانے والی شاید دستیاب نہ ہو۔ مگر قاضی کی عدالت اس کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کرے گی۔

اسی طرح اگر شوہر کو دودھ پلانے کی اُجرت دینے پر قدرت نہیں وہ نہایت مفلس اور محتاج ہے، اور کوئی دوسری عورت بلا معاوضہ یا اس معاوضہ سے کم پر دودھ پلانے کو تیار ہو جو معاوضہ مطلقہ ماں مانگتی ہے تو شوہر کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ ماں کا مطالبہ منظور کر کے اسی سے بچے کو دودھ پلوائے، بلکہ دونوں صورتوں میں دوسری دودھ پلانی والی عورت سے بچے کو دودھ پلوایا جا سکتا ہے۔ ہاں! اگر دوسری دودھ پلانی والی عورت بھی اتنا ہی معاوضہ طلب کرے جتنا ماں کر رہی ہے تو شوہر کے لیے باتفاقِ فقہاء یہ جائز نہیں کہ بچے کی ماں کو چھوڑ کر دوسری عورت سے اسی معاوضہ پر دودھ پلوائے۔

مسئلہ:

اگر دوسری عورت کو دودھ پلانے پر مقرر کیا گیا تو یہ ضروری ہے کہ دوسری دودھ پلانے والی عورت اس کی ماں کے پاس رکھ کر دودھ پلائے، اور اس عورت کو یہ اجازت نہیں کہ ماں کو چھوڑ کر بچہ اپنے گھر لے جا کر پرورش کرے، کیونکہ حضانت ماں کا حق ہے، یعنی تربیت اور اپنی نگرانی میں رکھنا۔ احادیثِ صحیحہ کی رو سے یہ ماں کا حق ہے، اس سے یہ حق سلب کرنا جائز نہیں ہے۔ [مظهري]

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ﴾ بیوی کے نفقہ کی مقدار میں شوہر کی حیثیت کا اعتبار ہوگا یعنی خرچ کرے وسعت والا آدمی اپنی وسعت کے مطابق، اور اس سلسلہ میں بخل و کنجوسی نہ کرے۔ ﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ﴾ اور جس شخص پر رزق تنگ ہو وہ صاحب استطاعت نہ ہو تو وہ اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرے، اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کے نفقہ میں بیوی کی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ شوہر کی حالت کے مطابق نفقہ دینا واجب ہوگا، اگر شوہر مالدار ہے تو امیرانہ نفقہ دینا واجب ہوگا، اگرچہ بیوی تنگ دست اور فقیر ہو، اور اگر شوہر غریب ہے تو غریبانہ نفقہ اس کے ذمہ واجب ہوگا اگرچہ بیوی مالدار ہو، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا یہی مذہب ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو اس کو عطا کردہ مال سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، اسی لئے تو مفلس شوہر پر اسی کی حیثیت کا نفقہ واجب ہوگا جو اس کی وسعت کے مطابق ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے عورت کو غریبانہ نفقہ پر قناعت اور صبر کرنے کی تلقین فرمائی، ارشاد ہے:

﴿سَيَجْعَلُ اللهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا﴾ یعنی کسی کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ہماری موجودہ تنگ دستی ہمیشہ رہے گی، بلکہ تنگدستی اور فراخی، فقر وفاقہ، مالداری، پریشانی اور خوشحالی سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ اس پر قادر ہے کہ موجودہ تنگ دستی کو ایک بے مثال فراخی اور مالداری کے ساتھ تبدیل کردے۔

صاحب روح المعانی نے فرمایا: اس آیت میں ایسے شوہروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراخی ملنے کی طرف اشارہ ہے جو مقدور بھر نفقاتِ واجبہ پورا کرنے کی کوشش میں رہیں، اور بیوی کو تنگ رکھنے کی عادت نہ ہوں، تو نتیجہ یہی ہوا کہ میاں بیوی دونوں کو فراخی ملنے کی طرف خوشخبری سنائی جارہی ہے۔ واللہ اعلم

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۞ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۞ اَعَدَّ اللهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۞ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللهُ لَهٗ رِزْقًا ۞ اَللهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۞

ترجمہ: اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے ربّ کے حکم سے اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی، سو ہم نے ان کا سخت حساب کیا، اور انہیں برا عذاب دیا ⑧ سو اس نے اپنے اعمال کا وبال چکھ لیا، اور ان کا انجام کار خسارہ ہوا ⑨ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار فرمایا، سواے عقل والو! جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نامہ نازل فرمایا ⑩ ایک ایسا رسول جو تم پر اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتا ہے، جو واضح طور پر بیان کرنے والی ہیں تاکہ ان لوگوں کو اندھیریوں سے نور کی طرف نکالے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی جنت میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اچھی روزی مقرر فرمائی ہے ⑪ اللہ تعالیٰ ایسا

ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور انہی کی طرح زمین بھی ان سب میں احکام نازل ہوتے رہتے ہیں تا کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو احاطہ علمی میں لئے ہوئے ہیں⑫

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں احکامِ قرآنی جو بیان ہوئے فرمایا: ان احکام کی خلاف ورزی نہ کرو، ورنہ تمہارے لئے مشکلات پیدا ہوں گی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بطور عبرت یاد دلایا کہ جن گزشتہ اقوام نے جب اللہ تعالیٰ کے حکموں کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کس طرح نیست و نابود کر دیا۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ﴾ بہت سی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے تجاوز کیا، اور اس کے رسولوں علیہم السلام کی اطاعت سے بھی، سو ان کی نافرمانی اور سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

﴿فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۞ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا﴾ پس ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا، اور ان کو سخت سزاء میں مبتلا کیا، پس انہوں نے اپنے غلط کاموں کی سزاء کا مزہ چکھ لیا، اور ان کے معاملے کا انجام خسارہ میں رہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پیدائش اسلامی فطرت پر ہوئی، پس انہوں نے اپنی فطرت کو ضائع کر دیا، انہیں اللہ تعالیٰ نے جو عقل و شعور عطا فرمایا تھا انہوں نے اسے برباد کیا، پس ان کی یاد دہانی کے لئے انبیاء و رسل علیہم السلام تشریف لائے، ان پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، مگر ان برگشتہ لوگوں نے ان کو جھٹلایا، اور ان کی تکذیب کی۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت و تبلیغ کو مسلسل جاری رکھا، اور عرصۂ دراز تک لوگوں کو توحید کی طرف بلایا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کئی زمانوں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو مہلت دے دی، جب ان کی ہدایت سے مایوسی ہوئی تو ان کا سخت محاسبہ ہوا، اور آسمانی عذابوں کی لپیٹ میں آ کر وہ لوگ اور ان کی بستیاں صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئیں، یہ ان کا دنیاوی عذاب تھا، جبکہ آخرت میں عذاب اس کے علاوہ ہوگا جس کو اگلی آیت میں فرمایا۔

ارشاد ہے: ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔

پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے کہ نافرمان اقوام پر مثلاً قومِ نوح، قومِ عاد وثمود، قومِ لوط وقومِ ابراہیم، قومِ شعیب اور قومِ فرعون وغیرہ پر اسی نوعیت کے عذاب نازل ہوئے جس سے وہ سب ہلاک و برباد ہوئے، اسی طرح مدینے کی اطراف

میں کئی یہودی بستیاں تھیں جن کے باشندے (بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ) اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے تھے، انہوں نے اسلام کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا تھا، ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی، کچھ مارے گئے اور کچھ جلاوطن ہوئے، ان کے مکانات، باغات، زمینوں اور مال و مویشیوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مسلمان قابض ہوگئے، اور اس طرح انہیں اسی دنیا میں سزا ملی، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے لئے آخرت میں عذاب شدید تیار ہے، اب اللہ تعالیٰ نے جب نافرمان قوموں کی تباہی کا ذکر کر کے لوگوں کو عبرت کا سبق دلانے کی خاطر فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا﴾ اے عقلمند لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر عذاب کی لپیٹ میں آجاؤ، اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے جس سے مراد قرآن کریم ہے، قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی وہ آخری کتاب ہے جو محض ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لئے ابدی نصیحت ہے، پھر قرآن مجید کے ساتھ یہ فرمایا:

﴿رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ یعنی اَرْسَلَ رَسُوْلاً ۔ اس آیت کی آسان توجیہ یہ ہے کہ یہاں لفظ اَرْسَلَ محذوف مانا جائے، تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا، یعنی قرآن کو اور بھیجا رسول کو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ ایک رسول بھی بھیجا ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی واضح آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، وہ آیتیں بالکل واضح اور مبنی برحقیقت ہیں کہ ان میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے، رسول کی بعثت اور آیات کے نزول کا مقصد یہ ہے تاکہ ایمان لانے اور اچھے اعمال انجام دینے والوں کو اندھیریوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے، یہ صفت اتنا اہم اور عالمگیر ہے کہ اس کا اطلاق یہاں اس آیت میں رسول اور قرآن پر ہوا، جبکہ سورۂ بقرہ میں اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کی طرف ہوا ہے جیسے کہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرۃ: ۲۵۷] (اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا دوست ہے جو انہیں تاریکیوں سے نکال ہدایت کی روشنی کی طرف لے آتا ہے)۔

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور نیک اعمال بھی انجام دیتا ہے ان کے متعلق یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کی جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے، ان کی یہ جنتی زندگی ابدی ہوگی جس پر نہ زوال آئے گا اور نہ ہی

اس کا خاتمہ ہوگا۔ ﴿قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بڑی بہتر روزی تیار کر رکھی ہے، جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے جنت میں اپنے بندوں کے لئے ایسی ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں، اور نہ کسی کان نے سنی ہیں، نہ وہ کسی دل میں کھٹکی ہیں، فرمایا: اَعْدَدتُّ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِینَ مَالَا اَعینَ رَأَتْ وَلَا اُذُنَ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَر۔ [مشکوٰۃ]

اسی طرح سورۃ السجدہ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدۃ:۱۷] (سو کسی نفس کو معلوم نہیں جو کچھ چھپا رکھا گیا ہے ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک، ان اعمال کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے) یعنی وہ نعمتیں جن کے دیکھنے کے بعد آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے کہ جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور انہی کی طرح سات زمین بھی۔

اس آیت سے اتنی بات تو واضح طور پر ثابت ہے کہ جس طرح آسمان سات ہیں ایسی ہی زمینیں بھی سات ہیں، پھر یہ سات زمینیں کہاں کہاں اور کس وضع وصورت میں ہیں، اوپر نیچے طبقات کی صورت میں تہہ بر تہہ ہیں، یا ہر ایک زمین کا مقام الگ الگ ہے، اگر اوپر نیچے طبقات ہیں تو کیا جس طرح سات آسمانوں میں ہر دو آسمانوں کے درمیان بڑا فاصلہ ہے، اور ہر آسمان میں الگ الگ فرشتے آباد ہیں، اسی طرح ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان بھی فاصلہ اور ہوا فضاء وغیرہ ہیں، اور اس میں کوئی مخلوق آباد ہے، یا زمین کے یہ طبقات ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، قرآن مجید ان تمام باتوں سے ساکت ہے۔

اور روایات حدیث جو اس بارے میں آئی ہیں ان میں اکثر احادیث میں ائمہ حدیث کا اختلاف ہے، بعض نے ان کو صحیح وثابت قرار دیا ہے، اور بعض نے موضوع ومنگھڑت تک کہہ دیا، اور عقلاً یہ ضرورت اس تحقیق پر موقوف نہیں، نہ ہم سے قبر میں یا حشر میں اس کا سوال ہوگا کہ ہم ان سات زمینوں کی وضع وصورت اور محل وقوع اور اس میں بسنے والی مخلوقات کی تحقیق کریں، اس لئے اسلم صورت یہ ہے کہ بس اس پر ایمان لائیں اور یقین کریں کہ زمین بھی آسمانوں کی طرح سات ہیں، اور سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا، قرآن مجید نے اتنی ہی بات بیان کی ہے، باقی جن باتوں کو قرآن مجید نے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا ہم بھی اس کی فکر وتحقیق میں کیوں پڑیں؟

سلف صالحین کا ایسی صورتوں میں طرز عمل یہی رہا ہے کہ انہوں نے فرمایا: أبهموا ما أبهمه الله۔ یعنی جس چیز

کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو، جبکہ اس میں تمہارے لئے کوئی عملی حکم نہیں ہے، اور تمہاری کوئی دینی یا دنیوی ضرورت اس سے متعلق بھی نہیں۔ [معارف القرآن]

قرآن حکیم میں آسمان وزمین کی تخلیق کا ذکر بے شمار مقامات پر اکھٹا آیا ہے، مگر ہر جگہ آسمانوں کو جمع اور زمین کو مفرد کے صیغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، پورے قرآن پاک میں یہ واحد آیت ہے جو زمین کی ایک سے زیادہ تعداد پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ احادیث وآثار میں زمینوں کے سات ہونے کا بکثرت ثبوت ملتا ہے۔ آگے فرمایا:

﴿يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ان ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے، اور یہ حکمِ الٰہی کی دو قسم ہیں: ایک تشریعی دوم تکوینی۔ تشریعی کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے مکلف بندوں کے لئے بذریعہ وحی بواسطہ انبیاء علیہم السلام احکام بھیجے جاتے ہیں جیسے زمین میں انسان اور جنات کے لئے آسمانوں سے فرشتے تشریعی احکام انبیاء علیہم السلام کے پاس لے کر آتے ہیں، جن میں عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور معاشرت کے قوانین ہوتے ہیں، ان کی پابندی پر ثواب اور خلاف ورزی پر عذاب ہوتا ہے۔

دوسرا حکم تکوینی ہے، یعنی تقدیرِ الٰہی کی تنفیذ سے متعلق احکام، جن میں کائنات کی تخلیق اور اس کی تدریجی ترقی اور اس میں موسموں کی تبدیلی، دن رات کی کمی زیادتی، سفلی اور علوی مخلوقات کا نظام اور مخلوقات کی موت وحیات، یہ سب احکامِ الٰہیہ پر حاوی ہے، اس لئے اگر ہر دو زمینوں کے درمیان فضاء اور فاصلہ اور اس میں کسی مخلوق کا آباد ہونا ثابت ہو جائے خواہ وہ مخلوق مکلف احکامِ شرعیہ کے نہ ہو تو اس پر بھی ﴿يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ﴾ صادق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر تکوینی اس پر بھی حاوی ہے۔

﴿لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ﴾ تا کہ تم جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نہ صرف ہر چیز پر قادر ہے، بلکہ: ﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا﴾ اور بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم کے واتھ احاطہ کر رکھا ہے، کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، یعنی ظاہری اور باطنی چیزوں کا جاننے والا، پس انسانوں کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی تمام صفاتِ کاملہ پر ایمان لائیں، اور اس کے نازل کردہ شرعی احکام کو تسلیم کرتے ہوئے ان پر عمل کریں، اسی میں ان کی نجات ہے، اور اسی پر آخرت کی فلاح کا دارومدار ہے۔

سُورَةُ التَّحْرِيْمِ

مدنيةٌ آياتها ۱۲ رکوعاتها ۲

سورۂ تحریم مدنی ہے، اس میں بارہ (۱۲) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ التحریم ہے جو اس کی پہلی آیت کے لفظ تُحَرِّمُ سے ماخوذ ہے، اور اس سورت کو سورۃ النبی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں چھیاسٹھ ٦٦ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ایک سو سات (۱۰۷) نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مدنی زندگی میں نازل ہوئی، اس کا نزول سورۃ الحجرات کے بعد ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں دو رکوع، بارہ (۱۲) آیات، تین سو ترپن (۳۵۳) کلمات، اور ۱۱۲۴ حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت میں عورتوں کے مسائل کا بیان ہوا، اس سورت میں بھی عورتوں کی وجہ سے بعض مسائل کا بیان ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ گزشتہ اور موجودہ دونوں سورتوں میں عائلی قوانین اور تدبیر منزل کا بیان ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

فرائض خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،احکامِ ضروریہ کفارہ وقسم کا بیان، انسان کے فرائضِ منصبی، کفار کے لئے تخویفات، مؤمنین کے لئے بشارات، توبہ کی ترغیب، تسلی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا باہمی مکالمہ، مجازاتِ اعمال، حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے نتائج، حضرت آسیہ و مریم علیہما السلام کے فضائل اور فرشتوں کی قوت اور سختی کا بیان ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ①
قَدۡ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمۡ تَحِلَّةَ اَیۡمَانِكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ مَوۡلٰىكُمۡ ۚ وَهُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَكِیۡمُ ②

ترجمہ: اے نبی! آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کیا؟ آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے، مہربان ہے ① اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا مقرر فرما دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارا مولیٰ ہے، اور وہ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے ②

معارف ومنازل

اس سے پہلی سورت میں اہل ایمان کی ازدواجی زندگی سے متعلق احکام وہدایات کا ذکر ہوا، اس سورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خانگی زندگی کے کچھ حالات بیان ہورہے ہیں۔ ان آیات کے شان نزول کے بارے میں دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں: پہلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے امام بخاری وامام مسلم نے اپنی صحیحین میں نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ نماز عصر کے بعد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجروں میں تشریف لے جاتے تھے، اور تھوڑا تھوڑا وقت ہر بیوی کے پاس تشریف رکھتے، ایک دن ایسا پیش آیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی خدمت میں کسی نے شہد کا تحفہ بھیجا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے کاشانۂ اقدس میں رونق افروز ہوتے تو وہ بڑے اہتمام سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شہد پیش کرتیں، طبعی طور پر آپ کو شہد بہت پسند تھا، اسی لئے نوش فرماتے، اس

طرح حضرت زینبؓ کے ہاں عام معمول سے زیادہ قیام ہوجاتا، لیکن جن امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے حصہ سے یہ لمحے صرف ہوتے ان کے لئے یہ صوتحال ناقابل برداشت ہونے لگی، محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے رقابت کا جذبہ اتنا ہی قوی ہوتا ہے، آخر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ضبط نہ ہوسکا، انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت زینبؓ کے پاس سے اٹھ کر ہم میں سے جس کے پاس آئیں تو وہ یہ کہے کہ یا رسول اللہ! آپ کے منہ مبارک سے مغافیر کی بو آرہی ہے، کیا آپ نے مغافیر تناول فرمایا؟

مغافیر عرفط درخت کی گوند ہے، جس سے خفیف بدبوئی آتی ہے، انہیں علم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نفاستِ مزاج کے باعث ہر قسم کی بدبو کو سخت ناپسند کرتے ہیں، جب آپ حضرت حفصہؓ کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے یہی بات عرض کردی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے مغافیر تو نہیں کھایا بلکہ زینب بنت جحش کے پاس شہد پیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے رخصت ہوکر حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے بھی یہی بات عرض کردی، اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں مغافیر نہیں کھایا، کہنے لگی: ہوسکتا ہے کہ شہد کی مکھی نے مغافیر کی بوٹی کو چوسا ہو، جس سے پیدا شدہ شہد میں مغافیر کی بدبو یا ذائقہ آیا ہو۔ فرمایا: میں نے زینب بنت جحش کے پاس شہد تو پیا ہے مزید مجھے کسی مغافیر کا پتہ نہیں، اور میں نے قسم کھائی ہے کہ اس کے بعد ہرگز نہیں پیوں گا۔

اور سوال کرنے والی بیوی سے یہ بھی ارشاد فرمایا، یعنی حضرت حفصہؓ سے کہ تم یہ بات کسی کو نہیں بتانا، اسی پر ان آیات کا نزول ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا کہ اے نبی! جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال قرار دی ہیں آپ ان کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہیں؟ آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں، یہ حرام قرار دینا ان کی خوشنودی کے لئے ہے، اور پھر اس پر قسم بھی کھانا، یہ آپ کے شایان شان نہیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک کنیز تھی حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کے بطن سے آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے، جو بعد میں اٹھارہ ماہ کی عمر میں انتقال فرماگئے، ایک روز ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی باری تھی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے کر اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملنے چلی گئیں، وہیں حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی آگئیں، اور تخلیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہیں، اتنے میں حضرت حفصہ بھی واپس آگئیں، اور باہر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دروازہ کھولا اور حضرت حفصہؓ نے ماریہ کو اپنے حجرے میں دیکھا تو انہیں سخت ناگوار گزرا، اور یوں شکوہ کرنے لگی: میری

باری، میرا حجرہ، میرا بستر اور ماریہ؟ یا رسول اللہ! آپ مجھے حقیر سمجھتے ہیں، اس لئے آپ نے ان کو میرے گھر میں بلایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جان نثار زوجہ کی غم زدہ گی اور تڑپ دیکھ کر قسم کھائی کہ آئندہ ماریہ سے ازدواجی تعلقات نہیں رکھوں گا، اور حضرت حفصہ ؓ کو تاکید فرمائی کہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا، اس پر لطیف و خبیر جل شانہ نے اپنے نبی کو تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہ آپ کے شایان شان نہیں کہ آپ اپنی کسی بیوی کو خوش کرنے کی خاطر اور اس کی حوصلہ افزائی میں کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیدیں۔

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ اللهُ لَكَ﴾ اے نبی! آپ کیوں حرام قرار دیتے ہیں اس چیز کو جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کی ہیں، شہد کو یا لونڈی یا دونوں چیزیں جو آپ کے لئے حلال تھیں۔ فرمایا:

﴿تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ﴾ کیا آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں جس کی وجہ سے حلال چیز کو آپ نے حرام قرار دیا۔ حرام قرار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ شرعاً یا عقیدۃً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلال کو حرام قرار دیا، بلکہ محض اس کا استعمال حرام قرار دے دیا تھا۔ فرمایا: ﴿وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی عظمت بتاتی ہے کہ ترک اولیٰ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام عالی کے خلاف ہے، یہ بھی واقع نہیں ہونا چاہئے تھا، اور جو کچھ ہو گیا اللہ تعالیٰ نے اسے بھی معاف فرما دیا۔ واضح ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعتقاداً حلال کو حرام نہیں قرار دیا تھا، بلکہ ترک مباح پر قسم کھالی تھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قسم اور اس کے کفارہ کا قانون بیان فرمایا:

﴿قَدْ فَرَضَ اللهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسموں کو کھول دینے کو فرض قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے اگر مباح چیز کی قسم کھالی کہ میرے اوپر حرام ہے قسم اٹھالی ہے تو اس کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کر دے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حکم کے مطابق قسم کو توڑ کر ایک غلام یا لونڈی آزاد فرمائی۔ اس میں لفظ لَكُمْ بڑھا کر یہ بتا دیا کہ یہ حکم ساری امت کے لیے ہے کہ جب وہ کسی چیز کی قسم کھائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس سے نکلنے کا جو طریقہ مشروع فرمایا ہے، اس کے مطابق عمل کر لے، یہ قسم کا کھولنا یعنی قسم کھا کر جو بات اپنے ذمہ کر لی ہے اس سے نکلنا دو طریقوں سے ہے: ایک تو یہ ہے کہ قسم کو پورا کر لے، بشرطیکہ معصیت نہ ہو، اگر قسم معصیت کے قبیلے سے ہے تو اس کا پورا کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر قسم ٹوٹ جائے، یا اسے قصداً توڑ دے تو اس کا علاج یہ ہے کہ کفارہ دیدیا جائے۔

ان دونوں صورتوں سے قسم ختم ہو جاتی ہے، اور اس کا حکم باقی نہیں رہتا، پھر یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ ایک قسم تو وہ ہے کہ اللہ کی قسم میں ایسا کروں گا، یا ایسا نہیں کروں گا، پھر یہ معلق اور غیر معلق دونوں طرح کا ہوتا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی حلال کو اپنے اوپر حرام کردے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بھی یمین ہے، اس کا بھی کفارہ واجب ہے، جیسا کہ قسم کی خلاف ورزی کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی تمہارا آقا اور کارساز ہے۔ یہ خطاب ساری امت کو ہے، اور شفقت و رحمت کی انتہاء نہیں کہ کسی مباح چیز کو ترک کرنے پر ڈانٹ اور تنبیہ بھی ہے، اور ساتھ ساتھ دل جوئی بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مولیٰ اور کارساز ہے۔ ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ اور وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمتوں والا ہے، وہ تمہاری نیت اور ارادے سے بھی واقف ہے۔

❁ ❁ ❁

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ
اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۳ اِنْ
تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝۴ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا
مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝۵

ترجمہ: اور جب نبی نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے آہستہ سے بیان فرمادی، پھر جب وہ بات اس بیوی نے بتادی اور اللہ تعالیٰ نے وہ بات نبی پر ظاہر فرمادی تو پیغمبر نے کچھ بات بتادی اور کچھ بات سے اعراض کیا، پھر جب نبی نے وہ بات اس بیوی کو بتادی تو اس نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی اس کی؟ آپ نے فرمایا: مجھے جاننے والے اور خبر رکھنے والے نے خبر دی ۝۳ اے دونوں بیویو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلو تو تمہارے دل مائل ہو گئے، اور اگر پیغمبر کے مقابلہ میں تم دونوں آپس میں کارروائیاں کرتی رہو تو اللہ تعالیٰ ان کا مولیٰ ہے، اور جبریل بھی اور نیک مسلمان بھی، اور ان کے علاوہ فرشتے بھی مددگار ہیں ۝۴ اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدل ان کو تم سے اچھی بیویاں عطاء فرمادے گا، جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، فرمانبرداری کرنے

والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں ہوں گی، کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں ۵

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ ؓ کے سامنے شہد کو استعمال نہ کرنے اور حضرت ماریہ قبطیہ ؓ سے فائدہ نہ اٹھانے کی قسم کھالی تھی، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوئی، اب ان آیات میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو تنبیہ کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ﴾ اور جب اللہ تعالیٰ کے نبی نے اپنی بیویوں میں سے ایک کو ایک بات پوشیدہ طور پر بتلائی، اور اسے تاکید بھی کی کہ کسی سے ذکر مت کرنا، پھر جب اس بیوی (حضرت حفصہ ؓ) نے اس راز کو فاش کر دیا اور دوسری بیوی (حضرت عائشہ ؓ) کو بتا دیا، اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے نبی کو اطلاع کر دی کہ راز کی بات اس بیوی نے دوسری بیوی کو بتا دی ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کا کچھ حصہ اپنی زوجہ محترمہ ؓ پر ظاہر کر کے تنبیہ فرمائی کہ تمہیں اس راز کو آگے نہیں چلانا چاہئے تھا، جس کی میں نے تجھے سخت تاکید کی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کچھ بات بتا دی، اور کچھ بات سے خاموشی اختیار فرمالی، یعنی اس کو صیغۂ راز میں رکھا۔

دراصل اس سے یہ بات مراد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ ؓ سے فرمایا تھا کہ کسی کو خبر نہ دینا۔ حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اس شہد اور ماریہ ؓ کے متعلق جو فرمایا تھا اس وقت یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرے بعد ابو بکر ؓ اور اس کے بعد عمر ؓ خلیفہ ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کہہ کر باہر تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ ؓ نے حضرت عائشہ ؓ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور انہیں خوشخبری سنائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی باندی کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیا ہے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ ؓ کو یہ جتا لیا کہ تو نے میری بات حضرت عائشہ ؓ سے کیوں کہی؟ تو اس نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو کس نے خبر دی کہ میں نے آپ کا راز افشا کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اس ذات نے خبر دی ہے جو علیم ہے خبیر ہے۔

چونکہ حضرت حفصہ ؓ نے حضرت عائشہ ؓ کو باندی حرام کرنے والی بات بھی بتا دی تھی، اور خلافت والی بات بھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ایک بات کا ذکر فرمایا، اور ایک بات چھوڑ دی یعنی یوں نہیں فرمایا حضرت

حفصہؓ سے کہ تو نے عائشہؓ کو خلافت والی بات بھی بتائی ہے، آپؐ چاہتے تھے کہ خلافت والی بات لوگوں میں نہ پھیلے۔

تو فرمایا: ﴿فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ﴾ جب سرور عالم ﷺ نے بیوی کو افشائے راز کی خبر دی تو وہ کہنے لگی کہ آپ کو کس نے بتایا کہ میں وہ راز عائشہؓ کو بتا چکی ہوں؟ حضرت حفصہؓ کو تو پورا یقین تھا کہ حضرت عائشہؓ نے تو نہیں بتایا، کیونکہ وہ میری سہیلی ہے جس پر مجھے اعتماد ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس ذات خداوندی نے بتایا ہے جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے مجھے خبر دی ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ اگر تم دونوں راز کو بتانے والی اور اس کو سننے والی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کر لو تو بے شک تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں، اور تمہارے لئے یہی بہتر ہے۔ امام قرطبیؒ یہاں فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ دونوں ازواج مطہرات حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہو کر ان کے دل ندامت کی وجہ سے توبہ کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ لیکن بعض مفسرین نے یہ معنی کیا ہے کہ تم نے نبوت کے راز کو قائم نہ رکھ کر تمہارے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے دلوں میں نہ کوئی بدنیتی تھی، نہ آنحضرت ﷺ کے خلاف کوئی سازش، اور نہ ہی ان کے دل ٹیڑھے ہوئے تھے، وہ محض کم حوصلگی کی وجہ سے اس طرح کی باتوں میں پھنس گئیں، کیونکہ ان کا مرتبہ بہت ہی اونچا ہے، پس ان کی معمولی غلطی بھی قابل گرفت ہے، اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ایک خاوند کی متعدد بیویوں کے درمیان خواہ وہ کتنے اونچے درجے کے لوگ کیوں نہ ہوں اس قسم کی رقابت ایک فطری اور غیر اختیاری امر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ﴾ جس طرح سے ایک شوہر بیویوں کے درمیان مکمل برابری اور مساوات قائم رکھنے سے ایک حد تک عاجز ہے تو عورتیں اس معاملہ میں اور بھی زیادہ غیر محتاط رہتی ہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ھن ناقصات العقل و الدین۔ فرمایا:

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ﴾ اے نبی کی بیویو! اگر تم نبی کے خلاف جتھہ بندی کرو گی، اور آپ ﷺ کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گی تو یاد رکھو! کہ اس میں نبی کا کچھ نقصان نہیں ہوگا، بلکہ الٹا تمہیں ہی نقصان اٹھانا پڑے گا، کیونکہ: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ﴾ بے شک

نبی کا کارساز، نبی کا آقا اور معاون و مددگار تو اللہ تعالیٰ ہے، اور جبرائیل بھی، اور سارے نیک مؤمن بندے بھی آپ کے ساتھی اور معاون ہیں، اور ان سب کے بعد اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے معاون ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کے لئے ہر طرف سے مددگار موجود ہیں، مگر تمہارے لئے کوئی مددگار ہی نہ ہوگا، لہٰذا نبی کی مخالفت سے تمہارا ہی نقصان ہو گا، پس جتھہ بندی اور گروہ بندی تمہارے لئے بہتر نہیں ہے، تم سراپا وفادار اور فرمانبردار رہو، یہی تمہاری سعادت ہے، ورنہ سنو!

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا نبی تمہیں طلاق دیدیں تو کوئی بعید نہیں کہ اس کا پروردگار اس کے لئے بیویاں تبدیل کر دے جو تم سے بہتر ہوں، تم یہ نہ سمجھو کہ ہماری غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ کے نبی کو کوئی زحمت اٹھانا پڑے گی، نہیں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تم سے بہتر بیویاں عطاء کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اگرچہ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن میں خیر کا پہلو ہی غالب تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہ اور سرزنش کے طور پر دوٹوک الفاظ میں تنبیہ فرمادی کہ اپنے ذہن میں کوئی گھمنڈ نہ لانا، بلکہ عاجزی اختیار کرو، یہ تمہارے لئے بہت بڑا شرف ہے، اور نہایت اونچا مقام ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہو، اور قیامت تک آنے والے اربوں کھربوں مسلمانوں کی مائیں ہو، اور تمہارا یہ منصب صرف دنیوی نہیں بلکہ اخروی بھی ہے، اگر اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ نبی کے لیے تم سے بہتر دوسری بیویوں کا انتظام فرمائے تو ان کی صفات یہ ہوں گی:

﴿مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا﴾ نبی کی نہایت فرمانبردار ہوں گی، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کمال درجے کا ایمان رکھنے والیاں ہوں گی، اطاعت کرنے والیاں ہوں گی، توبہ کرنے والیاں ہوں گی، عبادت گزار ہوں گی، روزہ رکھنے والیاں ہجرت کرنے والیاں ہوں گی، خاوند دیدہ بھی ہوسکتی ہیں اور دوشیزہ بھی ہوسکتی ہیں۔ یہاں پر ثَيِّبٰت کا تذکرہ اس لئے مناسب اور قابل ذکر فرمایا کہ ثیبہ عورتیں تجربہ کار، مزاج شناس، خدمتگار اور محبت کرنے والیاں ہوتی ہیں۔

❀ ❀ ❀

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ

غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝٦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا
تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً
نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ
بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٨ يٰٓاَيُّهَا
النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٩

ترجمہ: اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، اس پر فرشتے مقرر ہیں جو سخت مزاج ہیں، مضبوط ہیں، وہ اس کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ۞ اے کافرو! آج عذر بیان نہ کرو، تمہیں اسی چیز کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے ۞ اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے حضور میں سچی توبہ کرو، قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے گناہوں کا کفارہ فرمادے گا، اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور ان کو رسوا نہ فرمائے گا جو اہل ایمان ان کے ساتھ ہیں، ان کا نوران کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا، وہ عرض کرتے ہوں گے کہ ہمارے ربّ ہمارے نور کو پورا فرمادیں، اور ہماری مغفرت فرمادیں، بیشک آپ ہر چیز پر قادر ہیں ۞ اے نبی! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجئے، اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے لوٹنے کی ۞

معارف ومنازل

پیغمبر کی بیویوں کے لئے قانون بیان کرنے کے بعد اب تمام اہل ایمان کے لئے نصیحت ہے کہ اپنے اہل و عیال، متعلقین و منسلکین اور گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی تدبیر کریں، تو ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو یعنی اپنے پورے خاندان کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، ایک متقی آدمی جب کفر و شرک اور نفاق والحاد سے اور کبائر وصغائر سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اور حدود شریعت کی حفاظت کرتا ہے، اور اپنے لئے جنت کا راستہ اور سعادت حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے تو اسے چاہئے بلکہ اس پر یہ فرض ہے کہ اپنے گھر والوں کو اور پورے خاندان کو نیکیوں کا

راستہ اور تقویٰ اور اعمالِ صالحہ ایسا سکھائے جیسے اس نے خود سیکھا تا کہ اپنے گھر والوں رشتہ داروں کو جہنم کی آگ سے بچائے۔امام بغویؒ نے اپنی کتاب "شرح السنہ" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ والدین سے باز پرس کرے گا کہ تم نے بیوی بچوں کو اچھا راستہ کیوں نہ دکھایا؟ اور ان کو صحیح تعلیم کیوں نہیں دی؟ اور ادھر اولاد سے بھی سوال ہوگا کہ جب تمہارے والدین تمہیں اچھی بات کی نصیحت کرتے تھے تو تم نے کیوں اس کو قبول نہ کیا؟

بہر حال! انسان کو سب سے پہلے اپنی فکر کرنی چاہئے کہ اپنا عقیدہ درست رکھے، اچھے اعمال اختیار کرے، برائیوں سے پرہیز کرے، حسن اخلاق کا اہتمام کرے، پس اپنے متعلقین کو بھی اسی راستے پر ڈالنے کی کوشش کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے خود بھی بچے اور اپنے گھر والوں کو بھی بچائے، انہیں دینی احکام سکھائے، اور ان پر عمل کرائے، ان کو حلال رزق وروزی کمانے کی تلقین کرے، اور خود حلال کما کر اپنے گھر والوں کو کھلائے۔ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا کہ جو گوشت حرام سے پلا بڑھا ہوگا جنت میں داخل نہ ہوگا، اور جو گوشت حرام سے پلا بڑھا ہوگا دوزخ اس کی زیادہ مستحق ہوگی۔ [مشکوٰۃ: ص ۲۴۲]

کتاب الامارۃ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک شخص ابن لتبیہ کو مال غنیمت اور زکوٰۃ و صدقات کی وصولی کے لئے ایک علاقے میں بھیجا، وہ شخص جب واپس آیا تو کہنے لگا کہ یہ تو مال زکوٰۃ ہے جو بیت المال میں جائے گا، اور یہ مال لوگوں نے مجھے عطیہ دیا ہے، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اگر تم اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہتے تو کون تمہیں تحفے بھیجتا؟ جس مال کو تم ہدیہ قرار دے رہے ہو یہ تو رشوت ہے، کیونکہ یہ عطیہ وبخشش تمہیں اس عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے ملا ہے، یہ تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں۔

پھر فرمایا کہ قیامت کے دن کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے جو اپنے سروں پر جانور، کپڑے اناج اور دیگر مال واسباب اٹھائے ہوئے ہوں گے، اور مجھ سے کہیں گے کہ ہماری گرفت ہوگئی ہے آپ ہمیں کسی طریقے سے بچائیں، مگر میں یہی کہوں گا: **لا أملک لکم من اللہ شیئا و قد بلغت**۔ اے لوگو! یاد رکھو! میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں آج تمہاری حمایت میں کچھ نہیں کرسکتا، میں نے دنیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم بتا دیا تھا کہ خیانت نہ کرنا اور رشوت نہ لینا، کسی کا حق نہ مارنا، ناجائز طریقوں سے مال جمع نہ کرنا، اس وقت تو تم نے میری بات نہ مانی اور میری نصیحتوں کو نظر انداز کیا، دنیا اور مال کی محبت میں اندھے ہوگئے، آج میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا، تم

اپنی برائیوں کی سزا خود بھگتو۔ [بخاري] اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کو بھی خطاب ہے: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] (اے نبی! اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ کا ڈر سنائیں) تا کہ وہ ایمان قبول کر کے دوزخ کی آگ سے بچ جائیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے قریش اور اس کے تمام خاندانوں کو اپنے عزیزوں سمیت خطاب فرمایا، اور انہیں صاف صاف بتادیا، حتی کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور اپنی پھوپی حضرت صفیہؓ اور حقیقی چچا حضرت عباسؓ کو بھی خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمہارے لئے روز قیامت کچھ نہیں کر سکتا، تم اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کی خود تدبیر کرو، یعنی ایمان لے آؤ۔ [بخاري]

صحیحین میں آنحضرت ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ألا كلكم راع وكلكم مسؤل عن رعيته۔ خبردار! تم سب حاکم ہو یعنی ذمہ دار ہو، تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: فالرجل راعٍ على أهل بيته فهو مسئول عنه۔ ہر آدمی اپنے گھر والوں کے لئے حاکم ہے، اور ان کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص معاشرے میں کسی بھی حیثیت میں ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماتحت اور زیر دستوں کو نیکی کا حکم کرے، اور برائی سے بچنے کی تلقین کرے۔

بزرگوں نے اس حدیث کی رو سے فرمایا ہے کہ گھروں میں اکثر عورتیں بے نماز اور بے دین ہوتی ہیں، قیامت کے دن ایسی عورتوں کے متعلق چار مردوں سے باز پرس ہوگی: عورت کے باپ سے، اس کے بھائی سے، اس کے شوہر اور اس کے بیٹوں سے، اور یہ باز پرس محض زبانی نہیں ہوگی بلکہ انہیں سزا بھی ملے گی۔

ترمذی اور مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ کسی والد نے اپنی اولاد کو اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں دیا کہ اس کی تعلیم وتربیت اس طرح کردی کہ وہ نیکی کو اختیار کرے، عقیدے کو درست کرے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، اخلاق کو درست رکھے، اور برائیوں سے بچتا رہے تا کہ وہ آتش دوزخ سے بچ جائے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مروا أولادكم بالصلوة إذا بلغوا سبعاً واضربوا هم عليها إذا بلغوا عشرا۔ جب بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو ان کو نماز کا حکم دو، کیونکہ انسان میں ابتدائی شعور سات سال کی عمر میں پیدا ہونا شروع ہوتا ہے، دس سال کی عمر میں شعور درمیانہ درجے کو پہنچتا ہے، اس وقت نماز چھوڑنے پر انہیں ادب کی خاطر درمیانہ درجہ مارا کرو، اور نماز پڑھاؤ، اس کے بعد بچوں کو ایک بستر پر نہ سلاؤ، بلکہ ان کے بستر الگ کردو۔

بچوں کو ہدایت کرنے کے کئی طریقے ہیں، انہیں کسی چیز کا لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر یا پیار و محبت سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے ان کو سمجھا کر، یا یہ کہ نیکی کرنے پر ان کو انعام دے کر اور نہ کرنے پر ان کو جرمانہ کر کے مار پیٹ کر ان سب طریقوں کو آزمایا جائے، امید ہے ان شاء اللہ بچے بچپن ہی سے نیک بننا شروع ہوں گے۔ آگے دوزخ کی سختی کا بیان فرمایا:

﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں جو اس میں جلیں گے، ان پتھروں سے مراد عام پتھر بھی ہو سکتے ہیں، اور وہ پتھر بھی جن کو بتوں کی شکل میں گھڑ کر ان کی پوجا کی جاتی تھی، اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا شدید ہے۔ [مشکوۃ: ص ۲۴۲]

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ جہنم پر کارندے کے طور پر فرشتے مقرر ہیں جو تند خو اور سخت مزاج ہیں، نہ کسی سے رعایت کرتے ہیں اور نہ کسی پر ان کو ترس آئے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے، جہنمی روتے پیٹتے رہیں، یا چیختے چلاتے رہیں، وہ نہ اس طرف توجہ کرتے ہیں نہ سنتے ہیں، اور نہ ان پر کوئی اثر ہوتا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ان کی شکلیں بھی بڑی دہشت ناک ہوتی ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ مرتے وقت ایمان والوں کے سامنے فرشتے اچھی شکل وصورت میں آتے ہیں، اور قبر میں بھی یہی حال ہوگا کہ مؤمن کے پاس اچھی شکل والے فرشتے آئیں گے، اس کے برخلاف مشرک، کافر، منافق، معاصی و کبائر کا دلدادہ ایسے لوگوں کے پاس بڑی خوفناک شکلوں والے فرشتے آتے ہیں جن کی وجہ سے اس گناہ گار کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر خیر و شر سے خبردار کر دیا ہے۔ اس کے بعد کافروں کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ﴾ اے کفر اختیار کرنے والو! اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور قیامت و جزاء عمل کا انکار کرنے والو! آج کے دن کوئی بہانہ نہیں سنا جائے گا، آج تمہاری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی، نہ کوئی تمہارا حمایتی ہوگا اور نہ تمہارا کوئی مددگار، عمل کا زمانہ دنیا میں ختم ہو چکا، آج مجرموں کو سزا سنانے کا دن ہے، نہ کسی کے عذر و معذرت سنی جائے گی اور نہ مجرموں کی مغفرت ہوگی۔ ہاں! ﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ بیشک تمہیں آج ان کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو کچھ تم دنیا میں کیا کرتے تھے، جو بویا وہی کاٹو۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ☆ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے ناری ہے

گزشتہ آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اپنی کوتاہیوں پر توبہ کرنے کی تلقین کی گئی تھی، اب ان آیات میں عام مسلمانوں کو خالص توبہ کی تلقین کی جارہی ہے، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے حضور صدق دل سے خلوص کے ساتھ توبہ کرو، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ امید ہے اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیاں دور فرمائے گا، یعنی تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اور تم کو اپنی رحمت کی ان جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ مسلمانوں کے لئے طہارت ظاہری ہو یا باطنی وہ ایمان کا ایک حصہ ہے، جس طرح صبح وشام وضو اور غسل کے ذریعہ ظاہری طہارت کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح باطنی طہارت جس کے ذریعہ صغیرہ وکبیرہ سارے گناہ معاف ہوں وہ توبہ ہے، توبہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ بہت ہی راضی ہوتا ہے، اور بار بار توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوجاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک فرائض ادا کرنے کے بعد سب سے پسندیدہ عمل توبہ ہے، اور جو شخص بار بار گناہ کرتا ہے اور فوراً بار بار توبہ بھی کرتا ہے وہ گناہوں سے ایسے پاک ہوجاتا ہے جیسے کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔

توبہ کی عظمت کا اور اس کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مشرک سینکڑوں سالوں سے کفر اور معاصی میں اٹناڈوبا رہتا ہے کہ اس کے بدن میں ایک بال برابر پاکیزگی نہیں ہوتی، اور وہ سرتاپا نجاستوں میں لت پت رہتا ہے، لیکن جب وہ اپنی ناپاکیوں سے توبہ کرکے اسلام قبول کرلیتا ہے تو اس کی ساری زندگی کی ناپاکیاں معاف ہوجاتی ہیں۔

آیت کریمہ میں اسی توبۂ نصوح کی تلقین ہے، اور اس سے مراد عام توبہ نہیں، بلکہ وہ خالص توبہ مراد ہے جو صدق دل اور اخلاص کے ساتھ کی جائے، ایسی توبہ تمام مسلمانوں کے لئے سعادت اور فلاح کا پہلا زینہ ہے۔ قرآن کریم نے مختلف سورتوں میں مختلف انداز سے توبہ کے متعلق بار بار تلقین فرمائی ہے، اور ایسے توبہ کرنے والوں کے لئے بڑی بڑی بشارتوں کا تذکرہ فرمایا ہے، اب رہا یہ سوال کہ توبہ کیا چیز ہے، اور کیا اس کے لئے بھی کوئی شرائط ہیں؟

سو عرض ہے کہ توبہ ندامت ہی کا نام ہے، جب کوئی شخص اپنی غلطی پر نادم ہوجاتا ہے کہ میں نے یہ غلط کام کیوں کیا؟ مجھے یہ غلط کام نہیں کرنا چاہئے تھا، اور آئندہ کے لئے ایسا پختہ عزم وارادہ کرلے کہ ایسا غلط کام آئندہ نہیں

کروں گا، اور اس گناہ سے رک جائے تو گویا اس شخص نے توبہ کرلی۔

ہوسکتا ہے کہ کسی سے توبہ کے باوجود دوبارہ وہ گناہ سرزد ہو، اور وہ دوبارہ توبہ کرنے سے شرم محسوس کرتا ہو، پس بنیادی بات یہ ہے کہ بار بار توبہ کرنے سے شرم محسوس نہیں کرنا چاہئے، آخر انسان خطا ہی کا تو پتلا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں اتنی وسعت ہے کہ اس کی ایک ادنیٰ رحمت پوری کائنات سے وسیع ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سو (۱۰۰) رحمتیں ہیں جن میں سے ننانوے آخرت کے لئے ہیں اور ایک رحمت دنیا کے لئے، اس ایک رحمت کا اندازہ لگایئے کہ تخلیق کائنات سے لے کر نفخِ صور تک اس ایک رحمت کے سایہ میں ساری کائنات آباد ہے، لہٰذا بار بار توبہ سے نہیں شرمانا چاہئے۔ اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے: ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ کردی باز آ ☆ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

این درگہٗ ما درگہٗ نومیدی نیست ☆ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے توبہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ خالص توبہ کس طرح ہوسکتی ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ اگر توبہ کرنے کے بعد بدستور غلط کام جاری رہا، یا دل میں اخلاص پیدا نہیں ہوا تو یہ سچی اور خالص توبہ نہیں کہلائے گی، فرمایا: خالص توبہ وہ ہے جس میں یہ چھ چیزیں جمع ہوجائیں:

(۱) سابقہ غلطی یا غلط عمل پر ندامت ہو کہ یہ توبہ کا اولین جزو ہے۔ (۲) جو فرائض ترک ہوئے ہیں ان کو لوٹایا جائے۔ (۳) اگر کسی پر ظلم وزیادتی کی ہے یا حق تلفی کی ہے تو اس سے معافی مانگی جائے، اور اس کا حق لوٹایا جائے۔ (۴) اگر کسی کی بے آبروئی کی ہے، یا اس کی غیبت کی ہے، یا بہتان باندھا ہے تو اس سے معافی طلب کرے۔ (۵) دل میں پختہ عزم وارادہ کرے کہ آئندہ ایسا غلط کام نہیں کرے گا۔ (۶) اپنے نفس کو اطاعت اور نیکیوں پر اسی طرح آمادہ کرے جس طرح گناہ کے کام پر کیا کرتا تھا۔ [مظهري]

سو یاد رکھا جائے کہ معصیت کی مختلف اقسام ہوتی ہیں، مثلاً حقوق اللہ جس میں امر بالمعروف کا ترک اور ماموراتِ شرعیہ کا ترک اور منہیات کا ارتکاب، اور اسی طرح حقوق العباد کا تلف اور بندوں پر ظلم وزیادتی، ان میں سے ہر ایک کے لئے توبہ اسی مناسبت سے ہوگی۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے نیکیوں کے اندراج اور گناہوں کی معافی کا ایک عجیب وغریب نظام قائم کر رکھا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن انسان کے تین قسم کے دفتر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جائیں گے، اور پہلا دفتر اعمالِ صالحہ کا ہوگا جس میں تمام نیک

اعمال درج ہوں گے، دوسرا دفتر گناہوں کا ہوگا جس میں تمام برے اعمال درج ہوں گے، اور تیسرے دفتر میں انسانوں کو ملنے والی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اندراج ہوگا۔

فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جس آدمی کا محاسبہ کرنا چاہے گا اس کے تینوں دفتر پیش کئے جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ نعمتوں میں سے سب سے چھوٹی نعمت سے فرمائے گا کہ تو اس شخص سے اپنا حساب لے لے، یعنی اس انسان نے جو تمہیں استعمال کیا اس کی نیکیوں سے تم اپنا بدلہ لے لو، چنانچہ وہ نعمت انسان کی نیکیوں میں سے اپنا بدلہ طلب کرے گی، پس ایک معمولی سی نعمت کے عوض میں انسان کی تمام نیکیاں ختم ہوجائیں گی، مگر نعمت کا حق ادا نہیں ہوسکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی نعمت بھی انسان کے تمام اعمالِ صالحہ کو ہضم کرجائے گی، سو وہ شخص تہی دست رہ جائے گا، اس کی ایک نیکی بھی نہیں بچے گی، اور گناہوں کا بار ابھی اس کے سر پر ہوگا۔

پھر فرمایا کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے نرمی اختیار کرنا چاہے گا تو اس کو کہا جائے گا کہ اے بندے! آج میں نے تیری نیکیوں کو دوگنا کردیا ہے، اور میں نے تیرے گناہوں سے درگزر فرمایا ہے، اسی لئے تو فرمایا کہ سچے دل سے توبہ کرو تاکہ سارے گناہ معاف ہوں۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾[البقرۃ: ١٦٠] (جو لوگ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور ہدایت کی باتوں کو چھپانے کی بجائے ظاہر کردیں پس میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں، اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہوں)۔ آگے محاسبہ کے دن کی کیفیت کا بیان ہے، فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا، یعنی ان کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑے گا، بلکہ وہ اپنے نبی کی عزّت افزائی کرے گا، اور اس کو مقامِ محمود کے عظیم منصب پر فائز فرمائے گا، اور ساری خلقت کے لئے اس کی شفاعت عظمیٰ قبول فرمائے گا، پھر جب پلِ صراط کے اندھیروں پر سے گزرنے کی منزل آئے گی تو ایمان واعمالِ صالحہ کا نور جگمگاتے ہوئے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے ظاہر ہوگا، اسی کو فرمایا:

﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ایمان والوں کا نور ان کے سامنے اور دائیں طرف اعمالِ صالحہ کی روشنی ہوگی، جس کے ذریعہ وہ اندھیروں اور تاریکیوں کو عبور کرلیں گے، یہ روشنی چونکہ علیٰ قدر الاعمال ہوگی تو کسی

کی زیادہ اور کسی کی کم، یہاں تک کہ بعضوں کا نور انگلی کے ناخن برابر ہوگا، تو وہ اپنے ربّ کو پکارتے ہوئے یہ کہیں گے:

﴿یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ وہ بارگاہ ربّ العزت میں عرض کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے ہماری روشنی کو مکمل فرمادے، یعنی جو نور ایمان آپ نے ہمیں عطاء فرمایا اسے پورا فرمادیجئے اور باقی رکھیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صاحب روح المعانی نے نقل کیا ہے کہ جب منافقین کا نور بجھ جائے یعنی اہل ایمان کی روشنی میں وہ ان کے پیچھے پیچھے آئیں گے، اور جب مؤمنین آگے بڑھ جائیں گے تو منافقین ان سے پیچھے رہ جائیں گے، تو مسلمانوں سے درخواست کریں گے: تم ذرا ٹھہر جاؤ ہم بھی تمہاری روشنی میں تھوڑا چل دیں، مگر ان کو مایوسی ہوگی وہ تاریکیوں میں ڈوب کر نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔ تفصیل سورۃ الحدید میں گزر چکی ہے۔

﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ اور ہمیں معاف فرمادیں۔ ﴿اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا، خطاب کا مقصد کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ آپ کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کریں تاکہ وہ اسلام قبول کر کے اپنی آخرت کی روشنی کا سامان اور پل صراط کو عبور کرنے کا ذریعہ حاصل کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اتنا کریم ہے کہ اس کی رحمت کا نہ اندازہ ہے نہ حد، نہ وہ کفر سے راضی ہے، نہ کسی کے جہنم میں جانے سے راضی ہیں، وہ یہی چاہتا ہے کہ میرے سارے بندے نور اور روشنی حاصل کر کے جہنم سے نجات پائیں، اور وہ الگ بات ہے کہ وہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، تو فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ اے نبی! آپ کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کافروں کے ساتھ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ ان کے خلاف تلوار کے ذریعے باقاعدہ جنگ کی جائے، اور ان کے خلاف قوت وطاقت جمع کرنے کا اہتمام کیا جائے، سامان ضرب وحرب جمع کر کے ان کو خوب سزا دی جائے، اور انہیں یہ بتادیا جائے کہ تمہاری آخرت تباہ ہونے والی ہے، جہاں تمہارا کوئی نور نہ ہوگا، اور تم مؤمنوں کے ساتھ پل صراط پر نہ گزر سکو گے، یہ سب کچھ ان کے ساتھ جہاد کرنے اور سختی کا معاملہ کرنے کو شامل ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے حضرت حسنؒ سے نقل کیا ہے کہ سختی کا معاملہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر حدود قائم کی جائیں، کیونکہ وہ ایسے کام کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے ان پر حد جاری کی جاسکتی تھی۔ صاحب روح المعانی نے

بھی حضرت حسنؒ سے یہ بات نقل کی ہے۔ اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منافقوں کی حرکتیں ایک عرصہ تک مسلمان برداشت کرتے رہیں، پھر سختی کے حکم کے ساتھ انہیں ذلّت کے ساتھ نام لے کر پکڑ پکڑ کر مسجد نبوی سے نکال دیا گیا۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

﴿وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾ کافروں کا ٹھکانہ آخر جہنم ہی ہے جو لوٹ کر جانے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا
صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ⑩ وَضَرَبَ
اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَنَجِّنِیْ مِنْ
فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ⑪ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا
فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ⑫

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کا حال بیان فرمایا، وہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے نکاح میں تھیں، انہوں نے ان دونوں سے خیانت کی، پھر وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ان عورتوں کے ذرا بھی کام نہ آسکے، اور حکم دیا گیا کہ تم دونوں دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ⑩ اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے فرعون کی بیوی کا حال بیان فرمایا ہے، جبکہ اس نے عرض کیا کہ اے میرے ربّ! میرے لئے اپنے قرب میں جنت میں گھر بنا دیجئے اور مجھے فرعون سے اور ظالم قوم سے نجات دیجئے⑪ اور عمران کی بیٹی مریم کا حال بیان فرمایا، جس نے اپنی ناموس کو محفوظ رکھا، سو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی، اور اس نے اپنے ربّ کے کلمات کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھیں⑫

معارف ومنازل

ان آیات میں دو خوش قسمت اور دو بدقسمت عورتوں کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ کی بردباری اور بے نیازی کا اندازہ لگائیے کہ دو ایسی عورتوں کا تذکرہ فرمایا جو نبیوں کے نکاح میں ہوتے ہوئے کافر تھیں، اور زندگی بھر کفر پر جمی

رہیں، اور دو ایمان والی خوش قسمت عورتوں کا بھی تذکرہ ہے، ان میں سے ایک آسیہ بنت مزاحم جو فرعون جیسے گمراہ بادشاہ کی بیوی تھیں، جبکہ دوسری حضرت مریم علیہا السلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ تھیں، جن کا فر عورتوں کا تذکرہ فرمایا ان میں سے ایک حضرت نوح علیہ السلام کی، اور دوسری لوط علیہ السلام کی بیوی ہے۔

سابقہ شریعتوں میں مسلمانوں کا کافر عورتوں سے نکاح جائز تھا، جبکہ ہماری شریعت میں اس کی اجازت نہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿ضَرَبَ اللهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی، اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال بیان کی ہے، یہ دونوں پیغمبر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور نبی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں انبیاء کے واقعات قرآن مجید میں بکثرت بیان فرمائے ہیں، اور ان کی قوموں کی ہلاکت کا ذکر بھی قرآن میں بکثرت موجود ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی آپ پر ایمان نہیں لائی، بلکہ اپنی قوم کے مذہب پر ہی قائم رہی، اور آپ کے چار بیٹوں میں سے ایک بیٹا بھی ماں کا فرمانبردار رہا اور کفر اختیار کیا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، آپ کا علاقہ شرق اردن کے قریب تھا، آپ کی قوم کی آبادی ۱۲-۱۳ لاکھ کے قریب تھی، وہاں بڑی بڑی بستیوں کی تعداد ۱۲ تھی، یہ پوری آبادی عذاب کی لپیٹ میں آ کر تباہ ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کی مثال بیان فرمائی:

﴿كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا﴾ یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، سو ان دونوں عورتوں نے اپنے شوہروں کی خیانت کی، ان عورتوں کی خیانت نہ مال میں تھی اور نہ ہی عصمت و ناموس میں، ان کی خیانت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں کے نکاح میں آنے کے باوجود انہوں نے دین اور توحید کو قبول نہیں کیا، اور زندگی بھر ان دونوں کا رویہ اپنے شوہروں کے ساتھ منافقوں کا رہا، جیسے جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا اور وعدہ خلافی کرنا، ان دونوں عورتوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ جھوٹ بھی بولا، خیانت بھی کی اور وعدہ خلافی بھی کی۔

عصمت میں خیانت سے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے: ماذنت امرأة نبيٍ قط۔ کسی بھی نبی کی بیوی نے کبھی بھی زنا کا ارتکاب نہیں کیا، یہ ایسی بداخلاقی ہے کہ جس کو کافر بھی معیوب سمجھتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو اس عیب سے بچالیا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ نبی کی بیوی کافر تو ہوسکتی ہے مگر زانیہ نہیں

ہوسکتی، کیونکہ کفر دنیا کی بہت سی اقوام میں اس طرح معیوب نہیں، جبکہ زنا تمام اقوامِ عالم کے نزدیک معیوب اور برا کام ہے۔

بہر حال! ان دونوں عورتوں نے اپنے شوہروں کا دین قبول نہ کر کے ان کی خیانت کی، ان خیانتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نوح علیہ السلام کی بیوی لوگوں سے کہا کرتی تھی کہ میرا خاوند پاگل ہوگیا ہے، اور لوط علیہ السلام کی بیوی کا حال یہ تھا کہ جب ان کے گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو وہ رات کو آگ جلا کر اور دن کو دھویں کے ذریعہ قوم کو اطلاع دیتی تھی کہ ہمارے گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں، یہ ان کی بڑی خیانت تھی، جب یہ دونوں عورتیں کفر اور خیانت کی وجہ سے جہنمی ثابت ہوئیں تو فرمایا:

﴿فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ﴾ سو نہ بچایا ان دونوں پیغمبروں نے ان دونوں عورتوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اللہ کے عذاب سے کچھ بھی، چنانچہ وہ دونوں جہنمی ثابت ہوئیں، اور ان سے کہا گیا کہ باقی دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہوجاؤ۔

الغرض: پیغمبروں کے ساتھ رشتۂ نکاح کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوا، یہی وہ حقیقت ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، اور سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ﴾ [التوبة: ۱۱۳] (کسی بھی نبی اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ایمان لایا ہے مناسب نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگے)۔ مشرک اور کافروں کے لئے کسی بھی نبی کی سفارش قابل قبول نہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کے لئے سفارش نہیں کرسکیں گے، اور ابراہیم علیہ السلام آذر کے لیے سفارش نہیں کریں گے تو قرآن حکیم کی یہ بات کہ: ﴿فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ایک واضح حقیقت ہے کہ کافر اور مشرک کے لیے شفاعت نہیں ہوسکتی، اگرچہ وہ نبی کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو خطاب کرتے ہوئے یہاں تک کہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ اور اپنی پھوپی حضرت صفیہؓ کا نام لے کر فرمایا: اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللهِ شيئا۔ اے لوگو! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ، میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہیں کچھ کام نہیں دے سکوں گا، اگر ایمان ہوگا تو میری شفاعت بھی کام آسکے گی، ورنہ نہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے کسی بڑے آدمی یا بڑے خاندان کی طرف نسبت کچھ فائدہ

نہیں دے گی جب اپنا دامن عمل سے خالی ہو، جیسے سورۃ التوبہ میں عبداللہ بن ابی ابن سلول کے واقعہ میں بیان ہوا۔ لوگ اس معاملہ میں بڑے غلو کرتے ہیں، سیدوں، پیروں، فقیروں اور مرشدوں پر فخر کرتے ہیں، اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اپنی بیویوں کو نہ بچاسکے تو دوسروں کی کیا مجال؟ اور یہ مسلم ہے کہ نبی کا مقام کھربوں پیروں اور مرشدوں سے بلند وبالا ہے، فرمایا:

﴿وَضَرَبَ اللهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ﴾ اہل ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرعون کی بیویوں کی مثال بیان فرمائی ہے، فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم صدیقہ عابدہ زاہدہ ولیہ خاتون تھیں، یہ وہ خوش قسمت عورت ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی، اور اسے فرعون کے برے ارادہ سے بچالیا، اور فرعون جو اسے قتل کرنا چاہتا تھا سے کہنے لگی: ﴿لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ [القصص: ۹] (اس بچے کو قتل نہ کرو، امید ہے کہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا (سبحان اللہ! اس کی یہ تمنا پوری ہوئی) یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں گے)۔

حضرت آسیہ سابقہ فرعون کی بیٹی تھیں، جب موسیٰ علیہ السلام اس کی پرورش میں ہوتے تھے اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس بچے کی نرالی شان ہوگی، یہ عام بچوں کی طرح نہیں، اس کی عجیب وغریب حرکات واطوار ہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا مقابلہ ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام جیت گئے تو یہ خوش قسمت خاتون فوراً مسلمان ہوگئیں، پھر اپنے تحفظ کی خاطر اپنا ایمان پوشیدہ رکھا، مگر کب تک حتیٰ کہ یہ راز افشاء ہو کر کھل گیا، پھر فرعون نے انہیں اپنے سخت سے سخت مظالم کا نشانہ بنایا، مگر وہ کسی طرح ایمان کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئی، بالآخر فرعون نے ایک بڑا بھاری پتھر آسیہ کے اوپر ڈال دینے کا حکم دیا، جب ان پر ڈالنے کے لئے وہ پتھر لا یا گیا تو وہ کہنے لگی:

﴿رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ اس کے ساتھ سارے پردے ہٹا دیئے گئے اور اس نے اپنا موتی وجواہرات کا گھر جنت میں دیکھ لیا، اور بصد شوق وخوشی اس کی پاکیزہ روح بدن سے پرواز کرگئی، جب پتھر ان پر ڈالا گیا تو نعش بے جان تھی، پتھر کے نیچے دبنے کی کوئی تکلیف اور اذیت ان کو نہیں پہنچی۔ [مظهري] امام حاکمؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔

بجرم عشق تو این میکشند وغوغائیست ☆ تو نیز بر سر بام آچہ خوش تماشائیست

حضرت آسیہؓ کی دعا کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

﴿وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اے میرے پروردگار! مجھے فرعون اور

اس کے عمل و کردار سے نجات دے، یعنی اس کے ظلم و ستم سے اور مجھے اس ظالم قوم سے بھی نجات دے، کیونکہ زیادتی اور ظلم و ستم میں قوم کے تمام افراد فرعون کے ساتھ شریک اور ہمنوا تھے۔ اس مثال کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ سارے مسلمان مرد اور عورتوں کو چاہئے کہ ہر طرح کے نامساعد حالات میں اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے حضرت مریمؑ بنت عمران کی مثال بیان فرمائی ہے، وہی مریمؑ جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں اپنی طرف سے ایک روح پھونک دی۔ سورۂ مریم میں ہے: ﴿فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ [مریم: ۱۷] (ہم نے مریم علیہا السلام کی طرف اپنی روح یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا جو کمال درجے کے حسین و جمیل شکل میں متشکل ہو کر آئے)۔ حضرت مریم ان کو دیکھ کر پریشان ہو گئیں، اور اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی: أعوذ باللہ پڑھ لی، سو جبریل علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے اپنا تعارف کرایا، اور بتایا کہ میں تو تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تجھے کمال درجے کا ایک فرزند عطا فرمانے والا ہے، ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا﴾ [مریم: ۱۹] (بیشک میں تمہارے پروردگار کا فرستادہ ہوں، تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں)۔ پھر فرشتے نے حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں دور سے پھونک ماری جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کر کے فرمایا:

﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ کیونکہ یہ سب کچھ اسی کے حکم سے ہوا۔

بہر حال! عصمت و ناموس کی حفاظت جو کہ حیاء کا ثمرہ ہے جس طرح عورتوں کے لئے ضروری ہے اور کمال درجے کی صفت ہے، اسی طرح مردوں کے لئے بھی اہم اور ضروری ہے، اور سب کے لئے کمال ایمان کی علامت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس صفتِ عالیہ کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کو متصف فرما کر دنیا کی عورتوں پر اس کی برتری ثابت فرمائی۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ مردوں میں سے تو بہت سے صاحب کمال لوگ ہوئے مگر عورتیں بہت کم ہی کمال درجے تک پہنچی ہیں، تمام کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام مرد تھے، اور یہ منصب عالی اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو عطا نہیں فرمایا۔

اسی طرح بے شمار اولیاء اللہ کرام بھی مرد گزرے ہیں، تاہم کامل درجے کی عورتوں میں جن کا ذکر آتا ہے وہ حضرت مریم علیہا السلام بنت عمران، آسیہؓ زوجہ فرعون، ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور سیدہ فاطمۃ الزہراء بنت سید

الانبیاء ﷺ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا کہ ان کی فضیلت باقی عورتوں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے ثرید کھانے کو دیگر کھانوں پر برتری حاصل ہے۔طبقات صوفیاء والے امام محمد بن علی ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اصلاح کے پانچ درجات ہیں:

(۱) بچوں کی اصلاح مکتب میں ہوتی ہے، اور یہ بہت ضروری ہے۔

(۲) ڈاکوؤں اور اوباش لوگوں کی اصلاح جیل میں ہوتی ہے۔

(۳) عورتوں کی اصلاح گھر میں ہوتی ہے، گھر سے باہر جانا زہر قاتل ہوگا۔

(۴) نوجوانوں کی اصلاح علم سے ہوتی ہے۔

(۵) بوڑھوں کی اصلاح مسجد میں ہوتی ہے یعنی کثرت ذکر وعبادت سے۔فرمایا:

﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾ اور اپنے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ بہت ہی عبادت کرنے والوں میں سے تھیں۔قنوت کا معنی اطاعت وعبادت گزاری اور عاجزی کے ہیں، یہاں بجائے قانتات جمع مؤنث ہے قانتین جمع مذکر کے صیغہ لانے سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ صفت عورتوں کی بنسبت مردوں میں زیادہ ہے، اور حضرت مریم علیہا السلام عبادت واطاعت میں مردوں کی طرح تھی، چنانچہ سورۃ المائدہ میں انہیں صدیقہ کا لقب دیا گیا، فرمایا: ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾[المائدۃ: ۷۵] (اور ان کی ماں صدیقہ تھیں)۔اور صدیق کا لقب بہت ہی اونچا ہے، یہ درجہ نبوت کے بعد دوسرے نمبر پر ہے، اس عظیم الشان لقب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا۔واللہ اعلم

سُورَةُ الْمُلْكِ

مكية آياتها ٣٠ ركوعاتها ٢

سورۂ ملک مکی ہے، اس میں تیس (۳۰) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورة الملک یہ نام اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ یہ لفظ پہلی آیت میں مذکور ہے، اس کے علاوہ اور بھی اس کے بہت سے نام ہیں، جیسے: **سورة تبارک، سورة المانعة، سورة الناجية، سورة المنجية، سورة المجادلة، سورة الواقية**۔

سورتوں کے نام توقیفی ہوتے ہیں، یعنی یہ نام کسی متعلقہ حدیث و روایت سے ثابت ہوتے ہیں، اور یہ نام باعتبار **تسمية الكل باسم الجزء** کے ہوتے ہیں، پھر مشہور قول کے مطابق ہجرت سے پہلے نازل شدہ سورتوں کو مکی کہتے ہیں، جن کی تعداد (۸٦) ہے، اور ہجرت کے بعد نازل شدہ سورتوں کو مدنی کہتے ہیں جو کہ (۲۸) ہیں۔ کبھی مکی سورتوں میں مدنی آیتیں اور مدنی سورتوں میں کچھ مکی آیتیں بھی ہوسکتی ہیں، جن سورتوں میں اسم رَبّ زیادہ مذکور ہو انہیں "ربانیات" کہتے ہیں جیسے سورۂ رحمٰن، اور جن سورتوں میں اسم الرّحمٰن زیادہ مذکور ہو انہیں "الرحمانیات" کہتے ہیں جیسے سورۂ مریم اور سورۂ ملک۔

نزول:

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ سورة الملک کے مکی ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور اس کا نزول سورة الٓمٓ تنزیل

السجدۃ کے بعد ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک سورۂ حاقہ کے بعد اس کا نزول ہوا، اور بعض کے نزدیک سورۂ معارج کے بعد، مگر پہلا قول راجح ہے۔ یہ سورت (۳۰) آیتوں، (۳۳۵) کلمات اور (۱۳۱۳) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

اس سے قبل سورۂ تحریم میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا بیان تھا، اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے جو معمولی لغزش ہوگئی تھی اس کا بیان تھا، اس کے ساتھ قیامت، توبہ نصوح، اور جہنم کی شدّت، نیز فرمانبردار اور نافرمان انسانوں کا تذکرہ تھا، اس سورت میں حقوق اللہ، دلائل توحید، براہینِ قدرت، اور احوالِ قیامت کے ساتھ فرمانبردار اور نافرمان بندوں کے علاوہ جنت اور دوزخ کا بھی تذکرہ ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ شانہ کی عظمت وجلال کا مؤثر انداز میں تذکرہ ہے۔ اللہ ربّ العزّت نے اپنی اُلوہیت وسلطنت اور قدرتِ کاملہ کا بڑے شد و مد کے ساتھ تحقیق واثبات فرمایا ہے، اور بڑے پیارے انداز میں اپنے لئے حمد وثناء کا استحقاق بیان فرمایا ہے، اور موت وحیات کی تخلیق کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے ساتھ ابتلاء و آزمائش کی حکمت واضح فرمائی ہے، اور ملکوت السمٰوٰت والأرض کی پیدائش اور دیگر عظیم مخلوقات کی معرفت و شناخت کا راستہ بتا کر انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔

پھر اپنی حکمت وقدرت کے ثبوت کے لیئے اپنی کائنات کو بطور حجت و گواہ پیش کیا ہے، اور قیامت تک دنیا بھر کے تمام معترضین اور نقادوں کو بار بار دعوت دی ہے کہ میری مخلوقات میں کوئی عیب یا کمزوری تلاش کر کے بتاؤ! یا اس سے بہتر کوئی نقشہ تیار کر کے پیش کرو اور تجویز کر کے دکھاؤ، لیکن جب کسی کو یہ جرأت حاصل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات پر کسی طرح انگشت نمائی کر سکے۔ اس سے بہتر تو درکنار! بلکہ متبادل پیش کرنے سے بھی ساری دنیا کے عقلاء و ماہرین عاجز ہیں، تو پھر از راہِ شفقت فرمایا کہ میری بندگی کرو، انسان بنو، ناعاقبت اندیشی اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر، خود کو جہنم میں مت ڈالو، اور اللہ تعالیٰ کے حضور سرِ تسلیم خم کر کے اس کی وحدانیت پر ایمان لاؤ، اس کی ذات و صفات میں کسی مخلوق کو شریک نہ کرو، بے جان پتھر کے تراشیدہ بتوں کی عبادت چھوڑ کر حیّ وقیوم کے حضور جھک جاؤ، ورنہ تمہارا انجام بہت برا ہوگا، اور نہایت اندوہناک کیفیت کے ساتھ دوزخ میں پھینک دیئے جاؤ گے، جس کے شعلے غیظ وغضب کی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت تم:

﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ﴾ (اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے) کہہ کر اپنی بدبختی کا اعتراف تو کرو گے، مگر تمہیں فائدہ کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس ضمن میں فرمایا کہ سارے انسان یکساں اور برابر نہیں اور نہ ہی سب ناحق شناس ہوں گے، بلکہ کچھ وہ حق شناس بھی ہوں گے، جو اپنے ربّ پر بن دیکھے ایمان لائے ہوں گے، اوراس کی رضا پر سب کچھ قربان کریں گے، اوراس کی ناراضگی سے ترساں ولرزاں رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے گناہ بخش دیئے جائیں گے، اور جنت کی ابدی اوردائمی راحتوں میں داخل کئے جائیں گے، اوراجر کبیر کے مستحق ہوں گے، اوران کے نیک اعمال کی عنداللہ بڑی قدردانی اور پزیرائی ہوگی۔

ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگرتم لوگوں (کافروں) نے اپنی روش نہ بدلی، تو اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں کہ تمہیں زمین میں دھنسادے، یا پتھر برسا کر تمہیں فنا کردے، پھر قیامت کے بارے میں ان کے سوال کا جواب دے کر فرمایا کہ اس کے آنے کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ اے میرے نبی! آپ کہہ دیجئے: میں بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، میرا منصب بشارت سنانا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہی ہے، البتہ جب قیامت اپنے وقت پر برپا ہوگی، تو تمہارے چہرے مسخ ہوجائیں گے، اس دن تمہارے معبود تمہیں کچھ کام نہیں آئیں گے، اور تمہاری طرح وہ بھی جہنم کی آگ میں گر کر جل جائیں گے، پس تمہارے لئے یہی ایک راستہ کامیابی کا متعین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھک کر اس کی وحدانیت کا اقرار کرو، اور بس۔

فضیلت:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ رات کو سونے سے پہلے سورۂ ملک اور سورۂ الم سجدہ ہمیشہ بلاناغہ پڑھا کرتے تھے۔ [درمنثور]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص لاعلمی میں کسی قبر کے پاس خیمہ لگا کر بیٹھ گیا، تو اس نے سنا کہ ایک شخص نے قبر کے اندر سے سورۂ ملک کی تلاوت شروع کی، اور اسے مکمل کیا، انہوں نے یہ واقعہ رحمت عالم ﷺ کو سنایا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ سورة مانعة ہے اور منجية ہے، یہ اپنے پڑھنے والوں کو عذاب قبر سے نجات دلانے والی ہے۔ [ترمذي]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں ایک ایسی سورت ہے جس کی تیس آیات ہیں، قیامت کے روز پڑھنے والے کی سفارش کرے گی، اور اسے جنت میں داخل کرے گی، اور وہ

سورۂ تبارک ہے۔[ترمذي، قرطبي]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ سورۂ ملک ہر مؤمن کے دل میں ہو۔ اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سورت کے قاری کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے، تو یہ سورت چاروں طرف سے اس کی حفاظت کرتی ہے، اور ہر قسم کے عذاب کو دفع کرتی ہے۔[ثعلبي، قرطبي]

قرآن کریم عرش معلیٰ کے نیچے کے خزانوں سے نازل ہوا، اس کی ہر سورت جنت کے باغوں کا گلدستہ ہے۔ ہر گلدستہ کا رنگ وخوشبو اور خاصیت الگ ہے، آخرت کی پہلی منزل قبر ہے، اور قبر بہت ہی وحشتناک ہے، اس کی وحشت، تنگی، تاریکی، اور دیگر سختیوں کے لیے سورۂ ملک ایک بہترین علاج اور تریاق ہے، پس ہر مؤمن کو چاہئے کہ روزانہ بلاناغہ، عشاء کے بعد اس مبارک سورت کی تلاوت کرے، اور جو شخص اس کی تلاوت کو ہر رات معمول بنائے گا، تو سمجھو کہ اس شخص نے بہت اچھا کیا اور بہت کچھ پڑھا اور پایا۔[قرطبي]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تَبٰرَكَ الَّذِیۡ بِیَدِهِ الۡمُلۡكُ

ترجمہ: بڑی بابرکت ہے وہ ذات پاک جس کے ہاتھ میں سارے جہانوں کی سلطنت ہے۔

معارف ومنازل

﴿تَبَارَكَ﴾ واحد مذکر ماضی کا صیغہ ہے، اس کی گردان نہیں آتی، یہ صیغہ صرف ربّ العزّت عزّ وجل کے ساتھ مخصوص ہے، لفظاً بھی اور معناً بھی، اس لیے کہ برکت کے معنی ہیں: وہ غیر مرئی خیر وبرکت وزیادتی جو زیادتی کرنے والے کے بے مثال کمال پر دلالت کرتی ہے، اور مقتضی نقصان بھی نہیں ہے۔[لغات القرآن]

مخلوق کی صفات میں نقص لازم ہے، اس لئے پورے کلام عرب میں تبارک کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوا ہے۔﴿تَبَارَكَ﴾ اللہ اکبر کی طرح ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، جس طرح وہ اپنی عظمت وکبریائی میں واحد لاشریک ہے، اسی طرح اپنی عظیم اور دائمی ابدی برکتوں میں بھی یکتا ویگانہ ہے۔[عزیزی]

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ﴿تَبٰرَكَ﴾ اور اس کے معنی دونوں مخصوص ہیں ذات باری تعالیٰ کے ساتھ، کسی غیر اللہ پر ان کا اطلاق شرک ہے، کیونکہ مخلوقات میں ایسی کوئی ہستی نہیں جو برکت دینے پر قادر ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات ہوں یا اولیاء کرام کی کرامات، ان کی برکت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ پیغمبر اور ولی دونوں اس پر قادر نہیں کہ جب چاہیں معجزات اور کرامات صادر کریں، بلکہ تمام معجزات اور کرامات ان کے حق میں غیر اختیاری ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کی مشیئت واختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

فائدہ:

برکت کے اندر جو معانی ملحوظ ہیں وہ چار ہیں:

(١) خیر کثیر۔ (٢) موقع پر استعمال کرنا۔ (٣) نتائج کے ثمرات کا حصول۔ (٤) دوام وبقاء۔

بہر حال! برکت خواہ حسی ہو یا معنوی ہر حال میں اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی، کیونکہ یہ مخصوص فعل اسی کا ہے، البتہ! اس کا مفعول عام ہی رہے گا، جیسے کہتے ہیں: مال واولاد میں برکت ہوگئی، کھانے پینے کی چیزوں میں برکت آگئی، اسی طرح علم وعمل اور عمر میں برکت کا آنا یہ اسی مفعول (مبارک) کے مختلف افراد کہلائیں گے، اور ان تمام چیزوں میں برکت پیدا کرنے والا صرف اور صرف خاص اللہ تعالیٰ سبحانہ ہی ہوگا۔

ہاں! اگر ان چیزوں سے برکت سلب ہو اور بے برکتی پیدا ہو جائے، تو اس کی نسبت بندے کی طرف ہوگی کہ اس کے کسی فروگزاشت سے برکت زائل ہوگئی، جیسے فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ [النساء: ٧٩] (اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے، اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے)۔

پس جو ذات پاک اس جہاں، زمین وآسمان اور پوری کائنات کا پیدا کنندہ ہے، اور اس نے اس جہاں میں طرح طرح کی مخلوقات پیدا کی ہے، اور پھر روز اول سے ہر ایک کے رزق وروزی اور ان کے سامان حیات وبقا بھی مہیا کیا ہوا ہے، اس سے زیادہ برکت والا کون ہو سکتا ہے کہ اس قدر بے حساب بخشش اور صرف کرنے پر بھی اس کے خزانوں میں ایک قطرہ یا ذرہ بھر کی کمی واقع نہ ہو؟

﴿تَبٰرَكَ﴾ کے اس مخصوص عظیم معنی ومطالب عالیہ کے پیش نظر اگر غور سے دیکھا جائے تو پورے قرآن حکیم میں اس کی خصوصیت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ جلوہ افروز اور نمایاں ہے، اور رب العزت عزّ سبحانہ کی عظیم

مخصوص صفات کمالیہ، جمالیہ پر دلالت کنندہ ہے، اور یہ مقامات کل نو ہیں:

(١)﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأعراف:٥٤] (دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے، اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ خدا ربّ العالمین بڑی برکت والا ہے)۔

(٢)﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون:١٤] (پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا، تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا بڑا با برکت ہے)۔

(٣)﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾[الفرقان:١] (وہ (خدائے عزّ وجل) بہت ہی با برکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ رہے سارے جہان والوں کے لیے ڈرانے والا)۔

(٤)﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ﴾[الفرقان:١٠] (بڑی برکت ہے اس کی جو چاہے تو کر دے تیرے واسطے اس سے بہتر باغ)۔

(٥)﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا﴾ [الفرقان:٦١] (بڑی برکت ہے اسکی جس نے بنائے آسمان میں برج اور رکھا اس میں چراغ اور چاند اجالا کرنے والا)۔

(٦)﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المؤمن:٦٤] (وہ اللہ تعالیٰ ہے ربّ تمہارا، سو بڑی برکت ہے ربّ العلمین کی)۔

(٧)﴿وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾[الزخرف:٨٥] (اور بڑی برکت ہے اس کی جس کا راج ہے آسمانوں اور زمین میں، اور ان کی درمیان چیزوں میں، اور اسی کے پاس ہے علم آخرت کی اور اسی تک لوٹائے جاؤ گے)۔

(٨)﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾[الرحمن:٧٨] (بڑی با برکت نام تیرے ربّ کی جو عظمت و بڑائی والا ہے)۔

(٩)﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ﴾[الملک:١] (بڑی با برکت ہے وہ ذات پاک جس کے ہاتھ میں سارے جہانوں کی سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

ان مقامات میں جہاں بھی تَبٰرَكَ مذکور ہے اس کے سیاق و سباق پر فکر کرنے اور غور کرنے سے یہی

عظمتِ کمالیہ وجلال وبرکات ذاتیہ مخصوصہ معلوم ہوتی ہیں۔

صحیح حدیث میں وارد ہے: "الخير كلّه في يديک و الشر ليس إليک"۔[مشکوٰۃ] قال الله سبحانہ: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾[آل عمران:۲٦] (کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے، اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کردے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے)۔ ﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾[یس:۸۳] (وہ (ذات) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے، اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے)۔ قاله عبدالله بن عباس رضی اللہ عنہ بمعناه۔[قرطبي]

﴿بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں ایسے الفاظ بکثرت وارد ہوئے ہیں مثلاً: ﴿بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ﴾[یس:۸۳] (اس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے)۔ یا ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾[الفتح:۱۰] (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے)۔ یا ﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾ [النساء:۱۴۸] (اور اللہ سننے والا باخبر ہے)۔ یا ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ [الممتحنة:۳] (اور اللہ دیکھنے والا ہے تمہارے اعمال کو)۔ یا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰه:۵] (رحمٰن نے عرش پر استویٰ فرمایا) وغیرہ الفاظ۔ یہ اگر عام مخلوقات کے لیے مستعمل ہوں تو وہاں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ الفاظ جب باری تعالیٰ سبحانہ کے لیے مستعمل ہوں تو ایک قسم کی بے ادبی یا گرانی معلوم ہوگی۔

اس سلسلے میں یہ فیصلہ نہایت مناسب ہے کہ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] (اس جیسی کوئی چیز نہیں)۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوقات کے ساتھ ہر قسم کی تشبیہ سے منزہ وپاک ہے، اس کی کوئی صفت مخلوقات کی طرح نہیں ہے، اور مخلوقات کی کوئی بھی صفت اس کی صفات کے مماثل وبرابر نہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا اور کرتا ہے، مگر ہماری طرح نہیں، اور ہمارا کوئی بھی عمل اس کے افعال کی طرح نہیں ہے، اور یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہئے کہ سمع وبصر کا نتیجہ علم کلی ہے، اور رحمت کا نتیجہ وغایت احسان اور بخشش ہے۔

"ید" اور استواء کا نتیجہ قوت غلبہ اور تسلط ہے، جب یہ الفاظ باری تعالیٰ سبحانہ کے حق میں مستعمل ہوں گے، تو وہاں مبداء واعضاء سے قطع نظر غرض وغایت والے معنی مراد ہوں گے۔ ﴿بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ سے مراد غلبہ و

تصرف، اور رحمت سے مراد بخشش، اور استواء سے مراد تسلط وقدرت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے استواء کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا: **الاستواء معلوم و الکیف مجھول (غیر معقول) والإقرار به إیمان والجحود به کفر**۔ استواء کے معنی معلوم ہیں، اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی، اس کا اقرار ایمان ہے، اور اس کا انکار کفر ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ [روح المعانی وتفسیر طبری]

حضرت امام ابو یوسفؒ نے امام اعظم رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے: **لاینبغي لأحد أن ینطق في اللہ تعالی بشئ من ذاته ولکن یصفه بماوصف سبحانه تعالیٰ به نفسه، ولایقول فیه برأیه شیئا تبارک اللہ رب الغلمین**۔ [روح المعاني، لغات القرآن] یعنی کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ شانہ کے بارے میں اس کی ذات کے متعلق اپنی من چاہی سے ذرا بھی زبان کھولے، بلکہ وہ اسی طرح بیان کرے جس طرح خود اللہ سبحانہ نے اپنے لئے بیان فرمایا ہے، مزید اپنی رائے سے کچھ نہ کہے، بڑی برکت وعظمت سے موصوف ہے اس کی ذات پاک جو ربّ ہے ساری مخلوقات کا۔ شیخ سعدیؒ نے بہت خوب کہا:

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ☆ واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

دفتر تمام گشت وبپایان رسید وعمر ☆ ماہمچنان در اول وصف تو ماندہ ایم

آیات قرآنیہ کی اقسام:

پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں یعنی وہ آیات ہیں جن کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب ومراد بھی معلوم ہے، گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں، اور قرآن پاک کی اکثر آیات اسی طرح محکمات ہی ہیں۔

دوسری قسم کی آیات متشابہات ہیں جن کے الفاظ اور معنی تو معلوم ہیں مگر مطلب اور حقیقت پوشیدہ ہے، جیسے: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى ۝۵﴾ [الرحمٰن] (رحمٰن نے عرش پر استویٰ فرمایا) رحمن، عرش، استویٰ، معنی تینوں کا معلوم ہے مگر ان کی حقیقت ومراد انسانی ذہن کی رسائی سے بالاتر ہے، اسی طرح دیگر تمام صفات باری تعالیٰ کو سمجھیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات ہیں، یہ مفرد حروف ہیں یعنی جن کے نہ معنی معلوم ہیں اور نہ مراد ومطلب معلوم ہے۔ پوری تفصیل سورۃ البقرۃ کے شروع میں گزر گئی وہاں رجوع کیا جائے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ①

ترجمہ: وہ ہر چیز پر قادر ہے ①

شئ سے مشئ مراد ہے خواہ موجود ہو یا معدوم، قیامت تک آنے والی اشیاء جنہیں وقتاً فوقتاً احکم الحاکمین پیدا فرماتے رہیں گے، یہ سارے ممکنات اس میں داخل ہیں، اور باری تعالیٰ سبحانہ کی قدرت کاملہ مع علم کلّی کے ان سب پر حاوی اور محیط ہے۔ لفظ "کل" کا یہی مطلب ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اس کی سلطنت وحاکمیت سے باہر نہیں، اور ہر چیز اس کے دائرہ اختیار میں ہے۔

معارف ومنازل

عقلمند انسان جب آسمان وزمین کی پیدائش اوران کے عجیب وغریب احوال وروابط اور کائنات کے مضبوط ومحکم دلکش نظام میں غور وفکر کرتا ہے تو اسے یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا منظم ومرتب عجیب وغریب حیران کن نظام اس شہنشاہ حقیقی، مختارِ کُل، قادر مطلق، واحد لاشریک لہ ربّ العزّت سبحانہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے اپنی عظیم قدرتِ کاملہ، قاہرہ، سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حد بندی کر رکھی ہے، اور تقریباً اسی ہزار (۸۰۰۰۰) مخلوقات کا نظم و نسق ایک مربوط نظام پیدائش سے لے کر ایک محکم ومضبوط اور محفوظ نظام تحفظ وبقاء کے ذریعہ ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کے ساتھ چلا رہا ہے۔ ﴿وَلَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾﴾ [البقرة] (اوران کی نگرانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا، اور وہ بڑا عالی مقام صاحب عظمت ہے)۔

ہر مخلوق اپنے دائرہ میں رات دن رواں دواں محوسفر ہے، مجال نہیں کہ کوئی چھوٹی یا بڑی مخلوق اپنے محاذ یا دائرہ کار سے باہر قدم رکھے، یا اس بے مثال کارخانہ قدرت کا کوئی ادنیٰ پرزہ اپنے مرکز سے ہٹ کر نظامِ تکوینی میں خلل پیدا کرے۔ [تفسیر عثمانی]

اس آیت کریمہ سے پانچ بنیادی اصول معلوم ہوئے، یہ پوری سورت ان کی تفصیل وتشریح اوران امورِ خمسہ کے اثبات میں رطب اللسان ہے، وہ اصول یہ ہیں:

اول: اثباتِ وجود باری تعالیٰ سبحانہ جو کہ واجب الوجود کی صفت کے ساتھ موصوف ہے۔

دوم: پوری کائنات پر عزّ سبحانہ تعالیٰ کی شہنشائیت وسلطنت کا اثبات وبیان۔

سوم: تمام ستودہ پاکیزہ اور عظیم صفات کمالیہ جمالیہ وجلالیہ کا اثبات وبیان۔

چہارم: تمام کائنات وساری مخلوقات پر اس کی قدرت کاملہ اور اختیار قاہرہ کا اثبات وبیان۔

پنجم: تمام کائنات اور اس کے ذرہ ذرہ پر سبحانہ شانہ کے علم کلی کے احاطہ کا اثبات وبیان۔

ان پانچوں دعووں کا تقاضا ہے کہ ان کے دلائل بیان کیے جائیں اس لئے بعد میں آنے والی آیات کو بطورِ دلائل ذکر فرمایا گیا ہے، ان میں کچھ دلائل تو انسان میں موجود ہیں یعنی موت وحیات کی تخلیق وتقدیر، کچھ آسمانوں میں موجود ہیں یعنی آسمانوں کی عجیب وغریب تخلیق ان میں ہم آہنگی اور ان میں کوئی عیب اور کسی قسم کا رخنہ ونقص کا نہ ہونا وغیرہ، کچھ زمین میں موجود ہیں یعنی زمین کا سکونت کے قابل ہونا، زمین کی پیداوار جس پر اکثر جانداروں کا رزق اور بود وباش کا نظام قدرت، جو ان کی نشوونما اور بقائے حیات کا سبب ہے، کچھ اوپر فضاء میں ہیں یعنی پرندوں کی اڑان اور ان کی مخصوص کیفیات۔

ان سب چیزوں کا ذکر تو بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے جس سے ربّ العزّت عزّ شانہ کی ہستی وصفاتِ کمالیہ جمالیہ اور قدرتِ کاملہ وغیرہ کا ثبوت ہوتا ہے، اور جو لوگ کسی دعویٰ کے ماننے کے لئے دلیلوں کو چاہتے ہیں ان کی ہدایت کے لئے یہ سب دلائل ہیں، اور جو کوتاہ نظر یا ہٹ دھرم اور کم عقل ہوتے ہیں جو دلائل کو نہیں سمجھتے اور نہیں مانتے ان کی ہدایت کے لئے اعمال کے اچھے اور برے نتائج کا بیان اور ترغیب وترہیب بسا اوقات کافی ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے لئے کافروں کے عذاب اور مؤمنوں کے ثواب کا بھی اس سورت میں ذکر فرما دیا گیا، کیونکہ قرآن کریم سب کی ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے، اگرچہ بدقسمتی کا کوئی علاج اور دوا نہیں ہوتی۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ☆ مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

ترجمہ: وہ ذات پاک جس نے بنائی موت اور زندگی تا کہ جانچے تم کو کہ تم میں کون اچھا عمل کرتا ہے۔

معارف ومنازل

حسنِ عمل کا راز موت وحیات کے ابتلاء وآزمائش میں مقدر فرما کر بڑا احسان کیا، اور قرآن کریم میں موت و

حیات کا تذکرہ مساوی رکھ کر ایک سربستہ راز سے پردہ اٹھایا، اور اپنے بندوں کو دونوں کی قدر و قیمت سے آگاہ فرمایا، وہ یہ کہ (۱۴۵) مرتبہ دونوں کا تذکرہ و بیان قرآن حکیم میں موجود ہے، مثلاً ۱۴۵، مرتبہ موت کا ذکر اور اسی کے برابر ۱۴۵، حیات کا تذکرہ ہے، یہ مساوات کوئی اتفاقی نہیں بلکہ اس میں رازوں کا خزانہ مخفی ہے، اس آیت کریمہ اور دیگر متعدد آیتوں میں ایک ایک موت وحیات کا ذکر ہے، جبکہ سورۂ بقرہ میں بیک وقت دو موت اور دو حیات کا تذکرہ ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝۲۸﴾ [البقرة: ۲۸] (تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم مرے ہوئے تھے، پھر تم کو زندہ کردیا، پھر تم کو موت دے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

پہلی موت وہ ہے کہ جب انسان (معدوم غیر مخلوق کی طرح) ایک بے حس و بے جان نطفہ کی شکل میں تھا، اس کو موت سے تعبیر فرما کر اپنی خالقیت کا اظہار فرمایا کہ ربّ العزّت عزّ مجدہٗ کا کتنا کرم و ذرہ نوازی ہے کہ مشت خاک اور نطفہ بے جان سے ایک جاندار انسان پیدا فرمایا، اور حیات کی دولت سے نوازا، پھر اس موجودہ حیات کے بعد دوسری موت ہے جو کہ مسلمان کے لیے ایک بڑی نعمت ہے، کیونکہ یہی موت اسے رضاء الٰہی اور جنت کے دروازہ پر پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے، اگر یہ موت نہ ہوتی تو جنت کا حصول نہ ہوتا، اور لوگوں کو چھوڑیئے دونوں جہان کے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق سنئے: جبرئیل و میکائیل علیہما السلام نے خواب میں انہیں جنت میں ان کا مخصوص ذاتی مکان دکھادیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے جنتی مکان میں جانے اور سیر و ملاحظہ کا اشتیاق پیدا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں جانے کا مطالبہ فرمایا، دونوں فرشتوں نے کہا کہ ابھی نہیں ابھی آپ کی عمر مبارک باقی ہے، جب آپ دنیا سے رخصت ہوجائیں گے تب آپ اپنے مکان میں جاسکیں گے۔ [بخاري كتاب الجنائز: ص ۱۸۵]

اسی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ: الموت تحفة المؤمن۔ موت مؤمن کا تحفہ ہے، موت مؤمن کے لیے رحمت اور راحت ہے، اور موت مؤمن کو ربّ تعالیٰ سے ملاتی اور ملاقات کراتی ہے، مسلمان کے لیے زہے نصیب کہ موت کے بعد ایک مرتبہ ربّ العزّت کے دربار میں اس کی پیشی ہو۔ [الدرة للغزالي علیہ الرحمۃ]

سورۂ بقرہ میں پہلی موت کے بعد جس زندگی کا تذکرہ ہے وہ یہی پہلی دنیوی زندگی ہے، یہ زندگی بڑی نعمت ہے، اس کا لمحہ لمحہ قیمتی ہے، یہی مزرعة الآخرة ہے، اسی پر جنت و دوزخ کا دارومدار ہے، اور یہی اصلی سرمایہ ہے، اسی کی بدولت قرب و رضا کا حصول ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو آٹھوں جنت اسی زندگی کے ادوار و لمحات کے مرہون منت

ہیں۔اوراس قیمتی زندگی کے بعد دوسری موت ہے، یہ موت بذات خودکوئی نعمت نہیں اور قیمتی بھی نہیں،اگر وہ نعمت بنتی یا قیمتی ہوتی ہے تواِس زندگی کی بدولت، بشرطیکہ یہ زندگی ایمان واعمالِ صالحہ اور حسناتِ حمیدہ کے ساتھ آباد ہو۔رزقنا الله وجميع المؤمنين۔آمین۔

اس دوسری موت کے بعد پھر آخری زندگی ہے جوکہ دائمی بھی ہے اورابدی بھی، یہ بذات خود قیمتی نہیں،اس کی قیمت وخوشحالیوں کا اصلی سبب وہ پہلی اور دنیوی زندگی ہے، ﴿فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗؕ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾[الزلزال] (پس جوذرہ برابر نیکی کا عمل کرے گا اس کو دیکھے گا۔اور جوذرہ برابر برائی کا عمل کرے گا اس کودیکھے گا)۔

﴿اَلَّذِىۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ﴾ آیت کریمہ میں موت کوحیات پر مقدم رکھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ موت وجود میں مقدم ہے حیات سے، كما مر في سورة البقرة۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ: ﴿لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا﴾ کے ساتھ دونوں کا تعلق ہے،مگر اعمالِ صالحہ پر ابھارنے اور آمادہ کرنے میں موت بہ نسبت حیات کے زیادہ مؤثر ومعاون ہے، وہ اس لئے کہ حیات میں خوف آخرت کا مادہ کمزور ہے،اور موت میں زیادہ ہے،موت کے تصور کے ساتھ طبیعت میں ہیجان پیدا ہوتا ہے جبکہ حیات میں نہیں۔حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ موت سب سے بڑی واعظ اور نصیحت گر ہے،اور ایمان ویقین سب سے بڑی دولت ہے،اس کو حافظ طبرانی نے تخریج کی ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی انگھوٹی پر یہ کندہ کرایا تھا: كفى بالموت واعظا۔موت بڑی واعظ ہے۔اسی طرح متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس پر عمل کیا تھا۔حدیث میں وارد ہے کہ تمام لذّتوں کی مٹانے والی موت کوکثرت سے یادکیا کرو۔[مشکوٰۃ]

حضرت ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں پچیس (۲۵) مرتبہ روزانہ موت کو یاد کرنے سے شہادت کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔[مرقات] حضرت امام شافعیؒ وامام احمدؒ نے ربیع بن انس سے مرسل قول روایت کیا ہے کہ دنیا سے بے رغبت بنانے اور آخرت کی اندرونی (قلبی) طلب پیدا کرنے کے لیے موت کافی ہے۔[مظهري]

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سوال کیا: یارسول اللہ! اَحۡسَنُ عَمَلًا کون لوگ ہیں؟ فرمایا: أحسنكم عملاً أحسنكم عقلاً وأورعكم عن محارم الله وأسرعكم في طاعته سبحانه

تعالیٰ۔ وہ شخص جس کی عقل اچھی ہو، حرام سے زیادہ پرہیز کرے اور خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری زیادہ کرے۔[تفسیر عثمانی]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں جائیں گے تو موت کو ایک جانور کی شکل میں لاکر جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کیا جائے گا، اور اعلان کیا جائے گا کہ اے جنتی لوگو! آئندہ موت نہیں آئے گی، اے اہل دوزخ! آئندہ موت نہیں آئے گی، اس اعلان کے ساتھ جنتیوں کی مسرتوں میں بیحد اضافہ اور دوزخیوں کے غم و پریشانیوں میں بے انتہاء اضافہ ہوگا، اور وہ غم میں ڈوب جائیں گے۔[متفق علیہ]

یہ ایک تمثیل بھی ہے اور حقیقت بھی۔ موت اگرچہ ایک عرض ہے، وہ کوئی جسم و جوہر نہیں مگر ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ دوسرے جہاں میں تمام اعراض، اعمال، طاعات، وغیرہ کو جواہر و اجسام کی شکل دیں گے۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ نیک مسلمانوں کا عمل قبر میں ایک بہت خوبصورت شخص کی شکل میں آئے گا، اور بدکار فاجر لوگوں کا عمل قبر میں ایک قبیح و بدصورت شخص کی شکل میں متشکل ہوگا، اور قیامِ قیامت تک قبر میں ان کے ساتھ رہیگا۔[مشکوٰۃ]

فائدہ:

بعض روایات میں ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان موت کو ایک دُنبے کی شکل میں لایا جائے گا، اور حضرت یحیٰی علیہ السلام کے ہاتھ سے اسے ذبح کیا جائے گا۔[مظہری، ابن کثیر]

ایک علمی نکتہ:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ﴾ کا تعلق کائنات کی تمام مخلوقات کے ساتھ ہے بشمول انسان اور ﴿لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً﴾ کا تعلق صرف انسان کے ساتھ ہے، یہ اس لئے کہ کائنات کی تمام مخلوقات (سوائے ناپاک نجس بتوں کے جن کے متعلق ﴿اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ﴾ [النحل:۲۱] (مرے ہوئے ہیں، زندہ نہیں) کا فرمان الٰہی ہے کہ ان میں حیات نہیں)۔ جمادات ہوں یا نباتات سب کے اندر ایک غیر مرئی حیات موجود ہے، لقولہ تعالیٰ: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾[الإسراء:۴۴] (اور کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ کی تسبیح حمد کے ساتھ نہ کہتی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں)۔ ﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾[النحل:٦٥] (اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو

زندہ کردیا اس کی موت کے بعد)۔

ہم لوگ ان مخلوقات کی تسبیح وذکر اس لئے نہیں سمجھتے کیونکہ غور وتدبر نہیں کرتے، یا اس لئے کہ ان کی غیر مرئی وغیر مسموع تسبیحات سننے کی ہمارے پاس استعداد نہیں۔ بہر حال! وجود وعدم کا تعلق تمام مخلوقات سے ہے، اور یہی موت وحیات ہی ہے۔کما ر ؎

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند ☆ بامن وتو مردہ باحق زندہ

(شیخ سعدیؒ)

البتہ ہر مخلوق کی موت وحیات کا تعلق اسی کی مناسبت سے ہے، اور دوسروں کی موت وحیات سے مختلف ہے، جیسے کہ بعض وجوہات سے مسلمان کو زندہ اور کافر کو باوجود حیات کے مردوں میں شمار کیا گیا ہے، اور علم والوں کو زندہ اور جہلاء کو باوجود حیات کے مردہ کہا گیا ہے۔ دنیا کی بہت ساری قومیں جو ربّ العزّت سبحانہ کے وجود کی منکر ہیں، مگر موت کا کوئی منکر نہیں، روسی سائنسدانوں نے موت پر بہت تحقیق اور مغز ماری کی اور کر رہے ہیں مگر موت کی حقیقت ابھی تک انہیں سمجھ میں نہیں آئی۔

جب ﴿لِيَبْلُوَكُمْ﴾ کا خطاب انسان کو ہے اور نحوی ترکیب میں بھی اس کا تعلق خَلَقَ کے ساتھ ہوا ہے، تو یہ مسئلہ اور بھی واضح ہو گیا، جس میں انسانوں کی برتری عام مخلوقات پر ثابت ہو گئی، بہ سبب عقل معنوی اور مکلف ہونے کے، اور بہ سبب اس کے کہ روز ازل میں خداوند ذوالجلال والاکرام کے سامنے انسان نے امانتوں کے اٹھانے اور ان کے تحمل کا اقرار کیا، وہ امانتیں کہ جن کے تحمل اور اٹھانے سے آسمان، زمین، جبال وغیرہ سب کانپ گئے، اور انکاری ہو گئے، اس کی تفصیل سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکا ہوں، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تمام کائنات کی تخلیق حضرت انسان اور اس کی خدمت گزاری کے لیے ہے، فقط، اور انسان کی تخلیق صرف اور صرف عبادت الٰہی اور توحید وطاعت کے لیے ہے جس کی خاطر ﴿لِيَبْلُوَكُمْ﴾ کا خطاب صرف اسی کو ہوا، اور موت وحیات کی نعمت کا اسے حقدار گردانا گیا۔ واللہ اعلم

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝٢

ترجمہ: وہ مکمل اقتدار کا مالک، اور بہت بخشنے والا ہے۔

معارف ومسائل

وہی ہے غالب، ایسا بڑا غالب شہنشاہ جس کے سامنے سب عاجز ومغلوب ہوں، اور وہ کسی سے مغلوب نہ ہو اچھے اعمال پر اجر وثواب اور برے اعمال پر سزا دینے پر قوی وقادر ہو، یہ ہے معنیٰ: **العزیز** کا۔ **الغفور** ہر قسم کے معاصی سے درگزر کرنے پر قادر وتوانا۔ بادشاہ کے شایان شان یہی ہے کہ اس میں جزاء وسزا اور عفو ودرگزر دونوں قسم کی صفات پورے طور پر موجود ہوں، اگر یہ دونوں صفات کسی بادشاہ میں نہ ہوں تو اس کا اقتدار نقصان پذیر ہوگا۔ ربّ العزّت عزّ شانہ کی ذات پاک جمیع صفات کمال کے ساتھ موصوف اور ہر قسم کے نقائص سے منزہ وپاک ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ

ترجمہ: وہ ذات پاک جس نے پیدا کئے سات آسمان تہہ بر تہہ (اوپر نیچے)۔

معارف ومسائل

قرآن حکیم کی کئی آیات میں اور اسی طرح متعدد احادیث میں سات آسمانوں کی تصریح ہے، مفسرین، محدثین، محققین اور سارے علماء اسلام یہی کہتے آرہے ہیں کہ آسمان سات ہیں، اور ان کے باقاعدہ اجسام ہیں، اور یہ سارے گول شکل میں ہیں، اور پورے عالم پر محیط یعنی احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور سارا عالم چاروں طرف سے ان کے درمیان واقع ہے، پس زمین، چاند، سورج، ستارے، سیارے اور کہکشائیں سارے آسمانوں کے جوف میں ہیں، جیسے تربوزے کے تخم اس کے گودے کے درمیان میں، یا جیسے انڈے کی زردی اس کی سفیدی کے درمیان ہے۔

فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرات ہیں، شاید اس قدر آسمانوں میں ستاروں کی تعداد ہو، ان میں کچھ ستارے ایسے ہیں جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جاسکتی ہیں، اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سما سکتی ہیں، یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہو وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے، پھر اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر لحظہ اپنے چاروں

طرف پھیل رہی ہے۔ اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر ۱۳۰ کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہوجاتے ہیں۔ اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کرسکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔ (کائنات کی وسعت کے بارے میں یہ نظریہ آئن سٹائن کا ہے، جو ایک ریاضی دان کا قیاس ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے، اور نہ ہی آئندہ اس کا امکان ہے)۔

آسمان گرد وغبار سے پاک ہوتو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن معمولی دوربین کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہوجاتی ہے، اور وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلو پر لگی ہوئی ہے اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں، مگر یہ تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے، کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے، جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کررہے ہیں، کچھ ستارے تنہا سفر کررہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی شکل میں ہیں، اور بے شمار ستارے ایسے ہیں جو مجامع النجوم کی صورت میں متحرک ہیں، روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بے شمار ذرے اِدھراُدھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے، اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کرسکیں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کرسکتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ملے ہوئے حرکت کرتے ہیں، اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود بالکل یکہ وتنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انہیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے، ہر جھرمٹ کو کہکشان کہتے ہیں، اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں، سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں وہ چاند کی ہے۔ چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ساڑھے انتیس دن میں زمین کے گرد اس کا ایک چکر پورا ہوجاتا ہے، اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ بناتی ہے، جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں، اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں، ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگارہا ہے۔

یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں کا ایک حلقہ ہزاروں دمدار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہیں جو اس طرح گردش میں مصروف ہیں، ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے جس کو ہم سورج کہتے ہیں، اور جس کا قطر آٹھ لاکھ ٦۵ ہزار میل ہے، اور وہ زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے، بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لئے ہوئے ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے، اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں جن سے مل کر ایک کہکشان وجود میں آتی ہے، کہکشاں گویا ایک بہت بڑی پلیٹ ہے جس پر بے شمار ستارے منفرداً اور مجتمعاً لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں، پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں، چنانچہ وہ قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کر رہی ہے کہ اس کا ایک دَور بیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سو ملین (ایک ملین برابر دس لاکھ) کہکشاؤں پر مشتمل ہے، اور ہر کہکشان میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم وبیش ستارے پائے جاتے ہیں۔ قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نوری ہے۔ اور ہم زمین کے رہنے والے کہکشان کے مرکز سے تیس ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں، پھر یہ کہکشاں ایک اور بڑی کہکشاں کے جزو ہے جس میں اسی طرح کے سترہ کہکشائیں حرکت کر رہی ہیں، اور پورے مجموعہ کا قطر بیس لاکھ سال نوری ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبارے کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے، ہمارا سورج ہیبت ناک تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشان کے بیرونی حاشیے کی طرف مسلسل بھاگ رہا ہے، اور اپنے ساتھ نظام شمسی کے تمام توابع کو بھی لئے جا رہا ہے، اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں، کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ ہے، کسی کی ۳۳ میل فی سیکنڈ، کسی کی ۸۵ میل فی سیکنڈ، اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دور بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا ہے، اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا ہے، زمین کی حرکت سورج کے گرد ہر درجہ منضبط ہے، اسی طرح اپنے محور کے

او پراس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدی کے اندر بھی اس میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا ز، مین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے، اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے وہ بھی ہر ساڑھے آٹھارہ سال کے بعد نہایت صحت کے ساتھ دہرادیا ہوتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد، ابراہیم اندلسی، ابواسحٰق زرقالی، امام رازی، امام غزالی، شیخ الرئیس، اور متعدد علماء و محققین رحمۃ اللہ علیہم نے آسمانوں کے گول ہونے اور شمس وقمر ودیگر تمام سیاروں ونجوم وکواکب پر محیط ہونے کی تصریح کی ہے، اور لکھا ہے کہ قرآنی ہفت آسمانوں کے بارے میں علماء اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ گول اور محیط بالعالم ہیں، اور یہ آسمان جن کی کوئی نہ حد نگاہ ہے نہ فضائی طبقے بلکہ باقاعدہ اجسام اور تہہ بر تہہ سقف مرفوعہ محفوظہ ہیں۔ ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ [الأنبياء: ۳۲] (اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنادیا ہے)۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا﴾ [النباء] (اور ہم نے تمہارے اوپر سات محکم ومضبوط آسمان بنائے)۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ﴾ [الفرقان: ۲۵] (اور جس دن آسمان بادل پر سے پھٹے گا)۔ ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝﴾ [الانشقاق] (جب آسمان پھٹ پڑے گا۔ اور وہ اپنے پروردگار کا حکم سن کر مان لے گا، اور اس پر لازم ہے کہ یہی کرے)۔ ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝﴾ [الانفطار] (جب آسمان چر جائے گا)۔

شگاف ہونا، پھٹ جانا، ریزہ ریزہ ہونا اجرام واجسام کی خاصیت ہے، پس آسمانوں کے اجسام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح احادیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کے دروازے بند تھے جبریل علیہ السلام کو وہاں کچھ دیر کے لیے رکنا پڑا، استفسار کے بعد پہرہ داروں نے دروازہ کھولا۔ اس حدیث میں دروازہ پہرہ داروں پھر آسمانوں کے آپس کے فاصلوں اور مختلف آسمانوں میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی ملاقاتوں وغیرہ کی تفصیل ہیں، یہ سب اس بات کی علامت وثبوت ہیں کہ آسمانوں کے اجسام ہیں۔ [الھینه الوسطی]

امام بغوی رحمہ اللہ نے حضرت کعب الاحبارؒ کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا دنیوی آسمان موج بستہ ہے، دوسرا آسمان سفید زمرد کا ہے، تیسرا لوہے کا، چوتھا پیتل کا، پانچواں چاندی کا، چھٹا سونے کا، ساتواں سرخ یاقوت کا ہے۔ [مظهري] یہ سارے خواص اجسام واجرام کے ہیں۔ آسمانوں، ستاروں، افلاک، وغیرہ کے متعلق قدیم وجدید حکماء کی

آراء قدیم یونانی حکماء ارسطو اور بطلیموس کہتے ہیں کہ آسمانوں کا وجود ہے، اور آسمان متحرک ہیں، البتہ سیارے، ستارے، کہکشائیں، سورج اور دیگر نجوم سب کے سب آسمانوں میں مرتکز پیوست ہیں جیسے نگینہ انگشتری میں یا کیل دیوار میں، آسمانوں کی حرکت سے ان کی حرکت معلوم ہوجاتی ہے، مگر یہ کواکب خود متحرک نہیں ساکن ہیں۔

جدید حکمت کے بانی (واضع) ابو اسحاق ابراہیم بن یحیٰ زرقالی قرطبی اندلسی رحمہ اللہ کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام سیارے کواکب و نجوم آسمانوں سے بہت نیچے اپنے اپنے افلاک (گزرگاہ) فضاء بسیط میں ہیں، اپنے اپنے مداروں میں رواں دواں اور متحرک ہیں، اور ان کی حرکت باختلاف سمت ذاتی ہے، اور جاری بھی ہے، ان میں سے کوئی بھی سیارہ نجم اور کوکب آسمانوں کے ساتھ متصل پیوست جڑا ہوا نہیں ہے، اور آسمان ان سیاروں سے وراء الوراء بہت بلند و بالا بہت دور ہے، اور آسمانوں کی اپنی ذاتی حرکت نہیں، اور وہ ساکن غیر متحرک ہیں۔

بعینہ یہی عقیدہ موجودہ یورپی سائنسدانوں کا ہے۔ دراصل یورپی سائنسدانوں کا عقیدہ وخیال ونظریہ اسی مسلمان سائنسدان کے نظریات سے ماخوذ اور اس کی تشریح ہے، یہ آیندہ معلوم ہوگا تو اس عقیدہ اور نظریہ کے پیش نظر تمام ستارے، سیارے، نجوم، کہکشائیں (ثوابت وغیرہ) زمین و آسمانوں کے درمیان لامتناہی فضاء میں دوام کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح ہوائی جہاز اور پرندے کھلی فضاء کرۂ ہوا میں اڑتے اور تیرتے رہتے ہیں، اور یہی درمیانی لامتناہی فضاء ستاروں کا محل وقوع ہے، اور آسمان تو ان سے وراء الوراء بہت بلند و بالا دور ہے، وہاں تک کسی سائنسدان کی رسائی ابھی تک نہیں ہوسکی ہے۔

آسمان اور افلاک کے درمیان فرق:

عام طور پر لوگ آسمان اور افلاک کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، اسلامی نقطہ نظر سے ان دونوں کا مصداق الگ الگ ہے، آسمان سات ہیں اور بہت بلند و بالا اجسام سے متشکل ہیں، جبکہ افلاک فضاء میں سیاروں کے مدارات (گزرگاہوں) کا نام ہے، آسمان ٹھوس اجسام ہیں، اور افلاک ایسے نہیں، یہ کرۂ ہوا ہی ہے، پس یاد رکھیں! جتنے سیارے بکثرت ہوں گے اسی طرح ان کے افلاک و مدارت بھی بکثرت ہوں گے، اب تک جدید سائنسدانوں نے تقریباً ایک کھرب ستارے معلوم کئے ہیں، تو ان کے افلاک بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں گے، بخلاف آسمانوں کے کہ وہ سات ہی ہیں جیسے کہ نص قرآن کریم ہے۔ [الھیئۃ الوسطی]

☆☆☆

آسمان اور افلاک کے درمیان فرق کے بارے میں علماء اسلام کے نظریہ اور عقائد کے دلائل و وجوہاتِ ثلاثہ:

(۱) پہلی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی اثر ہے کہ تمام سیارے زمین و آسمان کے درمیان لٹکے ہوئے معلق فانوس ہیں نور کی زنجیروں کے ساتھ جن کو فرشتے تھامے ہوئے ہیں۔[روح المعاني، دروس القرآن افغاني رحمہ اللہ]

اس روایت سے چار امور معلوم ہوئے جن میں قدیم فلسفہ کی تردید اور جدید کی تائید ہے:

☆ اول یہ ہے کہ ستارے آسمانوں سے نیچے کھلی فضاء میں ہیں۔

☆ دوم یہ کہ ستارے آسمانوں میں پیوست جڑے ہوئے نہیں۔

☆ سوم یہ کہ ستارے نورانی زنجیروں کے ساتھ معلق ہیں، یہ نورانی زنجیر وہ چیز ہے جسے سائنسدان قوت کشش سے موسوم کرتے ہیں۔

☆ چہارم نورانی زنجیر اور کشش ثقل ایک ہی چیز کی دو تعبیریں ہیں: اول پیغمبرانہ تعبیر ہے، دوم فلسفیانہ تعبیر ہے، پس یہ مربوط نظام اسی نورانی زنجیروں کا کمال اور برکت نہیں تو کیا ہے؟

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ فلسفہ جدید کے ماہرین نے رصدگاہوں میں بہت بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعہ سورج، ستارے اور کواکب کو بڑے غور سے دیکھا تو بار بار دیکھنے سے ان پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ تمام سیارے کھلی فضاء میں اپنے اپنے مداروں میں شب و روز محوِ سفر رواں دواں ہیں، اور ان میں سے کوئی سیارہ کسی جرم عظیم یعنی آسمان کے ساتھ پیوست جڑا ہوا نہیں۔ یہ مشاہدہ ایک بہت بڑا ثبوت اور محکم دلیل ہے، اس سے علماء اسلام کے نظریہ کا اثبات اور تائید ثابت ہوگی، اور تصدیق ہوگئی کہ آسمان بہت بلند و بالا ہیں، اور سارے ستارے نیچے فضاء میں متحرک ہیں۔

یاد رہے کہ اب تک سائنسدانوں نے جتنی دوربینیں ایجاد کی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ دوسو انچ کی ہیں، ان دوربینوں سے ابھی تک انہیں ستاروں تک رسائی اگرچہ حاصل ہو چکی ہے مگر آسمانوں تک ان کو کوئی رسائی حاصل نہیں ہوسکی ہے، اس سے آسمانوں کی بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فسبحانه ما أعظم شانه لا إله إلا هو العليم الحكيم کہ بغیر کھمبے اور عمود و ستونوں کے اتنا بلند و بالا آسمانوں کی تخلیق کی، اور اسے کھربوں ستاروں سے رونق و خوبصورتی عطا کی۔ تبارک اللہ رب العلمين، فتبارک اللہ أحسن الخلقين۔

نگہ کن برین گنبد زرنگار ☆ کہ سقفش بود بے ستون استوار (سعدیؒ)

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ فضاء کے حال معلوم کرنے اور خلائی تجربات کے سلسلے میں سائنسدانوں نے کئی طاقتور راکٹ اور خلائی جہاز خلا میں روانہ کئے ہیں، ان میں سے بعض جہاز چاند سے اوپر گزر کر خلا بسیط میں داخل ہو چکے ہیں، اور بعض جہاز ستاروں پر اتر گئے ہیں، اور وہاں سے مرکز میں ماہرین کو احوال بھیجتے رہتے ہیں، اگر خلائی جہاز ستارہ پر اترتا ہے تو اس کا معنی یہی ہوگا کہ ستارہ آسمان کے ساتھ جڑا ہوا پیوست نہیں ہے، ورنہ آسمانوں کے ساتھ متصادم ہو کر پاش پاش ہو جاتا۔ [الھیئۃ الوسطیٰ]

خلاصہ:

آسمان سات ہیں، آسمان اور فلک الگ الگ ہیں۔ آسمان اجسام ہیں، فلک فضاء کا نام ہے، سارے کواکب افلاک میں ہیں، جبکہ آسمان افلاک سے بہت اوپر ہیں۔ قدیم یونانی نظریہ، تصریح و چغمینی والا نظام اسلامی فلسفہ کے خلاف ہے، جدید فلسفہ اسلامی ہے مغربی نہیں، اس کا موجد مسلمان عالم ہے نہ کہ مغرب و یورپ۔ افلاک اور سیاروں تک انسان کی رسائی ممکن ہے، آسمانوں تک نہیں ہے، ابھی تک کسی بھی ذریعہ سے آسمانوں تک سائنسدانوں نے رسائی حاصل نہیں کی ہے، اور نہ آیندہ اس کا امکان ہے۔ ابھی تک ایک کھرب ستارے دریافت ہوئے ہیں، مزید تحقیق جاری ہے، ابھی تک جتنی دوربین ایجاد ہوئی ہیں وہ صرف دو سوانچ تک ہیں۔ سائنسدان اعتراف کر چکے ہیں کہ کائنات ہماری رسائی سے باہر ہے، اور اس کی تسخیر خارج از امکان ہے۔

موجودہ سائنسدان یہی کہتے ہیں کہ عالمِ بالا میں انسانی رہن سہن اور رہائش ممکن نہیں، ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝۴۰﴾ [یٰس] (سب مدار میں تیر رہے ہیں)۔ سورج، چاند، سارے کواکب نیرات اپنے اپنے افلاک میں ایسے رواں دواں تیر رہے ہیں جس طرح مچھلی پانی میں تیر رہی ہے، کچھ مشرق و مغرب کے سمت، کچھ جنوب و شمال کے سمت، اگر کوئی زمین کے کسی بھی حصے میں ہو کواکب اسے اپنے افلاک سے اسی سمت میں نظر آئیں گے، اس سے کائنات کی بے انتہاء عظمت کا اندازہ ہوگا۔ ﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [یٰس: ۸۳] (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے، اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا)۔

جدید و قدیم فلسفہ:

یونانی حکماء فیثاغورث، ارسطو اور بطلیموس دہریہ گزرے ہیں، عالَم کو قدیم مانتے اور قیامت کے منکر ہیں۔ اول الذکر آسمانوں کا منکر ہے، جبکہ دوسرے دو بجائے سات کے نو آسمانوں کے قائل ہیں۔ بعض حکماء تیس تک

آسمانوں کے قائل ہیں۔ نصیر الدین طوسی شیعی چوبیس آسمانوں کا قائل ہے، یہ سارے ستاروں کو آسمانوں کے ساتھ جڑے ہوئے پیوست مانتے ہیں، ان کے نزدیک آسمان متحرک اور ستارے ساکن ہیں۔

جدید فلسفہ کا بانی (واضع) مسلمان سائنسدان ابو اسحٰق ابراہیم بن یحیٰ زرقانی قرطبی اندلسی متوفی ۱۰۸۷ء ہیں، انہوں نے قرطبہ میں بہت ساری رصد گاہیں بنائیں، اور جدید فلسفہ پر تحقیقات کیں، اور کتابیں لکھیں، انہوں نے قدیم حکماءِ یونان کے تمام نظریات کو غلط ثابت کیا، اور انہیں گمراہ کن قرار دیا۔ بدقسمتی سے یکے بعد دیگرے جب سقوط بغداد و اندلس کا سانحہ پیش آیا تو مسلمانوں کی علمی روشنی اور علمی ورثہ پر زوال آیا۔ تاتاری چنگیزی وحشی جاہل اور بے علم لوگ تھے، انہیں علم کے ساتھ کوئی شغف نہیں تھا، انہوں نے مسلمانوں کے علمی ورثہ کو دریا بُرد کر کے یا تو کتابوں کو جلا دیا اور یا کتابوں سے دریائے دجلہ پر پل بنایا، پانچ ماہ تک دریا کا پانی کتابوں کی سیاہی سے رنگین بہتا رہا، یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا جس کو قیامت تک نہیں بھلایا جاسکتا۔ إنا لله و إنا إليه راجعون۔

دوسری طرف جب اندلس کا سقوط ہوا تو عیسائیوں نے مسلمانوں پر قیامت برپا کی، ایک حصے کو شہید کیا ایک حصہ ملک بدر ہوا، اور ایک معتدبہ حصے کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اندلس کے مسلمان اتنے علم پرور تھے کہ ہر گھر میں علمی کتب کا معتدبہ باقاعدہ کتب خانہ ہوتا تھا۔ عیسائی لوگ اگرچہ اہل کتاب جہلاء تھے مگر انہیں علم اور علمی اقدار کے ساتھ ذوق وشوق حاصل تھا، انہوں نے مسلمانوں کے اس علمی ورثہ کو ضائع نہیں کیا بلکہ انہیں تحفظ دیا، اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کتب خانوں سے کتابیں جمع کیں اور پورے ذخیرے کو یورپ منتقل کیا۔

وہ مسلمانوں کے علوم وفنون خاص کر سائنسی علوم سے بڑے متاثر تھے۔ ان کتب خانوں کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کیا، اور یورپی زبانوں میں ان کے ترجمہ کئے، باقاعدہ مدارس وعلمی مراکز قائم کر کے ان علوم کا درس وتدریس شروع ہوا، اور تحقیقی مراکز میں ان کتب پر شروح وحواشی لکھے گئے، خاص کر معقولات اور سائنسی شعبوں پر بڑی دلچسپی کے ساتھ کام شروع ہوا۔ دوسرے درجے میں طب وعلم الابدان کو اہمیت دے کر خوب کام کیا، اس سے پہلے یہ وحشی قوم مغرب والے اتنی سادہ، نکمی اور بے ہنر تھی کہ انہیں ایک معمولی چیز کے بنانے اور ایجاد کرنے پر قدرت ودسترس حاصل نہ تھی۔ مسلمان قوم پر غلبہ نے اور ان کے علمی ورثہ نے یورپ کے محنتی لوگوں کو فلسفہ اور طب کے میدان میں اتنا بلند وبالا مقام پر پہنچایا جس کی بدولت ان دونوں شعبوں میں وہ آج آسمانوں پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہیں، اب انہیں ہر طرح سے پورے عالم پر عروج وبرتری حاصل ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی ☆ جو دیکھا ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

(اقبال)

غنی روز سیاہ پیر کنعان راتماشا کن ☆ کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

یہ جو میں نے عرض کیا یہ ایک منفرد جزوی واقعہ ہے، ورنہ بہت سے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ عیسائیوں نے مسلمانوں کے علمی ورثے کے بیشتر حصے کو ضائع کئے۔ واللہ اعلم

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۳
ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ ۴

ترجمہ: کیا دیکھتا ہے تو رحمٰن کے بنانے میں کچھ فرق؟ پھر دوبارہ نگاہ کر دیکھ کہیں نظر آتی ہے تجھ کو دراڑ؟ (شگاف) ۳ پھر بار بار نگاہ لوٹا کر دیکھو، تیری نگاہ تیرے پاس لوٹ آئے گی تھک کر رد ہو کر ناکامی کے ساتھ ۴

معارف ومنازل

''ما'' نافیہ اور استفہامیہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں، یعنی رحمٰن عزّ مجدہٗ نے اپنے انتظام اور کاریگری میں کہیں کوئی فرق (عیب ونقص) نہیں رکھا، انسان سے لے کر حیوانات، نباتات، بحر وبر، جمادات، عناصر، اجرامِ علویہ، سماواتِ سبعہ اور نیّرات تک ہر مخلوق میں یکساں حسنِ ترتیب کی کاریگری دکھائی ہے، اور حکمت وبصیرت کے ساتھ ہر چیز کو مناسب ومحکم ترکیب کے ساتھ بنائی ہے، جو اس سے بہتر احوال ومناسب ممکن ہی نہ ہو، کیونکہ یہ ساری تخلیق و مصوری حضرت رحمٰن جل شانہ کی ہے، جس میں کسی عیب ونقص اور کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مجال نہیں کہ کسی تخلیق و مصوری میں کوئی فروگزاشت ہو۔

﴿فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ﴾ پھر دوبارہ نگاہ کر دیکھ کہیں نظر آتی ہے تجھ کو دراڑ؟ (شگاف) کیونکہ ساری کائنات نیچے سے اوپر تک ایک تخلیقی بے مثال قانون اور عجیب وغریب اور مستحکم نظام میں جکڑی ہوئی ہے، اور کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے، سلسلۃ الذہب کی زنجیروں میں تسبیح کے دانوں کی طرح مربوط ومنظم ہیں، جس کی صنعت بے مثال ہے، اور ایسی صنعت کہ جس میں اونچ ونیچ واختلال کا شائبہ تک نہیں، ہر چیز اسی معیاری کیفیت کے

ساتھ ہے کہ جس سے بہتر خوبصورتی و تنظیم کا امکان ہی نہیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ اے دیکھنے والا! مناظر قدرت پر غور وفکر کرنے والا! اوپر آسمان کی طرف نظر جما کر دیکھ کہیں کوئی نشیب وفراز اور دراڑ و شگاف نہیں پائے گا، بلکہ صاف وشفاف ہموار بلند و بالا خوبصورت متصل مربوط و محکم جاذبِ نظر پرکشش چیز نظر آئے گی، جس پر ہزاروں اور بے شمار سالوں اور مختلف ادوار، موسموں، زمانوں کے گزرنے کے باوجود آج تک کوئی عیب، نقص وشگاف یا تفاوت پیدا نہیں ہوا، اور یہ دیکھنے کا عمل بار بار تکرار کے ساتھ جاری رکھو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کو دیکھنا دنیا والوں کے لیے ممکن اور آسان ہے۔ قرآن کریم نے دیکھنے کی دعوت دے کر اسی کو واضح فرمایا، کیونکہ آسمان اگر یہی نیلگوں منظر ہے جو کہ ہر وقت نظر کے سامنے ہے تو اسے بار بار ہر علاقے سے دیکھنا آسان بھی ہے اور واقع بھی، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ آسمان اس سے بہت اوپر بلند و بالا ہے تو بھی جب فضاء صاف وشفاف ہو اس کا دیکھنا ممکن ہوگا۔

بالفرض! اگر یہ کہا جائے کہ آسمان بہت بلند و بالا ہے دوری کی وجہ سے اس تک نظر نہیں پہنچتی اور آنکھیں خیرہ ہو کر اس تک رسائی حاصل نہیں کرسکتیں تو پھر رؤیت سے رؤیت بصری مراد نہیں ہوگی، بلکہ رؤیت قلبی غور وفکر کرنا مراد ہوگی۔ واللہ اعلم [خلاصۃ التفاسیر]

﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝۴﴾ پھر بار بار نگاہ لوٹا کر دیکھو، تیری نگاہ تیرے پاس لوٹ آئے گی، تھک کر رد ہو کر ناکامی کے ساتھ، ممکن ہے ایک ادھ دیکھنے یا بغیر غور فکر کے دیکھنے سے یہ معلوم نہ ہو، تو بار بار دیکھو، کئی مرتبہ دیکھو، خوب غور وفکر کے ساتھ دیکھو، باریک بینی کے ساتھ یا سائنسدانوں کی طرح دوربین لگا کر دیکھو، شاید کوئی رخنہ، دراڑ یا عیب نظر آئے، جب یہ سب کچھ مفقود ہوں تو کیونکر نظر آئے، نظر میں تو وہ چیز آسکتی ہے جس کا وجود ہو، جب سارے عیوب ندارد ہوں تو کیا نظر آئے؟ تیری نگاہ نامراد ہو کر ذلیل وشرمندہ ہو جائے گی، خیرہ و درماندہ ہو کر تھک کر واپس رد ہو جائے گی۔

﴿كَرَّتَيْنِ﴾ سے دو مرتبہ تثنیہ مراد نہیں، لبیک وسعدیک کی طرح بار بار دیکھنا، کرةً بعد كرةٍ مراد ہے۔ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آسمان کا منظر مناظر قدرت میں ایک بڑی اہمیت کا حامل ہے جو شخص حسن عقیدت ذوق وشوق ایمانی کے ساتھ روزانہ دس مرتبہ آسمان کو دیکھ کر اس پر دس مرتبہ سبحان اللہ پڑھے گا اس پر عنایات

کا دروازہ کھل جائے گا، اور مقربین میں شمار ہوگا۔ [رسائل غزالیؒ]

علماء کرام نے فرمایا: بار بار آسمانوں، ستاروں، کوہ وجبال اسی طرح قرآن حکیم اور کعبۃ اللہ شریف اور والدین کے چہرے، علماء ربانی عاملین صادقین کے چہرے دیکھنے میں سکون واطمینان حاصل ہونے کے ساتھ ایمان بھی تازہ ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِينِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴿٥﴾

ترجمہ: ہم نے مزین کیا آسمانِ دنیا کو ستاروں سے، اور ان کو شیاطین کے لیے رجوم بنایا، اور رکھا ہے ان کے لیے عذاب دہکتی آگ کا ﴿٥﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ اور دیگر متعدد آیتوں میں اسی مقصد کی وضاحت ہے، سورۃ الصّٰفّٰت میں پوری وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ: ستاروں کی پیدائش کا پہلا مقصد آسمان کی زینت اور اس کی خوبصورتی ہے، اور دوسرا مقصد شیاطین سے آسمان کی اور وحی الٰہی کی حفاظت اور تحفظ ہے، فرمایا: ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ﴾ [الصافات:۷] (بیشک ہم نے نزدیک والے آسمان کو ستاروں کی شکل میں ایک سجاوٹ عطا کی ہے۔ اور ہر شریر شیطان سے حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے)۔

چنانچہ اس مضمون کو چند دیگر آیتوں میں بھی واضح فرمایا: قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿١٧﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨﴾ [الحجر] (اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں۔ اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے سجاوٹ عطا کی ہے۔ اور اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھا ہے)۔ وقولہ تعالیٰ: ﴿اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴿٦﴾﴾ [ق] (کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے؟ اور ہم نے اسے خوبصورتی بخشی ہے، اور اس میں کسی قسم کے رخنے نہیں ہیں)۔

آسمان کو دیکھ لو اور خوب غور کرو، نہ بظاہر کوئی کھمبا نظر آتا ہے، نہ ستون، اتنے بڑے عظیم الشان جسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کھڑا ہے، اور رات کو جب اس پر اربوں کھربوں مختلف رنگ مختلف سائز کے ستاروں کی قندیل اور جھاڑ فانوس روشن ہوتے جگمگاتے ہیں تو سماءِ دنیا کس قدر پر رونق اور خوبصورت نظر آتا ہے، خاص کر جب بادل اور گرد و غبار نہ ہو، فضا صاف وشفاف ہو، ایسے وقت میں آسمان کی خوبصورتی اور دلفریب حسن وتراوٹ دیکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت وخوشی ہے۔

پھر لطف یہ کہ ہزاروں لاکھوں برس گزر گئے نہ اس چھت میں سوراخ ہوا، نہ کوئی کنگرہ گرا، نہ پلاسٹر ٹوٹا، نہ رنگ خراب ہوا، نہ خوبصورتی میں فرق آیا، نہ نظام بدلا، آخر کونسا ہاتھ ہے جس نے یہ بے مثال مخلوق بنائی اور بنا کر اس کی ایسی حفاظت کی؟ یہ حق تعالیٰ کی صفتِ کاملہ، حکمتِ عظیمہ، قدرتِ بالغہ اور وحدانیتِ مطلقہ کی کرشمہ سازی ہے، ان عجیب وغریب محیر العقول بے مثل مناظر قدرت کو دیکھ کر عقلمندوں کے لیے توحید باری تعالیٰ اور اس کی اُلوہیت کا سبق و نشان عبرت واخلاص ہے۔ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ [آل عمران: ۱۹۱] (اے ہمارے پروردگار! آپ اس کو بے کار پیدا نہیں فرمایا)۔

توان آیتوں میں یہ بتایا گیا کہ ستارے پہلے آسمان کے لیے زینت ہیں، اور یہ بات پہلے ذکر ہوئی کہ ستاروں کا تعلق آسمان دنیا کے ساتھ ہے، تاہم وہ سماءِ دنیا میں پھنسے ہوئے نہیں، بلکہ آسمان سے بہت نیچے کھلی فضاء (افلاک) اور فضاء میں معلق ہیں، کیونکہ آیت بالا کی رو سے ستارے آتشیں گولے ہیں جو شیاطین آسمانوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے روکنے کے لیے یہ آتشیں گولے برسائے جاتے ہیں، عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ''رجم'' آتشیں گولے پھینکنے کے لئے کھلی فضاء ضروری ہے، نیز رجم سے مقصود آسمان کی حفاظت ہے، اور حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ آسمان تک پہنچنے سے قبل شیاطین پر گولے برسائے جائیں، لہٰذا آیت بالا کا مفہوم یہ ہوا کہ ستارے آسمان سے نیچے کھلی فضاء میں ہیں جو کہ آسمان کے لیے زینت کا موجب اور شیاطین کے لئے رجوم و گولے ہیں۔

آسمان کی تزئین کواکب سے ایسی ہوگی جیسے چھت کی زینت اس کے نیچے لٹکے ہوئے قمقموں سے ہوتی ہے، عربی شعر: زينتُ السقفَ بالقناديل، میں نے چھت کو قندیلوں سے آراستہ کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اثر کو مشہور مفسر مورخ علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے حدیث مرفوع طویل کے تحت ذکر فرمایا ہے، **فأما سائر الكواكب فمعلقات من السماء كتعليق القناديل من المساجد**۔ آنحضرت رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صریح

قول کے بعد بھی کیا کچھ شک باقی رہ سکتا ہے۔[روح المعاني وهيئة جديدة]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ دونوں کا اثر چند اوراق پہلے تفصیلاً مذکور ہوا، فليراجع۔

﴿رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ﴾ کی مکمل تفسیر سورۂ جن میں ملاحظہ کیا جائے۔

وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٦﴾

ترجمہ: اور جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے لیے ہے عذاب جہنم کی، اور وہ بری جگہ ہے ﴿٦﴾

معارف ومنازل

ماقبل میں ﴿عَذَابَ السَّعِيرِ﴾ کا بیان شیاطین کے لیے ہوا، اب یہاں سے اخوان الشیاطین کے لئے عذاب جہنم کا بیان ہے۔ یہ حکم عام ہے انسان ہو یا شیاطین یا جنات جو کوئی اپنے ربّ سے کفر کرے اور اس کی سابقہ بیان شدہ نعمتوں کا منکر ہو ان کا انجام یہی عذاب جہنم ہی ہوگا۔

فائدہ:

قرآن کریم اور صحیح احادیث میں جہنم کے مختلف ناموں کا تذکرہ ہے، علامہ سیوطیؒ نے البدور السافرة میں دوزخ کے سات طبقے شمار کئے ہیں، اور ان کے سات نام ذکر کئے ہیں:

﴿١﴾ جهنم ﴿٢﴾ السعير ﴿٣﴾ لظى ﴿٤﴾ الحطمة ﴿٥﴾ السقر ﴿٦﴾ الجحيم ﴿٧﴾ الهاوية۔ أعاذنا الله منها بكرمه ولطفه۔آمين

إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ ﴿٧﴾ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ

ترجمہ: جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے سنیں گے اس کا دھاڑنا، اور وہ اچھل رہی ہوگی ﴿٧﴾ ایسا لگتا ہے کہ پھٹ پڑے گی جوش سے۔

معارف ومنازل

﴿شَهِيْق﴾ کا کلمہ قرآن حکیم میں دو جگہ مذکور ہے: ایک یہاں، دوم سورۂ ہود آیت ۱۰۶ میں: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ﴾ [ھود] (چنانچہ جو بدحال ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے جہاں ان کی چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں گی)۔

اور اسی طرح کلمہ زفیر قرآن حکیم میں تین جگہ مذکور ہے: سورۂ ہود کی مذکورہ آیت ۱۰۶، دوم سورۂ فرقان آیت ۱۲ میں: ﴿اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا﴾ [الفرقان] (جب وہ ان کو دور سے دیکھے گی تو یہ لوگ اس کے بپھرنے اور پھنکارنے کی آوازیں سنیں گے)۔ سوم سورۂ انبیاء آیت ۱۰۰ میں: ﴿لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ [الأنبياء] (وہاں ان کی چیخیں نکلیں گی، اور وہاں وہ کچھ سن نہیں سکیں گے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: زَفِيْر زور کی آواز اور شَهِيْق پست آواز کو کہتے ہیں، اور دونوں گدھے کی آوازیں ہیں۔ حضرت مقاتلؒ اور ضحاکؒ کا بیان ہے کہ زَفِيْر گدھے کی پہلی آواز ہے اور شَهِيْق آخری آواز ہے، جبکہ وہ اس کو سینہ کی طرف لوٹاتا ہے۔ حضرت ابو العالیہؒ کہتے ہیں کہ زَفِير حلق میں ہوتی ہے، اور شَهِيْق پیٹ میں۔ [تفسیر خازن]

قرآن کریم نے گدھے کی آواز کو تمام آوازوں میں بدتر اور مکروہ بتایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ [لقمان: ۱۹] (بیشک آوازوں میں سب سے بدترین آواز گدھوں کی ہے)۔ عرب والے عام طور پر بے عقل آدمی کو گدھے سے اور اس کی آواز کو گدھے کی آواز کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ جہنم کی آواز ہو یا جہنمیوں کی آواز شہیق وزفیر کہہ کر تشبیہ بلیغ کا اظہار ہے۔ منکرِ ربّ اور کافر ومشرک گدھا نہیں تو اور کیا ہے؟

تجربہ شاہد ہے کہ دو چیزوں کا غیظ وغضب اتنا تباہ کن سخت ہوتا ہے کہ اس کے سامنے بڑی سے بڑی دیوہیکل طاقتور مخلوق بھی نہیں ٹھیر سکتی، یہ دونوں خطرناک چیزیں چشمِ زدن میں شہروں، قلعوں اور آبادیوں کو تباہ وبرباد کرتی ہیں، وہ ہیں: آگ اور طوفانی سیلاب، اگر یہ دونوں عذاب کے طور پر ہوں تو پھر ان کا مقابلہ بڑا مشکل ہوگا، جہنم ان دونوں سے بھی سخت اور تباہ کن ہے۔

جہنم کی آگ اور اس میں پیدا شدہ جوش وطغیانی ﴿اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ﴾ [المرسلات: ۳۲] (وہ آگ محل جیسے بڑے بڑے شعلے پھینکے گی)۔ نہایت ہولناک ہے جب ایک عام کمزور انسان اپنے خونی دشمن کو دیکھتا

ہے تو آگ بگولہ ہوتا ہے، آپے سے باہر ہو جاتا ہے، اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے، تو کھڑے لوگ اس کو دیکھ کر یہی تبصرہ کریں گے کہ یہ شخص پھٹ رہا ہے، تو جہنم کا کیا کہنا، نعوذ باللہ منہا۔

یہ آواز جہنم کی ہے یا ان لوگوں کی جو پہلے سے جہنم میں ہیں، یا ان تازہ جہنمیوں کی ہے؟ پہلی بات محقق اور متعین ہے کہ زفیر وشہیق جہنم کی آوازیں ہیں، بعد میں یہ آوازیں جہنمیوں کو منتقل ہو جائیں گی۔ أعاذنا اللہ منہا بکرمہ

كُلَّمَآ اُلۡقِيَ فِيۡهَا فَوۡجٌ سَاَلَهُمۡ خَزَنَتُهَآ اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَذِيۡرٌ ۞

ترجمہ: جس وقت ڈالا جائے اس میں ایک گروہ پوچھیں گے ان سے دوزخ کے داروغہ: کیا نہ پہنچا تھا تمہارے پاس کوئی ڈر سنانے والا؟ ۞

معارف ومنازل

سوچنے کا مقام ہے کہ آخر یہ دوزخی لوگ کون ہیں؟ یہ ایسے لوگ نہیں کہ جنہوں نے دنیوی زندگی کسی دور افتادہ صحراء میں گزاری ہو، اور کچھ نہ دیکھا نہ سنا ہو، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے لمبی لمبی خوشحال زندگی آبادیوں شہروں میں گزاری ہے، موت وحیات کا روزمرہ مشاہدہ کرتے رہے، آسمانوں، بادلوں، چاند، سورج، راتوں کو کواکب و ستاروں اور قدرتِ الٰہیہ کے مناظر دیکھتے رہے ہیں، انہیں عقل وشعور سے نوازا گیا تھا، ظاہری وباطنی نعمتوں سے نوازے گئے تھے، بے شمار نعمتوں میں پرورش پائی، ان کی ہدایت ورہنمائی کی خاطر انبیاء ورسل علیہم السلام وقتاً فوقتاً بھیجے گئے، وحی الٰہی کے فیوض وبرکات سے نوازے گئے، انہیں مفت بلا قیمت روشنی، آگ، آب وہوا دستیاب ہوتے رہے، انہیں کفر وشرک ودیگر معاصی کے عواقب وانجام بتائے گئے، اور انہیں ابدی زندگی اور اس کی سعادتوں سے مطلع کرتے رہے۔

پس ہوا یہ کہ انہوں نے ابدی زندگی پر دنیا کو ترجیح دی، ہدایت کاروں سے دور بھاگے، ابلیسی کارناموں پر مرمٹتے رہے، انبیاء علیہم السلام کا مذاق اڑایا، ان کی تکذیب کی، وحی کے ساتھ متصادم ہوئے، کائنات کے ربّ اُرحم الراحمین کا مقابلہ شروع کیا وغیرہ، اتمام حجت ہو چکا، پھر بھی شفقۃً بجائے گمنامی کے ان کے اعمال وزن ہوں گے، اور جہنم میں جانے اور ڈالے جانے کے بعد مزید ذلیل وخواری اور شرمندگی کے لئے ان سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ آخر تم

لوگ یہاں کیوں آئے؟ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرسنانے والانہیں آیا؟ اگر آیا توتم لوگوں نے اس کی باتوں پر کیوں یقین نہیں کیا؟ تو وہ خود اقرار کریں گے: بیشک سب کچھ ہوا، مگر قصور ہمارا ہے، ہم نے تکذیب کی، ان کی بات نہ مانی۔
﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ۝۴۳ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۝۴۴ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ۝۴۵﴾ [المدثر] (وہ کہیں گے کہ: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اور جو لوگ بے ہودہ باتوں میں گھستے ہم بھی ان کے ساتھ گھس جایا کرتے تھے)۔ قولہ تعالی: ﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۝۱۰۸﴾ [المؤمنون] (اللہ فرمائے گا: اسی دوزخ میں ذلیل ہوکر پڑے رہو، اور مجھ سے بات بھی نہ کرو)۔

سورۂ زمر کی آیت: ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا﴾ [الزمر: ۷۱] (جنہوں نے کفر کیا ان کو جہنم کی طرف ہنکایا جائے گا جماعت در جماعت) کے تحت گزر گیا کہ دوزخ کل سات ہیں، اس لئے کہ منکرین توحید ورسالت اور اللہ پاک کے نافرمان کفار ومشرکین عقیدہ واعمال کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں، ان کے کفریہ عقائد واعمال میں بہت اختلاف ہے، تو اسی بنیاد پر دوزخ کے طبقات ودرکات بھی مختلف ہیں، کفار کے ہر طبقے کو دوزخ میں گروہ درگروہ فوج درفوج کی صورت میں جب بھی جہنم میں ڈالا جائے گا، تو جہنم کے داروغہ نگہبان فرشتے ہر گروہ وفوج سے توبیخ اور زجر وتہدید کے طور پر یہی سوال کریں گے کہ تم لوگ یہاں جہنم میں کیسے آئے؟ یہ جہنم نافرمان لوگوں کا ٹھکانا ہے، اور ایسے بے عمل گنہگاروں کا جن کا دامن ایمان واعمالِ صالحہ سے خالی ہو، کیا تمہارے پاس اللہ پاک کے انبیاء ورسل علیہم السلام جہنم سے ڈرانے والے جنت کا راستہ بتانے والے نہیں آئے تھے جو تمہیں جہنم سے بچا لیتے؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو ہر گروہ کے افراد یہی کہیں گے کہ ڈرانے والا پیغمبر تو آیا تھا مگر ہم نے یہ کہہ کر اس کی تکذیب کی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کوئی چیز یا احکام اور کتاب وہدایات نہیں بھیجے، تم جو کچھ کہتے ہو یہ کچھ نہیں، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو۔

اندازہ لگائیں ابھی قیامت نہیں آئی، اور دوزخیوں کو گروہ درگروہ جہنم میں ڈالنے کی نوبت بھی نہیں آئی، مگر اس کی خبر قرآن حکیم نے ابھی سے وضاحت کے ساتھ واضح کر کے بتادی، آج کی دنیا بھی وہی کچھ کہہ رہی ہے جو قیامت میں کہا جائے گا، شرک وبدعت میں لت پت لوگ اہل حق وارثانِ نبوت کو آج وہی تکذیب وگمراہی کا طعنہ دے رہے ہیں، اور ان کی تکذیب پر کمر بستہ ہیں، آج کا گمراہ انسان بہ نسبت گزشتہ ادوار کے نہایت خسیس وگمراہ ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ میں آسمان کے چاروں افق پر اسلام اور قرآنی تعلیمات کے انوار وبرکات ہر طرف موجود اور

موجزن ہیں، جبکہ گزشتہ ادوارِ جاہلیت میں ان چیزوں کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا، لہذا اب کے گمراہ انسان کا شرک و کفر لازماً اشد شمار ہوگا۔

قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ⑨

ترجمہ: وہ جواب دیں گے: بیشک ہمارے پاس ڈرانے والے آئے تھے مگر ہم نے تکذیب کی، اور یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل نہیں کی تم لوگ بڑی گمراہی میں پڑ گئے ہو⑨

معارف ومنازل

آخر کار منکرینِ توحید صاف صاف اقرار کر کے کہیں گے: ڈرانے والے آتے رہے، کلمہ حق سناتے رہے، مگر ہمارے قلوب پر تالے پڑے تھے، ہماری عقول پر پردہ پڑا ہوا تھا، ہماری آنکھیں نابینا کور ہو چکی تھیں، ہمارے دماغ ماؤف تھے، ہم نے ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی، ان کی تکذیب کی۔

آیت کریمہ: ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ﴾ میں راجح یہی ہے کہ یہ کافروں کا قول ہے جنہوں نے ڈرانے والوں کو کہا تھا۔ بعضوں نے یہ قول فرشتوں کی طرف منسوب کیا ہے کہ فرشتے کافروں سے کہیں گے، بہتر پہلا قول ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑩

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑪

ترجمہ: اور کہیں گے کہ: اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے (اور جہنم میں نہ گرتے) ⑩ آخر کار یہ کافر اپنے جرم کا اقرار کرلیں گے، پس یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوں گے⑪

معارف ومنازل

اقرار تو کرلیا مگر یہ اقرار انہیں کیا کام آئے گا، کیونکہ بے وقت اقرار فائدہ مند نہیں ہوتا، جب اقرار فائدہ مند

تھا اور توبہ کا دروازہ کھلا تھا یہ لوگ شوخی میں رہے، اب پانی سر سے اوپر چڑھ گیا، اب یہی ایک فیصلہ ہے کہ ایسے لوگ عنایاتِ ربانی اور لطف وکرم سے محروم ہی رہیں گے، اور دور ہی رہیں گے، قیامت کے دن دوزخی اپنے کفر شرک ودوسرے اعمال بد کا خود اقرار کریں گے کہ ہم واقعی دوزخ اور اس کے عذاب کے مستحق ہیں، اور یہی ہمارا حق ہے، ہمارے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہوئی۔ [ابن کثیر]

مشہور ہے کہ کافر عقلمند نہیں ہوتا، دیکھیں اس آیت میں وہ اپنی نادانی اور بے عقلی کا خود اقرار واعتراف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ میں مذکور ہے: ﴿غَلَبَتۡ عَلَيۡنَا شِقۡوَتُنَا وَ كُنَّا قَوۡمًا ضَآلِّيۡنَ﴾ [المؤمنون: ١٠٦] (ہم پر بدبختی غالب آئی، اور ہم بھٹکے ہوئے لوگ تھے)۔ انسانی فلاح کے دو اسباب ہیں: اول خیر خواہوں کی بات سن کر اس پر عمل کرنا، دوئم اپنی دانش وعقل سے غور وفکر کے بعد صحیح راستہ متعین کرنا، تو یہی جہنمی لوگ افسوس کا اظہار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے دونوں باتیں نہیں کیں، نہ خیر خواہوں کی بات مانی، نہ عقل کو صحیح استعمال کیا، اگر ایسا نہ کرتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا: أقبل آگے آ تو وہ آگے آئی، فرمایا: پیچھے ہٹ جا، وہ پیچھے ہٹ گئی، پھر ارشاد فرمایا: بِکَ أعْطِي وَبِکَ اَمْنَعُ، یعنی تیری وجہ سے دوں گا اور تیری وجہ سے روکوں گا، تمہارے صحیح وغلط استعمال پر خیر وشر کا دارومدار ہے، جو تجھے صحیح استعمال کرے وہ خیر پائے گا، اور جو تجھے غلط استعمال کرے یا مہمل چھوڑ دے وہ شر کا مستحق ہوگا۔ یہی عقل ہی ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا، اس کی بڑی شرافت اور فضیلت ہے۔ تفصیل سورۂ فاتحہ کے فوائد میں دیکھی جائے۔ [مشکوٰۃ: ص ۲۳۰]

إِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١٢﴾

ترجمہ: البتہ جو لوگ اپنے پروردگار کو بغیر دیکھے اس سے ڈرتے ہیں تو ان کے لیے بڑی مغفرت اور بڑا ثواب ہے ﴿١٢﴾

معارف ومنازل

پورے قرآن مجید کا اعجازی بیان اکثر وبیشتر اسی طرز پر جاری وساری ہے کہ عبرت وتذکیر کی خاطر ہر جگہ

نافرمانوں کے احوال کے ساتھ متصل فرمانبرداروں کا بیان، اور دوزخ اور اس کے عذاب کے ساتھ جنت اور اس کی نعمتوں کا بیان مذکور ہوتا ہے، ترہیب کے ساتھ ترغیب کا بیان ہوتا ہے، شیاطین واخوان الشیاطین کے بیان کے بعد جنتیوں کا بیان مختصر الفاظ میں ارشاد فرمایا، بیشک جو لوگ بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، اس ڈروخشیت کی بدولت اس کی نافرمانی سے بچتے پرہیز کرتے ہیں ان کے لیے بڑی مغفرت اور بڑے ثواب کا وعدہ ہے۔ دراصل ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرة:۳] (غیب پر ایمان لاتے ہیں) اور ﴿يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف تعبیریں ہیں، اور ایمان کی پختگی کی نشانی وشناخت ہے، اللہ تعالیٰ بذات خود نظروں سے غائب، جنت وبرزخ قیامت حساب کتاب دوزخ ودیگر بہت سے امور پوشیدہ مخفی ہونے کے باوجود مؤمن کے ایمان کے حصے اور مؤمن بہ کے افراد ہیں۔ ؎

بیا کہ با تو بگویم کمال ایمانی ☆ بہ چشم ہیچ نہ بینی مگر مسلمانی
کسے کہ دید نبی رانکرد تصدیقش ☆ زغیب حال شنیدی کنی مسلمانی

اور یہی بات ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ [الرحمن:۴۶] (اور جو اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں) کی مصداق وبنیاد ہے۔ ایمان بالغیب اور اس کے انواع واقسام وضروری لوازمات کا بیان سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بن دیکھے ایمان لانا ہی اصل ایمان ہے، نہ دوزخ دیکھی ہے، نہ جنت، نہ خدا تعالیٰ کی ذات دیکھی ہے، نہ وحی الٰہی کا نزول، نہ پیغمبر دیکھا، نہ معجزہ تو جنت بھی برحق، دوزخ بھی برحق، محشر بھی برحق اور حساب وکتاب بھی اور عقیدہ یہ رکھا: "لک الحمد أنت الحق ووعدک الحق وقولک الحق ولقاءک الحق والجنة حق والنار حق والنبیون حق ومحمد صلی اللہ علیہ وسلم حق والساعة حق"۔ [مشکوٰۃ]

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑬
اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ⑭

ترجمہ: اور تم اپنی بات چھپا کر کہو یا آواز سے کہو، بلاشبہ وہ سینوں (دلوں) کی پوشیدہ باتوں تک سے بخوبی

واقف ہے⑬ بھلا جس نے پیدا کیا ہے وہ اپنی مخلوق سے بے خبر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور پورا باخبر ہے⑭

معارف ومنازل

شان نزول:

کفار ومعاندین اپنی محفلوں میں حضرت خاتم الانبیاء ﷺ اور قرآن کریم واسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے تھے، تو جبریل علیہ السلام جب آپ ﷺ کو خبر دیتے آپ ان سے کہا کرتے تھے کہ فلاں مجلس میں فلاں شخص نے ایسا کہا، اس پر وہ آپس میں کہنے لگے کہ آئندہ کھل کر باتیں نہ کہا کریں، بلکہ آہستہ بولیں تاکہ اس کو معلوم نہ ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قلنا: ''العبرة لعموم الألفاظ لالخصوص الأسباب''۔ مشہور قاعدہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے خصوصی اسباب سے قطع نظر عموم الفاظ کے مطلب ومعانی پر احکام جاری رہیں گے، یعنی کفر وشرک ہو یا نفاق ادنیٰ سے ادنیٰ چیز ہو یا کوئی بڑی بات، تم ظاہر ہو یا چھپے ہوئے، تمہاری باتیں بولی وگفتار کے درجہ میں ہوں یا نفسانی ارادے ربّ العزّت سبحانہ سب سے باخبر ہے، اور سب کچھ جانتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ساتوں سمندروں کے نیچے تہہ میں باریک چیونٹیوں کے پاؤں کی آواز سنتا بھی ہے، اور انہیں دیکھتا بھی ہے۔ [إحياء العلوم]

''الذي يسمع دبيب النملة السوداء على الصخرة الصماء تحت ظلمات البحار''۔ [الحديث]

اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے ہو مگر وہ پاک ذات سبحانہ تمہیں دیکھ رہی ہے، اور تمہارا ظاہر وباطن سب کو جانتا ہے، یہاں تک کہ تمہارے دلوں کے خیالات اور ارادوں سے بھی باخبر ہے، وہ اگر تم سے اوجھل ہے مگر تم اس سے اوجھل نہیں ہو۔ سوتے میں تم اپنی ذات سے بے خبر ہو مگر وہ تمہیں وہاں بھی دیکھتا اور سنتا ہے، تمہارے گفتار، کردار اور ارادے سب اس کے علم میں عیاں وظاہر ہیں، وہ جب پوری کائنات کا خالق برحق ہے تو کائنات کا کوئی ادنیٰ ذرہ بھی اس کے علم محیط سے باہر نہیں۔

مؤمن اور کافر، چھوٹے اور بڑے سب کو یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ ہمارا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ گفتار وکردار یا عمل ربّ العزّت سے مخفی اور پوشیدہ نہیں، جس طرح اس کی قدرت سارے جہاں کے ذرات پر محیط ہے اسی طرح اس کا علم کلّی بھی ذرہ ذرہ پر محیط ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر ہو؟ ایک ایک سانس ہر ارادہ

یا تنہائی میں کوئی سوچ وخیال ہو سب اس کو معلوم ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ [آل عمران] (بیشک اللہ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو ماؤں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے، ان کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست اقتدار کا مالک ہے، حکمت والا ہے)۔ وہ لطیف باریک بین اور باخبر ہے قیامت کے دن تمہارے ہر عمل وارادہ سے تمہیں خبر دے گا۔ لطیف کے معنی: مہربان کے بھی ہیں جیسے: ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [الشوری: ۱۹] (اللہ مہربان ہے اپنے بندوں پر، جیسے چاہے رزق دیتا ہے)۔

ایمان افروز واقعہ:

امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ مدینہ منورہ کی گلی کوچوں میں ہر رات تاریکی میں رعایا کے حالات معلوم کرنے کی خاطر گشت لگاتے، کان لگا کر سنتے، ہر قسم کی معلومات حاصل کرتے، پھر صبح احکامات صادر کرتے۔ ہوا یہ کہ ایک بیوہ عورت نے دکاندار کے ساتھ بکری کے دودھ کا ٹھیکہ کیا ہوا تھا، آج اتفاقاً دودھ اصلی مقدار سے کم رہا، بیوہ کی لڑکی نے اپنی ماں سے پوچھا: اماں جان! آج دودھ کم ہے شاید دکاندار ناراض ہو، ماں نے کہا: بیٹی تھوڑا سا پانی ملا کر مقدار پوری کرلو (امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ باہر کھڑے سن رہے ہیں) بیٹی نے کہا: اماں جان! امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) کے قانون کی بے احترامی ہوگی، ماں نے کہا: بیٹی یہ نصف شب امیر المؤمنین کیا دیکھتا ہے؟ وہ گھر میں سو رہا ہے، بیٹی نے کہا: امی جان! ہمارا اور اس کا ربّ تو نہیں سوتا، وہ مسلسل جاگ رہا ہوتا ہے، اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ مکالمہ سن رہے ہیں، اور رو بھی رہے ہیں، اور لڑکی کے جوابات سے محظوظ بھی ہو رہے ہیں۔ صبح اپنے بیٹے عاصم کے لیے اس لڑکی کا رشتہ طلب کیا، رشتہ طے ہوگیا، اس لڑکی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، پھر اس کا نکاح عبدالعزیز بن مروان کے ساتھ ہوا جس کے بطن مبارک سے **مجذد المأة الأولى خليفه راشد** حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا: ؎

بتولے باش بیرون شوا زین دہر ☆ کہ درآغوش شبیرے بگیری

ہر عورت شبیر جنم لینے کے کہاں لائق ہوتی ہے، اچھے بچوں کو اچھی مائیں جنم لیتی ہیں، اور برے کم ظرف بے

ہنر بچوں کو نالائق بے دین مائیں جنم لیتی ہیں۔ حیوانات کے بچے باپ کے تابع ہوتے ہیں مگر انسانوں کے بچوں کی خوبیاں اور خامیاں ماؤں کی تابع ہوتی ہیں، اسی طرح برائیاں بھی، یہ تجربہ مسلم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس رشتے کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہر روز جب گھر سے نکلتے تو پہلے اپنی اس بہو کے پاس تشریف لے جاتے اور فرماتے میری بچی! ذرا اپنا سبق تو دھرا دو، تو وہ کہتی: اگر عمر سو رہا ہے تو اس کا خدا جاگ رہا ہے، تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ روتے ہوئے عوام کی عدالت چلے جاتے۔ [سیرت عمر بن خطاب]

هُوَالَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِهٖ ؕ وَاِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ذات وہی ہے جس نے بنائی ہے تمہارے لئے زمین تابع، چلو اس کے اطراف میں اور اس کے دیئے ہوئے رزق میں سے کھاؤ، اور ایک دن اس کی طرف زندہ ہو کر جانا ہے ﴿۱۵﴾

معارف ومنازل

سارے جہاں کے شہنشاہ مطلق موت وحیات اور بلند و بالا ساتوں آسمانوں کا خالق پورے عالم کو ستاروں، شمس و قمر سے زینت اور روشنی دینے والا ربّ شیاطین اور ان کے عملہ سے تمہاری حفاظت کرنے والا اللطیف وخبیر جس کا نہ کوئی شریک ہے نہ ہمسر، اس کا کرم ولطف تم پر کتنا بے حساب ہے کہ اس نے تمہارے نفع اور تمہاری خوش حالی کے لیے کتنی بڑی زمین بنائی، تمہیں مہمان بنا کر تمہاری میزبانی کی، اور اپنی زمین پر تمہیں بسایا اور پوری زمین کو تمہارے لئے مطیع وفرمانبردار اور مسخر بنایا تا کہ آسانی سے اس کے اطراف و جوانب کا سیر کرو، اور چلو پھرو، اس کی قدرتوں کی نیرنگیوں کا نظارہ ومشاہدہ کرو، محض یہ نہیں، بلکہ یہ بہت بڑا دستر خوان بھی ہے جس پر ہزاروں لاکھوں اقسام کے مختلف لذت وذائقہ کے کھانے پینے کی چیزیں چنے ہوئے ہیں۔

﴿کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِهٖ﴾ یہ سب تمہارے کھانے کے لیے ہیں، خوب کھاؤ پیو عیش کرو، مگر ایک بات ذہن نشین کرلو کہ اسراف وتبذیر اور ناشکری سے بچو، اپنے میزبان اور مالک کی حکمِ عدولی نہ کرو، کیونکہ تمہیں مر کر اسی زمین کے اندر جانا ہے، اور ایک دن زندہ ہو کر اسی میزبان کے پاس پہنچنا ہے، کھائی ہوئی ساری نعمتوں کا حساب دینا ہے، شکر گزاروں کو بڑا انعام ملے گا، ان کے چہرے سفید نورانی ہوں گے، ناشکروں کو سزا ہوگی، ان کے چہرے سیاہ ہوں

گے۔ اکبر الہ آبادیؒ نے کہا: ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو ☆ جائز ہے غباروں پہ اڑو چرخ پہ جھولو

ایک بات رہے بندۂ مسکین کی تمھیں یاد ☆ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

کرم نوازی کا اندازہ لگائیں! اشرف المخلوقات سے لے کر انجس المخلوقات اور خنازیر و کفار تک کے لیے اس دستر خوان پر بے شمار ماکولات و مشروبات کا بلا قیمت مفت انتظام موجود ہے، اور اس سرزمین پر اور اس کے سمندر، دریا، نہریں، پہاڑ، جنگلات وغیرہ پر تمام مخلوقات کے کھانے پینے، علاج و معالجہ، رہنے سہنے، غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے کے لیے وافر مقدار میں ہر قسم کی سہولت موجود دستیاب ہے، ہزاروں قسم کے پھل، فواکہ، خشک و تر فروٹ مہیا ہیں، صرف ایک ہی سیب کو لیجیے اکیس سو اقسام میں دستیاب ہے، دوڈھائی ہزار قسم کے نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجے کی معدنیات، سات ہزار قسم کے پھول، تین چار ہزار قسم کے درخت، بائیس سو تک مچھلیوں کی اقسام، آٹھ ہزار کے قریب نادر و بیش قیمت جڑی بوٹیاں دستیاب ہیں، ہر طبقہ کے ماہرین نے عمریں صرف کی ہیں ابھی تک قدرت کی مخلوقات و مصنوعات کا شمار احاطہ نہیں ہوسکا ہے، اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، اور قرآن حکیم کی پیشینگوئی کے مطابق یہ میدان تشنہ تکمیل ہی رہے گا، ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [ابراهيم: ۳۴] (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو نہیں گن سکتے)۔ یہ مضمون ایک مستقل موضوع ہے، اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر درکار ہے۔ واللہ اعلم

فرمایا کہ زمین کی بناوٹ اور ساخت کو دیکھو، چاروں طرف سمندر ہے، درمیاں میں زمین جسے اللہ ربّ العزّت نے تمہارے لئے مسخر اور منقاد بنایا، تم زمین سے ہر قسم کی منفعت حاصل کرتے ہو، تمہارے ہزاروں فوائد اس کی ہزاروں پیداواروں کے ساتھ متعلق و وابستہ ہیں، زمین کے کندھے اور اطراف و جوانب اور بلند و بالا پہاڑ تمہاری سیر و سیاحت کے لیے موزوں و تیار ہیں، جہاں جی چاہا سڑک بنائی، پل بنایا، کاشت کیا، درخت و باغ لگایا، مکان بنایا، مویشیوں کے لئے چراگاہ بنائی، جہاں چاہو سفر کرو، ایک علاقے کی پیداوار اور خوراک وغیرہ دوسرے علاقے منتقل کرو، فوائد حاصل کرو، نفع کماؤ، اپنے ربّ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو، مگر مالک مختار جل جلالہ کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ، اکڑ کر غرور کے ساتھ مت چلو، ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ [بني اسرائيل: ۳۷] (اور زمین میں اکڑ کر مت چلو)۔ زمین کی مٹی سے مجسمہ بنا کر اس کی پوجا نہ کرو، زمین کی قیمتی پتھروں اور دھاتوں سے بت بنا کر شرک

نہ کرو، بندہ پرستی اور پیر پرستی چھوڑ دو، یہ بندے جن کی تم عبادت کرتے ہو تمہاری طرح کے بے اختیار انسان ہیں، ان کی پیدائش بھی اسی زمین کی مٹی سے ہے۔

یاد رکھو! زمین تمہارے فائدے کے لیے ضرور ہے مگر تمہاری ملکیت نہیں، فرق سمجھو! تمہارا مالک اور زمین کا داتا جب چاہے گا تمہیں زندہ یا مردہ زمین کے اندر دھنسا کر ﴿وَإِلَيْهِ النُّشُورُ﴾ کا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا، اور تمہیں اپنے حضور میں حاضر کر کے تمام نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس بعد والی آیتوں میں تہدید وتوبیخ زجر وگرفت کا بیان ہے، اسے پڑھ کر سدھر جاؤ، تو فرمایا:

ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾

ترجمہ: کیا تم بے خوف بے فکرو بے غم ہو گئے ہو اس سے جس کی آسمانوں میں عظمت و بادشاہت ہے کہ تم کو زمین میں دھنسا دے پھر لرزنے لگے؟ ﴿١٦﴾

معارف ومنازل

(جیسے کہ کئی لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا) زمین لرزنے لگے حرکت کرے جیسے کہ زلزلہ ہوتا ہے، اور زمین لرز جاتی ہے، ایسے زلزلے دنیا میں دنیا کے مختلف ممالک میں آئے جن سے ہزاروں لاکھوں انسان تباہ وبرباد ہو گئے۔ قریبی زمانے میں ترکی اور افغانستان، جاپان، ایران، انڈونیشا، چینا، ہندوستان، پاکستان اور مغربی ممالک میں خطرناک قسم کے زلزلے آئے، ان زلزلوں کے اسباب یہی انسانوں کے برے اعمال ہی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ﴾ [الزخرف: ۸۴] (اللہ وہ ذات ہے جو آسمان میں معبود ہے، اور زمین میں معبود ہے، اور وہ حکمت والا، علم والا ہے)۔ اس لطیف وخبیر ذات کے بارے میں کبھی یہ نہ کہو کہ وہ آسمان میں ہے یا زمین میں ہے، وہ لامکان ولازمان ہے، اس کی صفت یوں بیان کرو کہ وہ ہر جہت سے پاک ومنزہ ہے، اس کی سلطنت جس طرح زمین پر ہے اسی طرح بلند وبالا آسمانوں میں ہے، پھر اوپر جنتوں پر، پھر کرسی وعرش معلیٰ پر۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ﴿اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ [الأعراف: ۵۴]

(عرش پر استویٰ فرمایا) سے مراد یہ ہے کہ عرش مجید پر اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم پڑتی ہے، جب اس کی تجلی اعظم عرش معلّٰی پر پڑتی ہے تو وہ سارا رنگین ہوجاتا ہے، اور اس کے اثرات سارے جہاں پر چھا جاتے ہیں، پھر دوبارہ اس کے اثرات واپس لوٹ جاتے ہیں، اس طرح اس پر تجلی اعظم پڑتی رہتی ہے۔[معالم العرفان]

چنانچہ بندوں کو سمجھانے کی خاطر فرمایا: ''فِي السَّمَآءِ''۔اور یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ عام کافر یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے، اور رحمت وعذاب اوپر سے اترا کرتے ہیں، اور بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس کی سلطنت وشہنشاہیت کا بڑا مرکز آسمان ہی ہے، اس لئے ''فِي السَّمَآءِ'' فرمایا۔حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے معمولی غلطی پر اپنی لونڈی کو تھپڑ مارا، رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا، آپ نے اس لونڈی کو بلوایا، جب وہ حاضر ہوگئی تو آپ نے لونڈی سے پوچھا: أین اللہ؟ اللہ پاک کہاں ہے؟ اس نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ ربّ العزّت اوپر آسمان میں ہے، پھر پوچھا: من أنا؟ میں کون ہوں؟ کہنے لگی: أنت رسول اللہ۔ آپ ربّ العزّت کے رسول ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس صحابی سے کہا: یہ مؤمنہ ہے، تمہارے تھپڑ کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کرو اس نے اسے آزاد کیا۔[مشکوٰۃ]

تو سارے لوگوں کی فہم وعقل ایک جیسی نہیں ہوتی، خواص کے لیے اس طرح کہنا اچھا نہیں ہوتا، بلکہ خواص کبھی اس طرح کہتے بھی نہیں، عوام بیچارے اپنے علم وفہم کے مطابق ابھی بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اوپر عرش پر ہے، ان پر مواخذہ نہیں ہوتا، یہ ایک بنیادی بات ہے کہ اللہ ربّ العزّت کی صفات پر اجمالی ایمان کافی ہے، اگر کسی کو اللہ جل شانہ کی کوئی صفت معلوم نہ ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا، اس کے ایمان کے لیے خطرہ نہیں۔[عقیدۃ الطحاویۃ، مختلف الحدیث] اس سلسلے میں ایک بنی اسرائیلی شخص کا واقعہ مشہور ہے کہ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ بعد الموت مجھے آگ میں جلاؤ، اور راکھ سمندر میں ڈال دو، دیکھیں! اس کو اللہ پاک عزّ مجدہ کی اس صفت کا علم نہ تھا کہ وہ راکھ سے مجھے دوبارہ زندہ کرسکتا ہے، چنانچہ مؤاخذہ نہ ہوا، اور رحمن ورحیم عزّ سبحانہ نے اس کی مغفرت فرمائی۔[بخاري] اے تمام جہانوں کا ربّ! واحد لاشریک! ہم سب کی مغفرت فرما۔آمین

فائدہ:

صحیح احادیث میں یہ بات مذکور ہے کہ قربِ قیامت زلزلے بکثرت آئیں گے، اور جزوی طور پر کئی علاقوں (مشرق ومغرب) میں خسف ومسخ کے واقعات پیش آئیں گے، کئی لوگ اپنے جرائم کی پاداش میں زمین کے اندر

دھنسے جائیں گے، اور کئی لوگوں کی شکل وصورت مسخ ہو جائے گی۔ [کتاب الملاحم لابن کثیر رحمہ اللہ]

❁ ❁ ❁

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو کہ وہ معبود جس کا تصرف آسمان وزمین ہر جگہ ہے تم پر پتھروں کا مینہ برسا دے؟ پس تم جان لو گے کہ میرا ڈر سنانے والا کیسا ہے ﴿۱۷﴾

معارف ومسائل

آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے عذاب کا پتہ لگ جائے گا کہ وہ عذاب کیسا ہے، قوم لوط علیہ السلام پر اسی قسم کا عذاب بھیجا گیا، ﴿فَجَعَلۡنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ﴿۷۴﴾﴾ [الحجر] (ہم نے اس کا اوپر نیچے کر دیا، اور ان پر پکی مٹی کے پتھر برسائے)۔ دوسری آیت میں ہے: ﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۬ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾﴾ [هود: ۸۲] (پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس زمین کے اوپر والے حصے کو نیچے والے حصے میں تبدیل کر دیا، اور ان پر پکی مٹی کے تہہ بر تہہ پتھر برسائے)۔ تہ بہ تہ پتھر برسائے گئے، اور زمین الٹ پلٹ کر تہ وبالا کر کے سارے غرق کر دیئے۔

﴿مُسَوَّمَةً﴾ کا معنی ہر شخص کے لیے جو پتھر مقرر تھا، اس پتھر پر اس کا نام لکھا ہوا تھا، نعوذ باللہ من غضبه وعقابه وبطشه۔ اسی طرح یمن کا گمراہ بادشاہ ابرہہ اشرم جو فوج لے کر کعبۃ اللہ شریف کے ڈھانے کے ارادے سے آیا تھا، یعنی اصحاب الفیل میدان عرفات ومغمس کے درمیان ربّ العزّت قہار وجبار نے اس کے پورے لشکر کو ابابیل پرندوں کے ذریعہ تہس نہس فرما کر تباہ کیا۔ ابابیل پرندوں کی چونچ میں ہر سپاہی کے نام کا پتھر مقرر تھا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ مکمل تفصیل سورۃ الفیل میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

بہر حال! اگر تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرو گے اور اس کے پیغمبروں کی مسلسل مخالفت کرتے رہو گے تو تم کو عنقریب دنیا میں یا مرنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا، یا ڈرانے والوں کی مخالفت کا انجام کیسا تھا۔

❁ ❁ ❁

وَلَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: بلاشبہ جولوگ ان سے پہلے ہوگزرے ہیں وہ بھی پیغمبروں کی تکذیب کر چکے ہیں، پھر دیکھ لو کہ میرے انکار کا انجام ان کے حق میں کیسا ہوا⑱

معارف ومنازل

مطلب یہ ہے کہ جیسے کہتے ہیں کہ قصص الاوّلین مواعظ للآخرین، اگلوں کی تباہی کی کہانیاں پچھلوں کے لیے نصیحت اور درس عبرت ہیں، جب اگلے لوگ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں ہلاک وبرباد ہو چکے ہیں تو آئندہ آنے والوں کو ان کی تباہی سے سبق سیکھنا چاہئے، اور ان کے غلط اعمال سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ⑯ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ⑰ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ⑱ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑲﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ہم ان کے پیچھے پچھلوں کو لگاتے رہیں گے۔ مجرم لوگوں کے ساتھ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہلاکت ہو جھٹلانے والوں کے لیے)۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے مکذّبین اور جھٹلانے والوں کو مختلف طریقوں سے عذاب میں مبتلا کر کے ہلاک کر دیا، کسی پر طوفان مسلط کر دیا، کسی کو پانی میں غرق کر دیا، کسی پر آگ برسائی، کسی پر تند وتیز آندھی بھیج دی، کسی پر خسف ومسخ کا عذاب بھیج دیا، کسی پر پتھروں کی بارش برسائی، یہ تباہ شدہ اقوام بڑے تومند، طاقتور اور مضبوط قسم کے لوگ تھے، ﴿لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ⑧﴾ [الفجر:۸] (ان کی مثل شہروں میں پیدا نہیں کیے گئے)۔ مال و دولت، سرمایہ وجاگیر اور عظیم سلطنتوں کے مالک تھے، آج روئے زمین پر ان کا نام ونشان باقی نہیں، وہ بڑے شائستہ لوگ تھے، یہ اہل مکہ ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، ہم انہیں بھی ہلاک کرنے اور مٹانے پر قادر ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جہاد کے ذریعہ میدانِ بدر ودیگر غزوات میں قریش کے سارے سرغنے اور سردار ہلاک کر دیئے گئے، اور ان کی قوت پاش پاش ہو گئی، بالآخر بچے کھچے لوگ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر فتح مکہ کے دن دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ⑲

ترجمہ: کیا یہ منکرین توحید اپنے اوپر اڑتے پرندوں کو نہیں دیکھتے جو پَر پھیلائے ہوتے ہیں؟ اور کبھی پَر

سمیٹ لیتے ہیں۔ان پرندوں کو بجز رحمٰن جل شانہ کے اور کوئی نہیں روکتا، بیشک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے ⑲

معارف ومنازل

یہ پرندے جو تمہارے اوپر فضاء میں اڑتے ہیں معلق ہیں گرتے نہیں ،کبھی انفرادی طور پر ،کبھی غول درغول سینکڑوں کی تعداد میں ان پرندوں میں ایسے بھاری بھر کم بڑے جسم والے بھی ہیں جن کا وزن من کے قریب ہوگا، کبھی اپنے پروں کو پھیلاتے کبھی سمیٹتے ہیں کئی کئی میلوں کا سفر طے کرتے ہیں ،اور کبھی سرد علاقوں سے گرم اور ہوادار علاقوں کا لمبا سفر کاٹتے ہیں، چاہئے تھا کہ زمین کی قوتِ جاذبہ انہیں کھینچ کر اتار دے اور نیچے گرادے ،مگر ایسا نہیں، یہ اڑنے کی طاقت اور فضاء میں قوتِ ماسکہ (تیرنے کی حالت اور یہ عجیب طاقت)۔یہ کس ہاتھ کا کمال اور ذرہ نوازی ہے؟ یہ حضرت حق الرحمن جل مجدہٗ کی قدرت اور کرشمہ سازی نہیں ،تو اور کیا ہے؟

تم زمین پر بڑی سہولت سے چلو، مچھلیاں پانی میں تیرا کی کریں ، پرندے ہوا میں سیر و تفریح کریں ، کھربوں ستارے فضاء میں حیران کن رفتار سے رواں دواں ہوں۔ساتوں آسمان بغیر ستون کے کھڑے ہوں ، زمین پانی پر محو سفر ہو آخر کوئی مخفی ہاتھ ضرور ایسا ہے کہ سب کچھ اس کی کرشمہ سازی سے ہو رہا ہے، یہی وہ ذات اقدس ہے جس کا نام ہے: الرحمن لا إله إلا هو على كل شئ قدير۔

؎ فَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهُ اٰیَةٌ ★ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

بلاشبہ ہر چیز اس کی قدرت کاملہ کے ساتھ ،اور ہر چیز اس کی نگاہ کرم کے ساتھ آباد ہے، کوئی مخلوق نگاہ کرم سے مستغنی اور پوشیدہ نہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ⑳

ترجمہ: بھلا ربّ رحمٰن عزّ مجدہٗ کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کر سکے؟ یہ کافر محض دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں ⑳

معارف ومنازل

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ رحمٰن جل شانہ نے جب کسی قوم کو پکڑا ،عذاب میں ڈالا تو کوئی خارجی لشکر ان کی مدد

کونہیں پہنچ سکا، اور کوئی طاقت انہیں نہ بچاسکی، اگر کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے کیا، اس کے سوا کوئی فوج یا لشکر تمہارے پاس ہے کہ جس وقت وہ تمہیں عذاب دے یا تمہیں کسی مصیبت یا آفت میں مبتلا کردے ایسے وقت میں وہ لشکر تمہاری مدد وحفاظت کرے؟ کوئی نہیں، تو پھر تم غلط فہمی، دھوکہ اور فریب میں مبتلا ہو کہ اسے چھوڑ کر باطل لاچار اور بے بس وبیکس معبودوں کی گرفت میں ہو جو تمہارے لئے کیا اپنے لئے بھی کچھ کرنے کے قابل نہیں، ﴿اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [الأنبياء:٦٧] (تف ہو تم پر، اور ان بتوں پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو)۔

❁ ❁ ❁

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ۲۱

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ اپنی روزی کو روک لے تو بھلا وہ کون ہے جو پھر تم کو روزی پہونچائے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ کافر سرکشی اور نفرت پر اڑے ہوئے ہیں ۲۱

معارف ومنازل

تمام مخلوقات کا رزق وروزی بلکہ رزق کے تمام اسباب ووسائل اللہ پاک کے قبضہ واختیار میں ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [هود:٦] (زمین پر کوئی بھی جاندار ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے)۔ اگر اللہ ربّ العزّت تمہارے رزق وروزی اور اس کے اسباب ووسائل بند کردے تو بھلا کوئی اور طاقت ہے جو تم کو رزق پہنچائے اور بند ذرائع کو کھول دے؟ ہرگز نہیں، یہ لوگ یہ کچھ سننے اور جاننے کے باوجود ضد وگمراہی، ہٹ دھرمی وسرکشی پر ڈٹے ہوئے مغرور اور متنفر ہیں۔ ''لجاج'' کے معنی ہیں: انتہائی عناد، ''عتو'' سرکشی، گمراہی، حد سے تجاوز اور ''نفور'' نفرت اور بیزاری یہ ان کے عیوب ہیں۔

❁ ❁ ❁

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۲۲

ترجمہ: بھلا وہ شخص جو ہر قدم پر منہ کے بل گرتا ہوا چلے وہ ہدایت یافتہ شمار ہوگا یا وہ شخص جو ایک سیدھی راہ پر سیدھ باندھے چلا جارہا ہو (وہ منزل مقصود تک پہنچے گا) ۲۲

معارف ومنازل

یہ موحد و مشرک کی ایک تمثیل ہے۔ "مُکِبّ" کا معنی منہ پر گرنے والا، جیسے مرگی کا مریض یا فالج زدہ یا پاگل جو چلتے ہوئے کسی منزل مقصود تک جارہا ہو اور دھکا کھاتا ہوا قدم قدم پر گر رہا ہو، نہایت عاجز و ناتواں ہو، ایک ناہموار راستہ پر رینگ رہا ہو، اور کھڑے کھڑے چلنے سے معذور ہو، جس کو سوائے نیچے زمین کے کچھ نظر نہ آرہا ہو، کیا وہ شخص زیادہ راہ یافتہ ہوگا یا وہ شخص جو سیدھی راہ سیدھی سڑک پر کھڑے کھڑے سیدھا چلتا ہو، اور سامنے والا پورا راستہ اسے ہر قسم نشیب و فراز کے ساتھ نظر آرہا ہو، چاروں طرف کا میدان اور صحراء بھی اسے نظر آرہا ہو، بلکہ اوپر آسمان، چاند و سورج کی روشنی وغیرہ سب کچھ اس کے سامنے ہو، تو ظاہر ہے کہ وہ پہلا شخص کبھی بھی منزل مقصود تک نہیں پہونچے گا، بھٹکتا ہوا گرتا ہوا ناکام رہے گا، اور یہ دوسرا شخص بآسانی جلدی منزل مقصود تک پہونچنے میں کامیاب ہوگا۔

اول مثال مشرک کی، دوم مثال مؤمن موحد کی ہے، مؤمن کا ایمان پختہ اور یقین محکم ہے، ہر قسم شکوک و شبہات سے پاک ہے، حق و باطل کے راستے اور منزل مقصود سے باخبر ہے، اس کے اعمال صراط مستقیم کے موافق اور چلنا پھرنا صراط مستقیم کے موافق ہے، راستہ ہموار اور چال چلن روشنی میں ہے، اس کے برعکس مشرک شکوک وشبہات کا شکار ہے، اس کا راستہ تاریک اوندھے منہ چلتے ہوئے اور گرتے ہوئے ذلیل وخوار ہے، ان حقائق کے باوجود پھر اگر وہ سیدھا راستہ اختیار نہ کرے تو اگلا فرمان الٰہی یہ ہے:

....

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: آپ فرمائیے: وہی پروردگار ہے جس نے تم کو پیدا کیا، اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے، مگر تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو ﴿۲۳﴾

معارف ومنازل

بعض مفسرین نے ﴿اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا﴾ کے تحت لکھا ہے کہ جو کفار دنیا میں اوندھے منہ چل رہے ہیں، وہ قیامت کے دن بھی اوندھے منہ چل کر دوزخ میں گر جائیں گے، اس پر لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا، اور کہا: یارسول اللہ! یہ لوگ منہ کے بل کس طرح دوڑیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدا تعالیٰ نے دنیا میں انہیں پاؤں پر

دوڑایا، وہ اس پر قادر ہے کہ قیامت کے دن انہیں سر کے بل دوڑائے۔ [بخاري]

اس آیت کریمہ میں دلائل توحید کو چار نعمتوں کے ضمن میں بیان فرمایا: اول اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود کی عظیم نعمت عطا فرمائی، دوم سننے والے کان دیئے، سوم دیکھنے والی آنکھیں عطا کیں، چہارم دل کی نعمت سے نوازا۔ یہ بہت بڑی بیش قیمت نعمتیں ہیں، اور تمہیں مفت بلا معاوضہ عطا ہوئی ہیں، اگر کوئی شخص دنیا کے تمام خزانوں سے ان نعمتوں کو قیمتاً حاصل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا، پس تم لوگ بڑے ناشکر ہو۔

تمام ظاہری نعمتوں کی بنیاد اور سرچشمہ بہت سے حواس مقرر ہوئے ہیں، پانچ حواس ظاہرہ، پندرہ حواس باطنہ، اور دل، دماغ، ان کی پوری تفصیل عمدہ پیرایہ میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان ہوئی۔ مختصراً یہ اجمال کافی ہوگا کہ یہاں سمع وبصر اور دل کی نعمتوں کا تذکرہ ہے کہ حصول علم کا سب سے بڑے ذرائع سمع وبصر ہی ہیں، تمام مسموعات وحی الٰہی جو انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ سے حاصل ہوں گے ان کا تعلق سمع کے ساتھ ہے، اور مسموعات زیادہ بھی ہیں، اور پختہ ویقینی بھی، اس لئے سمع کو یہاں اور دیگر بہت سے مقامات پر مقدم رکھا گیا ہے۔ دوم درجے میں بصر ہے، مبصرات اگرچہ بکثرت ہیں مگر ان کا ادراک وعلم مسموعات کی طرح پختہ نہیں، آپ نے اندازہ نہیں لگایا کہ ہزاروں وہ چیزیں جو ایمان بالغیب سے متعلق ہیں وہ سب مسموعات کے افراد ہیں، جہاں بصارت کا کوئی تعلق نہیں۔

تیسرے درجے میں دل کا بیان ہے جو مرکز عقل ہے بعض کے نزدیک، اور یہی قلب سلطان البدن ہے۔

إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله۔ [بخاري]

سوال: یہ دل کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا کام کیا ہے؟

جواب: بائیں پستان کے نیچے گوشت کا چھٹانک جتنا لوتھڑا ہے، اس میں مقناطیسی غیبی لطیفہ قدرت وکشف کا چھپا ہوا ہے، اسی کو بصیرت کہا جاتا ہے جس کو ربّ العزّت نے وہاں ودیعت فرمایا ہے جیسے گلاب کے پھول میں مہک یا چراغ میں روشنی یہی لطیفہ قلبی انوار وبرکات پیدا کرتا ہے، اور معاصی کے خیالات کو مٹا دیتا ہے، یہی سلطان البدن اور حاکم بدن ہے، معارف وبرکات کا منبع ومرکز ہے، اور یہی عرش الرحمن ہے۔ حضرت پاک ذات سبحانہ کے لیے آسمان وزمین اور پوری کائنات کی وسعتیں محدود وکم ہیں جہاں وہ نہیں سما سکتا، مگر اس تنگ وتاریک صغیر الحجم قلب مؤمن میں وہ سما سکتا ہے۔

جلوۂ حسنت نہ گنجد در زمین وآسمان ☆ در حریم سینہ حیرانم کہ چون جا کردۂ

پس یہ قلب سلیم کتنا خوش قسمت ہے کہ ربّ علیم وخبیر جل جلالہ کا مسکن وگھر بنا، اور کعبۃ اللہ (بیت اللہ شریف) سے بھی ایک قدم آگے نکلا۔ مولانا رومی مثنویؒ میں فرماتے ہیں: ؎

دل بدست آور کہ حج اکبرست ☆ از ہزاران کعبہ یکدل بہترست

دل گزرگاہ جلیل اکبرست ☆ کعبہ معمار خلیل آزرست

یہ قلب انسانی مسکن رحمٰن عزّ مجدہٗ ہے، یہی وہ عظیم قلب ہے جسے پورے بدن پر حکمرانی حاصل ہے، سارے اعضاء اس کے رعایا اور اس کے تابع ہیں، بغیر اس کی مرضی واجازت کے کوئی عضو کسی کام کے لیے تیار نہیں ہوتا، جب وہ اجازت دے گا تو اعضاء کام شروع کرتے ہیں، وہ سب کو سکون وآرام پہنچاتا ہے، اگر وہ مریض ہوا تو سارے اعضاء بے قرار ہوجاتے ہیں خود کبھی آرام نہیں کرتا ہے، رات دن ہر لحہ بیدار رہتا ہے، سب کی نگرانی کرتا رہتا ہے، رات کو سارے اعضاء آرام کر کے سوجاتے ہیں مگر یہ خود بیدار رہتا ہے پہرہ دیتا ہے، کیونکہ اگر یہ چند لحہ کے لیے آرام کرے تو زندگی درہم برہم ہوجاتی ہے۔

یہی لطیفہ ربانی ہے کہ جس کی بقاء کا نام زندگی اور فناء کا نام موت ہے، اگر یہ صالح رہا تو پوری قوم سلامت ہے، اگر اس پر فساد کی آفت آئی تو پوری قوم قریب الموت تباہ ہے۔ دراصل یہ دل اس وقت دل کہلائے گا اور عرش الرحمن کا شرف حاصل کرے گا جب رحمٰن عزّ سبحانہ کے حکموں اور وحی الٰہی کی برکات کے تابع ہوگا، یہی چیز اس کے لیے پیغام حیات اور صلاح کا مصداق ہوگی، اگر احکام شریعت کا تابع نہ رہا اور خودسری وآزادی کا مرض اسے لاحق ہوگیا تو پھر اس کی فضیلت ضائع ہوگئی، اس میں اور گدھے کتے کے دل میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ ؎

قلب موسیٰ پرز نور وحکمت ست ☆ قلب فرعون پرز خبث باطن ست

گر بصورت آدمی انسان بدے ☆ احمد وبوجہل ہم یکسان شدے

(رومی)

قرآن وحدیث اور کتب سلف صالحین اس قسم کے واقعات سے پر ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت مرحومہ کے لیے تزکیہ وطہارت کا جو پیغام لایا، وہ سارے قلوب کے لیے تریاق ثابت ہوا، اگر ان پر کوئی عمل پیرا ہوگا تب اسے قلب طاہر نصیب ہوگا، اگر کوئی غلط راستہ اختیار کرے گا تو اس کا قلب ناپاک رہے گا۔ ؎

حکمت قرآن قلوب المؤمنین ☆ در نہانش نور رب العلمین

ہر کہ قلبش تابع شیطان بود ☆ قلب اوخنزیر نجس العین بعد

(عطار)

آیت کریمہ میں شکر کی تعلیم ہے، اور ناشکری سے بچنے کا بیان ہے، یاد رہے کہ جس طرح منعم حقیقی جل شانہ نے اپنے بندوں کو ذکر کی تعلیم دی ہے اور ذکر لسانی وقلبی دو قسم پر ہے، دونوں محبوب و پسندیدہ ہیں، اسی طرح شکر کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ شکر کا تعلق زبان وعمل دونوں کے ساتھ ہے، اور دونوں پسندیدہ ہیں، مگر اکثر لوگ صرف زبانی شکر پر اکتفاء کرتے ہیں، عملی شکر کا چنداں لحاظ نہیں کرتے، یہ بہت گناہ ہے، یہاں جس طرح شکر باللسان ضروری ہے اس سے کئی درجہ زیادہ شکر بالارکان ضروری اور فرض ہے، ایک پر اکتفاء جائز نہیں۔

سارے حواس خمسہ ظاہرہ و باطنہ قلب و دماغ اور پورے بدنی اعضاء کو ربّ العزّت کے حکموں کی تعمیل اور بجا آوری پر لگانا اور تمام طاعات کو بجالانا ہی شکر ہے، اسی طرح معاصی سے بچنا بھی ضروری ہے، بصورت دیگر شکر ناقابل قبول تصور ہوگا، قوله تعالیٰ: ﴿اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ ۝۱۳﴾ [سبأ] "اِعۡمَلُوۡۤا" کا کلمہ اسی پر دلالت کرتا ہے کہ عملی شکر ہی اصلی شکر ہے، زبانی شکر ہر نعمت پر الحمد للہ کہہ کر شکر بجالانا اگر چہ پسندیدہ ہے مگر یہ بہت آسان ہے اصلی شکر نام ہے، عملی شکر و اطاعت کا اور اسی پر وعدہ ہے: ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾ [إبراهيم:٦] (یقیناً اگر تم نے شکر کیا تم ہم اور زیادہ کر دیں گے) کا۔ اللہ ربّ العزّت توفیق عطا فرمائے۔

تو مطلب یہ ہوا کہ ربّ العزّت تمہیں وجود عطا کر کے بڑا احسان کیا، سننے کے لیے کان دیا دیئے، دیکھنے کے لیے بصارت دی، سمجھنے کے لیے دل عطا کیا، اور تمہیں عقل کی نعمت بھی عطا کی، اور انسان پیدا کیا، تم جانوروں کی طرح اندھا اور بے عقل نہ بنو، اس کی قدرتوں کو دیکھو، سنو اور غور وفکر کرو، اس کی زمین پر گھومو پھرو، جو رزق تمہیں دیا ہے اس میں سے کھاؤ، اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ، تمہیں ایک روز اس کے پاس پہنچ کر ان تمام نعمتوں کا جواب دینا ہے، مگر کتنی حماقت ہوگی کہ ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے، اگر سرکشی کر کے اس کے حکم عدولی اختیار کیا جائے۔ ○

قُلۡ هُوَ الَّذِىۡ ذَرَاَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَاِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ۝۲۴

ترجمہ: آپ فرمائیے کہ اللہ پاک وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر پھیلا رکھا ہے، اور تم سب اسی کے پاس

جمع کئے جاؤ گے (۲۴)

معارف ومنازل

تھوڑے سے غور کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ ربّ العزت سبحانہ نے تمہارے لئے جو زمین پیدا کی ہے وہ کتنی وسیع وفراخ ہے، اس کا ہر حصہ وہر علاقہ کسی نہ کسی چیز میں دوسرے حصوں سے ممتاز ہے، اور یہی تمیز وفرق تمہاری شکل وصورت میں بھی نمایاں اور موجود ہے، پھر زمین کے مختلف حصوں میں تمہیں اسی فرق کے ساتھ پھیلا کر آباد کیا، جس سے تمہاری خوشیوں میں بہت ہی اضافہ ہوا، تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرو، اور اس کے عوض اس کی رضا اور ابدی سعادتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور قانون مجازات کی تباہ کن گرفت سے بچو، کیونکہ ہر حال اس کے پاس تمہیں جمع ہونا ہے، اور پوری زندگی کے اعمال کا جواب اور حساب دینا ہے۔

❀ ❀ ❀

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۵)
قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۶)

ترجمہ: اور یہ منکر کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ آخر یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ (۲۵) آپ کہہ دیجئے کہ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہے، اور میں تو صرف ایک صاف صاف ڈرانے والا ہوں (۲۶)

معارف ومنازل

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت والا وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم لوگ اپنے وعدے میں سچے ہو؟ تو ضرور قیامت کو لا کر دکھاؤ۔ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں بہت سے مقامات پر کفار کا یہ اعتراض مذکور ہے کہ اگر یہ وعدہ سچا ہے تو اسے پورا ہونا چاہئے، اور قیامت کو آنا چاہئے، جواب میں ارشاد ہوا کہ وعدہ سچا ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، مگر بات یہ ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ﴾ [الأعراف:۱۸۷] (کہہ دو کہ اس کا علم صرف میرے ربّ کے پاس ہے، وہی اسے اپنے وقت پر کھول کر دکھائے گا، کوئی اور نہیں، اور وہ آسمانوں اور زمین میں بڑی بھاری چیز ہے، جب آئے گی

تو تمہارے پاس اچانک آجائے گی)۔

یہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کے ساتھ مخصوص ہے، اور کسی کو معلوم نہیں، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے صرف اتنا علم دیا اور بتایا ہے کہ قیامت آنے والی ہے (یقینی ہے) میں اس کے متعلق تم کو آگاہ کرتا ہوں اور ڈراتا ہوں، خبردار کرتا ہوں، یہی میرا منصب اور فریضۂ رسالت ہے۔ رہا وقت کا تعین تو یہ میرے علم میں نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، دیکھو تم لوگ موت کے متعلق یہی کہتے ہو کہ موت کا آنا ہر بشر کے لیے یقینی ہے، موت سے کوئی منکر نہیں، مگر موت کا وقت صحیح اور تعین کوئی نہیں کرسکتا۔ نہ اپنے لئے نہ کسی اور کے لیے، بعینہٖ یہی معاملہ قیامت کا ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے، اور وقت کا تعین میرے علم میں نہیں وہ اچانک آئے گی، لوگ اپنے کاروبار میں منہمک مصروف ہوں گے، غفلت میں ہوں گے، اچانک دیکھیں گے کہ قیامت آگئی۔

قیامت ایک بڑی خبر ہے، نہایت بھاری اور بوجھل خبر، نبأ عظیم ہے، مگر آئے گی اچانک، جب لوگ غفلت میں ہوں گے۔ واضح رہے کہ کفار کا قیامت کے بارے پوچھنا کہ کب آئے گی؟ ان کے سوال کی غرض یہ ہرگز نہ تھی کہ وہ قیامت کا وقت معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر ان کو اس کی آمد کا دن، ہفتہ، مہینہ، سال بتایا جائے تو وہ اسے تسلیم کریں گے، اور ایمان لائیں گے، بلکہ وہ اس لئے سوال کرتے تھے کہ وہ اسے غیر ممکن اور بعید از عقل سمجھتے تھے، بطورِ مذاق واستہزاء سوال کرتے تھے، اور ان کا یہ سوال ایک بہانہ ہوتا تھا کہ یہ عجیب وغریب غیر ممکن قیامت کیوں نہیں آتی؟ اسے آنا چاہئے تمہارے دعویٰ کے مطابق، جب نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ تمہارا دعویٰ برحق اور سچا نہیں ہے۔

صرف یہ نہیں بلکہ قرآن حکیم میں یہ سوال اور خواجہ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے یہی قرآنی جواب کہ مجھے قیامت کے وقت کا کوئی علم نہیں دیا گیا، اس سے علم غیب کلّی کا انتفاء غیر اللہ سے واضح ہوگیا ہے، مگر علم غیب کلّی ثابت کرنے والے یہ کہاں مانتے ہیں، وہ اپنے آباء واجداد کی اتباع ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو زندگی کے آخری حصے میں علم غیب کلّی سے نوازا گیا ہے۔ ان کی یہ بے بال و پر دلیل لغو اور افتراء علی اللہ تعالیٰ پر مبنی ہے، قرآن حکیم کی قطعی نص صریح اور محکم آیت یہ ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: ٦٥] (کہہ دو کہ: زمین اور آسمان میں کسی کو غیب کا علم نہیں سوائے اللہ کے)۔ مزید اس مسئلہ کی تحقیق اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ

اس مسئلہ میں صحاح ستہ کی معروف حدیث جبریل علیہ السلام میں ہے: قال أخبرني عن الساعة قال: مالمسئول عنها بأعلم من السائل۔ الحدیث تمام محدثین علماء امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ حدیث جبریل کا واقعہ عمر شریف کے آخری ایام کا واقعہ ہے۔ اسی کے ساتھ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جس میں مفاتیح الغیب کا بیان ہے، اور قرآن حکیم سورۂ لقمان کی آخری آیتوں کی تلاوت وتذکرہ ہے، قوله تعالىٰ: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿٣٤﴾﴾ [لقمان:] (یقیناً قیامت کی گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہ بارش برساتا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹ میں کیا ہے، اور کسی متنفس کو یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ کل کیا کمائے گا، اور نہ کسی متنفس کو یہ پتہ ہے کہ کونسی زمین میں اسے موت آئے گی، بیشک اللہ ہر چیز کا مکمل علم رکھنے والا ہر بات سے پوری طرح باخبر ہے)۔

چونکہ سائل حضرت حارث بن عمرو بن حارثہ نے اپنے سوال میں صرف انہی پانچ چیزوں کو ذکر کیا تھا، تو جواب میں انہی پانچوں کے متعلق آیت کریمہ کا نزول ہوا، ورنہ علم غیب کلّی کی تخصیص مراد نہیں، وہ اپنے عموم پر خاصہ خداوندی ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾

ترجمہ: منکرین قیامت جب قیامت کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھیں گے تو ان کے چہرے بگڑ جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا: یہ وہی چیز ہے جسے تم خود طلب کرتے تھے ﴿٢٧﴾

معارف ومنازل

ارشاد ربانی ہے: ﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾﴾ [العبس] (اس دن کچھ چہرے غبار آلود ہوں گے۔ ان پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ کافر نافرمان ہیں)۔ ان کے برعکس مؤمنین کے چہرے: ﴿ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾﴾ [عبس] (ہنسنے والے خوش و خرم) بڑے چمکدار نورانی سفید اور مسرتوں میں خوشحال نظر آئیں گے۔ کفار سے کہا جائے گا کہ لو یہ قیامت آ گئی جس کا

تم نے انکار کیا، اور اسے غیر ممکن بعید ومحال سمجھا، یہ وہ ہے جسے تم نے خود طلب کیا اور سوال کیا۔

واضح ہو کہ اگر کسی کی نیت صحیح ہو اور اسے قیامت کے آنے کا ایمان کے ساتھ یقین بھی ہو، اور وہ محض اس بناء پر قیامت کے متعلق سوال کرتا ہو کہ اس کے قریب وبعید ہونے کا حال معلوم ہو، یہ سوال جائز ہوگا۔ بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف اوقات میں سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قیامت کے بارے میں سوالات کئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کی علامات کے بیان کے ساتھ انہیں جوابات دیئے ہیں۔ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قیامت کے متعلق پوچھا: متى الساعة؟ یارسول اللہ! یارسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا ضیعت الأمانة۔ یعنی جب امانتوں میں خیانت ہو، سائل نے دوبارہ پوچھا: فکیف أضاعتها؟ یارسول اللہ! امانت میں خیانت کا مطلب کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إذا وسد الأمر إلى غير أهله، یعنی جب نااہل جاہل لوگ امیر اور حاکم بنیں گے تو یہ قیامت کی نشانی اور علامت ہے، جہاں حقوق اللہ وحقوق الناس تلف ہوں گے۔

ایک دوسرے آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی سوال پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ قیامت کے بارے میں پوچھتے ہو تیرے لئے افسوس ہو تم نے اس کے لیے کوئی تیاری کی ہے؟ کہنے لگے: یارسول اللہ! میں نے صرف فرائض پر اکتفاء کیا ہے بس، اس سے زائد نوافل صوم وصلوٰۃ وغیرہ کا کوئی ذخیرہ جمع نہیں کیا، ہاں یہ بات ہے کہ اللہ پاک اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہوں، تو فرمایا کہ فکر نہ کرو جو کوئی کسی سے محبت کرے گا تو قیامت کے دن اسی کی معیت ورفاقت میں رہے گا، النمر أمع من أحب الحديث۔ [رواهما البخاري]

واضح ہو کہ اللہ پاک اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خالی خولی محبت کا دعویٰ فائدہ مند نہیں، اگر محبت میں اطاعت وفرمانبرداری نہ ہو تو یہ محبت نہیں عداوت اور بے رحمی ہے، اصلی محبت جو فائدہ مند ہے وہ یہ ہے کہ محبت کے ساتھ اعلیٰ درجے کی اطاعت کے ساتھ ہر چیز کی قربانی بھی ہو، اس مسئلے کی تفصیل آنے والی ہے۔

❁ ❁ ❁

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾

ترجمہ: اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے: فرض کرو اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کردے جیسا کہ تمہارا خیال ہے یا وہ ہم پر رحم کردے جیسا کہ ہمارا اعتقاد ہے، تو کافروں کو عذاب الیم سے کون بچائے گا؟ ﴿٢٨﴾

معارف ومنازل

مشرکین مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق طرح طرح کی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے، کبھی ساحر کہتے، کبھی مجنون، پھر کہتے کہ ساحر تباہ ہوگئے، مجنون اور پاگل بھی مرگئے یہ بھی ایسا ہی ہوگا، کبھی کہتے: ﴿شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۝۳۰﴾ [الطور] (ایک شاعر ہے، ہم اس کے بارے میں زمانہ کے حوادثات کا انتظار کررہے ہیں) ہم ان کے بارے میں یہی سوچتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں دوسرے شاعروں کی طرح یہ بھی تباہ ہوجائیں گے مرجائیں گے، پھر اس کا سارا کرتا دھرتا پروگرام ٹھپ ہوجائے گا اور ختم ہوجائے گا، چند دن انتظار کریں گے مسئلہ حل ہوجائے گا۔

اس پر ربّ العزّت عزّ مجدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ فرض کرو اگر ایسا بھی ہوجائے تو اس سے کافروں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ ہمارے ہلاک ہوجانے سے یا ہم پر رحم کئے جانے سے کفار کے عذاب میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بہرکیف انہیں عذاب سے چھڑانے والا اور پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا، کفر کی بنیاد پر ان کا جہنمی ہونا اٹل اور پختہ ہے۔

❁ ❁ ❁

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝۲۹

ترجمہ: آپ ان سے فرمایئے کہ وہ اللہ کی ذات ہے جو رحمٰن ہے، وہ ہم پر رحم کرے گا، کیونکہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور اس پر ہمارا بھروسہ ہے، پس تمہیں جلد ہی پتہ چلے گا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے۝۲۹

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں چار باتوں کی تاکید ہے: اول ربّ تعالیٰ رحمٰن ہے، دوم ایمان باللہ وبصفاتہٖ مدارِ نجات ہے، سوم کفر باللہ وبصفاتہٖ مدارِ عقاب ہے، چہارم اعتماد وتوکل علی اللہ مدارِ سعادت وفلاح ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگ اس ربّ پر اس کی ذات وصفات پر ایمان لائے ہیں جو کہ رحمٰن ہے، بے حد رحم کرنے والا ہے، اور اس پر ہمارا توکل واعتماد ہے، پس اس کی رحمتوں کے ہم ہی تو مستحق وحقدار ہوئے، یقیناً وہ ہم پر رحم فرمائے گا اس لئے کہ ایمان وہدایت ہمارا مقدر ثابت ہوا، تمہیں نافرمانوں کو کل بروز قیامت جلدی معلوم ہوجائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی میں، سورۃ القمر میں ارشاد ہے: ﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ۝۲۶﴾ [القمر] (وہ جلد جان لیں گے کہ کون

جھوٹا اور شر پسند ہے)۔عربی شاعر نے کہا:

فسوف تری اذاانکشف الغبار	★	أفرس تحت رجلک ام حمار

ترجمہ: ابھی تو تم یہی کہتے اور سمجھتے ہو کہ شہسوار ہوں، گرد وغبار جب صاف ہوجائے گا تو پتہ چلے گا کہ شہسوار ہو یا گدھا سوار ہو، تو روز قیامت سارا غبار صاف ہوجائے گا، جب ایمان وکفر اور ہدایت وضلالت کا ربّ العزّت سبحانہ کے دربار میں فیصلہ صادر ہوگا، اور ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝٥٩﴾[یٰس] (اے مجرمو! آج کے دن الگ ہوجاؤ) کے حکم کے بعد عباد الرحمن وعباد الشیطان میں تفریق ہوگی، تو سارے غبار صاف ہوں گے۔

❁ ❁ ❁

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَآءٍ مَّعِينٍ ۝٣٠

ترجمہ: آپ فرمایئے: اگر اس پانی کو جس پر تمہاری زندگی کا دارومدار ہے زمین کی تہہ اور گہرائی میں لے جائے تو کون ہے وہ جو تمہیں صاف وشفاف پانی مہیا کرے؟ ۝٣٠

معارف ومنازل

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ ۝١٨﴾ [المؤمنون:۱۸] (اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے مطابق پانی نازل کیا، پھر اس کا زمین ٹھہرایا، اور اسے ختم کرنے پر قادر ہیں)۔ بارش کا پانی زمین اپنے اندر جذب کرلیتی ہے جس کو تم کنواں کھود کر نکالتے ہو، اگر ہم اسے نہ اتارنا چاہیں، نہ اتاریں اور اتارنے کے بعد تم کو اس سے منتفع ہونے کی دسترس نہ دیں مثلاً اس قدر گہرا کردیں کہ تم نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکو، یا خشک کرکے ہوا میں اڑادیں، یا کھاری اور کڑوا کردیں تو ہم یہ سب کچھ کرسکتے ہیں، بھلا کوئی طاقت ہے کہ ہمارے معاملات میں مداخلت کرکے تمہیں صاف ستھرا پانی مہیا کرے؟

اس آخری آیت کو آیت نمبر (۲۱): ﴿أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ﴾ کا تتمہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ روشنی اور ہوا کی طرح پانی کا شمار بھی بڑی نعمتوں میں سے ہے، بارش کے ذریعہ پانی سے زمین سیراب ہوکر پانی اس میں جذب ہوتا ہے اور ذخیرہ بنتا ہے۔ سرد علاقوں کے پہاڑوں پر پانی برف بن کر جم جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ زمین کے ریشوں

کے ذریعہ ہر جگہ ذخیرہ بنتا ہے اور یہی برف پگھل کر دریا کی صورت اختیار کرتا ہے، نہریں چلتی ہیں اور اسی پانی سے ہر چیز کی حیات وبقاء وابستہ ہے۔

فرمایا: اللہ پاک کی اس نعمتِ عظیمہ کو یاد کر کے اس کی وحدانیت کا اقرار کرو، اور اس کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک مت سمجھو، اور پوری زندگی جب اس کی نعمتوں پر تمہارا بسر گزر جاری ہے تو اس کی نعمتوں کا مسلسل شکر ادا کرو، اور سمجھو کہ اگر وہ اس پانی کو زمین کی تہہ میں نیچے گہرائی میں اتار دے جہاں سے اس کا حصول تمہارے لئے ناممکن ہو تو کیا کوئی ایسی طاقت ہے کہ اس کا حصول تمہارے لئے آسان بنادے؟ کوئی نہیں، اور اتنی بات تم خود جانتے بھی ہو کہ یہ سب کچھ اسی کی کرم نوازی ہے، پھر کیوں اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو؟ پس سمجھو کہ خود جان بوجھ کر اپنے ٹھکانے جہنم میں تیار کرتے ہو، پس تم جانوروں کی طرح اندھے بہرے ہو، یا ان سے بھی بدتر ہو، اور سرکشی وگمراہی میں بھٹک رہے ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عذاب عنقریب بڑی بڑی آبادیوں پر آنے والا ہے جہاں پانی ایک سوفٹ سطح زمین سے نیچے تھا اب سات آٹھ سوفٹ نیچے اتر گیا ہے، مزید سلسلہ جاری ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین

قربِ قیامت کی علامات میں یہ بھی شمار ہے، اور احادیث میں اس کا تذکرہ ہے کہ بڑے بڑے دریا تو خشک ہوجائیں گے یا ان کا پانی اتنا کم ہوگا کہ اس سے زرعی فوائد حاصل نہیں ہوسکیں گے، اسی طرح پہاڑی چشمے خشک ہوجائیں گے، اور کاریزات کا سلسلہ ختم ہوجائے گا، عام زمینی پانی بہت ہی نیچے زمین کی گہرائیوں میں چلا جائے گا جس کا حصول بہت مشکل ہوجائے گا۔

سُورَۃُ الْقَلَمِ

مکیۃٌ آیاتہا ۵۲ رکوعاتہا ۲

سورۂ قلم مکی ہے، اس میں باون (۵۲) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ نٓ اور سورۃ القلم ہے۔ بعض تفاسیر میں صرف دوسرا نام، بعض میں صرف پہلا نام، اور بیشتر تفاسیر میں دونوں نام مذکور ہیں۔ یہی راجح قول ہے کہ اس سورت کو دونوں ناموں سے یاد کیا جائے۔

نزول:

سورۃ نون و القلم مکی ہے۔ اس کا نزول سورۂ مدثر کے بعد ہے۔ اس کی باون (۵۲) آیتیں ہیں، تین سو (۳۰۰) کلمات، اور یہ سورت ایک ہزار دو سو چھپن (۱۲۵۶) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

سورۂ ملک میں توحید باری تعالیٰ اور چار طریقوں سے دلائل توحید و عمومی دلائل کے ذریعہ مکمل اثبات توحید کا بیان ہوا۔ اس سورت میں دلائلِ توحید کے ساتھ اثباتِ رسالت اور اس کے لوازمات و ذمہ داریوں کا مکمل بیان ہے۔ جس طرح سابق سورت میں قیامت اور اس کی ہولناکیوں اور جزاء و سزا کا بیان تھا اسی طرح یہ سورت بھی انہیں مضامین پر مشتمل ہے۔ سورۂ ملک میں ﴿إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا﴾ مذکور ہوا، یہاں باغ والوں کا تذکرہ ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

قلم اور اس کی افادیت کا بیان ہوگا، پھر مشرکین مکہ کے طعنوں اور بے سروپا غلط ناشائستہ الزامات کا نہایت مؤثر مدلل جواب دیا گیا ہے، اور سرور عالم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات وخصوصیات پر نہایت دلچسپ اور عمدہ بحث ہوگی۔ اس کے ساتھ اطاعت وبغاوت کے اچھے اور برے نتائج کا بیان ہوگا۔ نیز شدومد کے ساتھ معاندین پر گرفت اور ان سے مکمل قطع تعلق اور دور رہنے کا تذکرہ بھی ہے۔ نافرمانوں کو تنبیہ اور سبق سکھانے کی خاطر باغ والوں کا واقعہ اور ان کی محرومی کا تذکرہ ہوگا، اور استقامت وصبر کی ترغیب کی خاطر ایک پیغمبر حضرت یونس بن متیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور معاندین کی شرارت اور ان کی ناکامی کا بھی ذکر ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ﻥٓ وَالۡقَلَمِ

ترجمہ: ن اور قلم کی قسم۔

معارف ومنازل

حروف مقطعات خماسی، رباعی، ثلاثی، ثنائی اور وحدانی جس طرح بھی ہوں، ان کا شمار متشابہات قسم دوم میں ہے، یعنی معنی بھی معلوم نہ ہو اور مراد ومقصد بھی پوشیدہ ہو، اس مسئلہ کی پوری تفصیل گزر چکی ہے۔ البتہ مفسرین حضرات نے تاویل کے طور پر کچھ دوسرے معانی بیان کئے ہیں، مگر وہ حتمی نہیں، اور امام رازی، ابن کثیر، سید آلوسی وغیرہ حضرات رحمۃ اللہ علیہم نے انہیں بیان تو کیا ہے، مگر صراحۃً یا اشارۃً ایسے معانی کو ضعیف بتایا ہے، وہ معانی یہ ہیں:

(۱) ﻥٓ نون ساتوں زمینوں کے نیچے ایک مچھلی کا نام ہے، جس کی پشت پر سات زمینیں رکھی ہوئی ہیں۔ جس کا نام یہ موت ہے، اور نون مچھلی کا نام ہے، جیسے: ﴿وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ [الأنبياء:۸۷] (اور مچھلی والے پیغمبر کو یاد کرو جب وہ خفا ہو کر چل کھڑے ہوئے)۔ مچھلی والے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام، جن کا ذکر اسی سورت کے آخر میں ہے۔ یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔

(۲) نون کا معنیٰ: ''دوات''، یہ دوات قلم کا رفیق ہے۔ یہ قول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

(۳) نون ایک نہر کا نام ہے، جو کہ جنت میں ہے۔ یہ قول جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

(۴) نون کے معنیٰ سیاہی کے ہیں، جس سے قلم نے لکھا۔ یہ قول عکرمہ کا ہے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۵) نون سے مراد نبوت کا پہلا حرف ہے۔

(۶) نون سے مراد الرحمٰن کا آخری حرف ہے۔

(۷) نون سے مراد الناصر و النصیر کا پہلا حرف ہے۔

(۸) نون ایک نورانی تختی کا نام ہے، جس پر فرشتے لکھتے ہیں۔

جن تفاسیر نے یہ معانی بصورت تاویل یا حدیث مرفوع یا موقوف بیان کئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: تفسیر عزیزی، تفسیر کبیر، تفسیر روح المعانی، تفسیر ابن جریر، تفسیر درمنثور، تفسیر قرطبی، تفسیر اللباب اور تفسیر غرائب القرآن وغیرہ۔ یہاں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا، وہاں تفصیل ہے، فتدبر۔

قرآن حکیم کی قسموں کا مختصر بیان:

واضح ہو، کہ دنیا میں کئی قسم کی چیزیں ہیں، جن کی قسم لوگ کھاتے ہیں، مثلاً اپنے معبود کی قسم، کسی معظم و محترم ہستی کی قسم، کسی مہتم بالشان چیز کی قسم، کسی محبوب یا نادر شئی کی قسم اور کسی چیز کی خوبی و احترام جتانے کے لیے قسم کھانا۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں چیز یا فلاں شخص کی قسم، یا فلاں شخص کی بزرگی و بڑائی کی قسم اور کبھی پیر، استاذ، مرشد اور سردار وغیرہ کے سر کی قسم وغیرہ کھاتے ہیں۔ شریعت محمدیہ قرآن و حدیث کی رو سے کسی بھی غیر اللہ (خواہ وہ کتنی بڑی ہستی کیوں نہ ہو) کی قسم ناجائز اور حرام ہے۔ جس طرح غیر اللہ کی عبادت اور سجدہ حرام ہے، اسی طرح غیر اللہ کی قسم مطلقاً حرام ہے، حتیٰ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی قسم بھی ممنوع اور ناجائز ہے۔

لیکن اللہ پاک جل شانہ کی شان، بندوں سے جداگانہ اور مختلف ہے، وہ اپنے غیر کی قسم کھاتا ہے اور عموماً ان چیزوں کی جو اس کے نزدیک محبوب یا نافع یا برگزیدہ یا مہتم بالشان یا پختہ ہوں، اور یا مقسم علیہ کے لئے بطور شاہد، حجت اور دلیل کے کام دے سکیں۔ یہاں قلم کی قسم اس کے نہایت وقیع و مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے ہے، اور قلم کی قسم اس کی عظمت شان کی دلیل ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کی مختلف متعدد آیتوں میں مہتم بالشان چیزوں کی قسم کا ہر جگہ اثبات و بیان ہے، جیسے:

﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴾[الواقعة:۷۵] (میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کی گرنے کی جگہوں کی)۔
﴿لَعَمۡرُكَ اِنَّهُمۡ لَفِىۡ سَكۡرَتِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴾[الحجر:۷۲] (تیری عمر کی قسم بیشک وہ بیہوشی میں سرگرداں ہیں)۔﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ‏ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ﴾[القیمة:۲] (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔اور قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی)۔﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ﴾ [البلد:۱] (میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی)۔﴿وَالۡفَجۡرِ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ﴾ [الفجر:۱] (قسم ہے فجر کے وقت کی۔اور دس راتوں کی۔اور جفت کی اور طاق کی۔اور رات کی جب وہ چل کھڑی ہو)۔﴿وَالضُّحٰى وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى﴾ [الضحیٰ:۱] (قسم ہے چڑھتے دن کی روشنی کی۔اور رات کی جب اس کا اندھیرا بیٹھ جائے)۔﴿وَالشَّمۡسِ وَضُحٰٮهَا وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰٮهَا﴾[الشمس:۱] (قسم ہے سورج کی اور اس کی پھیلی ہوئی دھوپ کی)۔﴿وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى﴾[اللیل:۱] (قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔اور دن کی جب اس کا اجالا پھیل جائے)۔وغیرہ مثالیں بکثرت قرآن حکیم میں موجود اور شائع وذائع ہیں۔

عرب میں دستور تھا کہ لوگ عموماً اپنے آباء واجداد اور باطل معبودوں (بتوں) کی قسم کھاتے تھے، جب اسلام کا نور اور شریعت کی روشنی آئی تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سختی سے منع فرمایا کہ غیر اللہ کی قسم حرام ہے، اس سے پرہیز لازمی ہے، اگر کسی کو خواہ مخواہ قسم کھانی ہو، تو اللہ ربّ العزّت معبودِ حقیقی کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔[بخاري ومسلم]

﴿وَالۡقَلَمِ﴾ قلم کی قسم۔ یہاں واؤ قسم کے لیے ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہاں قلم سے خاص قلمِ تقدیر مراد ہے۔اس بارے میں حضرت عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ سید الانبیا صاحب خلق عظیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، اور اس کو حکم دیا کہ لکھو! قلم نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ تو فرمایا کہ تقدیرِ الٰہی کو لکھو۔قلم نے حکمِ الٰہی کے مطابق ابدالآباد تک تمام واقعات حالات سب کچھ لکھ دیا۔[ترمذي]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ربّ العزّت عزّ وجل نے تمام مخلوقات کی تقدیر کو آسمان وزمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا۔[مسلم، مظهري، معارف]

امام ابوحاتم بستی ودیگر حضرات کا قول ہے کہ یہاں قلم سے مراد عام قلم ہے، یعنی تقدیر کا قلم فرشتوں اور کرام کاتبین، اسی طرح قیامِ قیامت تک سارے انسانوں کے لکھنے والے قلم سب کو عام اور شامل ہے۔

امام قتادہ فرماتے ہیں کہ قلم اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی بابرکت نعمت ہے، جو اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے۔قرآن حکیم کی پہلی سورت جو نازل ہوئی سورۃ العلق اس میں اس عظیم نعمت کا محض تذکرہ نہیں، بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے قلم کا فائدہ وثمرہ بھی بیان فرمایا:﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾[العلق:۵] (جس نے قلم سے تعلیم دی۔انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا)۔اس پر علماء امت کے محققین نے اس طرح اظہار خیال فرمایا کہ تقدیر کا قلم ایک نورانی قلم تھا،جس نے تمام مخلوقات کی تقدیر ثبت کی۔

امام بغویؒ نے فرمایا کہ تقدیر لکھنے والا قلم نور کا تھا، جس کا طول آسمان وزمین کی درمیانی مسافت کے برابر تھا۔ [مظهري] جب تقدیر کے قلم نے سارا کچھ لکھ دیا،تو ربّ العزّت نے نظامِ دنیا اور کائنات کی محکم ومنظم نظام کو چلانے کی خاطر دوسرا قلم اپنے بندوں کے لیے پیدا فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نظام وحی وآسمانی کتابوں کا اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا ذریعہ یہی قلم ہے۔پھر نظامِ دنیا میں مخلوقات کی آبادی اور اصلاح معاشرہ کے سارے نشیب وفراز کا واحد ذریعہ بھی قلم ہے۔

آج کی دنیا میں دیکھا جائے تو قرآنی تعلیمات جن کی اشاعت وترویج دنیا کے ہر گوشے تک پھیلی ہوئی عام ہیں، اسی قلم کے طفیل ہیں، اور دنیا میں انسانی آبادی کا نظام اسی قلم ربانی کا مرہونِ منت ہے۔اگر یہ قلم نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا، اور انسان کی برتری حیوانات پر ممکن نہ ہوتی، اور سارا نظام تہہ وبالا درہم برہم نظر آتا۔آج سارا جہاں اگر روشن اور معمور نظر آتا ہے، تو یہی قلم کی برکات ہیں، ہم جزوی طور پر ایک صاحب قلم اور ایک بے قلم انسان میں زمین وآسمان کا فرق مشاہدہ کرتے ہیں۔دنیا میں اس وقت جتنے بے شمار علوم ومعارف کا چرچا ہے یہ صرف قلم کی وجہ سے ہے۔قلم کی اہمیت وافادیت سے کسی کو انکار نہیں، جبکہ اس کو أول ما خلق الله القلم کا شرف واعزاز حاصل ہے۔یہی قلم اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کے درمیان ترجمانی کا حق ادا کررہا ہے۔

کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے متعلق قلم نے ترجمانی نہ کی ہو۔سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ قلم نے ربّ العزّت سبحانہ کے احکامات کی روشنی میں تمام جہان اور ساری مخلوقات کی تقدیر لکھ کر پوری کائنات کے نظم ونسق کے لیے راہ ہموار کیا، اور اللہ تعالیٰ کی عظمتوں اور قدرتوں کو ساری مخلوقات کے سامنے واضح کیا، اور مخلوقات پر اتمامِ

حجت کا باعث بنا۔ قیامت کے دن جہاں مخلوقات خاص کر انس وجن کے افراد کی حمایت یا مخالفت میں ہزاروں گواہ شاہدی ادا کرنے کی خاطر میدان میں آئیں گے تو ان میں یہی قلم کی گواہی (انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد) سرفہرست ہوگی۔

یہ بات واضح ہے کہ اسی قلم نے علوم ومعارف اور حقائق کے ذخیروں سے کائنات کو بھر دیا۔ اگر ایک طرف حق وصداقت کی بے مثال ترجمانی کی تو دوسری طرف باطل خیالات ونظریات کی اشاعت کو عام کیا، چونکہ یہ قلم سراسر تابع عقل اور ترجمان کی حیثیت کا حامل ہے، تو عقل کی طرح اہلِ حق واہلِ باطل دونوں کی مساوی خدمات انجام دینے کا ذریعہ بنا۔ اس وقت علوم ومعارف حقہ سے اگر کائنات کا چپہ چپہ قلم کی وجہ سے روشناس ہے تو اسی قلم کے ذریعہ باطل نظریات اور لایعنی خیالات کا بھی بڑا ذخیرہ دنیا میں موجود ہے، جن سے تمام انسانوں کو بچنے کا حکم۔

یہی دونوں نظریات کی جمع وتفریق اور کاتبانِ تقدیر واعمالِ انسانی کی کتابت کرام کاتبین فرشتوں کے سپرد ہے، اور وہ جو کچھ نیک وبد اعمال لکھیں گے قیامت کے دن انہیں کی روشنی میں جنت ودوزخ کا فیصلہ سرانجام پائے گا۔ پس آیت کریمہ کا یہی معنی ومطلب ہوگا کہ قلم اور اس کی تحریرات پر قسم کھائی گئی اور فرمایا کہ: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾۔

تو قلم تقدیر والا ہو یا عام انسانوں والا قلم ہو اس کی برتری اور افادیت نہایت اہم اور اظہر من الشمس ہے۔ اس پر حضرت باری تعالیٰ کی قسم واضح اور روشن دلیل ہے، اس لئے فرمایا کہ قلم کی قسم۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں وہ مضمون قسم پر ایک شہادت ہوتی ہے، اس کے ساتھ ایک اہم نکتہ ملحوظ نظر رہے، کہ قلم ہو یا عقل، علم ہو یا قلب اور سمع ہو یا بصر یہ سب اللہ ربّ العزّت کی بیش قیمت اور عظیم نعمتیں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بن مانگے بلا قیمت اپنے بندوں کو عطا کی ہیں، ان کا شکر بجالانا ہر انسان پر فرض ہے، اور شکر یہ ہے کہ انہیں ربّ العلمین کے حکموں کے مطابق صحیح اور برحق استعمال کرے، اس کی نافرمانی اور حکمِ عدولی سے بچے، اگر خدانخواستہ ان کا استعمال غلط ہوا تو پھر گرفت یقینی ہوگی، اور ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ [الحج:۱۱] (دنیا اور آخرت کھوگیا) بھی یقینی ہوگا۔ اللّٰھمّ أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ آمین

نکتہ:

کہتے ہیں اگر کوئی چاہتا ہو کہ میرا فیض عام ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہر وقت سربسجود ہونا چاہئے، اور

ندامت وانکساری کے آنسو بہانا چاہئے، کیونکہ قلم کی یہی خاصیت ہے کہ ہر وقت وہ سر بسجود ہے، اور آنسو بہاتا ہے، اسی وجہ سے اس کے فیض نے دنیا کو علوم ومعارف سے بھر دیا ہے۔

وَمَا يَسْطُرُوْنَ ①

ترجمہ: اور قسم ہے اس کی جو لکھنے والے لکھتے ہیں ①

معارف ومنازل

اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کاتبانِ اعمال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ دیگر حضرات نے ﴿وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ کو عام رکھا ہے کہ قیامت تک لکھنے والے جو کچھ لکھتے رہیں گے، سب کو شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کا یہ عمل جس پر قسم کھا کر کہا گیا ہو وہ ایسے علوم ومعارف کے خزانے ہوں گے جنہیں دربارِ الٰہی سے قبولیت کا شرف حاصل ہو۔ یہ وہ مکتوباتِ حقہ ہوں گے جن کا تعلق دینِ الٰہی کے ساتھ ہوگا، اور یہ وہ علوم ومعارف ہوں گے جن کی قرآن وحدیث اور احکامِ شریعت کے ساتھ وابستگی ہوگی، جیسے کہ قرنِ اول میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی کتابت کا زبردست اہتمام کیا، اور جزوی طور احادیث کی کتابت بھی ہوتی رہی، حتیٰ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے جمع وتدوین احادیث کا بڑے اہتمام کے ساتھ انتظام فرمایا، جس کے نتیجے میں پورا ذخیرہ احادیث قلمبند ہوا۔

الحمدللہ آج لاکھوں کی تعداد میں قرآن حکیم کی تفاسیر اور لاکھوں کی تعداد میں کتب احادیث وفقہ اور دوسرے اسلامی علوم دنیا میں موجود ہیں، دس لاکھ احادیث کے ذخیرہ کے ساتھ پانچ لاکھ راویانِ حدیث کے متعلق کتب اسماء الرجال کا ذخیرہ بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ الحمدللہ

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ②

ترجمہ: آپ اپنے پروردگار کے فضل سے مجنون اور دیوانے نہیں ہیں ②

☆☆☆

معارف ومنازل

یہ وہ بات ہے جس پر قلم اور کتابت کی قسم کھائی گئی ہے، اور یہ جملہ قسم کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن جو کاتبینِ وحی کے ہاتھوں کتابت ہو رہا ہے بجائے خود کفار کے اس بہتان کی تردید کے لئے کافی ہے کہ معاذ اللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجنون ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوائے نبوت سے پہلے کفار مکہ آپ کو اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپ کی دیانت وامانت اور عقل وفراست پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ تعمیرِ کعبہ کے موقعہ پر حجر اسود کو نصب کرنے کا جو طریقہ آپ نے منتخب فرمایا آپ کی اس عقلمندی اور فراست پر پوری قوم نے آپ کو سراہا، اور آپ کی مدح وثنا کی۔

مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دیوانہ ہونے کی تہمت لگائی، اس لئے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اس تہمت کی تردید کے لئے کافی ثبوت ہے، یہ اعلیٰ درجہ کا فصیح و بلیغ کلام جو ایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے اس کا پیش کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ پاک کا خاص فضل ہوا ہے، نہ یہ کہ کہا جائے (معاذ اللہ) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیوانے ہوگئے ہیں۔

یہاں بظاہر خطاب تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے ہو رہا ہے، مگر درحقیقت مقصود کفار کو ان کی تہمت کا جواب دینا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خلق عظیم پر ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اخلاق کے بہت بلند مرتبہ پر فائز ہیں، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلق کی ہدایت کے لئے اتنی مشقتیں برداشت کر رہے ہیں، ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ﴾ [الشعراء:۳] (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کیے جا رہے ہیں) والی آیت اس پر واضح گواہ اور ثبوت ہے۔ ورنہ ایک کمزور اخلاق کا انسان یہ کٹھن کام نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرا یہ کہ قرآن حکیم کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند اخلاق بھی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دیوانگی کی جو تہمت لگا رہے ہیں، وہ سراسر جھوٹی ہے، کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو، اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ ہو، اس کے افعال واعمال برگشتہ اور بے اعتدال ہوں، اور وہ ہر قسم اخلاقی پہلو سے عاری ہو، جس طرح ہم دیکھتے اور صبح وشام مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرۃ ہے، اور اس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن اور معتدل ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند اخلاق اور کردار وعمل سے کفارِ مکہ خوب واقف بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مداح تھے، اس

لئے ان کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر احمق اور بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ ان کی اس بیہودگی سے خود ان کا نقصان ہے کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر ایسی ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جنہیں کوئی عقلمند صاحب فراست قبول نہیں کر سکتا، اور نہیں کرے گا، اور اس پایہ کے عقلمند شخص کو دیوانہ کہنے والے خود پاگل و دیوانہ شمار ہوں گے، چنانچہ آئندہ کے واقعات نے مکمل اس کی تائید کی۔ الحمد للہ

دراصل اس سورت میں کفار مکہ کے ان مطاعن اور تہمتوں کا جواب ہے جو وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پورے زور وشور سے لگایا کرتے تھے۔ سب سے پہلا طعنہ استہزاءً ان کا یہ تھا کہ ربّ العٰلمین عزّ شانہ کے بھیجے ہوئے کامل العلم، کامل العقل اور جامع الکمالات والفضائل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معاذ اللہ مجنون کہتے تھے۔ پہلے ان اسباب ودواعی کا بیان ہوگا جن کی بنیاد پر وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنون کا الزام لگاتے تھے، یہ اسباب بادی النظر میں چار ہیں:

اول وجہ: یہ کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابتداءِ بعثت کے ساتھ نمازوں کے اہتمام کا سلسلہ شروع فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے رفقاء حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ، سیدۃ خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہم نے نماز پڑھنی شروع کی، چند ہی دنوں میں یہ سلسلہ مزید وسیع ہوا، اور نماز میں تکبیر، قراءت، قیام، رکوع، سجدہ، التحیات اور سلام سب کچھ ہونے لگا۔ مشرکین مکہ نے جو کہ چار سو سالوں سے بت پرستی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا، جب انہوں نے قریب سے بغور ان نمازوں کا بلاحظہ کیا تو کہنے لگے: دیکھو! یہ لوگ پاگل اور دیوانوں کی طرح حرکتیں کر رہے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) معاذ اللہ دیوانہ ہیں، اور اپنے پورے کنبے کو دیوانہ بنا رہے ہیں۔ یہ زمانہ بالکل ابتدائی تھا۔

دوم وجہ: جو کہ رسالت کے زمانہ سے متعلق ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو وحی فرشتہ کے ذریعہ نازل ہوتی تھی، بوقتِ وحی اس کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسم مبارک پر دیکھے جاتے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وحی سے حاصل شدہ آیات پڑھ کر سناتے تھے، یہ معاملہ ان کے فہم وادراک سے باہر تھا، اس لئے اس کو جنون قرار دیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مجنون کہنے لگے۔

سوم وجہ: یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی قوم اور پوری دنیا کے موجودہ عقائدِ شرکیہ کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ عبادت کا صحیح حقدار اللہ پاک کے سوا کوئی نہیں، جن خود تراشیدہ بتوں کو وہ خدا سمجھتے تھے ان کا بے علم، وبے شعور اور

نا قابلِ نفع وضرر ہونا بیان کیا، اس پر وہ کہنے لگے: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ [ص:۵] (کیا بہت سارے معبودوں کو ایک ہی معبود قرار دیا؟ ایک عجیب چیز ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عقیدہ کے متعلق آپ کے کوئی مہتم بالشان ساتھی کچھ زیادہ نہ تھے۔ آپ اکیلے بغیر کسی قوم ولشکر کے ظاہری اسباب ومددگاروں کے بغیر تن تنہا اتنے بڑے کٹھن مشکل پروگرام کو لے کر چلنے کا پختہ عزم کئے ہوئے تھے، اس پر وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاذ اللہ نا عاقبت اندیش اور مجنون کہنے لگے، کہ دیکھو! یہ شخص تمام جہان کے عقائد کو تن تنہا بدلنے کی کوشش کر رہا ہے، ظاہری اسباب کے فقدان کے ساتھ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، اسی بنیاد پر معاذ اللہ انہوں نے آپ کو مجنون کہا اور کہنے لگے کہ عجیب خلافِ عادت پروگرام لے کر آیا ہے، کہ سارے جہان کا ایک ہی خدا ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

چہارم وجہ: جو کہ اہم بھی ہے اور تاریخی بھی: قولہ تعالی: ﴿یٰحَسْرَةً عَلَی الْعِبَادِ ۚ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [یس:۳۰] (بندوں پر افسوس ہے کہ ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا، مگر وہ اس سے تمسخر کرتے ہیں)۔ ﴿كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ﴾ [الذاریات:۵۲] (اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو پیغمبر آتا وہ اس کو جادوگر یا دیوانہ کہتے)۔

یعنی قدیم زمانے سے ہر زمانہ کے کافر اس بات میں ایسے متفق اللفظ رہے ہیں کہ گویا ایک دوسرے کو وصیت کر کے مرے ہیں کہ جو پیغمبر آئے اسے ساحر یا مجنون کہہ کر چھوڑ دینا۔ یہ ان کی پرانی شرارت رہی ہے، اور کفار مکہ اگرچہ پرانی قدیم تاریخوں سے ناواقف جاہل رہے ہیں، مگر ابلیس انہیں ایسا سبق دے کر راہِ حق سے گمراہ کرنے کی ہر وقت کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ قرآن حکیم کی متعدد مقامات میں مذکور ہے کہ لوگوں نے اکثر وبیشتر انبیاء علیہم السلام کو ساحر و مجنون کہا۔ معاذ اللہ

﴿مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (اے محمد!) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو)۔ قلم نے تاریخی معلومات کا جو ذخیرہ بطونِ اوراق میں جمع کیا ہے، وہ ببانگِ دہل شہادت دیتا ہے کہ واقعی دیوانوں اور ان دیوانہ کہلائے والوں کے حالات میں کس قدر زمین وآسمان کا تفاوت ہے۔ آج آپ کو (العیاذ باللہ) مجنون کے لقب سے یاد کرنا بالکل وہی رنگ رکھتا ہے جس رنگ میں دنیا کے تمام جلیل القدر اور اُولوالعزم مصلحین کو ہر زمانہ کے شریروں اور بے عقلوں نے یاد کیا ہے۔ لیکن جس طرح تاریخ نے ان مصلحین کے اعلیٰ کارناموں پر بقاء ودوام کی مہر ثبت کی اور ان مجنون کہنے والوں کا نام ونشان باقی نہ چھوڑا، قریب ہے کہ قلم اور اس کے ذریعہ سے لکھی ہوئی تحریریں آپ کے ذکر

خیر اور آپ کے بے مثال کارناموں اور علوم و معارف کو ہمیشہ کے لیے روشن رکھیں گی، اور آپ کو دیوانہ بتلانے والوں کا وجود صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ کر رہے گا۔ ایک ایسا وقت آئے گا جب ساری دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت ودانائی کی داد دے گی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل ترین انسان ہونے کو بطور ایک اجماعی عقیدہ کے تسلیم کرے گی۔ بھلا خداوند قدوس جس کی فضیلت و برتری کو ازل الآزال میں اپنے قلم نور سے لوح محفوظ کی تختی پر نقش کر چکا ہے، کسی کی طاقت ہے کہ محض مجنون ومفتون کی پھبتیاں کس کر اسکے ایک شوشہ کو مٹا سکے؟ جو ایسا خیال رکھتا ہو وہ پرلے درجے کا مجنون یا جاہل ہے۔ [تفسیر عثمانی]

یاد رکھو کہ بعثت سے پہلے چالیس سال تک وہ تمہارے اور تم اس کے ساتھ رہے، اتنی طویل مدت تک اس کے تمام کھلے چھپے احوال کا قریب سے تجربہ کیا، کبھی ایک مرتبہ اس کا جھوٹ فریب یا دیوانہ پن کی بات نہ دیکھی۔ ہمیشہ اس کے صدق وامانت اور عقل ودانائی کے معترف رہے، اور اپنی مجلسوں میں انہیں امین کے لقب سے یاد کرتے رہے، اب بلا وجہ اسے جھوٹا یا دیوانہ کیونکر کہہ سکتے ہو؟ کیا یہ وہ تمہارا رفیق نہیں ہے جس کے رتی رتی احوال کا تم پہلے سے تجربہ رکھتے ہو، اور اس کی صداقت ودیانت اور امانت کی بخوشی اعتراف کرتے چلے آرہے ہو، اب ان کو دیوانہ کہنا بجز دیوانگی کے کچھ نہیں۔

نعمت ربّ کی موجودگی کے ساتھ نفی جنوں کو مقید کرنے سے نفی کی دلیل وبرہاں کا بھی ذکر ہو گیا کہ جب کسی کو فضلِ الٰہی، یعنی علم، عقل وفہم اور دوسرے کمالات اس حد تک حاصل ہوں اس کو دیوانہ کہنا محض حماقت وبیہودگی ہے۔ ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو گدھے سے بھی بڑھ کر احمق اور ناداں ہو۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ جب حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لئے گدھی پر سوار تھیں تو گدھی نے کعبۃ اللہ کی طرف تین بار سجدہ کیا، اور کہا کہ میری پشت پر افضل الانبیاء سید المرسلین خیر الاولین والآخرین حبیب ربّ العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہیں؟ مواہب لدینہ میں اس روایت کو ایک طویل حدیث کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار ومشرک گدھے سے بھی زیادہ بیوقوف تھے۔ [مظہری]

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ﴿٣﴾

ترجمہ: بلاشبہ آپ کیلئے ایسا بڑا اجر ہے، جو کبھی ختم ہونیوالا نہیں ﴿٣﴾

معارف ومنازل

رنج والم اور طرح طرح کے دکھ برداشت کرنے اور احکام رسالت پہنچانے کا آپ ﷺ کے لیے نہایت بڑا غیر منقطع اجر ہے، اور یہ محض خداداد احسانِ الٰہی ہے، جب رہتی دنیا تک آپ ﷺ کا سلسلہ رشد وہدایت اکنافِ عالم میں جاری رہے گا، تو اس بے حساب اجر وثواب کو کیسے ختم کیا جا سکے گا؟

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۴

ترجمہ: اور یقیناً آپ بہت بڑے بلند اخلاق کے مالک ہیں ۴

معارف ومنازل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ خلق عظیم سے مراد دین عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام سے زیادہ کوئی پسندیدہ محبوب دین نہیں، قوله تعالیٰ: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔ قوله تعالیٰ: ﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة: ۳] (اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا)۔ قوله تعالیٰ: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ۸۵] (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا)۔ قوله تعالیٰ: ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [یس: ۴] (بیشک تم پیغمبروں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو)۔

﴿لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ بمعنی ﴿عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ایک ہی مقصد ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ ارشاد فرمایا: كان خلقه القرآن۔ [متفق عليه] آپ ﷺ کا خلق خود قرآن ہے، یعنی قرآن کریم جن اعلیٰ اعمال واخلاق کی تعلیم دیتا ہے آپ ﷺ ان سب کا عملی نمونہ ہیں۔

قرآن کریم کو اول سے آخر تک غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کرنے والا، پھر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا نہایت

غور سے مطالعہ کرنے والا یہی محسوس کرے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زندگی قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے، اور قرآن حکیم مکمل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مسعود میں ایسا جاری وساری محسوس ہوتا ہے جیسے گلاب کے پھول میں اس کا عطر وخوشبو جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے، اور یہی مطلب اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کے جواب کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خُلق عظیم سے مراد آدابُ القرآن ہیں۔ مطلب تینوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔ ربّ العزّت نے تمام آداب فاضلہ، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ اور صفاتِ کاملہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مسعود میں بدرجہ اعلیٰ واکمل جمع فرمادیئے تھے۔ ؎

لكلّ نبي في الأنام فضيلة ★ وجملتها مجموعة لمحمّد

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: بعثت لأتمم مكارم الأخلاق۔ [ترمذي] میری بعثت کا مقصد تکمیلِ اخلاقِ حسنہ اور تکمیلِ انسانیت وتزکیۂ نفوسِ بشریہ ہے۔ میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں کہ انسانیت کو کمالات کے معارج پر پہنچاؤں۔ ظاہر بات ہے جو اخلاق واعمالِ حسنہ کی معراج پر خود پہنچا ہوا ہو تو دوسروں کو معراج پر پہنچانے کا وہی سزاوار اور اہل ہوگا۔ ؎

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم ☆ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(شیخ سعدیؒ)

جہاں کے سارے کمالات ہیں تجھ میں ☆ تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

(حضرت نانوتویؒ)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محاسن، صفات، کمالات، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ اور فضائل وبرکات اتنے جامع، بے حساب اور بکثرت ہیں کہ جنہیں کوئی نہ گن سکتا ہے، نہ شمار اور نہ کوئی کسی کتاب وتحریر میں احاطہ وبیان کرسکتا ہے۔ بعض محققین عشاق علماء امت نے صرف اسی ایک مضمون میں پوری زندگیاں کھپا کر صرف کیں، مگر نہ سیر ہوئے، اور نہ احاطہ کرسکے۔ ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان ☆ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنان باقی

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق عظیم قرآن ٹھہرا تو اس بحر بیکراں کی تفسیر وتشریح اس مختصر ساٹھ ستر سالہ زندگی میں کون انجام دے سکتا ہے؟ خوش قسمت ہیں وہ علماء امت مرحومہ جنہوں نے اس مقصد کی خاطر زندگیاں وقف کی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال کا عرصہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گزارا، کبھی آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اف تک نہیں کہا۔ [بخاري ومسلم]

حضرت ام المؤمنین عائشہ زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پورے عرصۂ رفاقت میں کبھی ترشروئی، غصہ، مار پیٹ، یا کوئی اور نامناسب بات ہم نے نہ سنی اور نہ دیکھی۔ اعرابی اور جنگلی لوگ کچھ مال کی خاطر سختی سے پیش آتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب بخشش اور تبسم ہی ہوتا تھا۔ پاگل لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو مطالبہ کرتے تھے ان کے ساتھ گرد وغبار زمین پر بیٹھ کر حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ راستہ پر چلنے والے بوجھ رکھتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا سامان اٹھا کر ان کے کندھوں پر رکھتے تھے۔ ایک شخص نے اپنے اونٹ کی سرکشی کی شکایت کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ساتھ روانہ ہوئے اور اس کے اونٹ کو مہار ڈال کر اس کے ہاتھ میں دیدی۔ [مجمع الزوائد]

لوگ آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مال مانگتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ ہوتا تو انہیں دیدیتے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ نہ ہوتا تو فرماتے: جاؤ میرے نام پر کسی سے قرض لے لو، پھر میں ادا کروں گا۔ اگر کوئی صحابی وفات پاتے تو فرماتے اگر اس کا کچھ مال ہو تو اس کے وارثوں پر تقسیم کرو، اگر اس کے اوپر کوئی قرض ہے تو وہ میں ادا کروں گا۔

مسجد نبوی کی تعمیر پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کے ساتھ پتھر اٹھا کر لانا شروع کیا، ہر چند لوگوں نے آپ سے درخواست کی، مگر آپ مسلسل کام میں شریک رہے۔ غزوات کے موقعہ پر لشکر کا پڑاؤ ہوتا اور لوگ کام میں لگ جاتے، آپ بھی ان کے ساتھ خدمت میں شریک ہوتے۔ صدقہ کی بکریاں آپ کے پاس ہوتیں انہیں اپنے ہاتھوں سے پانی پلاتے اور گھاس ڈالتے۔

ایک موقعہ پر کچھ لوگ مہمان ہوئے، ان میں سے ایک شخص کو دست آیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمبل اس کے پاس تھا وہ ناپاک ہوا، تو آپ نے اپنے ہاتھوں سے اسے دھو کر صاف کیا۔ [مثنوی رومی]

یہ تمام واقعات اختصار کے ساتھ جو بیان ہوئے سیرت حلبیہ اور مشکوٰۃ میں ہیں۔

خُلقِ حسن کیا ہے جس کا نام خُلق عظیم ہے، تواضع، انکساری، خدمتِ خلق، عفو و درگزر، دوست و دشمن دونوں پر کرم، انتقام سے اجتناب اور نیکی و برائی دونوں کا بدلہ احسان و بخشش سے دینا۔

بہر حال! باتیں اتنی ہیں کہ جن کو نہ بیان کر سکتے ہیں اور نہ ہی تحریر میں لا سکتے ہیں۔ جس ذات اقدس کی مدح وثنا خود ربّ العزت عزّ شانہ جا بجا قرآن حکیم میں بڑے محبوبانہ انداز میں بیان کرے، ہم کیا ہیں کہ اس کے

کمالات کا احصاء وشمار کر سکیں۔ ایک محقق عالم نے فرمایا ہے کہ باقی تو چھوڑ و اگر میں صرف سورۃ التوبۃ کے ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ﴾[التوبۃ: ۴۳] (اللہ نے آپ سے درگزر فرمایا) پر کتاب لکھوں، تو شاید ہزار صفحات بھر جائیں۔ جب آپ کی سیرت قرآن پاک قرار پائی اور قرآن پاک آپ کی سیرت ٹھہرا تو کیا کوئی ان دونوں کا احاطہ کر سکتا ہے؟ ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم ☆ کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

مراتبِ اخلاق:

اخلاق کے تین درجے ہیں:

اول اخلاقِ حسنہ جس کی تعریف ہے: الوفاء بالعدل۔ یعنی حقوق کے اندر برابری اختیار کرنا، اپنا حق پورا لینا اور دوسروں کا حق پورا پورا دینا۔ بالفاظ دیگر پتھر کا جواب اسی طرح پتھر سے دینا اور تھپڑ کا جواب تھپڑ سے دینا، مکہ مارنے سے اجتناب کرنا، کیونکہ یہ زیادتی اور بد اخلاقی شمار ہوگی۔

دوم درجہ اخلاقِ کریمانہ، یعنی ایثار وقربانی۔ اس کا مطلب عفو ودرگزر اختیار کرنا، اور دوسرے کا حق پورا پورا دینا، اپنا حق چھوڑنا اور معاف کرنا۔ اگر کوئی برائی اختیار کرے، تو اسے معافی دینا اور انتقام سے اجتناب کرنا۔

سوم درجہ نہایت انتہائی قیمتی اور بہت بلند ہے، وہ یہ کہ نہ صرف انتقام نہ لینا اور نہ صرف یہ کہ معافی دینا اور درگزر کرنا، بلکہ الٹا بخشش واحسان کرنا، اور مخالف ہر چند دشمنی وایذا رسانی کرتا رہے، تم مسلسل اس کے ساتھ احسان و بخشش کا معاملہ اختیار کرو۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ اور شان عظیمہ یہی آخری صفت تھی، جسے سیدۃ عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے کان خلقه القرآن سے تعبیر فرمایا تھا۔

زیر نظر آیت کریمہ نے خُلقِ عظیم جیسی صفت واضح فرمائی، اور یہ اخلاق انسانی کی آخری حد ہے۔ عالمِ بشریت میں اس سے زیادہ با اخلاق ہونا ممکن ومتصور نہیں، اور اس سے اوپر کسی اخلاق کا ہونا ہی محال ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صل من قطعک واعف عمن ظلمک وأحسن إلی من أساء إلیک۔ یعنی جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے جوڑ لگاؤ، جو تم پر ظلم کرے تم معافی کی صورت اختیار کرو، اور جو تم سے برائی کرے تم اس پر بخشش واحسان کرو۔ تو پہلا درجہ انتقام کا ہے، دوسرا درجہ ایثار کا ہے اور تیسرا درجہ احسان کا ہے اور یہ بہت ہی اعلیٰ مرتبہ ہے۔

ابتداءِ نبوت سے لے کر وصال تک اتنے بے شمار مصائب وآلام اور ناگفتہ بہ وناقابل برداشت ظلم وستم کفار و

مشرکین، یہود ونصاریٰ اور منافقین ومعاندین نے آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم پر روا رکھا، جنہیں بڑے بڑے کوہ وجبال بھی شاید برداشت نہ کر سکے، سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے مصائب سے اکیلا اور تنہا آپ ﷺ کی تکالیف اور مصائب زیادہ معلوم ہوتے ہیں، مگر آپ ﷺ نے اپنی ذات کی خاطر کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، بلکہ مسلسل درگزر کرتے رہے اور بخشش ونوازشوں سے مخالفوں کو نوازتے رہے، جس کی بدولت آپ ﷺ کے پیغام نے مختصر عرصہ میں پورے چار دانگ عالم میں اربوں انسانوں کے لیے باعث رشد وہدایت بن کر قیامت تک برگشتہ لوگوں کو جہنم کے گڑھے سے نکال کر جنت کا راستہ ہموار کیا، اور صراط مستقیم پر ڈال دیا۔ سو کھربوں صلوٰۃ وسلام ہو آپ علیہ السلام پر اور آپ کے آل واصحاب پر۔ آمین

❁ ❁ ❁

فَسَتُبۡصِرُ وَيُبۡصِرُونَ ۝٥ بِأَييِّكُمُ الۡمَفۡتُونُ ۝٦

ترجمہ: عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ معاندین بھی دیکھ لیں گے ۝٥ تم میں کون مجنون ہے ۝٦

معارف ومنازل

﴿الۡمَفۡتُونُ﴾ بمعنی مجنون، یہ ایک پیشینگوئی اور سخت تہدید وتوبیخ ہے کہ چند وقت صبر وانتظار کرو۔ یہ بات اٹل اور پختہ ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، اس کا انجام آپ کے حق میں فائدہ مند ہوگا اور کفار کے حق میں بڑا خطرناک ثابت ہوگا۔ آپ کا مشن کامیابی کے ساتھ آگے بڑھے گا، آپ کا دین شرق وغرب، عرب وعجم میں پھیل جائے گا، اور سارا جہاں آپ کا حلقہ بگوش فرمانبردار ہوگا۔ آپ کا احترام ہر کس وناکس کے دل میں جاگزیں اور سارا جہاں آپ کی دانائی وعقلمندی کا معترف ہوگا، یہاں تک کہ غیر مسلم بھی آپ کی شخصیت پر مہر تصدیق ثبت کریں گے، اور یہ لوگ خود پاگل ومجنون مفتون کہلائیں گے، اور خوار وذلیل ہو جائیں گے۔

ہاں! اگر ان میں سے کچھ آپ کا بن جائیں تو ذلت سے بچ جائیں گے، پس مختصر وقت کے بعد ایسا ہی ہوا، جن کی داستان اور تاریخ قلم نے لکھ لیا جو کہ ابھی تک محفوظ ہے۔ یہی مطلب ہے قرآنی فرمودات کا کہ: ﴿وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِينَ﴾ [الأعراف: ١٢٨] (اور انجام وعاقبت کی کامیابی نیکوکاروں کی ہوگی)۔ ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡأَبۡتَرُ﴾ [الکوثر: ٣] (بیشک تمہارا دشمن ہی وہ ہے جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے) کا منظر سب کے سامنے ہے۔ پورے

جہاں نے دیکھا اور نظارہ کیا اور قیامت تک کرتا رہے گا۔

غریب، امیر حتی کہ بڑے بڑے حکمرانوں نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کو فخر ومباہات سے قبول کیا، اور آپ کی کفش برداری کو سلطنتوں پر ترجیح دے کر افضل وبہتر سمجھا۔ شیر شاہ سوریؒ اور شمس الدین التمشؒ جیسے حکمران بغیر طہارت آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے نام مبارک لینے سے گریز کرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید خان ترکیؒ نے ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ گستاخ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) مصنف کو اس کی کتاب سمیت استنبول حاضر کیا جائے یا اسلامی عثمانی فوج کے استقبال کا انتظار کریں، پھر ہوا یہ کہ گستاخ رسول کو کتاب سمیت استنبول لایا گیا اور کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔

اس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ انگلستان کے ایک صحافی نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں اپنی کتاب میں گستاخانہ کلمات لکھے اور تین براعظموں کے حکمران سلطان عبدالحمید خانؒ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا اور کہا کہ گستاخ کو بمع اپنی کتاب حاضر کرو، ورنہ اسلامی فوج کا انتظار کرو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ الحمدللہ

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

ترجمہ: بیشک آپ کا ربّ ہی اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گیا، اور وہی ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ یافتہ ہیں ۝

معارف ومنازل

ماقبل آیت میں بتایا کہ آپ اور وہ دیکھ لیں گے کہ مجنون کون ہے، اب عمومی حکم یہ ہے کہ عذاب دنیوی کی وقت یا مرنے کے بعد قیامت کے دن کا عذاب دیکھ کر یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ درحقیقت مجنون کون تھا، اور جنون میں کون مبتلاء تھا؟ قیامت کے دن جو نفع اور نعمتوں سے محروم رہے گا وہی مجنون قرار پائے گا اور عذاب میں مبتلا رہے گا۔ جس نے اپنی حماقت اور جنون وبے عقلی کی بدولت نعمت ایمان کو ضائع کیا اور مبتلائے عذاب ہوا، اس وقت اسے اپنے جنون کا اچھی طرح یقین ہو جائے گا، اور اپنے جرم کا اقرار بھی کرے گا۔ اور ساتھ اس کے پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے متبعین کو کامیابی اور جنتی نعمتوں میں جب پائے گا، تو اسے مزید حسرت وپریشانی دامن گیر رہے گی، اور وہ اس بارے میں دوبارہ اقرار کرے گا کہ یہ لوگ حق پر تھے میں باطل پر تھا، وہ عقلمند فرزانہ تھے، میں بے عقل اور مبتلاءِ جنون

رہا، اور وہ صحیح تھے ہم غلط اور گمراہ رہے، تیرے ربّ کو سب کچھ ابھی سے معلوم ہے، مگر ان دشمنانِ توحید کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔

بعض علماء اس طرح معنی کرتے ہیں کہ کفار کو ابھی بھی معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق، عقلمند اور فرزانہ ہیں، اور ہم لوگ مجنون، کودن اور بے عقل ہیں، مگر سرکشی اور ہٹ دھرمی سے حق کو تسلیم نہیں کرتے، وہاں ان کو اپنی حماقت آشکار ہو کر ظاہر ہو جائے گی، تو اپنے جنون کا اقرار کریں گے، جیسے فرمایا: ﴿قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰﴾ [الملک] (وہ کہیں گے: کیوں نہیں ضرور ہدایت کرنے والا آیا تھا، لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے تو کوئی چیز نازل ہی نہیں کی، تم تو بڑی غلطی میں (پڑے ہوئے) ہو، اور کہیں گے: اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے)۔ یہاں نَعْقِلُ میں عقل کی نفی ہے، وہی تو جنون ہے، کیونکہ مجنون عقل سے خالی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

مطلب یہ ہوا کہ تیرا ربّ گم کردہ راہ کو بھی جانتا ہے اور ہدایت پانے والوں کو بھی جانتا ہے، اور وہ ہر ایک کو اس کے کئے کی سزا اور جزا دے گا، اس وقت ان کافروں کو یہ بات کھل جائے گی کہ واقعی دیوانہ مجنون کون تھا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹

ترجمہ: آپ ان جھٹلانے والوں کی بات نہ مانیں ۝۸ وہ (مکذبین تو یوں) چاہتے ہیں کہ آپ (تبلیغ احکام میں) نرمی کریں (اور شرک وبت پرستی سے ان کو روکنا چھوڑ دیں) تو یہ بھی نرم پڑ جائیں ۝۹ (اور آپ پر طعن و تشنیع اور آپ کی مخالفت وایذا رسانی چھوڑ دیں)۔

معارف ومنازل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار وفجار کے ساتھ یہ سودا کر لینا کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے، تم ہمیں بھی کچھ نہ کہو، یہ مداہنت فی الدین اور حرام ہے۔ [مظهري] یعنی بلا کسی اضطرار اور وقتی مجبوری کے ایسا معاہدہ جائز نہیں، کیونکہ یہ کتمانِ حق کے زمرے میں آتا ہے۔ حق وہ حقیقت حقہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں اس کی مخالفت ہوتی رہتی ہے،

اور رہے گی، بطیب خاطر کبھی کسی نے اسے قبول نہیں کیا، اِلّا ماشاء اللہ۔ پس ہر موقعہ اس کا اظہار لازم ہے، اور کتمان و مصالحت جائز نہیں ہے، یہ حق کی نشانی اور علامت رہی ہے کہ ہر حال اس کی مخالفت ہوتی رہے گی۔ اس کی پوری تفصیل ''سورۃ الکٰفرون'' میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيۡنٍ ۙ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيۡمٍ ۙ﴿۱۱﴾ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ مُعۡتَدٍ
اَثِيۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾ عُتُلٍّۢ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِيۡمٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَنۡ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيۡنَ ؕ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ
اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جو بہت قسمیں کھانے والا اور ذلیل ہو ﴿۱۰﴾ طعنے دینے والا ہو اور چغل خوری کرتا پھرتا ہو ﴿۱۱﴾ نیک اور بھلے کاموں سے روکنے والا، حد سے بڑھ جانے والا ہو، مجرم گناہگار ہو ﴿۱۲﴾ سرکش، بدمزاج اور ان سب باتوں کے علاوہ بدنسب (حرامی) ہو ﴿۱۳﴾ اس سبب سے کہ وہ محض صاحب مال اور اولاد ہو ﴿۱۴﴾ جب اس کے روبرو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے: یہ اگلے لوگوں کی بے سروپا کہانیاں ہیں ﴿۱۵﴾ ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگادیں گے (یعنی اس کی سونڈھ پر داغ لگا کر اسے رسوا کریں گے) ﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

یعنی اول تو ہر مکذّب (عموم کے ساتھ) اس قابل نہیں کہ اس کی بات قابلِ التفات ہو، یا اس کی بات مان لی جائے، اور خاص طور پر ان مکذّبین میں سے اگر کوئی ان صفاتِ ذمیمہ کے ساتھ متصف ہو جن کا اوپر ذکر ہوا، تو ایسے شخص کا خاص طور پر خیال رکھا جائے، اور اس کی بات ماننے سے اجتناب کیا جائے۔ وہ خاص شخص ولید بن مغیرہ مخزومی ہے۔ یہ شخص مکہ میں بڑا مالدار تھا، اور اس کے لاکھوں اشرفیوں کا کاروبار چلتا تھا، یہ یمن وشام کے قافلوں (تجارتی قافلوں) کے اعتبار سے تمام تاجروں کا سرغنہ تھا، اور دس قابل جوان بیٹوں کا باپ تھا۔

کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد اور حرامی ہونے کی وجہ سے بڑا خبیث، مغرور اور رسوائے زمانہ انسان تھا، جس کی دس صفاتِ ذمیمہ کا اوپر بیان ہوا۔ یہ صفاتِ ذمیمہ جو اس میں تھیں کسی انسان کی بتائی ہوئی نہیں تھیں، یہ ربّ العزت عزّ مجدہٗ کی بیان کردہ ہیں۔ مکہ میں سب سے پہلے خواجہ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرنے والا اور

معاذ اللہ آپ کو مجنون کہنے والا یہی بدنصیب ''ولید بن مغیرہ'' تھا۔

اللہ پاک نے اس خبیث کی جتنی مذمت کی ہے کہ شخصی طور کسی اور مشرک کی اتنی شدت سے مذمت نہیں کی ہے۔ جس طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک دفعہ درود شریف پڑھنے پر اللہ تعالیٰ شانہ دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں، اسی طرح مذمت کنندہ ولید بن مغیرہ کی دس برائیاں بیان کیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور فیضانِ رحمت کا اندازہ لگایئے! اسی معتوب ومعیوب ولید بن مغیرہ کے دس بیٹوں میں سے چار نامور، صاحب عزم وہمت بیٹے دائرۂ اسلام میں داخل ہوکر پوری جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سرور وخوشی کا باعث بنے، وہ ہیں: سیدنا خالد سیف اللہ، سیدنا عمارۃ، سیدنا ہشام اور ولید بن ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہم، یہی تاویل ہے آیت کریمہ: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ [الأنعام:۹۵] (زندہ کو مردہ سے نکال دیتا ہے) کا یہ چاروں جلیل القدر صحابی ہیں، جن میں سے پہلا حضرت خالد سیف اللہ رضی اللہ عنہ وہ عظیم فاتح شہسوار اور جرنیل ہیں کہ ان پر پوری تاریخ اسلامی بجا طور پر فخر کرتی ہے، جن کے جہادی کارنامے اتنے بکثرت ہیں کہ شاید وباید۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی میں وفات پاگئے، کنیت ہے: ابوسلیمان، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیا ہوا لقب ہے: ''سیف اللہ'' رضي اللہ عنہ وعن جمیع الصحابۃ۔

سابق الفاظ کے معنی وتشریح:

﴿حَلَّافٍ﴾ کثرت کے ساتھ بلاوجہ قسمیں کھانے والا۔

﴿مَهِينٍ﴾ باوجود مالداری کے اپنی قوم میں ذلیل وخوار۔

﴿هَمَّازٍ﴾ بہت طعنہ دینے والا۔

﴿مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ﴾ بہت فساد وچغلخوری کرنے والا۔

﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ﴾ یعنی نیکی کا بڑا دشمن، اور بھلائی سے بہت روکنے والا۔

﴿مُعْتَدٍ﴾ حد سے بڑھ کر برائی کرنے والا۔

﴿أَثِيمٍ﴾ یعنی بڑا مجرم، گناہگار۔

﴿عُتُلٍّ﴾ سرکش، مغرور، شریر۔

﴿زَنِيمٍ﴾ بدنسل وبدنسب، بے پدر، حرامزادہ (واقعی)۔ اس کے غرور اور سرکشی کا سبب یہ تھا:

﴿اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیۡنَ﴾ کثرت مال واولاد کی وجہ سے مغرور تھا۔

﴿اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾ کچھ ایرانی بادشاہوں (بہمن، اسفندیار) کے قصوں پر قرآن حکیم کی نسبت کرتا تھا۔ ﴿سَنَسِمُہٗ﴾ عنقریب داغ لگائیں گے۔ ﴿عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ﴾ اس کی سونڈھ پر۔ خرطوم ہاتھی اور خنزیر کی سونڈھ کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ بلیغ ہے، اسے ہاتھی اور خنزیر کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ جنگ بدر میں ایک انصاری صحابی نے اس کی ناک پر نیزہ مارا اور وہ بھاگ کر بچ نکلا، ناک کا زخم بڑا خطرناک ثابت ہوا، ہر چند علاج کیا ٹھیک نہیں ہوا، آخر کار ناک سڑ گئی اور کینسر ہو گیا، بدبودار ناک کے ساتھ کسی محفل میں بیٹھ نہیں سکتا تھا، اور بدبو کی وجہ سے اپنے پرائے سب اس سے نفرت کرنے لگے، خود کہتا تھا کہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا لگ گئی، پھر ذلت کی موت مرا۔

﴿کَذٰلِکَ الۡعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ [القلم:۳۳] (اور اللہ نے انہیں دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا، اور بیشک آخرت کا عذاب سب سے بڑا ہے، کیا اچھا تھا اگر وہ جانتے)۔ یہ ہوا دنیا کا ادنیٰ اور خفیف ترین عذاب، جبکہ آخرت کا عذاب بہت بڑا دردناک تباہ کن ہوگا، کاش! یہ لوگ جان لیتے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کفار مکہ جب اللہ پاک اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کثرت و فراوانی کے ساتھ انہیں کیوں مال سے نوازا؟ اسی مال کے بل بوتے پر تو یہ مغرور اور حق کے دشمن بنے، اور وہ یہ مسلسل کہتے رہتے کہ یہ مال اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے تو دیا ہے کہ وہ ہم سے راضی اور ہمارے اوپر مہربان ہے، اور مال ہمارے پاس ہر وقت رہے گا۔ وہ مسلمانوں کے فقر و مسکنت کو خداوند تعالیٰ سے دوری کا سبب سمجھتے تھے۔ اگلی آیتوں میں ان کے زعمِ فاسد کا جواب ہے کہ مال رضاء الٰہی کا سبب نہیں، اور فقر سبب ناراضگی نہیں، بلکہ یہ مال جو تمہیں حاصل ہے اس میں تمہاری آزمائش و ابتلاء کا راز مضمر ہے، اگر ربّ العزّت بطور امتحان کسی کو مال دے سکتا ہے تو اس سے ناشکری اور احسان فراموشی کی صورت میں وہ نعمت و مال چھین کر سلب بھی کر سکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر اور سمجھانے کی خاطر باغ والوں کے باغ کا قصہ بیان فرما کر انہیں تنبیہ کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے:

اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّہَا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَیۡہَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّکَ وَہُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ ﴿۲۰﴾

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿٢١﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ
يَتَخَافَتُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿٢٤﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿٢٥﴾
فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿٣١﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى
رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿٣٢﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾

ترجمہ: ہم نے مکہ والوں کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جیسے ایک باغ والوں کو اس وقت آزمائش میں ڈالا تھا جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ صبح ہوتے ہی ہم اس باغ کا پھل توڑ لیں گے ﴿۱۷﴾ اور یہ کہتے ہوئے وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے ﴿۱۸﴾ پھر ہوا یہ کہ جس وقت وہ سو رہے تھے اس وقت تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھیرا لگا گئی ﴿۱۹﴾ جس سے وہ باغ صبح کو کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا ﴿۲۰﴾ پھر صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو آواز دی ﴿۲۱﴾ کہ اگر پھل توڑنے ہے تو اپنے کھیت کی طرف سویرے چل نکلو ﴿۲۲﴾ چنانچہ وہ ایک دوسرے سے چپکے چپکے یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے ﴿۲۳﴾ کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس اس باغ میں نہ آنے پائے ﴿۲۴﴾ اور وہ بڑے زوروں میں تیز تیز چلتے ہوئے نکلے ﴿۲۵﴾ پھر جب اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم ضرور راستہ بھٹک گئے ہیں ﴿۲۶﴾ پھر کچھ دیر کے بعد کہا کہ نہیں بلکہ ہم سب لٹ گئے ہیں ﴿۲۷﴾ ان میں جو شخص سب سے اچھا تھا وہ کہنے لگا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ ﴿۲۸﴾ کہنے لگے: ہم اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے ہیں، یقیناً ہم ظالم تھے ﴿۲۹﴾ پھر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے ﴿۳۰﴾ پھر سب نے متفق ہو کر کہا کہ افسوس ہے ہم سب پر، یقیناً ہم سب نے سرکشی اختیار کر لی تھی ﴿۳۱﴾ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس باغ کے بدلے اس سے اچھا عطا فرما دے۔ بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں ﴿۳۲﴾ عذاب ایسا ہی ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب یقیناً سب سے بڑا ہوتا ہے، کاش یہ لوگ جانتے ﴿۳۳﴾

معارف ومنازل

ان باغ والوں کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ایک نیک شخص کا بہت بڑا باغ تھا، اس شخص کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے

باغ اور کھیت کی پیداوار کا ایک اچھا خاصا حصہ مسکینوں کو دیا کرتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں نے فیصلہ کیا کہ ہمارا باپ بیوقوف تھا، جو اتنی ساری پیداوار مفت غریبوں کو دے کر اپنا نقصان اور مال میں کمی کر دیتا تھا، اب جو ہم پھل کی کٹائی کریں گے تو ایسا انتظام کریں گے کہ کوئی مسکین وہاں آنے ہی نہ پائے، بغیر اطلاع صبح ہوتے ہی سارا کام مکمل کریں گے۔ جب وہ اپنے اس فاسد ارادے کے ساتھ سویرے کٹائی کے لئے پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے باغ پر ان کے آنے سے کچھ دیر پہلے ایک ایسی آفت بھیج دی کہ سارا باغ جل کر تباہ ہو گیا۔

روایتوں کے مطابق یہ واقعہ یمن کے شہر صنعاء سے کچھ فاصلے پر ''ضروان'' نامی ایک علاقے میں پیش آیا تھا، ابھی بھی یہ علاقہ ضروان کہلاتا ہے، اب بھی اس باغ کے کچھ اثرات اور نشانات باقی ہیں، وہاں چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزے کے درمیان ایک کالے کالے پتھروں والا ویران علاقہ ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہی اس باغ کی جگہ تھی جو جل کر تباہ کر دیا گیا جو بعد میں بہ سببِ عذاب دوبارہ آباد نہ ہو سکی۔

فائدہ:

ربّ العزّت عزّ سبحانہ کی پکڑ بہت سخت ہے۔ تاریخی واقعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ امتوں کی معمولی بداعمالیوں پر بھی پکڑ جلد سے جلد لمحوں میں ہوتی تھی، اب اس امت کی بڑی سے بڑی لغزشوں اور بھاری سے بھاری بداعمالیوں پر پکڑ نہیں ہوتی، یہ سب سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعاؤں کی برکت ہے۔ ہمارے زمانے کے معاصی اور اعمالِ بد کچھ اس قسم کے ہیں جنہیں دیکھ کر قرآن وسنت کے قاری کا خون خشک ہو جاتا ہے، اور عقلمند لوگ پاگل ہو جاتے ہیں، مگر ربّ العزّت عزّ شانہ کا غیظ وغضب جوش میں نہیں آتا، رحم وکرم اور بردباری کا منظر ہر جگہ موجزن رہتا ہے۔

﴿وَلَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ﴾ ایک آسان ترجمہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ارادے کی تکمیل پر ان شاء اللہ نہیں کہا تھا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ سارا پھل ہم خود لیں گے، اس کے کسی حصے کا استثنا نہیں کریں گے، یعنی مسکینوں کے لئے نہیں چھوڑیں گے۔

﴿حَرۡدٍ﴾ کا مطلب منع کرنا، روکنا، بخل کرنا، تو وہ یہ سوچ کر گھر سے روانہ ہوئے کہ وہ غریبوں کو منع کرنے پر قادر ہو جائیں گے، یعنی کچھ نہ دینے پر قدرت رکھتے ہیں، تینوں بھائیوں میں سے ایک درمیانے بھائی نے پہلے اچھا مشورہ دیا تھا کہ ایسا کرنا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا، بعد میں بامرِ مجبوری وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا، وہاں پہنچ

گروہ حیران رہ گئے اور کہنے لگے: ہم بھٹک گئے ہیں، پھر سمجھ گئے کہ نہیں باغ ہی اجڑ گیا ہے، تب ایک دوسرے کو ملامت کرنا شروع کیا، اور اس نیک بھائی نے اپنے مشورے کی انہیں یاد دہانی کرادی، پھر استغفار، الحاح وزاری شروع کی، اور اللہ پاک کی رحمتوں کا سہارا لیا، پس أنا عند ظن عبدي بي جو وعدۂ خداوندی مسلم ہے اس وقت کے بادشاہ کو اس واقعہ کا علم ہوگیا، وہ نیک بخت حکمران تھا، اسے رحم آیا اس نے اپنے ذاتی باغوں میں سے ایک بہتر عمدہ باغ انہیں دیدیا۔

دراصل گناہ سرزد ہونے کے بعد جب گناہگار صدقِ دل سے توبہ کرے گا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے گا تو محض یہ نہ ہوگا کہ معافی مل جائے گی، بلکہ ربّ العزت اس نقصان کی بھی تلافی فرمائے گا، اور بہتر عوض عطا فرمائے گا۔

سابق آیت میں مجرموں کے لئے وعید کا بیان تھا، آنے والی آیتوں میں مؤمنین کے لیے جنت کی بشارت ہے، مشرکوں نے کہا تھا کہ بالفرض اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دوبارہ زندہ کیا تب بھی وہ ہمیں وہاں جنت کی نعمتیں دے گا، ان آیتوں میں اس بے بنیاد خیال کی تردید ہے، اور اہل ایمان کے لیے بشارت ہے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: بیشک پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کی نعمتوں سے بھرے باغات ہیں ﴿۳۴﴾ کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے ساتھ برابر کریں گے؟ ﴿۳۵﴾ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ ﴿۳۶﴾ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں تم یہ پڑھتے ہو؟ ﴿۳۷﴾ کہ تمہیں وہاں وہی کچھ ملے گا جو تم پسند کروگے ﴿۳۸﴾ یا تم نے ہم سے قیامت تک باقی رہنے والی قسمیں لے رکھی ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جو تم طے کروگے ﴿۳۹﴾ اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون ہے جس نے اس بات کی ضمانت لے رکھی ہو ﴿۴۰﴾ کیا خدائی میں ان کے مانے ہوئے کچھ شریک

ہیں؟ (جو یہ ضمانت لیتے ہوں) تو پھر لے آئیں اپنے ان شریکوں کو اگر وہ سچے ہیں ﴿۴۱﴾

معارف ومنازل

پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت اور محبوبیت کی نشانی ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں، نہ کہ مال و دولت۔ اکثر و بیشتر انبیاء کرام علیہم السلام اور صالحین دنیا میں کیسے رہے؟ کیا ان کے پاس مال و دولت یا خزانوں کی فراوانی تھی؟ تو معلوم ہوا کہ مال و دولت مقبولیت اور محبوبیت کی نشانی نہیں، بلکہ محض ابتلاء اور آزمائش ہے۔

اسی خاطر باغ والوں کی مثال بیان کر کے مکہ کے کفار کو تنبیہ کیا کہ مال و دولت پر مغرور ہو کر کہیں تمہارا حشر بھی وہی باغ والوں کی طرح نہ ہو، پھر تمہارا یہ خیالِ باطل کہ اگلے جہاں میں تمہیں نوازا جائے گا اور وہاں بھی دنیا کی طرح تم عیش اور رفاہیت میں رہو گے، یہ محض تمہاری خوش فہمی اور بچگانہ فیصلہ ہے، بلکہ تمہاری حماقت اور جنون کے سوا کچھ بھی نہیں، آخرت کی کامیابی اور ناز و تنعّم صرف مؤمنین متقین کے لیے ہے، تم نے دنیا کے باغ کا حال سنا کہ تقویٰ کے نہ ہونے سے تباہ و برباد ہوا۔

اب آخرت کا باغ ان لوگوں کے لیے ہے جن میں تقویٰ کی صفت موجود ہے، غیر متقی دنیا کے فانی باغ کا جب حقدار نہیں رہے تو آخرت کے باقی اور دائمی باغ کے کیسے حقدار رہیں گے؟ تم بڑے پاگل ہو جو خود کو متقیوں کے برابر سمجھتے ہو، یا بزعمِ باطل اپنے لئے آخرت کی کامیابی کا دعویٰ کرتے ہو۔ ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ﴾ [ص:۲۸] (کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان جیسا کر دیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں؟ یا ہم پرہیزگاروں کو شریر بے حکموں کے برابر ٹھہرا دیں؟)۔

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ﴾ [الطور:۱۷] (بیشک پرہیزگار باغوں اور چین میں ہیں)۔

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ﴾ [الذاریات:۱۵] (بیشک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہیں)۔

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا ۙ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ [النبأ:۳۲] (بیشک ڈر والوں کو کامیابی کی جگہ ہے باغ ہیں)۔

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ﴾ [المرسلات:۴۱] (بیشک ڈر والے سایوں اور چشموں میں

ہیں)۔ وغیر ذٰلک من الآیات۔ ان سب آیتوں کا ایک ہی معنی ومطلب ہے، وہ یہ کہ آخرت کی نعمتیں ہر طرح کی راحتیں اعلیٰ سے اعلیٰ باغات، قسم قسم کے ابدی انعامات، مختلف انواع کے پھل اور فواکہ ومیوے صرف متقین مؤمنین پرہیزگاروں کے لیے ہیں۔ متقی کون لوگ ہیں؟ سورۃ البقرۃ کے شروع میں ہے: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ: ۲] (قرآن کریم متقین کے لیے ہدایت ہے)۔ آگے متقین کے اوصاف کا بیان ہے:

پہلی صفت: ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرۃ: ۳] (وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)۔

دوم صفت: ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾ [البقرۃ: ۳] (متقی وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں)۔

تیسری صفت: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ [البقرۃ: ۳] (متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق وروزی میں سے خرچ کرتے ہیں، اور صدقات وزکوٰۃ دیتے ہیں)۔

متقی کی چوتھی صفت: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ [البقرۃ: ۴] (متقی وہ لوگ ہیں جو قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں)۔

پانچویں صفت: ﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرۃ: ۴] (متقی وہ لوگ ہیں جو تمام سابقہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لاتے ہیں) ایمان بالکتب میں ایمان بالرسالۃ وبجمیع الرسل علیہم السلام ضمناً آ گیا۔

چھٹی صفت: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ (متقی وہ لوگ ہیں جو قیامت پر ایمان لاتے ہیں) اس کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے: الّذین یتقون الشرک والکفر والمعاصي۔ (متقی وہ لوگ ہیں جو شرک کفر اور معاصی سے بچتے اور پرہیز کرتے ہیں)۔ آیت کا پہلا مطلب اثبات کا تھا، اور یہ حدیث کا دوسرا مطلب نفی کا ہے۔ اب ان دونوں معانی کے ملانے سے متقی کا معنی واضح ہوگیا، اور مؤمنین کے لئے لازم ہوا کہ شرک، کفر اور معاصی سے بالکلیہ پرہیز کریں، کیونکہ ایمان اپنی اضداد شرک وکفر اور معاصی کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہوسکتا، اور شرک وکفر کے ہوتے ہوئے آدمی مؤمن نہیں رہ سکتا، اور جو لوگ کسی طرح شرک وکفر میں ملوث یا مبتلا رہتے ہیں، وہ ہرگز مؤمن نہیں رہیں گے، جس طرح پانی آگ کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اسی طرح ایمان اور شرک ایک وجود میں جمع نہیں ہوسکتے۔ قبر پرستی اور اللہ تعالیٰ کے مخصوص صفات میں کسی بندے کو شریک کرنے سے جو نقصان پیدا ہوتا ہے اسی کا نام تو شرک ہے، اور نذر لغیر اللہ، قبروں پر چڑھاوا اور جانور قربانی کرنا صریح شرک ہے، اور ایسا کرنے والے مشرک ہیں، خوب سمجھنا چاہیے۔ قرآن کریم نے مؤمن متقیوں کے دوسرے مقام پر نو (۹) صفات ذکر کی ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱)﴿اَلتَّائِبُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] توبہ کرنے والے۔

(۲)﴿اَلْعَابِدُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] عبادت گزار۔

(۳)﴿اَلْحَامِدُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے والے۔

(۴)﴿اَلسَّائِحُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] دنیا سے لاتعلق رہنے والے۔

(۵)﴿اَلرَّاكِعُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] رکوع کرنے والے۔

(٦)﴿اَلسَّاجِدُوْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] سجدہ کرنے والے۔

(۷)﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] امر بالمعروف کرنے والے۔

(۸)﴿وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] نہی عن المنکر کرنے والے۔

(۹)﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] حفاظت کرنے والے حدود اللہ کی۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۲] آپ مؤمنین کو بشارت سنائیے۔

ان صفاتِ حسنہ میں آخری صفت جو بیان ہوئی: ﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ یہ بہت بڑی جامع صفت ہے، اور تمام حدود شرعیہ کے لیے جامع ہے، کیونکہ ایمان نام ہے: اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ تمام حدود واحکام کی حفاظت کا، اور تمام امورِ شرعیہ کے بجالانے کا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۲۹] (یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود (احکامِ شریعت) ہیں، پس ان سے تجاوز (حکمِ عدولی) نہ کرو، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی لوگ ظالم ہیں)۔

اگر تعدّی فی العقیدہ ہو تو ظلم سے شرک مراد ہوگا، اور اگر تعدّی فی الاحکام ہو تو ظلم سے معصیت مراد ہوگی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت کی جو حدود مقرر کی ہیں ان کی حفاظت کا نام تقویٰ ہے۔

بڑے صدمے کی بات ہے کہ حدود اللہ کو توڑنے والے سب سے زیادہ مسلمان لوگ ہیں۔ آج ہمارے عقائد، طاعات، عبادات اور معاملات تمام کے تمام جادۂ شریعت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ آج کا مسلمان امورِ معاملات میں مغرب سے بہت پیچھے ہے۔ اسی طرح عقائد کا معاملہ ہے جو کہ قابلِ رحم ہے۔ عیسائیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ مت کے لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، اور کئی امور میں ہمارے اوپر خندہ زن ہیں۔ ہمارے بہت سارے محاسن دشمنوں نے اپنائے ہیں، اور اپنے بہت سے عیوب وقبائح ہمارے حوالے کیے ہیں، جنہیں ہم سینے کے ساتھ لگا کر

شاداں وفرحاں ہیں۔

آپ کو پورے مغرب میں اشیاء غذائیہ میں ملاوٹ اور فراڈ شرطیہ طور پر نظر نہیں آئے گا، جبکہ ہمارے برصغیر کے مسلمانوں کی تیار کردہ اشیاء میں غیر ملاوٹ والی ایک چیز بھی نظر نہیں آئے گی، اسی طرح دیگر امور میں۔ آج تقویٰ صرف ایک چیز کا نام ہمارے اندر زندہ ہے (باقی اللہ حافظ)۔ کوئی شخص عالم دین سے یہ نہیں پوچھتا کہ مجھے حلال و حرام، جائز و ناجائز یا فرائض واجبات، سنن اور آداب کی فہرست بتاؤ، کونسی تجارت کی کمائی بہتر ہے، اور کونسی ناجائز وغیرہ وغیرہ۔ البتہ یہ روزمرہ پوچھتے ہیں کہ حضرت ٹینکی یعنی پانی کی ٹینکی میں چوہا گر گیا ہے اس کو کیسے صاف کیا جائے؟ بس یہ چوہے والا تقویٰ ماشاءاللہ زندہ ہے۔ ہزاروں چوہے جو ہمارے دانشوروں کے پیٹ میں گھوم رہے ہیں ان کی کوئی پروا نہیں۔ إنا للہ وإنا إليه راجعون۔

اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بغیر تقویٰ کے کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی شرف قبولیت نہیں پائے گا۔ غیر متقی انسان کا ہر عمل بے کار ہوگا، جبکہ متقی انسان کا ہر عمل اگرچہ معمولی ہو شرف قبولیت حاصل کرے گا۔ سرور دو جہان ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (متقیوں کی جماعت) کے متعلق ارشاد فرمایا کہ بعد والے لوگ اگر پہاڑ جتنا خالص سونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، مگر وہ پہاڑ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک نصف صاع (پونے دوسیر) گندم کے ثواب کے ساتھ برابر نہیں ہوگا۔ [ترمذي]

اے حضرت انسان! اے اولاد آدم! (علیہ السلام) اور اے مؤمن! امتِ محمد ﷺ کچھ تو اپنے اعمال کا محاسبہ کرو۔ جنت النعیم کی مناسبت سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنت کے ناموں اور درجات بیان ہوں، جنتوں کے آٹھ درجات ہیں، اور با قاعدہ یہی ان کے نام بھی ہیں، کیونکہ اعمال واخلاص کے اعتبار سے سب جنتی برابر نہیں۔

① دار السلام۔ ② دار القرار۔ ③ دار المقامة۔ ④ دار الخلد۔ ⑤ جنت عدن۔ ⑥ جنة الماوى۔ ⑦ جنة النعيم۔ ⑧ جنة الفردوس ہیں۔

ہشتم جنت الفردوس أوسط الجنة وأعلى الجنة فوقها عرش الرحمٰن تبارک وتعالیٰ شانہ۔ اگر کسی کتاب میں ان کے علاوہ کوئی نام ہو تو وہ انہی جنتوں میں سے کسی ایک کا دوسرا نام ہوگا۔ [البدور السافرة]

﴿أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ﴾ صرف آنکھوں کے اندھے ہونے سے انسان کبھی ناکارہ اور بے عقل نہیں ہوتا، ہزاروں نابینا دانا، عقلمند، ذہین، عالم، حافظِ قرآن اور ماہر وکیل دنیا میں گزرے ہیں، اور ہزاروں

موجود ہیں، علامہ شاطبیؒ ضریر نابینا تھے، فن قرأت کے وہ مشہور امام گزرے ہیں جو پورے جہاں میں اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بڑے پایہ کے امام تھے۔

ہاں! مگر عقل کا اندھا ہر زمانہ میں نِا کارہ، کودن اور غبی ہوتا ہے، کفار ومشرکین عقل کے اندھے جیسی صفات ذمیمہ کے حامل ہوتے ہیں جو کہ عقل ونقل دونوں کے خلاف غلط اعتقاد رکھ کر خوش فہمیوں کا شکار رہتے ہیں کہ ہمارا مستقبل قیامت میں بھی درخشان رہے گا، کیونکہ ہم دنیا میں مالدار ہیں، باعزّت اور خوشحال ہیں۔ اس طرح باتیں کرنے سے اور اعتقاد رکھنے سے شاید گدھا بھی شرم محسوس کرے، مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نافرمان فرمانبرداروں کے ساتھ برابر ہو، اور مجرم ڈاکو عزّت مند شریف لوگوں کا ہم پلہ ہو۔ جب دار العمل دنیا میں ایسا نہیں ہوسکتا، تو روزِ جزا وسزا میں یہ کیسے ممکن ہوگا؟ یہ عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔

جس نے ریاضت ومحنت کی وہ اپنے عمل کا پھل ضرور پائے گا، اور جس نے بغاوت کی اسے اپنے کئے کی سزا ضرور بھگتنا پڑے گی۔ مسلمان جنات النعیم کے مستحق ہوں گے، اور کفار جہنم کے قید خانے میں ذلیل وخوار ہوں گے۔ یہی عقل ونقل کا منصفانہ اور عادلانہ فیصلہ ہوگا، تم کیسے فیصلہ کرسکتے ہو؟ فیصلہ قاضی کا ہوگا، نہ کہ مجرم اور چور کا۔

﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ﴾ (کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس کو تم پڑھتے پڑھاتے ہو؟ جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ تم جو پسند کرو یا جو خیال کرو وہی کچھ ہوگا)۔ ہرگز ایسا نہیں، پھر تو تم اپنے خیال سے کیسے بلا سند وثبوت یہ کہتے رہتے ہو؟ تمہاری یہ کشتی ریت پر نہیں چل سکتی، اور تمہارا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی ☆ کاین رہ کہ تو میروی بترکستان ست

یہی تمہارا حال ہے، سوار ہو تم جہنم کی کشتی میں اور پہونچنے کا خواب دیکھتے ہو جنت میں، یہ کیسے ہوگا؟

ع این خیال ست ومحال ست وجنون

تمہاری مثال اس احمق جاہل کی ہے جس کو خواب میں اپنی بادشاہت نظر آئی، دوسرے دن اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کتبہ چسپاں کیا کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، چاہئے کہ عوام میری تاج پوشی کریں، پس گرفتار ہوا، جیل پہنچا اور کہنے لگا: خواب تو بڑا اچھا تھا، مگر انجام ونتیجہ خراب نکلا۔ کفار وملحدین دنیا میں اسی طرح کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، مگر عاقبت وانجام ان کا جہنم ہی ہے، وہاں پہنچ کر ہی انہیں اپنے خام خیالی کا اندازہ ہوگا۔

﴿اَمۡ لَكُمۡ اَيۡمَانٌ عَلَيۡنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمۡ لَمَا تَحۡكُمُوۡنَ﴾ (کیا ہمارے ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں؟ جو تمہارے لئے کھائی گئی ہوں، اور وہ قسمیں تمہارے لئے قیامت تک باقی رہنے والی ہوں جن کا یہ مضمون ہو کہ تم کو وہ چیز ملے گی جو تم فیصلہ کر رہے ہو) یعنی ثواب اور جنت۔ ان سے پوچھئے، ان میں اس کا کوئی ذمہ دار ہے؟ ان کے مقرر کئے ہوئے کچھ شریک (جنہیں وہ اللہ پاک کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہیں) کہ انہوں نے ان کو اجر و ثواب دینے کا ذمہ لیا ہے، اگر یہ سچے ہیں تو انہیں چاہئے کہ اپنے ان شریکوں (معبودانِ باطلہ) کو پیش کریں۔ جب یہ بات کسی آسمانی کتاب میں نہیں اور ہماری طرف سے ان کے ساتھ وعدہ بھی نہیں (جو مثل قسم کے پختہ ہوتا ہے) پھر ایسی حالت میں کون شخص ان میں سے یا ان کے شرکاء میں سے ذمہ داری کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، نتیجہ یہی ثابت ہوا کہ یہ سب کچھ بلا ثبوت و بلا دلیل ہے، اور خلاف عقل و فطرت بھی ہے، پھر دعویٰ کس بنا پر ہے؟ جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: وہ دن قابل ذکر ہے جس دن پنڈلی کو نمایاں کیا جائے گا (یعنی ایک قسم کی خاص تجلی) اور لوگوں کو سجدے کے لئے بلایا جائے گا، پھر کافر سجدہ نہ کر سکیں گے ﴿۴۲﴾ ان کی آنکھیں نیچی ہو رہی ہوں گی، اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اس رسوائی کا سبب یہ ہے کہ ان کو دنیا میں سجدے کے لئے بلایا جاتا تھا، حالانکہ اس وقت وہ تندرست توانا تھے ﴿۴۳﴾

معارف ومنازل

کشف ساق کیا ہے؟

اس کا واقعہ حدیث شیخین میں مرفوعاً اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ میدانِ قیامت میں اپنی ساق ظاہر فرمائے گا۔ ساق پنڈلی کو کہتے ہیں، اور یہ کوئی خاص صفت یا حقیقت ہے، صفات وحقائقِ الٰہیہ میں سے جس کو کسی خاص مناسبت سے ساق فرمایا، جیسے قرآن کریم میں ید، وجہ، یعنی ہاتھ، چہرہ یا سمع وبصر وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں، یہ سارے

متشابہات کہلاتے ہیں، ان پر اسی طرح بلا کیف ایمان لانا چاہئے، ان کی تحقیق ممنوع اور عقل وفہم سے بالاتر ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے، اسی طرح اللہ پاک کی ذات، وجود اور حیات وغیرہ صفات پر بلا کیفیت ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اسی حدیث میں ہے کہ اس تجلّی کو دیکھ کر تمام مؤمنین ومؤمنات غیر اختیاری سجدے میں گر پڑیں گے، مگر جو شخص ریا سے سجدہ کرتا تھا، یا نفاق سے تو اس کی کمر نہیں مڑے گی، اس کی کمر لکڑی کے تختہ کی طرح سخت ہو کر رہ جائے گی، اور وہ لوگ سجدہ کرنا چاہیں گے مگر قادر نہ ہوں گے۔ جب یہ ریاکار اور منافق سجدہ پر قادر نہ ہوں گے تو کفار بطریق اولیٰ سجدے پر قادر نہ ہوں گے۔ یہ سب کچھ محشر میں اس لئے کیا جائے گی کہ مؤمن وکافر اور مخلص ومنافق صاف طور پر کھل جائیں، اور معلوم ہو جائیں، اور ہر ایک کی اندرونی حالت حسی طور پر مشاہد ہو جائے۔ [تفسیر عثمانی]

تنبیہ:

﴿يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ﴾ کہ نیک وبد اہلِ ایمان سب کو سجدہ کی دعوت دی جائے گی، لیکن یہ سجدہ تکلیفی نہ ہوگا، کیونکہ آخرت دار التکلیف نہیں، بلکہ طبعی اور معارفی دعوت ہوگی۔ جب عظمت وجلال کے پردے اٹھ جائیں گے اور موانع دور ہو جائیں گے تو اس عظیم تجلّی کا تقاضا ہے کہ واجب الوجود کے سامنے سب کے سب سربسجود ہوں۔ ہاں! ریاکار، منافق، بے نماز اور دیگر غیر مخلص اس سجدے کی سعادت سے محروم رہیں گے، جھکی پڑی ہوں گی ان کی آنکھیں، اور چڑھی آتی ہوگی ان پر ذلّت۔ جب دنیا میں ان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا، جس وقت وہ اچھے خاصے سلامت وتندرست تھے، اور با اختیار سجدہ کر بھی سکتے تھے، وہاں کبھی اخلاص اور شوق سے سجدہ نہ کیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ استعداد ہی باطل ہوگئی، اب وہ چاہیں گے بھی، مگر سجدہ نہ کر سکیں گے۔

فائدہ جلیلہ:

بعض مفسرین جیسے ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہاں ساق کا حقیقی معنی (پنڈلی) مراد نہیں، بلکہ یہ ایک تمثیل ہے کہ کشف ساق کنایہ ہے شدت وسختی سے۔ عربی محاورہ میں کشف ساق شدت، بے چینی اور سختی کے معنی میں مستعمل ہے، جیسے کہتے ہیں: کشف الحرب عن ساقها (یعنی لڑائی نے اپنی پنڈلی کھول دی ہے) یعنی لڑائی سخت ہوگئی اور شدت اختیار کر گئی۔

توجس طرح قیامت کی سختی برپا ہوگی تو صحیح طاعت اور غلط اعمال میں تمیز ہوگا، جنہوں نے سجدے غلط اور شرک وبدعت کے ساتھ یا ریا ونفاق کے ساتھ کیا تھا، اور جن لوگوں نے اخلاص وتوحید کے ساتھ سجدے کئے تھے ان

دونوں قسم کے سجدوں کی حقیقت واضح ہوجائے گی، اور قیامت کی سختی میں کس کو شک ہوسکتا ہے؟ یہی مراد ہے کشف ساق سے۔

اور جن ائمہ کرام نے حقیقی معنی مراد لیا ہے جیسے وہ کہتے ہیں کہ یہاں لفظ ساق اور دوسری حدیث میں جو صلہ رحمی کا بیان ہے وہاں یہ کلمہ مذکور ہے: **فاخذت بحقو الرحمن،** حقو کمر، ازار بند۔ تیسری حدیث میں جو دوزخ کے بارے میں ہے: **فيضع الرب جل و علاقدمه فتقول قط قط**۔ ایک چوتھی حدیث میں ہے: **الكبرياء ردائي و العظمة إزاري**۔ تو ہر جگہ تمثیل اور معنی مجازی مراد لینا بہتر نہیں، لہٰذا ان تمام مقامات میں معنی حقیقی مراد لیا جائے، اور سلف نے جو ضابطہ متشابہات کے بارے میں وضع کئے ہیں اس پر عمل کیا جائے اور بلاکیف ان معانی پر ایمان لانے اور تسلیم کرنے کا حکم لگایا جائے جیسے پہلے بیان ہوا۔

عمدۃ المحدثین سراج المفسرین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں اس مقام پر عجیب بے مثال تحقیق لکھی ہے، اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے: فرماتے ہیں: خداوند تعالیٰ کی ایک ذات ہے، اور دوم درجے میں اس کی صفات ہیں، اس کے اسماء وصفات پر ایمان لانا ضروری ہے، **أمنت بالله كماهو بأسماءه و صفاته**۔ وہ رحمٰن ورحیم، علیم وحکیم اور خبیر ہے، یہ ساری اس کی صفات ہیں، جو ننانوے ہیں۔

صفات اس کی ذات سے الگ نہیں ہوا کرتیں، تو اللہ تعالیٰ کے لئے ساق، قدم، یا دیگر اعضاء کا جو ذکر ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے کمالات کی جہتیں ہیں، اور یہ جہات صفات سے الگ ہیں، ان کمالات کی جہتوں میں ایک ساق بھی ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے، جیسے انسان کی پنڈلی بنیاد ہوتی ہے، اور دوسرے اعضاء اس پر کھڑے ہوتے ہیں، اسی طرح ساق ایک حقیقت کو بیان کررہی ہے، اس سے مراد ایسی پنڈلی نہیں، بلکہ ایک حقیقتِ کمالیہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے کمال کی جہت کو بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کمالات کی بہت سی جہتوں میں سے دو جہتیں، یعنی پنڈلی اور قدم ادنیٰ درجے کی ہیں۔ پنڈلی کی (جہت) حشر میں ہوگی، اور قدم کی (جہت) دوزخ میں ہوگی۔ مگر کافر اور مشرک ان ادنیٰ جہتوں کو سمجھنے کے بھی قابل نہیں ہوں گے، کیونکہ انہوں نے اپنی استعدادوں کو خراب کیا ہوا ہے، باقی جہات تو بہت بلند ہیں، مثلاً: وجہ، سمع اور بصر وغیرہ، ان کو یہ لوگ کیسے سمجھ سکیں گے؟ تو یہاں پنڈلی سے مراد وہ تشبیہ والی پنڈلی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک جہت کو بیان کرنا ہے جس کا میدان محشر میں ظہور ہوگا۔ [تفسیر عزیزی]

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اہل کشف وتحقیق یہ فرماتے ہیں کہ کشف ساق تعبیر ہے، ایک عظیم مخصوص تجلّی سے، جس کا ظہور میدانِ محشر میں ہوگا۔

ایک بہت بڑے صاحب کشف وکرامت بزرگ حضرت شیخ ابوسعید ضریر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کشف ساق کنایہ ہے کشف حقیقت سے، پھر وہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ کشف ساق سے مراد کشف الحقیقۃ ہے، جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد ہے: ﴿یَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ﴾ جس دن حقائق اور پوشیدہ راز کھل کر ظاہر ہوں گے اور سورۂ غاشیہ میں بڑے عمدہ پیرایہ میں اس حقیقت کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

دنیا میں انسان دو قسم کے ہیں: ایک وہ لوگ جن کی عبادات حقیقتِ شرعیہ پر قائم ہیں (یعنی خلافِ شرع اس میں کوئی چیز شامل نہیں)۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو عبادت وریاضت بہت کرتے ہیں، نمازیں بکثرت پڑھتے ہیں اور کثرتِ صلوٰۃ سے پیشانیوں پر داغ دھبہ رکھتے ہیں، مگر ان کی یہ عبادت حقیقتِ شرعیہ پر مبنی اور قائم نہیں ہوتی، قیامت کے دن ان کی عبادت کی اصلیت کا پتہ چلے گا جب ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً﴾ [الغاشیۃ: ۴] (مصیبت جھیلتے ہوئے، تھکن سے چور۔ وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے)۔

دنیا میں تو بڑی عبادت وریاضت کی، مگر سب بے کار ضائع ہوگئی، وہ محض تھکاوٹ ہی تھی، کیونکہ صحیح حقیقتِ شرعیہ پر مبنی نہیں تھی، کہیں شرک کا شائبہ، کہیں بدعت کا، کہیں سوءِ معرفت کا اور کہیں اور کچھ وغیرہ، اور حقیقتِ شرعیہ پر مبنی عبادت کے لئے یہ شرائط ہیں:

(۱) صحیح معرفت الٰہی۔ (۲) توحید خالص۔ (۳) اجتناب عن الشرک الجلی والخفی۔ (۴) اتباعِ سنت سنیہ۔ (۵) اجتناب عن البدعات۔ (۶) اتباعِ سلف۔ (۷) فرائض واجبات، سنن اور مستحبات وآداب کی ادائیگی۔ (۸) محرمات، مکروہات اور خلاف ادب امور سے اجتناب ودوری۔

موجودہ زمانہ کے مشرکانہ اعمال، بدعات، قبر پرستی، عرس وشرک، قبروں پر میلہ وچراغاں، سجدہ، نذر ونیاز اور جانوروں کی قربانی ودیگر بے شمار شرکیہ اعمال وبدعات وغیرہ سارے کفر وشرک کے حصے اور اقسام ہیں، ان برائیوں کے مرتکب کو کافر ہی کہنا پڑے گا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص صفات کو کسی مخلوق کے لیے ثابت کرنا یا کسی پیغمبر، ولی اور بزرگ کے لیے وہ صفات ثابت کرنا جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، مثلاً روزی دینا، صحت وتندرستی دینا، نفع ونقصان کا مالک ہونا، اولاد دینا، عزّت وذلت دینا، ہر جگہ حاضر وناظر رہنا، علم غیب کلّی کا مالک ہونا، اور ہر بلا ومصیبت

لانا اور دور کرنا، وغیرہ۔ یہ سارے اعمالِ شرکیہ ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کوئی بھی عمل قبول نہیں ہوگا، قبول کیا، صحیح نہیں ہوگا، ایسے لوگ روز قیامت قابلِ رحم ہوں گے جو پہاڑوں جتنے اعمال لے کر آئے، مگر بے سود، تھکے ہوئے اعمال تلے دبے ہوئے، مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا، اور الٹا ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا'' کا مصداق بنا۔

ہزاروں اعمال نماز، حج، زکوٰۃ، صوم، وصلوٰۃ، علم، وریاضت سب کچھ کھوٹے اور کاسد ثابت ہوئے اور نتیجہ جہنم ہی نکلا، لہٰذا عنداللہ قابلِ قبول اور حقیقی عمل وہ کہلائے گا جس پر ماأنا علیه وأصحابي کی مہر لگ چکی ہے، کیونکہ ابھی دنیا میں آزادی ہے، کوئی پکڑ نہیں، ہر مشرک، ملحد اور کافر یہی رٹ لگا رہا ہے کہ اصلی مسلمان میں ہی ہوں، اور میرا طور وطریقہ ہی اصلی شریعت ہے، بریلویت ہو یا رفض وخروج حبِّ مال وحبِّ جاہ نے سب کی آنکھوں پر پردہ اور دلوں پر غفلت اور عقول پر بے سمجھی کا غلاف ڈالا ہوا ہے۔ کچھ لوگ جانتے ہوئے یہودیت ونصرانیت کے تعصب کا شکار ہیں، یہ سارے راز کشف ساق کے ساتھ کھل جائیں گے، اور ہر ایک کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ؎

فسوف ترىٰ إذا انكشف الغبار ★ أفرس تحت رجلك أم حمار

غبار صاف ہونے پر ہر سوار کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ شہسوار ہے، یا گدھا سوار۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۴

ترجمہ: پس چھوڑ دیں مجھے اور ان کو جو حق بات کو جھٹلاتے ہیں، اس لئے کہ ہم ان کو آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھائیں گے جہاں سے ان کو معلوم نہ ہوگا۝۴۴

معارف ومنازل

شاید آپ اس بارے میں پریشان ہیں کہ ان مکذّبینِ توحید ورسالت اور منکرینِ قیامت کی پکڑ کیوں نہیں ہوتی؟ اور وہ لوگ اس غرور میں ہیں کہ ہم اگر غلط ہوتے تو مبتلائے عذاب ہو جاتے، اور یہ مسلسل ہماری ترقی ہمارے حق پر ہونے کی نشانی ہے۔ دونوں باتوں کا جواب آگیا، یعنی آپ تسلی کریں، ان کی مستقبل میں پکڑ ہونے والی ہے، فی الحال یہ استدراج میں ہیں، یہ ایسے مبتلائے عذاب ہوں گے جہاں سے انہیں وہم وگمان بھی نہ ہوگا، پس ہوا بھی ایسا، جبکہ میدانِ بدر، قحط، فتح مکہ اور ان کے تمام معبودوں کی تلفی اور ریزہ ریزہ ہونا وغیرہ۔

استدراج درجہ بدرجہ چڑھانے یا اتارنے کو کہتے ہیں۔بعض روایات میں ہے کہ تم جب دیکھو کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں تو جان لو کہ یہ شخص استدراج میں مبتلا ہے، اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری میں مبتلا ہے، اور اللہ پاک کی مہلت سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔[مشکوٰۃ]

کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں دیکھ کر یہ اندازہ نہ لگانا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء و آزمائش ہو یا استدراج ہو۔ استدراج کا قانون نیک لوگوں کے لیے نہیں ہوتا، یہ برے لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔ رہا ابتلاء اور آزمائش کا قانون تو وہ سب کے لئے ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

بیشک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ڈھیل دیتا ہے اور جلدی نہیں پکڑتا، پھر جب پکڑے گا تو نہیں چھوڑے گا۔[بخاری]

یاد رہے کہ اس آیت میں جس استدراج کا بیان ہے کہ اس سے کافر پکڑے جائیں گے، اور ان پر عذاب اچانک آنے والا ہے، تو یہ پکڑ دینوی اور اخروی دونوں کو شامل ہے۔

وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: میں ان کو مہلت دیتا ہوں، میری تدبیر مضبوط ہے ﴿۴۵﴾

معارف ومنازل

دنیا میں اصول یہ ہے کہ حکام وسلاطین اور رؤساء و امراء اپنے مجرم کو مہلت نہیں دیتے، جلدی پکڑ کر سزا دیدیتے ہیں، کیونکہ مہلت کی صورت میں وہ بھاگ کر کسی پڑوسی علاقے میں چھپ جائے گا، اور سزا سے بچ جائے گا، لیکن اللہ پاک کا مجرم آخر کہاں جا کر جان بچائے گا؟ وہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، سارا جہاں اس کے قبضے میں ہے، اس لئے مہلت کا سلسلہ جاری ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ اس تاوان کی وجہ سے بوجھل ہیں (بے حوصلہ ہیں) جو آپ مزدوری کے طور پر ان سے

مانگتے ہیں؟ ﴿۴۶﴾

معارف ومنازل

اگر کوئی لوگوں سے چندہ، اُجرت، تاوان اور فیس طلب کرے تو لوگوں کا بوجھل ہونا، بیزار اور متنفر ہونا معقول ہے، لیکن آپ نے تو آج تک ان سے کچھ مانگا ہی نہیں، بلکہ قبل از نبوت چالیس سال کے عرصے میں بھی آپ نے کسی سے کوئی چیز طلب نہیں کی، آپ اور آپ جیسے انبیاء سابقین علیہم السلام تو یہی کہتے رہے ہیں: ﴿لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ [ھود:۲۹] (میں تم سے کچھ اس پر مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ ہی پر ہے)۔ ﴿وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ﴾ [الأعراف:۶۸] (اور تمہارا معتمد خیر خواہ ہوں)۔

یہ سارے انبیاء علیہم السلام کا خاصہ وخصلت رہی ہے کہ کسی سے کچھ طلب نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے سردار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قاسم ہیں اور دینے والے ہیں، کسی سے کچھ لینا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہ عادت ہے، نہ ہی پروگرام، تو پھر ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب ومجلس میں آنا چاہئے تھا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور کیوں بھاگتے رہتے ہیں؟ جیسے کہ گدھا شیر سے بھاگتا ہو، تو معلوم ہوا کہ یہ شقی اور بدبخت ہیں کہ رحمۃ العلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی ہستی سے دور بھاگتے ہیں، تو یہ پرلے درجے کے بیوقوف اور ناسمجھ قرار پائے۔

اس محرومی کے باوجود یہ کہتے رہتے ہیں: اول تو قیامت نہیں آئے گی، بالفرض اگر قیامت آ بھی گئی تو وہاں آج کی طرح ہم لوگ مسلمانوں سے زیادہ مال دار اور خوشحال رہیں گے۔ کیا ان کے پاس کوئی خدائی وعدہ یا کوئی علم غیب کی خبر ہے؟

۔۔۔۔ ❁ ۔۔۔۔ ❁ ۔۔۔۔ ❁ ۔۔۔۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: کیا ان کے پاس غیب کی خبر ہے، سو لکھ لاتے ہیں؟ ﴿۴۷﴾

معارف ومنازل

ہرگز نہیں، بلکہ یہ ان کی حماقت اور نادانی ہے، جو آج کی فانی دنیا کو کل کی ابدی اور دائمی آخرت پر یا برعکس

قیاس کرتے ہیں، انہیں خوب پتہ چلے گا، جب وہ خالی ہاتھ میدانِ محشر میں آئیں گے، وہاں سوائے ندامتوں اور حسرتوں کے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا، تو یہ ان کی بدبختی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے اور مسلسل ضد و عناد پر ڈٹے ہوئے ہیں، آخر نہ ماننے کی کوئی وجہ تو ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کچھ فیس اور کمیشن بھی نہیں مانگتے اور ان کے پاس کوئی غیب کی خبر بھی نہیں، تو پھر صاف ظاہر ہے کہ بدقسمت اور محروم ہیں، اور محض ضد و غرور کی بدولت جہنم کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ

ترجمہ: پس اپنے ربّ کے حکم کے لئے صبر کریں، اور مچھلی والے نبی کی طرح نہ بن جائیں (یعنی جلد باز)۔

معارف ومنازل

یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر یونس علیہ السلام کی طرح مکذّبین کے معاملہ میں تنگدلی اور پریشانی کا اظہار نہ کیجئے، بلکہ اپنی شان و ہمت کو دیکھتے ہوئے عزم و استقلال کا پہاڑوں جتنا بوجھ برداشت کر کے صبر کیجئے گا۔

مچھلی والا فرمایا حضرت یونس علیہ السلام کو، ان کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہر نینویٰ کی طرف (جو موصل کے مضافات میں سے ہے) مبعوث فرمایا تھا، یونس علیہ السلام نے ان کو بت پرستی سے روکا اور حق کی طرف بلایا، وہ ماننے والے کہاں تھے؟ روز بروز ان کا عناد و تمرد ترقی کرتا رہا، آخر بددعا کی اور قوم کی حرکات سے خفاء ہو کر غصہ میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا، اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا۔

ان کے نکل جانے کے بعد قوم کو یقین ہوا کہ نبی کی بددعا خالی نہیں جائے گی، اور کچھ آثار عذاب کے بھی دیکھے گئے، تب گھبرا کر سب لوگ بچوں، عورتوں اور جانوروں سمیت باہر میدان میں چلے گئے، ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا، اور جانوروں کو بھی ان کے بچوں سے الگ کر دیا، میدان میں پہنچ کر سب نے رونا چلانا شروع کر دیا، بچے، مائیں، آدمی اور جانور سب شور مچا رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، تمام بستی والوں نے سچے دل سے توبہ کی، ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی، بت توڑ ڈالے، خدائے تعالیٰ کی اطاعت کا عہد باندھا، اور حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے لگے کہ ملیں، تو ان کے ارشادات پر کاربند ہوں، حق تعالیٰ نے آنے والے عذاب ان پر سے اٹھالیا، جس

کا بیان سورۂ یونس رکوع دس ۱۰ میں ہے۔

ادھر یونس علیہ السلام بستی سے نکل کر ایک جماعت کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے، وہ کشتی غرق ہونے لگی، کشتی والوں اپنے مفروضات کے موافق یہ سمجھے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے مولا سے بھاگا ہوا ہے۔ بہر حال! اس آدمی کی تعیین کے لیے قرعہ ڈالا، وہ یونس علیہ السلام کے نام پر نکلا، دو تین مرتبہ قرعہ اندازی کی، ہر دفعہ یونس علیہ السلام کے نام پر نکلا۔ یہ دیکھ کر یونس علیہ السلام دریا میں کود پڑے، فوراً ایک مچھلی آکر نگل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونس (علیہ السلام) کو اپنے پیٹ میں رکھ اور اس کا ایک بال بیکا نہ ہو، یہ تیری روزی نہیں، بلکہ تیرا پیٹ ہم نے اس کا قید خانہ بنایا ہے، لہٰذا اس کو اپنے اندر حفاظت سے رکھنا۔

اس وقت یونس علیہ السلام نے اللہ کو پکارا: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۸۷] (کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے تجھ کو، بیشک مجھ سے غلطی ہوئی میں قصوروار ہوں)۔ اپنی خطاء کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بغیر بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ گو یونس علیہ السلام کی یہ غلطی اجتہادی تھی، جوامت کے حق میں معاف ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و تربیت دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ جس معاملہ میں وحی آنے کی امید ہو بدون انتظار کئے قوم کو چھوڑ کر چلا جانا ایک نبی کی شان کے لائق نہ تھا۔ اسی نامناسب بات پر دارو گیر شروع ہوگئی، آخر توبہ کے بعد نجات ملی، مچھلی نے کنارہ پر آکر اگل دیا، اور اسی بستی کی طرف صحیح سالم واپس کیے گئے۔ یہ واقعہ سورۂ یونس اور سورۃ الانبیاء اور سورۂ صافات میں قدرے تفصیل کے ساتھ موجود ہے وہاں مطالعہ کیا جائے۔ [تفسیر عثمانی]

ربّ العزّت نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر موقعہ صبر و استقلال اپنانے کا حکم دیا، اور انبیاء سابقین علیہم السلام جیسی اولو العزم ہستیوں کی سیرت و عمل پر چلنے کا کہا، کیونکہ سیدنا یونس علیہ السلام کا شمار اولوالعزم پیغمبروں میں نہیں، اس لئے اس کے طرزِ عمل پر چلنے سے منع فرمایا۔

﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ (مچھلی والے پیغمبر کی بے صبری اختیار نہ کرو) جیسے فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (تو تم صبر کرو جیسا ہمت والے رسولوں نے صبر کیا، اور ان کے لیے جلدی نہ کر)۔ اور فرمایا: ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ [هود: ۱۲۰] (اور سب کچھ ہم تمہیں رسولوں کی خبریں سناتے ہیں، جس سے تمہارا دل

ٹھہرائیں)۔تو نتیجہ یہ معلوم ہوا کہ منکرین کو سزا ملنی ضرور ہے، آخرت میں ملے یا دنیا میں یا دونوں جگہ، تو اس معاملہ میں آپ جلدی نہ کریں، بلکہ ایک میعاد متعین تک صبر کریں۔ ربّ العزّت اپنی حکمت وصوابدید کے مطابق خود فیصلہ فرمائے گا، اور آپ سے پہلے جن اولوالعزم ہستیوں نے جو صبر کئے ہیں آپ ان کی اتباع واقتداء کریں، وہ اولوالعزم یہ ہیں: حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام، اور آخری آپ کی ذات اقدس جو سارے انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سردار ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اِذۡ نَادٰی وَهُوَ مَكۡظُوۡمٌ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: جب پکارا اس نے اور وہ غصہ میں بھرا تھا﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

یعنی غم سے گھٹ رہے تھے، اور یہ غم کئی غموں کا مجموعہ تھا: ایک قوم کے ایمان نہ لانے کا، ایک عذاب کے ٹل جانے کا، اور ایک بغیر اجازت شہر چھوڑ کر چلے آنے کا، ایک مچھلی کے پیٹ میں محبوس رہنے کا، بقول مظہری ایک بیوی اور دونوں بیٹوں کی ہلاکت کا، یہ پانچ غم ہوئے۔ اگر قرعہ اندازی والا غم بھی شامل ہو تو چھ غم ہوئے۔ سبحان اللہ! کون برداشت کرسکتا ہے؟

نبوت چونکہ ایک اعلیٰ منصب ہے، اور اس کے حاملین بہت بڑے اونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں جنہیں أشد البلاء الأنبیاء کے پل صراط پر گزرنا پڑتا ہے، ورنہ کسی کی مجال نہیں کہ دم لیلے اور زندہ رہے۔ قاضی ثناء اللہ قدس سرہ لکھتے ہیں کہ قصہ میں یہ بات بھی منقول ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام جب سمندر کے کنارے پہنچے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی اور دولڑکے بھی تھے، کشتی آگئی اور آپ نے چڑھنے کا ارادہ کیا تو سوار ہونے سے پہلے بیوی کو آگے بڑھایا، اس درمیان میں سمندر کی ایک لہر آگئی اور بیوی کو بہا کر لے گئی، اور دوسری لہر نے آکر بڑے بیٹے کو بھی لے لیا، اور چھوٹا بیٹا جو کنارہ پر تنہا کھڑا تھا اس کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا، تو آپ اکیلے کشتی میں سوار ہوئے، اور پھر کشتی طوفان میں گر گئی۔ [مظہری]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مچھلی آپ کو نگل کر ساتویں زمین کے نیچے کے گڑھے میں لے گئی، اس

کے پیٹ کے اندر آپ چالیس رات رہے، اور پتھریوں کی تسبیح پڑھنے کی آواز سنی، تو اندھیریوں کے اندر ہی پکارا تھے۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۸۷] (کوئی معبود نہیں سوا تیرے، پاکی ہے تجھ کو، بیشک مجھ سے غلطی ہوئی میں قصوروار ہوں)۔ احادیث میں اس دعا کی بہت بڑی فضیلت آئی ہے، جو اس کو درد دل کے ساتھ کثرت سے پڑھے اور سُبْحٰنَكَ پر وقف کر کے پڑھے۔ علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ اس کی مصیبت دور نہ ہو۔ شیخ قاری رحمہ اللہ اس کو اسم اعظم بتاتے ہیں، اور صاحب تفسیر مظہری کی بھی یہی رای ہے، کیونکہ اس کے ساتھ متصل فرمان الٰہی ہے: ﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ﴾ [الأنبياء: ۸۸] (ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، اور اس کو غم سے نجات دی)۔

ہوسکتا ہے کسی کو وہم ہو کہ یہ ترانہ مخصوص ہے سیدنا یونس علیہ السلام کے ساتھ، ارشاد ربانی ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۸۸] (اور ہم اسی طرح مؤمنوں کو نجات دیتے ہیں)۔ صاحب فتح الملہم کہتے ہیں کہ امت نے شدائد و مصائب میں اس کو بہت مجرب پایا ہے۔ بات اصل میں درد دل والی ذہن نشین رکھئے، پھر مسئلہ آسان ہو جائے گا۔ یہ واقعہ دریائے فرات کا ہے، جو عراق میں بہتا ہے۔ نینوی موصل وہاں سے بالکل قریب ہے۔ تفسیر روح المعانی میں حضرت آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ہم نے خود اس دریا میں بہت بڑی بڑی مچھلیاں مشاہدہ کی ہیں، اس پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ سورۃ الصافات میں قدرے تفصیل زیادہ ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

القصة: بقول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چالیس رات مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے بعد مچھلی نے دریا کے کنارے پر لا کر صحیح و سالم ڈال دیا، چند وقت وہاں رہے، جب مکمل تندرستی حاصل ہوئی تو وحی نے انہیں واپس قوم کی طرف جانے کا حکم دیا، وہاں سے روانہ ہوئے خیر و برکات کا دروازہ کھل چکا تھا، توبہ قبول ہو چکی تھی، سارے غموں اور پریشانیوں کے دور ہونے کی خوش خبری حضرت جبرائیل امین سنا چکے تھے اور بتا دیا تھا۔

ادھر سے قوم والے مسلمان مؤمن مسلسل تلاش میں مصروف تھے، آپ وہاں جاتے ہوئے مسرور اور راضی معلوم ہوتے تھے، اور راستے میں زوجہ محترمہ دونوں بچوں کے ساتھ کھڑے انتظار کر رہی ہیں۔ ﴿وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کے بمصداق نہایت خوش ہوئے اور قوم نے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے واقعہ ذرا تفصیل سے لکھا ہے، اور واقعے کی نوعیت بھی ذرا مختلف لکھی ہے، مگر حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں صرف تعبیر کا فرق ہے۔ واللہ اعلم

لَوۡلَاۤ اَنۡ تَدٰرَکَهٗ نِعۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ وَهُوَ مَذۡمُوۡمٌ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: اگراس کے پروردگار کا فضل اس کی دستگیری نہ کرتا تو وہ چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا، اوراس کا حال براہوتا﴿۴۹﴾

معارف ومنازل

یعنی ربّ تعالیٰ کی نعمت اور مہربانی واحسان اگران کا تدارک نہ کرتا اوراسے نہ سنبھالتا توالبتہ انہیں چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا اس حال میں کہ وہ ہارے ہوئے ہوتے، مگر رحمت ایزدی نے تمام تلافی کی اور سارے نقصانات پورے کئے، یعنی ختم کئے۔ آپ کے چمڑے پر جو کیفیت آئی تھی کہ دھوپ برداشت نہیں کرسکتے تھے، اور بے انتہا نرم ہوئے تھے، مکھیوں کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اور چالیس دن بغیر غذا اور خوراک رہ کر قوت ہاضمہ ومعدہ جوکام چھوڑ گیا تھا۔ الغرض بہت سے مصائب جو ظاہری جسم پر نمایاں رہے سب دور ہوگئے۔ چالیس یوم درخت کدو کے سایہ میں رہے، اور جنگلی ہرنی نے آپ کو اپنا دودھ مہیا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے مذمومیت سے بچا کر محمودیت عطا کردی وغیرہ۔ آنے والی آیت میں ان سب کا جواب ہے۔

فَاجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: اللہ ربّ العزّت نے انہیں برگزیدہ بنا کر صالحین اوراپنے نیک بندوں میں شامل فرمایا﴿۵۰﴾

معارف ومنازل

سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: سارے انبیاء اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، ان میں سے اگرکسی نبی کی کوئی لغزش ہوتو بڑے ادب سے اس کا نام یاد کرو، اور کسی پر طنز نہ کروکہ حرام ہے۔ مجھے جناب حضرت یونس بن متی علیہ السلام پر فضیلت نہ دو کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان سے افضل اور بہتر ہیں، وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ کسی پیغمبر کی اس طرح برتری بیان نہ کروجس سے کسی دوسرے نبی کی توہین یا کوئی نقص وکمی کا پہلو مترشح ہو، اگرچہ سارے انبیاء علیہم السلام ایک جیسے نہیں، ﴿تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ﴾ [البقرة: ۲۵۳] [ہم نے ان رسولوں کے بعض کو

بعض پر فضیلت دی ہے] مگر ادب واحترام اور تقدس میں ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ [البقرة:۲۸۵] (ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے) پر عمل کیا کرو، کیونکہ سارے قابل احترام عظیم و برتر ہستیاں ہیں، اور سارے انبیاء علیہم السلام معصوم اور گناہوں سے پاک ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اجتہادی غلطی ہوئی، جس کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا، وبس۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝۵۱ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۵۲

ترجمہ: اور بلاشبہ نزدیک ہے کہ یہ کافر اپنی تیز نگاہی اور گھور گھور کر دیکھنے سے آپ کو پھسلا دیں، جبکہ وہ سنتے ہیں قرآن کو، اور یوں کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ اور مجنون ہے ۵۱ حالانکہ وہ (قرآن) نہیں مگر نصیحت اور تذکرہ ہے سارے جہانوں کے لیے ۵۲

معارف ومنازل

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ گھور گھور دیکھتے ہیں کہ ڈر کر قرآن پڑھنا چھوڑ دے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں قرآن سنتے ہیں تو آپ پر تیز اور قہر آلود غضبناک نگاہیں ڈالتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری خشم آلود نگاہوں سے خوفزدہ ہو کر قرآن کی تبلیغ چھوڑ دیں، اور قرآن پڑھنا بند کر دیں، اس طرح تیز تیز نگاہوں سے گھورتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دماغ کو بے کار کر دیں گے۔ نگاہوں کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی دیوانہ اور مجنون کہتے ہیں۔

ربّ العزّت عزّ شانہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن اعلیٰ درجہ کا باکمال ذکر و نصیحت ہے، سارے جہانوں اور اقوام عالم کے لیے، اور ہر قسم کی بیماریوں کے لیے شفاء اور برائیوں سے نجات دہندہ ہے، ایسا کلام اعلیٰ درجہ عقلمندوں کا ہوتا ہے، اور اس کے پیش کرنے والا اور بیان کرنے اور سنانے والا تمام عالم کا نجات دہندہ اعلیٰ درجے کا دانا و عقلمند ہے۔

تہید ستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل ☆ کہ خضر از آب حیوان تشنہ لب آرد سکندر را

مفسرین حضرات نے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا ہے، اور امام ترمذیؒ نے نظر بد کے متعلق ایک صحابی کے

واقعہ کے ساتھ نظر بد کے واقع ہونے کی حدیث بھی نقل کی ہے۔صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس بارے میں ایک لڑکی کے متعلق بھی موجود ہے،جس کو نظر بد کا عارضہ تھا۔صاحب حیاۃ الحیوان نے ان احادیث کی روشنی میں چند عجیب واقعات بھی نقل کئے ہیں۔مشرکین مکہ میں بھی قدیم زمانے سے یہ عقیدہ پایا جاتا تھا اوران میں ایک دو شخص بڑے معروف تھے جو نظر بد لگانے میں مشہور تھے جن کی نظر بد لگانے سے بڑے شہسوار گرتے اور ہلاک ہوجاتے،اوراونٹوں کو ادنیٰ کھیل کے ساتھ گراتے ختم اور ہلاک کرتے،اپنے مخالفین پر نظر بد دوڑاتے،ان کو ایسے تباہ کرتے جیسے کسی نے اس کو تیر مارا ہو۔النظر كالسهم ينزل الراكب عن فرسه فيهلكه۔

تو ایسے موقع پر کفار مکہ نے اپنے نظر بد لگانے والوں کی خدمات حاصل کر کے انہیں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا،یہ لوگ اپنے فن میں بڑے ماہر تھے،انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بار بار دیکھا اور نظر مارنے کا کرتب دکھایا،اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلسل ”ولاحول ولاقوة إلابالله“ پڑھتے رہے،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کچھ بھی اثر نہ ہوا،وہ ناکام وشرمندہ واپس لوٹے۔اس موقع پر یہ آیتیں اتریں اور آپ بحمدہٖ تعالیٰ محفوظ رہے۔”دشمن چہ کند چومہربان باشد دوست“۔اردو میں محاورہ ہے: ”جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے“۔حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو کسی انسان کی نظر بد لگ گئی ہو اس پر یہ آیات پڑھ کر دم کرنے سے نظر بد کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔[مظهري]

اور جو شخص صبح وشام تین مرتبہ بسم الله الذي لايضر مع اسمه شئ في الأرض ولافي السماء وهو السميع العليم پڑھے گا وہ نظر بد اور فالج سے محفوظ رہے گا۔[ترمذي، كنز]

سُورَةُ الْحَآقَّةِ

مکیۃ آیاتہا ۵۲ رکوعاتہا ۲

سورۂ حاقہ مکی ہے، اس میں باون (۵۲) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْــــمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الحاقۃ ہے۔ یہ بالاتفاق مکی سورت ہے۔

تعدادِ آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت باون (۵۲) آیتوں، دوسو چھپن (۲۵۶) کلمات، اور ایک ہزار چار سو اسی (۱۴۸۰) حروف پر مشتمل ہے، اور اس کا نزول سورۂ ملک کے بعد ہے۔

نزول:

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے اپنا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں یہ نیت کر کے گھر سے نکلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر آج پریشان کروں گا، اور جس طرح بن پڑا ان کو ایذاء پہنچاؤں گا، میرے پہنچنے سے پہلے وہ کعبہ کے حرم میں داخل ہو چکے تھے اور نماز ادا فرمارہے تھے، میں نے قریب میں کھڑے ہو کر سنا کہ سورۃ الحاقۃ پڑھ رہے ہیں، میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آپ بڑے شاعر ہیں، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ﴾ تلاوت فرمائی، میرے دل میں آیا کہ آپ کاہن ہیں، فوراً انہوں نے ﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ﴾ کی تلاوت فرمائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہ سورت سن کر میرے دل

میں اسلام کی عظمت موجزن ہوئی جو رفتہ رفتہ پختہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ بہن اور بہنوئی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس نے تمام پردے چاک کر دیئے، اور آپؓ نے کشاں کشاں دربار نبوت میں حاضری دے کر اسلام قبول کیا۔ رضی اللہ عنہ۔ [روح المعاني]

ربط و مناسبت:

یہ سورت ماقبل کی سورت کا تکملہ ہے، وہاں توحید و رسالت کے ساتھ کفار کو واقعی سزا ملنے کا بیان تھا، اس سورت میں اس سزا کی نوعیت عاد و ثمود جو کفار مکہ کے ہم مشرب تھے ان کی سزاؤں کا بیان ہے۔ باقی مضامین دونوں سورتوں کے قریب قریب ایک جیسے ہیں، توحید و رسالت، قیامت اور جزاء و سزا کا بیان ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا قول ہے، جس کا خلاصہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ نے تفسیر عزیزی میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرمین کو جو سزا دیتے ہیں وہ دو قسم کی ہیں: (۱) عارضی۔ (۲) دائمی۔

عارضی سزائیں صرف تنبیہ کے لیے ہوتی ہیں، ان کو مسلسل جاری نہیں رکھا جاتا، اور یہ سزا اس لئے دی جاتی ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں، عبرت حاصل کریں، غفلت اور گناہ چھوڑ دیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں، جب یہ کچھ ہوگیا تو پھر یہ سزائیں اٹھائی جاتی ہیں، کیونکہ ان کو ہمیشہ برقرار رکھنے میں نظامِ دنیا کا زوال ہوگا اور قدرت کو یہ منظور نہیں۔

دوسری قسم سزا یہ ہے کہ سزا آئی اور گرفت بھی ہوگئی، کبھی جزوی طور پر اور کبھی عمومی طور پر، تو یہ سزا برزخ میں، پھر قیامت میں ہمیشہ کے لیے جاری رہے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عاد، ثمود، قومِ شعیب، قومِ لوط، قومِ ابراہیم اور قومِ فرعون کو تباہ کیا، یہ سزا ابدی اور دائمی ہے، اور برزخ میں یہ مسلسل رہے گی، پھر قیامِ قیامت پر دائمی اور ابدی کے ساتھ اس کا فیصلہ ہوگا۔

مختصر موضوع:

ربّ العزّت سبحانہ نے حلف اٹھا کر فرمایا کہ قیامت ضرور واقع ہوگی، ساتھ ساتھ قومِ ثمود، عاد، اور فرعون کا تذکرہ فرمایا، جو قیامت کے منکر تھے، اس لئے عمر بھر طغیان و سرکشی میں گم رہے، جس کا نتیجہ عبرتناک تباہی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آیت ۱۳ تا ۱۷ قیامت کے روز برپا ہونے والے ہولناک حادثات کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور آیت ۱۸ تا ۳۷ تک میں یہ بتایا کہ جو لوگ یہ ایمان رکھتے تھے کہ ایک روز وہ ضرور اپنے پروردگار کے روبرو پیش کئے جائیں گے اور ان کا محاسبہ ہوگا، ان کو اس روز ان کا صحیفۂ عمل ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور ان کی بڑی عزت و تکریم

کی جائے گی۔

جولوگ قیامت کے منکر تھے اور ساری عمر ہر قسم کے باز پرس ومحاسبہ سے بے نیاز ہو کر داد عیش دیتے رہے، ان کا نامۂ عمل بائیں ہاتھ میں پکڑائیں گے، اس وقت ان کی حسرت اور ندامت قابل دید ہوگی، اور ان کے ساتھ جو خوفناک برتاؤ کیا جائے گا اس کا ذکر سن کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

آخر میں فرمایا کہ قرآن کریم کسی شاعر کی نغز بیانی اور قادر الکلامی کا کوئی کرشمہ نہیں، اور نہ ہی کسی کاہن کی تک بندی اور ہرزہ سرائی کا نتیجہ ہے، بلکہ اس کو ربّ العلمین نے بذریعہ وحی اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ پھر فرمایا کہ میرے رسول کی مجال نہیں کہ اپنی طرف سے کچھ گڑھ کر ہماری طرف منسوب کردے، اگر وہ اس سنگین جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس وقت اس کی رگ دل کاٹ کر رکھ دی جائے گی، اور کائنات کا کوئی فرد یا کوئی طاقت اس کو نہیں بچا سکے گی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَآقَّۃُ ۝۱ مَا الۡحَآقَّۃُ ۝۲ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ۝۳

ترجمہ: وہ ثابت ہونے والا حادثہ ① وہ ثابت ہونے والا حادثہ کیا ہے؟ ② آپ نے کیا سوچا کہ کیا ہے وہ ثابت ہونے والا حادثہ؟ ③

معارف ومنازل

کسی چیز کی زیادہ تاکید کے لئے یا اس کی اہمیت کے پیش نظر یا اس کی تفخیمِ شان بیان کرنے کی خاطر یا اس کے وقوع کو مضبوط کرنے کی خاطر اس طرح کا قول ذکر ہوتا ہے، جیسے: ﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ﴾ [الانفطار: ۱۸] (اور تو کیا جانیں کیسا انصاف کا دن، پھر تو کیا جانے کیسا انصاف کا دن)۔ یا ﴿اَلۡقَارِعَۃُ مَا الۡقَارِعَۃُ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡقَارِعَۃُ﴾ [القارعۃ: ۲] (دل دہلانے والی، کیا ہے وہ دہلانے والی، اور تو نے کیا جانا کیا ہے دہلانے والی)۔

چونکہ یہ موجودہ جہاں آنکھوں کے سامنے ہے، اسے سب دیکھتے اور مانتے ہیں، جبکہ قیامت اس جہاں کی

تباہی کا نام ہے، وہ آنکھوں سے غائب ہے، اس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں اسی طرح حیاۃ بعد الموت اور جزا وسزا کے بارے میں انکار اور شکوک وشبہات ہیں، اس لیے اس کے واقع ہونے اور آمد کے متعلق بار بار تاکید اور ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ﴾ کہا گیا ہے۔ یہاں بار بار تاکید واستفہام سے مقصد قیامت کی سختی اور ہولنا کیوں کو بیان کرنا ہے۔ قیامت نام ہے دنیا پرست عاشقوں اور شہزادوں کے محبوب ومرغوب (معشوق جہان) کی تباہی وبربادی کا، جس پر اللہ والے شاید "إنا للہ وإنا إلیہ راجعون" پڑھنا بھی گوارانہ کریں۔ اور دراصل قیامت نافرمانوں پر آئے گی، اس وقت "اللہ" کہنے والا کوئی ایک شخص بھی زندہ موجود نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت ایک تباہی ہے، یہ کوئی خوشخبری کا پیغام نہیں ہے۔

﴿اَلْحَآقَّةُ﴾ حق سے مشتق ہے، بمعنی واقعی اور ثابت، اور ﴿اَلْحَآقَّةُ﴾ اسم فاعل واحد مؤنث کا صیغہ ہے، بمعنی ثابت کرنے والی، یہ قیامت کا نام ہے، خود بھی ثابت اور برحق ہے اور اس کا وقوع وآنا بھی برحق وثابت ہے۔ مؤمنین کے لیے جنت اور مشرکین کے لیے عذاب جہنم بھی ثابت کرنے والی ہے، اسی ایک سورت میں "الحاقۃ، القارعۃ، الواقعۃ" قیامت کے تینوں نام مختلف معانی ومطالب کے ساتھ مذکور ہوئے۔

فائدہ:

علامہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے البدور السافرۃ میں قیامت کے اسی (۸۰) نام ذکر کئے ہیں، ان میں سے چند نام یہ ہیں: "الحاقۃ، القارعۃ، الواقعۃ، القیامۃ، الساعۃ، الصاخۃ، الراجفۃ، الحشر، النشر، الحساب، التلاق، العقیم، السعیر، المشھود، التغابن، الفتنۃ، الغاشیۃ، الطامۃ، الآزفۃ، یوم الحسرۃ، یوم الدین، یوم المیزان، یوم الجزاء، یوم الصعق، یوم الفزع الأکبر"، وغیرھا۔ [البدور]

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸

ترجمہ: جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی قیامت کو ۴ سو جو ثمود تھے وہ غارت کردیئے گئے زلزلہ

سے اچھال کر⑤ اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے تیز وتند ہوا سے⑥ جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن برابر لگا تار مسلط کیا تھا۔ سوائے مخاطب! تو لوگوں کو اس رات دنوں میں ایسا پچھڑا ہوا دیکھتا جیسے وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے پڑے ہیں⑦ سو کیا اے مخاطب! اب تجھ کو ان میں سے کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے؟⑧

معارف ومنازل

پوری کی پوری قوم تباہ کردی گئی، آج روئے زمین پر ان کا ایک فرد بھی نہیں۔ اس آیت کریمہ میں دو قوموں کی تباہی کا بیان ہے: قومِ عاد اور قومِ ثمود، ان دونوں نافرمان قوموں کے درمیان دو سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ عاد حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے، یہ لوگ ثمود سے دو سو سال پہلے گزرے ہیں، ان کا علاقہ احقاف ہے جو یمن کا ایک صوبہ ہے، یہ لوگ نوح علیہ السلام کے بعد ہیں اور خالص عرب تھے۔ سات رات آٹھ دن مسلسل تند وتیز تباہ کن طوفانی ہوا سے تباہ ہوئے، خطرناک مشرک، متکبر اور ظالم تھے، اور بے انتہا جسیم وقد آور تھے، اسی بنا پر کھجور کے درخت کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے۔ کہتے ہیں قدوقامت میں ۱۸ فٹ بلندی رکھتے تھے۔

ثمود حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے، یہ لوگ بڑے کاریگر اور انجنیئر تھے، وادی القریٰ، تبوک اور سعودیہ کے ساتھ اب بھی ان کے پہاڑی مکانات اور بستیاں کچھ صحیح سلامت موجود ہیں، ان کا علاقہ زرخیز، نہایت خوبصورت اور آباد تھا، بڑے نافرمان گزرے ہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زوردار چیخ سے ان کے کلیجے پھٹ گئے اور جہنم رسید ہو گئے۔

واضح رہے کہ ان کے طریق ہلاک کو قرآن مجید نے کہیں رَجْفَة (زلزلہ)، کہیں صَاعِقَة (کڑک)، کہیں صَيْحَة (چیخ) سے تعبیر کیا ہے، اور کہیں صرف عذاب بتایا ہے، یہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیرات ہیں۔ ایک گرجتی ہوئی بجلی جب پوری قوت کے ساتھ لرزہ فگن انداز میں کسی مقام پر گرے تو بیک وقت زلزلہ، کڑک، اور چیخ سب کچھ ہوتا ہے۔ یہی مختلف الفاظ کے درمیان تطبیق ہے، اور مزید تفصیل سورۃ الشمس کے تحت آئے گی۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ

یہاں سزا کے ذکر میں قومِ ثمود کا نام پہلے ہے اس کے بعد عاد کا ذکر ہے، اور اس کے بعد فرعون کا، پھر الٹی بستی والوں کا، اور پھر قومِ نوح علیہ السلام کا، حالانکہ تاریخی اعتبار سے معاملہ بالکل برعکس ہے، قوم نوح علیہ السلام سب سے مقدم ہے، پھر عاد ہے، اس کے بعد ثمود ہے، پھر قومِ لوط علیہ السلام، پھر قوم شعیب علیہ السلام ہے، اور آخر میں قومِ فرعون کا

تذکرہ ہے۔ قرآن حکیم کوئی تاریخی کتاب نہیں کہ قوموں کی تاریخ ایک ہی مرتبہ مفصل بیان کرے، بلکہ یہ مبارک کتاب ذکر وموعظت والی کتاب ہے، بطورِ تذکیر ونصیحت ایک ہی واقعہ کو بار بار بیان کرتا رہے گا، تاکہ عبرت میں تازگی ہو، اور اسی طرح انداز واسلوب وطرزِ بیان اور الفاظ ونصائح میں کچھ تبدیلی بھی ہوتا کہ بعینہٖ تکرار نہ ہو، اور طرز نصیحت میں تبدیلی بھی ہو، اور "کل جدید لذیذ" پر عمل بھی ہو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس تاریخی تبدیلی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ **ترقي من الأدنیٰ إلی الأعلیٰ** اور نوعیتِ عذاب کا عنصر چونکہ مختلف ہے اس لئے قرآن کریم نے تاریخی ترتیب میں تبدیلی کی ہے۔

قومِ ثمود کی تباہی بیک وقت زلزلہ اور فرشتہ کی چیخ سے ہوئی، جبکہ قومِ عاد کی تباہی پر پورا ہفتہ سات رات آٹھ دن صرف ہوئے، فرعون کی تباہی میں دو عنصر شامل رہے: پانی اور مٹی۔ قومِ لوط کی تباہی میں بارش، سنگ باری، پانی اور مٹی سب شامل رہے، قومِ نوح کی تباہی میں سارے عناصر شامل رہے، اور مدّت چھ ماہ کی رہی۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان تاریخی واقعات کے بیان کرنے سے عبرت مقصود ہے، نہ کہ ترتیب، کیونکہ سورۃ الانبیاء وغیرہ میں کسی ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم

سوچنے کا مقام ہے، عجیب وغریب انداز میں ان دنیوی حاقوں نے بڑی بڑی متمدن، ترقی یافتہ قوموں کا ایسا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا کہ ان کی اشدیت وقوت کا دعویٰ دھرے کا دھرا رہ گیا، آج بھی ان کے چند ایک کھنڈرات بطور یادگار باقی ہیں، جبکہ ان کی ہلاکت کو چھ ہزار سال کی مدت پوری ہونے والی ہے، یہ دنیوی حاقوں نے ان متمدن ترقی یافتہ قوموں کا کیسا بیڑا غرق کردیا؟ قومِ ثمود کی سترہ سو بستیاں صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئیں، آج چند ایک یادگار باقی ہیں، جبکہ ان کی ہلاکت کو چھ ہزار سال ہونے والے ہیں۔

قومِ عاد بہ نسبت ثمود کے زیادہ ترقی یافتہ تھی، انہوں نے اپنے بادشاہ کے لیے چالیس منزلہ قصر تعمیر کرایا، جس کی ہر منزل چالیس گز کی بلندی پر تھی، یہ اہرامِ مصر اسی وقت کے ہیں، ان کے بنانے والوں کی طاقت اور مہارت وفن کا اندازہ لگائیں کہ ایک ایک پتھر چھتر چھتر من وزنی ایک دوسرے کے اوپر چڑھا دیا گیا ہے، اور ہر اہرام چار سوفٹ اونچا ہے، آج کی ترقی یافتہ دنیا اس جیسے اعجوبہ بنانے سے قاصر ہے، اہرام مصر کا شمار دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ پوری تفصیل سورۃ الفجر کی تفسیر میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿٩﴾

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿١٠﴾

ترجمہ: اور فرعون اور اس سے پہلی قومیں اور الٹی ہوئی بستیاں بڑے بڑے جرائم (اور قصوروں) کا ارتکاب کرتے ہوئے آئے ﴿٩﴾ چنانچہ ان مذکورہ لوگوں نے اپنے پروردگار کے ہر پیغمبر کی جوان کی طرف بھیجا گیا نافرمانی کی، آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کی سخت سے سخت گرفت کی ﴿١٠﴾

معارف ومنازل

﴿رَّابِيَة﴾ چڑھی ہوئی گرفت، جس طرح سیلاب اوپر چڑھتا ہے۔ فرعون مصر کے ہر بادشاہ کا لقب ہوتا ہے، اصل نام ولید بن مصعب بن الولید تھا، اُلوہیت کا مدعی تھا، بڑا خبیث، جابر اور ظالم تھا، اس کی ہلاکت کے قصے اور واقعات قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں تفصیلاً موجود ہیں، اس سے پہلے فرعون جو یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں تھا، اس کا نام ''ریان بن ولید'' تھا، وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا، اس وقت جو عزیز مصر گزرا ہے، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے، وہ بھی اسلام لائے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا وفادار رہے، اس کا نام اطفیر تھا۔ [ابن خلدون]

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین میں تھی، یہ متمدن اور شہری لوگ تھے، کچھ ان میں سے جنگل اور بن میں تھے، انہیں کو ''اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ'' کہتے ہیں۔ پیغمبر کی تکذیب اور پرزور مخالفت کی بالآخر ان پر چیخ اور چھنگاڑ کا عذاب آیا، جس کو سورۂ شعراء میں ﴿يَوْمُ الظُّلَّة﴾ کہا گیا ہے۔

اور **مُؤْتَفِكَات** وہی سدوم اور اس کی متعلقہ بستیاں ہیں جن کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام تھے، ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ ان تمام سدومی بستیوں کو الٹ دیا گیا۔ یہ لوگ الٹا کام کرتے تھے، اور آج ان کی بستیاں بحیرہ مردار کے قرب وجوار میں الٹی پڑی ہیں، یہ سب حاقہ دنیوی کے مناظر ہیں، جنہیں عبرت کی خاطر صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا، اور اصلی حاقہ جو حاقہ کبریٰ (قیامت) ہے، وہ ان کے سامنے ہے۔ ﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [النحل:١١٨] (ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا ہے، مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے)۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: جس وقت پانی حد سے اونچا ہوا ہم نے تم کو کشتی میں سوار کیا ﴿۱۱﴾ تا کہ اس واقعہ کو تمہارے لئے یادگار بنادیں، اور محفوظ رکھنے والے کان اس واقعہ کو محفوظ رکھیں ﴿۱۲﴾ (اور کانوں کے راستے سے دلوں میں اتار کر باری تعالیٰ کا شکر بجالائیں)۔

معارف ومنازل

جب نوح علیہ السلام نے مجبور ہو کر بد دعا کی تو طوفان آیا، آسمان وزمین دونوں نے غضبناک طوفانی پانی بہانا شروع کیا، اور پانی سطح زمین سے پہاڑوں پر چڑھنا اور حد سے اونچا ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ بڑے بڑے اونچے پہاڑوں سے اوپر ہوا، تو تمہارے آباء واجداد کے مؤمنین کو ہم نے کشتی میں سوار کردیا، اور غرق ہونے سے بچالیا، ساری دنیا غرق ہوگئی، صرف کشتی میں سوار بیاسی (۸۲) مرد عورتیں مسلمان محفوظ رہے، پھر انہی کی نسل سے انسان کی بقاء ہوئی اور دوبارہ زمین پر انسان آباد ہوا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں سام، حام اور یافث کی نسل اکنافِ عالم میں پھیل گئی، اب ساری انسانیت انہی کی نسل سے ہے، اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام کو ''ابوالبشر ثانی'' کہتے ہیں، پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ پوری تفصیل آئندہ سورۂ نوح میں آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: پھر جب صور میں ایک پھونک ماری جائے گی ﴿۱۳﴾ اور زمین اور پہاڑ اٹھا لئے جائیں گے، اور ایک ہی چوٹ میں دونوں چورا چورا (ریزہ ریزہ) کردیئے جائیں گے (یعنی باہم ٹکرا کر) ﴿۱۴﴾ تو اس روز وہ ہونے والی چیز (یعنی قیامت) واقع ہوجائے گی ﴿۱۵﴾ اور آسمان پھٹ جائے گا، اور وہ اس دن بالکل بودا اور کمزور ہوگا ﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

نفخ صور کے دو مرحلے ہیں: پہلا نفخ جمعہ کے دن ہوگا، حضرت اسرافیل علیہ السلام فرشتے کے ذریعہ صور پھونکا

جائے گا، اس میں جلالی تجلی کی ایسی پرزورقوت ہوگی کہ اس کے اثر سے موجودہ نظام عالم اور یہ محکم ومضبوط جہاں، آنکھوں کے اشارے میں نیست ونابود، درہم برہم اور گردوغبار کی طرح تباہ ہوجائے گا۔ درحقیقت یہ نفخہ اولیٰ حضرت باری تعالیٰ کے غیظ وغضب اور صفت "مُمیت" کا مظہر ہوگا۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی	☆	اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

دیکھیں! اس عظیم الشان جہاں کی پیدائش کس مقصد کے لیے وجود میں آئی؟ اور لاکھوں نعمتوں کی بلا قیمت بارش بندوں پر شب وروز برسائی گئی، وہ کونسی نعمت ہے جسے مفت میں بندوں کے پاؤں پر نچھاور نہیں کیا گیا؟ مگر یہ نالائق، ہلوع وجزوع، تنگدل اور ناعاقبت اندیش "خصیم مبین" نے ان عظیم نعمتوں اور ان کے حقیقی خالق ومالک کے ساتھ ٹانگ اڑائی، اور ہم جوابی ومخاصمت شروع کی۔ اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوکر عظیم منعمِ حقیقی کے حضور سجدہ کرنے سے انکاری ہوا، اور اس کی تمام تعلیمات سے منحرف ہوکر انبیاء ورُسل پر لعن طعن شروع کیا۔ آج اسے پتہ چلے گا کہ اس کا انجام کیسے اور کیا ہوگا؟۔

عقلمند انسان کسی کے ہاتھ سے ایک گلاس پانی پیتے ہیں، عمر بھر اس کے احسان پر شکر گزار رہتے ہیں۔ تم لوگوں کیلئے اللہ رب العزت نے کتنا بڑا جہاں پیدا فرمایا! اور اس کے ہر ہر ذرہ کو تمہاری خدمت پر مامور فرمایا۔ مجال نہیں! کہ چاند، سورج، آسمان، ستارے، ہوا اور بادل تمہاری خدمت سے منکر ومنحرف ہوں یا سستی کریں۔ انبیاء ورسل علیہم السلام اور ان کے شاگرد ہر علاقہ وہر زمانہ تمہیں سمجھانے کی خاطر کمربستہ رہے، افسوس ہے کہ ان تمام احسانات وانعامات کی قدردانی درکنار تم لوگوں نے الٹا ناشکری، بغض وعناد اور استہزاء علی الحق شروع کیا۔ آج تمہیں پتہ چلے گا کہ جس لکڑی کے گھوڑے پر تم سوار تھے یہ تمہیں کہاں اور کس جگہ پہنچائے گی؟ دراصل قیامت کو جلدی میں لانے والے تم ہی تو ہو، اب چکھو اپنے کرتوت اور اعمالِ بد کی سزائیں۔

یاد رہے کہ قیامت کافروں اور بُرے لوگوں پر قائم ہوجائے گی، اور مؤمن فرمانبردار، ریح طیبہ کے ذریعہ پہلے وفات پائیں گے، اور قرآن مجید اور مساجد پہلے اوپر اٹھالئے جائیں گے۔ بیہقی میں بروایت مقاتل منقول ہے کہ صورِ اسرافیل کے دائرہ کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔

نفخہ ثانیہ: قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ﴾ [الزمر: ۶۸] (پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہوکر دیکھنے لگیں گے)۔ امام طبرانیؒ نے سند حسن کے ساتھ

حضرت مقدامؓ سے نقل کیا ہے کہ چھوٹے بچے سے بوڑھے تک سب زندہ ہو جائیں گے، اور باقی جو بچہ قبل از وقت گر گیا ہو تو اگر اس کے اعضا تام ہو گئے تھے اور روح پھونکی گئی تھی تو وہ زندہ کیا جائے گا، ورنہ نہیں۔ سب کی عمر ۳۳ سال کی ہو گی (یہ نفخہ ثانیہ مظہر ہو گا حضرت باری تعالیٰ کی صفت "محي" کا)۔ دونوں نفخوں میں چالیس سال کا وقفہ ہو گا۔ [بخاري]

﴿وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۶۹] (اور زمین جگمگا اٹھے گی اپنے ربّ کے نور سے، اور رکھی جائے گی کتاب، اور لائے جائیں گے انبیاء اور شہداء اور لوگوں میں سچا فیصلہ فرما دیا جائے گا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔ یہ موجودہ دنیا جس پر اربوں انسانوں نے سب کچھ لٹایا اور قربان کیا کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ کبھی اس کا بستر گول ہو گا۔ وہ صبح وشام اس کی عیش وعشرت اور نیرنگیوں میں مست رہتے تھے، بس دیکھا آپ نے "كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ" میں جہاں یہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہوا، جس کی جگہ ایک اور دائمی، ابدی اور حقیقی جہاں وجود میں آیا، جہاں چاند، سورج اور کہکشاؤں کا ہلچل نہیں، وہ ہمیشہ روشن وتابان رہے گا، ربّ العزّت کے نور وانوار اور ابدی برکتوں کے ساتھ اب حساب وکتاب کا مرحلہ ہو گا۔

سب سے پہلے اسی صور والے حضرت اسرافیل علیہ السلام سے پوچھا جائے گا، جنہوں نے وحی الٰہی کو تقسیم کیا تھا، وہ یہ کہیں گے: میں نے وحی جبرئیل علیہ السلام کے سپرد کی تھی، جبرئیل علیہ السلام جواب دیں گے: میں نے پیغمبروں کو پہنچائی تھی۔ انبیاء علیہم السلام جواب دیں گے کہ ہم نے یہ بارِ امانت انسانوں تک پہنچایا، اب انسانوں کی باری آئے گی، تو یہی ﴿قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ﴾ کا مرحلہ ہو گا، اسی پر دائمی نجات اور ابدی تباہی کا فیصلہ ہو گا، تو عذر گنہ را چہ داری بیا۔

شہداء سے مراد گواہ، فرشتے، نیک لوگ اور حق پہنچانے والے علماء ہیں۔ پھر ہر شخص کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور کان یہ سب گواہی دیں گے۔ ایک دیہاتی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! صور کیا ہے؟ فرمایا: یہ سینگ کی مانند ایک طرف سے باریک اور دوسری طرف سے کشادہ ہے، اور فرشتے نے منہ میں پکڑ رکھا ہے، اور سر جھکائے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کا منتظر ہے، جب حکم ہو گا صور پھونک دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ صور ایک قرن، یعنی نرسنگے کا نام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصور قرن ينفخ فيه۔ [أحمد، ترمذي، أبو داؤد، نسائي، دارمي]

وَّالۡمَلَكُ عَلٰۤى اَرۡجَآئِهَا ؕ وَيَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور فرشتے اس کے (آسمان کے) اطراف پر ہوں گے اور اٹھائیں گے تیرے ربّ کے عرش کو ان کے اوپر اس دن آٹھ فرشتے ﴿۱۷﴾

معارف ومنازل

فرشتوں کا مستقر ساتوں آسمان ہیں، یہ آسماں کچا کچ فرشتوں سے بھرے ہوئے ہیں، جب آسمانوں کا درمیان سے پھٹنا شروع ہوجائے گا تو فرشتے آسمانوں کے کناروں پر آجائیں گے، اور جب کنارے فنا ہوجائیں گے تو فرشتے بھی فنا ہوجائیں گے، ان پر موت طاری ہوجائے گی، کیونکہ تمام مخلوقات فنا کی زد میں ہوں گی، صرف چار مقرّب فرشتے رہ جائیں گے، بعد میں یکے بعد دیگرے وہ بھی موت کا شکار ہوجائیں گے، وہ نورانی فرشتے جو آج اپنے قیام، رکوع اور سجدے سے آسمانوں کے چپہ چپہ کو مزیّن کئے ہوئے ہیں، جب آسمان کا نظام درہم برہم ہوجائے گا تو صفیں باندھ کر آسمانوں کے کنارے پر کھڑے ہوجائیں گے، اور پھر فنا ہوجائیں گے، تو ایک سناٹا اور خاموشی کا منظر ہوگا۔

قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿ كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ ﴾ [الرحمٰن: ۲۷] (ساری مخلوق جو زمین میں پر فنا ہونے والی ہے، اور باقی رہے گی تمہارے ربّ کی ذات عظمت اور بزرگی والی)۔ تب ربّ العزّت کی طرف سے اعلان ہوگا: أنا الملک أنا الديان أين ملوک الأرض؟ (میں بادشاہ ہوں، میں بدلہ دینے والا ہوں، کہاں گئے دنیا کے مجازی بادشاہ؟) سب بیچارے نیست ونابود ہوکر ختم ہوگئے، صرف اور صرف بادشاہی سلطنت اللہ ربّ العزّت کے لیے ہے، جو کہ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ اس وقت حاملینِ عرش چار فرشتے ہیں، جب قیامت واقع ہوگی اس وقت ان کی تعداد آٹھ ہوجائے گی، ان فرشتوں کے متعلق بہت ساری باتیں احادیث میں وارد ہیں، یہ فرشتے نہایت بڑے اور طاقتور ہیں، جنہوں نے عرش معلّٰی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ ابن ابی حاتم، ابوداؤد اور دوسری روایات میں ہے کہ ان فرشتوں کے جسم کی کلائی ایسی ہے کہ کان کی لو سے کندھے تک سات سو سال کی مسافت ہے، ان فرشتوں کی جسامت ساتوں آسمانوں زمینوں سے زیادہ بڑی ہے۔ [مظهري]

اللہ رب العرش الکریم جل شانہ کی حکمتوں کا ادراک انسانی عقل وفہم سے بالاتر ہے، آسمانوں کو فرشتوں کے کندھوں پر نہیں رکھا، جبکہ عرش معلیٰ کو فرشتوں کے کندھوں پر رکھا، قرآن کریم میں عرش مجید، عرش کریم، عرش عظیم تینوں صفات عرش کے لیے وارد ہوئی ہیں، جبکہ تمام کائنات اس کے سامنے اتنی حقیر معمولی ہے جیسے کسی بڑے میدان کے بیچ میں ایک معمولی انگشتری حاملین عرش۔

ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی طویل روایت میں ہے کہ ساتوں آسمان پر ایک سمندر ہے، جس کے نیچے اور اوپر کی سطح کا فاصلہ اتنا ہے جتنا ایک آسماں سے دوسرے آسماں کا فاصلہ ہے، پھر اس سمندر کے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں، جن کے کھروں اور کولھوں کے درمیان کا فاصلہ دو آسمانوں کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہے، ان کے اوپر عرش معلیٰ ہے، جس کے اعلیٰ واسفل کا فاصلہ بھی دو آسمانوں کی درمیانی مسافت کے برابر ہے، اس کے اوپر ربّ العزّت کا خاص جلوہ ہے۔

علامہ بغویؒ نے بیان کیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ عرش معلیٰ کو آٹھانے والے فرشتے اب تو چار ہیں، قیامت کے دن ان کی مدد کے لیے ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ چار اور مقرر فرمائیں گے، ان فرشتوں کی شکل بکروں جیسی ہے، یاد رہے کہ فرشتوں کی شکل وصورت حلال، پاکیزہ، مختلف حیوانوں کی طرح ہیں، وہ سارے ہماری طرح ایک شکل میں نہیں ہیں، پوری تفصیل "الحبائک في أخبار الملائک" میں موجود ہے۔[سیوطیؒ]

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک کی صورت مرد کی، دوسرے کی شیر کی، تیسرے کی بیل کی، چوتھے کی گدھ کی ہے۔(ممکن ہے کہ صورت کے علاوہ باقی بدن بکروں جیسا ہو)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: قیامت کے دن عرش الٰہی کو فرشتوں کی آٹھ جماعتوں نے اٹھایا ہوگا، جن کی گنتی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [المدثر: ۳۱] (اور تیرے ربّ کے لشکر کو کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے)۔

عرش کیا ہے؟ کس طرح ہے؟ کس صورت ونوعیت کا ہے؟ کس چیز سے اس کی تخلیق ہوئی ہے؟ اس پر تجلیاتِ الٰہیہ کی نوعیت وکیفیت کس قسم کی ہیں؟ سبحان اللہ! یہ سارے امور انسانی عقل وادراک سے وراء الوراء ہیں، صرف ایمان لانا، تسلیم کرنا اور راضی رہنا ہمارا وظیفہ ہے، تحقیق کرنا، بحث ومباحثہ ممنوع اور حرام ہے۔ یہی طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ متشابہات پر بغیر چوں وچرا ایمان لانا فرض ہے، مزید کچھ نہیں، بس یہ کہو: واللہ أعلم وعلمه

أتم وأعم۔ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [الحدید: ۳] (وہ اول ہے، اور آخر ہے، اور ظاہر ہے، اور باطن ہے، اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے)۔

﴿يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝۱۸ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ
اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝۱۹ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝۲۰ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۲۱ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۲۲
قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝۲۳ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝۲۴﴾

ترجمہ: اس دن تم پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی خفیہ سے خفیہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی ۝۱۸ پھر جس شخص کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ لوگوں سے کہے گا: لو ذرا میرا یہ نامۂ اعمال تو پڑھ لو ۝۱۹ مجھ کو اس بات کا یقین تھا کہ مجھے میرا حساب پیش آنا ہے ۝۲۰ غرض وہ پسندیدہ زندگی گزارتا ہوگا ۝۲۱ یہ پسندیدہ زندگی بہشت برین میں ہوگی ۝۲۲ اس بہشت کے میوے جھکے ہوئے نزدیک ہوں گے ۝۲۳ جو اعمال تم گزشتہ زمانے میں بامید صلہ بھیج چکے ہو اس کے صلے میں خوب مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو ۝۲۴

معارف ومنازل

نفخۂ ثانیہ کے بعد جب دوبارہ زندگی ہوگی یہی اصلی زندگی بھی ہے اور پہلی زندگی کا ثمرہ ونتیجہ بھی، اب یہ مرحلہ بڑا سخت ہوگا، انبیاء، شہداء، گواہ، اعمال کی پیشی، عدالت ربانی، حساب کتاب، نامۂ اعمال، پل صراط، ان سب مراحل سے گزرنا ہے، یہ وہ منظر ہوگا کہ بے شمار مؤمنین کے لیے پیغامِ مسرت ومبارک باد ہوگا، اور کھربوں انسانوں، بدبختوں کے لیے بے انتہاء تباہ کن اور پیغامِ حزن وملال ہوگا، یہ پیشی اصحاب الیمین واصحاب الشمال دونوں کے لیے ہوگی۔

جنت ودوزخ کا فیصلہ سلامت وملامت کی نشاندہی اعمال نامے سیدھے ہاتھوں یا الٹے ہاتھوں دیئے جانے سے ہوگا، اور کچھ کہنے والے یہ کہیں گے: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ [الکہف: ۴۹] (کہیں گے: ہائے خرابی! ہماری اس نوشتہ کو کیا ہوا؟ نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا جسے گھیر لیا ہو، اور اپنا سب کیا ہوا انہوں نے سامنے پایا، اور تمہارا ربّ کسی پر ظلم نہیں کرتا)۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:

۸] (تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا)۔

آج ذرہ ذرہ، ہر اشارہ، ہر ارادہ کا حساب ہوگا، کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہے گا، جنہوں نے توحید کا اقرار کیا، عبادات وطاعات اختیار کئے، وحی الٰہی کو حرزِ جاں بنایا، پھونک پھونک کر قدم رکھے، یومِ حساب پر یقین کیا اور اس کے لئے تیاری کی، ربّ العزّت سبحانہ کے حضور پیشی سے پہلے پیشی کی تیاری کی، انہیں ان کے نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں ملیں گے، یہی بہشت بریں کی نشانی ہوگی۔ فرطِ مسرت سے نامۂ عمل کو اٹھا کر دوسروں کو دکھائے گا اور کہتا رہے گا:

مجھے دنیا کی زندگی میں اس پر یقین رہا، اسی یقین پر کاربند وعامل رہا، نافرمانیوں سے خوب بچا۔ دیکھو! آج میری قسمت کا کیسا اچھا نتیجہ سامنے آیا؟ پس وہ پسندیدہ زندگی میں رہے گا، اونچی اونچی، بلند وبالا جنتوں میں پہنچ جائے گا، فرشتے مبارکباد پیش کریں گے، سلام سلام کہتے جائیں گے، اور یہ کہتے جائیں گے: تم نے نماز پڑھی، گرمیوں میں روزے رکھے، بھوک و پیاس برداشت کی، آج اس کے صلے میں خوب عیش کرو، کھاؤ، پیو، جنتی میوے بالکل جھکے ہوئے سہل الحصول اور بکثرت تمہارے پاس رہیں گے، اور ایامِ خالیہ، یعنی گزرے ہوئے دنوں کا صلہ پھل، میوہ، جنتی شربت، وشراب، خوب پیو، ابدی عیش کی سعادت حاصل کرتے جاؤ۔ ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدۃ:۱۷] (یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے)۔

❁ ❁ ❁

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ﴿۲۶﴾
یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ
الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: پھر جس کسی کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا: اے کاش! میرا نامۂ اعمال مجھ کو دیا ہی نہ جاتا ﴿۲۵﴾ اور مجھ کو یہ خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے ﴿۲۶﴾ کیا اچھا ہوتا کہ وہ پہلی موت ہی آخری فیصلہ کرنے والی ہوتی (یعنی دوبارہ نہ اٹھنا ہوتا) ﴿۲۷﴾ میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا ﴿۲۸﴾ میری وجاہت (اور اقتدار) مجھ سے چھین لی گئی ﴿۲۹﴾ حکم ہوگا کہ اس مجرم کو پکڑو، اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو ﴿۳۰﴾ پھر اس کو جہنم میں داخل کرو ﴿۳۱﴾ پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے، اس کو جکڑ دو ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں منکرینِ دینِ الٰہی، یعنی اصحاب الشمال کے انجام کا بیان ہے، ان کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں یا پیچھے سے دے دیے جائیں گے، یہ بربادی اور تباہی کی علامت ہے، دنیا میں ان کے سارے اعمال الٹے تھے، اور حق سے منحرف رہے کماتدین تدان کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

پس یہ لوگ چیخنا پیٹنا شروع کریں گے، ہر ایک یہی کہے گا: ہائے میری کتاب! میرا لکھا میرے ہاتھ میں نہ دیا جاتا، اور میرے حساب کی مجھ کو خبر تک نہ ہوتی، اور دنیا میں جو موت آئی تھی بس وہی موت فیصلہ کن ہوتی، اور اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہ ہوتی، قصہ ہی ختم ہوتا! آج میرا مال مجھے کوئی کام نہ آیا، میری عزت وحکومت تباہ و برباد ہوگئی۔ اس کے ساتھ جہنم کے فرشتے "زبانیہ" کو حکم ہوگا: اس کو پکڑ لو اور اس کے دونوں ہاتھوں کو گلے کے ساتھ ملا کر جکڑ دو اور اس کو دوزخ میں داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں باندھ کر جکڑ دو جس کی پیمائش ستر گز ہو۔

قرآن حکیم ہر مقام پر جنت و دوزخ، ثواب وعقاب اور ترغیب و ترہیب کو ایک ساتھ بیان کر کے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جنتی انعامات کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور عقوبتوں سے اجتناب کرو، کیونکہ "تبشیر و انذار" کا حقیقی یہی انداز ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ﴾ [یونس: ۲۵] (اللہ دار السلام کی طرف بلاتا ہے)۔ ربّ العزت عزّ شانہٗ نہیں پسند کرتا کہ میرے بندے گمراہ اور مستوجبِ دوزخ بن جائیں، ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ [النساء: ۱۴۷] (اگر تم (خدا کے شکر گزار رہو اور (اس پر) ایمان لے آؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا)۔

اس کا کرم وعنایت اس کے غضب وقہر پر ہر وقت مقدم وآگے ہے، لیکن یہ بھی اس کا قانون نہیں کہ زبردستی کسی کو مسلمان بنایا جائے، ﴿فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکہف: ۲۹] (تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے)، ہر شخص بااختیار مکلف ہے، اس کی مرضی اسلام قبول کرے، یا اپنی مرضی سے کفر اور جہنم، زبردستی کسی پر نہیں۔ آگے دوزخیوں کے دوزخ میں جانے اور اصحاب الشمال وراندۂ درگاہ بننے کے اسباب ووجوہات کا بیان ہے، فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝۳۳ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳۴ فَلَيْسَ لَهُ

الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝٣٥ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝٣٦ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝٣٧

ترجمہ: کیونکہ یہ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان نہیں رکھتا تھا۝٣٣ اور محتاجوں کو کھانا کھلانے پر ترغیب نہیں دیتا تھا۝٣٤ سو نہ آج اس کا یہاں ہمدردی کرنے والا دوست ہے۝٣٥ اور نہ اس کو یہاں سوائے جہنمیوں کے زخموں کے خون و پیپ کے علاوہ اور کوئی خوراک میسر ہے۝٣٦ جس کھانے (خوراک) کو سوائے جہنمیوں کے اور کوئی نہیں کھاتا۝٣٧

معارف ومنازل

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ فرشتے اور جنتی جہنمیوں سے سوال کریں گے: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝٤٢﴾ [المدثر] (تمہیں کیا چیز جہنم لے آئی؟)، تو وہ جواب دیں گے: ﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝٤٣ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝٤٤ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝٤٥ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝٤٦ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝٤٧﴾ [المدثر] (وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے، اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی)۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣﴾ [الماعون] (بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی (بدبخت) ہے، جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کا اصلی سبب اور بنیاد ایمان ہے، دوسرے باقی اعمالِ صالحہ اور تمام حسنات اس کے معاون ہیں، اگر ایمان نہ ہو، تو سارے اعمال بے کار ہوں گے، اسی طرح دوزخ میں ابدی جانے کا اصلی سبب کفر و بے ایمانی ہے، اور معاصی اس کے معاون ہیں، اگر کسی کافر کے پاس معاصی نہ ہوں پھر بھی کفر کی وجہ سے وہ ابدی دوزخی ہوگا۔ گزشتہ آیتوں میں کفر کے ساتھ معاصی کا ذکر اسی وجہ سے ہے۔

جہنم کا عذاب:

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے عوفی کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ زنجیر کافر کے مقعد سے داخل کر کے ناک کے نتھوں میں سے نکال لی جائے گی، اس طرح اس کو زنجیر میں پرو دیا جائے گا تاکہ وہ پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ ابن ابی حاتم نے ابن جریر کے طریقہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بیان کیا ہے کہ زنجیر کافر

کے سرین سے داخل کی جائے گی اور منہ سے نکالی جائے گی۔ [مظهري]

حدیث میں آیا ہے کہ دوزخی کافر کی داڑھ کوہِ اُحد کے برابر، اور اس کی کھال کی موٹائی تین دن کی مسافت کی بمقدار ہوگی۔ [رواه مسلم مرفوعا، مظهري] اس زنجیر کے بارے قرآن حکیم نے ستر گز چوڑائی بتائی۔ نوف البکالی تابعی نے بتایا کہ زنجیر ستر ذراع کی ہوگی، اور ہر ذراع ستر ہاتھ کا اور ہر ہاتھ اتنا لمبا جتنا کہ میدانِ کوفہ سے مکہ تک۔ [مظهري] جب کافر کی داڑھ اُحد کے پہاڑ کے برابر ہو تو اس کا جسم ہزاروں پہاڑوں جتنا ہوگا، اور یہ بات عقل ونقل دونوں کے موافق ہے تاکہ شدت عذاب کا تقاضا پورا ہو۔

دوم اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ دونوں کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے کہ تمہیں بھر دوں گا (پر کروں گا) جنت کی بھرائی کی خاطر ایک نئی مخلوق پیدا فرمائیں گے، جنہوں نے کوئی عمل نہیں کیا، مفت بغیر عمل کے جنت میں رہیں گے، اسی سے خدائی وعدہ پورا ہو جائے گا، اور یہ عین رحمت ہے کہ بغیر عمل کسی مخلوق کو جنت میں داخل کیا جائے، اور جب دوزخ اپنی بھرائی کا مطالبہ کرے گی تو یہ رحمت الٰہی کے شایان شان نہیں کہ اس کی بھرائی کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کرے اور بغیر معاصی کے انہیں دوزخ میں ڈالے، پس وہ اپنا وعدہ اس طرح پورا فرمائیں گے کہ ایک ایک کافر کے بدن کو پہاڑوں جتنا موٹا کریں گے تاکہ جہنم کی بھرائی کا وعدہ بھی پورا ہو اور کسی پر ظلم بھی نہ ہو۔ [متفق عليه]

ابن ابی حاتم نے بطریق عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ غِسلِين دوزخیوں کا کچ لہو ہوگا۔ ضحاک اور ربیع کا قول ہے کہ غِسلِين ایک درخت ہوگا جس کو دوزخی کھائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے بطریق مجاہد بیان کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں کہ غِسلِين کیا چیز ہوگی، مگر میرا خیال ہے کہ غِسلِين ہی زقوم (تو ہر) کا درخت ہوگا۔ [مظهري] ان اقوال میں کسی قسم کا تعارض نہیں، مآل ایک ہے۔

فائدہ:

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جابجا مذکور ہے کہ مسکینوں کی خبرگیری کرو، ان کو کھلاؤ، پلاؤ، ان کی خیالداری پر لوگوں کو ترغیب دو، اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو، اللہ تعالیٰ کو قرض دو، خیر کے مصارف میں مال خرچ کرو، اور ایسے کام کرنے والوں کی تعریف وتحسین کے بڑے عجیب واقعات بیان ہوئے ہیں اور ان باتوں پر عمل نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین اور احکامِ الٰہی کا لب

لباب اور خلاصہ یہ بتایا گیا کہ حقوق اللہ وحقوق العباد کی پاسداری اور حفاظت ہی اصل دین الٰہی کا نام ہے، اور ان سے انحراف و پہلوتہی کفر ونفاق کی علامت ہے۔ [تفسیر کبیر]

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ: مجھے ان چیزوں کی قسم جنہیں تم دیکھتے ہو اور مشاہدہ کرتے ہو ﴿۳۸﴾ اور ان چیزوں کی بھی قسم جنہیں تم نہیں دیکھتے ہو ﴿۳۹﴾

معارف ومنازل

اول کی مثال وہ مظاہر واشیاء ہیں جن کا تعلق ذات وصفات خداوندی کے ساتھ ہے، جس کا نمونہ ومظہر یہ محکم ومنظم کائنات ہے جو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ دوم کی مثال وہ صفات وذوات ہیں جنہیں تم عقل وفہم اور نظر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے ہو۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اول سے مراد اجسام ہیں، دوم سے مراد ارواح، یا اول سے انسان، دوم سے ملائکہ وجنات، یا اول سے ظاہری نعمتیں، دوم سے باطنی نعمتیں، یا اول سے مراد وہ علم جسے اللہ تعالیٰ نے مخلوقات پر ظاہر فرمایا، اور دوم سے مراد وہ علم مراد ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، یا اول سے مراد دنیا اور دنیوی چیزیں، دوم سے مراد برزخ اور آخرت واخروی چیزیں۔

اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: بیشک یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامبر عزّت والے کا قول ہے ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

اس سے مراد حضرت جبریل امین اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہیں، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہستیوں کی صفت ہے، اور اس مبارک صفت کا انطباق دونوں پر صادق ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ

ترجمہ: یہ کسی شاعر کا قول نہیں۔

معارف ومنازل

جیسا کہ تم سمجھتے اور کہتے رہتے ہو، ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۝۳۰ ﴾ [الطور] (کیا کافر کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے؟ (اور) ہم اس کے حق میں زمانے کے حوادث کا انتظار کر رہے ہیں)۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ۝۴۱ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۝۴۲ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝۴۳

ترجمہ: مگر تم بہت ہی کم یقین کرتے ہو۝۴۱ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے، مگر تم بہت ہی کم غور وفکر سے کام لیتے ہو۝۴۲ یہ قرآن پروردگار عالم کی طرف سے بھیجا ہوا (نازل شدہ) ہے۝۴۳

معارف ومنازل

﴿ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ عالم شہادت کی ہزاروں چیزیں ﴿ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ عالم غیب کی بیشمار چیزیں جنہیں اکثر لوگ بغیر دیکھے کسی کے کہنے پر یا کسی تقلیدی نظریے پر مانتے ہیں، اسی طرح قیامت جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے، حساب وکتاب، جنت ودوزخ، ثواب وعقاب اور دیگر احوالِ قیامت پر یقین کرنا چاہئے، اس لئے کہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ساری باتیں تمہارے سامنے بیان کی ہیں، اس کی چالیس سالہ زندگی تمہارے سامنے ہے، اور وہ سب سے سچا بھی ہے، مجنون نہیں، بڑے دانا، عقلمند اور ہشیار بھی ہے، شاعر بھی نہیں اور کہانت سے پاک بھی ہے، جو تمہارے سامنے ظاہر کر رہا ہے، یہ گزشتہ اقوام کی کہانی بھی نہیں، یہ عزّت والے امانتدار فرشتے کا لایا ہوا کلام ہے، جسے سارے جہانوں کے ربّ نے نازل کیا ہوا ہے، اور جو کچھ تمہارے سامنے بیان ہوا یہ کوئی شاعری نہیں، نہ کاہنوں کی اٹکل پچو باتیں ہیں، بلکہ یہ قرآن ہے، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کو آسمان سے ایک بزرگ فرشتہ لے کر بزرگ ترین پیغمبر پر اترا جو آسمان سے لایا، وہ اور جس نے زمین والوں کو پہنچایا، یہ دونوں رسول کریم ہیں۔ ایک کا

کریم ہونا تو تم آنکھوں سے دیکھتے ہو ﴿بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾ اور دوسرے کی کرامت و بزرگی پہلے کریم کے بیان سے ثابت ہے۔ ﴿وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾۔

عالم میں دو قسم کی چیزیں ہیں: ایک وہ جن کو آدمی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دوسری وہ جو آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، لیکن عقل و دانش اور بصیرتِ حقہ ان کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے، مثلاً: ہم کتنا ہی آنکھیں پھاڑ کر زمین کو دیکھیں، وہ چلتی ہوئی نظر نہیں آئے گی، لیکن حکماء کے دلائل و براہین سے عاجز ہو کر ہم اپنی آنکھ کو غلطی پر سمجھتے ہیں اور اپنی عقل کے یا دوسرے عقلاء کی عقل کے ذریعہ سے ان کی ان غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کر لیتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کی عقل بھی غلطیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ نہیں، آخر اس کی غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کی تلافی کس سے ہو؟ بس تمام عالم میں ایک وحی الٰہی کی قوت ہے جو خود غلطی سے محفوظ و معصوم رہتے ہوئے تمام عقلی قوتوں کی اصلاح و تکمیل کر سکتی ہے۔

جس طرح حواسِ خمسہ جہاں پہنچ کر عاجز ہوتے ہیں وہاں عقل کام دیتی ہے، ایسے ہی جس میدان میں عقلِ مجرد کام نہیں دیتی یا ٹھوکریں کھاتی ہے اس جگہ وحی الٰہی اس کی دستگیری کر کے ان بلند حقائق سے روشناس کرتی ہے۔ شاید اسی لئے یہاں ﴿بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾ کی قسم کھائی، یعنی جو حقائق جنت و دوزخ وغیرہ کی پہلی آیت میں بیان ہوئی ہیں، اگر دائرۂ محسوسات سے بلند تر ہونے کی وجہ سے تمہاری سمجھ میں نہ آئیں تو اشیاء میں مبصرات و غیر مبصرات یا بالفاظ دیگر محسوسات و غیر محسوسات کی تقسیم سے سمجھ لو کہ یہ رسول کریم کا کلام ہے، جو بذریعہ وحی الٰہی دائرۂ حس و عقل سے بالاتر حقائق کی خبر دیتا ہے، جب ہم بہت سی غیر محسوس بلکہ مخالف حس چیزوں کو اپنی عقل یا دوسروں کی تقلید سے مان لیتے ہیں تو بعض بہت اونچی چیزوں کو رسول کریم کے کہنے سے ماننے میں کیا اشکال ہے؟ [تفسير عثماني]

وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ﴿۴۵﴾
ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡهُ حٰجِزِيۡنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: اور اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ کوئی غلط بات گھڑ کر لگاتا ﴿۴۴﴾ تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑتے ﴿۴۵﴾ اور ہم اس

کے دل کی رگ کاٹ ڈالتے (یعنی گردن مارتے) ﴿۴۶﴾ پھر تم میں سے کوئی بھی اس کو قتل کی سزا سے روکنے والا نہ ہوتا ﴿۴۷﴾

معارف ومنازل

اگر یہ رسول معاذ اللہ ہماری طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے اور ہم پر افتراء پردازی کرتے تو کیا ہم یوں ہی دیکھتے رہتے اور ان کو ڈھیل دیدیتے کہ خلق خدا کو گمراہ کریں؟ یہ بات کوئی عقل والا باور نہیں کرسکتا، اس لئے آیت کریمہ میں بطورِ فرض ومحال کے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ رسول کوئی قول بھی اپنی طرف سے گھڑ کر ہماری طرف منسوب کرتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ کر ان کی رگ جان (حیات) کاٹ ڈالتے، اور پھر ہماری سزا سے ان کو کوئی بھی نہ بچا سکتا۔

یہاں یہ شدّت کے الفاظ ان جاہلوں کو سنانے کے لیے فرض ومحال کے طور پر استعمال فرمائے ہیں۔ داہنا ہاتھ پکڑنے کی تخصیص غالباً اس لئے ہے کہ جب کسی مجرم کو قتل کیا جاتا ہے تو قتل کرنے والا اس کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے، قتل کرنے والے کے بائیں ہاتھ کے مقابل مقتول کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے، اس کو یہ قتل کرنے والا اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ سے اس پر حملہ کرکے تلوار چلا کر اس کی جان لے لیتا ہے۔ یہ ایک فرض محال کی بات ہے جس سے منکرین توحید ورسالت کو سمجھانا مقصود ہے، فقط۔

مقام ومنصب نبوت ورسالت:

نبوت کا منصب ومقام بڑا عالی اور نہایت اونچا ہوتا ہے، اور اس کے انتخاب کسی جمہورت یا عوام الناس کی رائے پر مبنی نہیں ہوتا، قولہ تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] (اللہ خوب جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے)۔ وقولہ تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] (خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی)۔

اللہ جل شانہ وعزّ سبحانہ اپنے علم کلّی ذاتی کے تحت جس شخصیت کو اس پاکیزہ اونچے مرتبہ ومقام (نبوت) کے لیے انتخاب کرتا ہے وہ ہر اعتبار سے صحیح اور برحق ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی کمی، عیب اور نقص پیدا ہونے کا آئندہ بلکہ ہمیشہ کے لیے کوئی امکان نہیں ہوتا۔ نبی کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے اس کے انتخاب کا فیصلہ صادر ہوتا ہے، پھر پیدائش سے لے کر وفات تک مسلسل اس کی سرپرستی اور نگرانی خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ فرماتے رہتے ہیں، اور نبی

کی ذات ہر قسم معاصی اور خطاؤں سے محفوظ ومعصوم رہتی ہے، مجال نہیں کہ پیغمبر ربّ العزت عزّ سبحانہ کی منشا اور احکامات کے خلاف کوئی ادنیٰ غلطی کا ارتکاب کرے، یا کسی شرعی حکم کو نظر انداز کرے۔

گزشتہ آیتوں میں انہی باتوں کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم خالص ربّ العلمین کا کلام اور نازل کردہ کتاب ہے، نہایت پاکیزہ وبے عیب ہے، یہ کسی شاعر اور کاہن کا کلام نہیں، یہ کوئی جادو اور محض قصہ اور کہانی والا کلام نہیں، اس کا اتارنے والا خود ربّ العلمین ہے، لانے والا اور جس برگزیدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا دونوں عزّت و شرافت، دیانت وامانت والے ہیں، ایسا باکمال وباعظمت کتاب کا لانے والا بھی باکمال ہوتا ہے، اور جس پر نازل ہوا وہ نہایت باکمال، عقلمند وفرزانہ ہی ہوتا ہے کہ اپنے ربّ عزّ مجدہٗ کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، اور اپنی کہی ہوئی بات کو کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہیں کرتا، کیونکہ وہ عقلمند وفرزانہ ہے، اور حکیم ودانا بھی ہے، پھر مجسم صادق وامین بھی ہے۔

ان سب صفات کے ساتھ وہ یہ جانتا بھی ہے کہ اس طرح کہنے والے پر فوراً اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا، اور وہ پکڑا جائے گا، اور اس کی نبوت داغدار ہوکر معاذ اللہ وہ ہلاک ہوجائے گا، اور اس کی نبوت سے خلق خدا کا اعتماد اٹھ جائے گا، اور بہت سے نقصانات پیدا ہوں گے۔

قرآن کریم نے ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ﴾ سے اس نکتے کی وضاحت فرمائی کہ فرض کرو، العیاذ باللہ، اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ربّ کی منشا کے خلاف کوئی منگھڑت (بے بنیاد) بات گھڑلے اور اس کی نسبت اللہ عزّ سبحانہ کی طرف کردے تو فوراً قوت وقدرت اور مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑا جائے گا، اور اس کے شہرگ ودل کی خصوصی رگ کاٹ کر اسے ہلاک کیا جائے گا۔

یہاں نحوی قاعدہ کے مطابق انتفاءِ ثانی بہ سبب انتفاءِ اول کے تحت یہ مطلب ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں پکڑے گئے اور ہلاکت وقطعِ حیات بھی نہیں ہوئی، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صادق وامین ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی اپنے ربّ کے منشا کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا اور نہیں کہیں گے، "فانتفاء لأخذنا منه باليمين بسبب انتفاء تقول علينا بعض الأقاويل، فظهر صدق الرسول صلى الله عليه وسلم وصداقة القرآن وأمانة جبريل عليه السلام فكمل الوحي بجميع الجهات"۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت وامانت جبریل علیہ السلام کی صداقت وامانت اور قرآن حکیم کی حقانیت سب پر حجت قائم ہوگئی۔ البتہ! یہ تنبیہ قیامت تک برقرار ہے، جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

نبوت اور قرآن کریم دنیا میں برقرار رہیں گے۔

سوال: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عزّ مجدہٗ پر افتراء اور جھوٹ بولنے سے فوراً پکڑ اور ہلاکت کا واقع ہونا ضروری ہے، حالانکہ مدّعیانِ نبوت بہت سارے مکّار اور جھوٹے دجال، جیسے غلام قادیانی ملعون، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی اور دیگر بہت سے خبیث لوگوں نے خوب جھوٹ بولے اور افتراء علی اللہ کے مرتکب ہوئے، اس کے باوجود وہ نہ پکڑے گئے اور نہ ہلاک ہوئے۔

جواب: ﴿وَلَوۡ تَقَوَّلَ﴾ کے سیاق وسباق دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص وعید کوئی عام قاعدہ کلیہ کے طور پر نہیں، یہ ایک خاص بات ہے، جس کا مطلب تخصیص ہے نہ کہ تعمیم، اور یہ حکم ہر مدّعی نبوت کاذبہ کے لئے نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ﴿لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ﴾ کا تعلق نبوت صادقہ کے ساتھ ہے، کسی جھوٹی نبوت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں، کیونکہ سچا مدّعی نبوت صاحب الوحی والمعجزات سے کوئی منگھڑت اور بے بنیاد بات۔ العیاذ باللہ۔ بالفرض اگر صادر ہو تو اس میں دو قسم کے نقصانات ہوتے ہیں: اول یہ کہ اس قسم کی باتیں شان ومنصب نبوت کے منافی ہیں۔ دوم یہ کہ اس قسم کی باتوں سے امت کے اندر شکوک وشبہات پیدا ہوں گے، اور نبوت پر سے مسلمانوں کے اعتماد کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے، جبکہ جھوٹی، دجالی نبوت میں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں، نہ ان کی کوئی شان ومنصب امت میں موجود ہے، نہ ان کی باتوں پر کسی کو اعتماد ہے، اور نہ ہی کسی افراتفری کا خوف واندیشہ ہے۔

سارے مسلمان انہیں کاذب اور دجال سمجھ کر ان پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ شانہٗ انہیں مزید ڈھیل دے کر استدراج میں رکھتا ہے، ﴿وَاُمۡلِىۡ لَهُمۡ ‌ؕ اِنَّ كَيۡدِىۡ مَتِيۡنٌ﴾ [الأعراف: ۱۸۳] (اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں، میری تدبیر قوی ہے)۔ قانون کے تحت انہیں خوب مہلت دیتا ہے، جیسے کہ تمام کفار کے لیے اس کا ضابطہ وقانون مقرر ہے، جیسے کہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں اس مسئلے پر مکمل تفصیلی بیان گزر چکا، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

❁ ❁ ❁

وَاِنَّهٗ لَتَذۡكِرَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۴۸ وَاِنَّا لَنَعۡلَمُ اَنَّ مِنۡكُمۡ مُّكَذِّبِيۡنَ ۴۹ وَاِنَّهٗ لَحَسۡرَةٌ
عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۵۰ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الۡيَقِيۡنِ ۵۱ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ۵۲

ترجمہ: اور بلاشبہ یہ قرآن پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہی نصیحت ہے ۴۸ اور بلاشبہ ہم خوب جانتے ہیں

کہ تم میں سے بعض اس قرآن کی تکذیب کرنے والے بھی ہیں ﴿۴۹﴾ اور بلاشک یہ قرآن کافروں کے لیے موجب حسرت وندامت ہے ﴿۵۰﴾ اور بلاشک یہ قرآن بالکل حق (علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، یہ تینوں یقین کے مراتب ہیں، تفصیل سورۂ تکاثر میں آنے والی ہے، اِن شاء اللہ) اور یقینی ہے ﴿۵۱﴾ پس اے پیغمبر! آپ اپنے عظیم الشان ربّ کی پاکی بیان کیجیے ﴿۵۲﴾

معارف ومنازل

جاننا چاہیے کہ یہ مبارک کلام جسے ربّ العٰلمین نے نازل کیا اور یقین کرنے والے متقین کے لیے سراسر نصیحت وموجب یقین بنایا۔ البتہ! چند بدنصیب لوگ جانتے ہوئے محض عناد وہٹ دھرمی کی بنیاد پر اس کی تکذیب پر اتر آئے، سو وہ زمانہ چنداں دور نہیں جب حقیقتِ حال کشفِ ساق کی صورت میں کھل کر واضح ہوجائے گی، تو یہی منکرین ﴿يٰلَيْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ [الفرقان: ٢٧] (اور کہے گا) کہ اے کاش! میں نے پیغمبر کے ساتھ رشتہ اختیار کیا ہوتا) کہتے ہوئے حسرت وندامت کی وادی میں بہہ کر اپنے گریبان چاک کریں گے، اور منہ میں مٹی ڈال کر ﴿يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ [النبأ: ٤٠] (اے کاش میں مٹی ہوتا) کا رٹ لگائیں گے۔

آپ اس حق صداقت والی کتاب کی تبلیغ جاری رکھیے، مخالفین کی تکذیب ومخالفت سے نہ گھبرائیے، اور پریشان نہ ہوجائیے، حسنِ انجام اور بہتر عاقبت اور ہر فوز وفلاح آپ کی قدمبوسی کے لیے تیار ہوگی، اور آپ کا چراغ ہمیشہ روشن رہے گا، اس کی شکرگزاری میں اپنے عظیم الشان ربّ کی پاکی اور عظمت بیان کیجیے، اور تحدیثِ نعمت کے طور پر تسبیح وتحمید کا ورد جاری رکھیے، جو آپ کی شایان شاں ہے۔ ؎

اگر دنیا سراسر باد گیرد ☆ چراغ مقبلان ہرگز نمیرد

اگرچہ بت ہیں جماعت کے آستینوں میں ☆ مجھے ہے حکم اذان لا الٰہ الا اللہ

جب آیت: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ [الحآقة: ٥٢] (پاکی بیان کریں اپنے بڑے پروردگار کے نام کی) نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجعلوها في ركوعكم۔ اسے اپنے رکوع میں پڑھو، اور جب: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ [الأعلى: ١] (پاکی بیان کریں اپنے برتر پروردگار کے نام کی) کا نزول ہوا، تو فرمایا: اجعلوها في سجودكم۔ اسے اپنے سجدے میں داخل کرو۔ [أبو داؤد] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی

روایت میں ہے کہ تین مرتبہ تسبیح پڑھنے سے رکوع وسجدہ مکمل ہوجاتے ہیں، اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔نوافل میں اگر کوئی اس سے زائد پڑھ لے تو بہتر ہے، بیس تک یا اس سے زائد پڑھنے کی بھی اجازت ہے۔آنحضرت ﷺ نے رات کی نمازوں میں بہت لمبے رکوع وسجدہ کا معمول رکھا تھا، اور تسبیحات کے علاوہ سجدے میں لمبی لمبی دعائیں بھی مانگتے رہتے تھے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ فرائض کے سجدوں میں گیارہ مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

یادرہے کہ کثرتِ تسبیح اسی طرح تحمید وتکبیر پڑھنے سے رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، اور قلب کو سکون وراحت حاصل ہوتا ہے، ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد:٢٨] (آگاہ رہو! اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے)۔اور ذاکرین کا یہی شیوہ وعمل ہے۔

فائدہ:

جو شخص پابندی کے ساتھ فجر کی نماز کے بعد **سبحان اللہ العظیم وبحمدہ** سات مرتبہ پڑھے گا زندگی بھر فالج اور نابینائی سے محفوظ رہے گا۔[رواہ قبیصة بن عقبه مرفوعاً]۔[الکنز المکنون]

حدیث شریف میں آیا کہ جنت کے حصول کی خاطر یہ چار کلمات نہایت قیمتی اور مفید ہیں، معراج کی رات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت محمدیہ کو انہیں کلمات کے پڑھنے کو بطور تحفہ تلقین فرمایا، صلوٰۃ تسبیح جیسی بابرکت نماز میں انہی کلمات کو دہرایا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: "**سبحان اللہ والحمد للہ ولا إلٰہ إلا اللہ واللہ أکبر**"۔

سورۃ الحاقہ کی تفسیر مکمل ہوئی۔ **الحمد للہ والمنة**

سُوْرَۃُ الْمَعَارِجِ

مکیۃ آیاتھا ۴۴ رکوعاتھا ۲

سورۂ معارج مکی ہے، اس میں چوالیس (۴۴) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

سورت کا نام المعارج تیسری آیت میں اَلْمَعَارِجِ کا لفظ موجود ہے وہی سورت کا نام ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت چوالیس (۴۴) آیات، دوسوسولہ (۲۱۶) الفاظ اور آٹھ سو اکسٹھ (۸۶۱) حروف پر مشتمل ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۂ فاتحہ کے بعد ہے۔

ربط و مناسبت:

اس کے مضامین اکثر وبیشتر سابقہ سورۂ حاقہ سے ملتے جلتے ہیں، توحید، رسالت، قیامت، جنت، دوزخ، منکرین کے بے جا اعتراضات اور صبر وتحمل علی ایذاء المشرکین وغیرہ مضامین دونوں سورتوں کے مشترک مقاصد ہیں۔ معاندین کبھی قیامت کے آنے اور عذاب کی آمد کا بطور استہزاء جو مطالبہ کرتے رہتے تھے، جیسے: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [یونس: ۴۸] (اور یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو (عذاب کا) یہ وعدہ کب آئے گا؟) اور کبھی کہتے تھے: ﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾[الأنفال: ۳۲] (اور جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا کوئی اور تکلیف دینے والا عذاب بھیج)۔

اللہ تعالیٰ شانہ اپنے بندگان خاص انبیاء ورُسل علیہم السلام اور ان کے متبعین کو صبر جمیل اور عزم واستقامت کا پیغام دیتے رہتے ہیں، انہیں استقلال وہمت کی بلندی کی تلقین فرماتے رہتے ہیں، اور وقوعِ قیامت کے اٹل ہونے اوراس کی آمد کی خبر دیتے ہیں کہ قیامت ضرور آئے گی، اس کی آمد میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں، وہ اپنے اصلی وقت پر آئے گی، وہ کسی مطالبے کی ہرگز پابند نہیں، وغیرہ۔

مختصر موضوع:

اول یہ کہ اہل مکہ معظّمہ قیامت کے برپا ہونے کو ناممکن اور محال سمجھتے تھے، اور جب بار بار انہیں قیامت سے ڈرایا جاتا تو وہ ازراہِ استہزاء کہتے کہ عرصۂ دراز سے آپ نے ''قیامت آئے گی قیامت آئے گی'' کی رٹ لگا رکھی ہے، اسے لے کیوں نہیں آتے؟ تاکہ ہم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ قیامت کیسی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بیمار ذہنیت کی اصلاح فرما رہے ہیں کہ اہل مکہ! سنو، قیامت آئے گی، ضرور آئے گی، دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی، لیکن وقوعِ قیامت کوئی کھیل اور تماشہ نہیں کہ ادھر تم نے فرمائش کی اور ادھر وقوعِ قیامت کا عمل شروع ہوا، بلکہ یہ تو ایک بڑا ہولناک سانحہ ہوگا، آسمان پہاڑ پرزے پرزے ہوجائیں گے، اور ستاروں کی کشش ختم ہوکر آپس میں زوردار دھماکوں سے ٹکرائیں گے اور تباہ ہوجائیں گے۔ اس کی دہشت اور ہولناکی سے ہر شخص تھر تھر کانپ رہا ہوگا، دوست، بھائی، بیوی، بچے، ماں، باپ، سب فراموش ہوجائیں گے، ہر کسی کو اپنے نفس کی پڑی ہوگی، اس لئے تم ناداں اور بیوقوف نہ بنو، کیونکہ قیامت تمہارے کہنے پر نہیں آئے گی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے، جب وہ وقت آئے گا تو قیامت خود بخود برپا ہوجائے گی۔

دوم یہ کہ اسلامی نظامِ عبادات اور نظامِ اخلاق انسان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو جس حیرت انگیز طریقے سے دور کرتا ہے، اس کا اظہار فرمادیا، بتایا کہ انسان اپنی سرشت کے لحاظ سے بڑا بے صبر اور حریص ہے، جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بلبلا اٹھتا ہے، اور جب اسے نعمت دی جاتی ہے تو وہ کنجوس بن جاتا ہے۔ خود سوچئے! جس انسان میں یہ عیوب ہوں وہ قطعاً قابلِ احترام شئ نہیں، لیکن نماز، روز، زکوٰۃ، قیامت پر ایمان، عفت وعصمت، امانت و دیانت اور عہد کی پاسداری وغیرہ، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی تاثیر سے انسان کی خامیاں دور ہوجاتی ہیں، اور اس کے

تمام نقائص وکمزوریوں کی اصلاح ہوجاتی ہے، جو انسانیت کے دامن پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسے انسان میں انسانیت کا وہ عکسِ جمیل نظر آنے لگتا ہے جس کی وجہ سے یہ انسان مسجود ملائکہ بنا، اور اسے خلافتِ ارضی کے مسند پر متمکن کیا گیا۔

سوم یہ کہ پھر فرمایا کہ کفار کس بات پر فخر و ناز کرتے ہیں؟ ان کے اعمالِ بد کے باعث اگر ہم ان کو نیست و نابود کردیں تو دنیا غیر آباد نہیں ہوجائے گی، بلکہ ان کے قائم مقام ہم ایسے لوگ کھڑے کردیں گے جو اپنے ایمان اور حسنِ عمل سے عروس کائنات کے گیسوؤں کو سنوارنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے، آخر میں پھر وقوعِ قیامت کے یقینی ہونے کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی، تو فرمایا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سَاَلَ سَآٮِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ لَـيۡسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الۡمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾
تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ‌ ۚ﴿۴﴾

ترجمہ: مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے جو ضرور واقع ہونے والا ہے ﴿۱﴾ کافروں کے لیے ہے، کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں ہے ﴿۲﴾ اس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے ﴿۳﴾ ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے ﴿۴﴾

معارف ومنازل

باری تعالیٰ کی صفات غیر مشتقہ کے شروع میں کلمہ ذُوْ کا آنا لازمی ہوتا ہے، جیسے ذِی الْمَعَارِجِ، ذِی الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ، ذِی الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ، ذُو الْعَظَمَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ، ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ، ذُو الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، ذُو الرَّحْمَةِ وَالْمَغْفِرَةِ، وغیرہا۔ کلمہ ذُوْ بمعنی صاحب کے ہے۔ ''مَعَارِج'' کا مفرد معرج اور معرج ہے، بمعنی زینہ، سیڑھی، درجہ۔

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ﴾ سوال کبھی کسی چیز کی تحقیق کے لئے آتا ہے، اس کا صلہ ''عن'' آتا ہے، جیسے: سألت عنه، اور کبھی سوال بمعنی درخواست کے ہوتا ہے، اس وقت اس کا صلہ حرف ''با'' آتا ہے، بمعنی طلب کے، جیسے:

سألت به ، یہاں آیت کریمہ میں ﴿بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾ حرف ''با'' کے ساتھ ہے، بمعنی طلب کے، جیسے اکثر مفسرین حضرات نے یہاں سوال کو مانگنے اور مطالبہ کے معنی میں لیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نضر بن حارث بن کلال اور ابوجہل نے کہا تھا: ﴿اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۤءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الأنفال: ٣٢] (اے اللہ! اگر یہ واقعی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا پھر دردناک عذاب لے آ۔ [حاكم، نسائي]

یہ سائل نضر بن حارث ہو یا ابوجہل دونوں میدانِ بدر میں کام آئے اور عذاب جہنم میں گرفتار ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن کریم میں کفار و مشرکین مکہ کے اس مطالبہ کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، مثلاً یہ کہ: اگر عذاب برحق ہے تو وہ کیوں نہیں آتا؟ اگر قیامت برحق ہے تو وہ کب آئے گی؟ یا کیوں نہیں آتی؟ یا آپ جو وعدہ کرتے ہیں قیامت کے آنے پر وہ کب آئے گی؟ اس قسم کے مطالبے ہر وقت ہوتے رہے، تو جواب دیا جارہا ہے کہ عذاب آرہا ہے، وہ حتمی ہے یا دنیا یا آخرت میں ضرور آئے گا، عذاب ہو یا قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا وقت مقرر ہے، وہ اپنے وقت ہی پر ضرور آئے گا، کتاب تقدیر میں اس کے آنے کا جو وقت مقرر ہو چکا ہے اس سے پہلے نہیں آتا، اور وقت مقررہ پر آنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ ہی ٹال سکتا، ہم اس کا انتظار کرتے ہیں تم بھی انتظار کرو، جلد بازی نہ کرو صبر کرو۔

بعض مفسرین حضرات نے یہاں سوال کے معنی پوچھنے کے لئے ہیں، اس وقت آیت کا معنی یہ ہوگا کہ: ''پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جارہی ہے کس پر اور کس وقت واقع ہوگا؟'' اللہ تعالیٰ نے جواب ارشاد فرمایا: ''وہ کافروں پر واقع ہوگا، اور عنقریب واقع ہوگا، یا دنیا میں اور یا آخرت میں جو کہ دور نہیں بلکہ نزدیک ہے''۔ اس صورت میں سائل حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے عذاب کے واقع ہونے کا پوچھا ہو، اور مکہ کے مشرکین بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے از راہِ استہزاء و مذاق عذاب کا پوچھا ہو۔

پس جواب دونوں سوالوں کا آ گیا کہ عذاب واقع ہوگا کافروں پر، جسے نہ کوئی روک سکتا ہے، نہ ٹال سکتا ہے، وہ عذاب بعید نہیں بلکہ قریب ہے، جس کا بیان اگلی آیتوں میں آنے والا ہے۔

بعد و قرب سے مراد بعدِ زمانی و قربِ زمانی بھی ہو سکتا ہے اور امکانی بھی، یعنی جس چیز کو تم بعید از عقل غیر ممکن

سمجھتے ہو وہ فی الواقع ممکن اور یقینی ہے، لامحالہ واقع ہونے والی ہے، کیوں نہیں، جب یہ عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو کہ صاحب درجات وخالق مراتب ہے، پس اس کو کوئی نہ دفع کرسکتا ہے اور نہ ہی ٹال سکتا ہے۔

"مَعَارِج" آسمانی سیڑھیاں، جن پر فرشتہ چڑھ کر اوپر جاتے ہیں، اور ارواح مؤمنین واعمالِ صالحہ اوپر عروج کرتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ [الفاطر: ١٠] (اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتے ہیں)۔ اور یہ درجات اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ قاله سعيد بن جبير رحمہ اللہ۔ یا خود آسمان ہی درجات ہوں، قاله ابن مسعود رضی اللہ عنہ، أي ذي المعارج بمعنی مالك السموٰت والدرجات۔

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾ یعنی یہ اوپر نیچے تہ بہ تہ درجات پر چڑھتے ہیں فرشتہ اور روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام، یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔ رُوْح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: ١٩٣] (اسے روح الامین لے کر اترا، تمہارے دل پر)۔

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ [النبأ: ٣٨] (جس دن جبریل کھڑا ہوگا اور سب فرشتے پرا باندھے (صفیں بنائے) کوئی نہ بول سکے گا مگر جسے رحمٰن نے اجازت دی)۔

﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ﴾ [القدر: ۴] (اس میں فرشتے اور جبرئیل اترتے ہیں اپنے ربّ کے حکم سے ہر کام کے لیے، وہ سلامتی ہے صبح چمکنے تک)۔

﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے جس پر لفظ واقع دلالت کر رہا ہے، یعنی اس روز جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے ان پر عذاب واقع ہوگا، یعنی روز قیامت۔ امام بیہقیؒ نے باسناد عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول نقل کیا ہے۔ یمانؒ نے کہا: قیامت کے دن پچاس منزلیں ہوں گی، ہر منزل ہزار برس کی ہوگی۔

بخاری ومسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو خزانہ والا اپنے خزانہ (جمع کیے ہوئے سونے چاندی) کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں اس خزانہ کو تپا کر (پگھلا کر) سلیاں بنا کر اس کے دونوں پہلوؤں اور پیشانی پر داغ لگائے جائیں گے، یہ عذاب اس وقت تک جاری رہے گا تا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا اس روز جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی فیصلہ کردے، پھر اس کو جنت یا

دوزخ کا راستہ بتادیا جائے گا۔اسی طرح کا عذاب بھیڑ بکری اونٹ وغیرہ کے مالکان کو بھی ہوتا رہے گا۔[متفق علیہ]

احمد، ابویعلی، ابن حبان اور بیہقی نے اسنادِ حسن کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس روز کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہوگی کہ وہ دن کس قدر لمبا ہوگا؟ فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ دن مؤمن کے لئے ہلکا ہوگا، یہاں تک کہ دنیا میں جو فرض نماز پڑھتا تھا اتنے وقت سے بھی اس کے لئے آسان (یعنی کم ہوگا)۔[مظہری]

میں کہتا ہوں اس توجیہہ کی بناء پر دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا، ایک یہی آیت (جس میں پچاس ہزار برس کی مقدار بیان کی ہے) اور دوسری سورۂ سجدہ کی آیت، یعنی: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [السجدۃ:۵] (وہی آسمان سے زمین تک (کے) ہر کام کا انتظام کرتا ہے، پھر وہ اس کی طرف چڑھ جاتے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار برس ہوگی۔اس آیت میں ایک ہزار سال کی مقدار بیان کی ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف امور کے متعلق حکم دیتا ہے، اور جبریل علیہ السلام اس حکم کو لے کر آسمان سے زمین تک آتے ہیں، پھر دوبارہ چڑھ کر اللہ تعالیٰ تک جاتے ہیں۔

اس آمد ورفت میں دنیا کا ایک دن صرف ہوتا ہے، حالانکہ مقدارِ مسافت ایک ہزار برس کے برابر طے ہوجاتی ہے، کیونکہ آسمان سے زمین کی مسافت پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے، پانچ سو برس جانے کے اور پانچ سو برس آنے کے، یعنی آمدرفت کی اس مسافت کو اگر کوئی آدمی طے کرے تو ایک ہزار برس میں کرے گا، مگر فرشتے ایک دن، بلکہ اس سے بھی کم مدّت میں طے کرلیتے ہیں، (بلکہ مختصر لمحات میں بھی)، پس آیت: ﴿يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ کی تشریح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بسندِ ابوطلحہ بیہقی نے نقل کیا ہے کہ یہ دنیا میں ہوتا ہے، یعنی فرشتے ہزار برس کی مسافت ایک دن میں طے کرلیتے ہیں، اور آیت: ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ قیامت کا دن ہوگا، جس کو اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے پچاس ہزار برس کا کردے گا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ دونوں آیتوں میں قیامت کا دن ہی مراد ہے۔بعض کے لئے قیامت کا دن لمبا ہوگا، بعض کے لئے چھوٹا، یہاں تک کہ مؤمنوں کے لئے فرض نماز سے بھی زیادہ آسان (یعنی کم ہوگا)، اور یہ اضافی

معنیٰ کے اعتبار سے ہوگا، یعنی کمی بیشی۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوعاً اور موقوفاً بیان کی ہے کہ مؤمنوں کے لئے قیامت کا دن اتنا مختصر ہوگا جتنا کہ ظہر وعصر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس قول پر سورۂ سجدہ والی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک نظم احکام (روزانہ) مدت ایامِ دنیا تک کرتا رہے گا، پھر دنیا کے فنا ہونے اور ہر حاکم کا حکم اور ہر آمر کا امر ختم ہوجانے کے بعد ہر حکم اور نظم کا رجوع (براہ راست) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوجائے گا، اور قیامت کے دن کی مقدار ایک ہزار سال ہوگی۔

بعض لوگوں نے کہا کہ فِىْ يَوْمٍ دونوں آیتوں میں یعرج سے متعلق ہے، اس صورت میں دونوں آیتوں کا تعارض اس طرح دور کیا جائے گا کہ سورۂ تنزیل کی آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ آسمان سے زمین تک تدابیر امر ایک دن میں ہوتی ہے، حالانکہ یہ درمیانی سیر ایک ہزار برس کے برابر ہوتی ہے، پانچ سو برس نزول (فرشتوں) کے اور پانچ سو برس اوپر چڑھنے کے، اور اس صورت میں اس جگہ ساتویں زمین کی تہہ سے لے کر ساتوں آسمان کے اوپر تک جتنی مسافت ہوتی ہے اس کو طے کرنے کی مدت بیان کی ہے، یہ مسافت پچاس ہزار برس کی ہے۔

لیث رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ [بغوي] محمد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ اگر آدمی حسب معمول دنیا سے عرش تک جانا چاہے تو پچاس ہزار برس چلتے رہنا ہوگا۔ [مظهري]

فائدہ:

سابق بیان کی تائید اور مسافتوں اور اوقات کی کمی کے متعلق واقعۂ معراج ایک واضح حقیقت ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لمبا سفر مبارک نہایت مختصر وقت میں مکمل ہوگیا۔ اسی طرح مؤمنین کے لئے قیامت کی مدت جو پچاس ہزار سال ہے، اگر ایک نماز فرض کے برابر ہو تو اس پر کیا اشکال؟ اور یہی ابوسعید خدریؓ کی روایت کا مطلب ہے۔

فائدہ:

مسافتوں کو طے کرنے میں اور ایام میں کمی بیشی مثلاً چھوٹے اوقات اور مختصر ساعات کو طویل بنانا یا بڑی لمبی اور طویل مدتوں کو نہایت مختصر اوقات میں تبدیل کرنا، یہ سارا ممکنات میں شامل ہے، اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حکم کُنْ فَيَكُوْنُ کا حصہ ہیں، اس کی ذات پاک "سریع الحساب" کی صفت کے ساتھ موصوف ہیں، نصف یوم کی مقدار میں تمام مخلوقات کے حساب وکتاب کو روزِ قیامت مکمل انجام دیں گے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک نہایت مختصر وقت میں سفرِ معراج شریف کو انجام دیا، یہ سفر پورے ملک وملکوت کی سیر وسیاحت پر مشتمل ہے، جو منٹوں میں مکمل ہوا۔

اسی واقعہ سے ربّ العزّت سبحانہ کی مقادیرِ قدرت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پچاس ہزار سال کا عرصہ مؤمنون پر نہایت قلیل ہوگا، جب ہر زمین کا دَل پانچ سو سال مسافت کا ہے، اسی طرح ایک زمین سے دوسری زمین تک مسافت پانچ سو سال، علیٰ ہٰذا القیاس آسمانوں کا دَل اور ان کا درمیانی فاصلہ بھی اسی قدر سمجھنا چاہئے، تو زمینوں اور آسمانوں کا فاصلہ مجموعی چودہ ہزار سالہ مسافت ہوا، پھر ساتویں آسمان سے عرش معلّٰی تک بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے چھتیس ہزار سالہ مسافت ہے، تو یہ مجموعی پچاس ہزار سالہ مسافت ہوئی۔ [ابن کثیر]

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ﴿٥﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيدًا ﴿٦﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيبًا ﴿٧﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿٨﴾ وَ
تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿٩﴾ وَلَا يَسْئَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ﴿١٠﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ
عَذَابِ يَوْمِئِذٍ ۢ بِبَنِيْهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿١٣﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ
ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿١٤﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿١٦﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿١٨﴾

ترجمہ: پس اے پیغمبر! آپ صبر جمیل ہی پر قائم رہیں ﴿۵﴾ یہ لوگ اسے دور (غیر ممکن) سمجھتے ہیں ﴿۶﴾ اور ہم اسے قریب (ممکن الوقوع) دیکھ رہے ہیں ﴿۷﴾ جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا ﴿۸﴾ اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے ﴿۹﴾ اور کوئی جگری (خالص) دوست کو نہ پوچھے گا ﴿۱۰﴾ حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے، مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو ﴿۱۱﴾ اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو ﴿۱۲﴾ اپنے قریب خاندان کو، جو اسے پناہ دینے والا تھا ﴿۱۳﴾ اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دیدے، اور یہ تدبیر اسے نجات دلادے ﴿۱۴﴾ ہرگز نہیں، وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی ﴿۱۵﴾ جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی ﴿۱۶﴾ پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو جس نے پیٹھ دی اور منہ پھیرا ﴿۱۷﴾ اور مال جمع کیا اور سمیٹ سمیٹ کر رکھا ﴿۱۸﴾

معارف ومنازل

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان کی باتوں سے اور بے جا تہمتوں سے تنگدل نہ ہوں، اور

اضطراب وبیقراری نہ کریں، یہ آپ کی شان نہیں، آپ کا سینہ مبارک نہایت ہی وسیع ہے، آپ صبر جمیل اختیار فرمائیں، ایسا صبر کہ جس میں کوئی قلق و پریشانی نہ ہو، یعنی جزع فزع اور زبان مبارک پر حرف شکایت کا صدور نہ ہو۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ [الأحقاف:۳۵] (پس (اے محمد ﷺ) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح تم بھی صبر کرو، اور ان کے لئے (عذاب) جلدی نہ مانگو)۔

آپ سے پہلے برگزیدہ پیغمبروں علیہم السلام نے جس طرح صبر کیا آپ بھی ان کی طرح صبر اختیار فرمائیں اور عجلت نہ کریں، اس لئے کہ: ﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ [الطلاق:۳] (خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے)۔ اس طرح کی تسلی قرآن کریم نے جابجا ذکر کیا ہوا ہے، اور صابرین کے لیے عظیم الشان کامیابیوں کا وعدہ موجود ہے، اور یہ لوگ قیامت پر ایمان نہ ہونے کے سبب اس کے واقع ہونے کا شک اور انکار کرتے ہیں، اور اس کو بعید و غیر ممکن تصور کرتے ہیں، جبکہ وہ ایک فیصلہ کن اٹل یقینی امر ہے، ہم اس کو واقعی اور قریب ویقینی دیکھ رہے ہیں، اور وہ ایسے روز واقع ہو کر رہے گا جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، یا اس کا رنگ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا۔

سورۃ الرحمٰن میں ہے: ﴿فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ [الرحمن:۳۷] (جب آسمان پھٹے گا اس کی رنگت نری سرخ چمڑے کی طرح نظر آئے گی)۔ قال الحسن علیہ السلام تتلون الوانا۔ کبھی کالا، کبھی سرخ رنگ نظر آئے گا۔ [ابن کثیر] اور مختلف یعنی سرخ وسیاہ، سفید و زرد رنگ کے پہاڑ رنگ برنگ دھنے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ﴾ [القارعة:۵] (پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح اڑتے پھریں گے)۔ سورۂ فاطر میں پہاڑوں کے مختلف رنگوں کا تذکرہ اس طرح ہے: ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ﴾ [فاطر:۲۷] (آسمان سے مینہ برسایا، تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں، اور (بعض) کالے سیاہ ہیں)۔

اس روز کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ تم کیوں پریشان ہو؟ پوچھنا تو درکنار، اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا، ایک ایسا ''فاجعہ'' منظر ہو گا کہ ہر طرف نفسی نفسی کا میدان ہو گا، ﴿فَلَا

﴿ أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون:١٠١] (تو اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں نہیں ہوں گی، اور نہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے)۔ سارے رشتے ناطے دوستیاں کالعدم، ہر شخص اپنے غم میں ایسا مبتلا ہوگا جیسا کوئی شراب کے نشہ میں بے خودلت پت ہو۔ ﴿ وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ [الحج:٢] (تو لوگوں کو دیکھے گا جیسے نشہ میں ہیں، اور نشہ میں نہ ہوں گے، مگر ہے یہ کہ اللہ کی مار کڑی ہے)۔ باوجود اس کے کہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے کوئی کسی سے نہ دور ہوگا، نہ غائب، آمنے سامنے ہوتے ہوئے قطع تعلق کریں گے، بلکہ ایک دوسرے کے بدخواہ دشمن بن جائیں گے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الزخرف:٦٧] (اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن بنیں گے، سوائے پرہیزگاروں کے) مؤمن وہاں بدستور ایک دوسرے کی خیرخواہی کریں گے اور شفاعت کریں گے۔ وہاں نیک لوگ گناہگاروں کے لیے شفاعت کریں گے اور کہیں گے: یا ربّ! یہ ہمارے مسلمان بھائی تھے جنہوں نے ہمارے ساتھ روزہ رکھا، نماز پڑھی اور نیک اعمال کئے، آج انہیں آزاد فرما اور بخش دے، پس مغفرت کا فیصلہ ہوگا۔ [الحدیث]

﴿ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴾ (اس روز مجرم کا فر اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس روز کے عذاب سے خلاصی کے لئے اپنے بیٹوں کو، بیوی کو، بھائی کو، کنبہ وخاندان کو جس میں وہ رہتا تھا اور تمام اہل زمین انس وجن کو اپنے فدیہ میں دیدے اور اپنی جان چھڑا لے) لیکن یہ خواہش ہرگز پوری نہیں ہوگی، دیکھیں! کل تک جن لوگوں پر وہ جان دیتا تھا آج ان کو اپنے فائدے اور چھڑانے کے لئے عذاب کے سپرد کردینے کو تیار ہوگا، لیکن یہ ہرگز پورا نہ ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: اے ابن آدم! اگر ساری زمین سونے کی بھری ہوئی ہو تو کیا تم اس کا فدیہ دینے کے لئے تیار ہو؟ وہ عرض کرے گا کہ ہاں! تیار ہوں، ارشاد ہوگا: تم جھوٹے ہو، میں نے تم سے ایک مختصر چیز کا دنیا میں مطالبہ کیا تھا ﴿ اَلَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا ﴾ [الحج:٢٦] (میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ) مگر دنیا میں تو نے میری اتنی بات نہ مانی، اب سونے کی بھری ہوئی ساری دنیا فدیہ میں دینے کے لیے تیار ہو، تم جھوٹے ہو۔ [رواہ مسلم]

قرآن کریم نے یہ مضمون متعدد مقامات پر ذکر فرمایا، قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ

كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ﴾[آل عمران:۹۱](جو لوگ کافر ہوئے اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے، وہ اگر نجات حاصل کرنا چاہیں اور بدلے میں زمین بھر کر سونا دیں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔

قوله تعالىٰ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾[المائدة:۳۶]

قوله تعالىٰ: ﴿وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ﴾[یونس: ۵۴](اور اگر ہر ایک نافرمان شخص کے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں ہوں تو (عذاب سے بچنے کے) بدلے میں (سب) دے ڈالے)۔

وقوله تعالىٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ ﴾[الرعد](اور جنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اگر روئے زمین کے سب خزانے ان کے اختیار میں ہوں تو وہ سب کے سب اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور (نجات کے) بدلے میں صرف کر ڈالیں (مگر نجات کہاں؟) ایسے لوگوں کا حساب بھی برا ہوگا، اور ان کا ٹھکانا بھی دوزخ ہے)۔

وقوله تعالىٰ: ﴿وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ ﴾[الزمر](اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب (مال ومتاع) ہو جو زمین میں ہے، اور اس کے ساتھ اسی قدر اور ہو، تو قیامت کے روز بُرے عذاب (سے خلاصی پانے) کے بدلے میں دے دیں، اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائے گا جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا)۔

ان تمام آیات کا مطلب یہ واضح ہوا کہ فرض کرو کافر کے پاس اتنا مال ہو کہ جس سے زمین بھر دیا جائے اور اس کی مانند اور بھی، اگر وہ اپنی جان چھڑانے کے عوض یہ سب کچھ فدیہ دینا چاہے تو قبول نہیں ہوگا اور نجات کا راستہ مسدود ہو کر یہ فدیہ کارگر نہ ہوگا۔

﴿كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴾ (ہرگز نہیں، وہ تپتی ہوئی آگ

ہے، کھینچ لینے والی کلیجہ، پکارتی ہے اس کو جس نے دنیا میں حق سے پیٹھ پھیرلی اور طاعت سے بے رخی اختیار کرلی، اور دوسروں کا حق مار مار کر حرام مال جمع کیا، اور اٹھا اٹھا کر رکھا، نہ حقوق اللہ کا پاس رکھا اور نہ حقوق العباد کا، سب کو ضائع کیا، نہ عقائدِ حقہ کا خیال رکھا اور نہ اخلاقِ حسنہ پر متوجہ ہوا، بس ایک ہی فکر میں رہا کہ حق تعالیٰ سے بغاوت ہو، اور حبِ جاہ ومال میں مستغرق ہو، اور متاعِ دنیا میں منہمک ہو، اور آخرت سے بیگانہ ہو۔

﴿اِنَّهَا﴾ میں ھا ضمیر سے نار مراد ہے۔ ''لَظٰى'' جہنم کے دوم دَرک (درجہ) کا نام ہے، بمعنی بھڑکتی ہوئی، خالص شعلہ، جس میں دھواں نہ ہو، خالص آگ کا شعلہ ہو۔ ''شَوٰى'' آدمی کے اطراف، مثلاً: ہاتھ، پاؤں، یا انسان کا چمڑہ، دماغ کی کھال، کلیجہ نکالنے والی، دلوں پر اثر کرنے والی، ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ [الهمزة: ۷] (جو دلوں تک جا چڑھے گی)۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آگ ایسی تیز ہے کہ کھال کھینچ لیتی ہے، پھر یہ کہ وہ خود ایک ایک کافر اور منافق اور مال جمع کرنے والے کو پکار کر بلاتی ہے: ''إِلَيَّ يا كافر يا منافق يا فلان'' کہہ کر پکارتی ہے، اور ہر منکر کافر ومشرک کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیتی ہے جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔

کفار جو کہ اعمالِ سیئہ اور معاصی میں منہمک ہوتے ہیں اعمالِ سیئہ نے ان میں آگ کی خاصیت پیدا کردی ہے، اس لئے ''الجنس يميل إلى الجنس'' آگ کو آگ کھینچ لے گی۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس دن لوگ کثیر بے شمار تعداد میں ہونے کی وجہ سے ملے جلے اور مخلوط ہوں گے، دوزخ سے اونٹ کی گردن جیسی ایک گردن نمودار ہوگی اور جن لوگوں کو پکڑنا مقصود ہوگا انہیں چن چن کر پکڑے گی، جیسے کرین پکڑ کر اٹھاتی ہے، وہ کرین نما گردن دوسو سال کی مسافت تک لمبی ہوگی، اور مجرمین کو چن چن کر نکال لے گی اور انہیں اٹھا کر لے جائے گی۔

﴿تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى وَجَمَعَ فَاَوْعٰى﴾ کے ساتھ کفار کے بخل وحرص کی طرف اشارہ ہے، اول تو مال جمع کرتا ہے، اس میں کوئی احتیاط نہیں کرتا، اور پھر مال میں جو حقوقِ واجبہ ہیں ان کو پورا نہیں کرتا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو تلف کرتا ہے، محض حرص ولالچ میں مبتلا مال جمع کرتا رہتا ہے اور سمیٹ سمیٹ کر رکھتا ہے، ایسے لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ عذاب سے چھٹکارا پانے کے لئے سب کچھ فدیہ میں دے ڈالیں، خواہ وہ بیٹے ہوں، بیوی یا بھائی ہو، یا کنبے والے ہوں، بلکہ روئے زمین کے تمام لوگوں کو کسی طرح فدیہ میں دے ڈالیں، پھر یہ فدیہ اسے نجات دلا دے، لیکن یہ سارے جتن بے سود ثابت ہوں گے، اور جہنم اسے پکار پکار کر بلائے گی کہ آؤ! تمہارے عذاب کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے، آؤ! تیار ہو جاؤ! (نعوذ باللہ) پھر جس طرح پرندہ جانور دانہ چگتا ہے، اسی طرح میدانِ محشر میں سے

ایسے بدکار لوگوں کو ایک ایک کر کے چن لیتی ہے، اور انہیں اندر لے جاتی ہے۔ [ابن کثیر]

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِيْنَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٣٤﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٣٥﴾

ترجمہ: بیشک انسان اپنی جبلت میں جی کا کچا پیدا کیا گیا ہے ﴿١٩﴾ جب اسے تکلیف پہونچتی ہے تو بے صبرا ہوجاتا ہے ﴿٢٠﴾ اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل و بے توفیق ہوجاتا ہے ﴿٢١﴾ مگر ہاں! وہ نمازی ان باتوں سے مستثنیٰ ہیں ﴿٢٢﴾ جو اپنی نماز کی برابر پابندی کرتے ہیں ﴿٢٣﴾ اور وہ لوگ جن کے مالوں میں حق مقرر ہے ﴿٢٤﴾ مانگنے والے کا بھی اور مانگنے سے بچنے والے کا بھی حصہ ہے ﴿٢٥﴾ اور وہ جو قیامت کے دن کی تصدیق کرتے ہیں ﴿٢٦﴾ اور وہ جو اپنے ربّ کے عذاب سے ڈرتے ہیں ﴿٢٧﴾ بے شک ان کے ربّ کا عذاب بے فکر ہونے کی چیز نہیں ہے ﴿٢٨﴾ اور وہ لوگ جو اپنی شہوت کے مقامات کی حفاظت کرنے والے ہیں ﴿٢٩﴾ سوائے اپنی بیویوں کے یا جن کے مالک ہیں (لونڈیوں کے) تو ان پر کوئی الزام وملامت نہیں ﴿٣٠﴾ پس جو شخص ان کے علاوہ کوئی راستہ تلاش کرے تو یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ﴿٣١﴾ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرنے والے ہیں ﴿٣٢﴾ اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ٹھیک ادا کرنے والے ہیں ﴿٣٣﴾ اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں ﴿٣٤﴾ یہ لوگ سب کے سب باعزّت واحترام بہشتوں کے باغوں میں داخل ہوں گے ﴿٣٥﴾

معارف ومنازل

﴿هَلُوع﴾ کے لفظی معنی: حریص، بے حوصلہ، بے صبر، جزع فزع اور کم ہمت کے ہیں، یہ مبالغہ کا صیغہ

ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ **ھلوع** سے مراد وہ شخص ہے جو مال حرام کی حرص میں مبتلا ہو۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے بخیل آدمی مراد ہے۔ حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تنگدل اور بے صبر آدمی مراد ہے، اور یہ سب معانی متقارب ہیں، اور ''**ھلوع**'' کے مفہوم میں سب داخل ہیں، اور ''**ھلوع**'' کی تشریح خود قرآن حکیم کے الفاظ میں آ رہی ہے، اور یہ افعال اختیاریہ پر مشتمل ہے۔

﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا﴾ (جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے، اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے)، یعنی اس انسان کی کم ہمتی اور بے صبری وحرص کا یہ عالم ہے کہ جب اس کو کوئی تکلیف ومصیبت پیش آجاتی ہے تو صبر سے کام نہیں لیتا، جزع فزع اور واویلا شروع کرتا ہے، اور جب کوئی راحت وآرام، خوشی اور مال ودولت مل جاتا ہے تو اس میں بخل کرتا ہے۔ یہاں بے صبری اور جزع سے مراد وہ ہے جو حدودِ شرع سے باہر ہوں، اسی طرح بخل سے مراد فرائض وواجبات کی ادائے گی میں کوتاہی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر آدمی کو مال سے بھری ہوئی دو وادیاں مل جائیں تب بھی وہ تیسری کا طلبگار رہتا ہے، آدمی کے پیٹ کو مٹی (قبر کی مٹی) کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ [متفق علیه] حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے مگر دو چیزیں اس کی جوان ہوجاتی ہیں: مال کی حرص اور درازی عمر کی حرص۔ [متفق علیه] قرآن کریم نے بیان کیا: ﴿اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ [العادیات: ۸] (بلاشبہ انسان مال کی محبت میں بڑا حریص واقع ہوا ہے)۔ خلاصہ یہ ہے کہ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا﴾ میں الف لام جنس اور استغراق دونوں کے لئے ہے۔

﴿اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ﴾ وغیرہ اوصافِ ثمانیہ میں استثناء متصل ہے۔ قرآن کریم میں بکثرت علمی، عملی اور اخلاقی مواقع پر نوعِ انسانی کی عام فطری، جبلی اور اخلاقی نقائص اور کمزوریوں کے ذکر کے بعد ایمان لانے والے اور راہِ راست، حق وصداقت اختیار کرنے والے لوگوں کو اس قسم کی کمزوریوں اور بداعمالیوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور ان کی مدح وثناء اور تعریف پر مبنی احکام جاری ہوئے ہیں۔ ان مواقع میں سے چند مقامات یہ ہیں:

قوله تعالیٰ: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبیاء: ۳۷] (انسان (کچھ ایسا جلد باز ہے کہ گویا) جلد بازی ہی سے بنایا گیا ہے)۔

قوله تعالیٰ: ﴿ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴾[النساء:٢٨] (انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے)۔

قوله تعالیٰ: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُوراً﴾ [الإسراء:١٠٠] (اور انسان دل کا بہت تنگ ہے)۔

﴿وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولًا ﴾ [الأحزاب:٧٢] (اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا)۔

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴾[المعارج:١٩] (کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے)۔

﴿ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ السّٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [التين:٥] (پھر (رفتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا، مگر جو لوگ ایمان لائے)۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [العصر:٢] (بیشک انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے)۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب انسان کو پیدا ہی اس حال (جبلت) میں کیا گیا ہے، اور یہ عیوب ونقائص اس کی تخلیق میں رکھے ہوئے ہیں تو پھر اس کا کیا قصور ہوا؟ وہ مجرم کیوں قرار دیا گیا؟ وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد انسانی فطرت اور جبلت میں رکھی ہوئی استعداد اور بنیادی مادہ ہے، سو اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ہر خیر وصلاح کا مادہ اور اعلیٰ درجہ کی استعداد وقوت بھی رکھی ہے، اور شر وفساد کی بھی، ﴿ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴾ [الشمس:٨] (پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی)۔

اس کو اعلیٰ درجے کی عقل وہوش بھی عطا فرمایا، اور آسمانی کتابوں اور رسولوں علیہم السلام کے ذریعہ ہر ایک کام (خیر وشر) کا انجام بھی بتلا دیا، وہ ایک بے جان پتھر کی طرح نہیں اسے کائنات کے اکثر وبیشتر چیزوں پر تسخیر کا اختیار بھی دیا گیا، اور ستاروں تک اس کی رسائی اور کمند ڈالنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔

جب وہ اپنے ایجادات ومصنوعات کے ذریعہ پوری دنیا پر اپنی برتری کا لوہا منوا سکتا ہے تو کیا یہ محیر العقول مصنوعات کا موجد بے اختیار اور عاجز محض ہے؟ ہرگز نہیں! جب اس نے اپنے اختیار سے شر وفساد کی پرورش کی، اپنے اختیاری اعمال کو گمراہی کے رخ پر ڈال دیا، اور خود کو ہر گونہ آزاد سمجھ کر اپنے خالق ومالک کا انکار کیا، اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء ورسل علیہم السلام اور کتابوں کی تکذیب کی، تو وہ مجرم ان اختیاری اعمال کی وجہ سے قرار پایا، جو مادہ اس کی پیدائش میں ودیعت رکھا گیا تھا اس کی وجہ سے وہ مجرم نہیں قرار پایا، بلکہ اپنے اختیار دست وکردار سے جہاں اس

نے خیر وشر کے انتخاب میں عمداً جان بوجھ کر غلط انتخاب کیا۔ انبیاء ورُسل علیہم السلام نے اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اس کے انتخاب کو غلط قرار دیا، اور اسے خیر محض کی طرف موڑنا چاہا، مگر اس مجرم نے خود کو عقلِ کُل قرار دیتے ہوئے ان پاکیزہ ہستیوں کی تعلیمات کا مذاق اڑایا، جب قیامت قائم ہوگی وہاں ﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾[ق:۲۲] (اس دن تمہاری نظر بڑی تیز ہوگی) کا مصداق بن کر یہ خود اپنی پوری زندگی کی بیہودگی اور گمراہی پر بزبان خود گواہ بنے گا۔ کمامر۔ آگے عام انسانوں (نافرمانوں) کے ان خصالِ مذکورہ سے مؤمنینِ صالحین کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور ان کے نیک و پاکیزہ اعمال واخلاقِ حسنہ صالحہ ثمانیہ کا بیان ہے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم۔ آمین

﴿إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ تا ﴿عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ وہ یہ ہیں:

(۱) نمازوں پر مداومت کرنے والے۔

(۲) اپنے اموال میں سے سائل ومحروم کو کچھ حصہ دینے والے۔

(۳) قیامت پر یقین کرنے والے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے۔

(۵) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے۔

(۶) امانتوں کی حفاظت کرنے والے، اور اپنے وعدوں پر قائم رہنے والے۔

(۷) گواہی اور شہادتوں کی لحاظ ورعایت کرنے والے۔

(۸) اپنی نمازوں پر محافظت کرنے والے۔

اگر ان امورِ ثمانیہ پر غور کیا جائے تو سارے احکامِ شریعت ان میں داخل ہیں، دین اسلام کا کوئی گوشہ یا جزئی مسئلہ ایسا نہیں جو ان اوصافِ ثمانیہ میں مندرج نہ ہو۔ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ پانچ حدیثیں ایسی ہیں کہ پورا دین اور پوری شریعت ان میں مندرج ہے، اگر اور مزید احادیث نہ ہوتیں تو انہی پانچ حدیثوں سے تمام احکامِ شریعت کا استنباط ممکن ہوتا، وہ پانچوں احادیث صحیح البخاری کے کتاب الایمان میں موجود ہیں، میں نے "الكوثر الجاري إلىٰ رياض البخاري" میں ان کی نشاندہی کی ہے۔ واللہ اعلم

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ مطلب یہ ہے کہ مکمل توجہ سے نماز ادا کرتے ہیں، اِدھر اُدھر دائیں بائیں کسی طرف نہیں دیکھتے، بحالتِ قیام سجدے کی جگہ نظر جما کر دیکھتے ہیں، بحالتِ قعود اپنے سینے اور قلب پر

نظر جما کر دیکھتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب نمازی نماز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، جوں ہی اس نے خیال ہٹایا، یا اِدھر اُدھر دیکھا تو رحمت کی نگاہ وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔ [مشکوٰۃ عن أبي ذر رضي اللہ عنہ]

امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوالخیرؒ سے روایت کی ہے کہ ہم نے حضرت عقبہ بن عامر صحابی رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا مطلب پوچھا کہ کیا اس کی مراد یہ ہے کہ ہمیشہ مداومت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں؟ فرمایا: نہیں، یہ مراد نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اول نماز سے آخر تک اپنی نماز پر متوجہ رہتے ہیں، کسی طرف التفات نہیں کرتے ہیں۔

اس کا مطلب بعینہٖ وہ ہے جو سورۃ المؤمنون کی آیت میں ہے: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۲] (وہ لوگ جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں) یعنی یکسوئی کے ساتھ اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ آگے جو مذکور ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اوقاتِ نماز، باجماعت نماز اور آدابِ صلوٰۃ پر مداومت ومحافظت کرتے ہیں، تو تکرار نہیں ہوا۔

حضرت امیر المؤمنین سید احمد شہید رحمہ اللہ نے نماز کے متعلق ایک رسالہ میں سینکڑوں آداب ومسائل نماز جمع کئے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اسے جنت کی چابی سے تعبیر فرماتے ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے تو دین اسلام میں توحید کے بعد کوئی عمل نماز کے برابر نہیں، ساری بندگی نماز میں ہے، اگر نماز سنت کے مطابق ادا ہو تو باقی سارے اعمال صحیح اور درست رہیں گے، اگر نماز میں کوئی کمی ہوئی تو باقی سارے اعمال بے برکت ہو جائیں گے۔ نماز جب صحیح اور قبول ہو تو سارے حسنات آسان ہو جائیں گی، اور حرام ومکروہات ودیگر معاصی متروک ہو جائیں گے۔ مزید تفصیل اپنے مقام پر سورۃ البقرۃ کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔

نماز کیا ہے؟ نماز ایک عظیم بابرکت عمل ہے، جس کے ذریعہ ایک ظلوم وجہول ناکارہ بندہ کا ربّ العزّت سبحانہ کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم ہے، سارا جہاں اس رشتے کی قیمت کے سامنے ہیچ ہے، بڑا محروم ہے وہ جس کے پاس یہ قیمتی سرمایہ نہ ہو۔

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ ''حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ'' سے مراد زکوٰۃِ مفروضہ ہے، یا نفلی صدقات، آیت مکی ہے، مگر بعض حضرات نے حق معلوم کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ اپنی طرف سے

فقراء ومساکین کے لئے کوئی حصہ مقرر کیا ہو۔سائل وہ حقدار جو مانگتے اور طلب کرتے ہیں۔محروم سے مراد وہ فقراء ہیں جو اپنی حاجت کسی بندہ کے سامنے پیش نہیں کرتے، بڑے مستغنی اور متوکل رہتے ہیں، ﴿لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾[البقرة:۲۷۳] اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ سائل سے مراد اہل وعیال ہیں، جو ہر وقت مانگتے رہتے ہیں، اور محروم سے اجنبی فقراء مراد ہیں، اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سائل سے مراد انسان ہے، اور محروم سے مراد بے زبان مال ومویشی جانور ہیں۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محروم سے مراد مہمان ہو، کیونکہ مہمان زبان سے کچھ بھی نہیں مانگتا، میزبان کے رحم وکرم کا انتظار وامید کرتا ہے۔

بہر حال! سخاوت کا میدان بڑا وسیع ہے، اور یہ عمل قابلِ رشک ہی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی تمام چیزوں میں صرف دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن پر حسد ورشک ہوسکتا ہے: ایک سخی کی سخاوت پر جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہو۔دوم عالم کے علم پر جو اللہ تعالیٰ کی رضاء میں علم وحکمت بکھیرتا ہو۔[بخاري]

﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾ وہ لوگ جو ''يَوْمِ الدِّيْن'' قیامت کی تصدیق کرتے ہیں، یہ وہ عظیم عقیدۂ حقہ ہے جس نے پوری ملّت کفر کو مسلمان قوم سے الگ کردیا جس کی بناء پر روزِ محشر ربّ العزّت عزّ مجدہٗ اعلان فرمائیں گے:﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾[یس:۵۹] (اے گنہگارو! آج الگ ہوجاؤ)۔ تمام اقوامِ عالم سوائے چند مجرموں کے سارے مذاہب والے ربّ العزّت سبحانہ کے ایک حد تک قائل ہیں، اگرچہ غلط ہی سہی، مگر جس عقیدہ نے انہیں مسلمانوں سے الگ کیا ہوا ہے وہ اثبات قیامت ہی ہے، چونکہ وہ اس دنیا کو آخری منزل سمجھتے ہیں، اور اس کے بعد کسی منزل کا عقیدہ نہیں رکھتے، تو قیامت کو نہیں مانتے۔

دراصل وہ ایک بڑی غلطی اور شیطانی دھوکے میں مبتلاء ہیں، وہ اپنی دنیاوی حکمرانی اور دنیوی نظامِ حیات وبقاء کے لئے ملکی سطح پر یہ قانون بنائے ہوئے ہیں کہ تمام ریاستی محکموں کے سالانہ آمد وخرچ کی آڈٹ ضروری ہے، جس کے بغیر ریاستی نظام تہ وبالا اور درہم برہم ہوجائے گا، اور یہ بھول گئے کہ اس نظامِ عالم کا بھی کوئی حساب وکتاب کی آڈٹ ہونی چاہیے، جس کے بغیر تخلیقِ عالم بے معنی ومہمل ہوجائے گی، اور قیامت کا واحد مقصد یہی ہے کہ ساری کائنات کی آڈٹ کا کوئی دن ضروری ہو، تاکہ سچ اور جھوٹ، حق اور باطل، امانت اور خیانت کا انکشاف ہو، اور حقائق

کھل کر ظاہر ہوں، تاکہ قانونِ الٰہی کے پاسداروں کو انعام اور ترقی ملے، اور قانون شکنوں کی گوشمالی اور گرفت ہو۔ اسی بنیاد پر متصلاً فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ﴾ وہ لوگ جو اپنے ربّ سبحانہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بندہ جب اپنے ربّ کے عذاب سے ڈرتا ہے تو ہمہ وقت اس کی نافرمانی سے بچتا ہے، اور خوب نیکیوں میں کوشش کر کے اس کی رحمتوں کی امید رکھتا ہے، تصدیقِ قیامت اور ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ بندہ میں خوف ورجا دونوں موجزن ہوں، یہی ایمان کی علامت اور شناخت ہے، اور ایسے بندوں اور فرمانبرداروں کے لیے جنتوں کا انعام ہے:

﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ﴾ بلاشک ان کے ربّ کا عذاب بے فکر و بے خوف ہونے کی چیز نہیں۔ یعنی ربّ کے عذاب سے بے خوف ونڈر رہونا نہیں چاہیے۔

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حرام سے بچنے والے ہیں، مگر اپنی منکوحہ بیویوں سے یا اپنی شرعی مملوکہ باندیوں سے تو ان پر کوئی الزام اور ملامت نہیں۔ ہاں! جو شخص ان بیویوں اور باندیوں کے علاوہ شہوت رانی کا کوئی اور راستہ تلاش کرے گا تو ایسے ہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے ان دونوں راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا جائز راستہ ہرگز نہیں جو شرعاً حلال ہو، بلکہ وہ تیسرا راستہ حرام ہی ہوگا، جیسا کہ روافض کا متعہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نکاح بشرطیکہ اس میں جواز کی ساری شرائط موجود ہوں اور عدمِ جواز کی شرائط معدوم ہوں، یا شرعی مملوکہ باندی مع شرائط الجواز وانتفاء شرائط الحرمة، کیونکہ باندی اگر منکوحۂ غیر ہو تو مالک اس سے خدمت لے سکتا ہے، مگر شب باشی اس پر حرام ہے، ان دونوں جائز صورتوں کے علاوہ جتنی دیگر صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب حرام ہیں، اور وَرَآءَ ذٰلِكَ میں داخل ہیں، حتیٰ کہ غیر شرعی فعل (لواطت) بھی حرام ہے، مطلقاً دونوں کے ساتھ، کیونکہ بیوی اور مملوکہ کے ساتھ صرف شرعی فطری شب باشی کی اجازت ہے، غیر فطری عمل پر لعنت کا اطلاق ہوا ہے۔

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ اور وہ لوگ جو امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرنے والے ہیں، ظاہر ہے کہ امانتوں میں خیانت اور عہد شکنی علاماتِ نفاق میں سے ہیں، اور نفاق کفر کی طرح ایمان کی ضد ہے، اور یہ دونوں عمل، یعنی خیانت و بدعہدی علاماتِ قربِ قیامت میں سے ہیں، اور صحیح البخاری و مسلم کی روایتوں میں

ان کا شمار نفاق عملی میں ہے، اور یہ دونوں مؤمنِ صالح کے لئے سخت مضر اور نقصان دہ ہیں، اور نورِ ایمانی کے زوال میں ان کا بڑا دخل ہے۔

امانت اور عہد دو چیزیں ہیں، پھر امانت وعہد کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگا، یا لوگوں کے ساتھ، یہ چار صورتیں ہوں گی، ان چاروں کی حفاظت ونگہداشت فرض ہے، اور انہیں ضائع کرنا خلاف ورزی کرنا حرام ہے۔

دراصل بندوں کی امانت یا عہد وپیان جو مختصر بھی ہیں اور محدود بھی، ان کی حفاظت ونگہداشت سہل وآسان بھی ہے اور موقت بھی، مگر اللہ تعالیٰ کی امانتیں اور عہود وپیان بے شمار بھی ہیں اور غیر موقت بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری وباطنی نعمتیں جو بندوں کو عطا ہوئی ہیں وہ بندوں کے پاس بطورِ امانت وعاریت کے ہیں، یہ بندوں کی ملکیت میں نہیں، حتیٰ کہ بندوں کی جان یہ بھی عاریت ہے، ملکیت نہیں۔ بندوں کو ان نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق تصرف کا حق ہے، اور ضائع کرنے اور خیانت کرنے کا حق نہیں، یہی سبب ہے کہ روزِ قیامت ایک ایک نعمت کا جواب دینا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں جب بندوں کی پیشی ہوگی تو وہاں سے ہٹنے کی اجازت نہیں ہوگی، جب تک پانچ چیزوں کا جواب نہ دے گا:

☆...... پہلا سوال یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عمر کو کہاں اور کس چیز میں صرف کیا؟

☆...... دوسرا سوال یہ ہوگا کہ شباب اور جوانی کی قوت کو کہاں کھپایا؟

☆...... تیسرا سوال یہ ہوگا کہ مال اور روزی کو کیسے اور کہاں سے کمایا؟

☆...... چوتھا سوال یہ ہوگا کہ مال ودولت کس طرح اور کہاں کہاں خرچ کیا؟

☆...... پانچواں سوال یہ ہوگا کہ کم یا زیادہ علم جو حاصل کیا تھا اس پر کیا عمل کیا۔ [مشکوٰۃ] اندازہ لگائیں! ہم تو ان چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اور اپنی مرضی سے تصرف کرتے تھے، اب پتہ چلا کہ اصلی مالک ان چیزوں کا ربّ العزّت سبحانہ ہے۔

ہمیں صرف اس کے حکموں کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار حاصل تھا، تو ان امانتوں اور دیگر بہت ساری بے شمار نعمتوں کا ہم کیا جواب دیں گے؟ اگر یہ چیزیں ہماری ملکیت ہوتیں تو ہم سے باز پرس نہ ہوتا، یہ ہمارے پاس امانت ہیں، تب ہمیں ان کی حفاظت کا حکم ہے، اور ہر قسم کی طرح خیانت ولا پرواہی کی اجازت نہیں۔

یہی حال عہد و پیمان کا ہے، جبکہ ازل میں ہر شخص نے توحید الٰہی پر قائم رہنے کا عہد کیا ہوا ہے، جب توحید پر عہد ثابت ہو تو توحید کے دیگر تمام تقاضوں کو پورا کرنے کا عہد خود بخود ثابت ہوا، تو ان تقاضوں کی اتنی بڑی لمبی فہرست ہے جو پوری زندگی کے اعمال پر حاوی ہے، یہی معنی ہے آیت کریمہ کا: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ۹۹] (اپنے ربّ کی عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں یقین آجائے) مطلب یہ ہوا کہ پوری زندگی اس عہد و پیمان پر قائم رہو، یہاں تک کہ موت آجائے۔

اگر گویم مسلمانم بلرزم ☆ کہ دانم مشکلات لاالہ را

(اقبال)

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ﴾ وہ لوگ جو اپنی شہادتوں کو ٹھیک ادا کرتے ہیں۔ شہادتوں کا صیغہ جمع کا ہے، شہادت اس بیان کو کہتے ہیں جو اس علم کی بناء پر ہو، جو مشاہدہ، بصیرت یا مشاہدۂ بصر کے ذریعہ یا سماعت کے ذریعہ حاصل ہو۔ قرآن حکیم کہتا ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ﴾ [آل عمران: ۱۸] (خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں)۔ "قسط" کا معنی ہے: "انصاف"۔ سب سے بڑی شہادت علماء کرام کی ہے، یہی وجہ ہے کہ علم پڑھنے کا بڑا ثواب ہے، اور اس کو چھپانے کا نہایت بڑا گناہ ہے۔

علماءِ یہود مغضوب و معتوب اسی بناء پر ہوئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکموں کو چھپایا اور بیان نہیں کیا، خاص کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تمام بشارتوں کو یا تو تحریف کرکے تبدیل کر دیا، یا چھپایا۔ جو علم بصیرت سے حاصل ہو یا بصارت سے یا سماع سے عند الضرورة بدون المطالبة لإثبات حقوق اللّٰه تعالىٰ أو حقوق الخلق ولو كان حيوانا أو غيره اس کا اظہار ضروری ہے، اور کتمان یا خلاف واقع یا تغییر گناہ کبیرہ میں سے ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ایک علمی راز کی بات کے کتمان کو گناہ سمجھ کر عند الموت ظاہر کیا تھا، باوجود اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھپانے کا حکم دیا تھا، اور ظاہر کرنے سے منع فرمایا تھا۔ [مشکوٰۃ، کتاب الایمان، فصل أول] پس مطلب یہ نکلا کہ حقوق اللہ اور حقوق الخلق کے متعلق جو بھی علم ہو اس کو ظاہر کرنا اور ٹھیک ادا کرنا مؤمنین صالحین کی صفت ہے، اس میں شہادۃ توحید، شہادۃ رسالۃ، شہادۃ اذان، شہادۃ چاند، حدودِ شرعیہ، معاملاتِ نکاح وطلاق، سرقۃ، زنا، شراب، بیع وشراء، غصب، جنگ وجدال، وغیرہ سب شہادتیں داخل ہیں۔ کتمان، تبدیلی،

مصلحت اندیشی، لحاظ اور کمی بیشی سب حرام ہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (اور جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں)۔ ان اوصاف ثمانیہ میں پہلی صفت نماز کے متعلق ہے، اور آخری صفت بھی نماز کے بارے میں، یہ طرز بیاں سورۂ مؤمنون کے شروع میں اسی طرح ہے، پھر اس پر وراثت جنت واکرام جنت کا ترتب ہو رہا ہے۔ کتنی بابرکت عبادت ہے جس کی بدولت ہر قسم کی پاکی وطہارت، خضوع وخشوع، دخولِ مسجد، قیام فی الصّف، رفع یدین، سجدہ، التحیات، سلام، تلاوتِ قرآن، طہارتِ بدن، طہارتِ لباس، طہارتِ مکان، استقبالِ قبلہ، حضور ومناجاۃ مع الرّب اور دعا وتضرّع اور حصولِ قربِ الٰہی أقرب مایکون العبد إلی اللّٰہ وھو ساجد۔ [الحدیث] حاصل ہوتے ہیں۔

ایک اصحابی نے خواجہ عالم ﷺ سے مشورہ لینا چاہا، اپنے دو غلاموں میں سے کسی ایک کے آزاد کرنے کے متعلق، آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرما کر کہ: اس کو آزاد کرو میں نے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ [مجمع]

﴿يُحَافِظُوْنَ﴾ کا معنی ہے: ''حفاظت ونگہداشت''، اس مفہوم میں نماز کے تمام آداب، ارکان، شرائط، واجبات، سنن، مستحبات، اور ظاہری وباطنی تمام لوازمات شامل ہیں۔ اسی سے علماء کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ غلط نماز پڑھنے والے کا گناہ بے نماز آدمی کے گناہ (ترک صلوٰۃ) سے بدتر ہے، کیونکہ یہ خفتِ صلوٰۃ اور استہزاء بالصلوٰۃ کو مستلزم ہے۔

نماز کے طفیل قیامت کے روز نمازیوں کے اعضاء چمک رہے ہوں گے۔ غرّا محجّلین من أثار الوضوء۔ زہی سعادت! نمازیوں کے لیے بڑی بشارت اور میدانِ نفسی نفسی میں بڑا اعزاز ہے۔ اللّٰھمّ ارزقناہ، و اجعلنا من عبادک الغرّ المحجّلین یوم القیمۃ۔

﴿أُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ﴾ (یہ لوگ جنتوں میں اعزاز واکرام سے رہیں گے) یہ کیسے اچھے قابلِ احترام اور باعزّت مہمان ہوں گے جن کو الجبار عزّ مجدہٗ کے مہمان ہونے کا شرف حاصل رہے گا۔ یہ شکل وصورت، گوشت وپوست کے اعتبار سے ھلوعا جزوعا منوعا والے لوگوں کے رشتہ میں منسلک تھے، اور انہیں کی نسل میں سے تھے، مگر اٰمَنُوْا بِالرُّسُلِ وَاتَّبَعُوْهُمْ کے فیضان نے انہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچایا، اور حظیرۃ القدس کا مہمان بنایا، اللہ اکبر، یہ جنتی لوگ ضیوف الرحمن کہلائیں گے، اور ربّ العزّت عزّ سبحانہ ان کا میزبان کہلائے گا، فھنیئًا لھم۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ
مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ
وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا
وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ
اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں؟ ﴿۳۶﴾ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ در گروہ ﴿۳۷﴾ کیا ان کافروں اور مشرکوں میں سے ہر ایک امید رکھتا ہے کہ وہ نعمتوں کے باغوں میں داخل ہو گا ﴿۳۸﴾ خبردار! ہم نے ان کو اس چیز سے پیدا کیا جسے یہ جانتے ہیں ﴿۳۹﴾ پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے ربّ کی یقیناً ہم قادر ہیں ﴿۴۰﴾ اس بات پر کہ ہم ان لوگوں سے بہتر لوگ لے آئیں، اور ہم اس بات میں عاجز نہیں ہیں ﴿۴۱﴾ پس ان کو چھوڑ دیں، یہ باطل باتوں میں گھستے رہیں، اور کھیل تماشے میں گھستے رہیں، یہاں تک کہ وہ اس دن سے جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ﴿۴۲﴾ جس دن قبروں سے نکلیں گے تو دوڑتے ہوئے جائیں گے، گویا کہ وہ اپنے نشانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ﴿۴۳﴾ ان کی نگاہیں پست ہوں گی، ان پر ذلت سوار ہوگی، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا ﴿۴۴﴾

معارف ومنازل

﴿مُهْطِعِيْنَ﴾ أي مسرعين۔ عزين جماعات متفرقة (گروہ در گروہ، ٹولیاں ٹولیاں)۔ مشرکین حضور اکرم ﷺ کو کسی جگہ بیٹھے ہوئے دیکھ لیتے تو دائیں بائیں سے گروہ در گروہ بھاگے بھاگے تیزی سے چلے آتے اور ٹکٹکی باندھ کر حضور ﷺ کو دیکھنے لگتے، لیکن ان کی یہ آمد و سرگرمی دعوتِ حق اور عقیدت کے لیے نہیں، بلکہ مذاق اور ہنسی اڑانے اور رعب جمانے کے لئے ہوا کرتی، اور حضور ﷺ کے اردگرد جمع ہو کر طرح طرح کے الزامات لگاتے، اور طرح طرح کے استہزاء و رعونت کا اظہار کرتے، اور مسلمانوں کو پست نگاہوں سے دیکھ کر ان کی تنقیص کرتے، اور کہتے کہ اگر یہ کنگال و مفلس اور پریشان حال لوگ جنت میں گئے تو ہم ان سے کہیں پہلے جنت کے بڑے درجات میں محوِ استراحت و خراماں رہیں گے، اگر ان پر اللہ تعالیٰ نے بالفرض کرم کیا تو ہم پر وہ اپنی نعمتوں کی بارش برسائیں گے، اور

ہر قسم کی نعمتوں سے نوازیں گے۔

قرآن حکیم ان سے پوچھتا ہے کہ نہ تم ایمان لائے اور نہ نیک عمل کیا، نہ شرک وکفر سے توبہ کی، اور نہ اللہ تعالیٰ کا حکم مانا، تو یہ خوش فہمیاں کہ تمہیں جنت میں داخل کیا جائے گا، یہ تمہاری اپنی خام خیالی اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ؎

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ☆ این خیال ست ومحال ست جنون

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایمان وعمل کے بغیر تمہیں مفت جنت عطا کی جائے، اور مؤمنین صادقین کی صف میں کھڑا کیا جائے؟ جیسے کہ ایک دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ﴾ [صٓ:۲۸] (جولوگ ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے، کیا ان کو ہم ان کی طرح کردیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں؟ یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کردیں گے؟)۔

ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، یہ ممکنات میں نہیں کہ مجرم، چور اور ڈاکوؤں کو شریف اور عزّت مند لوگوں کی صف میں برابر کھڑا کیا جائے، تو کیا ان کے ایمان وحسنات کی یہی قدر وقیمت ہوگی کہ انہیں مجرمین کے ساتھ ملایا جائے؟ ﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ [القلم:۳۶] (تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسی تجویزیں کرتے ہو؟)۔

آگے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ہم نے ان کو ایسے مادے سے پیدا کیا ہے جس کو وہ خود بھی جانتے ہیں، وہ کس منہ سے نخوت وغرور کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے سامنے اکڑ جاتے ہیں، جبکہ انہیں خوب علم ہے کہ ان کو ایک مردار قطرۂ آب اور خسیس مادے سے پیدا کیا گیا ہے، ان کا خمیر کسی الگ مادہ سے نہیں اٹھایا گیا ہے، جس کے باعث انہیں ایمان وعملِ صالح کے بغیر جنت میں داخل ہونے کا حق پہنچتا ہو، سب کی تخلیق ایک ہی مادہ سے ہوئی ہے۔

امیر وغریب، شریف ورزیل، عالم وجاہل سب مساوی وبرابر ہیں، اگر دوسرے لوگوں کو جنت میں داخل ہونے کے لیے ایمان وعمل کی ضرورت ہے تو مشرکین وکفار کو بھی اس کے بغیر چارہ نہیں، اور یہ حقیقت انہیں اچھی طرح معلوم بھی ہے، وہ اسے خوب جانتے ہیں۔ پس ان کی خوش فہمی بے معنی ہے۔ مزید فرمایا کہ ان لوگوں کو شاید یہ غلط فہمی ہے کہ دنیا کی رونق وآبادی ان کے دم قدم سے ہے، اگر وہ نہ ہوں تو گلستان کا وجود اجڑ جائے، اور دنیا کی زیب وزینت ختم ہوجائے، اور اس پر خزان کا عالم طاری ہوجائے، تو یہ ان کا بھول اور نادانی ہے۔

فرمایا: ہم اپنی باعظمت ذات کی قسم کھاتے ہیں جو مشارق ومغارب کی پروردگار ہے کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ ہم انہیں تباہ وبرباد کردیں اوران سے کہیں زیادہ بہتر کسی قوم کوان کا جانشین بنادیں، جوان سے زیادہ نیک بخت اور باصلاحیت ہو، علم وعمل کی دولت سے مالا مال ہو، تقویٰ وایمان سے آراستہ ہو، میری وحدانیت پر ایمان رکھتی ہو، اور میرے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دلی عقیدت ومحبت رکھتی ہو، ان کے حسنِ عقیدہ وبرگزیدہ اعمال کی بدولت ہر طرف بہار ہی بہار ہو۔

چونکہ سورج کا مشرق ومغرب ہرروز بدلتا رہتا ہے، اس لئے جمع کا صیغہ استعمال ہوا، اور سورۃ الرحمٰن میں ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ [الرحمن:۱۷] (مشرقین کا پروردگار ہے، اور مغربین کا پروردگار ہے) تثنیہ کے صیغے مستعمل ہیں، یہاں سردی وگرمی کے موسموں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ﴾ (اللہ تعالیٰ عاجز وکمزور نہیں کہ اس سے کوئی سبقت کرکے آگے نکل جائے، اور وہ پیچھے رہ جائے) نعوذ باللہ۔

﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ﴾ یہاں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلّی ہے کہ آپ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا کردیا، اور انتہائی خلوص کے ساتھ انہیں شرک وکفر کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش فرمائی، اس کے باوجود وہ اپنے کفر وضلالت پر بضد ہیں، تو آپ مزید کبیدہ خاطر نہ ہوں، ان کو چھوڑیئے، وہ اپنی ضلالت وخرافات میں غرق رہیں، اور اپنی زندگی کی قیمتی اوقات کھیل کود میں برباد کرتے رہیں، یہاں تک کہ موت کا گڑیال بج کران کی یہاں سے روانگی کا اعلان کردے، اور پھر انہیں قیامت کے روز قبروں سے نکال کر حساب وکتاب دینے کے لیے حاضر کردے۔

﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ﴾ (اس دن یہ قبر سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے جیسے (شکاری) شکار کے جال کی طرف دوڑتے ہیں)۔ نفخہ ثانیہ کے بعد جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے، جلدی جلدی بلا کسی توقف کے بڑی تیزی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ (نشان) کی طرف دوڑنے لگیں گے، ایسا معلوم ہوگا کہ دنیا میں اپنے بتوں (معبودوں) کی طرف جس شوق وارفتگی سے وہ دوڑا کرتے تھے۔ وہی وارفتگی آج ان پر طاری ہے، آج وہ جانتے ہیں کہ ہمارا انجام جہنم ہی ہے، نہ ٹال مٹول کی گنجائش اور نہ بھاگنے اور چھپنے کی مجال، جب بلاوا ہی آگیا تو کیا مجال کہ سستی کریں۔

﴿خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الۡيَوۡمُ الَّذِىۡ كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَ﴾ (ان کی آنکھیں جھک رہی ہوں گی، اور ذلت ان پر چھا رہی ہوگی، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا) یہ رسوا کن یومِ موعود آپہنچا جس کی انہوں نے تکذیب کی، آج ان پر شرمندگی وذلت اس طرح طاری ہوگی کہ شرم وخجالت کے مارے آنکھیں خستہ جھکی ہوں گی اور چہروں پر رسوائی وذلت کی دھول جمی ہوگی، خستہ حال، سرگرداں، سیاہ چہروں کے ساتھ کسمپرسی میں گرفتار ہوں گے۔ نعوذباللہ اللّٰھم یافاطر السمٰوٰت والأرض یارب العٰلمین پوری امت محمدیہ پر رحم فرما، اور ان کے چہروں کو اپنے انوار وبرکات سے منور فرما، روزِ قیامت کی تمام ذلتوں سے بچا، اور عرش معلّٰی کا سایہ نصیب فرما۔ آمین

سُورَةُ نُوح

مکیۃ آیاتہا ۲۸ رکوعاتہا ۲

سورۂ نوح مکی ہے، اس میں اٹھائیس (۲۸) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

سورۂ نوح (علیہ السلام)۔ سورت کا نام پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بھی سورۃ المعارج کی طرح بالاتفاق مکی ہے، اور اس کا نزول سورۂ نحل کے بعد ہے۔ یہ سورت مکی زندگی کے ان ایام میں نازل ہوئی، جب مشرکین مکہ کا حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختلاف وعداوت کا بازار خوب گرم اور اپنے عروج پر تھا، اللہ ربّ العزّت نے اس سورت کے انزال کے ساتھ دشمنانِ توحید ورسالت پر واضح فرمایا کہ اگر تمہارے رویہ وسلوک وہی رہا جو قوم نوح (علیہ السلام) کا تھا تو تم بھی ایسے ہلاک کئے جاؤ گے، اور تمہارا حشر ان سے مختلف نہ ہوگا۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت میں اٹھائیس آیات (۲۸)، دوسو چوبیس کلمات (۲۲۴) اور نوسو ننانوے (۹۹۹) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

اس سورت کا ماقبل سورۂ معارج کے ساتھ عمومی ربط یہ ہے کہ دونوں سورتوں میں توحید ورسالت اور اثبات

قیامت کا مدلل بیان ہے، اور خصوصی ربط یہ ہے کہ سورۂ معارج میں ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا﴾ [المعارج: ۵] (صبر جمیل اختیار کریں) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید ہے کہ مشرکین کی ایذا رسانی سے پریشان و کبیدہ خاطر نہ ہوں، انبیاء سابقین علیہم السلام کے صبر و استقامت کو ملحوظ نظر رکھ کر، ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح تم بھی صبر کرو) پر عمل پیرا رہو، اس بارے میں نوح علیہ السلام کا واقعہ اور ان کے صبر و استقلال کو نمونہ کے طور پر پیش فرمایا۔

نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو شرک و بت پرستی کو ختم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم آخری تاجدار نبی و رسول ہیں، جو اسی مقصد کے لیے دنیا میں تشریف لائے، اور ایک مختصر مدت میں پورے جزیرۂ عرب کو اصنام و بت پرستی سے مکمل پاک فرما کر ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ [الفتح: ۲۸] (تا کہ دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ دے) کا نقشہ دنیا میں جاری فرمایا، اور کہا: إن الشيطن قد أيس أن يعبد في جزيرة العرب۔ فصلى الله عليه وآله وصحبه وسلم

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت اس زمانے کے تمام انسانوں کے لیے تھی جو اس وقت دنیا میں آباد تھے۔ آپ حضرت آدم علیہ السلام سے دس قرن بعد مبعوث ہوئے۔ آپ سے پہلے جتنے پیغمبر علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ سب کے سب انبیاء گزرے ہیں، ان میں رسول کوئی نہیں تھا، دنیا میں سب سے پہلے رسول آپ ہیں۔ [كما في حديث الشفاعة في الصحيحين] حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام کے والد ماجد تک تقریباً تمام لوگ مؤمن موحد گزرے ہیں، شرک و اصنام پرستی کا رواج نہ تھا، ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ [البقرة: ۲۱۳] (پہلے تو) سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا)۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت:

حضرت نوح علیہ السلام سے چند وقت پہلے اصنام پرستی کا دور شروع ہوا، کچھ بڑے صالح نیک لوگوں نے عبادت گاہ اور مساجد تیار کی تھیں، وہاں دن رات عبادت واذکار میں مشغول رہتے تھے، مرورِ زمانہ کے بعد یکے بعد دیگرے وہ سب وفات پاگئے، ان کے متبعین ان کی جدائی پر غمگین پریشان ہوئے، جب وہ عبادت گاہوں میں بیٹھتے تھے تو اپنے اسلاف اور بزرگوں کا تذکرہ کر کے ان کی جدائی پر غمزدہ رہتے تھے، شیطان موقع کو غنیمت سمجھ کر عمامہ وقبا اور عصاء کے ساتھ ان کی محفل میں آیا، ایک خیر خواہ اور ناصح بن کر انہیں بتایا کہ اپنے بزرگوں کے مجسمے بنا کر مسجدوں میں

رکھو، جب عبادت میں مصروف ہوں تو انہیں دیکھتے رہو، اور ان کی قدموں پر بوسہ دیا کرو، تمہاری پریشانی دور ہوجائے گی، اور عبادت میں لطف وسرور بھی پہلے کی طرح حاصل ہوگا، انہوں نے ایسا ہی کیا۔

یہاں تک کہ آہستہ آہستہ عبادت کی شکل وصورت تبدیل ہوئی، اور بات صرف قدم بوسی وسجدے کی حد تک رہ گئی۔ یہ نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے شیطان کے ورغلانے پر ان مجسموں کو معبود کا درجہ دے کر ان کی عبادت شروع کی، رفتہ رفتہ یہ وبا کی طرح پوری آبادی میں پھیل گئی، اور پھر وہاں سے دوسرے علاقوں تک یہ رسمِ بد عام ہوگئی، اور دیگر اقوام بھی اس کی لپیٹ میں آکر غرق ہوگئیں، تب حضرت نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے، بعثت کے وقت بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ کی عمر چالیس سال تھی، اور بقول حضرت وہب بن منبہ آپ کی عمر پچاس سال تھی، ساڑھے نوسو سال کا بڑا عرصہ تبلیغ میں گزارا۔ سورۂ عنکبوت میں تشریح گزر چکی ہے۔

پوری جماعت انبیاء علیہم السلام میں آپ کا ایک خاص امتیازی مقام ہے کہ اتنی بڑی مدت جو کئی پشتوں پر مشتمل ہو آپ نے مسلسل تبلیغ میں گزاری، اور تبلیغ کے سلسلے میں اتنی تکالیف برداشت کیں جس کی مثال ملنی مشکل ہے، اور لوگ آپ کو مار مار کر زخمی کرتے بیہوش ہوجاتے، کہیں پھینک دیتے، جب ہوش میں آتے دوبارہ تبلیغ شروع کرتے اور ان کے لئے ہدایت کی دعا کرتے۔ پھر آپ کی تبلیغ اتنی ہمہ گیر ہوتی تھی کہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے محفلوں میں، تقریبات میں، بازاروں میں، صحراؤں میں، گھروں میں، اجتماعات میں، انفرادی طور پر یہاں تک کہ سوئے ہوئے لوگوں کے بستروں میں جاجا کر ہروقت صبح وشام اور دن رات تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھتے، اور انہیں مختلف قسم کے عذاب و مؤاخذوں سے ڈراتے، اور جنت کی خوشخبری سناتے، مال واولاد، عزّت وخوشحالیوں کا یقین دلاتے، بارشوں اور ملکی آبادی اور باغات ودیگر راحتوں کا وعدہ دیتے، اور اتنی محنت وجانفشانی سے تبلیغ کرتے کہ اپنی ذاتی راحتوں سے بے خبر رہتے۔ [تفسير عزيزي، قرطبي، معالم وغيرها]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغِ دین کے جو رہنما اصول وضع کئے وہ اتنے بابرکت اور قیمتی ہیں جو رہتی دنیا تک حق وصداقت کے مبلغین کے لئے نمونہ ہیں، ساڑھے نوسو سال شب وروز خلوت وجلوت میں لوگوں کو دعوتِ حق دینا اور مسلسل اس دعوت میں منہمک ومشغول رہنا اور کسی قسم کی تعب وتھکاوٹ محسوس نہ کرنا اور کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا، یہ منصب نبوت ہی کا طرۂ امتیاز ہے، اور صبر واستقلال کی وہ شان وہمت ہے جس کے سامنے پہاڑ بھی عاجز ہے، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں آپ کی شانِ تبلیغ اور دعوتِ حق کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ

بیان کیا ہے، سورۂ ہود میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہوگیا ہے۔

بالآخر ہزار سالہ تبلیغ کا نتیجہ صفر نکلا، اور تقریباً بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما صرف اسی آدمیوں نے ایمان قبول کیا، اور کعب الاحبار کہتے ہیں کہ بہتر (۷۲) لوگوں نے ایمان لایا۔ اور حضرت نوح رضی اللہ عنہما ہر طرح ہر سمت سے مایوس ہوگئے، باوجودیکہ تقریباً ستر سال اسی حال میں گزرے کہ پوری قوم کی نسل منقطع ہوگئی، کسی عورت سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، اور بارشیں بند ہوگئیں، لوگوں کی معیشت تباہ ہوگئی، لیکن لوگ وہی کے وہی رہے، بڑے تنگ آئے، پریشان ہوئے، نہایت مایوسی کے عالم میں ہاتھ اٹھا کر اپنے محسنِ حقیقی کے سامنے الحاح وزاری شروع کی، اور قوم کی تباہی کی التجاء کی، بالآخر دعا منظور ہوئی، طوفان آنے کا مژدہ سنایا گیا، فرشتوں نے کشتی بنانے پر مدد کی، کشتی بن گئی، ہر قسم کے زمینی جانوروں کے لئے خانے بنائے گئے۔

آسمان کے دروازے کھل گئے، زمینی تنور سے پانی ابلنا شروع ہوگیا، جن کو نجات دلانی تھی انہیں کشتی میں سوار کیا گیا، جبل ابوقبیس سے حضرت آدم علیہ السلام کو نکال کر ان کے جسد خاکی کو تابوت میں رکھ کر کشتی میں رکھا گیا، دس رجب المرجب کو کشتی روانہ ہوئی، دس محرم کو چھ ماہ مسلسل پانی پر رہنے کے بعد "جبل جودی" پر رک گئی، ڈرامہ بازوں کا ڈرامہ اختتام کو پہنچا، سارے ڈرامہ باز غرق ہوئے، پوری انسانیت تباہ ہوگئی، بیوی اپنے نافرمان بیٹے کنعان سمیت ڈوب گئی، باقی دیگر تینوں فرمانبردار بیٹے: سام، حام، یافث، نجات پائے، انہیں کی نسل سے دوبارہ انسانیت روئے زمین پر پھیل گئی، جبکہ اسی آدمی جو کشتی میں سوار تھے ان کی نسل کوئی نہیں رہی، یہ ہے مختصر روئیداد آدم ثانی سیدنا حضرت نوح علیہ السلام کی۔ اور ان کا مقدس نسب نامہ یہ ہے:

هو نوح بن لامک بن متوشلخ بن إدريس (أخ نوخ پیغمبر) بن يرد بن مهلائيل بن قينان بن أنوش بن شيث بن آدم عليه السلام أبي البشر۔ حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔ [اثمار واز ہار]

تینوں بیٹوں کی نسل کا مختصر تعارف:

عن سمرة بن جندب مرفوعًا: سام أبو العرب، وحام أبو الحبش، ويافث أبو الروم۔ [أحمد]

وعن أبي هريرة مرفوعًا: ولد لنوح عليه السلام سام وحام يافث، فولد لسام العرب وفارس و الروم، والخير فيهم، وولد ليافث ياجوج وماجوج والترک والسقالبة، ولا خير فيهم، وولد لحام

القبط والبَرْبَرْ والسودان۔ [أخرجه البزار]

برصغیر ہندو پاک کے لوگ بقولِ محققین اولادِ سام ہیں، اور بقول بعض اولاد حام ہیں۔ واللہ اعلم

فائدہ:

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم میں اجمالاً وتفصیلاً تینتالیس (۴۳) مقامات پر مذکور ہے، طوفان نوح (علیہ السلام) کا تذکرہ قرآن کریم نے جغرافیائی لحاظ سے بیان نہیں کیا، بلکہ اسے قوم نوح (علیہ السلام) کے ساتھ مقید کر کے بیان کیا، اس سے مؤرخین نے ایک اختلافی نتیجہ اخذ کیا اور کہا کہ علماء اسلام میں سے ایک جماعت اور بعض ماہرین فلکیات، طبقات الارض اور تاریخ طبعیات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا، بلکہ صرف اس خطہ میں محدود تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی (یعنی نینویٰ، عراق، دجلہ وفرات کا مابین)۔

یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کیلومیٹر مربع ہے، کیونکہ اُس زمانے میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی، اور وہی خطہ تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم آباد تھی، ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا، لہٰذا وہی مستحقِ عذاب تھے، اور انہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا، باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا (بلکہ باقی کرۂ ارض انسانی آبادی سے خالی تھا)۔ علماء یہود ونصاریٰ بھی یہی کہتے ہیں۔

اور بعض علماء اسلام، ماہرین فلکیات وطبقات الارض اور علماء طبعیات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا، مگر صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا، عام نہ تھا، پوری تحقیق قصص القرآن میں ہے، اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت لکافۃِ الناس یعنی سارے اقوام عالم کے لیے نہیں تھی، کیونکہ یہ منصب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، نوح علیہ السلام کی بعثت صرف اس کی قوم کے لیے ہے، یہ معنی تقریباً لفظ إلیٰ قومہ چالیس کے قریب مقامات میں مذکور ہے۔

دوسری وجہ تاریخی حوالے سے یہ ہے کہ بعثت نوح علیہ السلام کے وقت دنیا کی آبادی نہایت محدود ومختصر تھی، البتہ! بعد از طوفان پھر تمام اکنافِ عالم میں آہستہ آہستہ انسانی آبادی عام ہوئی، اور ظاہر بھی یہی ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت پورے عالم کے لئے نہیں، بلکہ صرف اس کی قوم کے لیے ہے، تو پھر پورے عالم پر طوفان کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (پوری تفصیل کے لیے قصص القرآن اور قصص الانبیاء کا مطالعہ مفید ہوگا)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ① قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ② اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ③ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ④

ترجمہ: بے شک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف، اور فرمایا: اے نوح! بروقت خبردار کرو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ نازل ہو جائے ان پر عذاب دردناک ① آپ نے فرمایا: اے میری قوم! میں تمہیں صریح طور پر ڈرانے والا ہوں ② کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی، اور ڈرو اس سے اور میری پیروی کرو ③ وہ بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ، اور مہلت دے گا تمہیں ایک مقررہ میعاد تک، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا مقررہ وقت جب آجاتا ہے تو اسے مؤخر نہیں کیا جاسکتا، کاش! تم حقیقت کو جان لیتے ④

معارف ومنازل

(۱) حضرت نوح علیہ السلام کو جس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے ان کو ان کے فریضۂ نبوت سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ آپ اٹھئے! اور اپنی قوم کے پاس تشریف لے جایئے! انہیں بتایئے کہ ان کے شرک وکفر کے باعث وہ عذابِ الٰہی کے سزاوار ہو گئے ہیں، لیکن ابھی ان پر توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا، اب بھی اگر وہ آنکھیں کھولیں اور اپنی غلط روش، شرک وبت پرستی سے باز آجائیں اور توحیدِ الٰہی کا اقرار کرلیں تو ان کی مغفرت کی جاسکتی ہے، اور معافی کے امکانات واضح ہیں۔

(۲) فرمایا: اے میری قوم! میں تمہیں عام فہم الفاظ اور کھلے انداز میں ڈرانے والا بن کر آیا ہوں تاکہ تم اپنے شرک ونافرمانیوں سے باز آجاؤ، اور کفر ومعاصی سے مکمل توبہ کر کے ایمان لاؤ۔

(۳) میری دعوت کے تین بنیادی اصول ہیں:

❶ کفر وشرک چھوڑ دو، اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو، اس سے تمہارے قلوب پاک ہو جائیں گے، عقائد درست ہو جائیں گے، توہمات اور وسوسوں سے تمہاری عقلیں آزاد ہو جائیں گی، جب نورِ توحید جگمگا اٹھے گا تو تمہارے سینے نورِ ایمانی کے پرتو سے چمک اٹھیں گے۔

❷ میری دعوت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تم تقویٰ کو اپنا شعار بنالو، جب تم متقی و پارسا بن جاؤ گے تو فسق و فجور اور دیگر تمام معاصی کی بدبوؤں سے تمہارا دامن یکسر پاک ہوجائے گا، ظلم وستم، لوٹ کھسوٹ، خودغرضی، خیانت، مکر و فریب، جھوٹ، اور بخل وحسد، حرص ولالچ کا تمہارے معاشرے میں نام ونشان باقی نہیں رہے گا، خوب سوچو اور تقویٰ اختیار کرو۔

❸ میری دعوت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو، تمہارے پروردگار نے مجھے مرشد ورہنما بنا کر مبعوث فرمایا ہے، میں تمہیں سیدھی راہ پر لے چلوں گا، اور منزلِ مقصود تک پہنچاؤں گا، اور تم گم گشتہ راہ لوگوں کا رابطہ حق تعالیٰ سے ملاؤں گا، اور جب تم مجھے اپنا رہنما، بہی خواہ اور رہبر تسلیم کرلو گے تو تمہارے اندر جتنے انتشار واختلافات ہیں سارے ختم ہوجائیں گے، اور تمہاری تہذیب وتمدن، سماج ومعاشرہ کا سمتِ قبلہ صحیح اور درست ہوجائے گا، تمام افتراق اتفاق سے بدل جائیں گے، پس تم ایک منظم ومتحد ملت کی طرح قوت وشوکت کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کروگے۔

عمر میں کمی بیشی اور زیادتی ونقصان کا بیان:

مسئلۂ تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے، اور علم کلام وعقائد کے سلسلے میں یہ بات نہایت اہم اور مسلمات میں سے ہے۔ حدیث جُبریل (علیہ السلام) میں اس کا واضح ثبوت وبیان موجود ہے، اور قرآن کریم کی متعدد آیات میں تقدیر کا بیان واثبات کا تذکرہ موجود ہے، نیز بے شمار احادیثِ صحاح اس پر ناطق ہیں، اور منکرین تقدیر کے لیے سزا اور وعید مذکور ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے کہ تقدیر کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اور مسئلۂ تقدیر میں نزاع و اختلاف اور بحث ومباحثہ سے ممانعت بھی واضح طور پر موجود ہے۔

سورۂ رعد کی آیت: ﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ [الرعد:۳۹] (اللہ جو چاہے مٹادیتا ہے اور برقرار رکھتا ہے، اور اس کے ہاں اصلی کتاب ہے)۔ اسی طرح سورۂ قمر کی آیت: ﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ [القمر:۴۹] (ہم نے ہر چیز کو اندازہ کے ساتھ پیدا کیا ہے) اور دیگر قرآنی آیتوں کی ذیل میں مفسرین حضرات نے تفصیلی احکام ومسائل بیان کئے ہیں، اور تقدیر کے مسئلہ پر سیر حاصل تفصیلاً بحث کی ہے۔

مختصر طور پر تقدیر کی دو ہی اقسام بیان ہوئی ہیں:

(۱) تقدیر مبرم (قطعی ناقابلِ تبدیلی)۔ (۲) تقدیر معلق، جس میں اسباب کے ذریعہ تبدیلی اور ردوبدل کا

امکان موجود ہے۔ یہ دونوں قسم ''اُم الکتب'' یعنی لوحِ محفوظ میں مندرج ہیں، جس پر ربّ العزّت سبحانہ کا علمِ محیط اور حاوی ہے۔ مخلوقات میں سے صرف چند مقادیر کا جزوی طور پر بذریعہ وحی صرف پیغمبروں علیہم السلام کو اطلاع ہوتی ہے، جیسے نوح علیہ السلام کو بتایا گیا کہ: ﴿لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ﴾ [ھود:۳۶] (تمہاری قوم میں سے ہرگز کوئی ایمان نہیں لائے گا، مگر وہ جو ایمان لا چکے ہیں)۔ اس حکم کے بعد آپ کو کشتی تیار کرنے کا امر ہو، اور: ﴿وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ﴾ [ھود:۳۷] (اور جو لوگ ظالم ہیں ان کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا، کیونکہ وہ ضرور غرق کردیئے جائیں گے)۔ ﴿وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ﴾ [ھود:۳۸] (تو نوح نے کشتی بنانی شروع کردی، اور جب ان کی قوم کے سرداران کے پاس سے گزرتے تو ان سے تمسخر کرتے)۔

بہر حال! جب قوم پشت در پشت اسی طرزِ عمل کے ساتھ برابر اصرار کرتی رہی اور ایمان لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، تب عذاب کا فیصلہ حتمی طور پر مقرر ہوا۔

﴿وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ میں اسی تقدیری مسئلہ کی طرف اشارہ ہے۔ اَجَلٍ سے مراد مدّت اور مُّسَمًّى کا مطلب متعین کردہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مدّت تک دنیا میں مہلت دے گا جو تمہارے لئے مقرر اور متعین ہے، یعنی مقررہ مدّت عمر سے پہلے تمہیں کسی بھی دنیاوی عذاب میں پکڑ کر ہلاک نہیں کرے گا۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدّتِ مقررہ سے پہلے ہی تم پر عذاب لا کر ہلاک کردے (یہ قضاء معلق ہے، نہ کہ مبرم)۔

معلوم ہوا کہ عمر کی مدّتِ مقررہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اگر آدمی نے فلاں کام کرلیا تو اس کی عمر مثلاً اسی سال ہوگی، اور اگر نہ کیا تو ساٹھ سال میں موت مسلط کردی جائے گی، یا منفی کاموں میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری سے عمر کا گھٹ جانا اور شکر گزاری سے عمر کا بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال، مثلاً والدین کی اطاعت وخدمت سے عمر میں ترقی ہونا، یا صلہ رحمی اور دوسرے اعمال سے عمر کا بڑھ جانا جو احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے۔

اس مضمون کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضاءِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں: ایک مبرم یعنی قطعی، دوسری معلق، یعنی جو کسی شرط پر معلق ہو، یعنی لوحِ محفوظ میں اس طرح لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اگر اللہ تعالیٰ کی

اطاعت کی تو اس کی عمر مثلاً ستر سال ہوگی، اور نہ کی تو پچاس سال میں مر جائے گا، اس دوسری قسم کی تقدیر میں شرط نہ پائے جانے پر تبدیلی ہوسکتی ہے۔

قرآن کریم میں ان دونوں قسم کی قضاء وتقدیر اس آیت میں ہے: ﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ [الرعد:٣٩] (اللہ تعالیٰ لوح محفوظ میں محو واثبات، یعنی ترمیم وتبدیل کرتا رہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اصل کتاب)۔ اصل کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیر مبرم لکھی ہوئی ہے، کیونکہ تقدیر معلق میں جو شرط لکھی گئی ہے اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ شخص یہ شرط پوری کرے گا یا نہیں، اس لئے تقدیر مبرم میں قطعی فیصلہ لکھا جاتا ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یرد القضاء إلا الدعاء و لا یزید في العمر إلا البر۔ [ترمذي، مظهري] یعنی قضاء الٰہی کو کوئی چیز بجز دعا کے نہیں روک سکتی، اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز برّ والدین کے نہیں ہوسکتی۔ "بر" کے معنی ان کے ساتھ "اچھا سلوک ہے"۔ اور مطلب اس حدیث کا یہی ہے کہ تقدیرِ معلق میں ان اعمال کی وجہ سے تبدیلی ہوسکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو ﴿ اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ تک مؤخر کرنے کو ان کے ایمان لانے پر موقوف کیا ہے یہ ان کی عمر کے بارے میں تقدیرِ معلق کا بیان ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو علم عطا فرمادیا ہوگا، اس کے سبب سے انہوں نے اپنی قوم کو بتلایا کہ تم ایمان لائے تو جو اصلی عمر تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے، وہاں تک تمہیں مہلت ملے گی، اور کسی عذابِ دنیوی کے ذریعہ ہلاک نہ کئے جاؤ گے، اور اگر ایمان نہ لائے تو اس اصلی عمر سے پہلے ہی خدا تعالیٰ عذاب سے تمہیں ہلاک کردے گا، اور آخرت کا عذاب اس صورت میں اس کے علاوہ ہوگا۔

آگے یہ بھی بتلادیا کہ ایمان لانے پر بھی ہمیشہ کے لئے موت سے نجات نہیں ہوگی، بلکہ "تقدیر مبرم" میں جو تمہاری عمر لکھی ہوئی ہے، اس پر موت آنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اس عالمِ دنیا کو دائمی نہیں بنایا، بلکہ یہاں کی ہر چیز کو فنا ہونا تقاضائے حکمت ہے، اس میں ایمان واطاعت اور کفر ومعصیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا، ﴿ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ﴾ میں اسی کا بیان ہے۔ [معارف القرآن]

﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ ﴾ ایمان لانے سے تمام گناہوں کا معاف ہونا حدیث پاک سے ثابت ہے: "الإسلام یهدم ما کان قبله، والهجرة تهدم ما کان قبلها، والحج یهدم ما کان قبله۔ [مشکوۃ بروایة

عمرو بن العاص]

البتہ! جمہور علماء کرام کے نزدیک حقوق اللہ اسلام قبول کرنے سے معاف ہو جائیں گے، مگر حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے، یہی حال ہجرت اور حج کا بھی ہے، نیز یہ بھی یادر ہے کہ عبادات سے صغیرہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں کبیرہ گناہوں کی معافی نہیں ہوگی، کبائر کی معافی کے لیے توبہ شرط ہے۔

توبہ کے شرائط:

حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں سچی توبہ کے لیے تین چیزوں کا جمع ہونا لازمی ہے:

اول:...... اس گناہ کو کلیۃً ترک کرنا۔

دوم:...... جو گناہ کر چکا ہے اس پر دل میں ندامت اور شرمندگی محسوس کرنا۔

سوم:...... پختہ عزم کرنا کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کرے گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی شرائع مختلف ہوتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی شریعت اس مسئلہ میں ہماری شریعت سے مختلف ہو، جہاں ایمان لانے سے حقوق اللہ وحقوق العباد دونوں کی معافی کی گنجائش ہو۔ واللہ اعلم

تو نوح علیہ السلام نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میری دعوت کو قبول کریں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے ساتھ تمہارے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور ان گناہوں کے باعث جو عذاب عنقریب تم پر نازل ہونے والا ہے وہ ٹل جائے گا، اور تمہاری مہلت کو لمبا کر دیا جائے گا۔ فرمایا: جب کوئی قوم اپنے پیغمبر کی دعوت کو ٹھکرا دیتی ہے اور اسے غور وفکر کرنے کے لیے جو مہلت دی گئی ہو وہ ختم ہو جاتی ہے، اور مشیت ایزدی اس قوم کو نیست ونابود کر دینے کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے، تو پھر کوئی طاقت اس فیصلے کو موخر نہیں کر سکتی۔

﴿لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ کاش تم حقیقت کو جان لیتے، اگر یہ حقیقت تم پر آشکارا ہو جاتی تو تم مہلت کے ان قیمتی لمحوں کو ضائع نہ کرتے، بلکہ فوراً توبہ وانابت کر کے ایمان لاتے اور عذاب سے نجات پاتے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝٥ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا

فِرَارًا ۝٦ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ

وَّاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۞

ترجمہ: نوح نے بارگاہ الٰہی میں التجا کی: اے میرے ربّ! میں اپنی قوم کورات اور دن توحید کی دعوت دیتا رہا۞ پر میری دعوت نے ان میں زیادہ نہیں کیا، مگر بھاگنا اور بدکنا۞ اور میں نے جب بھی ان کو ایمان اور دین حق کی طرف بلایا تاکہ آپ ان کو ایمان کی وجہ سے بخش دیں، اور ایمان لانے کے سبب ان کی مغفرت فرمادیں، تو انہوں نے اپنی کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں، اور اپنے کپڑے اپنے اوپر اوڑھ کر سب طرف سے لپیٹ لئے، اور اپنی کافرانہ روش پر اصرار کیا، اور انتہائی تکبر کا اظہار کیا (شاہ صاحب نے فرمایا: کپڑا اوڑھنے لگے کہ ان کی بات ہمارے دل میں نہ لگ جائے)۞

معارف ومنازل

نوح علیہ السلام منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد اپنے فرائض کی ادائے گی میں جان فشانی کے ساتھ مصروف ہوگئے، اور وعظ ونصیحت اور تبلیغ دین کے طوفان برپا کئے، لوگوں نے خاص کر بڑے بڑے سرداروں نے اتنی بے مثال مخالفت شروع کی جس سے قبل از طوفان کئی طوفان برپا کئے، آپ علیہ السلام کو برا بھلا کہا جاتا، طعن وتشنیع کے تیر برسائے جاتے، افتراء وبہتان کے طوفان اٹھائے جاتے، اور آپ کو ﴿ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ ﴾ [الأعراف:٦٦] (ہم تمہیں بے وقوفی میں سمجھ رہے ہیں)۔ بیوقوف ونادان کہتے رہے، حتیٰ کہ آپ کو مار مار کر لہولہان زخمی کردیتے، آپ گھنٹوں بیہوش رہتے، آپ کو کسی مکان میں بند کردیتے اور مار کر بیخود و بیہوش کردیتے، مگر اس جور و جفا، سب وشتم کے باوجود یہ پیکر صدق ووفا بڑے اخلاص کے ساتھ ان کی اصلاح وفلاح میں لگے رہتے، ہوش میں آکر ان کی ہدایت کے لیے دعا فرماتے، استغفار کرتے، اور شب وروز مسلسل سلسلہ تبلیغ جاری رکھتے، عام اجتماعات میں بلند آواز سے انہیں وعظ ونصیحت کرتے، جب وہ اپنی خلوت گاہوں میں چھپ جاتے وہ وہاں پہنچتے، رازدارانہ طور پر خاموشی کے ساتھ انہیں سمجھاتے اور تلقین کرتے، جب وہ سوجاتے یا چادر لپیٹ کر لیٹ جاتے، وہاں جاکر کپڑا اٹھا کر تلقین شروع کرتے، ایک ایک شخص کے پاس جاکر اس کو حق وہدایت سناتے۔

یہ سلسلہ برابر جاری رہا، ماہ وسال کیا ساڑھے نوصدیاں بیت گئیں، اور کئی نسلیں ختم ہوگئیں، اس کے باوجود حق قبول کرنے اور ہدایت کی پذیرائی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے، بلکہ اس کے برعکس ان کی سرکشی، تعصب وعناد میں

اضافہ ہوتا رہا، مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، ہر آنے والی نسل سابقہ نسل سے بدتری اور گمراہی وطغیانی کا مظاہرہ کرتی نظر آئی، ان بے مثال نصیحتوں سے ان کی گمراہی وفرار اور دوری میں اضافہ ہوتا رہا، سوائے معدودے چند مفلوک الحال غریب ومسکینوں کے کسی نے دعوتِ حق کا ساتھ نہیں دیا۔

یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ آپ مایوس ہوگئے اور کہنے لگے: جب بھی میں انہیں وعظ سنانے کھڑا ہوتا ہوں یہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھوس کر بہرے ہوجاتے ہیں، تاکہ میری آواز انہیں سنائی نہ دے، اور کپڑے چہروں اور آنکھوں اور بدن پر ڈالتے تاکہ مجھے نہ دیکھے، اور میں انہیں نہ پہچان سکوں کہ یہ کون ہیں؟ یاربّ! جس طرح میں نے ہر طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کی، اسی طرح انہوں نے ہر طرح نہ سمجھنے کا حربہ استعمال کیا، اور کفر پر جمے رہے، اور غرور وسرکشی میں گم صم رہے اور یہ کہتے رہے کہ ہم تمہیں کیسے پیشوا تسلیم کریں؟ تم تو ہم جیسے عام آدمی ہو، تمہارے پاس مال وسرمایہ کا خزانہ بھی نہیں، اور کوئی فرشتہ تمہاری تصدیق پر مامور بھی نہیں، چند ایک ناکارہ محتاج لوگ تمہارے ساتھ ہیں، کوئی قومی سردار تمہارا معاون ومددگار بھی نہیں۔

ہائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا	☆	کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۟ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۟ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۟ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۟ وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَ
یَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۟ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۟ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۟

ترجمہ: پھر میں نے ان کو بلند آواز سے بلایا (٨) پھر میں نے ان کو علانیہ بھی سمجھایا اور ان کو بالکل پوشیدہ طور پر بھی سمجھایا (٩) اور میں نے ان سے کہا: تم اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، بیشک! وہ بڑا بخشنے والا ہے (١٠) وہ تم پر خوب پے درپے مینہ برسائے گا (١١) اور تم کو مال اور بیٹے دے کر تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے لئے بہت سے باغ لگادے گا، اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا (١٢) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا اعتقاد نہیں رکھتے؟ (١٣) حالانکہ اس نے تمہیں طرح طرح سے بنایا ہے (پیدا کیا ہے) (١٤)

☆☆☆

معارف ومنازل

انسان فطری طور پر سکون وآرام کا طلبگار رہتا ہے، اور مال ودولت کا عاشق اور فریفتہ رہتا ہے، اسی طرح اہل وعیال واولادِ ذکور کا طالب وحریص رہتا ہے، توحضرت نوح علیہ السلام حسب وعدہ فرمانِ الٰہی اپنی قوم کوانہیں پانچ چیزوں کے حصول وفراہمی اور قدرت کی طرف سے عنایت بخشش کا وعدہ دیتے رہے کہ تم توحیدِ الٰہی کا اقرار کرو، کفروبت پرستی سے تائب ہوکر استغفار کرو، اس کے عوض تمہیں آخرت کی ابدی نعمتوں کے علاوہ دنیاوی زندگی میں بھی بڑا سکون وآرام حاصل ہوگا، تمہارا دنیوی معاشرہ جنت نظیر وخوشحال بنے گا، چاروں طرف تمہارے لئے لذیذ اور میٹھے پانی کے چشمے جاری ہوں گے، اور بکثرت نہروں کا سلسلہ جاری رہے گا، ہر قسم کی لہلہاتے، سرسبز وشاداب باغات تمہیں نصیب ہوں گے، خوش ذائقہ اور لذیذ پھلوں کے درخت اور سبزیاں تمہیں دستیاب رہیں گی، مال واولاد اور دیگر ہر طرح کی نعمتیں تمہیں مہیا رہیں گی، بارش کا سلسلہ ہر موسم آسمان سے جاری رہے گا۔

تمہارا معاشرہ امن وسکون اور ہر قسم خوشحالیوں کا نظارہ پیش کرے گا، اور ہر طرح کی پریشانیاں دور ہوجائیں گی، اس کے ساتھ آنے والی آیتوں میں جن نعمتوں کا تذکرہ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم انعامات ہیں جنہیں دلائلِ توحید کے طرز پر بیان فرما کرانہیں خبردار کیا جارہا ہے، مثلاً:

اول: یہ ہے کہ خلاّق عالم سبحانہ نے کتنی بہترین تخلیق اور اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ کے ساتھ تمہیں وجود کی نعمت سے نوازا۔

دوم: ساتوں آسمانوں کوتمہارے اوپر خوبصورت سائباں بنایا۔

سوم: نظامِ کواکب اور شمس وقمر کی روشنی اور دیگر ہزاروں فوائد ومنافع تمہارے لئے مقرر فرمایا۔

چہارم: زمین کی بے قیمت مٹی سے تمہیں کیسی عجیب وغریب قیمتی شکل وصورت کے ساتھ پیدا فرمایا۔

پنجم: پھر موت کی نعمت کے ساتھ ہزاروں اعزاز وشرف کے ساتھ تمہیں زمین کی آغوش میں سلادیا۔

ششم: اس نعمت کے ساتھ تمہیں ابدی زندگی کی راحتوں اور نعمتوں تک رسائی اور حصول کا وعدہ فرمایا۔

ہفتم: زمین کوتمہارے لئے فرش اور مستقر بنا کراس پر تمہیں بسایا۔

ہشتم: زمین کی کشادہ شاہراہوں کوتمہاری سیروسیاحت کی خاطر ہموار بنایا۔

نہم: آسمان سے ہر موسم موسلادھار بارش کے ذریعہ تمہارے لئے ہر قسم خوراک وتعیش کا سامان مہیا فرمایا،

پس جوذات پاک ان نعمتوں کا حقیقی والی وارث اور عطا کنندہ ہے وہی ہر قسم کی عبادتوں کا حقدار و لائق ہے، لہٰذا اُسے واحد لاشریک یقین کر کے صرف اسی کو پروردگار مانو، اور صرف اس کے حضور سر تسلیم خم کر کے اس کی عبادت بجالاؤ، اور کثرت سے استغفار کرو، یعنی اخلاص کے ساتھ معافی مانگو، کیونکہ استغفار کے بے شمار فوائد ہیں، مثلاً:

(١)......استغفار سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔

(٢)......استغفار سے تمام صغیرہ و کبیرہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

(٣)......استغفار سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔

(٤)......استغفار سے ہر قسم پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں۔

(٥)......استغفار سے امن وسکون حاصل ہوتے ہیں۔

(٦)......استغفار سے بیمار شفایاب ہوجاتا ہے۔

(٧)......استغفار سے قحط سالی دور ہوجاتی ہے۔

(٨)......استغفار سے ہر حاجت پوری ہوجاتی ہے۔

(٩)......استغفار سے مردوں کی قبر روشن ہوجاتی ہے۔

(١٠)......استغفار سے قرض ادا ہوجاتے ہیں۔ امام غزالی اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہما نے استغفار کے تقریباً چالیس فوائد بیان کئے ہیں، آیت کریمہ میں صرف چند فوائد کا ذکر ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٣] (اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں سے تھے انہیں عذاب دیتا، اور ایسا نہ تھا کہ وہ بخششیں مانگیں اور انہیں عذاب دے)۔ یہ آیت کریمہ بتارہی ہے کہ کثرت استغفار مانعِ عذاب ہے، قاله ابن عباس رضي الله عنه۔ [روح المعاني] اور استغفار ایک برگزیدہ عمل ہے، ایک ہی مجلس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سو کے قریب کلمہ استغفر اللہ کا ورد کرتے تھے، حدیث میں ہے کہ جس شخص کے نامہ اعمال میں استغفار کی کثرت ہووہ قابل مبارک باد ہے۔ [مشكوٰة]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ استسقاء کے لیے باہر نکلے کوئی نماز یا دعا نہیں کی صرف استغفار پر اکتفاء فرمایا، اور یہی آیت بطور استشہاد تلاوت فرمائی۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ہر مصیبت دینی و دنیوی پریشانی، فقر و فاقہ وغیرہ کا علاج

استغفار سے کیا جائے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ مردوں پر قبروں میں جب نعمتوں راحتوں کی بارش ہوتی ہے، تو انہیں یہ بتایا جائے گا کہ تمہارے زندہ رشتہ داروں نے تمہارے لئے استغفار کیا، یہ اس کا ثواب ہے۔ [مشکوٰۃ]

اَلَمۡ تَرَوۡا کَیۡفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الۡقَمَرَ فِیۡہِنَّ نُوۡرًا وَّ جَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَ اللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ یُعِیۡدُکُمۡ فِیۡہَا وَ یُخۡرِجُکُمۡ اِخۡرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسۡلُکُوۡا مِنۡہَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے پیدا کیا ہے سات آسمانوں کو تہ بہ تہ؟ ﴿۱۵﴾ اور بنایا ہے چاند کو ان میں روشنی اور بنایا ہے سورج کو درخشاں چراغ ﴿۱۶﴾ اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے ﴿۱۷﴾ پھر لوٹا دے گا تمہیں اس میں، اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالے گا ﴿۱۸﴾ اور اللہ تعالیٰ نے اسی زمین کو تمہارے لئے فرش کی طرح بچھا دیا ہے ﴿۱۹﴾ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو ﴿۲۰﴾

معارف ومنازل

قولہ تعالیٰ: ﴿سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا﴾ حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ، حکمتِ بالغہ کی کرشمہ سازی کی دلیل پیش فرما رہے ہیں کہ میں نے درجہ بدرجہ جو سات آسمان بنائے ہیں یہ آسمان غیر مربوط بکھری ہوئی صورت میں نہیں ہیں، بلکہ ایسی عمدگی اور نظم سے انہیں ترتیب دی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے اوپر منطبق ومربوط ہیں، فرمایا:

اپنے اوپر اس منظم ومحکم نظام کو دیکھو، اور کروڑوں ٹنوں نور وروشنی برسانے والے چاند کو دیکھو، اور کھربوں ٹنوں روشنی پہنچانے والے نیر اعظم، آفتاب عالمتاب سورج کو دیکھو، اور غور وفکر کرو کہ یہ کس ذات کی صناعی وبے مثال تخلیق ہے؟ کیا اس ذات پاک پر ایمان لانے کے لئے اس کے بعد بھی تمہیں کسی دلیل کی ضرورت ہے؟ سورۃ الملک میں مکمل کلام گزر چکا ہے، ملاحظہ ہو۔

﴿وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ بِسَاطًا تاسُبُلًا فِجَاجًا﴾ کہیں فرمایا: مِهَادًا، اور کہیں فِرَاشًا فرمایا، یہاں بِسَاطًا، تقریبًا سب کا ایک مطلب ومعنی ہے۔

"سُبُل" سبیل کی جمع ہے، بمعنی راستہ۔

''فِجَاجًا'' جمع ہے فجّ کی، سورۃ الحج میں ہے: ﴿مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ﴾ [الحج:۲۷] (ہر کشادہ گہرے راستے سے)۔فجّ دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ راستہ کا نام ہے، اور عام کشادہ راستہ کو بھی فجّ کہتے ہیں۔

یہاں اس خصوصی نعمت واحسان کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا ہے، اور اس میں بڑے بڑے کشادہ راستے بنا دیئے، جن پر چل کر تم دور دراز مسافتوں کو بآسانی طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہو۔ یہاں تلمیح واشارہ ہے کہ جس ہستی نے تمہارے لئے چاند وسورج بنائے، اور کشادہ راستوں کا انتظام فرمایا اسی طرح تمہارے لئے ہدایت کا راستہ اور اس پر چلنے کے لیے توحید وشریعت کے انوار وبرکات کا راستہ بھی بنایا، کاش تم یہ سب کچھ جانتے۔

قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ اِنَّهُمۡ عَصَوۡنِىۡ وَاتَّبَعُوۡا مَنۡ لَّمۡ يَزِدۡهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوۡا مَكۡرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَقَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمۡ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوۡثَ وَيَعُوۡقَ وَنَسۡرًا ﴿۲۳﴾ وَقَدۡ اَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ مِمَّا خَطِيۡٓــٰٔتِهِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا ۙ فَلَمۡ يَجِدُوۡا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡصَارًا ﴿۲۵﴾

ترجمہ: نوح نے عرض کیا: اے میرے ربّ! انہوں نے مسلسل میری نافرمانی کی، اور ان لوگوں کی پیروی کرتے رہے جن کو نہ بڑھایا ان کے مال اولاد نے بجز خسارہ کے (یعنی مال واولاد کی کثرت نے انہیں گمراہ کر کے خسران میں ڈال دیا) ﴿۲۱﴾ اور انہوں نے بڑے بڑے مکروفریب کئے ﴿۲۲﴾ اور ان بڑوں نے کہا: اے لوگو! (نوح کے کہنے پر) اپنے خداؤں کو ہرگز نہ چھوڑنا، اور خاص طور پر وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو ﴿۲۳﴾ اور انہوں نے گمراہ کیا بہت سے لوگوں کو۔ یاربّ! تو بھی ان کی گمراہی میں اضافہ کر ﴿۲۴﴾ اپنی خطاؤں کے باعث انہیں غرق کر دیا گیا، پھر انہیں آگ میں ڈال دیا گیا، پھر نہ پایا انہوں نے اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

حضرت نوح علیہ السلام نے عرصۂ دراز تک تبلیغِ حق اور سمجھانے ونصیحت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ادھر قوم کے مالداروں، سرداروں اور رؤساء نے عوام الناس کو گمراہ اور بے راہ کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی، وہ ہر وقت رکاوٹیں

کھڑی کر کے عوام الناس کو قبولِ حق سے منع کرتے رہے۔ پوری دنیا کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ امر بخوبی عیاں وآشکارا ہے جس پر تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہر زمانے میں مالدار اور سرمایہ دار لوگ حق کی مخالفت میں پیش پیش رہے ہیں اور رہتے ہیں، چاہئے تو یہ تھا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایات اور نعمتوں کی قدر کرتے، اور اس کی نعمتوں کے مقابلے میں شکر گزار رہتے، خود بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہدایت پر قائم رہتے، اور اپنے ماتحت عوام کو بھی تلقین کر کے انہیں ہدایت قبول کرنے پر مجبور کرتے، مگر خداوند تعالیٰ بیڑا غرق کرے کرسی واقتدار اور کثرتِ مال کا کہ یہ دونوں ہمیشہ تمرد اور غرور پیدا کرنے میں بڑے تیز تر ثابت ہوئے، اور ان بیش بہا انعامات کے ہوتے ہوئے حق وصداقت کا ہمیشہ انکار ہوتا رہا، اسلام ہمیشہ غریبوں کے بطفیل چار دانگ عالم میں پھیلا ہے، اور غریب ہی نے اس کی اشاعت وتبلیغ کی ہر زمانہ میں قیادت کی ہے۔

امراء نشہ دولت میں ہیں بیزار ہم سے	☆	زندہ ہے ملت بیضا غرباء کے دم سے

(اقبالؒ)

نوح علیہ السلام کے بڑے مخالف ان کی قوم کے مالدار اور سرمایہ دار ہی رہے، وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے کہ عام لوگ بھی نوح علیہ السلام کے مخالف اور ان سے برگشتہ وبیزار ہوں، اور ان کے دین کو قبول نہ کریں، انہیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتا تھا کہ اگر لوگوں نے ان کے دین کو قبول کیا تو ہماری سرداری اور چودھراہٹ ختم ہو جائے گی، اور اگر یہ کمزور وضعیف لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے تو ہم کسی کام کے نہیں رہیں گے، ساری قوم کی سیادت و پیشوائی نوح علیہ السلام کے کھاتے میں جائے گی، پھر ہم بھی اس کے عام رعایا اور خدام میں شمار ہوں گے، ہماری عزّت و سلطنت خاک میں مل جائے گی۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ اہل مدینہ نے عبداللہ بن ابی بن سلول (رئیس المنافقین) کی سرداری پر متفق ہو کر اس کو اپنا سرپرست وقائد بنانے کا فیصلہ کیا، اور اس کی دستار بندی کا ارادہ کیا، اچانک دوسری طرف سے اہل مدینہ پر شمس نبوت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا طلوع ہوا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیادت ونبوت کے ظہور سے وہ پروگرام ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، اس پر اس خبیث نے آگ بگولہ ہو کر اہل مدینہ میں منافقت کا تخم ڈال کر اپنی جماعت بنالی، اور تادمِ مرگ مخالفت اسلام وعداوت نبوی میں سرگرم اور پیش پیش رہا، یہاں تک کہ اس پر موت آئی اور جہنم رسید ہوا۔

اسی طرح قوم نوح علیہ السلام کے سرداروں کو جب اندازہ ہوا کہ اگر قوم نے پیغمبر کا کہنا مان کر ایمان قبول کیا، تو

ہماری سرداری کا براحشر ہو جائے گا، اور ہمارا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو جائے گا۔

حضرات مفسرین اور مؤرخینِ اسلام نے لکھا ہے کہ ایسے لوگ قلیل تعداد میں نہیں تھے، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، انہوں نے نوح علیہ السلام کی شان میں اتنی گستاخیاں کیں کہ جس کی حد نہ ہو، اس کی شخصیت کو اپنے مسموم ارادوں سے داغدار بنانے کی کوشش کی، اور طرح طرح کے حربے، فریب اور مکر سے کام لیا، اپنی نسلوں کو یکے بعد دیگرے اس کی مخالفت کی وصیت بھی کی، اسی بات کے پیش نظر قرآن کریم نے ان کے مکر وفریب کو ﴿مَكْرًا كُبَّارًا﴾ سے تعبیر فرمایا۔ یہ ''كُبَّارًا'' مبالغہ کا صیغہ ہے، کثرت کے معنی میں ہے۔

چونکہ ہر انسان کے گلے میں اطاعت و پابندی کا ایک طوق (غلامی) فطری طور پر ڈالا گیا ہے، اگر کسی نے انسان پرستی کا طوق قبول کیا تو خدا پرستی کا خدا حافظ، لیکن اگر خدا پرستی کا طوق گلے میں آیا تو بادشاہ یا سردار پرستی کا پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، قومی سردار ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ عوام کی رسائی خدا تک نہ ہو، شریعت و مذہب تک رسائی نہ ہو، کیونکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ پھر ہم کسی کام کے نہیں رہیں گے، اور ہماری حیثیت باغ کی گاجر و مولی کی ہوگی۔ واللہ اعلم

اصنام پرستی کی مختصر تاریخ وسرگزشت:

اسی سابق بنیاد پر قوم کے امراء، چوہدریوں، خان صاحبان اور سرداروں نے واویلا شروع کیا تھا، اور قوم کو بیوقوف بنا کر اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر ان کی عاقبت وانجام پر ڈاکہ ڈالا تھا، وہ جانتے تھے کہ قادر مطلق کی غلامی سے قوم میں شعور وجرأت کا پیدا ہونا لازمی ہے، ورنہ پھر ہم کہیں کے نہیں رہیں گے، کیونکہ ربّ العزّت کے حضور میں جو شخص سجدہ ریز ہوگا وہ پھر کسی بھی شخصیت کا سجدہ نہیں کرے گا، لہٰذا انہیں سمجھایا جائے، بتوں اور باطل معبودوں کی عبادت پر انہیں مضبوط ومحکم پابند رکھا جائے، کیونکہ ان ناجائز معبودوں کا پرستار پھر ہر در پر، ہر پیر وفقیر، ہر رئیس وسردار کی پیشانی پر سجدہ کرنے پر اعتقاداً وعملاً ہر وقت تیار رہے گا۔

حضرت اقدس شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں کہ معبود کے اثر کا عابد میں پیدا ہونا یقینی اور بدیہی امر ہے، پس اللہ تعالیٰ کا بندہ کبھی غیر اللہ کے در پر ٹھوکریں نہیں کھاتا اور نہ کھائے گا، اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کرتا اور شرک میں (اگرچہ معمولی ہو) مبتلا ہوگا تو غیور ربّ العزّت اس کو ہزاروں دروازوں پر ذلیل وخوار کرکے اسے سجدہ کروائے گا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت ☆ بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے راسخ العقیدہ موحد مسلمان میرو، زیر، شاہ وسلاطین کے دروازوں پر حاضری نہیں دیتے، اوران سے کچھ بھی امید نہیں رکھتے، اوران کے سامنے نہیں جھکتے، ان کے محلات اور دفتروں پر حاضری دے کر جھاڑو نہیں کھینچتے۔

جو ہیں مستغنی عنایات وزیر شاہ سے ☆ جن کی امیدیں ہیں وابستہ فقط اللہ سے

برخلاف ان بدعقیدہ، بے انصاف، مشرک وقبر پرست، نواب وسردار پرست، شاہ وگدا پرست، بے حوصلہ لوگوں کے جنہیں ربّ العزّت کے پاکیزہ چوکھٹ سے محروم رکھا گیا ہے، وہ پھر تازیانۂ عبرت کے چابک سے اتنے بے حوصلہ ہو چکے ہیں کہ تکوینی طور پر زخم خوردہ، بے مروّت، بے جان، بے ہمتی، کے عالم میں ہزاروں دروں پر قطار در قطار کھڑے منتظر رہتے ہیں، یہ کوئی افسانہ نہیں، کسی قوم نوح علیہ السلام کی ماجرا نہیں، آج بھی اگر مشاہدہ کرنا چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔ ولا حول ولا قوة إلا باللہ۔

تجھ کو چھوڑا تو رسول عربی کو چھوڑا	☆	بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے	☆	ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

① ...... (۱) ود (۲) یغوث (۳) یعوق (۴) سواع (۵) نسر۔

② ...... (۱) ھبل (۲) لات (۳) مناۃ (۴) عزیٰ (۵) اساف (۶) نائلہ۔

③ ...... اسی طرح (۱) وشنو (۲) برہما (۳) اندر (۴) شیورام (۵) کرشن (۶) ہنومان، وغیرہ۔

اول پانچ بت قومِ نوح (علیہ السلام) کے معبود تھے۔ دوسرے نمبر کے چھ بت اقوامِ عرب کے ہاں قبل از اسلام معبود ہوتے تھے۔ آخری چھ بت اہل ہنود اور ہندو قوم میں معبود ہوتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ بت ان مشرک اقوام میں بہت اونچے درجے کے ہوتے تھے، ان کے علاوہ ہزاروں بت ان کے ماتحت چھوٹے درجے کے بھی ہوتے تھے۔ لعنة اللہ علیھم۔ یہ مذکورہ بت اوران کے علاوہ دیگر ہزاروں ذیلی بت دراصل صابی مذہب کی پیداوار ہیں۔

بابل، عراق قدیم تاریخ میں خراسان (ایران کا مرکز ہوتا تھا) جہاں نوح علیہ السلام سے پہلے ملوک فارس کی حکومت اور اقتدار کا زمانہ رہا ہے، فارس پر تقریباً ۵۴ بادشاہوں نے حکومت کی ہے، پہلے اور اول بادشاہ کا نام

کیومرث بن آدم علیہ السلام ہے، آخری بادشاہ کا نام یزدجرد ہے، جسے خلافت عثمانی میں مسلمان مجاہدین نے ہلاک کیا تھا، اس فہرست میں کیومرث کے بعد تیسرے نمبر پر طہمورث بن نوب جہاں بن ارفخشد ہے، جس کے زمانے میں صابی مذہب کا ظہور ہوا۔ صائبین کا ذکر قرآن حکیم میں کئی مرتبہ آیا ہے، یہ کواکب پرست فرقہ ہے۔ علامہ ابن الجوزیؒ نے ''تلبیس إبلیس'' کتاب میں ان کے متعلق دس اقوال تک ذکر کئے ہیں۔

یہ فرقہ بنی آدم کا قدیم ترین مشرک اور کافر فرقہ ہے، اس فرقہ کے بانی کا نام ''بوداسف'' ہے، یہ طہمورث بادشاہ کے زمانے میں ظاہر ہوا، یہ فرقہ نہایت خبیث، بدعقیدہ اور منکر توحید ہے، یہ سیارات وثوابت ستاروں کی شکلیں اور ہیکل بنا کر اپنے عبادت خانوں میں رکھتے ہیں، اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔ [مروج الذهب]

طوفانِ نوح (علیہ السلام) کے عرصہ بعد یہ بت پرستی صابئیت آشوری اقوام میں بڑے زور وشور کے ساتھ رواج پایا، نمرود بن کنعان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اس کا مذہب بھی یہی صابئیت تھا، اور وہ آشوری قوم کا سربراہ تھا، جو اُلوہیت کا مدّعی اور بت پرست تھا، بتوں کی پوجا کرتا تھا، پورے عراق پر اس کی حکومت تھی، نینوا اور بابل میں ایک بہت بڑا بت کدہ تعمیر کرایا تھا، جس میں بے شمار بت رکھے ہوئے تھے، جنہیں حضرت خلیل علیہ السلام نے توڑ کر مسمار کیا تھا، جس کی پاداش میں انہیں آگ میں ڈالا گیا، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔

فائدہ:

عقلِ انسانی جب وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہو تو مطلق العنانی کے عالم میں ہزاروں گمراہیوں کا شکار ہوجاتی ہے، اور حقیقی معرفت کے سارے دروازے اس پر بند ہوجاتے ہیں، پھر وہ حقائقِ اشیاء وموجودات کی صحیح شناخت سے نابینا ہوجاتی ہے، قرآن کریم نے اس کو ﴿ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى ﴾ [الإسراء: ۷۲] (اس دنیا میں اندھا) سے تعبیر فرمایا، اور اس بے راہ اور سقیم عقل کی حماقت کو واضح فرمایا۔ یہ صنم پرستی اور شرک کی ترویج واشاعت اسی عقل مختل آفت زدہ کا بے بنیاد کارنامہ ہے۔

صائبین نے یہ عقیدہ تسلیم کیا اور بنایا کہ اجرامِ سماوی (چاند، سورج، ستارے) سب جاندار اور ذی روح ہیں، اور پورے عالم کے امورِ خیر وشر میں متصرف ہیں، ان کا تعلق عالمِ دنیا کے ساتھ ہمہ گیر قائم ومنسلک ہے، اور اسی تعلق کی بنا پر یہاں کے سارے تغیرات ولادت، موت، صحت، مرض، فتح، شکست، عزّت، مال، غنا، خوشحالی، غم، وغیرہ رونما ظاہر ہوتے ہیں، ان میں تمام ستاروں کا تصرف وکارنامے شامل ہیں، اور وہی اس پورے نظامِ عالم میں مدبر د

متصرف ہیں، جہاں یہ کواکب منیرہ روشنی فراہم کرتے ہیں وہاں یہ تمام امور دنیا میں موثر بھی رہتے ہیں، تب انہوں نے ان تمام کواکب کی پرستش کو حق سمجھ کر ان کی عبادت شروع کی، لیکن جب یہ اجرام ان کی رسائی سے چونکہ بالاتر تھے، اور بیشتر ان کی آنکھوں سے بھی پوشیدہ تھے، اس لئے انہوں نے ان کے ناموں پر بت واصنام بنا کر عبادت گاہوں میں رکھ لئے، تاکہ ان کے تصور وذکر کی وہاں تک رسائی ہو سکے، چنانچہ اس طرح یہ بت معرض وجود میں آئے اور معبود بنا لئے گئے، اور ان کی عبادت شروع ہو گئی۔

مذاہبِ باطلہ میں سب سے قدیم مذہب انہیں صائبین کا ہے، حضرت نوح علیہ السلام طوفان سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک تقریباً تمام معمورہ پر اسی باطل عقیدہ کی گرفت عام رہی، ہوسکتا ہے یہ پانچ بت جن کی پرستش نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہوتی تھی بعض ستاروں کے نام ہوں، اور ان کے ناموں پر یہ پانچ بت تراشے گئے ہوں۔ نسر دوستاروں کا نام ہے، ایک ''نسر الواقع'' اور دوسرے کو ''نسر الطالع'' کہتے ہیں، آشوری اقوام کے بت کا نام ''نسر الطائر'' اور نسروخ یعنی نسر عظیم ہوتا تھا، اور یہ نینوا کے مرکز میں رکھا ہوا ہوتا تھا۔ اسی طرح باقی چار بتوں کا حال سمجھنا چاہئے۔

عرب میں لوگ بت پرستی سے چنداں واقف نہ تھے، حجاز کے لوگ اکثر وبیشتر ابراہیمی ملّت کے پیروکار تھے، جب قبیلۂ خزاعہ نے بزور شمشیر جرہُم قبیلے کو کعبۃ اللہ کی تولیت وسرپرستی سے بے دخل کر کے یمن کی طرف نکالا، اور قبیلۂ خزاعہ نے مکۃ المکرمہ اور اس کے نواح پر اپنی حکومت قائم کی، اور پورے حجاز پر ان کا اقتدار مضبوط ہوا، تو وہاں کے لوگ وقتاً فوقتاً گرمیوں میں ملک شام کی طرف بغرض تجارت سفر کرتے رہتے، اسی اثنا خزاعہ کا رئیس عمرو بن لحی بن قمعہ ملک شام جاتا تھا۔

یہ منحوس بڑا ہشیار اور مالدار مانا ہوا سردار تھا، اور ساڑھے تین سو سال عمر پائی، اس کے زمانے میں کلدانیوں اور آشوریوں کا عقیدہ مشرکانہ تھا، یہ صائبیت اور بت پرستی کے عروج کا زمانہ تھا، ملک شام اور عراق کے بعد شرک اور بت پرستی کی آماجگاہ ہوتا تھا، وہاں سے عمرو بن لحی بن قمعہ خزاعی نے بتوں کا پورا کھیپ حجاز مقدس برآمد کیا، اور ملک میں رواج دیا، اور بت پرستی کی ترویج میں اپنی پوری قوت صرف کردی۔

کعبۃ اللہ شریف جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا، اس بدبخت نے اسے مکمل بت خانہ بنا دیا، عرب کے مختلف قبائل نے اس منحوس عقیدۂ بت پرستی کو آناً فاناً قبول کرلیا، اور

ملّتِ ابراہیمی کے تمام پاکیزہ اعمال سے منحرف ہوگئے، یہ لعنتی عقیدہ یمن کے اطراف واکناف تک پھیل گیا، اور پورا عرب شرک وبت پرستی میں ڈوب کرغرق ہوا۔ عرب کے مختلف قبائل کے ہاں جو بت تھے ان میں بھی جن بتوں کو بڑی شہرت اور ناموری حاصل تھی وہ پانچ بت بھی یہی تھے، جن کے نام ودّ، سواع، یغوث، یعوق، اورنسر تھے۔ [ارض القرآن، تلبیس ابلیس وغیرہما]

﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا﴾ حضرت نوح علیہ السلام بارگاہ الٰہی میں درخواست پیش فرمارہے ہیں: اے ربّ العزّت! ان ظالموں کی گمراہی میں مزید اضافہ فرما تاکہ مکمل عذاب کے مستحق وحقدار ہوں، اور انہیں ان کی بدمعاشیوں، مکاریوں، خباثتوں اور شرارتوں کی خوب جلدی واجبی سزا ملے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع ہوئی کہ یہ لوگ آئندہ کبھی ایمان قبول نہیں کریں گے، مزید جدوجہد اور ہدایت کی دعا بے سود ہے۔ ﴿لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ﴾ [ھود:۳۶] (ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تمہاری قوم میں سے مگروہ جو ایمان لاچکے ہیں)۔ جن چندلوگوں نے ایمان لاناتھا وہ ایمان لے آئے، مزید کوئی ایمان نہیں لائے گا، تب انہوں نے ان کی ضلالت وگمراہی میں اضافے کی دعا کی، تاکہ عذاب جلدی آجائے، اور اگر یہ بات متحقق نہ ہوتی، وہ ہرگز یہ دعا نہ کرتے، جیسے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شان ہے کہ بلاوجہ بددعانہیں کرتے ہیں۔

﴿مِمَّا خَطِیۡٓـٰٔتِہِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا﴾ یہاں فا تعقیب مع الوصل کے لئے ہے، جوں ہی غرق ہوئے فوراً آگ میں داخل کئے گئے، قیامت کی آگ مرادنہیں، برزخ کی آگ مراد ہے۔ یہ آیت صریح ہے اثباتِ عذاب قبر وبرزخ کے متعلق، اہلسنت والجماعۃ کا متفق علیہ مذہب ہے کہ عذاب قبر وبرزخ برحق ہے۔

برزخ کے عذاب کے لیے زمینی قبر میں مدفون ہوناضروری نہیں، صاحب روح المعانی نے تصریح کی ہے: هي نار البرزخ فالمراد عذاب القبر ومن مات في ماء أو نار أو أكلته السباع أو الطير مثلاً أصابه مايصيب المقبور من العذاب۔ اس آگ سے مراد برزخ کی آگ ہے، مقصد عذاب قبر ہے، جوشخص پانی میں غرق ہوجائے یا آگ میں جل جائے، یا پرندے چرندے اسے کھاجائیں، تواس کوبھی وہی عذاب ہوتا ہے جوظاہری قبر میں مدفون کو ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف جنت اوراس کی راحتیں بھی برزخ میں جس طرح مدفون مسلمان متقی کو حاصل رہتی ہیں، اسی طرح کسی بھی ذریعے سے فوت شدہ متقی مسلمانوں کوبھی برابر حاصل رہیں گی، اس بارے میں معتزلہ کا مذہب باطل ہے جوعذاب قبرکونہیں مانتے۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا
عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ
مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ إِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ: اور نوح نے عرض کیا: اے میرے ربّ! نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا ﴿۲۶﴾
اگر تو نے ان میں سے کسی کو چھوڑ دیا تو وہ گمراہ کر دیں گے تیرے بندوں کو، اور نہیں جنیں گے مگر ایسی اولاد جو بڑی بدکار
سخت ناشکر گزار ہوگی ﴿۲۷﴾ میرے ربّ! بخش دے مجھے، اور میرے والدین کو، اور اسے بھی جو میرے گھر میں ایمان
کے ساتھ داخل ہوا، اور بخش دے سب مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو، اور کفار کی کسی چیز میں اضافہ نہ کر بجز ہلاکت
و بربادی کے ﴿۲۸﴾

معارف ومنازل

یعنی ایک کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑیئے، ان میں کوئی اس لائق نہیں کہ اسے باقی رکھا جائے، جو کوئی باقی رہے گا میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس کے نطفہ سے بھی بے حیا، منکرِ توحید اور ناشکرے پیدا ہوں گے، اور جب تک ان میں سے کوئی موجود رہے گا خود تو راہ راست پر کیا آتا دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ [عثمانی]

ابن ابی حاتم میں ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر طوفان نوح میں ربّ العلمین کسی پر رحم کرتا تو اس کے لائق وحقدار وہ عورت تھی جو پانی کو نیچے سے ابلتے اور اوپر سے برستے دیکھ کر اپنے شیر خوار بچے کو لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پہاڑ پر چڑھ گئی تھی، جب پانی پہاڑ کی چوٹی پر اوپر چڑھا، تو بچہ کو اٹھا کر کندھے پر اٹھالیا، جب پانی کندھے پر جا چڑھا، تو اس کو سر پر اٹھالیا، جب پانی سر تک پہنچ گیا تو بچے کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اوپر اٹھالیا، لیکن پانی وہاں بھی جا پہنچا ماں بیٹے دونوں غرق ہوگئے۔ [ابن کثیر] یہ عذاب کا پانی چالیس دن تک زمین سے ابل ابل کر اور اوپر سے نہایت قوت کے ساتھ موسلا دار بارش کی شکل میں برستا رہا۔

چونکہ شرک ناقابلِ معافی ظلم ہے، ہر گناہ کی بخشش ہوسکتی ہے مگر شرک کی کوئی بخشش نہیں، بنی اسرائیلی شخص سو آدمی قتل کر کے مغفرت حاصل کر سکتا ہے مگر مشرک خود کیا اس کا شیر خوار بچہ بھی معافی کا حقدار نہیں ہوتا، یہ لوگ جن باطل معبودوں کا جو احرام باندھے غرور میں مبتلا تھے، وہ بھی ان کے ساتھ غرقاب ہوگئے، نہ وَدّ، آئے نہ سواع نے مدد کی،

نہ **یغوث** نے فریادرسی کی، نہ **یعوق** کام آئے اور نہ ہی **نسر** سے کچھ بنا۔ ربّ العزّت کے مقابلے میں کوئی نہیں آیا، ان کے سارے غوث ودستگیروں نے اپنے عجز وناتوانی میں انہیں کیا بچاسکتے، جب وہ خود بھی تباہ وغرق ہوئے۔ فاعتبروا ياأولي الأبصار۔ إن شاء اللہ ہر زمانے میں مشرکوں کا یہی حال وانجام ہوگا، یہی خدائی اٹل فیصلہ ہے۔

نوح علیہ السلام کی کشتی مسلسل چالیس روز تک کعبۃ اللہ شریف کا طواف کرتی رہی۔ یاد رہے! کعبۃ اللہ شریف زمین سے لے کر آسمانوں تک پوری فضاء پر اس کے حدود واطراف حاوی ہیں، اگر کوئی ہزاروں گز میٹر اوپر ہوائی جہاز میں کعبہ کی طرف نماز پڑھے تو صحیح ہے۔ [تاریخ مکہ ازرقی]

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا اور خوب جامعیت کے ساتھ دعا کی، یوں گویا ہوئے: ''اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے مؤمن والدین کو بخش دے، اور وہ جو میرے گھر (کشتی) میں مؤمن کی حیثیت سے داخل ہوا۔ لیکن اس دعا میں شیطان شامل نہیں، کیونکہ وہ بحیثیت مؤمن کشتی میں نہیں آیا۔ [مظهري]

گھر سے مراد مسجد یا کشتی ہر دو ہوسکتی ہیں، یا مراد رہائشی گھر جس میں سوار ہونے سے پہلے اسی کے قریب مؤمن جمع ہوئے تھے، جب حکم آیا تو کشتی میں سوار ہوئے اور کہا: قیامت تک آنے والے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی بخشش فرمادے۔ سبحان اللہ! کیسی جامع دعا ہے، اے ارحم الراحمین! ہمیں سب کو اس دعا اور اس کی مغفرت میں شامل فرما۔

علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روزانہ جو شخص بلاناغہ ستائیس مرتبہ یہ دعا پڑھے گا تو وہ شخص مستجاب الدعوات، عباد اللہ الصالحین کے زمرے میں شامل ہوجائے گا، دعا یہ ہے:

اللهم اغفرلناولجميع المؤمنين والمؤمنت والمسلمين والمسلمات الأحيآء منهم و الأموات۔ [حصن حصين] لطف یہ کہ اس کے پڑھنے والے کے لیے فرشتے بھی دعا فرمائیں گے۔

دعا کا تیسرا حصہ: ﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا﴾ ظالمین کے لئے تباہی کے سوا کچھ نہ کر۔

﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [البقرة:۲۵۴] (اور کافر ہی ظالم ہیں)۔ ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان:۱۳] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [آل عمران:۸۶] (اور اللہ راستہ نہیں بتاتا ظالم قوم کو)۔ کافر ہی ظالم ہیں، اور مشرک ہی اصلی ظالم و بے انصاف ہے، جس نے شرک جیسے جرم کا ارتکاب کر کے ربّ العزّت سبحانہ کی اُلوہیت کو تسلیم نہیں کیا اور مجبور ولاچار، محتاج و بے بس اور بے

اختیار معبودوں کو اس کا ساجی مقرر کیا، اسی بناء پر وہ نا قابلِ معافی ہے، اور مستحقِ عفو و درگزر نہیں ہے، اور ابدی جہنمی ہے، اگر چہ وہ ایمان کا اپنے زعم میں ظاہری دعویٰ بھی کرے، اور روزہ رکھ کر نماز بھی پڑھے، وہ مطلقاً ہر وقت ہمیشہ نجس اور ناپاک رہے گا۔ ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ [التوبة:۲۸] (بیشک مشرک ناپاک ہیں)۔ تو ظاہر ہے ناپاک اور بے وضو کی نماز ہی نہیں، پس شرک کے ہوتے ہوئے اس کی نماز فضول اور عبث ہے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ [النساء:۴۸] (بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے، اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے گا بخش دے گا)۔ اسی کے ساتھ سورۂ نوح کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔

الحمد للہ رب الغلمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

سید عبدالستار شاہ

۲۳ ذوالقعدہ ۱۴۳۱ھ

سُوۡرَۃُ الۡجِنّ

مکیۃٌ آیاتہا ۲۸ رکوعاتہا ۲

سورۂ جن مکی ہے، اس میں اٹھائیس (۲۸) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:

اس سورت میں ایک مخلوق جنات کا بیان ہے، اور پہلی آیت میں لفظ الۡجِنّ بھی مذکور ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ الاعراف کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس کی اٹھائیس (۲۸) آیات، دوسو پچاسی (۲۸۵) کلمات اور آٹھ سوستر (۸۷۰) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

گزشتہ سورت کی طرح اس میں توحید، رسالت، قیامت، اور ضمناً قرآن مجید کی حقانیت، نیز صداقتِ وحی اور دیگر مظاہر قدرت کا بیان ہے۔

مختصر موضوع:

سورۂ نوح میں منکرینِ توحید ورسالت اور قیامت کا تذکرہ اور طوفان کا بیان تھا، یہاں جنات کے ایمان اور محض استماع قرآن پاک سے قبولِ حق جو کہ ایک اعلیٰ کارنامہ اور ایمان افروز حقائق پر مشتمل واقعہ کا بیان ہے، قومِ

نوح وقومِ قریش کتنے بدقسمت اور ہٹ دھرم نکلے کہ اہل لسان ہم قوم وہم زبان ہونے کے باوجود کثرتِ تبلیغ، استماعِ حق اور ظاہر وباہر معجزات کے مشاہدے کے باوجود ایمانی سعادتوں سے محروم رہے، جبکہ جنّات ہم جنس وہم زبان بھی نہیں تھے، نیز انہوں نے کوئی معجزہ بھی کبھی نہ دیکھا نہ سنا، اور نہ ہی انہیں تبلیغ وموعظت سننے کا موقعہ ملا، چلتے چلتے وہ نخلہ میں قرآن پاک سن کر ایمان لائے اور مبلغ بن کر اپنی قوم میں ترانۂ توحید بنا کر ہزاروں جنّات کی ہدایت وایمان کا سبب بنے۔ ﴿وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ﴾ [الحديد:٢١] [یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے]۔

"جنّ" جیم ونون کا مادہ بمعنی مستور وپوشیدہ۔ "جنّ" کو جنّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی نظروں سے غائب اور پوشیدہ رہتے ہیں، بنی آدم انہیں نہیں دیکھ سکتے، جبکہ وہ ہمیں دیکھتے ہیں۔ ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا﴾ [الأنعام:٧٦] (جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا (تو آسمان میں) ایک ستارا نظر پڑا) میں رات کی تاریکی مراد ہے۔

جنون، مجنون، جنان، جنت یہ سارے اسی مادے کے افراد ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی مختلف قسمیں ہیں: کسی میں عقل غالب ہے، تو کسی میں وہم کا غلبہ ہے، کسی میں شہوت وغضب کا غلبہ ہے، کسی مخلوق میں مختلف صفات کی ترکیب ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

اول: الملائكة: ملائکہ وہ مخلوق ہے جس میں دیگر صفات کی نسبت عقل غالب ہے، اس میں شہوت کا مادہ ہرگز نہیں، ہاں! غضب اس میں ہے، مگر مغلوب ہے، اس پر عقل کا غلبہ ہے، ملائکہ میں عقل، علم اور فہم کی فراوانی ہے۔ [عزیزی] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ملائکہ کی سات قسمیں ہیں: سب سے اعلیٰ ملائکہ کرام حاملین عرش ہیں، ان کے بعد ان فرشتوں کا نمبر ہے جو ﴿حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾ [الزمر:٧٥] (یعنی عرش الٰہی کے ارد گرد گھومنے والے ہیں)۔ تیسرے نمبر پر وہ فرشتے ہیں جو آسمانوں کے اوپر ہیں، ان میں ہفت آسمانوں کے ملائکہ کا نمبر ہے، اسی ترتیب کے ساتھ اوپر سے نیچے کی طرف، ان کے بعد فضاء والے ملائکہ کا مقام ہے، ان کے بعد زمین والے ملائکہ، پھر ان میں کئی طبقات ہیں، یہ ملائکہ سفلیہ کہلاتے ہیں، اور عالمِ بالا میں ملائکہ "ملائکہ اعلیٰ" کہلاتے ہیں۔ [الخير الكثير، تفسير عزيزي]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: إن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خلق الله الملائكة من نور، وخلق الجانّ من مارج من نار، وخلق أدم مما وصف لكم۔ [مسلم]

وفي الحديث: خلق الله الملائكة من نور يسبحون الليل والنهار لا يفترون۔ [الحبائک]

الغرض! یہ افضل اور پاکیزہ مخلوق ہے، جس طرح زمین کی زینت ورونق انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہے، اسی طرح تمام آسمانوں کی زینت ورونق ملائکہ کے ساتھ ہے، یہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں، مختلف شکلوں کے ساتھ متشکل ہونے پر قدرت رکھتے ہیں، ان میں معصیت وشہوت کا مادہ نہیں ہوتا، عقل وفہم اور علم کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہیں، رات دن تسبیح وتہلیل اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں، اور گناہوں سے پاک ہیں۔

قسم دوم جنات ہیں:

''جن'' باقی مخلوقات کی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک مستقل مخلوق ہیں، جیسے کہ فرمایا: ﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ [الرحمٰن: ۱۵] (اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا)۔ ان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے، لیکن ان کی تخلیق کی تفصیلی کیفیت معلوم نہیں، ہماری طرح یہ بھی احکامِ شرعیہ کے مکلف وپابند ہیں، ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ بھی ہے، اور نیک وبد، عالم وجاہل بھی ہیں، یہ ہمیں دیکھتے ہیں، جبکہ ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے، ہاں! اگر وہ شکل تبدیل کر کے انسانی یا حیوانی یا اور کوئی شکل اختیار کریں تو ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ عام طور پر ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱)...... پہلی قسم کی صورتیں سانپ جیسی ہیں۔

(۲)...... قسمِ دوم سیاہ کتوں کی شکل میں ہیں۔

(۳)...... قسمِ سوم اڑتی ہوا کی طرح ہیں۔ یہ قول امام سہیلی کا ہے۔ [الروض] حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح ثابت ہے مرفوعاً۔

بہر حال! ملائکہ، شیاطین اور جنّات ان تینوں مخلوقات کا وجود کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، جو لوگ فلاسفہ، موجودہ بعض ملحد، جیسے قادیانی اور مغرب زدہ اقوام، جو جنّات کے وجود کو نہیں مانتے، ان کے عقائد کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ ایسے لوگ توحید ورسالت اور دیگر تمام اسلامی اقدار کے بھی منکر ہیں۔

پس جیسے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کا نام ہے، اسی طرح ابو الجن کا نام ''شومیا'' بتایا گیا ہے، اور جو لوگ ابو الجن ابلیس کو قرار دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔ تمام ارباب مذاہب جو کسی آسمانی مذہب کے قائل ہیں، سب کے نزدیک جنات کا وجود مسلم ہے، لیکن بعض عقل فروشوں نے جنّات کے وجود سے انکار کیا ہے، وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر یہ موجود ہوتے تو ضرور نظر آتے، لیکن یہ نہایت لغو دلیل ہے، کیونکہ کسی چیز کا ہمیں نظر نہ آنا، یا اس کی کیفیت کا ہمیں معلوم نہ

ہونا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں، لاکھوں موجودات اسی قسم کی ہیں، چونکہ قرآن وحدیث کے نصوص سے تواتر کے ساتھ جنات کے وجود کا ثبوت محقق وثابت ہے، جس کا انکار صریح کفر ہے اور بعید از عقل اور خلاف مشاہدہ بھی ہے۔

خصوصاً ہر زمانے میں بکثرت سچے لوگوں کا جنّات کو دیکھنا اور ان کے ساتھ ہم کلام ہونا ثابت ہے، حافظ الحدیث قاضی بدرالدین شبلی حنفی المتوفی ٧٦٦ھ کی کتاب "آكام المرجان في أحكام الجانّ" اس موضوع پر ایک عمدہ مستقل قابلِ دید ذخیرہ ہے، یہ اتنی اہم معلومات کی کتاب ہے جس کی نظیر نہیں، اُسے مطالعہ کیا جائے۔ ابن حبان اور حاکم نے ابوثعلبہ خشنی سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنوں کی تین قسمیں ہیں:

☆ ایک قسم کے پَر ہیں، وہ ہوا میں اڑتی ہیں۔

☆ دوسری قسم سانپ اور بچھوؤں کی طرح ہے۔

☆ تیسری قسم (ایک مقام پر کچھ عرصہ) اترتی اور چل دیتی ہے۔ [فتح الباري، جلد ششم، ص: ٢٤٦]

جمہور علماء کرام کا عقیدہ ہے کہ جنّات میں سے مؤمن جنت میں داخل ہوں گے، اور انہیں اپنی نیکی وطاعات کا ثواب انسانوں کی طرح ملے گا، تاہم اس میں اختلاف ہے کہ وہ انسانوں کی طرح جسمانی طور پر اکل وشرب کریں گے یا نہیں۔ حارث محاسبی فرماتے ہیں: جنتی جنّات جنت میں جنتی انسانوں کو نہیں دیکھ سکیں گے، جبکہ جنتی انسان انہیں دیکھیں گے، على عكس ما كانوا عليه في الدنيا، وقال بعض العلماء: إنهم لا يدخلون الجنة بل يكونون في ربضها يراهم الإنس من حيث لا يرونهم، وهذا القول ماثور عن مالك والشافعي وأحمد ومحمد الشيباني وعمر بن عبد العزيز، وقال البعض: إنهم في الأعراف بين الجنة والنار، وقال أبو حنيفة رحمه الله: بالوقف۔ [أثمار التكميل]

قسم سوم حیوانات:

حیوانات میں شہوت اور غضب کا مادہ غالب ہے، اور ان کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اگر غضب اور سبعیت غالب ہوگی تو درندہ ہے، اگر خفت ہوگی تو پرندہ ہے، اور محض کھانے پینے اور شہوت رانی ہوگی تو بہیمیت ہے، جیسے عام جانور ہوتے ہیں، یہ سارے غیر ذوی العقول اور غیر مکلف ہیں۔

قسم چہارم انسان:

تمام مخلوقات کا سردار، صاحب عقل وفراست، خلیفۃ اللہ فی الارض، اعلیٰ درجہ کا عقلمند وہشیار، متمدن موجد

الاشیاء، معجون مرکب، تمام صفاتِ کمالیہ وغیرہ کا حامل یعنی ملکیت، بہیمیت، عقل، وہم وشہوت حتی کہ سبعیت تک کی تمام صفات اس میں موجود ہیں، حضرت رحمۃ للعلمین ﷺ کی بعثت سب کے لیے ہے۔﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۷] (اور (اے محمد!) ہم نے تم کو تمام جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

جمہور علماء امت کے نزدیک جنّات میں سے کوئی رسول اور نبی نہیں آیا، بلکہ نبوت ورسالت کا سلسلہ بنی آدم کے ساتھ مخصوص رہا۔ امام ضحاکؒ اور علامہ ابن حزم ظاہریؒ کہتے ہیں کہ جنّات میں انہیں میں سے انبیاء ورُسل آئے ہیں، اگرچہ ہمیں ان کے نام معلوم نہیں، کیونکہ جنّات کی خلقت حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہے، قرآن حکیم نے ان کی خلقت کا مقصود وہی بتایا جو انسان کی تخلیق کا بتایا ہے،﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاريات: ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں)۔ اور یہ مسلم ہے کہ انبیاء ورُسل علیہم السلام کا سلسلہ نوعِ انسانی کے ساتھ مخصوص ہے۔

جنّات کی پیدائش ہزاروں سال انسان سے پہلے ہے، اگر حسب مذہب جمہور کہ ان میں کوئی جنی نبی پیدا نہیں ہوا تو پھر سوال یہ ہوگا کہ وہ ہزاروں سال بغیر آسمانی ہدایت کے کیسے مکلّف رہے؟ جبکہ مکلف مخلوق کے لئے آسمانی وحی وہدایت کا ہونا ضروری ہے، پس علامہ ابن حزمؒ اور ضحاکؒ کا مذہب ہی راجح قرار پائے گا کہ جنّات کے لئے انبیاء انہی کی جنس میں آئے، اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے صاحب "أثمار التكميل" نے درج کی ہے، وہ یہ ہے: "فعن ابن عباس: أن الجن قتلوا نبياً لهم قبل آدم اسمه يوسف وأن الله تعالى بعث إليهم رسولاً فأمرهم بطاعته وأن لا يشركوا به شيئاً وأن لا يقتل بعضهم بعضا"۔ [أثمار: ج۲، ص: ۱۹۹]

اسی طرح قوله تعالى:﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ﴾ [الأنعام: ۱۳۰] (اے جنّات اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس میری طرف سے رسول نہیں آئے؟ جو تمہیں میری آیتیں سنا دیتے)، يعني بذلك رسلا من الإنس ورسلا من الجن۔

ابن حزم کہتے ہیں: وباليقين ندري أنهم قد أنذروا فصح أنهم جاءهم أنبياء منهم ولم يبعث إلى الجن نبي من الإنس قبل محمد ﷺ لأنه ليس الجن من قوم الإنس وكذا بالعكس، وقد كان النبي يبعث إلى قومه خاصة، ونبينا محمد صلى الله عليه وسلم مبعوث إلى الثقلين الإنس والجن كافة، وعن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: أرسلتُ إلى الجن والإنس وإلى كلّ أحمر وأسود۔

قرآن مجید میں استماعِ جنات للقرآن اور ان کا ایمان بالقرآن منصوص ہے، قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ﴾ [الأحقاف: ٢٩] (اور جب ہم نے آپ کی طرف جنوں کی جماعت کو پھیر دیا، جو قرآن سن رہے تھے)۔ یہ استماع ''سوق عکاظ'' کے قریب واقع ہوا تھا، اور یہ جماعتِ جن نو افراد پر مشتمل تھی، جو ایمان لے آئی اور واپس جا کر قوم کو بھی ایمان کی دعوت دی۔ روایات اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کئی مرتبہ رات کو جنات کی دعوت پر تبلیغ کی غرض سے ان کے پاس تشریف لے گئے تھے، آکام المرجان میں ہے کہ یہ واقعہ چھ مرتبہ پیش آیا تھا۔ [أثمار التكميل]

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جن اجسام ہیں، ان میں ارواح ہوتی ہیں، یہ انسان کی طرح عقلمند ہوتے ہیں، لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی لئے انہیں جن کہا جاتا ہے، ان کی تخلیق آگ سے ہے جیسے کہ فرمایا: ﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ﴾ [الرحمن: ١۵] (اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا)، جیسے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا، ﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمن: ١٤] (انسان کو بجتی مٹی سے پیدا کیا گیا)، جنات مذکر و مؤنث ہوتے ہیں، اور ان کی اولاد بھی ہوتی ہے۔ [مظهري]

امام راغبؒ فرماتے ہیں: روحانی مخلوق کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

(١) پہلی قسم سراپا خیر ہی خیر ہیں، وہ فرشتے ہیں۔

(٢) دوسری قسم سراپا شر ہی شر ہیں، وہ شیاطین ہیں۔

(٣) تیسری قسم وہ ہیں جن میں کچھ خیر اور کچھ شر ہوتا ہے، وہ جنات ہیں۔ [مفردات] یہ جنات انسانوں کی طرح مختلف عقائد ونظریات رکھتے ہیں، مثلاً: مؤمن، کافر، مشرک، یہودی، نصرانی، ہندو، بدھ مت، سکھ، شیعہ، قادیانی وغیرہ جیسے انسانوں کے طبقات ہوتے ہیں۔

شانِ نزول سورۃ الجن:

حضور انور رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین اور جنات بغیر کسی پابندی کے آسمانوں تک جاتے تھے، فرشتوں کی باتیں سنتے تھے اور زمین پر واپسی میں وہ باتیں زیادتی کمی کے ساتھ کاہنوں کو بتاتے تھے، پھر کاہن ان باتوں کی تشہیر کر کے مشرکینِ عرب کو مزید گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مشرکین کے عقائد ایک طرف جنات اور دوسری طرف کاہنوں کی کہانت پر جمے ہوئے مضبوط تھے، اور کہانت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُدھر سید المرسلین

صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نبوت اور بعثت سے نبوت ورسالت کا دروازہ بند ہونے والا تھا، اب اگر گمراہی کا یہ دروازہ (کہانت) کھلا رہتا تو اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ تھی۔

پچھلے زمانوں میں کہانت ونجوم اور شیاطین کا زور اگر ہوتا تو انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد دیگرے تشریف لا کر اس کا سدّ باب فرما دیتے، مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تو اس کا امکان نہ رہتا، اس لئے حکمت الٰہی یہ ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کا سدّ باب کیا جائے، چنانچہ یہ ضروری ہوا کہ جنّات کے آسمانوں تک جانے پر مکمل پابندی لگا دی جائے، تا کہ قرآن اور وحی کا اعجازی شان بلند وبالا ہو، نہ انسان اس کا مقابلہ کر سکیں، نہ جنّات کی وہاں رسائی ہو، اس خدائی نظام اور تدبیر ایزدی نے کاہنوں اور جنّات کے تمام آزادی کو درہم برہم کر کے شہابوں کے ذریعے ان جنّات وشیاطین کو مار بھگا دیا جانے لگا، جس سے جنّات میں تشویش ہوئی، اور وہ اس کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے اطراف عالم میں پھیل گئے۔

اسی تفتیشی سفر میں خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچنے میں وہ کامیاب ہو گئے، جس وقت بازارِ عکاظ کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں فجر کی نماز ادا فرما رہے تھے، وہاں جنّات کی ایک جماعت آ پہنچی، (جو کہ نو افراد پر مشتمل تھی)، انہوں نے قرآن حکیم سن کر اسلام قبول کیا، اور اپنی قوم میں جا کر اس کی تبلیغ کی اور صورت حال گوش گزار کر کے آسمانی بلندیوں پر بندش کی حقیقت حال اپنی قوم میں بیان کی۔

اس استماعِ جنّات اور ان کے ایمان لانے کا حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم نہ تھا، اس سورت میں اس کی تفصیل بتائی گئی کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ نو افراد جو ایمان لائے تھے وہاں سے جا کر اپنی قوم میں جو تبلیغ کی ہے، وہ ایک عجیب رشد وہدایت کا پیغام ہے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہیں کی ہے، آپ کی فرمودات نہیں سنی ہیں، محض قرآن کی تلاوت سن کر ایمان لائے، اور مبلغ بن کر قوم کو ہدایت کا راستہ بتا دیا، عقیدۂ شرکیہ، تثلیث اور دیگر عقائدِ باطلہ کی مکمل نفی اور تردید کی، جسے سورۃ الجن کی ابتدائی آیتوں نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی۔

مشرکین عرب اپنے باطل عقیدے کے ساتھ سفر وحضر میں شیاطین اور جنّات سے استمداد واستغاثہ کرتے رہتے تھے، پوری تفصیل کے ساتھ ان کے مذموم عقائد پر کاری ضرب لگا دی، ﴿وَاللّٰهُ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾ [النور:۴۶] (اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے)۔

علامہ خفاجیؒ نے فرمایا کہ احادیث معتبرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنّات کے وفود حضور اکرم سید الانبیاء صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں چھ دفعہ حاضر ہوئے ہیں، اس سلسلے میں یہ واضح ہو کہ سورۂ احقاف میں جس واقعہ کی تفصیل ہے وہاں بھی ''نفر'' کا کلمہ موجود ہے، مگر وہاں وضاحت کے ساتھ یہ کلمات موجود ہیں: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ [الأحقاف: ۳۰] (ہم نے ایک ایسی کتاب سنی جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی) سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جنات کا وہ وفد اہل کتاب میں سے تھے، اور یہاں جس وفد کا ذکر ہے یہ مشرک تھے۔

اس بارے میں مفسرین حضرات نے ''واقعہ عکاظ'' کے علاوہ ایک دوسرے واقعہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس کا تعلق مقامِ نخلہ سے ہے، جو کہ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان واقع ہے، اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفیق صرف حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے، اور کوئی نہ تھا، اور یہ طائف کے سفر سے واپسی کا واقعہ جو سنہ ۱۰ھ نبوی کو حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کے بعد پیش آیا، اللہ ربّ العزّت نے ظاہری اسباب کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پریشانیاں دور کرنے، حوصلہ بڑھانے اور تسلی دینے کی خاطر اندروں خانہ سیدۃ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور بیرون خانہ ابو طالب کا سہارا مہیا فرمایا تھا۔

جب یہ دونوں جاں نثار اٹھا لئے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال کو عام الحزن سے تعبیر فرمایا، اس موقعہ کو غنیمت جان کر کفار مکہ کے ظلم و زیادتیوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا، دشمنانِ توحید و رسالت نے پوری قوت کے ساتھ یلغار کی، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مکہ سے شمال مشرق طائف کی آبادی جو قبیلہ ثقیف کا دیار ہے، وہاں کے امراء، روساء اور سردار تینوں بھائی ''عبد یالیل، مسعود اور حبیب'' جو کہ عمیر کے بیٹے ہیں، نہایت شریف خاندانی لوگ ہیں، اسباب کے تحت اگر ان کی مدد و ہمدردی حاصل کر لی جائے تو یہ شانِ نبوت کے منافی نہیں، اس کے علاوہ ان کے گھر میں ایک قریشی عورت بھی ہے، اگر ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور کفار قریش کے مقابلے کو کم اور پست کرنے کی خاطر اگر ان کی ہمدردی اور معاونت حاصل کی جائے تو شاید بہتر ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تن تنہا اس سفر کا آغاز کیا، اور خادم خاص زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو رفیق بنایا، وہاں پہنچے اتفاقاً تینوں بھائی موجود تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اسلام اور کلمہ توحید کا پیغام پہنچایا، انہوں نے نہایت تند و تلخ لہجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو مسترد کر دیا اور فوراً وہاں سے چلے جانے کا کہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مایوسی کے عالم میں وہاں سے روانہ ہوئے، تو ان ناعاقبت اندیش ظالموں نے اپنے لنڈے لفنگے نوجوانوں اور کتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف دیتے، پتھروں سے مارتے رہے اور مسلسل تعاقب کا سلسلہ جاری

رکھا، اور ایذا دینے کا خوب بازار گرم کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم برداشت کرتے رہے، اور حسبنا اللہ و نعم الوکیل کا ورد کرتے رہے، نرم و نازک گلاب کے پھول جیسے بدنِ اطہر پر طرح طرح کے خراش آئے، چھوکروں نے بڑوں کے ساتھ مل کر مسلسل سنگباری کی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گہری چوٹیں آئیں، سارا بدن لہولہان ہوا، جوتے خون سے بھر گئے، کپڑے سرخ ہو گئے، بقول حضرت قاضی عیاضؒ زمین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خون کو اپنے پیٹ میں ودیعت رکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیچھے بہت بڑا لشکر گالیاں دیتا ہوا، واہیات بکتا ہوا، شور و شغب اور واویلا کرتا ہوا جمع ہو گیا تھا، تقریباً دو میل کے فاصلے تک پیچھا نہیں چھوڑا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے شر سے بچنے کے لئے ایک باغ میں تشریف لے گئے، جو کہ اصلی دشمنوں کی ملکیت تھی، اور اس وقت باغ کے دونوں مالکان ''عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ'' جو قریشی مکہ کے باشندے تھے وہاں موجود تھے جو سارا ماجرا اور منظر کو بغور دیکھتے رہے، ایک حیثیت سے وہ بڑے خوش ہوئے، مگر خون کے رشتہ نے تھوڑا سا انہیں ضرور پریشان کیا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باغ کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

بجرم عشق تو این می کشند وغوغائیست ☆ تو نیز برسر بام آچہ خوش تماشائیست

وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہایت سوز و گداز کے ساتھ یہ دعا پڑھی: ''اَللّٰھُمَّ اِلَیکَ اَشکُو ضُعفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّةَ حِیلَتِي وَھَوَانِي عَلَى النَّاسِ، یا اَرْحَمَ الرّٰحِمِینَ! اِلٰی مَنْ تَکِلُنِي؟ اِلٰی عَدُوٍّ یَتَجَھَّمُنِي اَمْ اِلٰی قَرِیبٍ مَلَّکْتَهٗ اَمرِي، اِنْ لَّمْ تَکُنْ سَاخِطًا عَلَيَّ فَلَا اُبَالِیْ، غَیرَ اَنَّ عَافِیَتَکَ اَوْسَعُ لِیْ، اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ اَضَاءَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ وَ صَلُحَ عَلَیْهِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ اَنْ تُحِلَّ عَلَيَّ غَضَبَکَ وَ تُنْزِلَ عَلَيَّ سَخَطَکَ، وَلَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِکَ۔

(یا اللہ! میں آپ سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفت اور بے توقیری کی، اور آپ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، آپ مجھے کس کے سپرد کرتے ہیں؟ کیا ایک غیر آدمی کے جو مجھ پر حملہ کرے، یا کسی دشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملہ کا مالک بنا دیا ہے (کہ جو چاہے کرے) اگر آپ مجھ پر ناراض نہ ہوں تو مجھے ان سب چیزوں کی بھی پروا نہیں، لیکن آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے (اس کو طلب کرتا ہوں)، میں آپ کی ذات مبارکہ کے نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو جاتی ہیں، اور اس کی بنا پر دنیا و آخرت کے سب کام درست ہو جاتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر اپنا غضب نازل فرمائیں، ہمارا کام ہی یہ ہے کہ آپ کو راضی کرنے اور منانے میں لگے رہیں، جب تک

کہ آپ راضی نہ ہو جائیں اور ہم تو کسی برائی سے بچ سکتے نہیں، نہ کسی بھلائی کو حاصل کر سکتے ہیں بجز آپ کی مدد کے)۔

یہ وہ تڑپا دینے والی دعا ہے جس سے پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔ اسی سفر میں ملک الجبال حاضر خدمت ہو کر عرض کرتے ہیں کہ میں آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں، اگر آپ راضی ہیں مجھے حکم دیتے ہیں تو ان کا کام منٹوں میں تمام کر سکتا ہوں، ''أخشبین'' کے دونوں پہاڑوں کو پوری آبادی کے ساتھ ٹکراؤں، ساری آبادی پس کر نیست و نابود ہو جائے، جیسے گندم کے دانے چکی کے پاٹوں میں پس جاتے ہیں۔

سبحان اللہ! رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کیا کریمانہ جواب دیتے ہیں! فرماتے ہیں: ہرگز نہیں، یہ لوگ بے سمجھ ہیں، اور انہوں نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں، اس لئے ناروا سلوک کرنے پر اتر آئے ہیں، ہو سکتا ہے ان کی آئندہ نسل میں کوئی سدھر جائے اور حق کو قبول کرے۔

پس ایسا ہی ہوا کہ پورا عرب حلقہ بگوش ہو کر مسلمان ہوا، لوگ عام انسانوں کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں شہید کا خون رنگ لایا، حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے خون سے بھر گئے یہ کیسا خون ہے؟ یہ وہ خون ہے جس کا ایک قطرہ آٹھوں جنتوں اور پوری کائنات پر بھاری ہے۔

پس یہ چند قیمتی قطرے کیسے رنگ لائے؟ پورے جہاں کی گندگیوں کو دھو ڈالے، ناپاک عقائد اور شرک و بت پرستی کی نجاستوں سے پورے عالم کو پاک کیا، مشرکوں کے گھروں میں فرشتہ سیرت اولاد پیدا ہوئی، کعبۃ اللہ میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بتوں کو مسمار کر دیئے، صحرائی شتربانوں کو عدل و انصاف کے عرش پر اٹھا کر بٹھایا، اور حکمرانی کے وہ عظمت و ہمت سکھائی جسے دیکھ کر ساتوں آسمانوں کے مقرب فرشتے تسبیح و تہلیل پڑھنے لگے، جنگلی درندے ریوڑ کے ساتھ مل کر گھاس کھانے لگے، بغیر کشتی کے فوجوں کو دجلہ میں ڈال کر تسخیر کا ریکارڈ قائم کیا گیا، امیر و فقیر ایک دسترخوان پر کھانے لگے، قاضیوں کی عدالت میں چرواہے مدعی کے ساتھ پچاس لاکھ مربع میل کے حکمران بادشاہ بحیثیت مدعی علیہ پیش ہوئے، کھربوں اولیاء و اتقیاء، علماء، صلحاء، قراء و حفاظ، نمازی و حجاج دھرتی کی زینت بنے، مرنے والوں کی قبروں سے جنتی خوشبوؤں کی مہک اٹھنے لگی۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ☆ گل چین بہار تو ز دامن گلہ دارد

فصلواۃ اللہ و سلامہ علی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ربیعہ کے بیٹوں نے اپنے نصرانی غلام عداس کے ہاتھ انگور کا خوشہ طبق میں رکھ کر خدمت اقدس میں پیش کیا،

آپ ﷺ نے اپنے ربّ کے نام کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر تناول فرمایا، اس خوش قسمت غلام نے حیرانی کے عالم میں پوچھا: کیا وظیفہ ہے؟ فرمایا: تم کون ہو اور کہاں کا ہو؟ تمہارا کیا مذہب ہے؟ جواب دیا: نینویٰ شہر کا نصرانی ہوں، فرمایا: اچھا میرے بھائی ''یونس'' پیغمبر کا ہم وطن ہو، وہ نبی تھے اور میں سارے نبیوں کا خاتم ہوں، یہ بسم اللہ نبیوں کا وظیفہ ہے، غلام نے عقیدت سے آپ ﷺ کے سر اور ہاتھ پاؤں پر بوسہ دیا (بعد میں مسلمان ہوئے صحابیت کا شرف پایا، میدانِ جہاد میں شہید ہوئے، ان کے دونوں مالک عتبہ وشیبہ کفر پر مرے، میدانِ بدر میں حضرت علی اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے، اور ابو جہل کے ساتھ قلیب بدر میں پھینک دئے گئے۔ یہ ربّ العزّت کی بے نیازی ہے جسے چاہے جنت دے اگرچہ غلام ہی ہو، جسے چاہے جہنم میں ڈالے، اگرچہ سردار ہی ہو)۔

آنرا بری از صومعہ در دار گبران افگنی ☆ این راکشی از بتکدہ سر حلقہ رندان کنی

چون وچرا با کار تو عقل زبون را کے رسد ☆ اے قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

عداس نامی غلام جب مالکان کے پاس آیا کہنے لگے: او بد بخت! تم نے اس شخص کے ہاتھ پاؤں پر کیوں بوسہ دیا؟ یہ تو ساحر ہے، غلام نے جواب دیا: (یہ شخص انجیل پڑھا ہوا تھا) یہ برحق پیغمبر ہے، اس کی پیشانی پر حق و صداقت کا نور جلوہ گر ہے، جو اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ بدنصیب ہیں، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، اس کے بعد آپ ﷺ واپس مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

مکہ پہنچنے سے پہلے مقامِ نخلہ میں رات کو قیام فرمایا، نماز تہجد میں نہایت سوز وگداز ورغبت کے ساتھ جہراً تلاوت فرماتے رہے، ملک یمن کے شہر ''نصیبین'' سے جنات کے وفد کا وہاں سے گزر ہوا، اچھی طرح کان لگا کر خاموشی کے ساتھ تلاوت سنتے رہے، یہ صاحب قرآن کی تلاوت تھی، جس کو سن کر دل پارہ ہو جاتا اور کلیجہ پاش پاش ہو کر حق وصداقت کی تصدیق پر مجبور ہو جاتا، ﴿وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ [الأنفال: ۲] (ان کے دل ڈر گئے) کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ خود مسلمان ہوئے، اور جا کر قوم میں تبلیغِ اسلام کا سلسلہ شروع کیا، اللہ پاک نے اس سورت میں اسی کو واضح فرمایا۔ ﴿قُلْ اُوْحِیَ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے جنات کو قرآن بالقصد نہیں سنایا، اور نہ ہی ان کو دیکھا، پس اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دی۔

☆☆☆

حکایت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر سے ایک بُرے ارادے کے ساتھ نکلے تھے، راستے میں جب فاطمہ (بہن) اور سعید بن زید بن عمرو رضی اللہ عنہما (بہنوئی) کے ایمان لانے کا سنا تو وہاں سے سیدھا ان کے گھر گئے، نہایت خشم وغضب کے عالم میں تھے، ادھر حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ میاں بیوی کو سورۂ طٰہٰ کا سبق پڑھا رہے تھے، قراءت کی خوش آواز نغمہ سن کر داخل ہوئے اور انہیں مارا پیٹا، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، جب عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اُسے وہ نغمہ یاد آیا جسے دوبارہ سن کر یہ شکاری خود شکار ہوئے، حضرت علامہ اقبالؒ نے یوں ترجمانی کی ہے: ؎

تو میدانی کہ سوز قرات تو ☆ دگرگون کرد تقدیر عمر را

جب امتی کے سوز قراءت سے اقوام کی تقدیر بدل سکتی ہے، تو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا کہنا۔ الحمد للہ علی نعمۃ القرآن۔ ؎

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں محتاج ☆ بہار ہو کہ خزان لا الہ الا اللہ

ع دوران باخبر، نزدیکان بے بصر

اللہ ربّ العزّت نے اپنے پیغمبر کی تسلی اس طرح فرمائی کہ جہاں بدقسمت طائف کے ازلی بدبختوں نے اہل مکہ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، اور مختلف اذیتیں دینا شروع کیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل طائف سے مایوس ہوکر واپس لوٹے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانیوں میں بے حد اضافہ ہوا، ربّ العزّت سبحانہ نے تسلی دی، اور تدارک کے طور پر حضرت جبریل علیہ السلام اور ملک الجبال کو آپ کی خدمت میں بھیجا، اور اس کے ساتھ ایک ایسی ناگہانی فوری خوشی وسکوں سے آپ کو نوازا گیا جو آپ کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ یہ آدم کی اولاد قریش وثقیف اگر آپ کی دعوت کو مسترد کرتے ہیں تو پریشانی کی ضرورت نہیں، یہ جنّات کا گروہ حاضر خدمت ہوکر اسلام قبول کررہا ہے، اور ان کے قلوب معرفتِ ایمانی سے منور ہوکر یہ لوگ آپ کا نمائندہ بن کر اپنی قوم میں بطورِ مبلغ ایمان کی اشاعت کررہے ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانی رفع ہوگئی۔ الحمد للہ

قرآن مجید عجیب وغریب کتاب ہے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر عزیزی میں ارشاد فرماتے ہیں کہ کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ جو پڑھی جاتی ہیں، اور دوسری وہ جو دیکھی جاتی ہیں (مطالعہ کے ساتھ)

قرآن حکیم اس لحاظ سے بھی عجیب کتاب ہے کہ اس میں پڑھی جانی والی کتابوں کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، اور مطالعہ کرنے والی کتابوں کی بھی۔

پڑھی جانے والی کتابوں میں قرآن مجید آسان بھی ہے اور ورد وظیفہ بھی، کلامِ الٰہی کو پڑھنے کے برابر کوئی وِرد یا وظیفہ نہیں ہے، یہ سب سے افضل ہے، حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجدہٗ نے فرمایا: جو خالص نیت اور حسن عقیدت سے کلام پاک پڑھتا ہے، **من شغله القرآن عن ذكري و مسألتي أعطيته أفضل ما أعطي السائلين۔** [ترمذي] میں اسے ان سے افضل دوں گا جو مانگتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں، اور دوسرے اوراد اور وظائف کرتے ہیں، اگر چہ میرا کلام پڑھنے والا نہ بھی مانگے، اور پھر یہ بھی ہے کہ ہر حرف کے عوض دس نیکیاں حاصل ہوں گی، اور دیگر اوراد کے برعکس کوئی معنی سمجھے یا نہ سمجھے اس کا فائدہ وثواب ہر حال میں حاصل رہے گا۔ [أحمد]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز میں پڑھنے سے ہر حرف کے عوض ایک سو نیکیاں حاصل ہوں گی۔ [در منثور] یہ مقدر کی بات ہے کہ جنّات غیر جنس غیر قوم ہو کر محض تلاوت سننے کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، جبکہ مکہ کے مشرکین اہل لسان ہونے کے باوجود بار بار سننے کے ساتھ تعصب وعناد اور شومیٔ قسمت کی وجہ سے ایمان نہیں لائے، حالانکہ وہ برادری کے لوگ ہیں، اور معنی بھی سمجھتے تھے، اس کے باوجود کہتے رہے: ﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [السجدة:۲۶] (اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو، اور (جب پڑھنے لگیں تو) شور مچا دیا کرو تا کہ تم غالب رہو)۔

گلیم بخت کسے را کہ بافتند وسیاہ ☆ بآب زمزم وکوثر سفید نتوان کرد

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سہل بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک مقام پر ایک بوڑھے جن کو دیکھا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ رہا ہے، اور اُون کا جبہ پہنے ہوئے تھے، جس پر بڑی رونق معلوم ہوتی تھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اُسے سلام کیا اور انہوں نے سلام کا جواب دے کر بتلایا کہ تم اس جبے کی رونق سے تعجب کر رہے ہو؟ یہ جبہ سات سو سال سے میرے بدن پر ہے، اسی جبے میں میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی، پھر اسی جبے میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، میں ان جنّات میں سے ہوں جن کے بارے میں سورۂ جن نازل ہوئی۔

☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ
فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنَّہٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّ لَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّ
اَنَّہٗ کَانَ یَقُوۡلُ سَفِیۡہُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا ۙ﴿۴﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ کچھ جنوں نے میرا پڑھنا کان لگا کر سنا، تو بولے: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ① کہ بھلائی کی راہ بتاتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لائے، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے ربّ کا شریک نہ کریں گے ② اور یہ کہ ہمارے ربّ کی شان بہت بلند ہے۔ نہ اس نے عورت اختیار کی اور نہ بچہ ③ اور یہ کہ ہم میں سے بعض بے وقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افتراء کہتا ہے ④

معارف ومنازل

یعنی جنات نے کہا کہ: ہم سنتے ہی اس کلام سے متاثر ہوئے، ہمارے دلوں کے عقدے کھل گئے، مزید تدبر کرنے اور دیر کرنے کو مناسب نہیں سمجھا، یہ عجیب وغریب قرآن نے اپنے نظم ومعانی کی وجہ سے ہمیں رہنمائی کی اور ہم جان گئے کہ یہ کوئی بشر کا کلام نہیں، اس پر ایمان لانے میں توقف کو جائز نہیں سمجھا، اور ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ عمر بھر کسی کو اپنے ربّ کے ساتھ شریک نہیں کریں گے، اور بیشک ہمارے ربّ کی شان وعظمت بہت ہی بلند ہے، اور وہ ہر قسم کے شریک وشرکاء سے پاک ہے۔

جنات نے اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت یہ بیان کی: ﴿مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا﴾ یعنی اس کی نہ کوئی بیوی ہے، اور نہ اولاد ہے، بیوی تو ضرورت کے لئے ہوتی ہے، اور اولاد احتیاج کی علامت ہے، وہ واحد لاشریک، احد وصمد جل شانہ ہر قسم کے احتیاج سے پاک ومبرّا ہے، سارا جہاں اور تمام مخلوقات قدم قدم پر اس کے جود وکرم اور ہر قسم کی عنایات کے محتاج ودست نگر ہیں، مگر وہ کسی احتیاج سے موصوف نہیں، اس کے حق میں کسی احتیاج کا تصور بھی خلاف عقل ونقل ہے۔

جنات نے یہ بھی کہا کہ ہم میں سے بیوقوف وبے عقل شخص اللہ تعالیٰ پر بڑی زیادتی کی بات کہتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے، کوئی اس کے لئے اولاد کا مدّعی ہے، اور کوئی شریک ٹھہراتا ہے وغیرہ، یعنی جس طرح

انسانوں نے مختلف گمراہ مذاہب اختیار کئے : صابئیت، نصرانیت ، یہودیت و مجوسیت ،شرک وغیرہ ، یہ سارے طور طریقے جنات میں بھی رائج رہتے ہیں، چنانچہ انس وجن میں قیامت تک یہ طریقے جاری رہیں گے۔

......۞......۞......۞......

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ۝۵

ترجمہ: ہم گمان کرتے تھے کہ انسان اور جن سارے کے سارے خدا تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ نہیں بولیں گے ۝۵

معارف ومنازل

ہمارا گمان تو یہ تھا کہ انسان اور جنات اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ نہیں بولتے ،لیکن اب پتہ چلا کہ انس و جن واقعی جھوٹ بولتے ہیں، شرک وکفر کے مرتکب ہوتے ہیں، کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ٹھہراتا ہے، کوئی عبادت میں، کوئی تدبیر وتصرف میں، اور کوئی استعانت میں، یہ سب جھوٹ وافتراء ہے۔

جنّات نے محض یہ نہیں کیا کہ استماعِ قرآن کے ساتھ ایمان لائے ، بلکہ اپنی قوم کا مقدر صحیح کرنے اور انہیں تبلیغ کر کے ہزاروں کی تعداد میں انہیں مسلمان بنایا، اور ان کے سابقہ شرک وضلالت اور عقیدۂ تثلیث کے ابطال اور دیگر بے شمار باطل عقائد پر کاری ضرب لگا کر ان کی سمت قبلہ درست کیا۔ ﴿وَذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ﴾ [الحدید: ۲۱] (اور یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے دیتا ہے)۔

......۞......۞......۞......

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ يَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡهُمۡ رَهَقًا ۙ۝۶

ترجمہ: اور یہ بات بھی ہے کہ کچھ مرد انسانوں میں سے پناہ پکڑتے تھے جنوں میں سے کچھ مردوں کے ساتھ، پس بڑھا دیا انہوں (انسانوں) نے ان کے لیے غرور وسرکشی کو (نافرمانی کو) ۝۶

معارف ومنازل

''رَهَق'' بمعنی سرکشی، نافرمانی، ﴿زَادُوۡهُمۡ﴾ کی ضمیر جنات اور انسانوں دونوں کی طرف لوٹ سکتی ہے۔

اگر انسانوں کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوگا: ''کہ وہ فائدے کی بجائے زیادہ خسارے میں مبتلا ہوئے''، یعنی ظالم قرار پائے اور مشرک ہو گئے۔ اور اگر ﴿زَادُوْهُمْ﴾ کی ضمیر جنات کی طرف منسوب ہو تو معنی یہ ہوگا: ''کہ انسانوں نے جنات کے ساتھ استعاذہ کر کے جنات کو اور بھی مغرور بنایا''، ان کی سرکشی بڑھ گئی کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں، ہمارے ساتھ استعاذہ کرتے ہیں، ہماری مدد طلب کرتے ہیں، ہمارے نام پر قربانی ذبح کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

عہدِ جاہلیت میں اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی صحراء یا ویران وادی میں انہیں رات کو قیام کرنا پڑتا اور انہیں کسی قسم کا خوف محسوس ہوتا تو سونے سے پہلے بلند آواز میں کہتے: "یا عزیز الوادي نعوذ بک من السفهاء الذين في طاعتک" (اے اس وادی کے سردار! ہم تجھ سے ان احمقوں کی شر سے پناہ مانگتے ہیں، جو تیرے تابعدار ہیں)۔ جنات جب یہ آواز سنتے تو ان کے غرور کی کوئی حد نہ رہتی اور فخر و غرور میں کہتے کہ ہم جنوں اور انسانوں سب کے سردار بن گئے ہیں۔

بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابو رجاء عطاردی رضی اللہ عنہ اور حضرت رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ (دونوں صحابی ہیں) اپنے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہم نے کسی سفر میں جب ایک وادی میں قیام کیا تو یہی استعاذہ کے کلمات زور زور سے کہتے رہے، ہمیں جنات نے غیبی آواز میں کہا: کسی جنی کی پناہ طلب نہ کرو، وہ دور گزر گیا، آئندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ربّ کی پناہ طلب کرو، ہم نے پوچھا: کون ہے محمد صلے اللہ علیہ وسلم؟ کہنے لگے: نہ شرقی ہے اور نہ غربی ہے، یثرب (مدینہ) جا کر اس کی تصدیق کرو، چنانچہ ہم وہاں گئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بتانے سے پہلے جو کچھ ہم نے سنا تھا ہمیں خبر دی، تو ہم نے اسلام قبول کیا۔

یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں، ابو رجاء رضی اللہ عنہ کا واقعہ طبقات ابن سعد میں، اور رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ تفسیر مظہری میں ہے۔ [مظهري]

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝٧ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ
حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝٨ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ
شِهَابًا رَّصَدًا ۝٩ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝١٠

ترجمہ: اور ان انسانوں نے بھی یہی گمان کیا جیسے تم گمان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بنا کر مبعوث نہیں کرے گا⑦ اور سنو! ہم نے ٹٹولنا چاہا آسمان کو، تو ہم نے اس کو سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا⑧ اور پہلے تو ہم بیٹھ جایا کرتے تھے اس کے بعض مقامات پر سننے کے لئے، لیکن اب جو جن سننے کے لیے کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لئے کسی شہاب کو انتظار میں⑨ اور ہم نہیں جانتے اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا کسی شر کا ارادہ کیا جا رہا ہے زمین کے مکینوں کے بارے میں، یا ان کے ربّ نے ان کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا ہے؟⑩

معارف ومنازل

مطلب یہ ہے کہ اے مشرکین مکہ! تمہارے خیال کی طرح جنّات کا بھی یہی خیال تھا کہ قیامت اور حشر ونشر کچھ بھی نہیں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ دوبارہ کسی کو زندہ نہیں کرے گا، لیکن جب قرآن نازل ہوا اور جنّات نے اس کو سنا، اس پر ایمان لائے اور قیامت کے قائل ہو گئے، لہٰذا تم قیامت پر ایمان لے آؤ، جس طرح وہ ایمان لے آئے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جنّات بھی کسی پیغمبر کی آمد و بعثت کا انکار کرتے تھے، جس طرح تم منکر ہو، لیکن جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور جنّات نے اس کی رسالت کا اقرار کیا اور اس پر ایمان لایا، تو تم بھی ان کی طرح تصدیق کر کے ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد جنّات نے ان سخت پابندیوں کا ذکر کیا جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان پر عائد کی گئیں، تو انہوں نے کہا کہ:

﴿وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا﴾ اسی طرح ﴿وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾ ہم نے حسب سابق جہاں بغیر کسی پابندی کے آسمانوں کو چھوا، عنان بادلوں پر پہنچے، جیسے پہلے ہوتا تھا، تو سخت پہرے داروں اور شہابوں سے آسمانوں کو بھرا ہوا پایا، اس سے پہلے جن جگہوں میں بیٹھ کر ہم فرشتوں کی باتیں سنا کرتے تھے، اب وہ کیفیت نہیں رہی، اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو کوئی بات سننا چاہتا ہے تو وہاں گھات میں شہابوں کو موجود پاتا ہے۔

امام ترمذی کتاب التفسیر میں حدیث تخریج کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جنّات شیاطین آسمانوں تک (عنان بادلوں) بلندی میں جاتے تھے، وہاں فرشتے عنان پر اترتے باتیں کرتے تھے، جنّات وہاں کچھ سنتے اور کاہنوں کو بتا دیتے، کچھ جھوٹ ملا کر یہ لوگوں کو گمراہ کرتے۔ بعثت سے پہلے بھی شہابوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا، مگر خفیف اور ہلکا، اب اس سلسلے میں شدّت بہت زیادہ نمودار ہوئی، یہ کیفیت اتنی شدت سے پھیل گئی کہ ہر محاذ

پر شہابوں نے بکثرت ان کا تعاقب کیا اور انہیں مار بھگایا، کچھ مرجاتے ہیں، کچھ زخمی ہو جاتے ہیں، کچھ گر کر منتشر ہو جاتے ہیں، اوران کے منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں۔

تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ کاہنوں کی کہانت کا عمل و پیشہ ماند پڑ گیا، تو انہوں نے برملا یہ کہا کہ ہمارا جو جھوٹ کا مشغلہ جاری رہتا تھا، وہ سراسر بند ہو گیا، ہم ابھی کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار پایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ اس نہایت طاقتور مخلوق پر ان کے اوپر جانے میں پابندی لگ گئی، اور یہ معلوم ہے کہ یہ مخلوق (جنّات) تخلیقِ آدم سے پہلے ہیں، اور انسانوں سے بہت زیادہ بھی ہیں اور ہشیار و طاقتور بھی ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے وہ خدمات لی ہیں جو طوق بشر سے خارج ہیں، یہاں تک کہ: ﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ﴾ [النمل: ٣٩] (ایک طاقتور سرکش جن نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا: ملکہ سبا (بلقیس) کی خوابگاہ (تخت) کو مجلس برخاست ہونے سے قبل حاضر خدمت کر سکتا ہوں۔ کہاں بیت المقدس اور کہاں ملک یمن (سبا) ہزاروں میلوں کا فاصلہ، اور وہ تخت بھی اتنا بڑا بھاری بھر کم جو ہزاروں منوں کے وزن پر مشتمل ہو، اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے بہت قوت حاصل ہے، اور امانتدار بھی ہوں، انہی جنّات نے دنیا میں وہ وہ کارنامے انجام دیئے جن کی نہ نظیر ہو نہ مثال۔

جہاں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان کے اوپر آسمانوں تک جانے پر پابندی عائد کرادی، اسی طرح امت محمدیہ کے خلاف ان کے غلط و ناجائز اقدامات اور سرکشیوں پر تکوینی طور پر بھی پابندی لگ گئی، ورنہ یہ طاقتور مخلوق جو نظروں سے غائب ہے، انسانوں اور دیگر مخلوقات کے خلاف سب کچھ کر سکتی تھی۔ واللہ اعلم

بہر حال! جب جنّات نے قرآن سنا اور ایمان لایا تو انہیں یقین کے ساتھ کہنا پڑا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہمارے اوپر جانے پر پابندی لگ گئی ہے۔

فائدہ:

اللہ ربّ العزّت نے یہ جہاں اپنی مخلوقات کے لیے بنایا، اور پھر انہیں اپنی دیگر مخلوقات علویات اور سفلیات، سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں وغیرہ میں آزادی کے ساتھ سیر و سیاحت اور قدرتی مناظر دیکھنے، معلومات حاصل کرنے، قدرتی عجائبات کے حقائق معلوم کرنے، ہر قسم کی تحقیقات کرنے اور منافع و فوائد حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، پس جنّات کے اوپر جانے اور معلومات حاصل کرنے پر کیا عجب؟ آج تو اسی خالق حکیم و

خبیر کے حکم و مرضی کے ساتھ یہ کمزور انسان بھی اوپر جانے پر اپنا پر تول رہا ہے، چاند تک رسائی حاصل کرنے کے بعد مزید ستاروں اور کہکشاؤں تک پہنچنے میں مصروف ہے۔

کچھ لوگ اس پر حیراں ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں؟ یہ عین مصلحت ہے، نہیں گھبرانا چاہیئے، اس سے مزید قدرت کے کمالات اور لامتناہی عجائبات کا ظہور اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا اعتراف واقرار پر مبنی ہے، انسان نے خدائی تخلیقات پر کوئی اضافہ نہ کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے، بلکہ اس کی تخلیقات جن عجائبات وسربستہ رازوں پر مشتمل ہیں، ان کا انکشاف ہو رہا ہے، اور یہی اصل مقصود ہے قرآن حکیم کا، جو فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأعراف: ۱۸۵] (کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، ان پر نظر نہیں کی؟)۔

یہ کوئی ملکی سیاحت نہیں جو مملکتوں نے اپنی تنگ نظری کی بنیاد پر قائم کیا ہو کہ ایک ملک کا باشندہ بغیر اجازت اور ویزا کے دوسرے ملک میں داخل نہیں ہو سکتا، یہ سارا جہاں قدر مشترک ساری مخلوقات کے لیے ہے، جو بھی اس کے اطراف واکناف تک رسائی حاصل کرنے کی ہمت وجرأت کر سکتا ہے، وہ آزاد ہے۔ مسلمان وغیر مسلم دونوں اپنے ارادوں میں آزاد ہیں۔ زمانوں اور قرنوں سے چاند سورج دیکھتے رہے، مگر شناخت نہ کر سکے، جہالت ونادانی کے سوا کچھ نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج نے یہ دروازہ کھول دیا، اور اتمامِ حجت کر دیا کہ آنے والی قیامت جس سے پورے عالم کا بسترہ گول ہوگا، اور کافر پر اتمامِ حجت تب ہوگا کہ پوری کائنات کی تسخیر کی اس کو موقع دیا جائے، اور مخفی رازوں تک اسے رسائی کی قدرت حاصل ہو۔

کیونکہ جیسے کہ شرک جو چند مخصوص صفات میں غیر اللہ کو شریک کرنے کا نام ہے، پس یہ تسخیر کائنات اور اس کی مخصوص عجائبات تک رسائی حاصل کرنے کا نام شرک نہیں، بلکہ اس سے مظاہر و برکات قدرت کی نشاندہی مقصود ہے، اس سے غیر مسلموں پر اتمامِ حجت قائم کرنا مقصود ہے، اور قومِ مسلم کے ایمانوں میں استحکام ومضبوطی مقصود ہے، اور اپنے پیغمبر برحق ﷺ کے فرمودات پر مزید یقین، جو علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین تک کا حصول ممکن ہوگا۔

دیکھنا یہ ہے کہ جنات کی پابندی کے ساتھ انسانوں پر پابندی نہیں لگائی گئی، کیونکہ اس کی نوعیت الگ تھی، جس سے وحی الٰہی متاثر ہو سکتی تھی، جبکہ انسانوں کے اوپر جانے سے یہ خطرہ نہیں ہے، بلکہ مناظرِ قدرت کی عجیب وغریب نشاندہی مقصود ہے، قرآن وحدیث نے کب کہا کہ تم ہاتھ پر ہاتھ رکھو وظیفہ پڑھو، کوئی فکر وغور نہ کرو؟ بلکہ یہ

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں میں خوب غور وفکر کرو، اہل دنیا کے سامنے ربّ العزّت کے عظیم کارخانوں کے حقائق معلوم کر کے بیان کرو، تاکہ اس کی عظمتوں کے مخفی رموز واسرار معلوم ہوں، اور لوگ اس کا اقرار واعتراف کر کے اپنے ایمان ویقین محکم کریں، اور یہی مقصد تخلیق کائنات ہے۔

قرآن حکیم کا واضح اعلان ہے: ﴿ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَ زِينَةً وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [النحل:۸] (اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور (وہ تمہارے لیے) رونق وزینت (بھی ہیں)، اور وہ (اور چیزیں بھی) پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں)۔

یہ ﴿ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ کیا ہے؟ زمانۂ رسالت میں نزولِ قرآن کے وقت علوی، سفلی، انسانی، حیوانی، نباتاتی، جماداتی، جتنی مخلوقات ہیں یہ سب کو معلوم ہیں، اور یہ تو اتر وتوارث سے ثابت ہے کہ بعد میں کوئی نئی چیز کی تخلیق نہیں ہوئی، نیا ستارہ پیدا نہیں ہوا، کوئی نیا پہاڑ وجود میں نہیں آیا، نیا آسمان، نئی زمین کا قطعہ، نیا جانور، نیا حیوان اور نئے درخت، نئے کیڑے مکوڑے پیدا نہیں ہوئے، پہاڑوں میں جو دھاتوں کے ذخیرے ہیں ان میں کوئی نئی دھات پیدا نہیں ہوئی، کھانے کی چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ ان چیزوں میں انسانی دماغ نے محیر العقول ایجادات کئے، مثلاً: جو گندم ایک دو کاموں کے لیے متعارف تھا، اب اس سے تین سو قسم کے کھانے تیار ہوئے، جو لوہا قلیل مقدار میں دستیاب تھا، انسان نے پہاڑوں سے اس کے بڑے بڑے ذخیرے تلاش کئے اور لاکھوں چیزوں کی ایجادات کیں، جن کا شمار نہیں، تیل زمین میں پہلے سے تخلیقاً موجود تھا، اس کے سینکڑوں اقسام کو تلاش کیا گیا، یہ سب کچھ تخلیق الٰہی ہے۔

انسان آج تک کوئی مکھی، مچھر، پسو پیدا نہ کر سکا، اور نہ آئندہ یہ اس کے بس میں ہے، اس کا کام صرف ربّ العزّت کی تخلیقات میں مختلف شکل ومنافع کی ایجادات ہیں، جب زمینی ایجادات بے شمار اور حیران کن ہیں، اس پر کسی کو نہ حیرانی ہے اور نہ اعتراض، پھر اگر اوپر کی منزل تک اس کی کوششوں کی رسائی کا سلسلہ جاری ہو، تو اس کو قبول کیا جا سکتا ہے، یہ تخلیقِ الٰہی ہے، انسان کی ایجادات معلومات تک ہی ہیں، اور یہ منافع پہلے سے مخلوق ہیں، راز میں رہے ہیں، انسان نے اس کو ظاہر کیا، اور اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر اسے عقل ودانائی کے ساتھ رہبری کی۔ یہ سب کچھ ﴿ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ کے افراد ہیں۔

ایک حکیم جڑی بوٹیوں پر تحقیق وریسرچ کر کے ایک بوٹی میں ستر بیماریوں کا علاج دریافت کرتا ہے، یہ اس

کی تحقیق اور فن کا کرشمہ ضرور ہے، مگر یہ فوائد اس بوٹی میں ہزاروں سال پہلے سے قدرت نے ودیعت رکھی ہے، انسان نے صرف صیغۂ راز سے پردہ اٹھایا، ان فوائد کی تخلیق نہیں کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے عصاء کے چند فوائد معلوم تھے، اور کچھ معلوم نہ تھے کہ یہ سانپ کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے، اور پتھر پر مارنے سے چشمے جاری ہو سکتے ہیں، دریا پر مارنے سے راستے بھی بن سکتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ شانہ نے اسے اس کی تعلیم دی، یہ سب کچھ پہلے سے موجود تھا، مگر راز میں رہے، پھر اس پر ان کا انکشاف ہوا، تو انسانی عقل کی رسائی نہایت اونچی پرواز کا حامل ہے، اگر یہ انسان اوپر (ایک خاص حد تک) جانا چاہے تو شریعت کے خلاف نہ ہوگا۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے ہمیں ☆ کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

(اقبالؒ)

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنات میں بھی اسی قدر فرقے ہیں جس قدر انسانوں میں ہیں، مثلاً: سنی، شیعہ، رافضی، یہودی، نصرانی، پارسی، مجوسی ہندو اور سکھ، اور فروعی اختلافات بھی ان میں ہیں۔ [تفسیر عزیز، کبیر]

﴿وَاَنَّا لَا نَدۡرِیۡۤ اَشَرٌّ اُرِیۡدَ بِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ جنات آسمانوں کے شہاب وسخت پہروں کو دیکھ کر کہنے لگے کہ: یہ چیز دو باتوں میں سے ایک ضرور ہے: یا زمین والوں پر کوئی عذاب نازل کرنا مقصود ہے، یا اس میں کسی رشد وہدایت کا پہلو موجزن ہے، جب انہیں قرآن سننے اور ایمان کی دولت نصیب ہوئی، تو کہنے لگے: اس میں سعادت اور کامیابی کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں، اسی وحی الٰہی کے تحفظ کی خاطر اللہ تعالیٰ نے شریر جنات کے اوپر آسمان تک جانے پر پابندی عائد کی ہے جو کہ برحق اور صحیح ہے۔ آگے مزید انہوں نے وضاحت کی اور کہا:

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنَّا دُوۡنَ ذٰلِكَ ؕ کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۝١١ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ نُّعۡجِزَ اللّٰهَ
فِی الۡاَرۡضِ وَلَنۡ نُّعۡجِزَهٗ هَرَبًا ۝١٢ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعۡنَا الۡهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِرَبِّهٖ فَلَا
یَخَافُ بَخۡسًا وَّلَا رَهَقًا ۝١٣ وَّاَنَّا مِنَّا الۡمُسۡلِمُوۡنَ وَمِنَّا الۡقٰسِطُوۡنَ ؕ فَمَنۡ اَسۡلَمَ فَاُولٰٓئِكَ
تَحَرَّوۡا رَشَدًا ۝١٤ وَاَمَّا الۡقٰسِطُوۡنَ فَكَانُوۡا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝١٥

ترجمہ: اور بیشک ہم میں نیکوکار بھی ہیں اور اس کے علاوہ بدکار بھی ہیں، ہم مختلف راستوں پر بٹے ہوئے تھے ⑪ اور بیشک ہم نے اب سمجھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے، اور نہ ہم کہیں بھاگ کر اللہ تعالیٰ

کو عاجز کر سکتے ہیں⑫ اور جوں ہی ہم نے ہدایت کی بات سنی فوراً اس پر ایمان لے آئے، پس جو اپنے ربّ پر ایمان لائے گا وہ کسی نقصان کا خوف نہیں کھائے گا، اور نہ اس کو کسی زبردستی کا کھٹکا ہوگا⑬ اور بیشک ہم میں سے فرمانبردار (مسلمان) بھی ہیں اور بے انصاف (کافر) بھی ہیں، پس جس نے فرمانبرداری کی تو انہوں نے نیکی کی راہ تلاش کر لی ⑭اور جو بے انصاف ہیں وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے⑮

معارف ومنازل

جنّات نے اپنے متعلق وہ تمام حقائق بہ طیب خاطر اقرار کر کے بیان کئے جو قبل از اسلام ان کے افراد اور پورے معاشرے میں تھے کہ ہم مختلف برے اور گندے عقائد اور غیر اسلامی اعمال میں منسلک رہے، ہمارے اندر اچھے اور برے ہر قسم کے افراد موجود ہیں، اب ہم اقرار کر کے کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور گرفت سے کہیں بھی بچ کر نہیں نکل سکتے، وہی کائنات کا مالک ہے، جب چاہے اور جس طرح چاہے ہمیں سزا دے سکتا ہے اور کوئی مخلوق اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتی اور اس کے عذاب سے نہیں نجات پاسکتی، اور نہ ہم بھاگ کر اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں۔

ہر وقت، ہر جگہ اس کے قبضے میں ہیں، یہ بات ہمارے لئے باعث فخر و سعادت ہے کہ ہم نے قرآن مجید سن کر بغیر حیلہ وحجت کے اسلام لایا، اور توحید و رسالت اور قیامت پر ایمان لایا، اور اقرار کرتے ہیں کہ ایمان ہی سبب خوشحالیوں اور نجات کا ذریعہ ہے، اس کے برعکس شرک وکفر میں بربادی اور ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں، ہماری خوش قسمتی کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم کو اولاً اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بغیر ایمان بھی لائے، اور دعوت الی الاسلام کے داعی ومبلغ بنے، اور یہ بھی کہا کہ ہمارے اندر انصاف والے اور بے انصاف ہر قسم کے افراد موجود ہیں، انصاف والوں کے لیے جنت اور رضائے الٰہی کا انعام واکرام مقرر ہے، جبکہ بے انصاف ونافرماں جہنم کے ایندھن بن جائیں گے۔

بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ جنّات جہنم کی آگ سے پیدا ہوئے، انہیں آگ کی سزا کس طرح ہوگی، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام آگ جس سے جنّات پیدا ہوئے یہ معمولی اور کمزور ہے، جبکہ جہنم کی آگ بہت سخت اور تیز ہے، دونوں کے ٹمپریچر میں بہت فرق ہے، اس کے علاوہ جہنم کے مختلف طبقات میں مختلف قسم کے عذاب ہوں گے، ایک طبقہ "زمہریر" کا ہے جس کی ٹھنڈک نہایت خطرناک ہے، تقریباً جنّات کے لیے شاید

یہی ہو، اس کے علاوہ عذاب دینے والی ذات جب ہر شئ پر قادر ہے تو اشکال بے معنی ہوگا۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۝۱۶ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۝۱۷ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝۱۸ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝۱۹ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۰ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝۲۱

ترجمہ: کہ اگر یہ لوگ سیدھے رستے پر رہتے تو ہم ان کے پینے کو بہت سا پانی دیتے ۝۱۶ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں، اور جو شخص اپنے ربّ کے ذکر سے اعراض کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں چلائے گا ۝۱۷ اور بیشک مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مت پکارو ۝۱۸ اور بیشک جب کھڑا ہوا اللہ تعالیٰ کا بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے لیے قریب تھا کہ یہ لوگ ہجوم کر کے اس کے گرد اکٹھے ہو کر اس سے لپٹ جائیں ۝۱۹ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: بیشک میں اپنے ربّ کو پکارتا ہوں، اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ۝۲۰ آپ کہہ دیجئے: اے لوگو! میں تمہارے لئے کسی بھی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں ۝۲۱

معارف ومنازل

الطریقة المرضیة عند اللہ یہ پسندیدہ طریقہ دین اسلام اور صراط مستقیم ہے، یہاں جن وانس دونوں مراد ہیں کہ اگر یہ لوگ سیدھے راستے پر آجائیں، اور صراط اللہ کو قبول کریں، توحید ورسالت پر ایمان لائیں، شرک، کفر اور دوسرے ہر قسم کے معاصی سے توبہ کریں، تو اللہ تعالیٰ انہیں ہر قسم سکون وراحت اور رزق وروزی بکثرت وفراوانی سے مہیا فرمائیں گے، جن میں سے ایک پانی بھی ہے جو کہ ہر شئ کی حیات وبقاء کا سبب ہے۔

قرآن حکیم نے اہل کتاب سے بھی اسی قسم کے وعدہ کا تذکرہ کیا ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [الأعراف:۹۶] (اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہوجاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے)۔ اسی طرح: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ

﴿اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ﴾ [المائدة: ٦٦] (اور اگر وہ گروہ تورات اور انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں ان کو قائم رکھتے (تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے پاؤں کے نیچے سے کھاتے)۔

اپنی جامعیت کے اعتبار سے یہ مضمون عام بھی ہے اور ابدی بھی کہ بندوں کی اطاعت وایمان ان کی خوشحالی اور رزق کی فراوانی اور امن وسکون کا سبب بن جاتی ہے، اور شرک ومعاصی سے بدامنی، فتنہ وفساد اور رزق وروزی کی تنگی اور کئی دیگر عذاب مسلط ہو جاتے ہیں، کاش غافل وگمراہ لوگ عبرت حاصل کرتے۔ قرآن مجید ہزاروں اعمالِ صالحہ پر ہزاروں، بلکہ بے شمار خوشخبریاں سناتا ہے، اور ہزاروں معاصی پر بے شمار وعید وعذاب کا تذکرہ کرتا ہے، پس ہے کوئی سوچ اور غور وتدبر کرنے والا؟ ان آیات کے نزول کے وقت مکہ میں قحط پڑا ہوا تھا، ان آیات میں ان کے لیے خصوصی تنبیہ بھی مقصود ہے۔ آگے:

﴿لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ﴾ میں اس بنیادی ضابطہ کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ظاہری وباطنی، ہر مادی وروحانی نعمت میں ابتلاء وآزمائش کا پہلو ہر وقت موجود ہے، شاکرین کے لیے بشارت ہے اور ناشکر اور نکمے لوگوں کے لیے وعید ہے، شاکرین نے کبھی نقصان نہیں اٹھایا، ناشکروں نے کبھی سکون نہیں پایا، اور ذکر الٰہی سے انحراف کرنے والوں اور اسی طرح ناشکروں کے لیے ﴿عَذَابًا صَعَدًا﴾ فرما کر تنبیہ کی کہ اخروی عذاب دینوی عذاب سے کہیں بدرجہا ابتر اور سخت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ [المدثر: ١٧] (ہم اس کو دوزخ کی چڑھائیوں پر چڑھائیں گے، اور نیچے گرائیں گے) اس سے واضح اشارہ ہے کہ مکذّبین اور شرک وکفر کے رؤسا کو اور نافرمان مالداروں کو دنیا کی خوب ترقی ہوگی، اونچے اونچے درجات اور بڑے بڑے دنیوی مراتب و مناصب پر ان کا عروج ہوگا، مگر انجام ذلت وخواری اور تنزّل کی صورت میں جہنم ہی ہوگی۔

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ جنّات میں رواج تھا کہ جب کسی مکان کو کسی خاص مقصد یا کسی خاص شخصیت کے لیے مخصوص کرتے تو کسی شخص جنی کو یا کسی اور مقصد کے لیے آنے والوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اس پر فرمایا: جنّات اور مشرکین دونوں کے لیے تنبیہ ہے کہ مساجد اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، ان کی بناؤ اور تعمیر صرف اللہ تعالیٰ کے نام پر خاص اس کی عبادت کے لیے ہے، پس تم جنّات اور مشرکین عام مسجدوں اور خاص کر مسجد حرام میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالاؤ، اور خاص اس کے حضور سجدہ ریز ہو کر اس کی

بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی بھی شخصیت یابت کو شریک کر کے مت پکارو، جو کہ صریح شرک اور ظلم و بے انصافی ہے۔

''مسجد''، تین معنوں میں مستعمل ہے:

(۱) عبادت گاہ، مکان۔ (۲) سجدہ۔ (۳) اعضاء سجدہ، جو کہ سات ظاہری ہیں، اور ایک باطنی ہے، ظاہری اعضاء سجدہ یہ ہیں: چہرہ، پیشانی سے ناک تک اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں، اور دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔ باطنی جو کہ اصلی بھی ہے اور محرک و حاکم بھی ہے، وہ قلب ہے، یہی تو تمام اعضاء پر حکمران ہے، اگر یہ نہیں چاہے گا تو اعضاء کبھی غیر اللہ کا سجدہ نہیں کریں گے، اصلی محل و مرکز ایمان یہی قلب ہے، ''**إذ اصلح صلح الجسد کله، وإذا فسد فسد الجسد کلّه**''۔ [بخاري، تفسیر عزیزي] ۔

دل بدست آور کہ حج اکبرست ☆ از ہزاران کعبہ یکدل بہترست

دل گزرگاہ جلیل اکبرست ☆ کعبہ معمار خلیل آزرست

''**خیر البقاع المساجد وشر البقاع الأسواق**''۔ [الحدیث] ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں ، سارے اعمالِ خیر ذکر اللہ کے افراد ہیں، جبکہ ان کا مرکز و مکان مسجد ہے، جو کہ خیر البقاع کے شرف سے موسوم ہے، اور غفلت تمام گناہوں کا مرکز و بنیاد ہے، جو کہ اسواق و بازار اس کے منبع و بنیاد ہیں، پس مطلب یہی ہوا کہ سجدہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، خواہ شرعی سجدہ ہو، یا تعظیمی انحناء جھکنے کے ساتھ ہو، غیر اللہ کے لیے حرام اور شرک ہے۔

سابقہ امتوں میں سجدۂ تعظیمی کسی شخصیت کے لیے جائز ہوتا تھا، جبکہ یہ ہماری شریعت میں مطلقاً حرام ہے۔ آج کل درگاہوں، مزارات، قبور پر، پیروں، نام نہاد اولیاء، امراء اور وزراء کے حضور جس نادانی اور سرکشی کے ساتھ شب و روز سجدے ہو رہے ہیں ان کے عدمِ جواز اور شرک ہونے اور غیر شرعی ہونے میں کیا اختلاف و شک ہے؟ قرآن و سنت کی رُو سے یہ شرک جلی اور حرام ہے، اس کا مرتکب کافر و مشرک ہے، جب یہ سجدہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی صفات کے لیے جائز نہیں ٹھہرا، جب اونٹ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکوہ لے کر آیا تو سجدہ ریز ہو کر اپنا سر قدموں پر رکھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جس طرح لوگ اپنے بڑوں، بادشاہوں کا سجدہ کرتے ہیں اور اس اونٹ نے بھی سجدہ کیا، تو کیا ہمیں اجازت ہو سکتی ہے؟ فرمایا: سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اور کسی کے لیے جائز نہیں اور حرام ہے، اگر یہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو امر کرتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، مگر یہ کسی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ [الحدیث] تو کسی اور مخلوق کے لیے کیا جواز ہے؟ [مشکوۃ]

یہود ونصاریٰ نے جہاں اپنے مذہب وشریعت ''توراۃ وانجیل'' میں تحریف کر کے مذہب کا حلیہ بگاڑ کر اسے بازیچہ اطفال سے بدتر بنادیا، وہاں انہوں نے مسلمان موحد قوم کو جو اپنے برگزیدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سجدہ کرنے کو بھی حرام سمجھتے تھے، عام پیروں، فقیروں، سیدوں اور درگاہوں پر سجدہ ریز ہونے کا گرویدہ وعادی بنادیا، جس شرک و کفر کو مٹانے کی خاطر نوح علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہزاروں انبیاء علیہم السلام تشریف لائے، اس شرک کی احیاء وترویج کو برصغیر کے مسلمانوں میں مرغوب ومحبوب کا درجہ دے کر اسے عام کیا۔ آج تین چوتھائی حصہ یہاں کے لوگوں کا توحید الٰہی سے کنارہ کش اور شرک وقبر پرستی کا علمبردار ہے۔

تعجب ہے کہ پڑھے لکھے نام نہاد علماء وصوفیاء صریح شرک کے داعی ومبلغ بنے ہوئے ہیں، کیا فرق ہے بت پرستی اور قبر پرستی میں؟ دونوں ایک گائے کی سینگ ہیں، ولا حول ولا قوۃ۔ اگر ہندو کسی بت کا سجدہ کرتا ہے تو وہ بت کسی چور چمار کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک روحانی شخصیت کا ہوتا ہے، لات ومنات، عزّیٰ، ہبل ودّ وسواع، یغوث و یعوق، یہ کوئی ڈاکو چور شرابی نہیں تھے، بلکہ یہ بڑے پارسا، عابد، زاہد، مصلحین لوگ تھے، عیسائیت نے خداوند تعالیٰ کے ساتھ کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ برحق پیغمبر حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کا اشتراک کیا، اسی طرح یہودیت نے حضرت عزیر علیہ السلام کو شریک مانا۔

سنئے قرآن حکیم: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾ [المائدۃ: ۷۳] (وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے)۔ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [المائدۃ: ۱۷] (جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں وہ بے شک کافر ہیں)۔

﴿ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ [التوبۃ: ۳۰] (اور یہود کہتے ہیں کہ عُزیر خدا کے بیٹے ہیں، اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں)۔ وغیر ذلک من الخرافات۔

قرآن کریم احکامِ شریعت، حلال وحرام وغیرہ کا بیان پانچ سو آیتوں میں کرتا ہے، جبکہ اثبات توحید اور شرک کی تردید و قباحت کا بیان ایک ہزار سے زائد آیتوں میں ہے۔ فإلی اللہ المشتکی۔

جس وجود اور اس کی قیمتی اعضاء کو ربّ العٰلمین نے اپنے حضور سجدہ کے لیے پیدا فرمایا تھا، آج وہ اعضاء ظاہری مع باطنی قلب کے انسانوں، عاجزوں، بے جانوں، بے حرکت باطل معبودوں کے چوکھٹوں پر ذلت وخواری کے ساتھ سرنگوں ہے، جبکہ قرآن وحدیث آسمان کے چاروں افق پر روز روشن کی طرح جلوہ افروز اور ڈیڑھ ہزار سال

کے عرصہ سے موجود ہیں، مسجدوں کی زینت بنا ہوا بے کسی و کسمپرسی کے عالم میں اپنے ماننے والوں سے شکوہ کناں ہے، خاکم بدہن ضرور اس مظلوم کی شنوائی ہوگی، ایک تباہ کن عذاب ضرور آئے گا، جس کے مقدمات و مبادی شروع ہو چکے ہیں، ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [آل عمران: ۱۸۰] (اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے۔

﴿وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ عبد اللہ سے مراد حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اولاً و بالذات عبد اللہ ہی ہیں، باقی سارے لوگ ثانیاً و بالتبع اس نسبت سے موصوف ہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع و محل پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف بلاتے تھے تو مسلمان بکثرت اس لئے جمع ہوتے تھے کہ توحید و احکام ان کی روحانی غذا تھی، وہ اس کے حصول کی خاطر جمع ہوتے اور کفار و مشرکین استہزاء و استخفاف کی خاطر رکاوٹ ڈالنے کے لیے جمع ہوتے، یہ ہجوم تہ بر تہ بڑی کثرت کے ساتھ رونما ہوتا، اسی طرح یہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ رسالت میں ہر آن کوشاں و منہمک رہتے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اخلاص و عبادت کی طرف دعوت دیتے۔

اس کی دوسری تاویل ایک عجیب پیشین گوئی پر مشتمل ہے، جسے حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام للعبادۃ و اداء احکام شریعت کی خاطر بے مثال و اعلیٰ درجے کے ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر تجلیات انوار الٰہی کا اس قدر کثرت سے نزول اور ورود ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے کٹ کر انوار الٰہی کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن نظر آتے، اور مقامِ شہود کے سارے درجات طے کرتے ہوئے مقامِ حضور تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسائی حاصل ہوتی۔ اس پر نادانوں اور بیوقوفوں نے سوچ کر آپ کو مظاہر انوار حق ہونے کا خیال کیا کہ آپ کے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کا ورود ہو گیا، بعض نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد مانگنا شروع کیا، بعض لوگوں نے مال و متاع اور عزّت کا سوال کرنا شروع کیا، اور چند لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عین جلوۂ حق قرار دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب و مختار کُل کا درجہ دے دیا۔ ایک قسم آپ کی اطاعت کے بہانے آپ کو معبود کا درجہ دینے لگے۔ علیٰ ھذا القیاس

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ناداں دوستوں کا تہ بر تہ ہجوم ہونا شروع ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی اور فرمایا کہ تم کو اگر اپنے حق میں خوف ہے کہ کہیں لوگ تمہارے ساتھ ایسا معاملہ نہ کریں تو تم صاف صاف ان دونوں فرقوں کو اپنا منصب بتا دو، اور یہ اعلان کر دو کہ میں صرف "عبد اللہ و رسولہ" کے منصب پر فائز ہوں۔

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا﴾ (میں خود محتاج ہوں اللہ کا، پیغمبر ہوں، اس کے حضور سوال کرنے والا اور اس کی طرف بلانے والا ہوں)۔

میرے ہاتھ میں کچھ نہیں، میں اپنے لئے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، چہ جائیکہ کسی اور کے لیے، جب خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تو پھر کسی اور کو کیسے اور کیوں اجازت دیدوں؟ اور یہ بھی اعلان فرمایئے:

﴿قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ لَكُمۡ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا﴾ (یہ بھی) کہہ دو کہ میں تمہارے حق میں نقصان اور نفع کا کچھ اختیار نہیں رکھتا)، اور یہ بھی اعلان فرمایئے:

﴿قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۲﴾﴾ (یہ بھی) کہہ دو کہ خدا (کے عذاب) سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اور میں اس کے سوا کہیں جائے پناہ نہیں دیکھتا)، اور یہ کہ میں تمہارے لئے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، کیونکہ النافع والضار اللہ کی ذات ہے، مجھے کسی بھی نفع ونقصان کا نہ اپنے لئے اختیار ہے، نہ تمہارے لئے اختیار ہے، حتی کہ جس کام کے لیے مبعوث ہوا ہوں، یعنی ہدایت دینا، یہ بھی میرے اختیار میں نہیں، اگر اس کا مجھے اختیار حاصل ہوتا تو اپنے مہربان چچا ابو طالب کو ہدایت دے دیتا۔

میری شان یہ ہے: ﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ﴾ [القصص:۵٦] (اے محمد!) تم جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے)۔ ﴿لَاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِیۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا﴾ [یونس:۴۹] (کہہ دو کہ میں اپنے نقصان اور فائدے کا بھی کچھ اختیار نہیں رکھتا)۔

﴿ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾ (یہ بھی) کہہ دو کہ میں تمہارے حق میں نقصان اور نفع کا کچھ اختیار نہیں رکھتا)۔ ﴿مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ﴾ [المائدۃ:۹۹] (پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام خدا کا پہنچا دینا ہے)۔ ﴿لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ﴾ [الغاشیۃ:۲۲] (تم ان پر داروغہ نہیں ہو)۔ ﴿اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ﴾ [النمل:٦۲] (بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے؟ جب وہ اس سے دعا کرتا ہے، اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے؟)۔

کیسے کیسے بیہودہ عقائد لوگوں نے تجویز کی؟ مافوق الاسباب کسی بھی فائدہ ونقصان کا اختیار نہ نبی مرسل کو، اور نہ ملائک مقرب کو، اور نہ کسی انسی کو، نہ کسی جنی کو ہے، یہ سارے مخصوص ہیں ذات خداوندی کے ساتھ۔

تو وہ مالک ہے کہ جو چاہے کرے ☆ جس کو چاہے دے جسے چاہے نہ دے

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام آذر کو، نوح علیہ السلام اپنی بیوی اور بیٹے کو، لوط علیہ السلام اپنی بیوی کو، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوطالب کو ہدایت نہیں دے سکیں، تو پھر کون ہے وہ ہستی جو غوث وقطب ہو اور وہ سب کچھ کر سکتا ہو؟ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ با کرامت شیخ ہیں، ان کے زمانے میں رضا خانی امت کا وجود نہیں تھا، پیشین گوئی قرآن سے ثابت کی کہ ایسی شخصیت آنے والی ہے جو قرآن وحدیث کی تعلیمات حقہ اور توحید پر پانی پھیر دے گا، اور دجال اکبر کے لئے راستہ ہموار کر کے پورے عالم کو شرک وبدعت کی آماجگاہ بنا کر ابلیسی کارناموں کو چند پیسوں کے عوض عام کردے گا۔

﴿قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ﴾ (مجھے خدا کے سامنے کوئی بھی پناہ نہیں دے گا) اگر میں نے کوئی شرک وکفر کی بات کی اور میں خدا کے سوا کوئی جائے پناہ بھی نہیں پاتا۔ ﴿اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾ [الأنعام:۱۵] (اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے خوف آتا ہے)۔ اور ﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ﴾ [الإسراء:۷۵] (اس وقت ہم تم کو زندگی میں (عذاب کا) دونا اور مرنے پر بھی دونا مزا چکھاتے)۔ ﴿لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ﴾ [آل عمران:۱۲۸] (اے پیغمبر!) اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں (اب دو صورتیں ہیں:) یا خدا ان کے حال پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے)۔ ﴿لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ﴾ [الزمر:۶۵] (اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل برباد ہو جائے گا)۔ ﴿وَلَوْ اَشْرَکُوْا لَحَبِطَ عَنْھُمْ﴾ [الأنعام:۸۸] (اگر انہوں نے شرک کیا تو ان کا عمل اکارت ہو جائے گا)۔ وغیر ذلک من الآیات، واللہ ولیّ التوفیق هو الهادي لعبادہ۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَ
رِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتّٰۤی اِذَا
رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ
مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ
ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ

اَبۡلَغُوۡا رِسٰلٰتِ رَبِّہِمۡ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیۡہِمۡ وَ اَحۡصٰی کُلَّ شَیۡءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ بیشک مجھے خدا کے سامنے ہرگز کوئی بھی پناہ نہیں دے گا، اور میں خدا کے سوا ہرگز کوئی جائے پناہ نہیں پاتا ﴿۲۲﴾ مگر میرے ذمہ خدا کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغامات کو ادا کرنا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا پس بیشک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ﴿۲۳﴾ یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے پس یہ لوگ اس وقت جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں، اور تعداد میں کم؟ ﴿۲۴﴾ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے: میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ قریب ہے یا میرا ربّ اس کے لیے مدّت دراز بنائے گا ﴿۲۵﴾ وہی غیب کو جاننے والا ہے، پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ﴿۲۶﴾ مگر اپنے رسولوں میں جسے پسند کرتا ہے، تو اس کے آگے اور پیچھے اللہ تعالیٰ پہرہ دار بھیجتا ہے ﴿۲۷﴾ تا کہ ظاہر کر دے کہ انہوں نے اپنے ربّ کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں، اور اس نے احاطہ کیا ہے ان کے تمام احوال کا، اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی گنتی کر رکھی ہے ﴿۲۸﴾

معارف و منازل

سورت کے آخر میں پھر قیامت کے متعلق بحث و مباحثہ شروع ہوا۔ گزشتہ سورتوں میں مسلسل شرک و انکارِ قیامت کا بیان چلتا رہا، مادیت و روحانیت کی جنگ روزِ اول سے قیامِ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ میں بڑے زور شور سے جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ☆ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

در کارخانہ عشق از کفر نا گزیر ست ☆ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

مادیت اور گمراہی اپنی پوری قوت، فوج و حشم اور مال و دولت کے بل بوتے پر ہر زمانہ میں ظاہری اسباب سے مستغنی روحانیت پر حملہ آور رہی ہے، اور قیامت تک رہے گی، کہیں منکرینِ توحید و رسالت، کہیں منکرینِ قیامت و حشر و نشر اپنی خرمستی اور غرور کے ساتھ اہل حق پر حملہ آور رہتے ہیں، کہیں مشرکین اہل توحید پر حملہ آور نظر آتے ہیں، کہیں یہودیت و نصرانیت اسلام اور اسلامی اقدار پر، مگر اہل حق باوجود ظاہری اسباب کے فقدان اور تعداد میں کمی و کمزوری کے اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت و حمایت کی بدولت اپنے دین و ایمان پر استقامت کے ساتھ ڈٹے رہیں گے،

ان شاء اللہ۔ ﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ [النساء:۱۴۱] (اور خدا کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا)۔ ارشاد خداوندی ہے کہ انجام و عاقبت کی سرخروئی و کامیابی ان کی ہوگی، اور حقارت و شکست باطل کا مقدر ہوگی، باذن اللہ۔

مشرکین اور باطل کے علمبردار اپنی دولت و سرمایہ، جاگیر و حشم اور کثرتِ مال پر نازاں رہتے ہوئے استہزاءً پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ اور جلدی کیوں نہیں آتی؟ اگر تم سچے ہو تو قیامت برپا کرو، اگر عذاب ہمارے مقدر میں ہے تو دیر کیوں کرتے ہو؟ کبھی کہتے ہیں کہ آج دنیا میں ہم باعزّت اور مالدار ہیں، اگر قیامت آ بھی گئی تو وہاں بھی ہم لوگ بڑی خوشحالی اور عزّت کے ساتھ رہیں گے، مسلمان یہاں محتاج و بے سرو سامان ہیں ان کا وہاں بھی یہی حال ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

اللہ ربّ العزّت سبحانہ کی طرف سے تنبیہ اور جواب ہے کہ انتظار کرو، تمہارا ربّ بہت مصلحت پسند ہے، وہ مجرم پر جلدی ہاتھ نہیں ڈالتا، اس لئے کہ خدا کی مملکت سے باہر کہیں کوئی بھاگ نہیں سکتا، وہ رحیم و کریم اچھی طرح مہلت دے دیتا ہے تاکہ گرفت کا بہانہ مضبوط ہو، تم اپنے پیشرو اور بڑے بڑے نافرمانوں کی تاریخ پڑھو، انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ لیکن جب پکڑے گئے تو پھر نشانۂ عبرت بن گئے۔ فرمایا: میرا عذاب جزوی بھی ہے کلی بھی، مکمل عذاب قیامت کا ہوگا، مگر نافرماں قوموں کی گوشمالی جزوی عذابوں سے بھی ہوتی رہے گی، بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ ایک دن اچانک ضرور اس کے گلے پر چھری کا وار ہوگا، جب وقتِ موعود آ پہنچے گا تب پتہ چلے گا کہ کون کمزور ہے، اور کون مضبوط؟ کس کے مددگار زیادہ ہیں، کس کے کم؟ کس کی تعداد زیادہ، کس کی کم؟

اس وقت کافر چیخ اٹھے گا اور کہے گا: ﴿يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ [الحاقة:۲۹] (اے کاش موت میرا کام تمام کر چکی ہوتی، آج میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا، (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی)۔

اس کے برعکس اہل حق یوں گویا ہوں گے: ﴿هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ﴾ [الحاقة:۲۰] (وہ (دوسروں سے) کہے گا کہ لیجئے! میرا نامہ اعمال پڑھئے! مجھے یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (کتاب) ضرور ملے گا، پس وہ شخص من مانے عیش میں ہوگا، (یعنی) اونچے (اونچے محلوں) کے باغ میں جن کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے)۔

اسی بناء پر مشرکین پوچھتے رہتے تھے کہ: ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [الملک: ۲۵] (اور کافر کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ وعید کب (پورا) ہوگا؟)۔ اور یہاں بھی یہی سوال مذکور ہے، جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْۤ اَمَدًا﴾ (میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا میرا ربّ اس کے لیے لمبا اور دراز زمانہ مقرر کرے گا)، اتنا مجھے علم ہے کہ وہ خدائی اٹل فیصلہ ہے، اس کو کوئی طاقت نہ روک سکتی ہے اور نہ آگے پیچھے کرسکتی ہے۔ (پوری تفصیل متعدد مقامات پر گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے)۔

مجھے وقوعِ قیامت کا علم حاصل نہیں اس لئے کہ میں غیب نہیں جانتا، ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا﴾ (غیب (کی بات) جاننے والا ہے، اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا) یعنی غیب کو جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، بلکہ کسی بھی پیغمبر کو قیامت کا مقرر وقت معلوم نہیں تھا، اس لئے کہ تمام غیوب کا علم خاصہ خداوندی ہے، ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: ۶۵] (کہہ دو کہ جو مخلوق آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے)۔

علم غیب کلّی یہ خاصہ خداوندی ہے، وہ ذات کریم اپنی مخصوص صفات میں کسی مخلوق کی شرکت کو گوارا نہیں کرتا، ہاں! جزئی علمِ غیب جو کسی واسطہ وسبب یا بذریعہ وحی الٰہی اور الہام کے ہو وہ بعض مخلوقات کو خصوصاً پیغمبروں اور فرشتوں کو بھی حاصل ہے، وہ غیب کلّی کی تعریف سے خارج ہے، اور وہ کوئی کمال بھی نہیں، کیونکہ وہ ذاتی نہیں اور جزوی بالواسطہ ہے، بلا واسطہ بھی نہیں، اس کی مکمل تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (مگر اپنے رسولوں میں سے جسے پسند کرتا ہے)۔ رسول سارے ہی پسندیدہ ہیں، مِنْ بیانیہ ہے، تبعیض کے لئے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن رسولوں کو اللہ چاہے جتنا چاہے وہ غیب کے علوم ومعارف مغیبات کے ساتھ نوازے۔ ان کو انباء الغیب کہتے ہیں، چونکہ رسول عام ہے، ملائکہ کو بھی رسول کہا جاتا ہے اور انبیاء کو بھی، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب فرشتوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ [البقرۃ: ۳۲] (کہا: ہمیں جتنا علم دیا گیا ہے، ہم اتنا ہی جانتے ہیں)، اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی والہام جتنا علم عطا ہوتا ہے، ان سے مزید وہ نہیں جانتے۔ تو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے یہی جواب دیا کہ مجھے قیامت کا علم نہیں دیا گیا، یہ جواب پورے قرآن مجید میں تیس سے زائد مقامات پر مذکور ہے۔

﴿فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا﴾ نزول وحی پورے اہتمام ونگرانی کے ساتھ ہوتی ہے، جب فرشتہ اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر آتا ہے تو اس کے آگے پیچھے فرشتوں کا رصد ہوتا ہے، بسا اوقات ستر اسی ہزار فرشتوں پر مشتمل پوری طاقتور فوج ہوتی ہے، تاکہ جنّات اور شیاطین کوئی دخل اندازی نہ کریں، کیونکہ دنیا دارالاسباب بھی ہے، اور موانعات ورکاوٹوں کا جہاں بھی ہے، تو احکامِ الٰہی کا مکمل تحفظ بہت ہی ضروری ہوا۔ آگے ارشاد ہے:

﴿لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کو اگلا پچھلا سب کچھ معلوم ہے، مگر وہ دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتا ہے، تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ پیغمبروں علیہم السلام نے صحیح طور پر وحی الٰہی کو حاصل کیا ہے، اور اپنے ربّ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ جو علم اپنے پیغمبروں علیہم السلام کو محفوظ طریقے سے پہنچاتا ہے وہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوتا، کیونکہ فرشتہ اور نبی دونوں معصوم بھی ہوتے ہیں اور امین بھی، جو کام ربّ العزّت کی نگرانی میں انجام پاتا ہے اس میں کیا مجال کہ کوئی شائبہ ہو؟ (شک وشبہ) یہ ممکن نہیں۔ آگے اسی نکتے کی وضاحت ہے:

﴿وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا﴾ اور وہ تمام حالات اور واقعات پر اپنے علم محیط کے ساتھ احاطہ کیا ہوا ہے، اسے ذرہ ذرہ کا علم حاصل ہے، گزشتہ موجودہ اور آئندہ کے تمام حالات سے باخبر ہے، یہ بڑے اہم امور تو کیا، بلکہ اسے مٹی کے ذرات بوٹیوں کے پتے مخلوقات کی حرکات وسکنات پانی کے قطرات جانوروں کے لمحات اور انسانوں کے لحظات وغیرہ کے سب حالات معلوم ہیں، ساتوں سمندروں کی تہہ میں چلنے والی چیونٹی اور مچھروں کے پروں تک کا اسے علم حاصل ہے۔ [إحیاء العلوم]

الغرض! کلّی علم صرف اس کی ذاتی صفت وکمال ہے، اس صفت میں وہ واحد لاشریک ہے، جو کوئی اس وصف حقیقی کو کسی غیر کے لئے ثابت کرے وہ کافر ہے، کیونکہ اس سے نص قطعی قرآنی کا انکار لازم آتا ہے جو کہ صریح کفر ہے۔

[ردالمختار شامی جلد: ۲ ۳۳٦۲]

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّل

مکیۃٌ آیاتھا ۲۰ رکوعاتھا ۲

سورۂ مزمل مکی ہے، اس میں بیس (۲۰) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورۃ المزمل کی پہلی آیت میں المزمل کا لفظ مذکور ہے، اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

مکی زندگی کے ابتدائی دور کے نازل شدہ سورتوں میں اس کا شمار ہے، اور اس کا نزول سورۃ القلم یا سورۃ المدثر کے بعد ہے، یہ آئندہ اس کا بیان ہوگا۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

سورۂ مزمل کی بیس (۲۰) آیات، دوسو پچاسی (۲۸۵) کلمات اور آٹھ سو اڑتیس (۸۳۸) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۃ الجن میں جنّات کے ایمان لانے کا بیان تھا جہاں جنّات نے رات کے وقت قرآن پاک سنا اور ایمان لایا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ نخلہ میں رات کے وقت نماز تہجد میں قرآن پاک تلاوت فرمارہے تھے کہ جنّات نے سنا اور مسلمان ہوئے، اس سورت میں اسی رات والی نماز تہجد کو جاری رکھنے، اور قرآن کی تلاوت ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے، تاکہ جنّات رات کو تلاوت سن کر مزید اپنے ایمان محکم ومضبوط رکھیں، اور غیر مسلم جنّات قرآن سن کر

ایمان لے آئیں۔سورۂ مزمل کا پہلا رکوع نزول کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر ہے، جبکہ آخری رکوع کا نزول ایک سال بعد ہے۔سب سے پہلا نزول سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کا ہے، دوسرے نمبر پر سورۂ فاتحہ کا نزول ہے، تیسرے نمبر پر سورۂ مزمل اور چوتھے نمبر پر سورۂ مدثر کا نزول ہے۔

بعض مفسرین نے تیسرے نمبر پر سورۂ مدثر، چوتھے نمبر پر سورۂ مزمل اور پانچویں نمبر سورۂ قلم کا نزول بتایا ہے۔صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''فترة الوحي'' کے بعد سب سے پہلا نزول سورۃ المدثر کا ہے، اس کے بعد غالباً سورۂ مزمل کا نمبر ہے، **كما قال بعض المفسرين۔ والله أعلم**

مختصر موضوع:

اَلْمُزَّمِّل: بڑی چادر، کمبل، اوڑھنے والا، عربی میں زمیل سواری پر دوسرے آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں عجیب نکتہ یہ ہے کہ شروع شروع میں جب یہ سورت نازل ہوئی تو مسلمان نہایت محدود اور کم تھے، اور اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر اور آخری دین کا نام ہے جس کے ذریعہ پورے عالم میں اسلامی انقلاب کے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوتا، اس ہمہ گیر انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ انقلاب لانے والی ایسی شخصیت ہو کہ جو اعلیٰ درجے کی صفاتِ کمالیہ حسنہ کی جامع ہو، وہ صفات بہت سی ہیں، جن میں پہلی صفت اہتمام صلوٰۃ، بالخصوص صلوٰۃ اللیل ہے جو کہ قرب الٰہی کا واحد حقیقی ذریعہ ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے، دوسرے نمبر پر فوج اور فدائی جان نثاروں کا لشکر ہے جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے۔

پس المزمل کے معنی یہ ہوں گے: ''اے پیغمبر! فدائی اور جان نثاروں کا لشکر تیار کرنے والے، اٹھو! راتوں کو قیام کرو، قرآن کو ترتیل کے ساتھ تلاوت کرو، تاکہ مؤمن جنات، اور انسانوں کا لشکر تیار ہو جائے، اور تزکیہ نفس کے ساتھ قرب حق کا حصول ہو، راتوں کی میٹھی نیند و سکون اپنے ربّ کی رضاء میں قربان کرو، جب سارے اطراف میں رات کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہوں انہیں نورِ قرآن سے روشنی عطا کرو، اسی طرح پورے جہاں سے ظلمتوں کو مٹا کر اس کی جگہ نور قرآن کو پھیلا کر روشنی عام کرو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تفسیر عزیزی اور حضرت حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش مکہ کے سامنے نزول وحی اور مسئلہ توحید کا اظہار فرمایا، تو سارے قریش سراسیمگی کے عالم میں جمع ہو گئے اور طرح طرح کی مخالفت کی باتیں کیں (تفصیل سورۃ القلم میں گزر چکی) کسی نے مجنون، کسی نے ساحر،

کسی نے شاعر اور کسی نے کاہن کہا، اور یہ میٹنگ ولید بن مغیرہ کے کہنے پر منعقد کی گئی تھی، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑا صدمہ لاحق ہوا، غمگین ہوئے، اور کمبل اوڑھ کر گھر میں لیٹ گئے، تب یہ سورت نازل ہوئی کہ اے کمبل اوڑھنے والے! آپ کھڑے ہوں، آپ کے لئے سونا اور آرام کرنا نہیں، اٹھ کر درودیوار کو ہلاؤ، اپنے پیغام پر پہلے خود عمل کر کے اپنے نور وانوار سے راتوں کی ظلمتوں کو روشن کرو، اپنے پیغام کے ذریعہ تاریک دلوں کو روشن کرو، ظلمتوں کو مٹا دو، اپنے ربّ کے ساتھ ہم کلامی کرو، یہی تو وقت ہے سماء دنیا پر اس کے نزول وتشریف آوری کا، یہی تو وقت ہے اس کے حضور مراجعت و درخواست پیش کرنے کا، اٹھو، جاگو، مٹا دو ظلمتوں کو نور نبوت وشب خیزی کی مناجاتوں سے، بادشاہ حقیقی مالک الملک والملکوت آپ کو اپنے دربار میں حاضری کا پیغام دے رہا ہے، اب اٹھو!

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ‏ ① قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ‏ ② نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انْقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۙ‏ ③ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ؕ‏ ④ اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا‏ ⑤ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡـاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا ؕ‏ ⑥ اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا ؕ‏ ⑦ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا ؕ‏ ⑧ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا‏ ⑨ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا‏ ⑩

ترجمہ: اے کمبل اوڑھنے والے! ① آپ رات کو کھڑے ہوں، مگر تھوڑا حصہ ② نصف شب یا نصف سے کچھ کم کر دیں ③ یا نصف سے کچھ زیادہ کر دیں، اور قرآن پاک ترتیل سے پڑھیں ④ بیشک ہم آپ پر ایک بوجھل بات ڈال رہے ہیں ⑤ بیشک رات کو اٹھنا روندنے کے اعتبار سے زیادہ سخت ہے، اور زیادہ درست ہے بات کرنے کے اعتبار سے ⑥ بیشک آپ کے لئے دن کے وقت بہت شغل رہتا ہے ⑦ اور اپنے ربّ کے نام کو یاد کریں، اور سب سے ہٹ کر صرف اسی کی طرف الگ ہوں ⑧ مشرق ومغرب کا ربّ وہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو اپنا کارساز بنالو ⑨ آپ مخالفین کی باتوں پر صبر کریں اور آپ خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کنارہ کش ہو جائیں ⑩

☆☆☆

معارف ومنازل

قیام اللیل (صلوٰۃ التہجد):

رات کوادا کی جانی والی نماز کا نام قیام اللیل ہے، یہ بہت بابرکت نماز ہے، اس کے اتنے فوائد وثواب ہیں جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، حدیث شریف میں ہے: **علیکم بقیام اللیل فإنه داب الصالحین قبلکم وهو قربة لکم إلی ربکم ومکفرة للسیأت ومنهاة عن الإثم۔** [کنز العمال]

اے ایمان والو! تم بھی رات کے وقت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو اپنے اوپر لازم کرلو، کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ رہا ہے، تمہارے لئے قرب الٰہی کا ذریعہ ہے، گناہوں کو مٹانے والی ہے اور معاصی سے روکنے والی ہے۔ [کنز العمال عن أبي الدرداء وجابر بن عبد الله وأبي أمامة رضي الله عنهم]

نماز تہجد سے بڑھ کر کوئی عمل اتنا زود اثر نہیں کہ سبب مغفرت بھی ہو، اور روشنی وفراخی قبر کا ذریعہ بھی ہو۔ [شاہ عبدالعزیزؒ] نماز تہجد کی سب سے بڑی خصوصیت جو حدیث بالا میں بیان ہوئی وہ قرب الٰہی ہے، جو تمام نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کا ثمرہ اور پھل ہے۔ یہی اصلی سبب وذریعہ ہے روحانی انقلاب کا، جب انقلاب لانے والوں میں قرب الٰہی کا ظہور ہوگا تو ان میں انقلاب لانے کی صلاحیت پیدا ہوجائے گی، کیونکہ جب تعلق مع اللہ پیدا ہوجائے گا تو انبیاء کرام علیہم السلام سے نسبت پیدا ہوگی، اور اصل مدار نجات وکامیابی یہی نسبت مع اللہ ونسبت مع الانبیاء علیہم السلام ہی ہے، اور ترتیل قرآن کی چاشنی جب ساتھ ہوگی تو کامیابی کے سارے دروازے کھل جائیں گے، اور ناکامیاں تمامتر کافور ہوجائیں گی۔ تاریخِ صحابہ وتابعین اولیاء ومتقین اور نیک سیرت سلاطین کا اس اسلامی انقلاب پر روزِ روشن کی طرح شاہدِ عدل وگواہ ہے، اور یہ بھی واضح رہے کہ دنیا میں قرب الٰہی اور نسبت کے بغیر جتنے انقلابات آئے ہیں وہ شیطانی اور ظالمانہ اور بہیمانہ قسم کے تھے، جو کہ انسانیت وشرافت کی پیشانی پر بدنما داغ سے کم نہیں تھے۔

اس کے بعد نماز تہجد میں جو تلاوت قرآن پاک کا اسلوب بتایا گیا ہے وہ کتنا ہی اہم ہے؟ فرمایا:

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ترتیل نام ہے حروف کو مخارج وصفات کی رعایت کے ساتھ ادا کرنے کا اور وقوف کی معرفت کا، **أي تجويد الحروف مع معرفة الوقوف۔** [النشر] آہستہ صاف صاف واضح طور پر تلاوت جاری رکھنا، تیز تیز پڑھنے اور بغیر تجوید پڑھنے سے احتراز کرنا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تیز پڑھنے کی ممانعت فرمائی، اور شعروشاعری کے لہجے سے پڑھنے پر گرفت فرماتے تھے۔[بخاري]

حدیث شریف میں ہے کہ قرآن پاک کو اپنی آوازوں (لہجوں) سے مزین خوبصورت کرو، اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانا کہ اسے آل داؤد علیہ السلام کی خوش آوازی (مزمار أمن مزامیر آل داؤد) عطا کی گئی ہے، اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمانا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میری قرأت سن رہے ہیں تو میں اور اچھی آواز سے زیادہ عمدگی کے ساتھ پڑھتا۔ [ترمذي] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ ریت کی طرح قرآن کومت پھیلاؤ، اور اشعار کی طرح قرآن مجید کو بے تہذیبی سے مت پڑھو، اس کے عجائبات پر غور کرو، اور قلوب میں اثر لیتے رہو، اور اس کے پیچھے مت پڑھو کہ سورت جلدی ختم ہوجائے۔[بغوي]

ایک شخص نے آکر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے مفصل کی تمام سورتیں (سورۃ الحجرات سے آخر قرآن تک کی سورتیں مفصل کہلاتی ہیں) آج کی رات ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تو تو نے شعروں کی طرح جلدی جلدی پڑھا ہوگا، مجھے وہ برابر کی سورتیں خوب یاد ہیں جنہیں سید النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ملا کر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے، جس سے بڑی دیر میں سورت ختم ہوتی تھی، گویا چھوٹی سورت بڑی ہوجاتی تھی۔[ابن کثیر]

﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ قرآن حکیم اپنے نزول کے اعتبار سے بھی قول ثقیل ہے، اور اپنے مضامین ومطالب کے اعتبار سے بھی قول ثقیل ہے، اور اعمال وترویج واشاعت کے لیے جن جن مدارج سے گزرنا ہے وہ نہایت ہی سخت اور پریشان کن ہیں، دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ [الحشر:۲۱] (اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے، اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں)۔

جب نبی کو خلعت نبوت سے نوازا جاتا ہے، تو سارے جہاں کے بوجھ اٹھانے پر انہیں مکلف بنایا جاتا ہے، اور پہاڑوں سے زیادہ وزنی بوجھ کو اٹھا کر اسے پوری قوم اور ساری جہاں میں رائج کرنے اور پھیلانے کا کام سپرد کیا جاتا ہے، اور لوگوں کے عقائد واعمال کو یکسر بدل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اسی کا نام توشرعی اور اسلامی انقلاب ہے۔

شیاطین، نفس، مشرکین، کفار، منافقین، فجار، وفساق سارے گروہوں کا مقابلہ درپیش ہے، اوران کی ناروا سلوک اور سرکشیوں اور بدمعاشیوں پر استقامت کے ساتھ صبر کرنا یہ جانگداز، پُراز خار کانٹوں کو پھولوں کے ساتھ تبدیلی، کیا کوئی مذاق ہے؟

پہلے قرآن کو اپنے اندر جذب کرنا، اس کے ہر اشارے پر کاربند ہونا، بلکہ قرآن کا عملی نمونہ بننا جیسے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: "كان خلقه القرآن"۔ [بخاري] قرآن کے شیشہ میں دیکھو تو پیغمبر نظر آئے، نبی کی پیشانی دیکھو، تو قرآن معلوم ہو، پھر ہر گونہ نامساعد حالات میں اس کی اشاعت وترویج کی جدوجہد کرنا چرواہے، ناہنجان، بے وقوف، بت پرست، خبیث النفس، مردار خور اور زانی، شرابی، قاتل، چوروں پر شب وروز اتنی محنت کرنا کہ ان کی زندگی بدل جائے، اور تمام خسارے اور شیطانی حرکتیں رحمانی بن جائیں، شیطان سیرت عوام فرشتہ سیرت انسانوں کی شکل وصورت میں ڈھل جائیں، چور ڈاکو امین ومامون بن جائیں، اونٹوں کے چرواہے مسند خلافت کے مستحق ہوں، وغیرہ، کیا یہ آسان کام ہے؟ ؎

تیری فیاضی نے ذروں کو بنایا آفتاب ☆ بن گئے اونٹوں کے چرواہے زمانے کے امام

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تو سخت سردیوں میں سارا جسم مبارک پسینہ سے شرابور ہو جاتا، ایسا معلوم ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدن پر پانی کے مشکیزے بہائے گئے ہیں، چہرہ مبارک سرخ ہو جاتا، ایسا معلوم ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ انور پر انار کا پانی ڈالا گیا ہے، سانس رک جاتی، سینہ مبارک بند ہو جاتا۔ **سبحان الله و بحمده**

اگر یہ قول ثقیل نہ ہوتا تو اسے ہر شخص بخوشی قبول کرتا، اور اسلام کا گرویدہ ہو جاتا، آج کے زمانے میں بخوشی دیکھ سکتے ہیں کہ کتنے لوگ اس کے اٹھانے پر تیار رہتے ہیں؟ اور کتنے بدنصیب اس سے بھاگ کر راہ فرار اختیار کر رہے ہیں؟ یہی وحی والا قرآن چند لوگوں کے لیے شربت مصفی اور شہد خالص ہے، جبکہ دیگر لوگ اسے زہر قاتل سمجھ کر اس کی تعلیمات کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا﴾ آپ کا رات کو اٹھنا اور عبادت کرنا (روندنے کے اعتبار سے) بہت زیادہ شدید ہے، اور رات کے پرسکون ماحول میں جو مناجات زبان سے ادا ہو جاتی ہے وہ نہایت

مؤثر، پرکیف اور پرمسرت ہے، رات کی دلجمعی اور سکون نہایت عمدہ وپرلطف ہے، دن میں شور وشغب اور ذہنی انتشار کی وجہ سے وہ مزہ ولطف حاصل نہیں ہوتا جس طرح رات کو حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عبادت میں نفس پر بوجھ زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی مؤثر اور فائدہ مند ہوگی، عام اوقات میں خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرنا اور ذوق وشوق کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرنا نہایت مشکل اور سخت کام ہے، اسی وجہ سے تو فرمایا: ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ [البقرة: ۴۵] (اور بے شک نماز گراں ہے، مگر ان لوگوں پر (گراں نہیں) جو عجز کرنے والے ہیں)۔ اللہ سے ڈرنے والے ہی اس نماز پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں، یہ ہر عام وخاص کے لیے آسان نہیں، اگر نمازیں پڑھنا مشکل نہ ہوتا تو ہر ہوسناک نمازیں پابندی کے ساتھ ادا کرتا۔

''وَطْاً'' کے معنی ہیں: پائے مالی، اور پاؤں کے نیچے نفسانی خواہشات کو روندنا، پائے مال کرنا، یہ کام خواص ہی کی خصوصیت وامتیازی شان ہے۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ربّ العزّت سبحانہ نے اتنا بڑا حوصلہ اور شوق ذوق عطا فرمایا تھا کہ رات دن، بلا توقف عبادت الٰہی میں مصروف رہتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقیقی معنی میں سید المجاہدین، رئیس العابدین، امام المتقین، پیشوائے زاہدین تھے، ساری رات عبادت ونماز تہجد میں مصروف رہتے، کبھی ایک رکعت میں پوری سورۂ بقرہ ترتیل کے ساتھ اس طرح تلاوت فرماتے کہ ہر آیت پر وقف کرکے مناجات کرتے، اور عذاب وعقاب کی آیتوں پر وقف کرکے استعاذہ کرتے، دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران، تیسری میں سورۂ نساء، چوتھی رکعت میں سورۂ مائدہ اسی طریقے پر تلاوت فرماتے، پھر رکوع میں بھی اتنی دیر لگاتے، اسی طرح ہر سجدہ میں جتنی کہ قیام میں دیر لگاتے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک قدموں میں ورم پیدا ہوتا اور پاؤں شق ہوجاتے۔

لوگ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ نے آپ کا اگلا پچھلا سب کچھ معاف کیا ہوا ہے، اور آپ ہر قسم گناہوں اور لغزشوں سے پاک ہیں، تو آپ اتنی محنت وریاضت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ جواب ارشاد فرماتے کہ یہ سب کچھ شکر بجالانے کی خاطر بجالاتا ہوں، جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بے حساب نعمتوں کی بارش برسائی تو اس کا شکر بجالانا عبدیت وبندگی ہی سے ہوگی، کیونکہ کثرت نعمتوں کا تقاضا تب پورا ہوگا جب عبادت وریاضت بھی کثرت کے ساتھ ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو جب تہجد پڑھتے تو نہایت رغبت ذوق وشوق سے نماز پڑھتے، اور نماز میں کثرت سے روتے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک سے رونے کی آواز اس طرح معلوم

ہوتی جیسے کسی ہانڈی میں گرم پانی جوش مار رہا ہو، ابل رہا ہو۔ یہ رغبت والی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سارے جہاں سے محبوب وپسندیدہ اس لئے تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع نبوت ''غارحراء'' میں تحفۃً، اور پھر معراج میں خصوصیت کے ساتھ بطورِ انعام وتحفہ عطا کی گئی، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **وجعلت قرة عيني في الصلوٰة۔** (نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے)، اور میرا روحانی سکون ہے، جب کبھی کوئی پریشانی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نماز پڑھتے اور نماز کے ذریعہ پریشانی دور کرنے کی تدبیر کرتے۔

علماء امت نے بھی یہی تجربہ کیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اور نماز واذکار پڑھنے سے غم دور ہوجاتے ہیں، اور سکون حاصل ہوتا ہے، قرآن حکیم کا اعلان ہے: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: ٢٨] (اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں)۔

﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا﴾ آپ کے لئے دن کے وقت بہت سارے اشغال ومسائل ہیں، مثلاً: عبادات، تعلیم وتربیت اصحاب، مقدمات کا تصفیہ، جہاد کی تیاری، عوام کے مسائل ودیگر بہت سے معاملات وغیرہ، ان کے ہوتے ہوئے دن کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعلق مع اللہ کے قیام اور مزید روحانی ترقی کا عمل جاری نہیں رکھ سکیں گے، جتنا کہ رات کے وقت آسانی سے رکھ سکتے ہیں، لہٰذا یہاں سے وہ بنیادی اصول بیان ہوں گے جن کے ذریعہ تعلق مع اللہ قائم ہوتا ہے، وہ یہ ہیں:

(١) اپنے ربّ کے ناموں کے ساتھ ذکر کی تلقین۔

(٢) تمام علائق وعوائق ودنیوی امور سے فارغ ہوکر تبتّل ویکسوئی اختیار کرنا۔

(٣) صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ وتوکل کرنا۔

(٤) مخالفین اور مشرکین کی ایذا رسانیوں پر استقامت کے ساتھ صبر کرنا۔

(٥) مخالفین اور معاندین سے قطع تعلق کرنا، اور ان کے ساتھ میل ملاپ نہ رکھنا، اور کسی قسم کی دوستی سے اجتناب کرنا، تو فرمایا:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ اپنے ربّ کا نام یاد کریں، اور اس کی تجلی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کریں، سارے علائق وتعلقات سے کٹ کر صرف اس کے حضور میں دست بستہ رہیں، کیونکہ ذکر الٰہی اور یکسوئی میں ایک قلبی تجلی حاصل ہوجاتی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام اسے دنیا ہی میں محسوس کرتے ہیں، جبکہ عام

مؤمنوں کو یہ بارونق تجلی جنت میں محسوس ہوگی۔ [حجۃ اللہ البالغۃ]

حدیثوں میں جس تبتّل و رہبانیت سے ممانعت آئی ہے وہ یہاں مراد نہیں، وہ غیر شرعی تبتّل نصرانی احبار کا اختراع ہے، یہاں جس تبتّل کا حکم ہے وہ محبوب و پسندیدہ اور شرعی ہے۔

﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحاً طَوِيْلاً﴾ اس پر واضح قرینہ یہ ہے کہ دن کے مشاغل سے کٹ کر رات کو یکسوئی و علیحدہ گی کے ساتھ اپنے ربّ کی یاد میں مشغول ہوں، وہ ربّ جو:

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا﴾ مشرق ومغرب سارے جہانوں کا ربّ ہے، جب عبادت وذکر صرف اس کے لیے ہیں تو بھروسہ وتوکل بھی اسی پر ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کا سرمایہ وطریقہ بھی یہی رہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ملت ابراہیمی کی تشریح وتفصیل ہے، وہ بھی اسی توکل کا علمبردار اور پرتو رہا، اور سید المتوکلین کا لقب پایا، جب نمرود کی آگ میں ڈالا گیا تو "حسبنا اللہ و نعم الوکیل" ان کی زبان پر جاری رہا۔ حضرت جبریل علیہ السلام مدد کے لیے پہونچے تو اجازت مانگی کہ آپ اگر چاہیں تو نمرود کی آگ کو اس پر اور اس کی قوم پر الٹ دوں، حضرت ابرہیم علیہ السلام نے پوچھا: ازخود آئے ہو یا آپ کو حکم دے کر بھیجا گیا ہے؟ کہنے لگے: ازخود آیا ہوں، جب ایک دوست کو پریشانی ہوتی ہے تو اس کے ساتھی اور دوست بغیر بلائے مدد کو پہنچتے ہیں، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ سب سے بڑا دوست یہ ماجرا جب خود دیکھ رہا ہے تو اس پر چھوڑ دیں، تب اللہ تعالیٰ کارساز وکیل کا براہ راست حکم آیا: "اے آگ! اپنی جلانے والی فطرت سے باز آجا، اور ابراہیم علیہ السلام پر گل وگلزار بن جا، اسے سلامت رکھ"، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فللہ الحمد

پہلے گزر چکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین نہ شرقی ہے، نہ غربی، بلکہ ﴿كَافَّةً لِّلنَّاسِ﴾ (سارے جہانوں کے لیے ہے) تو جب تمہارا ربّ، ربُّ المشرق والمغرب ہے، ہر طرف اس کی ملکیت وخدائی ہے، تو کیا بعید ہے کہ توکل علی اللہ کی بنیاد پر مشرق ومغرب سب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم لہرائے، اور مشرقی ومغربی عظیم نافرمان مملکتوں (فارس روم) کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعہ تہ وبالا اور تہس نہس کردے، چنانچہ یہ پیشینگوئی مختصر وقت میں اپنے انجام کو پہنچی۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جرنیلوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ یہ کارنامہ انجام دیا۔ الحمد للہ

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ (آپ مخالفین کی باتوں پر صبر کریں، اور آپ خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کنارہ کش ہو جائیں)۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (پس (اے محمد!) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح تم بھی صبر کرو)۔ اسی طرح: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ [النحل: ۱۲۷] (اور صبر ہی کرو، اور تمہارا صبر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے ہے)۔ ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] (صابروں ہی کو ان کا ثواب بھرپور دیا جائے گا، بے گنتی)۔

اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام کا سرمایہ یہی صبر و شکر ہی ہے، جس کے دامن کو حضرات انبیاء علیہم السلام نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اور صبر ہی کی بدولت لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی اور بے شمار انسانوں کی رہبری کر کے انہیں عذاب و عقاب سے بچانے کی پوری کوشش تا دمِ آخر جاری رکھا۔

﴿هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ یعنی بھلی طرح کا چھوڑنا، یہ کہ ظاہر میں ان کی صحبت کو ترک کرو، اور باطن میں ان کے حال سے خبردار رہو کہ کیا کرتے ہیں؟ کیا کہتے ہیں؟ اور مجھ کو کس طور سے یاد کرتے ہیں؟، دوسرا یہ کہ ان کی بدسلوکی کی شکایت کسی کے سامنے نہ کرو، نہ انتقام لینے کے درپے ہو، نہ گفتگو یا مقابلہ کے وقت سختی کا اظہار کرو۔ تیسرا یہ کہ باوجود مفارقت اور جدائی کے ان کی نصیحت میں کمی نہ کریں، بلکہ جس طرح بن پڑے ان کی ہدایت و رہنمائی میں سعی کرتے رہے۔ [تفسیر عثمانی]

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کفار اور معاندین سے ظاہری قطع تعلق ہو، باطن میں ان کی ہدایت کے لیے خیرخواہی کے ساتھ دعا کی جائے، اور حسبِ ضرورت بھلی باتوں کی انہیں ترغیب و تبلیغ ہو۔ دیکھیں! نوح علیہ السلام نے ہزاروں مایوسیوں کے باوجود سلسلۂ دعا و تبلیغ ترک نہیں فرمایا، یہی انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین علماء کرام کی شان ہے، اور درواقعہ میں کارگر اور فائدہ مند بھی یہی طرز و طریقہ ہے۔

وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾

ترجمہ: اور آپ مجھے چھوڑ دیں اور ان جھٹلانے والے اصحاب نعمت کو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں ⑪

بیشک ہمارے پاس بیڑیاں اور جہنم کی آگ ہے ⑫ اور گلے میں اٹکنے والا کھانا اور دردناک عذاب ⑬ جس دن زمین اور پہاڑ کانپنے لگیں گے، اور پہاڑ ریت کے منتشر ٹیلے ہوجائیں گے ⑭

معارف ومنازل

﴿ذَرۡنِیۡ﴾ یہ کلمہ اور اسی طرح کا کلام قرآن حکیم میں کئی جگہ مذکور ہے، فرمایا: چھوڑ دو مجھے اور جھٹلانے والوں کو جو دولت مند ہیں ان کو تھوڑی سی مہلت اور دیدو، ان کا معاملہ ہمارے سپرد کرو، ہم ان سے نبٹ لیں گے، اور ان کو سزا دیں گے، آپ جلدی نہ کریں، ہم نے انہیں ڈھیل دی ہوئی ہے، بہت جلد انہیں اپنے انجام کا معلوم ہوگا، یہ سرمایہ دار اور آسودہ حال جس غرور میں خرمستیاں کر کے اپنے ربّ اور پیغمبروں علیہم السلام کی تکذیب وایذاء رسانی میں پیش پیش ہیں انہیں پتہ چلے گا جب اللہ تعالیٰ ان پر گرفت فرمائیں گے، یہ لوگ جو توحید، رسالت اور قیامت کو جھٹلاتے ہیں، یہ سرمایہ دار اور جاگیردار ہر زمانے میں سب سے پہلے تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں۔

دولت کا نشہ بہت برا نشہ ہوتا ہے، ولید بن مغیرہ، ابوجہل عتبہ وشیبہ اور ان سے پہلے بہت سے سرمایہ داروں کا یہی طور طریق رہا ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال وسرمایہ کو خدائی نعمت نہیں سمجھتے ہیں، نہ حقوق ادا کرتے ہیں، نہ جائز طریقوں سے مال کماتے ہیں، اور نہ ہی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں، انہیں تو چاہئے تھا کہ یہ سب کچھ اللہ پاک کی نعمت اور بخشش سمجھ کر اس کی فرمانبرداری کرتے، مگر وہ اپنی گمراہیوں میں مست وغافل رہتے ہیں۔

سرمایہ دراصل تمام عیاشیوں، جرائم، کفر، سرکشی اور منعمِ حقیقی کی نافرمانیوں کی جڑ اور بنیاد ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے متبعین وتصدیق کنندگان اکثر فقراء ومساکین ہوتے ہیں، ہرقل روم دانشمند اور انجیل کا بڑا عالم تھا، ابوسفیان سے پوچھا تھا: ”أشراف الناس اتبعوه أم ضعفاءهم؟“ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”بل ضعفاءهم“۔ اس پر قیصر نے کہا: ”وهم أتباع الرسل“۔

قرآن حکیم نے نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنی قوموں کا ذکر کیا ہے، یہ بات تمام اقوام میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اولین مکذبین یہی دولتمند اور سرمایہ دار ہوئے ہیں، وہ خیال کرتے تھے کہ سرداری کا حق ہمارا ہے، ہم ایک بے سروسامان شخص کو کیسے نبی مانیں؟ اور اس کی اطاعت کریں؟ جبکہ اس میں ہماری سرداری کا خاتمہ ہوگا اور ہم محکوم ورعایا بن جائیں گے۔

اس بناء پر فرمایا کہ آپ مجھے اور ان سرمایہ داروں کو چھوڑ دیں، دنیا کا عذاب بھی ان کے مقدر میں ہے، اور آخرت کا عذاب تو ویسے ہی ان کے لیے لکھا جا چکا ہے، ان کے لیے جہنم کی بیڑیاں تیار ہیں، کہیں فرمایا: ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾ [الحاقة:۳۲] (اسے پکڑو، پھر اسے طوق ڈالو، پھر اسے بھڑکتی آگ میں دھنساؤ، پھر ایسی زنجیر میں جس کا ناپ ستر ہاتھ ہے، اسے پُرو دو)۔ اور گلے میں اٹکنے والا طعام ہے (زقوم، ضریع وغیرہ)۔ ترمذی شریف میں حدیث ہے کہ جب دوزخی "تھوہر" اور "زقوم" کا لقمہ حلق میں داخل کرے گا، تو وہ سو سال تک وہیں اس کے حلق میں اٹکا رہے گا، اس کو نیچے اتارنے کے لیے جب پانی (غسلین، حمیم) کا گھونٹ پیئے گا تو وہ ایسا گرم ہوگا جو اس کی آنتوں کو کاٹ کر نیچے پھینک دے گا۔ نعوذ باللہ

﴿وَّعَذَابًا اَلِيْمًا﴾ یہ عذاب الیم مختلف قسم کا ہوگا، جہنم کی آگ کے علاوہ سانپوں اور بچھوؤں کے ذریعہ بھی ہوگا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جہنم والے سانپ اور بچھو اتنے خطرناک اور زہریلے ہوں گے کہ اگر وہ اپنا زہریلا منہ دنیا میں نکال باہر کرے تو قیامت تک زمین میں کوئی سبزہ یا درخت نہ اگنے پائے۔ [ترمذي]

یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب زمین اور پہاڑ کانپنے لگیں گے، اور قیامت کا رجفہ شروع ہوگا، اور پہاڑ ریت کی مانند منتشر ہو جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کی ٹیلوں کی مانند بہہ جائیں گے، اور بکھر جائیں گے۔ اس دن مکذبین سرمایہ داروں کو انہیں عذابوں کے ساتھ واسطہ پڑے گا، اور بیڑیوں، زنجیروں میں جکڑے جائیں گے۔ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ [المرسلات:۱۵] (پس ویل کی تباہی ہوگی جھٹلانے والوں کے لیے)۔ نعوذ باللہ منہ

...... ❀ ...... ❀ ...... ❀ ......

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾

ترجمہ: بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو شہادت دینے والا ہے تمہارے اوپر جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا ﴿۱۵﴾ پس فرعون نے اس رسول کی مخالفت کی تو ہم نے فرعون کو پکڑ لیا وبال والا پکڑنا ﴿۱۶﴾

پس تم کیسے بچو گے اگر تم نے (توحید ورسالت کا) انکار کیا اس دن سے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا⑰ اس دن آسمان پھٹ جائے گا، اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا⑱ بیشک یہ نصیحت کی باتیں ہیں، لہٰذا جو شخص چاہے اپنے ربّ کی طرف نجات کا راستہ بنا لے⑲

معارف ومنازل

گزشتہ اصولوں کے بیان کے بعد ایک اور اصول بیان فرما رہے ہیں کہ تمہارے پاس ایک رسول بھیجا ہے، جو تمہارے اوپر روزِ قیامت شہادت دیں گے کہ کس نے مانا ہے اور کس نے نہیں مانا؟ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ [النساء:۴۱] (تو کیسی ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں، اور اے محبوب! تمہیں ان سب پر گواہ اور نگہباں بنا کر لائیں)۔

ہم ہر امت میں سے گواہ لائیں گے، اور وہ گواہ انبیاء کرام علیہم السلام ہوں گے، ان پر ہم آپ کو بھی گواہ بنا کر لائیں گے، ایک گواہی یہ جو قیامت کی گواہی ہے، دوم حق وصداقت کی گواہی ہوگی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد کی گئی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معلّم بنا کر سارے جہاں کو حق وصداقت کی تعلیم کے لئے تشریف لائے، اس سلسلے میں مثال دی کہ جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا، کیونکہ وہ مکذّب تھا، اور اولی النعمۃ میں سے تھا، بڑا ظالم، جابر، گمراہ اور خدائی کا دعویدار تھا، جب اس نے رسول کا نہیں مانا، انحراف وتعدّی پر اتر آیا، تو ہم نے دنیا ہی میں اسے ستر لاکھ فوجیوں سمیت دریائے قلزم میں غرق کر دیا، پس یہ اہل مکہ بیچارے کیا ہیں؟ ان کی حیثیت فرعون کے مقابلے میں ایک مچھر سے بھی کم ہے۔

﴿فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا﴾ اگر تم کفر سے باز نہ آئے اور گمراہی وضلالت پر ڈٹے رہے، پھر وہ یومِ موعود جو اتنا ہولناک اور نہایت لمبا ہوگا کہ بچے بھی غم کے مارے بوڑھے ہو جائیں گے، اور ہر قسم کے قریبی ومحکم رشتے بھی کٹ جائیں گے، اور آسمان جیسی مضبوط چیز بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گی، اس دن تم ناقابلِ برداشت عذاب الٰہی سے کیوں کر بچ سکو گے؟

﴿إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ﴾ یہ پیغامِ الٰہی اور فرمودہ نبوی تمہارے لئے تذکیر ویاددہانی ہے، تاکہ تم خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ، سرکشی وتمرد سے باز آجاؤ، اور پروردگار کی معرفت وقرب کی طرف قدم اٹھا کر اپنی ابدی نجات کا

سامان مہیا کرو، اللہ تعالیٰ اور تمہارے درمیان جو بعد وغفلت کے پردے ہیں انہیں چاک کر کے اس کے قرب وجوار کا متلاشی بنو، اور اسے قیام وقعود اور ہر حال میں یاد کر کے اس کا قرب حاصل کرو، ان نصائح وتذکیرات پر عمل کر کے ابدی نجات اور دائمی راحتوں کو حاصل کرو، اور ربّ العزّت کی محبت میں راتوں کی شب خیزی اور الحاح وزاری میں منہمک رہو۔ المرأمع من أحب (آدمی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ اسے محبت ہو) کے بموجب اس کا قرب وجوار تلاش کرو، تب تمہیں ابدی سعادت نصیب ہوجائے گی، اور سارے حجاب محو ہوجائیں گے، اور یاد رکھو! تمہارا ربّ ہر قسم کی طاعات سے مستغنی اور بے نیاز ہے، جو کچھ کرو گے اس کا فائدہ تمہیں حاصل ہوگا، بصورت دیگر نقصان تمہارا ہی ہوگا۔

یکے بر سر شاخ وبن میبرید ☆ خداوند بستان نگہ کرد ودید
بگفتا کہ این شخص بدمیکند ☆ نہ بامن کہ بانفس خود میکند
(سعدیؒ)

یہ ایک تمثیل ہے کہ بے وقوف انسان اپنے نفس کا بدخواہ ہوتا ہے، بظاہر اس کا عمل (بزعم خود) شاید اس کے فائدے کا ہوگا، مگر انجام سوائے اس کی تباہی کے کچھ نہیں، درخت کی شاخ پر بیٹھنے والا جب شاخ کو کاٹ رہا ہوتا ہے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ اس کی اپنی بربادی ہی ہوگی۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾

ترجمہ: بیشک آپ کا ربّ جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ دو تہائی رات کے قریب

اور کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہی رات کا اندازہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اس کو پورا نہیں کرسکو گے، تو اس نے تمہارے اوپر مہربانی کے ساتھ رجوع فرمایا۔ پس جتنا تمہارے لئے آسان ہو قرآن پاک پڑھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کئی بیمار ہوں گے، اور دوسرے طبقہ وہ ہے جو زمین میں سفر کرتے ہیں، اور تلاش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فضل، اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، لہٰذا قرآن پاک میں سے اتنا پڑھو جتنا آسان ہو، اور نماز کو قائم رکھو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ تعالیٰ کو قرض دو، قرضِ حسنہ، اور تم جو بھی نیکی اپنے لئے آگے بھیجو گے اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں پاؤ گے وہ بہتر ہے، اور اجر وثواب کے اعتبار سے بڑی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے ﴿۲۰﴾

معارف ومنازل

قرآن حکیم کے احکام دائمی اور ابدی ہیں، اور تقریباً تمام احکام میں جس طرح تعلیم وتزکیہ وغیرہ امور کا لحاظ ہوتا ہے وہاں تربیت کا پہلو ضرور موجود ہوتا ہے۔ سورت کا پہلا رکوع کئی امور پر مشتمل تھا، جن میں تربیت کا پہلو غالب رہا، جب تربیت مکمل ہوگئی تو ایک سال کے بعد دوسرے رکوع میں اس تربیتی نظام کا نسخ نازل ہوا، یعنی فرضیتِ قیام اللیل کی تنسیخ ہوگئی، اور استحباب کا درجہ باقی رہا۔ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے حق میں قیام اللیل فرض رہا، ایک سال بعد سب کے حق میں فرضیت منسوخ ہوگئی۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ امت کے حق میں فرضیت منسوخ ہوگئی، مگر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں باقی رہی، یہ لوگ سورۂ اسراء کی آیت سے استدلال کرتے ہیں: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [الإسراء: ۷۹] (اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد کرو یہ خاص تمہارے لیے زیادہ ہے، قریب ہے کہ تمہیں تمہارا ربّ ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں)۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نیند سے جاگ کر تہجد میں قرآن پڑھا کر، یہ حکم سب سے زیادہ تجھ پر جاری کیا ہے کہ تجھ کو مرتبہ سب سے بڑا دینا ہے۔ [موضح القرآن] اس سے یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرضیت باقی ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ صومِ عاشورا فرض رہا، جب ماہ رمضان کی فرضیت کا حکم آیا تو صومِ عاشورا کی فرضیت جاتی رہی، مگر استحباب ہمیشہ کے لیے باقی رہا۔ یہ قول ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ تہجد کی

فرضیت کا نسخ سب کے لیے ہے اور استحباب باقی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم قومی نبی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش اور عربوں کے لیے مبعوث ہوئے، عربی زبان بولتے اور قرآن جو کہ عربی ہے اس کو عربی زبان میں سناتے اور تبلیغ کرتے، اوّلین مخاطبین عرب ہی ہیں، جیسے کہ ایک دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ [ابراھیم: ۴] (ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر انہیں کی قوم کی زبان میں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حیثیت بین الاقوامی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم کے لیے نبی ہیں، جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الأعراف: ۱۵۸] (اے محمد!) کہہ دو کہ لوگوں میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا (یعنی اس کا رسول) ہوں)۔ یا: ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ [سبأ: ۲۸] (اور (اے محمد!) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)۔

تو یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام انقلابی دین ہے، اسے پورے عالم میں ایک شخص نہیں پھیلا سکتا ہے، اور ساری غیر محدود اقوام کا فردِ واحد (نبی) تنہا مقابلہ نہیں کرسکتا، اور یہ فطرت کے خلاف ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ نبی پہلے اپنی قوم کی تربیت کرتے ہیں، جب یہ لوگ تربیت کے ذریعہ اصلاح پذیر ہوں، تو ان کے ذریعہ دنیا میں انقلاب برپا کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جان نثار اور سرفروش فوج تیار ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں عرب کے اندر انقلاب آیا، کفر و شرک جزیرۂ عرب میں ختم ہوا، اور مرکز اسلام قائم ہوگیا۔

بیرون عرب غزوات میں سے صرف غزوۂ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود شریک ہوئے، ایک ہزار میل کا سفر طے فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیس ہزار، چالیس ہزار، اکسٹھ ہزار، ستر ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، یہ آخری قول مورخ واقدیؒ کا ہے، باقی بیرونی دنیا سے معرکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاص کر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہوا، ایران و مصر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کیا وغیرہ۔ [حجة الله البالغة، فيض الباري، فتوح الشام]

صلوٰۃ اللیل کی فرضیت ایک سال تک جاری رہی، جس سے تعلیم و اصلاح اور تربیت کے وہ حیران کن عجیب و غریب مراحل طے ہوئے، جن سے پوری قوم اور معاشرہ کا رنگ بدل گیا، اور جان نثاروں کی ناقابل شکست اور جرار فوج تیار ہوئی، یہ اگرچہ مادی وسائل و ذرائع سے خالی ہاتھ رہے، مگر روحانی توکل و اعتماد علی اللہ کے اسلحہ سے لیس

رہے، اسی بناء پر انہوں نے متمدن، ترقی یافتہ اور ہزاروں سالوں سے قائم عظیم سلطنتوں کو للکارا اور تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ کاش ان کے جانے کے بعد ملوکیت کا دور اگر شروع نہ ہوتا، تو آج دنیا کا رنگ کچھ اور ہوتا، شاید یہی ربّ العزت کی مرضی تھی۔ واللہ اعلم

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ﴾ بیشک آپ کا ربّ جانتا ہے کہ آپ رات کو دو تہائی حصہ یا نصف حصہ یا ایک تہائی حصہ قیام کرتے ہیں، اور نہ صرف آپ خود قیام کرتے ہیں، بلکہ ﴿وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ﴾ (بلکہ آپ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گروہ بھی ہے۔ مقصد تربیت صحابہ تھا، الحمدللہ انہوں نے پوری پابندی کے ساتھ عمل کر کے نتیجہ اخذ کیا، اور ان کی تربیت ایک حد تک کامل ہوئی، ولولہ اور جذبہ قربانی کا مادہ پختہ ہو گیا، اب یہ فرضیت منسوخ ہو نیچاہیے، یہ عمل استحباب کے طور پر انہیں سپرد کیا جائے، ان شاء اللہ یہ جان نثار جماعت اسے ہر حال میں پورا کر کے رہے گی۔

بعض روایات میں ہے کہ راتوں کو لوگ اپنے سر کے بالوں کو رسیوں سے باندھ کر چھتوں پر لٹکاتے تھے، تا کہ نیند کا غلبہ نہ ہو۔ [بخاري] اس طرح وہ رات کی ساعتوں، مثلاً: نصف، ثلث، دو تہائی وغیرہ کا اندازہ بھی نہیں جانتے تھے، اس پر ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ کہ دن رات کا اندازہ کرنا تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس لئے تمہارے اوپر تخفیف کا حکم جاری فرمایا۔

﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اس کو پورا نہ کر سکو گے، اور یہ ہر شخص کے بس میں نہیں، خصوصاً بعد میں آنے والے لوگ، جو کسی طرح تمہاری طرح نہیں ہوں گے، لہٰذا ارشاد فرمایا:

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر مہربانی کے ساتھ رجوع فرمایا ہے۔ "تَابَ" توبہ سے مشتق ہے، بمعنی "رجوع" کے ہو سکتا ہے، اگر اس دوران کسی عذر کی وجہ سے قیام اللیل میں کسی سے سستی ہوئی ہو، تو ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ سے اس کی مغفرت و بخشش کی طرف اشارہ ہوا۔ واللہ اعلم

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ (جتنا تمہارے لئے آسان ہو اتنا ہی قرآن پاک پڑھ لیا کرو)۔ یعنی اگر صرف دو چار رکعتوں پر اکتفاء ہو تو اسی مقدار میں تلاوت ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "قیام اللیل کا التزام کرو کہ تم سے پہلے صالحین کی عادت رہی ہے، قیام اللیل شیطان کو بھگانے، گناہوں کو مٹانے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ ہے"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ قیام اللیل کی دو ہی رکعت دنیا و مافیہا سے بہتر

ہے۔[ترمذي] اگر چہ فرضیت تہجد منسوخ ہوگئی، نصف وثلث ودو تہائی شب بیداری ضروری نہ رہی، مگر چند رکعتوں کا استحباب ہمیشہ کے لیے باقی ہے، فرائض کے بعد سب سے زیادہ مرتبہ صلوٰۃ اللیل ہی کا ہے۔

اب قرأت قرآن اور فرضیت کی منسوخیت کے اسباب کا بیان ہوگا، جس کی تین وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: ﴿عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی﴾ (اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کئی بیمار ہوں گے) بیماری بڑا عذر ہے، جہاں فرائض کے حق میں بھی تخفیف ہے، ﴿قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ﴾ [آل عمران :۱۹۱] (کھڑے ہوکر اور بیٹھ کر اور ان کے کروٹوں پر) تک کی اجازت ہے، اور ماہ رمضان کے روزے میں بھی مریض کی مرضی پر ہیں، تو نوافل اور تہجد و دیگر امور میں تخفیف بطریق اولیٰ ضروری ہوگئی۔

دوسری وجہ: ﴿وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (وہ لوگ جو زمین پر سفر کرتے ہیں) سفر کی حالت میں جب رباعی فرائض میں آسانی اور کمی کا حکم ہے، تا کہ مشقت نہ ہو، اسی طرح روزوں میں بھی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے، تو نوافل کا بطریق اولیٰ یہی حکم ہے، عام طور پر سفر چونکہ رزق وروزی اور تجارت کا ہوتا ہے، اس لئے فرمایا:

﴿یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ مقصد رزق حلال کی تلاش ہے، مگر یہ حصر کے لیے نہیں، اس میں سفر حج، و عمرہ، زیارت احباب، سفر طلب علم، وغیرہ سب کو شامل ہے۔﴿فَضْلِ اللّٰهِ﴾ کا تعلق سارے نیک اور دینی سفروں کے ساتھ ہے۔

تیسری وجہ: تخفیف جہاد فی سبیل اللہ ہے۔﴿وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی (کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کا فریضہ انجام دیں گے) یہ جہاد اہم فریضہ ہے، یہ اسلام کی سربلندی کا بیش قیمت واحد ذریعہ ہے، اس کو اونٹ کی کوہان کی بلندی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، میدان جہاد و معرکہ میں ”صلوٰۃ الخوف“ جو کہ نہایت تخفیف کی ایک صورت ہے، اسی بناء پر ہے تا کہ ہر قسم کی مشقت ختم ہو۔ اس مبارک عمل کا بیان مکمل طور پر اپنے مقام پر ہوگا۔

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ﴾ (جتنا مقدار آسان ہو، اتنا ہی قرآن پاک پڑھ لیا کرو)۔ اس آیت کو دوم مرتبہ ذکر کر کے تنبیہ کی کہ اسباب کی تخفیف اپنی جگہ مسلم ہے، اور یہ تخفیف صرف فرضیت کے ساتھ وابستہ ہے، استحباب اور قرأت قرآن بدستور قائم ہے، کما قال ركعتان في جوف الليل خير من الدنيا ومافيها۔ [كنز العمال]

صلوٰۃ اللیل میں تخفیف کے بعد ارشاد ہے: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ فرض نماز کو ہر حالت

میں قائم رکھو، یہ کبھی معاف نہیں ہوگی، ابتداء اسلام میں دو رکعت فجر، دو رکعت عصر اور تہجد کی نماز فرض تھیں، معراج شریف کے بعد پانچ نمازیں فرض ہوئیں، رہی زکوٰۃ وہ ہجرت کے سالِ دوم مدینہ میں فرض ہوئی، کتب فقہ میں نماز و زکوٰۃ، صوم رمضان، حج وغیرہ عبادات اور ان کے احکام کا تفصیلاً بیان ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً﴾ یعنی (اللہ تعالیٰ کو قرض دو اچھا قرض)۔ یہاں قرض سے مراد قرض حسن بھی ہے، اور عام صدقہ و خیرات بھی۔ زکوٰۃ کے علاوہ جو بھی مال اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے فقراء و مساکین اور دوسرے مصارف میں خرچ کیا جائے، وہ قرض حسن ہے، ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ [البقرۃ: ۲۴۵] (کوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا)۔ عام طور پر لوگ صرف صدقہ کو قرض حسن کہتے ہیں، اگر کوئی کسی کو مثلاً ہزار روپیہ قرض حسن کا نام لے کر دیتا ہے تو مقروض اسے بخشش سمجھ کر واپس نہیں کرتا، یہ بڑی جہالت ہے، قرض حسن کہتے اس قرض کو جو واجب الاداء ہو، کسی لاچار اور مجبور مسلمان کو وقت معین کر کے یا عام طور پر قرض دینا بھی قرض حسن شمار ہوگا جس کا ثواب صدقہ سے بھی افضل ہے، بشرطیکہ اس پر کوئی معاوضہ کی شرط نہ ہو، ورنہ سود ہی ہوگا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر دیکھا کہ جنت کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ایک درہم صدقہ کرے گا اس کو کم از کم دس درہم کا ثواب ملے گا، اور جو کوئی کسی کو ایک درہم قرض حسن دے گا اس کو اٹھارہ درہم کا اجر ملے گا، یہ بڑی حیران کن بات تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے اس کی وجہ دریافت کی کہ صدقہ کے مقابلے میں قرض حسنہ کا ثواب کیوں بڑھ گیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ صدقہ کبھی مستحق تک پہنچتا ہے، کبھی نہیں پہنچتا، بلکہ غیر مستحق اس کو لے جاتا ہے، مگر قرض ایسی چیز ہے جس کو صرف مستحق ہی حاصل کرتا ہے، جس کو احتیاج نہ ہو وہ قرض نہیں لیتا، اس لیے قرض کا ثواب دہرا ہوتا ہے۔ اگر کسی نے ایک درہم قرض دیا، پھر ایک درہم کو مقروض سے واپس لیا تو باقی نو درہم کا ثواب باقی رہا، اسے دگنا کیا گیا تو اٹھارہ درہم بن گئے۔ [تفسیر عزیزی]

آج لوگ اس اجر عظیم سے محروم ہو رہے ہیں، کیونکہ پہلے لوگوں میں خدا کا خوف موجود تھا، دینے والے ہر وقت قرض دے دیتے، مقروض بغیر حیلہ و حجت واپس کر دیتے، اب صورت حال یہ ہے کہ قرض کو شیر مادر سمجھ کر واپسی پر تیار نہیں ہوتے، دینے والے نے اسی خوف سے دینا بند کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرض حسنہ کا اجر وثواب اس شرط پر ہے کہ مقروض پر سختی اور تعدی نہ ہو، اگر کسی وقت اس کے پاس نہ ہوتو مزید مہلت دی جائے ، تنگ نہ کیا جائے ، گالی گلوچ اور بدزبانی بھی نہ ہو۔ بعض لوگ مقروض بیچارے کو تنگ کر کے اپنے قرض کے عوض اس کا کوئی پسندیدہ چیز ، ارزان قیمت پر لے کر اس سے جان چھڑاتے ہیں، ایسے لوگ اللہ ربّ العزّت کی بردباری سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ یاد رکھیں ! ایسے اعمال کی سخت سزا دنیا ہی میں بھگتنی پڑے گی، اورحق تعالیٰ ضرور مظلوم کی حمایت کرے گا۔ البتہ! اگر مقروض باوجود سرمایہ وفراخی کے غنی ہوتے ہوئے لوگوں کا قرض ادانہیں کرتا تو اس کا شمار ظالموں میں ہوگا، اگر قرض دینے والا اسے تنگ کرے وہ گنگارنہیں ہوگا۔

بنی اسرائیل کا ایک بے عمل شخص وفات پا گیا، جہنم کے فرشتے اسے لینے آئے، ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ شانہ نے جنت کے فرشتے بھیج دیئے، فرمایا: اس کی مغفرت ہوچکی ہے، کیونکہ یہ مالدار تھا، ہر شخص کو قرض دیتا تھا، پھر کبھی اسے تنگ نہیں کرتا تھا، بسا اوقات مجبوروں پر سے درگزر بھی کرتا تھا۔ [صحيح بخاري]

کیسا پاکیزہ اور قدرداں ربّ ہے؟ جس کی مغفرت کا دروازہ رات دن کھلا ہے، ادنیٰ ادنیٰ نیکیوں پر جنت کی وہ نعمتیں عطا کرتا ہے جو کہ کسی کے وہم وگمان میں نہ ہوں، اس کے نام پر ادنیٰ چیز (اگر چہ آدھی کھجور ہی کیوں نہ ہو) دینے سے پہاڑوں جتنا ثواب عطا فرمائے گا، ربّ الجلیل کی بندہ نوازی کی کوئی حد نہیں۔ [عمدة القاري: عن أبي هريرة رضي الله عنه] اسی بنیاد پر ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا﴾ تم جو بھی کارِ خیر (نیکی، قیام اللیل، نماز، زکوٰۃ، قرض حسنہ، صدقہ، خیرات، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، وغیرہ وغیرہ) آگے روانہ کروگے، تو یہ سارے تمہارے بینک اکاونٹ میں جمع ہوجائیں گے، کوئی ذرہ بھر عمل ضائع نہیں ہوگا، اور تم اپنی تمام حسنات کو لطیف وخبیر کے ہاں پاؤ گے، اور بہتر سے بہتر کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہاری نیکیوں کی پرورش کرے گا، ان کو بڑھائے گا، جس طرح تم اپنی گھوڑی کے بچے کی پرورش کر کے اسے بڑا کرتے ہو، یہاں تک کہ ایک کھجور کے پہاڑ کے برابر ثواب ہوگا۔

ایک عبرت آموز واقعہ:

ایک عورت دوپہر کو کھانا کھا رہی تھی، آخری لقمہ منہ میں ڈال کر چبانا شروع کیا، ادھر سے ایک بھوکا سائل آیا

اور کھانا طلب کیا، کھانا چونکہ ختم ہو چکا تھا، اس نے لقمہ منہ سے نکال کر سائل کو دیا، ایک دن بچے میدان میں کھیل رہے تھے، پہاڑ سے بھیڑیا اترا اور اس عورت کے بچے کو اٹھا کر جنگل کی طرف بھاگ گیا، دوسرے بچے دوڑتے ہوئے آئے اس عورت سے کہنے لگے کہ تمہارے بچے کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا، وہ بیچاری سراسیمگی کے عالم میں اپنے بچے کی تلاش میں جنگل کا رخ کیا، تو کیا دیکھتی ہے کہ میدان میں بچہ صحیح سالم ایک خوبصورت جوان کے ساتھ کھڑا ہوا ہے، وہ اس کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے، کہنے لگے: گھبراؤ مت! یہ صحیح سالم تمہارا بچہ ہے جسے میں نے ابھی بھیڑئے کے منہ سے چھڑالیا ہے، میں تمہارا وہ لقمہ ہوں جسے تم نے منہ سے نکال کر سائل کو دیا تھا۔ [مشکوٰۃ]

جب منہ سے نکالا ہوا لقمہ جو کسی کام کا نہیں ہوتا اتنا کام کر گیا کہ جس کا اندازہ نہ ہو، تو باقی اچھے خاصے اعمال کا کیا کہنا؟ یہ کمال لقمہ کا نہیں، لقمہ میں کیا رکھا ہے؟ بلکہ یہ کمال ربّ العزّت اور اس کی بندہ نوازی اور نیکی پروری کا ہے۔ فرمایا: اس کے باوجود یہ آخری اصول بھی یاد رکھو اور اپناؤ:

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ہمیشہ استغفار کرو، صدق دل کے ساتھ معافی مانگو، بیشک وہ بڑے بخشنے والا نہایت رحم والا ہے، کتنا خوش نصیب ہے وہ شخص جو ہر لمحہ ہر لحظہ استغفار میں مصروف ہے؟ سید کائنات **عليه وعلى جميع الأنبياء أفضل الصلوات وأجمل التحيات والتسليمات** ہر نشست میں سو سو مرتبہ استغفار پڑھتے تھے، استغفار بہت پسندیدہ عمل ہے، چاہئے کہ اس پر ہمیشہ مداومت کے ساتھ عمل ہو، جس طرح ہر اچھے کام کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھنا مسنون ہے، اصحاب طریقت حضرات نے اسی طرح ہر عمل کے اختتام پر استغفار کے عمل کو جاری رکھنے کا کہا ہے، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ذکر واذکار اور مناجات ودعا سے پہلے استغفار مسنون ہے، تاکہ صغیرہ گناہ معاف ہوں اور ذکر ودعا کی اجابت یقینی ہو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ فرماتے ہیں کہ استغفار سے روحانی تزکیہ اور تنقیہ حاصل ہوتی ہے، پھر اعمال میں برکت وطہارت حاصل ہوتی ہے۔ استغفار کے کچھ فوائد سورۂ نوح کی تفسیر میں بیان ہوئے، وہاں دیکھا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی قابل ذکر بات ہے، جسے امام بیہقی نے روایت کیا کہ مرنے والے لوگ منتظر رہتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی دعا کرے یا صدقہ خیرات کرے، جب ان چیزوں کا ثواب انہیں پہنچتا ہے، تو انہیں بڑی راحت ہوتی ہے۔ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کو اپنے اعمال کی نسبت سے زیادہ بلند درجہ حاصل ہوگا، اس کو تعجب ہوگا اور وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میرے اعمال تو اس قابل نہیں تھے جس قدر درجہ تو نے مجھے عطا کیا؟ تو اللہ

تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: باستغفار ولدک لک (یہ درجہ تجھے تیرے بیٹے کے استغفار کرنے کے صلے میں عطا ہوا ہے) وہ تیرے لئے بخشش مانگتا ہے (اللّٰھمّ اغفرلي ولوالدیّ) اسی لئے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی کہ اپنے والدین کے لیے استغفار کیا کرو، تا کہ ان کے گناہ معاف ہوں اور درجات بلند ہوں۔

قرآن کریم اور احادیث میں کثرت استغفار کی تلقین ہے، اور استغفار کے اتنے بے شمار فضائل ومناقب اور برکات ہیں جس کی کوئی حد نہیں، چاہئے کہ ہر مسلمان استغفار کی کثرت پر عمل کرے، اور سمندر کے جھاگوں برابر جتنے گناہوں کی مغفرت کا صلہ حاصل کرے۔ حدیث میں وارد ہے کہ خوش قسمت انسان وہ ہے جس کے نامہ اعمال میں استغفار کی کثرت ہو۔ [مشکوٰۃ] اس سلسلے میں سید الاستغفار دعا کی بہت بڑی فضیلت ہے، چاہئے کہ ہر مسلمان اسے یاد کرے، اور اخلاص کے ساتھ اسے صبح وشام پڑھا کرے۔ [متفق علیه]

سُورَةُ الْمُدَّثِّرِ

مكية آياتها ٥٦ ركوعاتها ٢

سورۂ مدثر مکی ہے، اس میں چھپن (۵۶) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ المدثر ہے، پہلی آیت میں المدثر کا لفظ مذکور ہے، اسی سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۃ العلق کے بعد ہے، تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس سورت کی چھپن (۵۶) آیات، دو سو پچپن (۲۵۵) کلمات اور ایک ہزار دس (۱۰۱۰) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر کے مضامین ومطالب تقریباً قریب قریب ہیں، دونوں سورتیں مکی زندگی کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتیں ہیں۔

مختصر موضوع:

شروع میں فرائضِ نبوت کا بیان ہے، آیت گیارہ (۱۱) سے آیت چھبیس (۲۶) تک ایک خاص واقعہ کا بیان ہے یعنی ولید بن مغیرہ کا جو قرآن اور صاحب قرآن کی مخالفت میں سب سے پیش پیش رہتا تھا، اس کے بعد

قیامت اور اس کی ہولناکی، نیز جہنم کے عذاب کی سختی کا بیان ہے، اور اہل جنت اور دوزخیوں کے درمیان مکالمہ سوال و جواب کا تذکرہ ہے، اور کفار و مشرکین کے خبث باطن اور برے عقائد و اعمال کا ذکر ہو رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ① قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ ④ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ⑤ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ⑥
وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ⑦ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوۡرِ ⑧ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌ ⑨ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ غَيۡرُ يَسِيۡرٍ ⑩

ترجمہ: اے (محمد!) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو ① اُٹھو، اور ہدایت کرو ② اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو ③ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو ④ اور ناپاکی سے دور رہو ⑤ اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو ⑥ اور اپنے پروردگار کے لئے صبر کرو ⑦ جب صور پھونکا جائے گا ⑧ وہ دن کا مشکل دن ہوگا ⑨ (یعنی) کافروں پر آسان نہ ہوگا ⑩

معارف و منازل

دراصل سورۂ مزمل میں سیاست اور تدبیر منزل کا بیان تھا، سورۂ مدثر میں سیاست مُدُن کا بیان ہے، اس لئے شروع ہی میں ارشاد ہوا کہ آپ اٹھیں اور منصب انذار کا سلسلہ شروع کریں، چونکہ سارا معاشرہ گندہ اور تاریک ہوگیا ہے، ہر طرف تاریکی وظلمت چھائی ہوئی ہے، تو ﴿فَاَنۡذِرۡ﴾ ہی بہتر رہے گا، تبشیر کی ابتدا اس وقت مناسب ہے جب بشارت والے لوگ پیدا ہوں گے، دفع مضرت جلب منفعت پر چونکہ مقدم ہے لہٰذا آپ اپنے ربّ کے بھروسہ و توکل پر روحانی مریضوں کا علاج شروع فرمائیں۔

جب عاشق کو معشوق کی اور محب کو محبوب کی کوئی ادا پسند آتی ہے تو اسی کے ساتھ اس کو خطاب کرکے بلاتا ہے، اور اظہار محبت کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جب فضیل بن عیاضؒ کو خطاب کرکے بلاتے تھے تو آواز دیتے تھے: ''یاعابدالحرمین''، ایک محب نے اپنے محبوب کے بڑے چمکدار بالوں کو دیکھا تو خطاب کیا: اے بڑے خوبصورت بالوں والے! ایسے وقت نام لینے میں وہ مزہ نہیں ہوتا جتنا کہ وصف کو یاد کرنے سے مزہ آتا ہے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں جب غار حرا سے نیچے

وادی میں پہنچا (یہ واقعہ فترۃ وحی کے بعد کا ہے) تو کسی آواز دینے والے نے مجھے نام لے کر پکارا، میں نے کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا، تو مجھے کوئی شخص نظر نہیں آیا، جب اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو وہ فرشتہ (جبریل علیہ السلام) مجھے نظر آیا اپنی اصلی صورت میں جو فضاء میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، آسمان کے افق تک پروں کو پھیلائے رکھا ہے۔ اس کے چھ سو پر ہیں، "فجئثت منه حتى سقطت على الأرض"، میں خوفزدہ ہو کر زمین پر گر پڑا، تھوڑی دیر بعد خوفزدگی کے عالم میں کانپتے ہوئے گھر پہنچا، مجھے سردی کے ساتھ بخار چڑھ گیا (شروع میں بھی یہی کیفیت تین سال پہلے غار حرا میں پیش آئی تھی، جب سورۃ العلق کی پانچ آیات اور سورۃ الفاتحہ کا نزول ہوا تھا)۔

میں نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ کر کہا: دَثِّرُونِي وَصُبُّوا عَلَيَّ مَاءً بَارِدًا۔ (مجھے کمبل، کپڑے اوڑھائیں اور میرے بدن پر ٹھنڈا پانی ڈالیں) انہوں نے ایسا ہی کیا، تو یہ آیتیں اتریں: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُدَّثِّرُ ١ قُمۡ فَأَنذِرۡ ٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ٣﴾۔

محبوب کا یہ طرز ادا ربّ العزّت سبحانہ تعالیٰ کو پسند آیا، اسی وصف کے ساتھ خطاب فرمایا: اے کمبل اوڑھنے والے! فرشتہ دیکھ کر خوفزدہ ہونے والے! تیرا منصب یہ ہے کہ خوفزدہ لوگوں کو تسلی دے دیں، اور بے سہارا لوگوں کو شفقت سے نوازیں، آپ کیوں خوفزدہ ہو کر اپنے اوپر لباس ڈالتے ہیں؟ جلدی اٹھو، قوت وعزم کے ساتھ اٹھو، بڑی دلیری اور ہمت کے ساتھ اٹھو، کھڑے ہو جاؤ، تیرا کام کھڑے ہو کر دنیا کی تقدیر بدلنا ہے، یہ لمبی چادر تان کر سونا آپ کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ [عزیزی، ابن کثیر]

اٹھو! جو لوگ برلب مرگ ہیں، انہیں زندگی دلاؤ، جو غرق ہونے کے قریب ہیں انہیں بچاؤ، جو دھڑا دھڑ جہنم میں گر رہے ہیں انہیں سنبھالو، جو لڑکیاں زندہ دفن ہو رہی ہیں ان کو زندہ رکھو، جو بتوں کے استھان میں سجدہ کر رہے ہیں انہیں نجات دلاؤ، جو معبود حقیقی سے کٹ چکے ہیں انہیں ربّ العزّت سبحانہ سے جوڑ دو، جو قہر وغضب الٰہی میں تباہ ہو رہے ان پر ذرا نظر رحمت فرماؤ، آپ یہ کام نہیں کریں گے، تو اور کون کرے گا؟ آپ ہی تو رحمۃ للعلمین ہیں، دوسرا کوئی نہیں، آپ ہی نے تاریک جہاں کو نور نبوت اور شمع ہدایت سے روشن کرنا ہے، ظلمتوں اور شرک وکفر کے بے انصافیوں کو مٹانا ہے، عظمت توحید سے درندوں کو آگاہ کرنا ہے، بھیڑئے اور درندوں کو شرافت واخلاق سکھانا ہے، وغیرہ۔

اگر غور اور فکر ونظر اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جائے، تو یہ خطاب: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُزَّمِّلُ قُمِ ٱلَّيۡلَ إِلَّا قَلِيلٗا﴾ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُدَّثِّرُ قُمۡ فَأَنذِرۡ﴾ کیسے پیار اور چاہت کے خطاب ہیں؟ دونوں جگہ ایک ہی معنی ہے: "اے کمبل اوڑھنے

والے! پھر دونوں جگہ ”قُمْ“ ہے یعنی اٹھو۔ اول قُمْ کمالِ ذات کے لیے ہے کہ خود کو کامل کرنے کا خیال رکھو، نماز، تہجد اور دوسرے اعمال کے ساتھ سرتا پا نور ہی نور بنو۔ دوسری قُمْ تکمیل انسانیت کا حکم ہے، یعنی جو کمال آپ کے پاس ہے، سب کو حصہ دے کر شریک کردو، جو نور آپ کے پاس ہے اس سے پورے جہاں کو روشن کرو، اور ویران جہاں کو آباد کرو، تمام گندگی اور نجاستوں کو مٹا کر دنیا کو نئی پاکیزہ زندگی عطا کرو، اِن شاء اللہ فتح ونصرت عنقریب آپ کے قدموں کو چھوم کر اپنے آشیاں میں اترے گی، وہ دن دور نہیں جب کعبۃ اللہ کی عظمت آپ کے طفیل لوٹ آئے گی، اور تیرا حبشی غلام اس کی چھت پر کھڑے ہوکر نغمۂ توحید ”اللہ اکبر“ کی اذان کے ساتھ اعلان کرے گا۔

• آج وحی الٰہی کے ثقل سے آپ کانپ رہے ہیں، کیوں کہ یہ قول ثقیل اتنا بھاری ہے کہ اسے فلک بوس پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے، اور جب منصب نبوت کا اعزاز حاصل ہوا تو اس کے ثقل سے آپ لرز اٹھے، جوں ہی بلال کی اذان نشر ہوگی تو پورا مکہ کانپ اٹھے گا، اور لوگوں پر خوف وہراس کے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ پتہ نہیں آج ہمارا کیا حال ہوگا؟ اس روز آپ ہی ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ کا مصداق بنیں گے، اور جانی ودینی دشمنوں سے فرمائیں گے: ”جاؤ، آزاد ہو، ”أنتم الطلقاء“، تب پتہ چلے گا کہ ﴿قُمْ فَأَنذِرْ﴾ آپ اپنے لئے نہیں کہتے تھے، اس میں انہی نادانوں کا مفاد مضمر تھا، یہ ہے رحمۃ للعٰلمین اور ﴿قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ کا مطلب۔ اس لئے ارشاد ہوا:

﴿قُمْ فَأَنذِرْ﴾ یہ وقت وموقع انذار تھا، ابھی ابتدائی مرحلہ تھا، بشارت والے لوگ نہیں پیدا ہوئے تھے، کیونکہ انذر وابشر دونوں آپ کی صفات مختصہ ہیں، یہاں صرف ایک کا ذکر ہے، دوسرے کا نہیں، باقی مقامات پر دونوں اکھٹے ذکر ہوتے گئے ہیں۔

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ (اپنے ربّ کی بڑائی بیان کرو)، کیونکہ: ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الجاثیة: ۳۷] (آسمانوں زمینوں میں ہر جگہ صرف اس کی بڑائی ہے) اذان میں نہ تسبیح وتہلیل ہے اور نہ ہی تحمید، بلکہ ”اللہ اکبر“ ہی ہے، نمازوں کا افتتاح بھی ”اللہ اکبر“ سے ہے، اور پوری نماز میں یہی ”اللہ اکبر“ جاری رہتا ہے، خوشیوں میں بھی ”اللہ اکبر“ کا ورد ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں جلسہ جلوسوں میں نعرہ تکبیر! ”اللہ اکبر“ کی گونج ہے، اور میدان جہاد کی زینت وانبساط اور فتح ونصرت کا یقینی حصول بھی ”اللہ اکبر“ کی مرہون منت ہے۔

سیرت کی متعدد کتابوں میں لکھا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ولادت کے وقت ”اللہ أکبر کبیرا!“ کا وظیفہ زبان مبارک سے ادا فرمایا تھا، قرآن حکیم کے قاری جب ایک سورت ختم کرکے دوسری سورت شروع

کرتے ہیں، تو "اللہ اکبر" زور سے پڑھتے، اور سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن تک یہ عمل جاری رہتا ہے، جب جانور ذبح کرنا ہوتا ہے وہاں بھی بسم اللہ کے ساتھ "اللہ اکبر" پڑھنے کا حکم ہے۔

تمام مذاہب میں ایک نہ ایک قسم کی عبادت رائج ہے، یہود، نصاریٰ، ہندو، بدھ مت، سکھ اور پارسی اپنے اپنے ملکوں میں لوگوں کو عبادت پر بلانے کا ایک طریقہ مقرر کیا ہوا ہے، زور سے بلند آواز کے ساتھ شرماتے اور عیب سمجھتے ہیں مگر اسلام کی حقانیت دیکھیے! اپنے اور پرائے ملکوں میں بلند آواز کے ساتھ اذان ہوتی ہے، شرمانا کیا، بلکہ فخر ومباہات کے ساتھ "اللہ أکبر اللہ أکبر" کی آواز گونجتی ہے۔

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ اپنا لباس پاک رکھو! کپڑوں سے میل اتار دو، اور نجاستوں سے پاک رکھو۔ مشرکوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ خود بھی نجس ناپاک ہوتے ہیں، اور ان کے لباس بھی، آپ ان کے طرز وطریقہ اختیار نہ کرو۔ اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ معنوی قلبی طہارت حاصل کرو، کلام عرب میں لباس کا اطلاق دل پر بھی ہوتا ہے، یعنی اپنا دل صاف رکھو۔ محمد بن کعب قرظی اور حسن بصریؒ نے یہی معنی بیان کیا۔ [ابن کثیر]

عربی محاورے میں یہ برابر آتا ہے کہ کپڑے صاف رکھو، یعنی گناہ چھوڑ دو، اعمال کی اصلاح کرو، جو شخص معصیت آلود اور بدعہد ہو اسے میلے اور گندے کپڑوں والا کہتے ہیں، اور جو شخص عفت مآب پابند عہد وپیمان ہو اسے پاکدامن اور سفید پوش، اچھا لباس والا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا اطلاق عام ہے، ظاہری، باطنی اور معنوی ہر قسم کی پاکی مراد ہے، تو ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ تمام اقسام طہارت کو شامل ہے۔ [ابن کثیر]

﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ گندگی چھوڑیے! مراد عقیدہ کی گندگی، جو قوم قریش اور عرب میں رائج تھی، کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کی اصلاح کنندہ ہوتا ہے، ان کے رسم ورواج اور بُرے عقائد کو تبدیل کرتا ہے، نہ کہ ان کا ساتھ دینے والا، دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ [الحج: ۳۰] (گندگی یعنی بتوں سے اپنے آپ بچاؤ)۔ یعنی شرک وکفر کی گندگی جو کہ تمام ناپاک گندگیوں سے بدتر ہے۔ عذاب چونکہ ایک لعنت ہے، تو قرآن پاک میں اس پر بھی رجز کا اطلاق ہوا ہے: ﴿فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ [البقرۃ: ۵۹] (پس ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا، کیونکہ نافرمانیاں کیے جاتے تھے)۔

مطلب یہ ہے کہ تمام باطنی عیوب ونقائص حسد وبغض، کینہ، بداخلاقی، بدباطنی، بدعقیدگی، کبروغرور، بخل، حرص، لالچ وغیرہ سب اس میں شامل ہیں، ان سب کے ترک کرنے کا حکم ہے، تب تو نبوت کے منصب کا حق ادا ہوگا۔

﴿وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ﴾ (کسی پر ایسا احسان نہ کریں جس کا پھر بدلہ طلب کریں)۔ یہ کوئی عدل وانصاف نہیں اور شرافت وعزّت نفس کے خلاف ہے کہ کوئی کسی عوض یا بدلہ یا کسی زیادہ منفعت کی خاطر لوگوں کے ساتھ احسان کرے، صفت عدالت اونچی صفت ہے کہ عام مقولہ ہے کہ ''نیکی کر کے دریا میں ڈالو'' معنی یہ ہے کہ اسے فنا ہی کرو، پھر یاد تک نہ کرو، احسان مت جتلاؤ، کسی بدلہ کا تقاضا نہ کرو، لوگوں میں اس کا تذکرہ نہ کرو وغیرہ۔ انبیاء کرام علیہم السلام بڑے اونچے قرب الٰہی کے مدارج پر فائز ہوتے ہیں، وہ سب کچھ دینے والے ہوتے ہیں، کسی سے امید رکھنا، طمع کرنا اور کچھ لینے کا ارادہ ان کی شان نہیں ہوتی ہے، ''لَا اَسۡأَلُكُم عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ مِنۡ مَالٍ'' بلکہ بے ریا، بے عوض، بغیر کسی طمع ولالچ کے سب کچھ بہانا، عطا کرنا، اور بطیب خاطر خدمت خلق کا فریضہ انجام دینا ان کی شان وصفت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ چاروں اخلاق دین الٰہی کے لب لباب خلاصہ ہیں، دین متین کے تمام احکام وشرائع انہیں چاروں صفات کے تحت مندرج ہیں، یعنی:

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۝٣ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ ۝٤ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ۝٥ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۝٦﴾ وہ کمالاتِ عالیہ اور صفات محمودہ وخصائل حمیدہ محسنہ ہیں کہ تزکیہ وطہارت عدل وانصاف ظلم کا خاتمہ اور خدمت خلق سب ان میں آ گئے۔ [حجۃ اللہ البالغۃ] اگر کوئی عالم ان کی تشریح کرنا چاہے تو ضخیم کتاب تالیف ہو سکتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں انہی خوبیوں کو بڑی بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فلیراجع

ایک ضروری وضاحت:

ان صفات کے روشنی میں یہ وضاحت فائدے سے خالی نہیں ہوگی کہ جب کوئی ان صفات عالیہ کو اپنائے گا تو ظاہر ہے کہ شیاطین الانس والجن اور نفس امارہ کے پجاری اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے، طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کریں گے، کیونکہ دین کا مزاج ہی ایسا ہے کہ اس پر مداومت کرنے اور اس کی خدمت کرنے سے مخالفتوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے، اور اگر ایک شخص لاکھوں دنیا کمائے، ستر سال دنیا کمانے میں صرف کرے، کوئی اس کی مخالفت پر ہرگز میدان میں نہیں اترے گا، بلکہ سب اس کی عزّت واحترام کریں گے، چودھری صاحب، خان صاحب اور ملک صاحب کے القاب سے یاد کریں گے، ہر معاملہ میں اس کے مشورہ پر عمل پیرا ہوں گے، اور اس کی ذاتی رائے کو بڑی اہمیت ہوگی۔

وہی شخص اگر اپنی دنیا کو دین پر لگائے اور قرآن وحدیث کی بات چیت کرنا شروع کرے، اور قرآن کی

خدمت واشاعت کرنا شروع کرے تو لوگوں کی نظروں سے وہ شخص گر جائے گا، معیوب ومعتوب ہو جائے گا، اس کی پرانی حیثیت داغدار ہو کر عیب ونقائص کا مجموعہ معتوبہ بن جائے گی، آدمی وہی پرانا ہے بدلا نہیں، صرف اس کی صفت بدلی ہے، عمل بدلا ہے، کردار بدلا ہے، مزید اور کچھ نہیں بدلا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ بلا وجہ علماء حق کی مخالفت کرتے ہیں، اگر یہی علماء کرام آج علم ودین کی خدمت ترک کریں، اور دنیا داروں سے مل کر ان کے ساتھ دنیا کے پلیٹ فارم پر آجائیں، تو فوراً بیک جنبش قلم معتوب ومبغوض ہونے سے بچ جائیں گے، اور لوگ ان کی مدح وثناء، تعریف وتوصیف کرنے لگیں گے۔

قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے بھی یہی کہا تھا: ﴿ يَاصَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا اَتَنْهَانَا اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴾[ھود: ۶۲] (انہوں نے کہا کہ اے صالح! اس سے پہلے ہم تم سے (کئی طرح کی) امیدیں رکھتے تھے (اب وہ منقطع ہو گئیں) کیا تم ہم کو ان چیزوں کے پوجنے سے منع کرتے ہو جن کو ہمارے بزرگ پوجتے آئے ہیں؟ اور جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس میں ہمیں قوی شبہ ہے)۔

انہوں نے کہا: ہم لوگ آپ کو بڑا عقلمند دانشور سمجھتے تھے، اور چاہتے تھے کہ آپ کو اپنے معزز بزرگوں کا جانشین سمجھ کر سر پر بٹھائیں، مگر آپ نے ایک خدا کی بات کر کے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، یاد رکھو! ہمارا راستہ الگ ہوگا، تمہارا الگ، ہم کبھی تمہاری بات نہیں مانیں گے، اور تمہارے کہنے پر اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے۔

اسی طرح پورے مکہ واطراف میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، امانتداری، بہادری، اقربا پروری، مہمان نوازی، غریب پروری، دیانت وتقویٰ، عفت وپاکدامنی، امن پسندی، شرافت، عقلمندی، دانائی، ہشیاری، عدل وانصاف وغیرہ صفاتِ حمیدہ کی خوب شہرت تھی، چالیس سالہ قبل از نبوت کا عرصہ بے داغ گزرا، مردوزن، صغیر وکبیر، ہر پیشہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کرتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس مآب زندگی پر فخر کرتے کہ ہماری قوم قریش کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی شخصیت ہمارے اندر موجود ہیں۔

مگر جوں ہی نبوت کا اعلان ہوا، اور دین الٰہی کا پیغام لوگوں کا گوش گزار ہوا یک وقت فضاء بدل گئی، وہ سارے محاسن وکمالات پس منظر میں چلے گئے، اور بلا تأمل لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نشانہ بن گئے، کسی نے کاہن کہنا شروع کیا، تو کسی نے ساحر قرار دیا، کسی نے شاعر اور سب نے مل کر ولید بن مغیرہ کی

تجویز پر مجنون اور دیوانہ کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتانوں اور مخالفتوں، افتراء وکذب وغیرہ کا طوفان برپا کیا گیا، تو ربّ العزّت سبحانہ نے تلقین کی اور فرمایا:

﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ (آپ اپنے ربّ کی خاطر صبر جمیل اختیار کریں) آپ سے پہلے گزشتہ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کا یہی صبر شیوہ رہا ہے، یہ اگرچہ سخت مشکل اور تلخ ہے، مگر ربّ کی خاطر اسے اپناؤ، انشاء اللہ عاقبت و انجام اور آئندہ کی کامیابی صابرین کے حق میں ہوگی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمائی، ایک منافق نے اعتراض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صبر فرمایا، اور کہا: رحم الله موسیٰ قد أوذي أكثر من هذا فصبر۔ (اللہ سبحانہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے موسیٰ علیہ السلام کو، قوم نے ان کو اس سے زیادہ ایذا پہنچائی، مگر انہوں نے صبر کیا) میں بھی صبر ہی پر عمل کرتا ہوں، اس موقع پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس منافق کے سر قلم کرنے کی اجازت مانگی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صبر وشفقت کے ساتھ اجازت نہیں دی۔

ع صبر تلخ ست ولیکن بر شیرین دارد

(سعدیؒ)

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ عام صبر اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لیے صبر میں فرق ہے، اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لئے صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر ایسی قوت برداشت پیدا کرے کہ امیر وغریب، شاہ وگدا، ہر قسم کے لوگوں کی ظلم وزیادتی پر صبر وبرداشت کرے، مقصد صبر کا صرف اللہ تعالیٰ سبحانہ کی رضاء ہو، اور یہ امتیاز ختم ہو کہ یہ امیر ہے اور یہ غریب ہے، اگر امیروں کی زیادتی پر صبر ہوا اور غریبوں کی زیادتی پر صبر نہ ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوا۔

یاد رہے! جب قوت انتقام نہ ہو، یا کسی زیادتی پر جزع فزع ہو، تو یہ صبر نہیں ہوگا، بلکہ عجز اور بے صبری میں شمار ہوگا، ہاں! قوت انتقام کے باوجود صبر کرنا ہی اصل صبر ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور عباد اللہ اسی روحانی زیور سے آراستہ ہیں۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ ایک عالم دین یا عام مسلمان اپنی بداخلاق بیوی کی زیادتیوں پر باوجود قدرت انتقام کے اگر روزانہ صبر کرتا رہے گا تو یہ صبر کا اعلیٰ مقام ہے، اور اسی گھریلو صبر سے باقی جہاں کی زیادتیوں پر صبر کرنے کا اچھا خاصا حوصلہ پیدا ہو جائے گا، اکثر پیر ومرشد مریدوں کی زیادتی پر، یا علماء کرام شاگردوں کی زیادتی پر بے صبری کرتے ہیں، یہ ان کی شان نہیں۔

اس کے بعد درج ذیل آیات میں اس چیز کو بیان کیا گیا ہے جو ہر مؤمن کا جز و ایمان ہے، بغیر اس کے ایمان کا کوئی تصور نہ ہوگا، اور وہ ہے عقیدۂ قیامت، تو فرمایا:

﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ وَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ﴾ پھر جب پھونکا جائے گا ناقور کے اندر۔ ناقور اس چیز کا نام ہے جو اندر سے خالی ہو، پائپ کی طرح، مرغی کی سونڈھ کو بھی ناقور اور منقار کہتے ہیں جو اندر سے خالی ہے، مراد ہے حضرت اسرافیل علیہ السلام کا صور (بگل)، اور سینگ کو بھی ناقور کہتے ہیں، صور پھونکنے والا فرشتہ اسرافیل ہے، صور کو پکڑا ہوا آنکھیں بند کیا ہوا ایک قدم آگے کیا ہوا کھڑا ہے، صرف ربّ العزّت سبحانہ کے حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ جثہ و بدن کے اعتبار سے سارے فرشتوں سے بڑا ہے، اس کے قدم ساتوں زمینوں سے نیچے اور سر عرش الرحمن عزّ مجدہٗ کے ساتھ ہے۔ [در منثور]

خواجۂ دو جہاں سرورِ مکین و مکان صلی اللہ علیہ وسلم کبھی زور سے نہیں ہنستے تھے، اگر کوئی تعجب کی بات سنتے یا بہت ہی خوش ہوتے تو زیادہ سے زیادہ صرف تبسم پر اکتفا فرماتے، اور ہمیشہ دائم الحزن (پریشان) رہتے۔ ایسا لگتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غم میں ڈوبے ہوئے ہیں، لوگوں کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ: میں کیسے خوش رہوں جبکہ صور والے فرشتے نے اپنا بگل منہ میں پکڑا ہوا حکم ربانی کے انتظار میں کھڑا ہے؟ جس سے پورا جہاں لمحوں میں فنا ہوجائے گا۔ [ترمذي: جلد دوم]

یاد رکھئے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کی تباہی کا غم نہ تھا، دنیا کی تباہی پر اگر دنیا دار لوگ پریشان ہوں تو معقول ہے، انبیاء علیہم السلام کو کیا پریشانی؟ وہ تو اس کوڑے کرکٹ کی تباہی پر بڑے راضی اور خوش ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پریشانی امت کے لئے ہوتی تھی اور بس۔

حدیث شریف میں ہے کہ ہر نبی کے لئے ایک خصوصی دعا مقرر ہوئی جو کہ رد نہیں ہوسکتی، سارے انبیاء علیہم السلام نے دنیا ہی میں وہ خصوصی دعا مانگی، مگر میں نے اپنی دعا ذخیرہ بنا کر آخرت کے لئے رکھی، جس سے روز قیامت اپنی امت کی بخشش کراؤں گا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [رواہ البخاري و مسلم و غیرھما]

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب سے جہنم پیدا ہوا اور حضرت جبریل علیہ السلام نے اسے دیکھا تو آج تک نہ اس نے خوشی کی اور نہ ہنسنے کا نام لیا۔ [قرطبي] جبریل علیہ السلام کو جہنم سے کیا واسطہ اور کیا خوف؟ بات یہ ہے کہ یہ وحی کا فرشتہ ہے، سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے ان کی ملاقات ہوئی، اور آمد و رفت کا سلسلہ

برابر جاری رہا، جب انبیاء کرام علیہم السلام پر خوف الٰہی کا عنصر غالب رہا، تو جبریل علیہ السلام بھی متاثر ہوئے، بلکہ انبیاء علیہم السلام والا تڑپ اور شفقت اس میں جاگزیں ہوا۔

فرمایا: یہ دن قیامت کا بڑا سخت ہوگا، پچاس ہزار سال کا یوم ہوگا، بندے نشہ اور سکر میں ہوں گے، بچے غم کے مارے بوڑھے ہو جائیں گے، حاملہ عورتوں کے حمل کا اسقاط ہو جائے گا، مائیں بچوں کو بھول جائیں گی، دوست و قریب ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، ﴿اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ [الزخرف:٦٧] (اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، سوائے پرہیزگاروں کے)، عزیز وقریب ایک دوسرے سے بھاگیں گے وغیرہ۔ ہاں! کافروں نافرمانوں پر حد سے زیادہ سخت ہوگا، وہ خود ہی کہیں گے: ﴿يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ﴾ [القمر:٨] (کافر کہیں گے یہ دن بڑا سخت ہے)۔

الحمد للہ! اہل ایمان پر یہ دن نرم ہوگا۔ (یہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے) اور کہنا چاہئے کہ دونوں جہاں کے سردار پر کھربوں صلوٰۃ وسلام و برکات وتحیات ہو کہ آپ نے اپنی وہ مخصوص دعا ایک ایسے دن کے لیے ذخیرہ فرمائی جہاں آپ مقام محمود پر فائز ہوں گے، اور شفاعت کریں گے۔

فائدہ:

حضرت مقاتلؒ فرماتے ہیں کہ صور اسرافیل کی وسعت ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کی وسعت سے زیادہ ہے، اور تمام ارواح کی گنتی کے مطابق اس میں سوراخیں ہوں گی۔ [البدور السافرة]

حضرت زرارہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ جو بصرہ کے قاضی تھے مقتدیوں کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، اسی سورت کی تلاوت شروع کی، جب ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ﴾ آیت پڑھی تو بے ساختہ زور کی ایک چیخ منہ سے نکل گئی اور گر پڑے، جب لوگوں نے اٹھایا، تو روح پرواز کر چکی تھی۔ [ترمذي]

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ⑪ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ⑫ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ⑬ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ⑭ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ⑮ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ⑯ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ⑰ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ⑱ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ⑲ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ⑳ ثُمَّ نَظَرَ ㉑ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ㉒ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ㉓ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ

اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دیں جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ﴿۱۱﴾ اور میں نے اسے لمبا چوڑا مال دیا ﴿۱۲﴾ اور مجلس میں حاضر ہونے والے بیٹے دیئے ﴿۱۳﴾ اور مہیا کیا میں نے اس کے لیے ہر قسم کا دنیوی ساز وسامان ﴿۱۴﴾ پھر وہ طمع کرتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں ﴿۱۵﴾ ہرگز نہیں! بیشک یہ شخص ہماری آیات کے ساتھ عناد رکھتا تھا ﴿۱۶﴾ میں اسے بڑی چڑھائی چڑھاؤں گا ﴿۱۷﴾ بیشک اس نے غور وفکر کیا اور اندازہ لگایا ﴿۱۸﴾ پس یہ مارا جائے، اس نے کیسا اندازہ لگایا؟ ﴿۱۹﴾ پھر مارا جائے، اس نے کیسا اندازہ لگایا؟ ﴿۲۰﴾ پھر اس نے دیکھا ﴿۲۱﴾ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا ﴿۲۲﴾ پھر اس نے پشت پھیری اور تکبر کیا ﴿۲۳﴾ پھر اس نے کہا: یہ جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے ﴿۲۴﴾ یہ تو انسان کا ہی کلام ہے ﴿۲۵﴾ عنقریب میں اس کو سقر میں ڈالوں گا ﴿۲۶﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ سقر کیا ہے؟ ﴿۲۷﴾ نہ باقی رکھتی ہے، نہ چھوڑتی ہے ﴿۲۸﴾

معارف ومنازل

گزشتہ سورت میں فرمایا تھا: ﴿ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ﴾ [المزمل:۱۱] (مجھے اور جھٹلانے والوں کو چھوڑیں جو خوشیوں والے ہیں) یہاں اس عموم کے ایک خاص فرد کا بیان ہے۔ سورۃ القلم میں جس خبیث شخصیت کے متعلق ارشاد ہوا: ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ﴾ [القلم:۱۰] (اور فرمانبرداری نہ کریں ہر قسم کھانے والے ذلیل کی) وہ تھا ولید بن مغیرہ مخزومی، یہاں اسی کا دوبارہ تذکرہ ہے، مگر ایک الگ انداز میں۔

یہ شخص قریش میں بڑا مالدار اور معزز سردار گزرا ہے، اس کے دو لقب ہوتے تھے: ایک ''وحید'' بمعنی مالداری اور سرداری میں یکتا، دوسرا لقب تھا: ''ریحانہ'' بمعنی قریش کی خوشبو وناز بو۔ یہ شخص بڑا ہشیار، چالاک اور جہاں گشتہ مانا جاتا تھا، تین قسم کے مال کثیر اور سرمایہ کا مالک تھا: ایک یہ کہ بڑا تاجر تھا، ایک لاکھ مثقال دینار، دس لاکھ دراہم، اس کا تاجرانہ سرمایہ تھا، تیس چالیس سے زائد غلاموں کا مالک تھا، طائف میں چار باغوں اور سینکڑوں ایکڑ زرعی زمینوں کا مالک تھا، اس کے علاوہ ہزاروں بھیڑ بکریاں اور سینکڑوں اونٹ اس کی ملکیت میں ہوتے تھے، دس اس کے چاق وچوبند، عقلمند وزیرک بیٹے تھے، جو کہ ہر وقت قومی مجلسوں اور محفلوں میں باپ کی معیت میں شرکت کرتے تھے۔

اس شخص کا غرور وتکبر اور گھمنڈ عزت وسرمایہ داری اور اولاد کی وجہ سے نہایت زیادہ تھا، قومی جرگے بغیر اس

کی شرکت کے منعقد ہی نہیں ہوتے تھے، ان آیات میں اس کے شرک وکفر اور غرور وتکبر کا تفصیلاً بیان ہے۔
﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾ [القلم:١٦] کے تحت گزر چکا کہ جنگ بدر میں ایک انصاری کی تلوار سے اس کی ناک کٹ گئی، پھر مدتوں تک صحیح نہیں ہوئی، حتیٰ کہ جہنم رسید ہوکر:

﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ﴾ پہنچ گیا (دوزخ میں)۔ ان آیات کے نزول کے بعد عذاب الٰہی میں مبتلا ہوکر آہستہ آہستہ پوری دولت سے ہاتھ دھوبیٹھا، جب مر رہا تھا تو کفن گھر میں نہیں تھا، اس کے چھ بیٹے باپ کی طرح کفر پر مرے، جبکہ چار کو اللہ ربّ العزّت سبحانہ نے قبول فرمایا، وہ اسلام لائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہراول دستے میں شامل ہوگئے، اور کفر وارتداد کے خلاف صف اول کے مجاہدین میں شمار ہوئے۔

مردود اور ناپاک کافر سے ربّ العزّت نے عظیم مجاہد پیدا کئے، ان چار بابرکت وباہمت کے نام یہ ہیں: خالد بن ولید سیف اللہ، عمارۃ بن ولید، ہشام ابن ولید، ولید بن ولید رضی اللہ عنہم۔ یہ آخر الذکر کا شمار مستضعفین میں ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص مبارک میں سپرد خاک ہوئے۔ زہی سعادت! باقی دو نے بڑے بڑے معرکوں میں داد شجاعت دے کر بڑا مقام پایا، چوتھا خالد رضی اللہ عنہ جن سے عرب کے درخت وگیاہ، کوہ وجبال اور تمام ذرات باخبر ہیں، ان کے اتنی کثرت سے جہادی کارنامے ہیں جنہیں مؤرخین اور سیرت نگاروں نے ضخیم جلدوں میں مرتب کئے ہیں، کنیت ابوسلیمان ہے، زبان حق، بیان نبوت سے ''سیف اللہ'' کا لقب پایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پاگئے۔ آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

﴿وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا﴾۔ ترکیب: ﴿خَلَقْتُ﴾ میں ''تا'' ضمیر متکلم فاعل ہے، ﴿خَلَقْتُ﴾ سے پہلے مَنْ مفعول بہ ہے، جو فعل پر مقدم ہے، اور وَحِيْدًا حال ہے۔ اگر فاعل سے حال بنایا جائے تو معنی ہوگا کہ میں نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ پیدا کرنے میں مَیں اکیلا ہوں، ظاہر ہے کہ پیدا کرنا بلا شرکت صرف اللہ کی صفت ہے، وہ اکیلا تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ اور اگر یہ مَنْ سے حال ہو تو معنی یہ ہوگا کہ جس کو میں نے پیدا کیا ایسے حال میں کہ وہ اکیلا تھا، اس کے پاس دنیوی مال ودولت، ساز وسامان کچھ نہ تھا، اب جبکہ یہ مالدار اور صاحب عزّت ہے، اور یہ سب کچھ ہماری ہی کرم نوازی ہے، تو ان نعمتوں کا اسے شکر بجالانا چاہئے تھا، مگر اس نے ناشکری اختیار کرکے خود کو اکیلا رکھا، جس سرمایہ پر اسے ناز تھا اسے چھوڑ کر خالی ہاتھ ہمارے پاس آئے گا، اور یہ مال اسے کچھ کام نہیں آئے گا، کاش یہ بدقسمت عقل سے کام لیتا، تو یہ روز بد اسے نہ دیکھنا پڑتا۔

﴿وَجَعَلۡتُ لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا﴾ (میں نے اسے لمبا چوڑا مال دے دیا)، اس کی مالداری کا بیان گزشتہ سطور میں گزر گیا۔ تفسیر مظہری نے اسے اس زمانے کا کروڑ پتی بتایا ہے، آج کا کھرب پتی اس زمانے کے کروڑ پتی سے چند قدم پیچھے شمار ہوتا ہے، کیا ہے مال، کیا ہے سرمایہ، سارے جہاں کے ناز ونخرے اور سرمایہ ایک ادنیٰ مؤمن کے ایمان کے مقابلے میں ہیچ ہیں، ولید بیچارہ جتنا بھی سرمایہ دار ہو ﴿مالا ممدودا﴾ کا ایک اکیلا مالک ہو، پھر بھی قارون کے مقابلے میں فقیر شمار ہوتا ہے۔ قارون پر کیا گزرا؟ محمد عربی کی غلامی جسے اگر نصیب نہ ہوئی، تو وہ کچھ بھی نہیں اور جسے نصیب ہوئی، وہ ہی اصلی سرمایہ دار ہے۔

ایک ترکی حکمران کی عجیب تمنا:

ترکی کا حکمران سلطان عبدالحمید خان (جن کی حکمرانی تین براعظموں پر مشتمل تھی) وفات سے پہلے وصیت کر گئے کہ میری میت بذریعہ ٹرین استنبول سے دمشق لے جائی جائے، اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے قدموں میں دفن کیا جائے، استنبول سے براستہ شام مدینہ منورہ تک ٹرین جاتی تھی، سلطان کے وزیر اعظم نے کہا کہ جناب بادشاہ صاحب! اگر بجائے دمشق کے آپ کا جسد خاکی مدنیہ منورہ لے جایا جائے، اور سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وجوار میں دفن کیا جائے؟ تو سنئے جواب! سلطان نے کہا: نہیں مجھ گناہگار کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے شرم آتی ہے، میں وہاں آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ وزیر نے کہا: جناب حضرت ابوایوب انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کی قبر ہمارے پاس ہے، پھر یہاں کیوں آپ کو دفن نہ کریں؟ کہنے لگے: سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اولوالعزم اور بڑے ہیں، مگر بلال حبشی کا مقام بہت اونچا ہے۔ (شب معراج کے دخول میں آپؓ جنت میں سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے) اور زندگی بھر آپ کے مؤذن وخادم رہے ہیں۔

کیا مال ودولت انسان کو بچا سکتا ہے؟

یہ مال ودولت سراسر دھوکہ ہے، کافر کہتے تھے: ﴿نَحۡنُ اَكۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ﴾ [سبأ: ۳۵] (اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے ہیں، اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا)۔ ولید بن مغیرہ ایسے کہنے والوں کا بڑا سربراہ تھا، انجام کیا ہوا؟ قرآن مجید نے انجام یہ بتایا:

﴿وَمَهَّدۡتُّ لَهٗ تَمۡهِيۡدًا﴾ (میں نے بھی اس کے لیے خوب تیاری کی ہے) یہ کہاں چھپ جائے گا؟ اکیلا

پیدا ہوا ہے، اکیلا ہمارے پاس آئے گا، ﴿يَوۡمَ لَا يَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ﴾[الشعراء: ۸۸] (جس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ بیٹے) ہمارے پاس اس کی آمد یقینی ہے، جہاں مال و اولاد کسی کا کام نہیں آئیں گے۔

تعجب اس بات پر ہے کہ یہ بیوقوف اتنے سرمایہ کے باوجود مزید طمع لے کر بیٹھتا ہے:

﴿ثُمَّ يَطۡمَعُ اَنۡ اَزِيۡدَ﴾ طمع کرتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں، اور زیادہ کی طمع رکھنے کا سزاوار شکر گزار بندے ہوتے ہیں نہ کہ یہ ناشکر، مگر مال کی زیادتی اور عمر کی زیادتی کی تمنا ہر بنی آدم کی فطرت میں ہے، انسان کو سونے، چاندی، جواہرات سے بھری ہوئی وادیاں دی جائیں تب بھی اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور وہ اسی تمناء کثرت میں شب و روز فکر مند رہتا ہے۔ ﴿جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾ [الھمزۃ: ۲] (مال کو جمع کیا اور گننے لگا)۔ ﴿جَمَعَ فَاَوۡعٰى﴾ [المعارج: ۱۸] (مال جمع کیا اور محفوظ رکھا) فطرتی حریص اور پھر اعلیٰ درجے کا کنجوس و بخیل ہے۔

﴿كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيۡدًا﴾ (یہ شخص ہماری آیات کے ساتھ عناد و بغض رکھتا تھا) وہ نہیں چاہتا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقصد و مدّعا میں کامیابی سے ہمکنار ہوں، اور اس کا مشن کامیاب ہوں۔

﴿سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا﴾ (ہم اس کو جہنم کی اندر چڑھائی پر چڑھائیں گے)، دوزخ کے اندر ایک پہاڑ ہے جس کی چڑھائی و بلندی ہزاروں سالوں کی مسافت پر ہے، فرشتے زنجیروں سے جکڑ کر مجرموں کو گھسیٹتے ہوئے اس کی بلندی پر چڑھا کر نیچے گرائیں گے، آج جس چڑھائی پر چڑھ کر وہ خود کو اونچا اور خلق خدا اور احکام الٰہی کا مذاق اڑا کر انہیں پست رکھنے کی تدبیر کر رہا ہے، دوزخ میں یہی سلوک ان کے ساتھ ہوگا کہ "صَعُوۡد" پر اسے چڑھا چڑھا کر گرایا جائے گا، کہتے ہیں کہ وہ پہاڑ ایسا سرخ پہاڑ ہے جیسے لوہے کو آگ پر گرم کر کے سرخ کیا جائے۔

﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ﴾ (اس نے فکر کیا اور تجویز کی) اس مشرک نے ان تمام باتوں پر غور فکر کیا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر غور کیا، یہاں تک کہ ایک دفعہ قائل بھی ہوا کہ نبی اور اس کا دین اور قرآن مجید برحق اور من جانب اللہ ہے، مگر اسے پھر عناد و سرکشی نے گمراہی پر آمادہ کیا۔

﴿فَقُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ﴾ (پس مارا جائے یہ بدبخت، اس نے کیسا اندازہ لگایا؟)

﴿ثُمَّ قُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ﴾ (پھر یہ مارا جائے، کیسا اندازہ لگایا؟) ﴿ثُمَّ نَظَرَ﴾ (پھر اس نے دیکھا غرور و سرکشی کے ساتھ)۔ ﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ﴾ (پھر تیوری چڑھائی، ترش رو ہو کر منہ چڑھایا، ناک ٹیڑھا رکھا ترشروئی کے ساتھ)۔ ثُمَّ اَدۡبَرَ وَاسۡتَكۡبَرَ﴾ (پھر پشت پھیری اور غرور و تکبر کیا)۔

﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ یَتَمَطّٰی﴾ (پھر اپنے گھر والوں کے پاس غرور کے ساتھ اتراتا ہوا گیا)۔

﴿ثُمَّ اَدۡبَرَ وَ اسۡتَکۡبَرَ﴾ (پھر اس نے پشت پھیر کر تکبر وغرور کیا) اور احکام الٰہی کا مذاق اڑا کر سرور عالم ﷺ سے کھلی بغاوت کی، آپ ﷺ کے خلاف محاذ تیار کیا، اور کلام الٰہی کو ﴿اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾ [النحل: ۲۴] (گزشتہ اقوام کی کہانیاں ہیں) اور سحر وجادو کہہ کر پکارا، اور کہا کہ یہ جادو ہے، بجائے تسلیم وانقیاد کے یہ کہا:

﴿اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ یُّؤۡثَرُ﴾ (یہ بابل کا جادو ہے) یہ محمد (ﷺ) بابل والوں سے جادو سیکھ کر لوگوں کو جادو کر رہا ہے، آباء واجداد کے دین کو جادو کے زور سے تبدیل کر رہا ہے، جو شخص اس کی مجلس میں جاتا ہے تو اسی کا ہی ہو جاتا ہے، نہایت خطرناک جادوگر ہے۔

﴿اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ﴾ (یہ تو انسان کا کلام ہے) یہ آسمانی وحی اور اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں، یہ ﴿اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾ [النحل: ۲۴] (گزشتہ اقوام کی کہانیاں ہیں) ہے۔ مکذّبین نے حد کر دی، اب جواب ہے:

﴿سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ﴾ (عنقریب میں اس کو جہنم کے پانچویں طبقہ ''سقر'' میں ڈالوں گا)، جب اسے بار بار، بلکہ ہزاروں بار سمجھایا گیا، اور تحدی وچیلنج دی گئی کہ اگر یہ کلام اللہ نہیں بقول تمہارے کلامِ بشر ہے، تو آؤ میدان میں اپنے معاون ومددگار شاعروں، فصحاء وبلغاء، معبودوں کے ساتھ دس سورت نہ سہی ایک مختصر سورت کی مثال پیش کرو، یا تو اس کو کلامِ الٰہی مان کر ہتھیار ڈال دو، جب میدان میں بھی آنے کو گوارا نہیں کرتے ہو اور تسلیم وانقیاد سے بھی منکر ہو، تو یہی فیصلہ ہوگا کہ تمہیں سَقَرَ کا ماء حمیم وغسلین پلایا جائے اور بس۔

﴿وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ لَا تُبۡقِیۡ وَلَا تَذَرُ﴾ استفہام ہے، کیا ہے سقر؟ جانتے ہو سقر کیا ہے؟ پھر جواب یہ ہے کہ وہ شعلہ زن دہکتی ہوئی آگ ہے، جو باقی نہیں رکھتی ہے، سب کچھ ہضم کرتی اور فنا کرتی ہے، فنا کر کے نہیں چھوڑتی، دوبارہ، بار بار زندہ کرتی اور تباہ کرتی ہے، کوئی بڑی منکر ہستی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتی، اور نہ کوئی مجرم بچ سکتا ہے، جیسے، فرمایا: ﴿کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَهَا﴾ [النساء: ۵۶] (جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی، تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے)، دنیا کی آگ میں لکڑی ڈالنے سے لکڑی جل کر راکھ بن جاتی ہے، تو فنا ہوگئی، مگر وہاں یہ سقر والا فنا کی کیفیت نہیں، وہ فنا شدہ انسان پھر دوبارہ پلٹ کر فوراً زندہ ہو جاتا ہے، پھر جل کر فنا ہو جاتا ہے، پھر فوراً زندہ ہو جاتا ہے، ابدالآباد یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

﴿فَكَّرَ وَقَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ﴾ کا پس منظر و حقیقت:

یہ بار بار کا ﴿فَكَّرَ وَقَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ﴾ کیا ہے؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ ایک دن ابوجہل، ولید بن مغیرہ، نضر بن الحارث، عاص بن وائل، ابوسفیان اور دیگر چند رؤساء و سرداران قریش نے ''دارالندوۃ'' میں میٹنگ کی کہ حج کا موسم قریب ہے، باہر سے جو قبائل حج کو آتے ہیں ایسا نہ ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت قبول کریں، یہ ہمارے لئے باعثِ خفت و شرمندگی ہے، اور اس کی کامیابی ہے، بایدہم لوگوں کو پہلے سے خبر دار کریں کہ اس شخص کے کہنے میں نہ آئیں، اور اس کے متعلق ایک ہی فیصلہ ہو کہ یہ شخص ایسا ہے، ویسا ہے، اگر کچھ لوگ کہیں یہ شاعر ہے، اور بعض کہیں کاہن ہے، کچھ اسے جادوگر بتائیں، دوسرے کچھ مجنون کہیں، تو باہر سے آنے والے شک و شبہ کریں گے، اور ہماری باتوں میں اختلاف کی وجہ سے کوئی خاص وزن نہیں ہوگا، آج ایک ہی بات پر اتفاق ہو، پھر پورے مکہ میں اس کی تشہیر و اعلان ہو کہ یہ طے پایا ہے، تاکہ سارے لوگ بیک زبان و اتفاق وہی ایک لفظ کہیں، اس طرح آنے والوں پر اثر ہوگا اور ہمارا منصوبہ اپنے منطقی انجام پر کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

اس مجلس کا صدر الصدور اتفاق رائے سے ولید بن مغیرہ منتخب ہوا، اور سب نے باری باری اپنی اپنی رائے پیش کی، ولید بن مغیرہ سب کو سنتا رہا اور ان کی باتوں پر سوچتا رہا، آخر میں ایک خاموشی اور سوچ و فکر میں گم صم ہو کر خوب فکر و غور کیا، تو پھر یوں گویا ہوا کہ شاعر کہنے سے اور کاہن کہنے اسی طرح مجنون، دیوانہ وغیرہ کہنے سے لوگوں کو یقین نہیں آئے گا، صرف ایک ہی کامیاب حربہ ہے کہ ہم اسے جادوگر کہیں گے، تو اس پر لوگوں کو یقین آئے گا، اگر لوگوں نے ہم سے دلیل و ثبوت مانگا تو یہ کہیں گے کہ جادوگر کی خاصیت یہ ہے کہ میاں بیوی میں، بھائیوں میں، باپ بیٹوں میں تفریق کرتا ہے، اس شخص میں یہی خاصیت موجود ہے، دیکھو! کہیں بیوی اس کے دین پر ہے، شوہر اپنے دین پر ہے یا بالعکس، یہ ایک تفریق ہے، یہی حال بھائیوں کا ہے، ایک دو، اس کے دین پر ہیں، باقی اپنے پرانے دین پر ہیں، باپ بیٹوں میں بھی یہی تفریق ہے۔ ہمارے شہر میں کچھ اس کے دین پر، کچھ اپنے آباء و اجداد کے دین پر ہیں۔ پھر بنیادی بات یہ ہے کہ جو شخص اس کے پاس خواہ کسی بھی مقصد کے لیے جاتا ہے بس وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔

یہ مشورہ ولید نے جب پیش کیا تو سب نے اسے سراہا اور قبول کیا، ولید نے بڑے غور و فکر کے بعد اسے سب کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ ہے ﴿فَكَّرَ وَقَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ﴾ وغیرہ کلمات قرآنی کا پس منظر و حقیقت۔ [تفسیر عزیزی اختصاراً]

لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾ وَمَا جَعَلۡنَآ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلۡنَا
عِدَّتَهُمۡ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۙ لِيَسۡتَيۡقِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَيَزۡدَادَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا
اِيۡمَانًا وَّلَا يَرۡتَابَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ وَلِيَقُوۡلَ الَّذِيۡنَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ
وَّالۡكٰفِرُوۡنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ
وَمَا يَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡبَشَرِ ﴿٣١﴾

ترجمہ: انسان کو جھلسا دینے والی ہے ﴿۲۹﴾ مقرر ہیں اس پر انیس فرشتے ﴿۳۰﴾ اور ہم نے نہیں مقرر کئے دوزخ کے کارکن، مگر فرشتے اور ہم نے یہ تعداد کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے، تا کہ اہل کتاب یقین کرلیں اور اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو، اور تا کہ اہل کتاب اور مؤمن اس میں شک نہ کریں، اور جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے یا جو کافر ہیں وہ کہیں گے کہ اس مثال کے بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کیا منشا ہے؟ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسی طرح گمراہ کرتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ایمان سے نوازتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے، اور تیرے ربّ کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے، اور یہ تو انسانوں کے لیے یاددہانی ہے ﴿۳۱﴾

معارف ومنازل

﴿سقر﴾ جہنم انسانوں کو جھلسا دینے والی تیز آگ ہے، جھلسا کے رکھ دے گی، چمڑے کو تباہ کر کے چھوڑے گی۔ ﴿اِنَّهَا تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ﴾ [الھمزۃ:۷] (بیشک وہ آگ دلوں پر چڑھے گی)، اس کا اثر اندر دلوں کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

﴿عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ﴾ دوزخ میں سزا دینے کے لئے انیس فرشتے مقرر ہیں۔ یہ انیس بڑے بڑے داروغے یا افیسر ہیں، اور ان کے ماتحت عملے کا کوئی حساب نہیں، مشرکین کے ایک پہلوان ''ابوالاسود بن کلدہ جُمحی'' نے غرور میں کہا تھا اور انیس کے عدد پر مذاق کر کے کہا تھا کہ ان کے سترہ کو میں ہی قابو کروں گا، باقی دو پر تم لوگ قابو کرو، بس قصہ ختم۔ ابوجہل اور دیگر مشرکوں نے بھی یہی کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں انیس فرشتوں سے ڈراتا ہے، ان سے ہم نمٹ لیں گے، یہ ان کا ٹھٹا مذاق ہوتا تھا، ان کو فرشتوں کی قوت کا کیا اندازہ؟ ایک ہی ان فرشتوں میں سے پوری دنیا کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے قومِ لوط کی بارہ بستیوں کو ہتھیلی پر اٹھا کر آسمان تک اٹھالیا، پھر انہیں الٹا کر زمین پر دے مارا، کہنے لگے: مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہاتھ پر ایک مچھر رکھا ہوا ہے، اگر یہ فرشتے اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کریں تو ایک فرشتے کروڑوں انسانوں کو ہتھیلی پر اٹھا کر جدھر چاہے رومال کی طرح پھینک دیں۔ایک فرشتہ کے پاس اتنی قوت ہوتی ہے کہ معمورہ کے پہاڑ کو ہاتھ کی ہتھیلی پر اٹھا کر آسمانوں تک لے جاسکتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے فرشتوں پر مستقل کتاب لکھی ہے، اس میں نفیس معلومات اور عجیب معلومات جمع کئے ہیں، اس کا (الحبائک) کے نام سے اردو ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

جہنم میں سزا دینے والے فرشتے (۱۹) کیوں؟

رہا انیس کا عدد، اس میں ضرور کوئی حکمت ہے۔حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر عزیزی میں اس پر عمدہ بحث سپرد قلم فرمائی ہے، جو قابل دید ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ جہنم میں عذاب کی انیس انواع ہیں، ہر نوع کا عذاب دوسرے نوع کے عذاب سے مختلف ہے، اور جہنم کے ہر طبقے کا عذاب دوسرے کے عذاب سے مختلف ہے، جیسے ہم دیکھتے ہیں دنیوی نظام کو جو کہ خدائی نظام سے ماخوذ ہے، یہاں حکومتی نظام میں درجنوں شعبے ہیں، ہر شعبہ کی وزارت الگ ہے، اور اس کا وزیر بھی الگ ہے، مثلاً: صحت، خوراک، مواصلات، پانی، بجلی، گیس، جنگلات، داخلہ، خارجہ، ماہی گیری، قانون، وزارت عدل وغیرہ، اسی طرح جہنم کا بھی ایک خدائی نظام ہے کہ کرۂ ارض پر بسنے والے مکلف (جن وانس) کی دو تہائی اکثریت اس میں مختلف جرائم کی پاداش میں سزا کاٹ رہی ہوگی، جبکہ جنت کی آبادی بہ نسبت جہنم کی آبادی کے نہایت کم ہے۔قیامت کے روز حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کا حصہ الگ کرو، وہ پوچھیں گے: یاربّ! جہنم کا حصہ کیا ہے؟ فرمائیں گے: ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے جہنم کے لئے نکالو، اور پورے ہزار میں سے صرف ایک جنت کے لئے باقی رکھو۔[متفق علیہ]

اسی طرح جہنم میں جانے والے لوگ اپنے جرائم کی پاداش میں جائیں گے، اور جرائم ایک جیسے نہیں ہوتے، بلکہ ان کی بہت سی مختلف اقسام وانواع ہوتی ہیں، انہی کے مطابق جہنم کے مختلف درجات وطبقات اور درکات مقرر ہیں، کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُلوہیت کا دعویٰ کیا، کچھ نے رسالت ونبوت کے دعوے کئے ہیں، کچھ مہدویت کے مدّعی، کچھ یہودیت اور نصرانیت کے مدّعی، کچھ صائبیت کے، کچھ نے بت پرستی کی، کچھ ہندو سکھ بنے، کچھ نے شیطان کی عبادت کی، بعض نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، بعض نے ارتداد اختیار کیا اور بعض نے انبیاء ورُسل علیہم السلام کو

شہید کیا، علیٰ ہذا القیاس۔ تو یہ سارے ایک جیسے جرائم نہیں، اور ان کی سزا و جزاء بھی ایک جیسی نہیں ہوں گی، کم از کم گناہوں کے اختلاف و نوعیت کے اعتبار سے جہنم کے داروغے انیس ہوں گے، ہر قسم کا عذاب کسی ایک کا سپرد ہوگا۔

ہم دنیا کے جیلوں میں دیکھتے ہیں کہ جہاں سارے قیدیوں کی سزا برابر نہیں، کسی کی اے، کسی کی بی اور کسی کی سی کلاس ہوتی ہے، اور جرائم بھی مختلف ہوتی ہیں، کوئی بغاوت کے کیس میں مبتلا ہوتا ہے، اسی طرح کوئی قتل، ڈاکہ، چوری، شراب، فراڈ، خیانت، قرض، دھوکہ، منشیات، اور غیر قانونی اسلحہ و دیگر مختلف سزاؤں میں مختلف وارڈوں میں محبوس جیل کاٹ رہے ہیں، علیٰ ہذا القیاس یہ مسئلہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں اگر چند چیزوں کے بارے میں کوئی خاص عدد مذکور ہو تو ہمیں اس پر یقین کے ساتھ ایمان لانا اور تصدیق کرنا ضروری اور فرض ہے، اگر آسانی سے اس کی حکمت ہمیں معلوم ہو، تو بہتر، ورنہ ہم اس کے مکلف نہیں کہ خواہ مخواہ اس کی حکمت معلوم کرنے کے درپے ہوں، اللہ ربّ العزّت سبحانہ نے بغیر حکمت کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی، ہر چیز کی حکمت اس کے علم محیط میں ضرور موجود ہے، مگر ہمیں اس کے جاننے کا مکلف نہیں بنایا گیا، چند ایک چیزوں کے علاوہ اس بڑے کارخانۂ قدرت کے لاکھوں موجودات کی حکمت کسی کو معلوم نہیں، مثلاً: اسماء حسنیٰ کیوں ننانوے ہیں؟ اس میں کیا راز و حکمت ہے؟ نمازیں کیوں پانچ ہیں؟ ان کی رکعتیں کیوں مختلف ہیں؟ آسمان کیوں سات ہیں؟ بچوں کی پیدائش کیوں نو مہینے میں ہے؟ قرآن مجید کی سورتوں کی اور آیتوں کی کیا کیا حکمتیں ہیں؟ رات دن کیوں گھٹتے بڑھتے ہیں؟ مقرّب فرشتے کیوں چار ہیں؟ جنت کیوں آٹھ اور دوزخ کیوں سات ہیں؟ نماز میں رکوع ایک اور سجدے کیوں دو ہیں؟ علی ھذا القیاس۔

کوئی چیز بغیر حکمت کے نہیں، مگر ساری حکمتوں کے معلوم کرنے کے ہم مکلف نہیں، چونکہ شریعت نے ہمیں مکلف نہیں بنایا تو ان چیزوں پر بلاچون وچرا ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اہل علم اپنی بساط کے مطابق کوشش کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں، اگر انہیں کسی چیز کی اصلی حکمت کا سراغ حاصل ہوتا ہے تو وہ تاویل کے درجے میں ہوتا ہے، یقینی اور حتمی نہیں ہوتا۔

گزشتہ ادوار میں وقتاً فوقتاً علماء امت نے اس سلسلے میں معلومات افزا کتابیں تالیف کی ہیں، مگر اسرار شریعت کا احاطہ نہیں ہوسکا ہے، احکامِ شریعت اتنے بکثرت ہیں کہ لاکھوں سالوں کا عرصہ ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کے معلوم کرنے کے لیے درکار ہیں، انسانی علم محدود ہے، اور قدرت کے عجائبات غیر محدود ہیں۔

حضرت علامہ محدث کبیر جامع اسرار شریعت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ جو کہ ہر فن میں راز دان گزرے ہیں، طریقت وشریعت کے علوم کے جامع تھے، صاحب کشف والہام تھے، تمام علوم میں یدطولیٰ اور استعداد اعلیٰ رکھتے تھے، ان کی مایہ ناز اور بے نظیر تالیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کشف اسرار شریعت میں وہ مستند جامع کتاب ہے کہ جس کی مثال نہیں، اور رموز واسرارِ شریعت پر اس جیسی پر از حکمت کتاب کسی نے نہیں لکھی ہے، لیکن کئی مرتبہ مطالعہ کرنے کے بعد شاید کچھ سمجھ میں آئے، ابھی قریبی دنوں میں حضرت شیخ علامہ سعید احمد صاحب پالن پوریؒ نے پانچ ضخیم جلدوں میں بنام ''رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ''۔

اس کی شرح جو لکھی ہے یہ نہایت مفصل اور جامع ہے، کتاب کے جو خبایا اور مخفی گوشے پوشیدہ تھے، حضرت نے ان کو نہایت عمدہ پیرایہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان شاء اللہ اس کے مطالعہ سے کتاب کا اصل مقصد، نیز موضوع ومفہوم اور مطالب پر آگاہی ممکن ہے۔ جزاء ھم اللہ أحسن الجزاء ورحمنا وإیاھم آمین

﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً﴾ (نہیں مقرر فرمایا ہم نے دوزخ والے انیس (۱۹) فرشتوں کو مگر ملائکہ یہ انیس فرشتے آفیسر داروغہ ہیں)۔﴿وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یہ انیس ملائکہ کی حکمت کا بیان ہے کہ (ہم نے یہ تعداد کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے) جہاں یہ لوگ ہر بات کا انکار کے ساتھ مذاق اڑاتے ہیں، تاکہ وہ اس حکم کا بھی انکار کریں، اور ہر قسم کی گرفت ان پر مضبوط ہوجائے، اور یہ مقصد بھی ہے کہ: ﴿لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ (تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے) کیونکہ انہیں علم ہے کہ ان کی کتابوں میں بھی انیس کا ذکر آیا ہے، اب جبکہ قرآن پاک بھی یہی تعداد بیان کررہا ہے تو انہیں اس تعداد پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یقین آنا چاہیے۔ اس کی دوسری حکمت یہ ہے کہ:

﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا﴾ کہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو، کیونکہ ہر مؤمن بہ کے بیان کرنے سے مؤمنوں کے ایمان (ایمانیات) میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے۔ وہ جب اس بات کو سن کر ایمان لاتے ہیں تو ان کا ایمان تازہ ہوجاتا ہے کہ پہلی کتابوں میں بھی یہی بات موجود ہے، اور ہمارے قرآن میں بھی یہی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا: ﴿وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اہل کتاب اور مؤمن کسی غلط بات سے دھوکہ نہیں کھائیں گے، بلکہ ہر قسم شک وشبہ سے بری ہوجائیں گے۔ ہاں! البتہ:

﴿وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ﴾ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے، یا

جو کافر ہیں وہ کہیں گے:﴿مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ اس مثال کو بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کیا منشا ہے؟ اور اس قسم کی مثال بیان کرنے سے وہ کیا چاہتا ہے؟ دوسری جگہ فرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ [البقرۃ:۲۶] (اللہ اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے، جو مؤمن ہیں وہ یقین کرتے ہیں کہ وہ ان کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے، اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کی مراد ہی کیا ہے؟) پس یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکھی مچھر کی مثال کیوں بیان کرتا ہے؟ کیا اس کے پاس اور مثال نہ تھی؟

یہاں بھی انہوں نے یہی اعتراض کیا کہ انیس کی تعداد بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے کون سی اچھی مثال بیان کی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسی مثالوں سے ان کی گندگی خباثت اور زیادہ بڑھتی رہے گی، مگر سمجھدار اہل کتاب یقین کرلیں گے کہ واقعی قرآن حکیم کا بیان پہلی کتابوں کے عین مطابق ہے، اور مؤمنوں کے ایمان میں اضافہ ہوگا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہر بات کی تصدیق کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسی طرح گمراہ کرتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)۔ یہ مضمون ہدایت وضلالت کا قرآن مجید میں بار بار بکثرت ذکر ہوتا رہا ہے، مگر جو لوگ ہدایت نہیں چاہتے انہیں کیا ہدایت حاصل ہو؟ ہدایت حاصل ہونے کے لئے اس کی طلب شرط ہے جن لوگوں کو ہدایت حاصل ہوئی، وہ محض بغیر طلب کے نہیں، بلکہ انہوں نے اس کے حصول کے لیے جدوجہد کی، تب وہ ہدایت یافتہ ہوگئے۔ ہاں! یہ بات متحقق ہے کہ ہدایت ہو یا گمراہی اس کے لئے اسباب ضرور ہوتے ہیں، کفر وشرک، ظلم وعناد وغیرہ، یہ سارے گمراہی کے اسباب ہیں، تو:

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اسی معنی میں رہنمائی کرتا ہے، پھر فرمایا: یہ فرشتوں کی تعداد کو انیس میں منحصر سمجھنا غلط ہے، فرشتے انسانوں سے کئی گنا زیادہ ہیں، آسمانوں میں ایک بالشت مقدار جگہ خالی نہیں مگر وہاں فرشتے موجود ہوتے ہیں۔

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ (تیرے ربّ کے ان لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے) اس نے اپنی فوجوں کو ساتوں آسمانوں اور فضاؤں میں ایسا پھیلا دیا ہے کہ سوائے اس کے کس کی مجال ہے کہ ان کو جاننے یا معلوم

کرے۔اس ناعاقبت اندیش انسان نے ابھی تک خود کونہیں پہچانا، یہ خدا تعالیٰ کی فوجوں کا کیا سراغ لگائے؟ یہ کم ظرف اور بے ضمیر انسان جو ایک مردار نطفہ کی پیداوار ہے نہ خوشی کو برداشت کرسکتا ہے نہ غم کو، اور نہ ہی بھوک و پیاس کو، یہ اپنی حماقت اور ناعاقبت اندیشی کے سبب خدائی معلومات میں ٹانگ اڑائی کرتا ہے، جس دن پکڑا جائے گا تب اسے پتہ چلے گا، فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زندگی بھر مذاق اڑاتا رہا، جب پکڑا گیا، تو خود کو ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ [النازعات: ۲۴] (میں تمہارا سب سے اعلیٰ پروردگار ہوں) کہنے والا چیخ چیخ کر کہتا تھا: ﴿اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ [یونس: ۹۰] (میں نے ایمان لایا ہے کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل نے ایمان لایا ہے، اور میں مسلمانوں میں سے ہوں)، اے موسیٰ! مجھے معاف کردو، میں نے تیرے ربّ پر ایمان لایا، اگر آج مجھے معافی دے دی تو زندگی بھر فرمانبردار اور تیرا غلام بنوں گا۔ جواب ملا: ﴿آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ﴾ [یونس: ۹۱] (ابھی؟ حالانکہ اس سے پہلے تم نے نافرمانی کی)۔حضرت جبریل امین علیہ السلام نے دریا کی مٹی اس کے منہ میں ڈال کر ہمیشہ کے لئے اسے خاموش کردیا۔

یہ ولید اور ابوجہل یہ کیا ہیں؟ فرعون کے عشر عشیر تک نہیں پہنچتے، آپ صبر فرمایئے، بے صبری نہ کریں، صبر جمیل ہی آپ کی شان ہے، اور صبر آپ کو زیب دیتا بھی ہے، کیونکہ آپ مُذَکِّر ہیں، مذکِر کو صبر اچھا لگتا ہے۔

﴿وَمَا ہِیَ اِلَّا ذِکۡرٰی لِلۡبَشَرِ﴾ آپ مذکِّر ہیں، آپ کی کتاب تذکرہ ہے، آپ اپنا تذکرہ جاری رکھئے، یہی آپ کا پاکیزہ منصب اور آپ کی شان ہے۔ ؎

گرچہ بت ہیں جماعت کے آستینوں میں ☆ مجھے ہے حکم اذان لاالہ الااللہ

(اقبال)

اگر دنیا سراسر باد گیرد ☆ چراغ مقبلان ہرگز نمیرد

كَلَّا وَالۡقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّہَا لَاِحۡدَی الۡکُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِیۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾
لِمَنۡ شَآءَ مِنۡکُمۡ اَنۡ یَّتَقَدَّمَ اَوۡ یَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ رَہِیۡنَۃٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ
الۡیَمِیۡنِ ﴿۳۹﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ ۟ۛ یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَکَکُمۡ فِیۡ سَقَرَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ: ہرگز نہیں، اور قسم ہے چاند کی ﴿۳۲﴾ اور رات کی قسم ہے جب وہ پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے ﴿۳۳﴾ اور قسم ہے صبح کی، جب وہ روشن ہو جاتی ہے ﴿۳۴﴾ بیشک یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک ہے ﴿۳۵﴾ یہ بنی نوع انسان کو ڈرانے والی ہے ﴿۳۶﴾ تم میں سے جو چاہتا ہے آگے بڑھے یا پیچھے ہٹ جائے ﴿۳۷﴾ ہر شخص اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے ﴿۳۸﴾ مگر دائیں ہاتھ والے ﴿۳۹﴾ یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور پوچھیں گے ﴿۴۰﴾ دوزخیوں سے ﴿۴۱﴾ کہ تم کو جہنم میں کس چیز نے ڈالا ہے ﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

فرمایا: تم کہتے ہو قرآنِ حکیم انسانی کلام ہے، ہم انیس فرشتوں کا مقابلہ کریں گے، اور قرآنی احکام کو نہیں مانیں گے، یہاں ہمارا راج ہوگا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسلام کو نہیں پھلنے پھولنے دیں گے، اس پر ارشاد ہوا:

﴿کَلَّا﴾ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، یہ تمہاری خام خیالی ہے، یا یہ کہو: تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو، آگے کام وہی ہوگا جو ہم چاہتے ہیں، تمہارے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے، سمندر میں غرق ہو کر فنا ہو جائیں گے، سنو! میں تین چیزوں پر قسم کھا کے کہتا ہوں: روشن چاند کی قسم، تاریک رات کی قسم اور نورانی صبح کی قسم! مستقبل ہمارا روشن رہے گا، تمہارے لئے آنے والا دور تاریک اور تباہ کن ہوگا، تو اب سنو!

﴿وَالْقَمَرِ﴾ مجھے چاند کی قسم ہے۔ ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴾ اور رات کی قسم ہے، جب وہ پیٹھ پھیر کر چلی جاتی ہے۔ ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ﴾ اور قسم صبح کی جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔

چاند کی قسم کھانے کا راز:

چاند کی قسم کھانے سے مراد یہ ہے کہ چاند کی روشنی سے تمام جنگلات پھلتے پھولتے اور زندہ ہو جاتے ہیں، میوے اور فروٹ پک جاتے ہیں، اور انہیں مختلف قسم کا رنگ لگ جاتا ہے، اور ہر قسم کی لذت و ذائقہ قبول کرتے ہیں، جن سے انسان اور حیوانات کی پرورش ہوتی ہے، مخلوقات کو عمدہ غذا مہیا ہوتی ہے، بعینہٖ آج کا اسلام جو ایک اعتبار سے کمزور ہے، ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ قوی و پختہ ہو جائے گا، اس میں ہر قسم کے رنگ ولذت اور عجیب وغریب معنوی ذائقے پیدا ہوں گے، تمام مخلوقات کے لئے غذا بن کر ان کے لئے سبب حیات وخوشحالی بن جائے گا، رحمۃ للعٰلمین کا دین جہاں انسانوں کو حیات اور خوشحالی عطا کرے گا وہاں حیوانات بھی سیراب اور فیضیاب ہو کر اپنے

حقوق حاصل کر پائیں گے، یہ ہے چاند کی منفعتوں کا مختصر بیان۔

اب خود چاند کی بابت سنو! وہ یہ کہ چاند کو دیکھئے! وہ کس طرح آہستہ آہستہ بدر کامل بنتا ہے، اور پورے کمال تک پہنچتا ہے، حالانکہ شروع میں وہ نہایت باریک ہلال ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ جب کمال تک پہنچ گیا تو سارے جہاں کو روشنی مہیا کرتا ہے، اگر آج اسلام اور مسلمان تمہیں کمزور نظر آتے ہیں تو یاد رکھو! اور خوب نظارہ کرتے جاؤ، وہ دن ان شاء اللہ دور نہیں جب یہی کمزور اسلام اور کمزور مسلمان اپنے کمال تک پہنچیں گے، اور بدر کامل بن کر میدان بدر میں تمہاری ساری شان وشوکت کو مٹی میں ملا دیں گے۔

چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی، سارے جہاں نے نظارہ کیا کہ ایک کمزور غیر مسلح جماعت نے اپنے سے تین گنا بڑا طاقتور مسلح اور کھاتے پیتے جرار، تجربہ کار لشکر کو وہ تاریخی سبق سکھایا جو رہتی دنیا تک تاریخِ اقوامِ عالم کے اوراق میں سونے کے پانی سے لکھا گیا، اور محفوظ رہے گا، اور ابو جہل، ولید، عقبہ، شیبہ، امیہ بن خلف اور دوسرے صنادید وسردارانِ قریش کی ناک کٹ گئی۔

بدر کامل چھوڑیئے! دو ہلال کو دیکھئے! دو کمسن نابالغ یتیم بچوں "معاذ، ومعوّذ" نے مل کر رئیس مکہ "ابو جہل" کو موت کے گھاٹ اتار دیا، دیکھا؟ ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ﴾ کی برکت، جس مخلوق پر خالق خود قسم کھائے اس میں یقیناً کوئی راز مضمر ہوگا، پس یہاں سے کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور اسلام کا بول بالا ہونا شروع ہوا۔ یہ ہے: ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ﴾ پر قسم کھانے کا راز کہ چاند کی طرح اسلام کا عروج ہوا، اس کے بعد دوسرے غزوات ہوئے، صلح حدیبیہ فتح مکہ کا بہانہ و سبب بنی، کفار قریش کا منصوبہ دب گیا، چند بد بخت بحالتِ کفر مر گئے، بقیہ قریش مشرف باسلام ہوئے، کفر پورے جزیرۂ عرب سے نکل گیا، شیطان مایوس ہو کر اپنے سر پر مٹی ڈالتا رہا، پھر خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا، واقعۂ ارتداد پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا مکمل قبضہ ہوا، جھوٹی نبوتوں کا قلع قمع ہو گیا، خلافت فاروقی میں عظیم منحوس سلطنتوں (روم فارس) کا مکمل خاتمہ ہوا، مصر وشام عراق وغیرہ فتح ہوئے۔

یہ سلسلہ مسلسل کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، بڑھتا رہا، ایک اندازے کے مطابق نصف دنیا پر مسلمانوں کا اقتدار مستحکم ہوا، یہ سیاسی اقتدار جب تک قرآن وسنت کے ساتھ منسلک رہا کامیاب رہا، پھر اس کا زوال شروع ہوا، کیونکہ بدر کامل سولہ سترہ تاریخ کے بعد زوال پذیر ہو جاتا ہے، گھٹتا ہے، بڑھتا نہیں۔

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

شاخ، پتہ اور میوہ جب تک درخت کے ساتھ لگے رہیں گے، سبز اور تروتازہ رہیں گے، جب درخت سے کٹ کر علیحدہ ہو جائیں گے تو مرجھائیں گے، گل سڑ جائیں گے، یا خشک ہو جائیں گے، اسلامی سیاست واقتدار جب تک اسلامی درخت ''شجرة طيبة'' کے ساتھ منسلک رہا، بڑھتا گیا اور خوب ترقی کرتا گیا، جب قرآن وسنت کے درخت سے کٹ گیا اس کا زوال شروع ہوا، ربّ العزّت عزّ اسمہ نے حمایت ونصرت سے ہاتھ کھینچ لیا۔

ع......سرمانداری سرخویش گیر

(سعدیؒ)

سقوط بغداد کا المیہ پیش آیا، پھر قرطبہ واندلس تاراج ہوئے۔ '' ماوراء النهر '' بلخ، بخارا اور سمرقند تباہ ہوئے، ادھر دہلی وکابل پر زوال آیا، پھر دوبارہ بغداد تاراج ہوا، خلافت عثمانیہ ترکیہ (جو تین براعظموں پر مشتمل تھی) تباہ ہوگئی، اب افغانستان چالیس سال سے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

ساٹھ سے اوپر مسلمان ملکوں میں اسلام صرف برائے نام ہے، سارے معاشرے غیر اسلامی زندقہ نظیر ہیں، ساڑھے چھ ارب اس وقت (۲۰۱۱ء میں) دنیا کی آبادی ہے، اس میں سے سوا ارب ہر قسم کے مسلمانوں کی آبادی ہے، راسخ العقیدہ مسلمان اتنے کم ہیں جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، ستر اسلامی ملکوں میں ایک صلاح الدین ایوبیؒ جیسا جوانمرد نہیں ہے۔

قیامت ہے کہ وہ اب بیٹھکر آنسو بہاتا ہے ☆ جسے سونپا گیا تھا کام دنیا کی امامت کا

ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام کا زوال قیامت کا پیش خیمہ ہے، یہ راز تمام ﴿وَالْقَمَرِ﴾ سے ماخوذ ہے۔ واللہ اعلم

رات کی قسم کھانے کا راز:

اب زوالِ کفر کا ترانہ شروع ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴾ (قسم رات کی جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتی ہے) الإسلام نور والكفر ظلمة، الإسلام كالنهار والكفر مثل الليل۔ یہ مثال نہایت واضح ہے، اور قرآن حکیم کہتا ہے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [ابراهيم: ۱] (من الكفر إلى نور الإسلام) (یہ ایک (پرُنور) کتاب ہے، اس کو ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ)۔

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرة: ۲۵۷] (جو لوگ ایمان لائے

ہیں ان کا دوست خدا ہے کہ اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے)۔

اس کے علاوہ متعدد آیتوں میں اسلام کی تعبیر نور وروشنی کے ساتھ، اور کفر کی تشریح ظلمت وتاریکیوں کے ساتھ ہے۔ ﴿وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ﴾ میں یہی اشارہ ربانی ہے کفار مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارا تاریک دین ان شاء اللہ غروب ہونے والا ہے، اس پر زوال آنے والا ہے، جس طرح رات پیٹھ پھیر کر جاتی ہے، اس کے مقدر میں پیٹھ پھیر کر جانا ہی لکھا ہوا ہے، اسی طرح دنیا کے بت کدوں پر زوال آنا ابھی شروع ہوگیا ہے، صبح کی روشنی رات کی ظلمتوں کے لئے پیام موت ہے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور جناب سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے "أول ما خلق الله نوري و في رواية أول ما خلق الله روحي" حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے آسمان کے فرشتوں نے کفر و ظلمت کے زوال کا بگل بجایا، جیسے بادشاہوں کی آمد پر بگل بجتے ہیں، اے صنادید قریش! تم اپنی شان وشوکت پر غرور نہ کرو، ان کے اور ان کے جان نثاروں کے فقر وفاقہ اور بے سروسامانی پر خوشی اور تعجب نہ کرو، یہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جناب اسماعیل ذبیح اور حضرت خلیل اللہ علیہما السلام کے فرزند ارجمند ہیں، قربانی ان کو ورثہ میں ملا ہے، یہ عہد کیے ہوئے ہیں کہ اشاعت حق کے لیے وہ جان کی بازی تک لگانے کے لئے تیار ہیں۔

یہ دو کاموں پر مامور من اللہ ہیں، یا خود کو اپنے عظیم ربّ عزّ شانہ کے دین پر قربان کریں گے، یا تمہیں قربانی کا بکرا بنا کر بدر وحنین کے کارزاروں میں کاٹ کاٹ کر فنا کر دیں گے، یہ وہ ہستی ہیں کہ جب ہاتھ اوپر اٹھائیں گے صاف آسمان پر بادل لمحوں میں برسنے کے لیے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔

صلى الإله على النبي محمد	★	والآل والأصحاب غرا محجلا

(بوصيري)

چنانچہ ایسا ہوا کفار مکہ کے پچیس (۲۵) رؤساء وصنادید قربانی کے بکروں کی طرح کاٹے گئے، اور میدانِ بدر کا تاریک قلیب ان کے لئے جہنم ثابت ہوا، وہاں سے تاریک رات نے اپنے بستر گول کرنا شروع کیا، آج سارے جہاں میں شرک کچھ نہ کچھ جزوی طور پر ضرور دکھائی دے رہا ہے، مگر حرمین شریفین میں اس کا نام ونشان تک نہیں، یہ ہے ربّ العزّت عزّ وجل کی رات کے جانے پر قسم کھانے کا اشارہ وپیغام۔

تیسری قسم: ﴿وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ﴾ (قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہوجاتی ہے) اور اس کی روشنی

پورے عالم میں پھیل جاتی ہے، اس پر مستزاد یہ کہ صبح کی روشنی خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے جہاں کو جگا لیتی، اور کام کاج کے لئے انہیں تیار، چاق وچوبند کرتی ہے، بڑے لوگ کیا بچوں کو بھی نیند سے اٹھاتی ہے، یہ ہے مثال نور محمدی اور نور اسلام کی، جس نے ایک طرف رات کی تاریکیوں کا خاتمہ کیا، دوسری طرف خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے مشرکوں کی اولاد کو اسلام کی نورانی زندگی عطا کی۔ الحمد للہ کون تھے ہمارے آنکھوں کے نورانی تارے؟

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین موحدوں کی اولاد تھے یا مشرکوں کے؟ خود بھی شرک میں پھلے پھولتے رہے، اور مشرک والدین کی معیت میں شرک کرتے رہے، جب صبح کی جانفزا روشنی آگئی انہیں سب کو بیدار کیا، بیدار ہوئے تو بیدار ہوئے، بیداری کا حق ادا کر کے دنیا والوں کے لیے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

ان کے کارنامے اور قربانی دیکھ کر صبح کی روشنی کے سردار نے ان کے حق میں آنے والوں کو یہ پیغام عنایت کیا، فرمایا: **الله الله في أصحابي لاتتخذوهم غرضاً من بعدي۔ [كنزل العمال]** اے لوگو! تمہیں بار بار ربّ العزّت کا واسطہ پیش کرتا ہوں، میرے بعد میرے جانثاروں کو اپنے بندوقوں کا نشانہ مت بناؤ، یعنی ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ کرو۔ "**فمن أحبهم فبحبي أحبهم ومن أبغضهم فبغضي أبغضهم**"۔ (ان کی محبت میری محبت ہے، اور ان کے ساتھ بغض ودشمنی رکھنے والا میرا دشمن ہی ہوگا) وہ میرے ہیں، میں ان کا ہوں، ہم آپس میں قالب کے اعتبار سے جدا ہیں، روح سب کا ایک ہے۔

میں کہتا ہوں صبح کی روشنی از خود نہیں، یہ سورج کی روشنی سے ہے، جو اس کا استقبال کرتی ہے اس کی آمد کی اطلاع دیتی ہے اس کے بعد آفتاب اپنی کرنوں کے ساتھ طلوع کرتا ہے، یہ سورج شمس نبوت کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، اور اس کی کرنیں شعاعیں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ جماعت ہے۔ **اللّٰھمّ احشرنا معھم۔ آمین**

﴿اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ﴾ (یہ دوزخ بڑی چیزوں میں سے ایک ہے) اللہ ربّ العزّت سبحانہ نے اس جہاں میں کتنے بے شمار کارخانے پیدا کئے؟ اور بے شمار جنود ولشکر پیدا کئے، یہ جہنم، یہ سقر، ان کارخانوں میں سے کوئی ایک بڑا کارخانہ ہے، اس کی بڑائی کا اندازہ اس سے معلوم ہوگا کہ انیس طاقتور فرشتے اس پر ڈیوٹی دیتے رہتے ہیں، یہ فرشتے اتنے بڑے عظیم الجثہ ہیں کہ ان کے کندھوں سے کانوں تک کی دوری اور مسافت ایک ہزار سال کی مسافت کے برابر ہے، کفار مکہ اور ابو جہل وغیرہ نے فرشتوں کو اپنے اوپر قیاس کر کے کہا تھا کہ جہنم کے انیس فرشتوں کو ہم قابو

کر کے عاجز کریں گے، انہوں نے ہٹ دھرمی اور تعصب کی بنیاد پر یہ کہا تھا، ربّ العزّت نے ان پر واضح فرمایا کہ جہنم کے داروغے انسان نہیں جن کا تم مقابلہ کرسکو، بلکہ یہ فرشتے ہیں، اور نہایت بڑے زبردست قوت والے ہیں، تم تو کیا سارا جہاں مل کر ان میں سے کسی ایک کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے مشرکین مکہ کی ذلت و رسوائی کا جب فیصلہ فرمایا تو ان کے جرار اور مسلح لشکر کو چند بے سروسامان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر کے ذریعہ رسوا کن شکست دے کر تہہ بالا کر دیا، جہاں کفار قریش کے بڑے بڑے صنادید سب کام آئے اور مارے گئے، اللہ ربّ العزّت نے جس طرح عیسائی بادشاہ ابرہہ اشرم کے لشکر کو ابابیل جیسے کمزور پرندوں کے ذریعہ تباہ و برباد کیا، اسی طرح مشرکین مکہ کے ایک ہزار لشکر کو تین سو تیرہ نہتے مجاہدوں کے ذریعہ تباہ و برباد کیا۔

شان خداوندی کا اندازہ لگائیں کہ قریش کے قائد و سرغنہ ابوجہل جو کہ سر سے پاؤں تک لوہے کے ذرہ میں چھپا ہوا تھا اور نیزہ، تلوار، خنجر وغیرہ کے ساتھ مسلح تھا، اور چاروں طرف نوجوانوں نے اسے اپنی حفاظت میں لیا ہوا تھا اور کئی لوگ اس کی حفاظت پر مامور بھی تھے، مگر اس کے باوجود دو یتیم چھوٹے، نابالغ بچوں ''حضرت معاذ و معوذ'' (عفراء کے بیٹوں) نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، اور گھوڑے سے گرا کر زخمی کر دیا، اختتامِ معرکہ تک وہ کسمپرسی کے عالم میں سسکیاں لے لے کر تڑپتا رہا اور چیختا رہا، حتیٰ کہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جا کر اس کی گردن پر پیر رکھا اور اسے ذبح کر کے جہنم رسید کیا، ''**فخسر الدنیا والاٰخرۃ**'' یہ ان سب کا سردار تھا، جو دو یتیم، نابالغ بچوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور قتل ہوا، یہ ہے مقام عبرت۔

﴿نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ﴾ (یہ سقر یہ جہنم انسانوں کو ڈرانے والی ہے) جیسے پہلے فرمایا: ﴿لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾﴾ جس طرح خواجہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بشیر و نذیر ہے اور نذیر کا معنی ہے: ''ڈرانے والا، خبردار کرنے والا'' شروع سورت میں فرمایا تھا: ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾﴾ (اٹھو! لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤ، اور انہیں جہنم کے عذاب سے ڈراؤ اور خبردار کرو)۔ یہاں تو نذیر جہنم کی صفت ہے جو کہ لوگوں کو ڈراتی ہے، خبردار کرتی ہے کہ میرا عذاب ناقابلِ برداشت اور بڑا سخت ہے، میرے عذاب سے بچنے اور نجات پانے کا واحد ذریعہ ایمان ہے، جو ایمان لائے گا وہ میرے عذاب سے محفوظ رہے گا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں ﴿اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾﴾ سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کا پروگرام اور عالمگیر ﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ انس وجن اور تمام عالم کے لیے نبوت عامہ مراد ہے۔ اِنَّهَا کی ضمیر اسی نبوت عامہ جامعہ کی طرف راجع ہے، اور ﴿نَذِيۡرًا لِّلۡبَشَرِ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی صفتِ انذار مراد ہے، یہ معنی بہتر ہے۔ پس اس توجیہہ پر ﴿اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ﴾ کے معنی ومطلب یہ ہوں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت عامہ ایک بڑی چیز ہے، یعنی کارخانۂ قدرت کی بڑی چیزوں میں ایک بہت بڑی چیز ہے، اور بڑائیوں کی حامل بھی ہے۔

نبوت کی کبریٰ ہونے کی وجوہات:

(۱) اس کی بڑائی کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ نبوت قیامت تک کے لئے ہے، اور پھر بین الاقوامی ساری اقوام اور تمام جہاں والوں کے لئے ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت جنات کے لیے بھی ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اس نبوی پروگرام سے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کو وہ عظیم فائدے حاصل ہوئے جس کا ایک مخصوص ریکارڈ موجود ہے، اور مزید قیامت تک اس کے فوائد اور فیوض وبرکات ہمیشہ جاری رہیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ تمام نبوتوں کے فیوض وبرکات سب مل کر بھی اس نبوت کے ساتھ برابر نہیں ہو سکتے۔ واللہ أعلم وعلمه أتم وأعظم

﴿لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّتَقَدَّمَ اَوۡ يَتَاَخَّرَ﴾ (پس تم میں سے جو چاہتا ہے اس پروگرام کو لے کر آگے بڑھے یا پیچھے ہٹ جائے) دین میں کیا زبردستی ہے؟ جو چاہے اپنی مرضی سے اسلام قبول کرے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے، یہ کارِ دین یوں ہی اپنے عزم کے ساتھ بڑھے گا، اللہ ربّ العزّت کا وعدہ ہے کہ وہ اسے چار دانگ عالم میں پھیلائے گا، کسی کی مخالفت سے یہ سلسلہ نہ ختم ہوگا اور نہ ہی کمزور یا بند ہوگا، جیسے کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ﴾ [الصف: ۹] (وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے)۔

اللہ تعالیٰ نے یہ پروگرام ہر حال میں آگے بڑھا کر اسے عام کرنا ہے، جس کی قسمت میں ہدایت ہو وہ اپنی رضا ورغبت کے ساتھ اس کو قبول کرے اور آگے بڑھے، جنت کے دخول تک بڑھتا چلا جائے، جیسے سینکڑوں قریشیوں نے ایسا ہی کیا، دھڑا دھڑ آتے گئے اور سلسلہ میں شامل ہوتے گئے، حتیٰ کہ اسی ولید بن مغیرہ کے چاروں بیٹے فتح مکہ

سے پہلے برضاوخوشی اسلام لے آئے، اور جن کے مقدر میں ہدایت نہیں تھی وہ پیچھے ہٹتے گئے اور محروم ہوئے۔

یہ سلسلہ دونوں طرف سے جاری رہا، فتح مکہ کے بعد تقریباً پورے عرب میں ایک حد تک ﴿ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ﴾ [النصر: ۲] (اور تم دیکھ لوگے کہ اللہ کے دین میں لوگ فوج درفوج داخل ہوں گے) کی کیفیت پیدا ہوگئی، اور پریشانیوں کا ازالہ ہوتا گیا۔ الحمدللہ علی ذٰلک۔ ہر زمانہ میں یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، آگے بڑھنے والے سعادت پائیں گے اور دخول جنت تک کی کامیابی کے ساتھ ہم کنار ہوں گے، پیچھے ہٹنے والے ناکام رہیں گے، اور ﴿سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ﴾ کا حقدار ہو جائیں گے۔

﴿کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ رَہِیۡنَۃٌ﴾ (ہر نفس اپنی کمائی اور عمل کے ساتھ پھنسا ہوا ہے اور مرہون و گروی ہے)۔ ﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ﴾ [الزلزال: ۸] (جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا) کون نہیں جانتا کہ کرنے والا نہ کرنے والے کے ساتھ برابر نہیں ہوتا؟ سب جانتے ہیں کہ آگے بڑھنے والا منزل مقصود تک پہنچتا ہے اور پیچھے رہنے والا وہیں کا وہیں رہے گا، کسی کی نہ محنت ضائع ہوگی، نہ اسے کوئی خسارہ ہوگا اور بغیر محنت مفت میں نہ کسی کو کچھ ملے گا، اور نہ ہی آگے بڑھنے والوں میں شمار ہوگا۔

﴿اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡیَمِیۡنِ﴾ (مگر داہنی طرف والے (نیک لوگ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ازل میں حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں ہاتھ اور دائیں کندھے سے سفید نورانی شکلوں میں پیدا ہوئے، اور دنیا میں راست بازی کے ساتھ دائیں اعمال کے ساتھ مصروف رہے حتی کہ قیامت کے روز ان کے نامہ اعمال بھی دائیں ہاتھ میں انہیں دے دئے جائیں گے، اور دائیں طرف کی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے، یہی لوگ ''اصحاب الیمین'' کہلائیں گے، اور کامیاب رہیں گے، اگر انہیں دنیا میں کوئی دیکھنا چاہے تو یہاں بآسانی ان کی شناخت ہوسکتی ہے کہ پوری زندگی اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ طاعات و بندگی اور توحیدِ الٰہی کے ساتھ منسلک معلوم ہوتے ہیں، یہ لوگ جنتوں میں پہنچ کر ﴿عَلَی الۡاَرَآئِکِ یَنۡظُرُوۡنَ﴾ [المطففین: ۲۳] (تختوں پر بیٹھ کر نظارہ کریں گے)۔ پھر:

﴿یَتَسَآءَلُوۡنَ عَنِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ﴾ پیچھے ہٹنے والے اصحاب الشمال سے پوچھیں گے، جنہوں نے پیغمبر کا مقابلہ کیا تھا، انہیں مجنون وساحر کہہ کر مخالفت کیا تھا، اور قرآن کو انسانوں کا کلام کہا تھا، انیس (۱۹) فرشتوں پر گرفت کرنے کا سوچا تھا، یہ ہیں ''اصحاب الشمال'' صلب آدم علیہ السلام کے بائیں حصے سے سیاہ شکلوں میں پیدا ہوئے، دنیا میں

سیاہ کار رہے، اسی پر مرے اور بائیں ہاتھوں یا پیٹھ کی طرف سے نامہ اعمال وصول کئے، بائیں ہاتھ کی جہنم میں گرے۔

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴾ استفسار ہو رہا ہے: (آج تم کو کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟) تمہیں یہ سزا کیوں ملی؟ تم کیوں برباد ہوئے؟ دراصل پوچھنے والے جانتے ہیں، مگر اتمامِ حجت کی خاطر پوچھتے ہیں، اور ان کی زبان سے ان کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو وہ کھل کر اقرار کریں گے اور اپنے آپ کو ملامت کریں گے، جبکہ ملامتی کا وقت گزر چکا ہے، اب فائدہ نہیں۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے ﴿۴۳﴾ اور ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے ﴿۴۴﴾ اور ہم باطل میں گھسنے والوں کے ساتھ گھستے تھے ﴿۴۵﴾ اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے ﴿۴۶﴾ یہاں تک کہ ہمارے پاس یقینی بات موت آگئی ﴿۴۷﴾ پس ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کام نہیں آئے گی ﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

مجرمین نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے ایک ایک جرم کی تفصیل بتادی، اللہ رب العزت کا قانون جسے قانونِ الٰہی اور قانونِ شرعی کہتے ہیں ایسا پاکیزہ، پر از انصاف قانون ہے جس میں ظلم وزیادتی کا وجود تو در کنار، بلکہ تصور تک نہیں ہوتا، قیامت کے روز فیصلہ کرنے والا وہ خود ہی ہوگا، پھر رحم وکرم کے وہ بے پایاں مناظر دیکھنے میں آئیں گے، جس کی کوئی حد واندازہ اور شمار نہیں ہوگا، سارے گناہوں کی مغفرت فرمائیں گے، اور خزانہ عفو وکرم سے لاکھوں جرائم سے درگزر فرما کر سیآت پر حسنات کا پردہ ڈالیں گے۔

مگر ایک بنیادی مرکزی جرم ایسا ہے کہ دنیا ہی میں بزبان انبیاء ورسل علیہم السلام واضح کیا ہے کہ اس کی مغفرت قیامت کے انصاف کے قانون میں ممکن نہیں، کاش اس ناعاقبت اندیش انسان اگر اس شرک سے کنارہ کشی کرتا اور توحید کی گود میں پرورش پایا ہوتا، تو جہنم کے دخول سے نجات حاصل کرتا، جب شرک کی وجہ سے وہ جہنم میں جائے گا، تو

دوسرے گناہوں کی مغفرت سے بھی محروم رہے گا، اگر کفر نہ ہوتا تو سارے دوسرے جرائم معاف ہو سکتے، کفر نے ان کو بھی نا قابلِ معافی بنا دیا، اور کافر کے تمام حسنات بھی کام نہیں آئے، جب بنیادی طور پر ایمان ثابت ہوگا، تو مؤمن کے ذرہ ذرہ حسنات بھی کام آئیں گے، اور بڑے بڑے جرائم بھی قابلِ عفو و درگزر قرار پائیں گے۔

جہنمی کافر اپنے دخولِ جہنم کے اسباب بیان کرتے ہوئے شرک کے ساتھ باقی جرائم کا بھی تذکرہ کر رہا ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، زکوٰۃ و صدقات بھی نہیں دیتے تھے، بری صحبتوں میں گھس کر گندی مجلسوں میں حق و صداقت کی تکذیب کرتے تھے، انبیاء و رسل علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کا مذاق اڑا کر استہزاء بھی کرتے تھے، احکام شریعت کو جھٹلاتے تھے، روزِ قیامت اور حیات بعد الموت کا منکر رہتے تھے، بلکہ نفس قیامت ہی کی تکذیب کرتے تھے، یہاں تک موت نے آگھیرا اور خاتمہ کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

میں تو رحمت و مغفرتوں کا مالک ہوں، قیامت کے دن طرح طرح کی شفاعتوں اور سفارشوں کا دروازہ کھول کر اعلان کرتا ہوں، مگر مشرک و کافر جس طرح میری عام مغفرت کا مستحق نہیں، اسی طرح ہر قسم شفاعتوں سے بھی محروم رہے گا، اس کو کسی قسم کی شفاعت کام نہیں آئے گی، گویا کہ کافر نے تمام سہولتوں، خوشحالیوں، مغفرتوں، شفاعتوں، کا دروازہ اپنے اوپر خود بند کر دیا۔

یہ ساری تباہی صرف اس وجہ سے آئی ہے کہ: ﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ﴾ اصل سرمایہ دخول جنت کا ایمان ہے، اور دخولِ جہنم کا سبب کفر و شرک ہے، ایمان جیسی کوئی نعمت نہیں، کفر جیسا کوئی جرم نہیں، اگر کسی کافر کے لئے بالفرض سارے انبیاء و رُسل علیہم السلام بشمول سارے جنتیوں کی سفارش کریں تو کوئی امید نہیں۔ اے بدبخت! نا عاقبت اندیش انسان! تو سب کچھ کر سکتا تھا مگر کاش اپنے ربّ کے ساتھ بغاوت نہ کرتا۔

آگے قرآن پاک اور انبیاء و رُسل علیہم السلام علماء و صلحاء کی روزمرہ نصیحتوں سے اعراض کرنے والوں کا بیان ہے، فرمایا:

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ
امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَن شَاءَ
ذَكَرَهُ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

ترجمہ: پس ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں؟ ۴۹ جیسے کہ وہ جنگلی گدھے ہیں ۵۰ جو بھاگ رہے ہیں شیر سے ۵۱ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے ۵۲ ہرگز نہیں! بلکہ یہ لوگ آخرت سے بے خوف ہیں ۵۳ ہرگز نہیں! یہ قرآن تو سراسر نصیحت ہے ۵۴ جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے ۵۵ اور لوگ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے وہی ہے اہلِ تقویٰ و اہل مغفرت ۵۶

معارف ومنازل

سورت کے شروع میں ارشاد ہوا تھا: ﴿قُمْ فَأَنذِرْ﴾ اب آخری حصہ میں دوبارہ ''انذار'' کا ذکر ہو رہا ہے، یہ امر باعث تعجب ہے کہ یہ لوگ نصیحت اور نصیحت گروں سے کیوں دور بھاگ رہے؟ اور اعراض کر رہے ہیں؟ اگر نصیحت کرنے والا کسی سے کچھ مال کا مطالبہ کر رہا ہو، تو اس سے بھاگنا معقول ہے، مگر یہ نصیحت گر انہیں سب کچھ دینے اور ہزاروں منفعتوں، بخششوں اور نعمتوں کا وعدہ دے رہا ہے، اور ہزاروں مضرتوں سے بچنے کا عہد و پیمان کر رہا ہے، اور یہ نصیحت گر ساری عمر ان میں رہا ہے، بے عیب و بے لالچ ہے، وعدہ کا پکا ہے، اس کے باوجود نہ معلوم یہ لوگ کیوں اعراض کر رہے ہیں؟ یا بے علمی کی وجہ سے یا نادانی جہالت کی وجہ سے یا ہٹ دھرمی اور غرور کی وجہ سے؟

افسوس کا مقام ہے کہ یہ لالچی انسان صبح و شام فائدہ و منفعت اور خوشحالی کے پیچھے بھاگ رہا ہے، اور اپنے عارضی مفاد کی خاطر جدو جہد کر رہا ہے، لیکن قرآن پاک اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اور منفعت بخش نصیحتوں سے اعراض اور پہلو تہی کر رہا ہے، کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟ ناعاقبت اندیش ہیں؟ اپنی جانوں کے بدخواہ دشمن ہیں؟ ہٹ دھرم متکبر و مغرور ہیں؟ ہوسکتا ہے یہ سب کچھ ہوں، مگر آخری شق یقینی ہے۔

قرآن حکیم تذکرہ ہے، پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم مُذَكِّر و نصحیت گر ہے، انہیں بار بار یاددہانی کرتے چلے جا رہے ہیں، مگر یہ ازلی بدبخت اعراض کرنے پر مصر و بضد ہیں۔ ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ﴾ اعراض کرنے کا یہ حال ہے: ﴿كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ﴾ حبشی زبان میں ''قَسْوَرَة'' شیر کو کہتے ہیں، قرآن مجید کو شیر کہا گیا، اور مشرکین کو گدھا اور وہ بھی جنگلی گدھا، بیوقوف، ناداں اور ناعاقبت اندیش ہیں، جیسے کہ جنگل کے بادشاہ، یعنی گرج دار شیر کی آواز سن کر جنگلی گدھے بھاگ جاتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ قرآن کی آواز سن کر گدھوں کی طرح بھاگ جاتے ہیں۔

یہ تشبیہ صرف بھاگنے میں ہے، ورنہ گدھوں کا شیر سے بھاگنا معقول ہے، کیونکہ وہ ان کا دشمن ہے، انہیں وہ چھیر پھاڑ کر تباہ کر دیتا ہے، یہاں وہ بات نہیں، یہاں تو دعوت ﴿لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ﴾ [الأنفال: ۲۴] (اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی دے) کی طرف ہے کہ قرآن پاک تمہیں اصلی حیات اور خوشحالیوں و مسرتوں کی طرف بلاتا ہے، کاش یہ لوگ نصیحت قبول کرتے اور اپنی غفلتوں سے باز آجاتے۔ آگے اس کی وجہ بیان فرمارہے ہیں جو کہ غرور و تکبر پر مبنی ہے:

﴿بَلۡ یُرِیۡدُ کُلُّ امۡرِیًٴ مِّنۡہُمۡ اَنۡ یُّؤۡتٰی صُحُفًا مُّنَشَّرَۃً﴾ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے، کبھی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آسمانی فرشتہ لائیں، وہ ہم سے بات کرے، ورنہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، ﴿حَتّٰی نُؤۡتٰی مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] (جس طرح کی رسالت خدا کے پیغمبروں کو ملی ہے جب تک اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے)۔ ہمیں بھی ایسی کتاب دی جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو دی جاتی ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نام پر آسمان سے کتاب نازل کریں، یا ہمارے سامنے آسمان پر جائیں ہمارے نام پر کتاب نازل کرائیں۔

بہرحال! ''دل ناخواہ راعذر و بہانہ بسیار، یا خوئے بدرا بہانہ بسیار''۔

ہزاروں بے ربط و بے ڈھنگ مطالبات تھے، جواب میں ارشاد فرمایا:

''کَلَّا'' یہ بات بعید از عقل و قیاس ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا، کیا آسمانی کتاب میرے دائرۂ اختیار میں ہے؟ میں جسے چاہوں دیدوں؟ کیا ہر شخص رسولوں علیہم السلام کی طرح مقدس ہے کہ اسے کتاب دی جائے؟ اگر ہر شخص کے نام پر کتاب ہو، تو پھر رسولوں علیہم السلام کی آمد کا کیا مطلب؟ کیا ہر شخص میں وحی کی آمد کی استعداد و برداشت ہے؟ کیا کوئی آسمانی خطاب کو برداشت کرسکتا ہے؟ آگے فرمایا کہ اصلی بات یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں، تب ہی تو نامعقول مطالبہ کررہے ہیں: ﴿کَلَّا ؕ بَلۡ لَّا یَخَافُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ﴾ دراصل بات یہ ہے کہ لوگ آخرت پر یقین ہرگز نہیں رکھتے، اسی وجہ سے آخرت کی گرفت سے بے خوف ہیں، اور جہنم میں جانے والوں نے خود یہی جواب دے دیا کہ: ﴿وَ کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ﴾ (اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے)۔

جب انسان کی نظر محاسبے پر نہ ہو تو کیا کچھ نہیں کرے گا؟ جب محاسبہ کا عقیدہ یا خوف دامن گیر ہوگا تو ہر قدم پر احتیاط کرے گا، دنیا میں دیکھتے ہیں جس ملک میں محاسبہ کا قانون لاگو ہے، اور پابندی سے محاسبہ کا عمل جاری ہے وہاں

رشوت اور کرپشن کے نام سے لوگ واقف ہی نہیں، اور جہاں جنگلی قانون ہو، محاسبہ کا نام ونشان نہ ہو، یا محض برائے نام ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں کیا کچھ نہیں ہوتا، بجٹ منظور ہونے سے پہلے لوگوں نے اسے کھا کے ہضم کیا ہوگا، صرف کاغذی کارروائی پر ملک بدحالی اور اُفلاس کے ساتھ زندہ رہے گا۔

ربّ العزّت عزّاسمہ نے قیامت کا جو محاسبہ رکھا ہے اسی سے دنیا میں امن وسکون ہے، حلال وحرام، جائز و ناجائز، عمل و بے عملی کا دور دورہ نہیں ہے، اور تمام حقوق اللہ وحقوق العباد کی احیاء وترقی ہے۔" **حسبنا اللہ ونعم الوکیل**۔

جنگیں قوت سے نہیں، تقویٰ سے لڑی جاتی ہے:

تاریخ اسلام میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے کفر کے خلاف زبردست جنگیں لڑی ہیں، جن میں دو جنگیں بڑے نمایاں ہیں: ''جنگ قادسیہ'' ایرانیوں کے خلاف، اور ''جنگ یرموک'' رومیوں کے خلاف۔ یہ دونوں عظیم تاریخی جنگیں امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت میں لڑی گئیں، دونوں معرکوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مخالف بڑی بڑی بے پناہ قوتوں کو اپنے بے سروسامانی اور قلیل فوجی تعداد کے باوجود قوت ایمانی کے ذریعہ وہ شکست فاش دی، اور تباہ کن ہزیمت سے دوچار کیا، جس کی تسلیم کرنے سے عقل انسانی انکار کرتی ہے۔ نو (۹) لاکھ ساٹھ ہزار رومی فوج پورے ساز وسامان اور آلات جنگ سے مسلح یہاں سے صرف چھتیس ہزار فرشتہ صفت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے اطمینان کے ساتھ تمام ظاہری اسباب سے ہاتھ خالی صرف تقویٰ اور اعتماد علی اللہ کی بنیاد پر میدان میں اترے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ جنگیں تقویٰ کی بنیاد پر لڑی جاتی ہیں، نہ کہ ظاہری و مادی اسباب ووسائل کے ساتھ۔ قادسیہ میں مسلمانوں کو فتح ہوگئی، ایرانی مجوس مارے گئے، باقی بھاگ گئے، شہر خالی ہوا، رات کو چاروں طرف پہرہ دار بٹھائے گئے۔

ایک صحابی کا عظیم کارنامہ:

بادشاہی محل پر کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہرہ دے رہے ہیں، اچانک مٹی کے ڈھیر میں آہنی بڑا صندوق نظر آیا، صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر دیکھا تو حیران ہوا، مال غنیمت پہلے جمع ہوا تھا اور امیر لشکر حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس رکھا ہوا تھا، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے حکم کا انتظار ہو رہا تھا۔

جب سپاہی صحابی نے صندوق کھولا تو دیکھا کہ قیمتی جواہرات سے بھرا ہوا ہے، اس میں اتنا مال سونے جواہرات تقریباً بیس کلو کے قریب ہیں، یہ رات کا وقت ہے، دیکھنے والا کوئی نہیں، اچھا موقع ہے کیا بہتر نہیں ہوگا کہ صندوق سے مال نکال کر اپنے سامان میں رکھ دے اور خالی صندوق کہیں پھینک دے، یا مٹی میں دفن کردے، دیکھا بھی کسی نے نہیں، صرف ایک ہی دانا بینا، لطیف وخبیر نے دیکھا ہے، وہ اتنا حلیم پردہ پوش ہے کہ وہ کسی کو نہیں بتادے گا، پردہ پوشی اس کی عادت وشان ضرور ہے، مگر وہ ایک یوم حساب ومحاسبہ کا مالک بھی ہے، شاید قیامت کے دن پوچھے، یا وہاں بھی نظر انداز کردے، جیسے دنیا میں ہر وقت کرتا رہتا ہے۔

شیطان اور نفس نے ایسا ہی کہا، ادھر سے اسی کشمکش میں اسے اللہ تعالیٰ خصوصیت کے ساتھ یاد آیا، قیامت سامنے آیا، اور جن ہاتھوں سے خواجہ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصافحہ اور بیعت کی تھی، انہی ہاتھوں سے اس خزانہ کو اٹھا کر امیر لشکر کے خیمہ تک پہنچایا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ نے آواز سن کر سعد کو بتادیا، سعد رضی اللہ عنہ (کچھ مریض تھے، عرق النساء کی مرض میں) نے پوچھا کون ہو؟ کیا کام ہے؟ کہنے لگے: خزانہ لایا ہوں، اندر بلایا، مال دیکھا، حیران ہوئے، کہنے لگے: کسی کو ساتھ کرکے لاتے، اتنا وزن اکیلا کیوں اٹھایا؟ کہنے لگے کہ میرے نزدیک کوئی آدمی نہ تھا، اچھا! آپ کو جب یہ مال ملا تھا، وہاں دوسرا کون تھا؟ کہنے لگے: اللہ پاک کے علاوہ کوئی نہ تھا، بہت اچھا! بھائی آپ نے اللہ پاک اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راضی کیا، اور اپنی آخرت کا معاملہ صحیح رکھا، میں آپ کے اس عظیم کارنامے سے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اطلاع کروں گا، کہنے لگے: نہیں! جس کی رضاء میں میں نے جوامانتداری کا ثبوت دیا اس کو معلوم ہے اور بس، مزید کچھ نہیں چاہئے۔۔ یہ ہے قرن اول کے مسلمانوں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عالی شان کارنامے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہوکر ☆ ہم خوار ہوئے تارک قرآن ہوکر

(اقبالؒ)

﴿كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ ہرگز ایسا نہیں، کہ ہر شخص کے پاس الگ صحیفہ ہو، یہ قرآن ایک نصیحت اور یاددہانی ہے، جو چاہے اس کو تسلیم کرلے، کیونکہ صحیفہ کسی فرد کے لئے نہیں ہوتا، صحیفہ کا مقصد تو امت کی اجتماعی تعلیم وتربیت ہی ہوتا ہے، اور اس کی تعلیم اجتماعی ہوتی ہے، ہر فرد کے لئے علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ مقصد پوری امت کی اجتماعیت اور جماعت بندی کے لئے موزون اور مقرر ہے، جو کافروں کا مطالبہ ہے، وہ غلط اور بے بنیاد

اور اجتماعیت کے لئے نقصان دہ اور غیر ممکن ہے، قانون کبھی شخصی نہیں ہوتا، وہ پورے پبلک کے لئے ہوتا ہے، اور اجتماعیت اور شخصی طور پر سب پر لاگو ہوتا ہے، وہ بادشاہ کون ہوگا؟ جو ملک کے ہر فرد کے لئے الگ الگ قانون بنائے اور تجویز کرے؟ کوئی نہیں، تو پھر خالق کائنات سے ایسے ایسے بھونڈے مطالبات کی کیا گنجائش؟

﴿وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (ہر شخص اس خزانہ رحمت سے نصیحت حاصل نہیں کرسکتا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے) اور اللہ تعالیٰ کے چاہنے کے لئے قرآن پاک چند اصول بیان کئے ہیں: وہ یہ کہ جو شخص اپنی مرضی اور اختیار سے ہدایت کا طالب ہوگا اسے ہدایت حاصل ہوگی، اور جو شخص اپنی مرضی سے ہدایت طلب نہیں کرے گا اسے یہ نعمت میسر نہیں آئے گی، حتی کہ صاحب وحی کے چاہنے سے بھی کچھ لوگوں کو ہدایت حاصل نہیں ہوئی، جبکہ خود ان کے اندر یہ طلب موجود نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں کے حصول کے لئے طلب وارادہ اور چاہت کو لازم بتایا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنکبوت: ٦٩] (اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم اُن کو ضرور اپنے راستے دکھادیں گے)۔ ﴿جَاهَدُوْا فِيْنَا﴾ پر ہدایت کو مرتب فرمانے کا وعدہ ہے، اگر بغیر طلب ہدایت کا حصول ممکن ہوتا تو دنیا میں کوئی گمراہ باقی نہ رہتا، سب کو ہدایت راس آتی، پیاسا آدمی پانی کے پاس جاتا ہے، اس کی طلب و خواہش کے بغیر پانی اس کے پاس چل کر نہیں آتا، اور ہدایت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا، رات، دن ہر ساعت کھلا ہے، بشرطیکہ کوئی اسے چاہے اور طلب کرے، یہ کوئی مدرسہ نہیں کہ وقت مقررہ کے بعد داخلہ بند ہوتا ہے، پھر کسی کو داخلہ نہیں ملتا، یہ ایک خدائی نعمت ہے، جس کے حصول وتحصیل کے لئے نہ وقت مقرر ہے، نہ کوئی فیس و مالی معاوضہ، البتہ! طلب شرط ہے، بغیر طلب کے امکان نہیں۔

﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ﴾ (وہی تقویٰ و مغفرت کا اہل ہے) اس سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے، جو کہ ہر خیر کا اہل، یعنی حقدار و مالک ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ عزّ وجل شانہ نے فرمایا: أَنَا أَهْلُ أَنْ أُتَّقَى فَمَنِ اتَّقَانِيْ فَلَمْ يَجْعَلْ مَعِيَ إِلٰهًا فَأَنَا أَهْلُ أَنْ أَغْفِرَ لَه۔ [حديث قدسي، ترمذی] میں ہی اس کا اہل (مالک حقدار) ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے، اور تقویٰ اختیار کیا جائے، پس جب بندہ مجھ سے تقویٰ اختیار کرے گا، مجھ سے ڈرے گا اور کوئی شرک نہیں کرے گا تو میں اس کا اہل ہوں کہ اسے بخش دوں (معاف کروں)۔

دراصل تقویٰ کے سات درجے ہیں: اول اور سب سے مقدم اور ضروری درجہ یہ ہے کہ آدمی کفر وشرک نہ

کرے، ہر قسم کی شرک سے پرہیز کرے۔ شرک کیا ہے؟ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص افعال میں کسی غیر کو شریک نہ کرے، صرف خدا کو ایک ماننے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، ایک ماننے کے ساتھ اس کے تمام دیگر صفات مختصہ وافعال مخصوصہ میں بھی اس کو ایک اور اکیلا مانو، اس کے افعال میں کسی غیر کو شریک نہ کرو۔

آج کل ''توحید'' لوگوں نے خدا کو ایک ماننے کا نام دیا ہوا ہے، ہزاروں مزاروں اور درگاہوں پر سجدہ کررہے ہیں، مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو بتوں پر تقسیم کیا، اور انہیں کارساز ومشکل کشا سمجھا، ان نام نہاد مسلمانوں نے چار قدم آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی صفات پیغمبروں، اولیاء، بزرگوں، گدی نشینوں اور سیدوں پر تقسیم کیں، اگر انہیں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے دو تو کوئی پرواہ اور خوف نہیں کریں گے، لیکن مرشد کا نام آیا تو بے ہوش وبے خود ہوجائیں گے، یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور بچائے۔ آمین

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توحید کے چار درجات ہیں: ان میں سے دو درجوں میں تو سب مؤمن، کافر، مشرک وغیرہ سارے متفق ہیں، مگر باقی دو درجوں میں کفار ومشرکین اہل ایمان سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔

درجات توحید:

(۱) توحید کا پہلا درجہ واجب الوجود کا ہے، اس پر سارے اہل ادیان متفق ہیں کہ واجب الوجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، باقی تمام مخلوقات کا وجود عطائی ہے، اور سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۲) دوسرا درجہ صفت خلق ہے، کسی سے بھی پوچھیں کہ تمام کائنات کا خالق کون ہے؟ جواب یہی آئے گا کہ تمام علویات وسفلیات کلیات وجزئیات کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بس۔

(۳) تیسرا درجہ تدبیر ہے، یہاں آکر کافر ومشرک اہل ایمان سے علیحدہ ہوجاتے ہیں، کیونکہ کافر ومشرک مدبر بتوں، اصنام، سیاروں، ستاروں کو مانتے ہیں، اور ہر لمحہ اپنی حاجتیں انہی سے طلب کرتے ہیں، اور انہیں کے آستانہ پر سجدہ کرتے ہیں، پیر پرست وقبر پرست اپنے پیروں اور ان کی قبروں، مزارات کی پوجا کرتے ہیں، اور ان سے حاجتیں مانگتے رہتے ہیں، پس بت، صنم، ستارہ، مزار قبر وغیرہ، ایک ہی طرز کے معبود کہلاتے ہیں، یعنی غیر اللہ، لہٰذا ان میں کوئی فرق متصور نہیں، اور سارے باطل ہی شمار ہوں گے۔

(۴) چوتھا درجہ عبادت وبندگی کا ہے، عبادت انتہائی درجہ تعظیم کا نام ہے، یہاں پر لوگ عبادت لغیر اللہ کی

وجہ سے کافر ومشرک ہوجاتے ہیں، اور قولی، فعلی، بدنی اور مالی عبادت جو کہ حسب فرمان: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ [الفاتحة:۴] (تجھ ہی کی عبادت کرتے ہیں، اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور کلمہ طیبہ اسی حقیقت کا ترجمان ہے، پس جو شخص باوجود کلمہ پڑھنے کے اگر غیر اللہ کی عبادت کا مرتکب ہوگا، تو وہ مشرک ہی شمار ہوگا، نہ کوئی مؤمن۔ [تفسير سورة الفاتحة: ص ۱۸۰]

سُورَةُ الْقِيٰمَةِ

مکیۃ آیاتہا ۴۰ رکوعاتہا ۲

سورۂ قیامہ مکی ہے، اس میں چالیس (۴۰) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

نام سورۃ القیمۃ ہے، پہلی آیت میں ''الْقِيٰمَة'' کا کلمہ ہے، سورت کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔

نزول:

اس کا نزول سورۂ قارعہ کے بعد ہے۔

تعداد آیات، وکلمات اور حروف:

اس سورت کی چالیس (۴۰) آیتیں، ننانوے (۹۹) کلمات اور چھ سو باون (۶۵۲) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

ماقبل سورۂ مدثر قیامت کے احوال اور منکرین قیامت پر شدت کے ساتھ زجر وتوبیخ پر مشتمل تھی، اور یہ سورت بھی انہی معانی ومسائل پر مشتمل ہے، مگر زجر وتوبیخ میں قدرے نرمی کے ساتھ، ماقبل سورۂ مدثر میں وحی الٰہی کا بیان تھا، اس سورت میں بھی ابتداء وحی کی کیفیت کا بیان ہے۔

مختصر موضوع:

قیامت کے بارے میں کفار ومشرکین جن شکوک وشبہات میں بری طرح گرفتار تھے اور ہٹ دھرمی وعناد کی

بنیاد پر قیامت کے انکار پر مصر تھے، اس سورت میں کئی قسمیں کھا کر ان کا ازالہ کیا جا رہا ہے کہ جس چیز کو تم محال سمجھ کر اس کا منکر ہو وہ اللہ تعالیٰ کا اٹل و پختہ فیصلہ ہے، اس کا آنا یقینی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے بہت سہل و آسان ہے، اس کے ساتھ قیامت کے وقوع اور اس کی ہولناکیوں کا تفصیلاً تذکرہ ہے، اور قیامت کے وقت جو جو حالات اور کیفیتیں پیش آئیں گی ان کا بیان ہے۔

درمیان میں کیفیت نزول وحی کا تذکرہ ہے، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا تذکرہ ہے کہ جن کے چہرے گلاب کے پھولوں کی طرح بارونق اور تروتازہ ہوں گے، اس کے ساتھ عباد الشیطن (کفار و مشرکین) کے بے رونق اور غبار آلود چہروں کا بیان ہے، پھر مکہ کے ایک معاند مشرک جو کہ سرکشی وغرور اور گمراہی میں مشہور ہے اس کی سرکشی وغرور کا تذکرہ ہے، اور اس کے لئے ویل وتباہی کے اسباب کا تذکرہ ہے، اسی کے ساتھ انسان کی ابتداء آفرینش پر اس کو تنبیہ کرنے کا ذکر ہے، اور اثبات قیامت وحیات بعد الموت کا اثبات ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ﴿۱﴾ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ؕ﴿۲﴾ اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡ نُّسَوِّىَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلۡ يُرِيۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِيَفۡجُرَ اَمَامَهٗ ۚ﴿۵﴾ يَسۡـَٔلُ اَيَّانَ يَوۡمُ الۡقِيٰمَةِ ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ ۙ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الۡقَمَرُ ۙ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ۙ﴿۹﴾ يَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ يَوۡمَئِذٍ اَيۡنَ الۡمَفَرُّ ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ؕ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوۡمَئِذِ الۡمُسۡتَقَرُّ ؕ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الۡاِنۡسَانُ يَوۡمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ؕ﴿۱۳﴾ بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰى نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّلَوۡ اَلۡقٰى مَعَاذِيۡرَهٗ ؕ﴿۱۵﴾

ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ① اور میں قسم اٹھاتا ہوں نفس لوامہ کی ② کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو ہرگز اکٹھا نہیں کریں گے؟ ③ کیوں نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے پور پور کو برابر کردیں ④ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے ⑤ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا؟ ⑥ پس جب آنکھیں چندھیا جائیں گی ⑦ اور چاند بے نور ہو جائے گا ⑧ اور سورج اور چاند کو یکجا کر دیا جائے گا ⑨ انسان کہے گا اس دن کہ اب بھاگ کر کہاں جائے؟ ⑩ خبردار! اب بچاؤ کی کوئی جگہ نہیں ⑪ ٹھہرنے کی جگہ اس دن تیرے

ربّ کی طرف ہی ہوگی⑫ اس دن انسان کو اس سے خبردار کر دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا تھا، اور پیچھے چھوڑا تھا⑬
بلکہ انسان اپنے نفس پر خود بصیرت رکھتا ہے⑭ اگرچہ وہ اپنے کتنے ہی حیلے بہانے کرے⑮

معارف ومنال

اس سورت مبارکہ اور دیگر کئی سورتوں کی ابتداء، اسی طرح دیگر مختلف مقامات میں قسم کے ساتھ "لا" کا کلمہ مذکور ہے یہ "لا" یا تو قسم کی تاکید کے لیے ہے، یا "لا" نافیہ ہے، جس کے معنی نہیں (منفی) کے ہوتے ہیں، دونوں باتیں صحیح ہیں، کیونکہ "لا" کے بعد جو مضمون ہے کفار نے اس کا انکار کیا ہوا ہے۔ کلمہ "لا" سے ان کے انکار کی نفی کرنا مقصود ہے، مثلاً: "لَا اُقْسِمُ" کے بعد قیامت کا ذکر ہے، کفار نے قیامت کا انکار کر کے نفی کردی، تو "لا" نے ان کی نفی کو نفی کر کے قیامت کا اثبات وثبوت بیان کیا۔ اور جو لوگ "لا" کو زائد قرار دیتے ہیں وہ صحیح نہیں۔

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ کے معنی یہ ہوں گے کہ میں قسم اٹھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔

اللہ تعالیٰ کی قسم اور بندوں کی قسم میں بہت بڑا فرق ہے، بندوں کو غیر اللہ کی قسم کھانے کی اجازت اس لئے نہیں کہ یہ شرک کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ کسی چیز کی قسم اٹھانے سے مراد اس چیز کو گواہ بنانا ہوتا ہے، یا قسم کھانے سے اس چیز کا مشاہدہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے، یا قسم اٹھانے سے مقصد اس چیز کی عظمت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، اس وجہ سے غیر اللہ کی قسم جائز نہیں۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ عرب میں آباء اجداد پر قسم کھانے کا رواج تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرما کر کہا کہ غیر اللہ پر قسم مت کھاؤ، یہ حرام ہے۔ اگر قسم کھانا ضروری ہو تو اللہ تعالیٰ کی قسم کھاؤ یا خاموش رہو۔ [بخاري]

مگر اللہ تعالیٰ کی شان جدا ہے، وہ جب کسی چیز کی قسم اٹھاتا ہے تو اس چیز کو بطور گواہ پیش فرماتا ہے، اس کی تعظیم مقصود نہیں ہوتی، یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ سورۂ قلم میں بیان ہوا، وہاں ملاحظہ ہو۔

بہرحال! "لَآ اُقْسِمُ" میں بہتر معنی یہی ہے کہ لام تاکید کے لئے ہو، جس طرح قرآن مجید کے دیگر متعدد مقامات میں مذکور ہے، "لا" نفی کے لئے نہیں، اگرچہ نفی کے معنی بھی صحیح ہیں۔

﴿بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ سے مراد قیامت کا دن ہے، اس کی پوری تفصیل سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کے تحت بیان ہوئی ہے، وہاں قیامت کے چالیس ناموں کا ذکر ہے۔ فلیراجع

﴿وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (قسم اٹھاتا ہوں نفس لوّامة کی)۔ ''لوّامة'' مبالغہ کا صیغہ ہے، (بہت ملامت کرنے والا)۔

نفس کی تین حالتیں:

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ''موضح القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ نفس کی تین حالتیں ہیں: أمارة، لوّامة، مطمئنة۔

(۱) پہلی حالت نفس ''امارہ'' کی ہے یہ حالت عام طور پر بچپن کی ہوتی ہے، جب انسان کھیل کود لہو ولعب کی طرف مائل ہوتا ہے، زیادہ تر انسان کا خیال باطل باتوں کی طرف ہوتا ہے، اس کو ''نفس امارہ'' (سرکش) کہتے ہیں۔

(۲) جب شعور کی منزل آتی ہے تو انسان کا نفس کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور برائی پر ملامت کرتا ہے، اور بعض حالات میں برائی میں مبتلا ہوجاتا ہے، چنانچہ یہ ملامت کرنے والی منزل ''نفس لوامہ'' کی ہے۔

(۳) نفس کی تیسری منزل مطمئنة کی ہے، اگر نفس میں وہ کیفیت پیدا ہوجائے جس سے اسے اطمینان حاصل ہوجائے، قوانین الٰہی کے ساتھ تعلق پیدا ہوجائے، اور برائی سے ہٹ جائے، نہ تو وسوسہ شیطانی اسے برائی کی طرف مائل کرسکے، اور نہ خواہشات نفسانی ہی اسے برائی پر آمادہ کرسکیں، تو یہ ''نفس مطمئنة'' کہلاتا ہے۔ [موضح]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ہر نفس ''نفس لوامہ'' بن جائے گا، نیکوکار بھی اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ دنیا میں اور زیادہ نیکی کیوں نہ کرلی؟ اور بدکار بھی اپنے نفس کو ملامت کرے گا کہ دنیا میں برائی کو کیوں نہیں چھوڑا؟ اگر میں نے نیکی کو اختیار کیا ہوتا تو آج میرا یہ حشر نہ ہوتا۔ مقصد یہ کہ نفس لوّامہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ نیکی کی طرف رجحان ہوتا ہے، اور برائی پر نفس ملامت کرتا ہے، نفس لوامہ کو قیامت کے ساتھ ذکر کرنے کا یہی مقصد ہے کہ انسان قیامت کی ہولناکی سختی سے ڈر جائے، اور برائی سے بچ جائے، اسی طرح نفس لوّامہ بھی برائی اختیار کرنے پر تنبیہ کرتا ہے، گویا کہ نیکی پر چلنے اور برائی سے بچنے پر نفس لوامہ اور قیامت دونوں برابر کے شریک ہیں۔

﴿اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ﴾ (کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟) جس طرح کافر مشرک کہتے ہیں: ﴿ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ [النازعات:۱۱] (جب ہماری ہڈیاں بوسیدہ ریزہ ریزہ ہوجائیں گی) یا ﴿قَالَ مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظَامَ وَهِيَ رَمِيۡمٌ﴾ [یس:۷۸] (کہنے لگا کہ (جب)

ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا؟)۔ ﴿ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ [السجدة: ١٠] (جب ہم زمین میں ملیامیٹ ہوجائیں گے، تو کیا ازسرنو پیدا ہوں گے؟)۔ ﴿ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا﴾ [الإسراء: ٤٩] (جب ہم (مرکر بوسیدہ) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہوجائیں گے)۔

یہ سب ان کے ظنون وشکوک ہیں، جسے قرآن مجید نے مختلف مقامات پر متعدد الفاظ میں بیان کیا۔ کبھی ﴿هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ﴾ [المؤمنون: ٣٦] (جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (بہت) بعید اور (بہت) بعید ہے)، کہا کرتے تھے، بڑے ناداں تھے، جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ﴾ (ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے پور پور اور بند بند کو درست کردیں)۔ ﴿قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ﴾ [یس: ٧٩] (کہہ دو کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا، اور وہ سب کا پیدا کرنا جانتا ہے)، پور پور بند بند جوڑ جوڑ کا، تقریباً ایک ہی مطلب ہے کہ اس کو دوبارہ اسی حالت پر لے آئیں گے جس طرح پہلے وہ دنیا میں تھا، یہ کیا مشکل ہے؟ ابھی تک انہیں قدرت کے کمالات کا اندازہ نہیں، جو واحد لاشریک لہٗ ایک مردار پانی کے نطفے سے ہڈیاں، پوست، گوشت، عروق وغیرہ ہزاروں چیزوں کی تخلیق وترتیب پر قادر ہے ایک ہی لفظ کن کے حکم سے فَیَکُوْنُ کی تنظیم کرسکتا ہے، یہ کیا ہے کہ اس موجودہ ڈھانچہ کو دوبارہ منظم کرکے جوڑ دے؟

”بنان“ (پوروں) کی تخصیص کیوں؟

اگر غور کیا جائے تو ”بنان“ یعنی انگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لیے اس کے سارے بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور ممتاز ہوجاتا ہے، خصوصاً انسانی چہرہ، جو چند انچ مربعہ ہے، اس کے اندر قدرت نے ایسے عجیب امتیازات رکھے ہیں کہ اربوں کھربوں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے کے چہرے کے ساتھ بالکل نہیں ملتا، اسی طرح زبان، حلقوم اور آواز ایک جیسے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایسی ممتاز ہیں کہ بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور عورت کی آوازیں الگ الگ پہچانی جاتی ہیں، اور ہر ایک کی آواز الگ ہے، اور شکل وصورت، قدوقامت، جسامت، سوچ اور عقل وفہم وغیرہ، تمام بدنی ساخت الگ الگ اور ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ﴾ [الروم:

۲۲] (اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا، اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا)۔

اور انسانی انگوٹھے اور پوروں میں اس قدر حیرت انگیز تفاوت ہے کہ ایک ہی آدمی کے ہاتھوں کی لکیروں میں بھی فرق نمایاں نظر آتا ہے، یہ نقش ونگار اور خطوط کے جال کی صورت میں بڑا تفاوت نمایاں ہے، صرف آدھ انچ کی جگہ میں ایسے امتیازات کہ اربوں کھربوں انسانوں میں یہ پورے اور نقوش کے مشترک ہونے کے باوجود، ایک خطوط دوسرے سے الگ ہیں، قدیم وجدید ہر زمانے میں نشان انگوٹھا کو ایک امتیازی چیز قرار دے کر عدالتی اور حکومتی فیصلے اس پر ہوتے رہتے ہیں، اور فنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے میں نہیں، ہر انگلی کے پورے کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔

آج ملک اور بیرون ملک تمام ملکوں میں پاسپورٹ اور شناختی کارڈوں میں عکسی تصویر پر اتنا اعتماد نہیں کرتے ہیں جتنا کہ انگلیوں کے خطوط ولکیروں پر کرتے ہیں، یہی امتیاز انسانی آنکھوں میں بھی علیٰ وجہ الاتم موجود ہے کہ کھربوں پدموں انسانوں کی آنکھیں اس طرح مختلف ہیں کہ اشتراک کے باوجود عجیب امتیازات جلوہ گر ہیں، بلکہ یہ امتیاز وتفاوت، دیگر مخلوقات ''شجر وحجر، نباتات، وحیوانات، بلکہ چیونٹیوں، مچھروں اور مکھیوں میں بھی موجود ہے۔

﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (پس برکت والا ہے بہترین پیدا کرنے والا)۔

پس یہ سو فیصد یقینی اور پختہ ہے کہ ربّ تعالیٰ اسی ساخت وانداز کے ساتھ ساری مخلوقات کو دوبارہ اسی شکل وصورت میں پھر دوبارہ پیدا کرنے پر بڑا قادر وتوانا ہے، اسی مقصد کے تحت: ﴿بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ﴾ کے ساتھ ربّ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا اظہار فرمایا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اطمینان قلب اور عین الیقین حاصل کرنا چاہا، چار مختلف پرندوں کے گوشت قیمہ کر کے ریزہ ریزہ کیا، مختلف پہاڑوں پر تقسیم کئے، جب آواز دی تو منٹوں میں زندہ ہو کر گمشدہ منتشر و پراگندہ اجزاء مل کر یکجاں ہو گئے، اگر کسی انسان کے باقی اجزاء در کنار صرف اس کے بالوں کو ریزہ ریزہ کر کے پانچوں براعظموں میں بکھیر دیا جائے، اللہ ربّ العزّت ایسی قدیر اور علیم ذات ہے کہ سیکنڈوں اور لمحوں میں ان کو جمع کر کے مرحوم کے سر کے ساتھ جوڑ سکتا ہے۔

﴿اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾ [یس: ۸۱] (جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، کیا وہ قادر نہیں کہ ان کی مثل کو پیدا کر دے؟) ﴿بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾

[یس:۸۱] (کیوں نہیں! اوروہ توبڑا پیدا کرنے والا، علم والا ہے)۔آگے ارشاد ہے:

﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ﴾ انسان چاہتا ہے کہ قیامت کا انکار کرکے دنیوی زندگی میں بے حیائی کرتا رہے، اگر قیامت کا عقیدہ ہوگا تو اسے تمام برائیوں سے رکنا پڑے گا، اس لئے وہ پہلوانی کرتا ہے، اوراپنے ہم جنس، گدھے مزاج بیوقوفوں سے کہتا ہے کہ بھائی عیش کرو، کھاؤ، پیو، منہ کالا کرو، بس یہی جہاں ہے، پیچھے کچھ نہیں، نہ زندگی ہے، اورنہ جنت ودوزخ ہے، یہ سب کچھ دھمکی شمکی ہے اور کچھ نہیں۔ ولاحول ولاقوۃ إلا باللہ

آج کل کچھ ایسے انگریزی خوانوں کا بھی یہی عقیدہ وخیال ہے، لینن کی بیٹی نے کہا تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے خدا کو سرزمین روس سے (نعوذ باللہ) نکال باہر کیا، مگر جب میں نے اپنے والد ''لینن'' کی موت اور مرنے کا جب قریب سے نظارہ کیا اور ایک ماہ مسلسل اس کی سکرات وبیہوشی کو دیکھا تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مخفی طاقت والے کا وجود ہے، وہ اب بھی ہمارے منصوبوں کو خاک میں ملانے پر قدرت رکھتا ہے۔

﴿يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ﴾ (اب یہ بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ) پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟) مقصد قیامت کے آنے کے وقت کا علم نہیں، طنزیہ سوال ہے، جس کا جواب ربّ الجلیل نے کچھ یوں دیا:

﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ﴾ (جب آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی)، ﴿وَخَسَفَ الْقَمَرُ﴾ (اور چاند بے نور ہو جائے گا، گردوغبار کی کیفیت اختیار کرے گا)، ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ (اور یہ دونوں یکجا ہوجائیں گے، آپس میں ٹکرائیں گے) پھر کیا ہوگا؟ ﴿يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ﴾ (اب یہ منکر) انسان کہے گا کہ اب بھاگ کر کہاں جاؤں؟) اب اس کا دماغ اصلی ٹھکانے پر آگیا کہ بھاگنا چاہئے، مگر کہاں؟

﴿كَلَّا﴾ ہرگز نہیں ﴿لَا وَزَرَ﴾ (اب پناہ کی کوئی جگہ نہیں) بلکہ ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ﴾ (جائے مستقر صرف تیرے ربّ کی طرف ہی ہے) وہاں جاکر ٹھرنا ہے، اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔پیشی کے ساتھ کیا کیا حالات ہوں گے؟ ﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ ۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ﴾ (اس دن انسان کو خبردار کیا جائے گا ہر اس چیز سے جس نے اس کو آگے بھیجا ہے یا پیچھے چھوڑا ہے) نیکی بدی، خیروشر، ذرہ ذرہ سامنے آکر معلوم ہوگا، کچھ بھی نہیں چھپے گا، پوری زندگی کا ریکارڈ شیشے کی طرح صاف صاف سامنے ہوگا۔

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ﴾ (انسان اپنے نفس پر بصیرت رکھتا ہے) اس کو اپنے ہر عمل خیر و شر کا علم ہے، وہ باخبر ہے ﴿وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ﴾ (اگرچہ وہ بہت سے حیلے بہانے کرے) اسے معلوم ہے کہ یہ کیا

کر کے آیا ہے؟ تو اسے کہا جائے گا: ﴿اِقْرَاْ كِتَابَكَ﴾[الإسراء: ۱۴] (لو! اپنا رجسٹر خود چیک کرو، ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ [الکھف: ۴۹] (اور جو عمل کئے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے)۔ چلاؤ موو ی، دیکھو اپنی زندگی کی مکمل کارکردگی، ہر چیز حاضر ہے، کوئی چھپا نہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ غافل انسان دوسروں کے عیوب اور نقصانوں و کمزوریوں کو عینک اور دوربین لگا کر دیکھتا رہتا ہے، مگر اپنے عیوب و کمزوریوں کو نہیں دیکھتا، بسا اوقات اعمالِ خیر پر دوسروں کو ترغیب دیتا رہتا ہے، اور اعمالِ شر پر نکیر کرتا رہتا ہے، مگر اپنے نفس کو آمادہ نہیں کرتا، دوسروں کی آنکھوں میں تنکا دیکھتا ہے اور اپنی آنکھوں کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔

ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ کے خطبے میں کہا: روزِ جزا کو جو لوگ سچا مانتے ہیں وہ احمق ہیں اور جو لوگ اسے جھوٹا مانتے ہیں وہ ہلاک ہوں گے، اس بات پر لوگ حیران ہوئے کہ سچا جاننے والے کیوں احمق ہیں؟ تو اس بات کا مطلب یہ ہے کہ سچا جاننے کے باوجود عمل نہیں کرتا، اتباعِ شریعت و اتباعِ سنت سے غافل رہتا ہے، اور قیامت کی کامیابی کا مدار اعمالِ صالحہ پر ہے، وہ اس کی تیاری نہیں کرتا، تو احمق ہوا۔ [ابن کثیر، ج: ۴]

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: آپ اپنی زبان اس قرآن پاک کے ساتھ نہ چلائیں تاکہ آپ اس کو جلدی سیکھ لیں ﴿۱۶﴾ بیشک اس کا آپ کے دل میں جمع کرنا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے ﴿۱۷﴾ پس جب ہم اس کو پڑھیں (یعنی ہمارا فرشتہ) تو اس کے پڑھ کر فارغ ہونے کے بعد آپ پڑھیں ﴿۱۸﴾ پھر بیشک اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے ﴿۱۹﴾ خبردار! بلکہ تم دنیا کو پسند کرتے ہو ﴿۲۰﴾ اور چھوڑتے ہو تم آخرت ﴿۲۱﴾ اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے ﴿۲۲﴾ اپنے ربّ کی طرف دیکھنے والے ہوں گے ﴿۲۳﴾ اور اس دن کئی چہرے اداس ہوں گے ﴿۲۴﴾ انہیں یقین ہوگا کہ ان کے ساتھ کمر توڑ

سلوک کیا جائے گا㉕ خبردار! جب انسان کی روح ہانسلی کی ہڈی تک جا پہنچتی ہے㉖ اور کہا جاتا ہے کون ہے راق (یعنی جھاڑ پھونک کرنے والا)㉗ اور انسان گمان کرتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آ پہنچی ہے㉘ اور پنڈلی پنڈلی کے ساتھ لپٹ جاتی ہے㉙ اس دن تیرے ربّ کی طرف جانا ہوتا ہے㉚

معارف ومنازل

یہاں سے اللہ تعالیٰ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی اخذ کرنے کی تعلیم دیتا ہے کہ فرشتے سے وحی کس طرح لیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی لینے میں (حرص اور مسرت کی وجہ سے) بہت جلدی کرتے تھے، اور قرأت (پڑھنے) میں فرشتے کے ساتھ ساتھ رہتے، اور تلفظ جاری رکھتے تھے، چونکہ فرشتہ اپنے ملکی وصف کے ساتھ تیزی کے ساتھ پڑھتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف کے ساتھ اس کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدت اور تھکاوٹ محسوس ہوتی، پس اللہ تعالیٰ مجدہٗ فرماتا ہے کہ جب فرشتہ وحی لے کر آئے تو آپ اس کے ساتھ پڑھنا، زور زور سے تلفظ کرنا چھوڑ دیں، اور فقط سننے پر اکتفاء کریں۔

پس جس ڈر سے (وہ ڈر وحی کے چھوٹ جانے کا تھا) آپ ایسا کرتے تھے، اس کی بابت ہم آپ کو مطمئن کرتے ہیں کہ آپ کے مبارک سینے میں اسے جمع کرنا اور بروقت آپ کی زبان سے اس کا پڑھا دینا، یہ ہمارے ذمہ ہے، اسی طرح اس کا واضح کرنا اور تفسیر اور بیان آپ سے کرانا اور مکمل مع مراد ومطلب کے آپ کو سکھانا، یہ سب ہمارے ذمہ ہے، یعنی اول: یہ کہ یاد کرانا۔ دوم: تلاوت کرانا۔ سوم: توضیح مطلب ومراد اور تفسیر کرانا، یہ تینوں کی کفالت اللہ ربّ العزّت سبحانہ نے اپنے ذمے میں لے لی۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ [طٰه: ۱۱۴] (یعنی جب تک تیرے پاس وحی پوری نہ آئے تو پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو، ہم سے دعا مانگ کہ میرے ربّ! میرے علم کو زیادہ کرتا رہ)۔ پھر فرماتے ہیں کہ اسے تیرے سینے میں جمع کرنا اور اسے تجھ سے پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے، جب ہمارا فرشتہ اسے نازل کر کے پڑھے تو آپ صرف سن لیں، جب وہ پڑھ چکے تب آپ پڑھ لیں، ہماری مہربانی سے تجھے ہر طرح مکمل یاد رہے گا، اتنا ہی نہیں، بلکہ تلاوت کرانے کے بعد ہم تجھے اس کے معانی، مطالب، تبیین وتوضیح کے ساتھ سمجھا دیں گے، تا کہ ہماری اصلی مراد اور واضح وصاف شریعت سے تو پوری طرح آگاہ

ہو جائے۔[ابن کثیر، جلد:۴]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کے نزول کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ پڑھنا چھوڑ دیا، جب حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور اول سے آخر تک پڑھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے، اور سماع کرتے۔ جبریل علیہ السلام کے جانے کے بعد پھر وہ نازل شدہ وحی کا حصہ پڑھ کر لوگوں کو سناتے۔[بخاري]

یہ اس دنیا میں چھوٹا سا نمونہ ہوا: ﴿یُنَبَّؤُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ﴾ کا، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اپنی وحی فرشتے کے چلے جانے کے بعد پوری ترتیب کے ساتھ حرف بحرف، بدون ادنیٰ فروگزاشت کے اپنے پیغمبر کے سینے میں جمع کر دے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ بندوں کے اگلے اور پچھلے اعمال، جن میں سے بعض کو کرنے والا بھی بھول گیا ہو گا، سب جمع کر کے ایک وقت میں سامنے کر دے؟ اور ان کو اچھی طرح یاد دلا دے، اور اسی طرح ہڈیوں کے منتشر ذرات کو سب جگہ سے اکٹھا کر کے ٹھیک پہلی ترتیب پر انسان کو از سر نو وجود عطا فرما دے۔ بیشک! وہ اس پر اور اس سے کہیں زیادہ پر قادر ہے۔

یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن حکیم جیسے خیرِ محض میں عجلت جائز نہیں تو دنیا کی محبت عاجلہ میں عجلت بطریق اولیٰ ممنوع و ناجائز ہو گی، یہ بات اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق سے بخوبی معلوم ہو گئی۔فتدبر

﴿کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ﴾ (ہرگز نہیں! بلکہ تم دنیا کو پسند کرتے ہو) جب آدمی کسی چیز کو پسند کرتا ہے، تو اس میں منہمک رہتا ہے، اس کی جدائی کو گوارا نہیں کرتا ہے، چونکہ تمہارا مقصد صرف محض دنیوی زندگی ہے اس لئے تمہیں اس کی جدائی پر صدمہ ہے، اور یہی آخرت کی زندگی کے انکار کا سبب ہے، اگر دنیا کی محبت کم ہوتی تو آخرت کی محبت بھی پیدا ہوتی، مگر تمہیں صرف جلد بازی عاجلہ دنیا کی محبت سے واسطہ ہے۔

حدیث پاک ہے: "من أحب دنیاہ أضر بآخرته"، جو دنیا سے محبت کرے گا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا، اور جو آخرت سے محبت کرے گا "أضر بدنیاہ" تو اس کی دنیا میں عیش کی کمی ضرور آئے گی۔[مسند احمد]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یاد رکھو! دنیا اور آخرت دو سوکنوں کی مانند ہیں، ایک کی رضامندی میں دوسری کی ناراضگی ہو گی، لہٰذا آخرت کا طلبگار بنو اور دنیا کو ناراض رکھو، یہی دانشمندی ہے، فکونوا من أبناء الأخرۃ ولا تکونوا من أبناء الدنیا۔ آخرت کے بیٹے اور طلبگار بنو، دنیا سے پہلوتہی کرو۔[عزیزی] حب الدنیا رأس كل خطيئة۔

(دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑھ ہے)۔[مشکوٰۃ]

﴿وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ﴾ (اور چھوڑتے ہو آخرت کو)۔ فانی دنیا پر فدا ہونا اور دائمی آخرت کے ساتھ بے وفائی کرنا کتنی ناعاقبت اندیشی کی بات ہے؟ مگر یاد رکھو! جب آخرت آئے گی، تو بڑی ندامت ہوگی۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ﴾ (اس دن کئی چہرے تروتازہ اور چمکدار ہوں گے) ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ﴾ [آل عمران:۱۰۶] (جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے) چودھویں رات کی چاند کی طرح دلفریب اور چمکدار چہرے والے وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی، یہی انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت اور حیات طیبہ کی مثال اور قابل اقتداء عمل ہے، جنہوں نے دنیا کو صرف ایک راہ گزر کی حیثیت سے دیکھا اور آخرت کو اصلی مستقر و منزل مقصود قرار دیا۔ اس آیت کریمہ ﴿إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ سے رؤیت باری تعالیٰ جل مجدہ کا اثبات ہے، وہ چمکدار چہرے والے اپنے ربّ کو دیکھتے ہوئے شاداں وفرحان ہوں گے، اور دنیا کے تمام مصائب وآلام کو بھول جائیں گے۔ "ونظرة منک یاربي ویاسندي خیر من الدنیا ومافیها، وفي روایة الذمن الدنیا ومافیها۔ (یہ کسی عارف کا قول ہے) رحمة الله علیه وعلینا وعلی جمیع الأمة۔

خوارج، معتزلہ اور شیعہ دیدار الٰہی کے منکر ہیں، کہتے ہیں: یہ ممکن نہیں، تو الحمد للہ ان کے لئے نہیں ہوگا اور وہ اس قابل نہیں کہ یہ نعمت انہیں نصیب ہو، اہلسنت والجماعۃ اور طائفہ ناجیہ کے ہاں مسلّم اور صحیح وثابت ہے، تمام نصوصِ قرآنیہ وسنت نبویہ اس پر دلیل ہیں۔ صحیحین کی احادیث اس پر بڑے طمطراق اور زوردار الفاظ کے ساتھ دلالت کرتی ہیں، اور اس پر اجماع امت بھی ہے۔ الحمد للہ رب الغلمین

رؤیت باری تعالیٰ عزّ مجدہ:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابوسعید وحضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا ہم اپنے ربّ کو قیامت کے دن دیکھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سورج اور چاند کو جبکہ آسمان صاف ہو اور کوئی بادل نہ ہو، دیکھنے میں تمہیں کوئی مزاحمت اور بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح تم اللہ ربّ العٰلمین سبحانہ کو دیکھو گے۔

بخاری ومسلمؒ میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھا اور فرمایا: تم اسی طرح اپنے ربّ کو دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم سے ہوسکے تو سورج

نکلنے سے پہلے نماز (صلوٰۃ فجر) اور سورج ڈوبنے سے پہلے نماز (صلوٰۃ عصر) میں کسی طرح کی سستی نہ کرو۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو جنتیں سونے کی ہیں، وہاں کے برتن وغیرہ ہر چیز سونے کی ہیں، اور دو جنتیں چاندی کی ہیں اور وہاں کے برتن وغیرہ ہر چیز چاندی کی ہیں، ان جنتیوں اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کے درمیان سوائے کبریائی چادروں کے اور کچھ آڑے نہیں آئیں گے، یہ جنت عدن میں ہوگا۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ جنتی جب جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ شانہ ان سے فرمائیں گے: ''کہو کچھ اور کیا مانگتے یا چاہتے ہو؟'' وہ کہیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے سفید و نورانی کردیئے ہیں، جنت میں پہنچادیا، جہنم سے بچالیا، اب ہمیں مزید کس چیز کی ضرورت؟ پس حجاب ہٹادیئے جائیں گے، اور اہل جنت کی نگاہیں جمال باری تعالیٰ سے منور اور روشن ہوجائیں گے، اس میں انہیں جو سرور و لذّت حاصل ہوگی، وہ کسی چیز میں حاصل نہ ہوگی؟ سب سے زیادہ محبوب انہیں دیدار باری تعالیٰ ہی ہوگا، اسی کو قرآن مجید کی آیت میں (زِیَادَۃٌ) سے تعبیر کی گئی ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ﴾ [یونس:۲۶] (احسان کرنے والوں کو جنت بھی ملے گی اور دیدار الٰہی بھی)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مسلم میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں پر قیامت کے میدان میں مسکراتے ہوئے تجلی فرمائیں گے، پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرصات قیامت اور جنتوں میں مؤمنوں کو اپنا دیدار کرائیں گے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے کم درجہ جنتی اپنی ملکیت جنت کو دو ہزار سال دیکھتا رہے گا، دور اور نزدیک کی چیزیں یکساں نظر میں ہوں گی، ہر سمت اور ہر طرف اس کی بیویاں اور خدام نظر آئیں گے، اور اعلیٰ درجے کی جنتی ایک ایک دن میں دو دو مرتبہ اللہ پاک کے بزرگ و برتر، باعظمت چہرے کو دیکھیں گے۔

ترمذی میں بھی حدیث ہے، یہ حدیث بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ مرفوعاً بھی مروی ہے، اگر اس قسم کی تمام حدیثیں اور روایتیں اور ان کی سندیں اور ان کے مختلف الفاظ یہاں جمع کریں گے تو مضمون بہت طویل ہوجائے گا۔ بہت ہی صحیح اور حسن حدیثیں بہت ہی مسند اور سنن کی کتابوں میں مروی ہیں، جن میں کی اکثر ہماری اس تفسیر کے متفرق مقامات پر بھی آگئی ہیں۔ ہاں! توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مسئلہ یعنی دیدار الٰہی

عزّ شانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین حضرات اور تمام علماء سلف کا اتفاق و اجماع ہے، سارے ائمہ اسلام کا اتفاق ہے، اس کے خلاف کہنے والے جو دیدار الٰہی کی نفی کرتے ہیں، وہ غلط اور جادۂ حق سے ہٹے ہوئے دور ہیں۔[ابن کثیر اختصار کے ساتھ]

﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ﴾ (بہت سے چہرے اس دن غبار آلود اور اداس ہوں گے، ردی اور خشک کھجور کی طرح پژمردہ ہوں گے)۔ ﴿وَ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ [آل عمران:۱۰۶] (کالے سیاہ ہوں گے) اور نہایت ترش اور غم زدہ تھکے ہوئے (نعوذ باللہ)، دنیا میں جب قرآنی احکام کا بیان ہوتا تھا تو یہ لوگ ٹیڑھے منہ اور ترش روئی کے ساتھ گزرتے تھے، ایسے لوگ جو اذان سن کر کہتے تھے کہ کتے بھونک رہے ہیں، ہماری نیند خراب کرتے ہیں، فلاں ہے، یہ ہے، وہ ہے، انگریزوں کی پجاری رات دن ٹیلیویژن کھلا ہے، ناچ دیکھ رہے ہیں، رات دو بجے تک کیا کیا دیکھ رہے ہیں، جب سو جاتے ہیں صبح دس بجے اٹھتے ہیں، ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ [الذاریات:۱۸] (رات کو تھوڑا سویا کرتے تھے، اور صبح سویرے مغفرت مانگا کرتے تھے) میں کس کی تعریف و مدح ہو رہی ہے؟ مسلمان امت کے افراد کی، اللہ ربّ العزّت توفیق و ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

﴿تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ﴾ (انہیں یقین ہوگا کہ آج ہمارے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا جائے گا)۔ ''فَاقِرَة'' کی جمع فقار ہے، کمر کے مہروں کو کہتے ہیں، فقار الظهر کمر انسان کی پشت و کمر اور ریڑھ کی ہڈی قریب قریب ایک ہی چیز کے نام ہیں، غمزدہ آدمی سخت مصیبت یا کسی دوست کی موت پر کہتا ہے میری کمر ٹوٹ گئی۔

﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ﴾ ترقوت ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جو سینے اور مونڈوں کے درمیان میں ہیں، جنہیں ہانسلی اور ہانس کہتے ہیں۔ (ہرگز نہیں، خبردار! جب انسان کی روح اور جان ہانسلی کی ہڈی تک جا پہنچتی ہے) اور اس دنیا سے جانے لگتی ہے اور محبوب و اُحبہ دوست و احباب سے جدائی و فراق کا وقت آ پہنچتا ہے، اور موت کی گھڑی خطرناک جان گسل، پریشان کن ساعت ہے جو کہ بعضوں پر بڑی بھاری ہے، بعض لوگوں پر موجب راحت و مسرت ہے، کسی عارف نے کہا:

نذر کردم گر بر آید بسرم آن روزے ☆ تا در میکدہ شادان و غزل خوان بروم

کیا بہتر تمنا ہے؟

﴿وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ﴾ (ہے کوئی جھاڑ پھونک والا؟) مطلب یہ کہ کوئی علاج ومعالجہ حکیم ڈاکٹر دم ورقیہ والا، کیونکہ ایسی بے خودی اور پریشانی کے عالم میں انسان بے چارہ جان بچانے کی خاطر ہر تدبیر اختیار کرتا ہے، اور بڑے علاج ومعالجے، مہنگے ہسپتال، مہنگا علاج ان کے لئے آسان ہوجائے گا، حتیٰ کہ دیندار نمازی لوگ حواس باختگی کے عالم میں بھی غیر شرعی تدبیروں پر مجبور ہوجائیں گے، سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہے: ﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ وَأَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ [الواقعة: ٨٥] (بھلا جب روح گلے میں آ پہنچتی ہے، اور تم اس وقت کی (حالت کو) دیکھا کرتے ہو، اور ہم اس (مرنے والے) سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں، لیکن تم کو نظر نہیں آتے)۔

ایک رئیس بیچارے نے بیٹے کی وفات پر موجود ڈاکٹر سے (روتے ہوئے) کہا تھا: جناب ڈاکٹر صاحب! بیٹے کی جان بچاؤ، ایک لاکھ روپیہ دیدوں گا، اور آپ کو حج کراؤں گا، ڈاکٹر کیا، دنیا کی کوئی طاقت اس قابل نہیں کہ ایک منٹ کی زندگی کسی کو دے سکے یا کسی کی جان بچائے، ہرگز ہرگز نہیں۔

"راق" رقیۃ اور علاج کرنے والے کو بھی کہتے ہیں، اور اوپر چڑھنے والے کو بھی کہتے ہیں، پس معنی یہ ہوگا کہ فرشتے ایک دوسرے سے کہیں گے: ﴿مَنْ رَاقٍ﴾ (کون ہوگا اس کی روح اوپر چڑھانے والا؟) یہ ان کی ڈیوٹی کی بات ہوگی، جو وہ آپس میں طے کریں گے، کیونکہ عزرائیل علیہ السلام اپنے ساتھ پوری جماعت ملائکہ کو لے کر روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے، گویا راق سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے پاس آخری وقت میں آتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کی روح کو اوپر کون لے کر جائے گا؟ یعنی رحمت والے فرشتے اس کو لے جائیں گے یا عذاب والے؟ ایسے وقت میں دونوں قسم کے فرشتے وہاں موجود ہوتے ہیں۔

اگر مرنے والا مؤمن ہے، تو اسے علیین والے فرشتے لے جاتے ہیں، جیسے سورۂ مطففین میں مذکور ہے، اور علیین ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے، جہاں جنت ہے، پس مؤمن نیکوکار انسان کی وہاں پیشی ہوتی ہے، اس کے بعد پھر اسے برزخ یا عالم قبر میں منتقل کرتے ہیں، اسی طرح اگر مرنے والا کافر یا منافق ہے تو فرشتے اس کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں (فرشتے عذاب کے) مگر آسمان دنیا سے اسے پلٹ کر واپس کیا جاتا ہے، اس کو اوپر اجازت نہیں ہوتی، پھر اسے جہنم کے ساتھ ساتوں زمینوں سے نیچے سجین میں ڈالا جاتا ہے، تو اس لحاظ سے راق سے مراد چڑھنے والے فرشتے ہوں گے، خواہ وہ رحمت کے فرشتے ہوں یا عذاب کے فرشتے۔

﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الۡفِرَاقُ﴾ مرنے والے کو یقین ہو جاتا ہے۔ ظنّ یہاں یقین کے معنی میں ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ ﴿وَالۡتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴾ (اور پنڈلی پنڈلی کے ساتھ مل جاتی ہے) یعنی جب جان دل سے نکل جاتی ہے، نچلے حصے سے بھی نکل چکی ہوگی، تو پھر بے جان پاؤں میں کوئی حس وحرکت باقی نہیں رہتی، یا مراد یہ ہوگا: ''یہ ایسا وقت ہوگا کہ مصیبت مصیبت کے ساتھ دہری ہوئی''، ساق سے مراد مصیبت ہے، تو ایک مصیبت دنیا سے روانگی ہے، عزیز وقریب مال ومنال سے جدائی ہے، اور دوسری مصیبت آنے والا وقت برزخ کی مصیبت ہے، یہ دونوں جمع ہو کر آپس میں مل گئیں۔ اس کے بعد انجام کار:

﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوۡمَئِذِ ۨالۡمَسَاقُ﴾ (اب اپنے ربّ کے پاس چلنا ہوتا ہے) پہلی منزل اپنے اختتام کو پہنچی، دوسری منزل کی ابتدا ہوئی، گو یا اس کی قیامت شروع ہوگئی، یہ اس کی ابتداء ہے، اختتام اس بڑی عمومی قیامت پر ہوگی، پس یہ تم کیوں جلدی کرتے ہو؟ اور کہتے رہتے ہو: قیامت کب آئے گی؟ اب بتاؤ کیا کھویا، کیا پایا؟ مختصر زندگی پر غرہ رہا، اور اپنے خالق کے ساتھ جھگڑتا رہا، اب تجھے پتہ چلے گا، تمہارے اصلی انجام کا۔ اللّٰھم ارحم جمیع أمة محمد صلی اللہ علیه وسلم۔ آمین

.........✿.........✿.........✿.........

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوۡلٰى لَكَ فَاَوۡلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوۡلٰى
لَكَ فَاَوۡلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمۡ يَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِيٍّ يُّمۡنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً
فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى ﴿٤٠﴾

ترجمہ: پس نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی ﴿٣١﴾ بلکہ اس نے تکذیب کی اور اعراض کیا ﴿٣٢﴾ پھر اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا گیا ﴿٣٣﴾ ہلاکت ہے تیرے لئے، پھر ہلاکت ہے ﴿٣٤﴾ پھر ہلاکت ہے تیرے لئے، پھر ہلاکت ہے ﴿٣٥﴾ کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟ ﴿٣٦﴾ کیا انسان ایک قطرہ منی نہیں تھا؟ جسے رحم کے اندر ٹپکا دیا جاتا ہے؟ ﴿٣٧﴾ پھر وہ جما ہوا خون تھا، پس خدا تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا اور ٹھیک ٹھاک بنایا ﴿٣٨﴾ پھر بنایا اس سے جوڑ انر اور مادہ ﴿٣٩﴾ تو کیا وہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے؟ ﴿٤٠﴾

☆☆☆

معارف ومسائل

حیرت ہے ان منکرین توحید ومنکرین قیامت پر کہ انہوں نے نہ تصدیق کی، نہ نماز پڑھی، جن چیزوں پر تصدیق اور یقین ضروری ہے ان بدبختوں نے بجائے یقین اور تصدیق کے مسلسل تکذیب وانکار کیا، انہی چیزوں میں سرفہرست ربّ العزّت سبحانہ کی تصدیق ہے، اور آخری چیز وقوعِ قیامت کی تصدیق واثبات ہے، درمیانی چیزیں، مثلاً: رسالت، فرشتے، آسمانی کتابیں، تقدیر وغیرہ، انہوں نے ان معتقدات میں سے کسی ایک کی بھی تصدیق نہیں کی اور نہ اعمالِ صالحہ بجالائے، جن میں نماز سرفہرست ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ''صَدَّقَ'' کے معنی صدقہ وخیرات بھی کیا ہے، یعنی نہ صدقہ کیا اور نہ نماز پڑھی۔ کفار شرائعِ اسلام کے متعلق مکلف ہیں یا نہیں، اس کی تفصیل گذر چکی ہے، اور یہ بات بھی پہلے گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن دوزخی جو جنتیوں کے سوالات کے جواب دیں گے ان جوابات میں سے یہ بھی مذکور ہوا کہ: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ﴾ [المدثر: ۴۴] (ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، اور ہم مسکین کو نہیں کھلاتے تھے)۔ ان باتوں کا خلاصہ یہی ہوگا کہ حقوق اللہ وحقوق العباد دونوں کی انہوں نے نفی کردی، تصدیق ونماز اول کی مثال ونمونہ ہے، صدقہ وخیرات، اطعام مساکین شق دوم کی مثال ونمونہ ہے

﴿لٰكِنْ كَذَّبَ﴾ ''كَذَّبَ'' کا تعلق معتقدات کے ساتھ، اور ''تَوَلّٰى'' کا اعمال کے ساتھ ہے، یا دونوں کا تعلق مجموعہ کے ساتھ ہو، تو مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے عقائد واعمال دونوں کی تکذیب کی، اور دونوں سے اعراض کیا۔

﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى﴾ اہل سے گھر بھی مراد ہوسکتا ہے، اور بناء جنس بھی، پھر اپنے گھر لوٹا، اکڑتا ہوا یا اپنے کفار ساتھیوں کے پاس گیا غرور واکڑ کے ساتھ، یہ غرور مستقل ایک عمل مذموم ہے، خواہ کافر میں ہو یا مسلمان میں، اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا جیسے کہ فرمایا: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ [الإسراء: ۳۷] (اور زمین میں اکڑ کرمت چلو) غرور کے ساتھ چلنا، سینہ تھان کر چلنا، یا دل میں غرور کا پیدا ہونا، یہ سب اللہ کے بندوں کی صفات نہیں ہیں، یہ عباد الشیطان کا طریقہ وعمل ہے۔ البتہ! یہ بات ہے کہ یہ صفت بہ نسبت مسلمانوں کے غیر مسلموں میں زیادہ ہے۔

﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى﴾ (ہلاکت ہو تیرے لئے (یہ کلمہ چار مرتبہ مذکور ہوا) زجر وتوبیخ کی خاطر، اور اس لئے بھی کہ ماقبل میں چار چیزوں کا بیان تھا تو ہر ایک کے مقابلہ میں ایک ایک فَاَوْلٰى قرار

پائے گا، وہ چار چیزیں، مثلاً: عدمِ تصدیق، اعراض عن الحق، ترکِ صلوٰۃ اور غرور وتکبر۔ ممکن ہے کہ یہ چار ہلاکتیں یہ ہوں: عندالموت، في البرزخ، في القيامة، في نار جهنم، یہ کل چار مقامات ہوئے۔ آگے وقوعِ قیامت اور حیات بعدازممات کے لئے مزید دلائل بدیہیہ کا بیان ہے:

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى﴾ (کیا یہ انسان یہی گمان کرتا ہے کہ اس کی پیدائش بے مقصد اور مہمل ہے؟) اور خود اس کا یہ حال ہے کہ کوئی معمولی ادنیٰ کام بغیر مقصد کے انجام نہیں دیتا، پس کیا ربّ العزّت جل شانہ نے اسے اور اس کی ظاہری پیدا کردہ عالم کو بے مقصد پیدا فرمایا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ پورا کارخانہ بلا مقصد ہو؟ یہ فاتر العقل اور ناداں انسان کیا سوچتا ہے؟ یہ اس کی عقلمندی ہے یا بے عقلی و ناعاقبت اندیشی، اور خیال باطل، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مکلف پیدا فرمایا، نہ کہ مہمل۔

یاد رکھو! اس سے سوال وجواب ہوگا، اسے خدائی قانون واحکامات کا پابند رکھا جائے گا، اس کو اس کے اعمال کی پوری پوری سزا ملے گی، اس کی زندگی پابندیوں پر مبنی ہوگی، وغیرذٰلک۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنی ہڈیوں کے جمع کرنے اور اُسے دوبارہ دنیوی زندگی کی مانند زندہ ہونے پر انکاری ہے، تو اس کو سوچنا چاہئے کہ اس کی پہلی پیدائش کس چیز سے ہے؟ اور اس کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ وہی ﴿خَلّٰقٌ عَلِيْمٌ﴾ جس نے معمولی حقیر چیزوں سے اپنی حکمت کے تحت اسے اول مرحلہ میں پیدا فرمایا، وہی ربّ اسے دوبارہ زندہ کرنے پر بڑا قادر ہے، بلکہ دوسری پیدائش وحیات بہ نسبت اول پیدائش کے سہل وآسان بھی ہے۔

﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً﴾ (کیا یہ انسان ایک قطرہ آب نہ تھا؟) ﴿مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى﴾ (کیا یہ منی کی ایک بوند نہیں تھا؟ جسے رحم کے اندر ٹپکا دیا جاتا ہے) یہ حقیر قطرہ آب ہے، جیسے کہ فرمایا: ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [المرسلات: ۲۰] (کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟)۔ وقوله تعالى: ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ﴾ [یٰس: ۷۹] (اور ہمارے بارے میں مثالیں بیان کرنے لگا، اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا کہ (جب) ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا، اور وہ سب قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے)۔ پھر فرمایا:

﴿ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً﴾ چالیس یوم کے بعد ''علقه'' میں تبدیل ہوا، ایک خون بستہ کی شکل اختیار کیا، سفید

منی، سرخ علقہ بن گیا، تیسرے مرحلے میں چالیس ایام گزرنے پر گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، یہ ایک سو بیس دن، یعنی چار ماہ ہوئے، یہ پھر اعضا اور ہڈیاں عروق ورگیں اور مغز و بال سب تیار ہوجاتے ہیں، اس میں روح پھونکی جاتی ہے، نر و مادہ کا فیصلہ ہوجاتا ہے، عمر لکھی جاتی ہے، رزق و روزی کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے، سعید و شقی جنتی دوزخی کا مرحلہ طے ہوجاتا ہے۔ آپ اندازہ لگائیں! یہ نطفہ کہاں سے آیا؟ پہلے سوچو کہ خود یہ نطفہ کہاں سے؟ کس چیز سے؟ کیسے پیدا ہو؟ پھر کہاں محفوظ ہوا؟ اور کن کن مراحل سے گزر کر انسان بنا؟ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ١٤] (پس اللہ برکت والا ہے جو بہترین پیدا کرنے والا ہے)۔ بہت ہی بڑا سفر ہے اور لطف یہ ہے کہ سب کے سامنے ہے۔

﴿فَخَلَقَ فَسَوّٰى﴾ (پس اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا اور ٹھیک ٹھاک بنایا)، جیسے کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ [التین: ٤] (یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا بہترین ڈھانچے میں)۔ کیسی عجیب خوبصورت شکل وصورت میں اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا اور پیدا فرمایا؟ تمام ظاہری و باطنی اعضا کمال درجے کے ہیں، کہیں عیب و نقص نہیں ہے، وہ حقیر تخم دیکھو! اور یہ خوبصورت انسان دیکھو! یہ کس کی صنعت ہے؟

پھر لطف یہ کہ: ﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ (پھر اس کی دو قسمیں بنائیں: (ایک) مرد اور (ایک) عورت)۔ یہ کمال اور حکمت انسانی سمجھ سے بالاتر ہے، ابھی تک سائنسدانوں نے یہ معمہ حل نہیں کیا کہ ایک ہی مادہ سے یہ تفریق دو مختلف و متضاد مرد و عورت کیسے پیدا ہوسکتے ہیں، ہاں! تحقیق سے اتنا پتہ چلا ہے کہ رحم کے دائیں حصے میں اندر سے ایک نرم غدود ہے اور بائیں حصے میں بھی اندر ایک نرم غدود ہے، دائیں حصہ والا بہ نسبت بائیں حصے والے غدود کے معمولی سخت ہے، اگر منی ٹپک کر دائیں حصے میں گرا تو لڑکا ہوگا، اگر بائیں حصے میں گرا تو لڑکی پیدا ہوگی۔

یہی سلسلہ حیوانات میں بھی ہے، اس کی مزید عجیب و غریب تحقیق سائنسدانوں اور ماہر ڈاکٹروں نے بیان کی ہے۔ واللہ اعلم۔ مگر یہ تحقیق حقیقی نہیں ظنی اور احتمالی ہے، کیونکہ بسا اوقات بچہ نر و مادہ پیدا ہوتا ہے، پس بہتر یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، وہ اپنی حکمت و مصلحت کے تقاضوں سے خود باخبر ہے، ہمارے ظن و تخمینے سارے اٹکل پر مبنی ہیں، جن پر یقین نہیں کیا جاسکتا، یہ سابقہ تحقیق سائنسدانوں کی طرف منسوب ہے۔ حدیث شریف میں جس بات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے، اور وحی الٰہی سے ثابت شدہ ہے۔

صحیحین کی حدیث ہے کہ علماء یہود نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور امتحان چند سوالات پوچھے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ رحمِ مادر میں جنس کی تبدیلی کس طرح اور کیوں ہوتی ہے؟ کبھی لڑکا، کبھی لڑکی کی پیدائش میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کا مادہ منویہ سفید رنگ کا ہوتا ہے، اور عورت کا مادہ منویہ زرد رنگ کا ہوتا ہے، ان دونوں کے اختلاط سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے، مباشرت کے وقت جس مادہ کا غلبہ ہوتا ہے بچے کی ذکورت وانوثت اور شکل وصورت اس کے موافق ہوتی ہے، یہودی علماء نے کہا کہ آپ نے صحیح درست جواب دیا، ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے، اطباء حضرات بھی یہی کہتے ہیں، اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔

﴿اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى﴾ (کیا وہ خالق اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے؟) جواب یہ ہے کہ بیشک، وہ اس پر بڑا قادر ہے، اور قدرت اس کی ذاتی صفت ہے، جس کی ذاتی صفت قدرت ہو تو شک نہیں کرنا چاہئے، بلکہ بلا حجت اور بغیر چوں و چرا کے یقین محکم کے ساتھ واحد لاشریک لہٗ کی اس صفت اور باقی دیگر صفات پر ایمان لانا چاہئے اور یہ فرض ہے۔

اس آیت کریمہ نے اتمامِ حجت کیا، اور ہمیں مسلمانوں کو خصوصاً اور پوری خلقت کو عموماً یہ سبق دیا کہ ہر انسان اپنے اصل پیدائش پر غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہے؟ اور اس کا پیدا کنندہ کون ہے؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ ضرور وہ کسی مقصد کی خاطر پیدا ہوا ہے، اس کی تخلیق یقیناً با مقصد ہے، بے مقصد و مہمل نہیں، اور وہ مقصد توحید الٰہی ہے، اور اس کی عبادت واطاعت ہے، وهو المراد۔

فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ﴾ [الذاریات:۵۶] (نہیں پیدا کیا میں نے جنات اور انسانوں کو مگر اپنی عبادت کے لئے) اس کی دوسری تفسیر "اِلّا لیوحدون" اس لئے پیدا فرمایا کہ وہ میرے ساتھ شریک نہ کریں، اور مجھے واحد لاشریک سمجھیں، اور میری توحید وحدانیت کا اقرار کریں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی تفسیر کی ہے۔ [بخاري]

سُورَۃُ الدَّھر

مدنیۃٌ آیاتھا ۳۱ رکوعاتھا ۲

سورۂ دہر مدنیہ ہے، اس میں اکتیس (۳۱) آیتیں، اور دو (۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

مشہور نام سورۃ الدھر ہے، اور سورۃ الإنسان اور سورۃ الابرار بھی اس کے نام ہیں۔

نزول:

اصح یہ ہے کہ پوری سورت مکی ہے، اور اس کا نزول سورۂ رحمٰن کے بعد ہے، یہی جمہور کا قول ہے، بعض حضرات نے اُسے مدنی، اور کچھ لوگوں نے پہلا رکوع مکی اور دوسرا رکوع مدنی کا قول کر چکے ہیں، اُصح قول جمہور کا ہے۔

تعداد آیات، کلمات وحروف:

اس کی اکتیس (۳۱) آیات، دوسو چالیس (۲۴۰) کلمات اور ایک ہزار چون (۱۰۵۴) حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

سورۂ قیامہ میں قیامت اور منکرین قیامت کا بیان اور موت اور اس کے دیگر حالات کا تذکرہ تھا، اس سورت میں قیامت اور اس کی سختی اور بعد الموت کے حالات کا کچھ تفصیلی بیان ہے، نیز اطعام طعام اور ایثار وقربانی کا بیان ہے، نیز انسان کی پیدائش کا بیان ہے، اور شکر گزاروں و ناشکر گزاروں کا، اور نزول قرآن کا بھی بیان ہے، اور ذکر اللہ تسبیح و تہلیل اور صبر کی تلقین کا تذکرہ ہے۔

مختصر موضوع:

انسان اپنی قوت بازو اور ساز و سامان پر اکثر و بیشتر نازاں رہتا ہے، اور اپنی تخلیق و پیدائش سے بے خبر ہے، اسے بتایا جارہا ہے کہ تم معدوم تھے، ایک قطرۂ آب سے تمہاری خلقت و پیدائش وابستہ ہے، اور طرح طرح کی ظاہری و باطنی نعمتوں سے نوازنے میں تیری آزمائش و امتحان مقصود ہے، اس کے ساتھ وہ مسلسل خیر و شر کے اختیار کرنے اور توحیدِ باری تعالیٰ اور اعمالِ صالحہ بجالانے کا مکلف ہے۔

اگر وہ ہدایت پر قائم رہا، تو وہ جنت اور اس کی ابدی گرانقدر نعمتوں کا حقدار ہوگا، اور اگر وہ صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہی وضلالت اختیار کرے تو ابدی سعادتوں سے محروم رہے گا، اور ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہوجائے گا۔

اس سورت میں جنتی نعمتوں اور راحتوں کا نہایت دلکش انداز میں بیان ہے، اور ہلِ جنت کے لئے بڑے سرور وخوشحالیوں کا عجیب انداز میں تذکرہ ہے، ساتھ ساتھ ربّ العزّت کی قدرتوں اور عظیم عنایتوں کا تذکرہ اور قرآن حکیم کی حقانیت وصداقت کا اظہار ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس بیان کرنے پر ترغیب ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا ① اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ
نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِیۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ② اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا
کَفُوۡرًا ③ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغۡلٰلًا وَّ سَعِیۡرًا ④ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ
کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوۡرًا ⑤ عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِیۡرًا ⑥

ترجمہ: تحقیق آیا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں سے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا ① بیشک ہم نے انسان کو ایک ملے جلے (مخلوط) قطرۂ آب سے پیدا کیا تاکہ ہم اس کو آزمائیں، پس ہم نے اسے سننے والا دیکھنے والا بنایا ② بیشک ہم نے اسے (ٹھیک) راستے کی طرف راہنمائی کی، یا وہ شکرگزار ہوگا یا ناشکرگزار ③ بیشک ہم نے تیار کر رکھی ہیں کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ ④ بیشک نیکوکار پئیں گے ایسے پیالے سے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی ⑤ یہ ایک چشمہ ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے (خاص) بندے پئیں گے، اللہ تعالیٰ کے وہ بندے

(اپنی مرضی سے جہاں چاہیں گے) اس چشمہ کو چلائیں گے ⑥

معارف منازل

سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پہلی رکعت میں سورۂ سجدہ اور دوسری رکعت میں سورۃ الدہر کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ [بخاري]

''حین'' اور ''دھر'' کیا ہیں؟

﴿الدَّهۡرِ﴾ بمعنی زمانہ۔ اصل میں ''دھر'' عالم کے وجود میں آنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کی مدت کا نام ہے جو کہ اہل کتاب اور اہل اسلام کے نزدیک تقریباً سات ہزار سال کی مدت وعرصہ کا شمار ہوتا ہے۔

''حین'' کا مختصر اور مطول دونوں زمانوں پر اطلاق ہوتا ہے، پس یہاں ''حین'' کا اطلاق دو قسم کے زمانوں پر ہوتا ہے: اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ شانہ نے آسمانوں زمینوں کی تخلیق فرمائی تو یہ چھ دن میں مکمل ہوئے، چار دن زمین اور دو دن آسمانوں کی تخلیق پر صرف ہوئے، سورۂ سجدہ کی آیت ۹ سے ۱۲ تک اس کی تفصیل قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ان چھ دنوں میں پورا عالمِ حیوانات اور دیگر تمام مخلوقات سمیت ہر چیز کی تخلیق عمل میں آئی ہے، اس کے بعد ایک مدت تک انسان کا کوئی نام ونشان شہود وجود کا خارج میں نہ تذکرہ رہا نہ اور کچھ، صرف علمِ الٰہی میں اس کا وجود تھا، اس عرصہ میں وہ ﴿لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا﴾ کے پردہ میں مخفی رہا، یہاں تک کہ اس کی پیدائش کا فیصلہ ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی۔

دوسرا یہ ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے انسان تدریجاً پیدا ہوتے رہیں گے، اور ﴿حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ﴾ سے مراد حمل قرار پانے سے لے کر وقت پیدائش تک کا زمانہ شمار ہوگا، جو کہ نو ماہ سے لے کر دو سال کا عرصہ ہے، اس میں انسانی تخلیق پر جتنے مراحل گزرتے ہیں، یعنی نطفہ سے لے کر تکمیل اعضا مروح وحیات تک، وہ سب اس زمانہ دراز میں داخل ہیں۔ اس عرصہ حمل میں کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ انسان پیدا ہوگا یا نہیں؟ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ کس شکل وصورت کا ہوگا؟ کتنا عرصہ عمر پائے گا؟ وغیرہ، یہ کسی کو معلوم نہیں اور یہ کوئی شئی مذکور نہیں ہے، بلکہ پردۂ خفاء ہی میں ہے، خارج میں اس کا کوئی تذکرہ، نام ونشان وشہود نہیں نظر آتا، تو ﴿لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا﴾ سے یہی مدت حمل ہی مراد ہے۔

علماء کرام مفسرین حضرات نے ان دونوں معانی پر آیت کریمہ کا انطباق کر کے دونوں کو صحیح بتایا ہے۔

مانبودیم وتقاضا ہم نبود ☆ لطف تو نا گفتۂ ما می شنود

حدیث شریف میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز سورۃ الدہر کی تلاوت فرما رہے تھے، اور کئی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس محفل میں تشریف رکھتے تھے، ان میں ایک حبشی سیاہ رنگ کے صحابی بھی تھے، جب جنت اور اس کی نعمتوں کا تذکرہ آیا تو وہ حبشی النسل صحابی نے زور سے ایک ہچکی لی اور اس کا دم نکل گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أخرج نفس صاحبكم الشوق إلى الجنة۔ تمہارے بھائی کی جان جنت کے شوق میں نکل گئی۔ [ابن کثیر در منشور اللباب]

اسی حدیث کے ایک راوی حضرت صالح المری ہے، جو قاضی تھے، جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے تو اس میں اس قدر جذب ہوتے تھے کہ سامعین پر دہشت طاری ہو جاتی تھی، اور کئی لوگ ہلاک ہو جاتے تھے۔ حضرت الشیخ سیدنا عبدالقادر الجیلانیؒ کی مجلس وعظ کا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

ع کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زمان از غیب جان دیگرست (حضرت جام)

مشہور مقولہ ہے کہ: ''از دل خیزد بر دل ریزد''۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ یہاں ''ھَلْ'' استفہامیہ نہیں، تحقیقیہ ہے، تحقیق کے ساتھ آیا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں سے کہ انسان موجود نہ تھا، کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ انسان سے مراد خاص انسان ''حضرت آدم علیہ السلام'' یا عام انسان جو کہ ان کی اولاد و نسل ہے، دونوں پر معنی صادق ہے کہ کسی وقت کرۂ ارض پر ان کا وجود و تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں! یہ جہاں تھا، گھر اور مکان بنا ہوا موجود تھا، مگر مکین کا نام و نشان نہ تھا، اس کی ہنوز آفرینش صیغۂ راز میں تھی۔

تو مطلب یہ ہے کہ انسان معدوم مذکور نہیں ہوتا ہے، جب یہ کتمان عدم میں تھا تو اس کے قبائل، نسل رنگ، صورت، زبان، کمالات، علم و معرفت، صناعت، ایجادات، معالم و مفاخر وغیرہ سب معدوم تھے، کائنات میں کسی بھی مخلوق کو اس کی معرفت و شناخت حاصل نہ تھی، وہ ایک گمنامی کے پردے میں مستور و محبوس تھا، پھر جب کائنات کے رب عز شانہ نے اس کی تخلیق کا کسی حکمت کے تحت فیصلہ فرمایا تو اس کی تخلیق وجود میں آئی، تب یہ موجود ہوا، اور اپنے

سے پہلے موجودات پر اسے سبقت بھی حاصل ہوئی، اب یہ رئیس کُل ہے، اس کی مرضی کہ اپنی بنیاد کو یاد کر کے شاکر بنے، یا سب کچھ بھول کر کافر بنے، پیچھے پوری سورت کے مضامین ومندرجات انہی دو حیثیتوں کے بیان میں وارد ہیں۔

اب یہ مکلف اگر اپنی بنیادی حیثیت کو بالکل قریب سے دیکھنا چاہے تو وہ یہ ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا﴾ ہم نے انسان کو پانی کے ایک ایسے قطرے سے پیدا فرمایا جو ملا جلا مخلوط ہوتا ہے، چونکہ اس کی پیدائش مرد اور عورت دونوں کے مخلوط منی سے ہے، اس لئے اَمْشَاجٍ سے تعبیر فرمایا۔ یہ مسلّم ہے کہ انسان کی پیدائش کے لئے صرف ایک منی کارآمد نہیں، جب تک مرد وزن دونوں کی منی میں اختلاط نہ ہو۔ ''روح المعانی'' میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے کہ اَمْشَاجٍ سے مراد اخلاط اربعہ، یعنی خون، بلغم، سودا اور صفرا ہیں، جن سے نطفہ مرکب ہو کر بنتا ہے۔ تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ اَمْشَاجٍ کے معنی یہ ہیں کہ اس منی مخلوط میں تمام عناصر کی خوبیاں اور صفات موجود ہوتی ہیں، یہ بھی درست معنی ہیں۔

انسانی جسم کے عناصر:

فرشتے، جنّات اور بنی آدم، یہ قابلِ ذکر مخلوقات ہیں۔ فرشتوں کی تخلیق صرف ایک عنصر (نور) سے ہے، جو کہ بسیط ہے، کسی دوسرے عنصر کا وجود ہی نہیں۔ جنّات کے عناصر صرف دو ہیں: آگ اور ہوا۔ انسان محض ایک مخلوق نہیں، بلکہ اس کو عالمِ صغیر کا مرتبہ حاصل ہے، عالم کبیر علوی، سفلی پورے عالم کا نام ہے، عالم کبیر کے اتنے بے شمار عناصر اور بنیادی اجزاء ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا، اور ماہرین حیوانات، جو انسانی جسم پر اور اس کے اجزاء وعناصر پر مختلف زمانوں سے آج تک گہری تحقیقات کر رہے ہیں، ان کی رائے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، آج تک ہم یہ سنتے آ رہے تھے کہ انسان کی تخلیقی بنیاد کے عناصر چار ہیں اور انہیں ''عناصر اربعہ'' کہا جاتا تھا، خاک، ہوا، مٹی، پانی اور آگ، آج تک طب وحکمت کے ماہرین انہی چار عناصر کو بنیاد بنا کر مریضوں کا علاج کرتے رہے ہیں، اور ادویہ میں بھی انہی عناصر اربعہ کو بنیاد بنا کر چار طبائع مرتب کئے ہیں۔

اس سلسلے میں یونانی ماہرین حکماء نے بھی عناصر کو چار بتایا، جس کی بڑی شہرت ہوئی۔ دیگر حکماء میں سے کچھ حکماء نے عناصر کو پانچ اور کچھ نے سات بتائے ہیں۔ موجودہ سائنس جس کو بہت ترقی اور عروج حاصل ہے، یہ اتنی آگے ہے کہ بال کی کھال اتارنے میں مصروف عمل ہے، اس کی تحقیق آج تک یہ ہے کہ انسانی عناصر اتنے پیچیدہ اور بکثرت ہیں کہ ان پر عبور حاصل کرنا نہایت دشوار ہے، اب تک ان سائنس دانوں نے جسمِ انسانی میں جن عناصر کا

کھوج لگایا ہے، وہ ایک سو دس سے زائد ہیں، آگے دیکھیں کیا ہوگا، تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔

آج تک مسلسل سنتے چلے آرہے تھے کہ عالمِ کبیر کے کُل یا بیشتر اجزاء عالمِ صغیر میں موجود ہیں، جو کچھ بڑے جہاں میں ہے وہی سب کچھ انسان میں ہے، یہ کوئی بے بنیاد ہوائی بات نہیں، اس کی حقیقت اور واضح ثبوت کتابوں میں موجود ہے، علماء اسلام، جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حکماء اسلام، جیسے ابوعلی سینا اور علامہ ابن رشد وغیرہم نے بھی یہی کہا ہے کہ عالمِ صغیر عالمِ کبیر کا نمونہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالمِ کبیر میں بے شمار وہ حقیقی اجزاء ہیں جو کسی زمانہ میں کوئی ان کے ناموں سے واقف نہ تھا، آج وہ بازاروں کی زینت بنے ہوئے ہیں، مسلسل بک رہے ہیں، عام ڈاکٹر صاحبان مریض کا جب معائنہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں بدن کا پانی کم ہوگیا ہے۔

چلو! یہ ایک پرانی بات ہے، اور عناصر اربعہ کا حصہ ہے، کہتے ہیں نمک کم ہوگیا، فولاد کی کمی ہے، ہائیڈروجن کی کمی ہے، چربی اور چونہ کم یا زیادہ ہوگیا ہے، بدن میں سونے کے اجزاء ختم ہوگئے ہیں، گندھک کم ہوگیا، تانبا بڑھ گیا، زہریات کا مادہ ختم یا کم ہوگیا، وغیرہ وغیرہ۔ اتنا بڑا علم ہے اور اتنی معلومات پر مشتمل ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں۔

پچھلے سالوں میں بعض ماہرین نے آنکھوں کے مریضوں سے کہا تھا: تمہاری آنکھوں میں چونہ اور موتیوں کی کثرت اور شیشہ کی کمی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے قدرت کے کمالات وعجائبات ہیں، جس نے ایک مختصر انسانی بدن میں عالمِ کبیر کی پوری فہرست مرتب کی ہے۔ عناصر جمع ہے عنصر کی، عنصر کے معنی ہیں: ''ایک بسیط جوھر'' جو ہر کسی چیز کی ترکیب میں ممد ومعاون ہو۔ واللہ اعلم

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ اَمْشَاج یہ جمع ہے، اس کا واحد مشیج ہے۔ یہ مرد وعورت کے مخلوط وممزوج پانی کا نام ہے، اور یہ اَمْشَاج ان مختلف عناصر سے پیدا ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک کی حقیقت دوسرے سے جدا ہے۔

اس کے علاوہ انسان کی پیدائش زمین کے مختلف حصوں کی مختلف النوع مٹی سے ہے، اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے تمام سطح ارض کی مٹی اکٹھی کرکے اس سے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیرہ تیار کیا، چونکہ یہ مٹی زمین کے مختلف حصوں سے جمع ہوئی، کہیں ریت، کہیں سخت، کہیں پتھر، کہیں سرخ، اسی طرح سیاہ سفید، کہیں چکنی وغیرہ، اس لئے نسلِ انسانی رنگ وصورت اور سختی نرمی، خصلت ومزاج کے اعتبار سے مختلف صورتوں میں پیدا ہوئی، مشاہدہ اس پر گواہ ہے۔ [أبو داؤد]

کچھ لوگ سفید، کچھ کالے، کچھ سرخ، اسی طرح نرم مزاج، سخت مزاج، اسی طرح قوت وضعف، شجاعت و بزدلی، الغرض! ہر شخص کی مٹی کا اثر اس میں نمایاں ہے، اور عناصر اربعہ کا اثر بھی، کوئی خاکی مزاج، کوئی آتشی مزاج، علی ہذا القیاس۔ فرمایا:

﴿نَبْتَلِيْهِ﴾ ہم نے آپ کو آزمانا ہے اور امتحان کرنا ہے، وہ کسی صورت ہر معاملہ میں خود مختار نہیں، اس کی پوری زندگی امتحان آزمائشوں میں مقید ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ہر خیر وشر کی استعداد سے نوازا ہے۔ ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ [البلد: ۱۰] (اور ہم نے اسے دونوں راستے بتائیے ہیں) کا راستہ بتایا ہے، اور اسے آزمانا ہے کہ اپنے خالق ومالک کا فرمانبردار رہے گا یا ناشکری کر کے بغاوت پر اُتر آئے گا۔

بعض مفسرین حضرات نے ﴿نَبْتَلِيْهِ﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس کو پلٹیاں دینا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے کہ ہم نے ملے جلے قطرۂ آب کو پلٹیاں دیدے کر اس سے سمیع وبصیر ہستی کو پیدا کیا، کیونکہ تینوں مدارج: نطفہ، علقہ اور مضغہ میں کئی پلٹیوں کی ضرورت ہوتی ہے، تب جا کر انسانی اعضاء تیار ہوجاتے ہیں، اور ترکیبی مرحلہ مکمل ہوجاتا ہے۔ اطباء جب کوئی معجون تیار کرتے ہیں تو مفرد ادویہ کو سینکڑوں پلٹیاں دے کر تب معجون تیار کرتے ہیں، یہی حال دیگچی میں سالن تیار کرنے کا بھی ہے جو کہ ہر شخص کے مشاہدہ میں فرمایا:

﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ یہ سماعت وبصارت وہ نہیں جو تمام جانوروں کو حاصل ہے، بلکہ یہ ایک مخصوص عالمگیر سماعت وبصارت کی نشاندہی ہے جو انوار وبرکات اور وحی الٰہی کے ساتھ مربوط ہے، چونکہ انسان کی عقل وفہم اور ہر قسم ہوشیاری وسنجیدگی میں زیادہ تر انہی دونوں کو مرکزیت حاصل ہے، اس لئے اختصاراً انہیں دو کا ذکر کیا گیا، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کرتا ہے، اور اسے معرفت الٰہی حاصل ہوجاتی ہے جس کی بدولت وہ خیر وشر میں مکمل امتیاز وفرق کو معلوم کرسکتا ہے، تو سمیع وبصیر کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے علم اور عقل سے نوازا تاکہ وہ امتحان دینے کا قابل ہوسکے، اگر وہ اندھا یا بہرہ ہو تو امتحان سے مستثنیٰ ہرگز نہ ہوگا۔ ہاں! اگر وہ نعمت عقل سے محروم ہو یا بالغ مجنون ہو تو سمع وبصر کے باوجود امتحان سے مستثنیٰ ہوگا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ [البلد: ۱۰] (بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے) (یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر وشر کے) دونوں راستے بھی دکھا دیئے)، اس پر آنے والی آیت دلیل ہے:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ (اور) اسے راستہ بھی دکھا دیا، (اب) وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا) ہم نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنی کتابوں کے ذریعے اسے بتادیا کہ یہ سیدھی راہ ہے خیر کی، اور یہ ٹیڑھی راہ ہے شر کی، یہ ہدایت ہے، یہ گمراہی ہے، یہ صراط الرحمن ہے، یہ صراط الشیطٰن ہے۔

اسی طرح پیغمبروں علیہم السلام کے ذریعے ہر قسم کی صلاحیتیں بخشیں، اور ان کے ذریعے حق و باطل کی راہنمائی کرادی، پھر ارادہ و قدرت کا اسے مالک و مختار بنا کر عمل کی آزادی بھی اسے عطا کی، تا کہ ہم دیکھیں کہ یہ کیسا بندہ ثابت ہوتا ہے؟ ہمیں یاد کرنے والا اور شکر کرنے والا، ہمارے احکام کی تعمیل کرنے والا، یا ہمارے احسان اور انعامات پر ناشکری کرنے والا؟ پتھر کے بتوں کو ہمارا شریک بنانے والا، نفس امارہ اور شیاطین کے ہاتھوں میں اپنی باگ ڈور دے کر فسق و فجور کے گرداب میں غلطان و پیچان رہنے والا؟ ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ [البلد:۱۰] (اور ہم نے اسے دونوں راستے بتائے ہیں)، یا دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ [الشمس:۸] (اس کے دل میں اس کی نافرمانی اور اس کا تقویٰ دونوں ڈال دیئے]۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی)۔

ہدایت و رہنمائی کے ذرائع:

ہدایت و رہنمائی اور یہ الہام و ہدایت مختلف اسباب و ذرائع کے ساتھ منظم و مربوط ہیں، تب اتمامِ حجت مکمل ہو جائے گا، مثلاً:

اول: یہ کہ ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی (عملی) حس بھی دی گئی ہے، جس کی بدولت وہ فطری طور پر نیکی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے۔ بعض اوصاف و اعمال کو اچھا جانتا ہے، اور بعض افعال و اوصاف کو برا جانتا ہے، اگرچہ وہ خود ان میں مبتلا ہو، جیسے کہ وہ کبھی چوری کے گناہ جرم میں مبتلا ہے، مگر وہ اسے اچھا نہیں جانتا، کبھی صدقہ کو اچھا جانتا ہے، اگرچہ وہ اس سے دور ہے۔

دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ضمیر، یعنی "نفس لوّامہ" ہر انسان میں رکھا ہے، جو نیکی چھوڑنے پر اور گناہ کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ﴾ [القيامة: ۱۴] (بلکہ انسان آپ اپنا گواہ ہے)، یا ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ [القيامة: ۲] (اور نفس لوامہ کی قسم (کہ سب لوگ اٹھا کر) کھڑے کئے جائیں گے)۔ انسان ہزاروں غلط کام انجام دے اور اپنی بے عملی کو چھپا کر مطمئن ہو جائے، اس کے باوجود اللہ

تعالیٰ نے اس کی فطرت میں جو محاسب بٹھا رکھا ہے، وہ اتنا جاندار و بیدار ہے کہ کسی بھی برے انسان سے یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے؟ لامحالہ نفس لوّامہ اس کام پر اسے ٹوکتا ہے۔

سوم: یہ کہ انسان کے اپنے وجود میں اور اس کے گرد و پیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی ربّ کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور نہ بہت سے خدا اس کارخانۂ ہستی کے بنانے والے اور چلانے والے ہوسکتے ہیں، اسی طرح آفاق و انفس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کررہی ہیں، انسان اگر ان سے آنکھیں بند کرے یا اپنی عقل سے کام لے کر ان پر غور نہ کرے اور یہ نشانیاں جن حقائق کی نشاندہی کررہی ہیں، ان کو تسلیم کرنے سے جی چرائے، تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی بہت سی واضح نشانیاں انکشاف حقیقت میں اس کے سامنے رکھ دی ہیں، کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

چہارم: انسان کی اپنی زندگی میں اس کی ہم عصر دنیا میں اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اس پر اور ساری کائنات پر فرمانروائی کررہی ہے، جس کے آگے انسان بالکل بے بس ہے، جس کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔

یہ تجربات و مشاہدات خارج ہی نہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے، جس کی بناء پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی برا وقت آنے پر خدا کے آگے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشرک بھی سارے باطل خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدائے واحد لاشریک کو پکارنے لگتا ہے، روسی دہریہ لینن جو کہ خدا کے وجود تک کا منکر تھا، اس کی موت کے بعد اس کی بیٹی (جو باپ سے چار قدم آگے نکلی ہوئی تھی) نے برملا صاف اور واضح اقرار کیا کہ ایک نظر نہ آنے والی طاقت کائنات میں ضرور موجود ہے جو کہ ہمارے سارے منصوبوں کو ناکام بنا کر خاک میں ملاسکتی ہے۔

پنجم: انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جرم کی سزا اور عمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے، اسی بناء پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے، اور جن خدمات کو قابل تحسین سمجھا جاتا ہے ان کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے، یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ

اخلاق اور قانونِ مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے، جس سے انکار کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔

اب اگر یہ مسلّم ہے کہ اس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پوری سزا تو درکنار سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جاسکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پورا صلہ تو کیا کوئی صلہ ہی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، مگر یہ کہ کوئی بیوقوف یہ فرض کر لے یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصور رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے، اور پھر اس سوال کا جواب اس کے ذمہ رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصور آخر کہاں سے آ گیا؟

ششم: ان تمام ذرائعِ رہنمائی کی مدد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لئے دنیا میں انبیاء علیہم السّلام کو بھیجا، اور کتابیں نازل کیں، جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے؟ اور کفر کی راہ کونسی؟ اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے کیا نتائج ہیں؟ انبیاء کرام علیہم السّلام اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات بے شمار محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں کہ کوئی بھی انسانی آبادی خدا کے تصور، آخرت کے تصور، نیکی اور بدی کے فرق اور ان کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ اسے یہ علم انبیاء کرام علیہم السّلام اور کتابوں کی لائی ہوئی تعلیمات سے ہی حاصل ہوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاء کرام علیہم السّلام اور کتابوں کے منکر ہیں، یا ان سے بالکل بے خبر ہیں وہ بھی ان بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل ان ہی کی تعلیمات سے چھن چھن کر انہی تک پہنچی ہیں، اور وہ نہیں جانتے کہ ان چیزوں کا اصل ماخذ کونسا ہے؟

بہر حال! انسان کو فطری سلامتی، پیدائشی عقل و فہم اور عقلی نقلی دلائل، نیکی کی راہ سمجھانے کے لئے دیئے گئے تھے، چاہیئے تو یہ تھا کہ سب انسان اسی ایک راہ پر چلتے، لیکن خارجی اثرات اور ماحول سے متاثر ہو کر انسان ایک ڈگر پر نہ رہ سکا۔ بعض نے اللہ تعالیٰ کو مانا اور اس کا حق پہچانا، اور بعض نے حق کشی اور ناشکری پر کمر باندھ لی اور گمراہ ہوئے۔ [انوار القرآن]

﴿اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا﴾ (بلاشبہ ہم نے منکرینِ حق کے لئے زنجیریں اور طوق اور دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے)، یعنی دینِ حق کے منکر اور پیغمبروں علیہم السّلام کے راستے اور کتابوں کی تعلیمات کو

جھٹلانے والے اور نظر انداز کرنے والوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا کہ زنجیروں سے باندھ کر گھسیٹے جائیں گے، کفر کا طوق ان کی گردنوں میں ڈال کر ان کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ دیا جائے گا، اور پھر دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دے جائیں گے، جیسا کہ سورۃ الحاقہ میں گذر چکا۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ یُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِی الْحَمِیْمِ ۙ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ [المؤمن] (جب طوق ڈالے جائیں گے ان کی گردنوں میں اور زنجیروں سے گھسیٹے جائیں گے جلتے پانی میں، پھر جھونکے جائیں گے آگ میں)۔ العیاذ باللہ من النار و من حال أهل النار۔

جب ان منکرین حق نے اپنے آباء واجداد کے کفر وشرک کا اور شک وشکوک اور کبر وغرور وسرکشی کا طوق لعنت اپنی گردنوں میں ڈال کر معبودِ حقیقی خالق و مالک جل شانہ کی غلامی واطاعت کا طوق زرین اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور حق واہل حق کی مخالفت وبدخواہی پر کمر بستہ ہوگئے، اس کے ساتھ نورانی عقل وفطری استعدادوں کو ضائع کر کے، آسمانی ہدایتوں کو پس پشت ڈالا، اور اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ برسر پیکار رہے تو اللہ تعالیٰ شانہ نے ایسے ناعاقبت اندیش نافرمانوں کے لئے یہ دوزخی زنجیریں اور جہنمی طوق گرم پانی اور دہکتی ہوئی آگ تیار کر لی۔ نعوذ باللہ منها

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۚ﴿۵﴾ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا﴾
بیشک نیک لوگ ایسے جامِ شراب سے شراب نوش کریں گے جس میں کافور کی آمیزش (خاصیت) ہوگی، وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ شانہ کے خاص بندے (عباد الرحمن) پئیں گے، اور وہ خاص بندے اس چشمے کو جدھر جدھر جہاں چاہیں گے بہا کر لے جائیں گے۔

''اَلْاَبْرَار'' جمع ہے، اس کا واحد ''بَرٌّ'' ہے، یہ ''بِرّ'' سے مشتق ہے، یہ بارّ کی جمع نہیں، کیونکہ بارّ کی جمع بَرَرَة ہے۔ البَرّ اسم پاک اسماء حسنیٰ میں سے ہے جیسے ﴿اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ﴾ [الطور:٢٨] (بیشک اللہ نیکی کرنے والا مہربان ہے)۔ تو ''اَلْاَبْرَار'' کا معنی ہوگا: اللہ والے۔ ''اَلْاَبْرَار'' کی ضد ''الفجار'' ہے جو سورۂ مطففین میں مذکور ہے۔ مسند ہند حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اَلْاَبْرَار'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنے نفس کے حقوق، بندوں کے حقوق اور خالق جل شانہ کے حقوق مکمل بلا کمی بیشی ادا کرتے ہوں، اور جادۂ شریعت پر پابندی سے قائم ہوں، دراصل یہی اصلی اور حقیقی استقامت ہے، اللہ تعالیٰ سب کو نصیب کرے۔ آمین

(٢) ''كَأس'' معنی پیالہ کے ہیں، دوسری جگہ وارد ہے: ﴿وَّكَاْسًا دِهَاقًا﴾ [النبأ:٣٤] (اور چھلکتے

ہوئے پیالے)۔ یہ اس پیالہ کو کہتے ہیں جو شراب سے بھرا ہو۔

مِزاج مزج سے ہے ''آمیزش اور ملاوٹ'' کے معنی میں ہے۔

کافور مشہور ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی، بلکہ خود تصریح فرمادی کہ کافور جنت کے ایک چشمے کا نام ہے، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہوسکتی ہے کہ '' کافور'' کی طرح اس چشمہ کے پانی کی رنگت سفید براق ہوگی، اس کی تاثیر ٹھنڈی خوشبودار ہوگی، اور اس سے کافور کی مہک آرہی ہوگی۔

کافور میں بڑی عمدہ صفات اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھی ہیں، رنگ سفید نورانی، براق، خوشبو اور مہک اعلیٰ درجہ کی، اس کا ذائقہ اور اس کی فرحت فوراً تمام اعضا میں پھیل کر سرایت کرتی ہے، دل ودماغ اور روح کو فرحت وسرور پہنچے گا، اَبرار کے لئے یہ چشمہ، سلسبیل کا چشمہ، شراب طہور کا چشمہ، زنجبیل کا چشمہ، دودھ کا چشمہ، شربت خالص کا چشمہ، شہد خالص اور شراب خالص وغیرہ اور دیگر بہت سے خوش ذائقہ پینے کے چشمے ہوں گے۔

کوئی اس سے اندازہ لگائے کہ دنیا میں مشروبات کتنے زائد و بے شمار ہیں؟ اور جنتی مشروبات دنیوی مشروبات سے کہیں زیادہ ہیں، مختلف ذائقہ کے روح پرور اور روح افزا ہوں گے، ''مالا عين رأت، ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر''۔ دنیوی لذائذ، مأکولات ومشروبات آخرت کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں، کیونکہ آخرت کی ہر نعمت دائمی بھی ہے اور لامتناہی بھی اور اعلیٰ بھی۔

﴿يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا﴾ (اور اس میں سے (چھوٹی چھوٹی) نہریں نکالیں گے) ایسا نہیں ہوگا کہ اہل جنت کو جب پانی کی ضرورت ہو تو اپنے بالا خانوں سے نیچے اتریں، انہیں مشکیزہ یا گڑھے یا برتن میں بھر کر لانے کی زحمت ہو، بلکہ جدھر وہ اشارہ کریں گے اس چشمے کا پانی اس طرف بہتا چلا جائے گا، کوئی بلندی یا پستی یا اور کوئی چیز اس پانی کی روانی میں رکاوٹ نہیں بنے گی، اور حدیث میں وارد ہے کہ اہل جنت کے ہاتھوں میں سونے کی چھڑیاں ہوں گی، اور جنتی جس طرف چھڑی سے اشارہ کرے گا وہ پانی اس کے اشارے کی سمت جاری ہوجائے گا۔ بعض مفسرین حضرات کہتے ہیں کہ اس نہر کا منبع و مرکز حضور اکرم صلی اللہ وسلم کا قصر ومحل ہوگا۔ [روح المعاني، عزيزي، مظهري]

اَبرار کو جن اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ حمیدہ کے باعث جن نوازشات سے مالامال کیا جارہا ہے، اب تفصیل سے ان کا بیان ہورہا ہے، اور یہ درج ذیل صفات چھ ہیں:

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝٧ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ

مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا ⑧ اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا ⑨
اِنَّا نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا يَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِيۡرًا ⑩ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الۡيَوۡمِ وَلَقّٰهُمۡ نَضۡرَةً
وَّسُرُوۡرًا ⑪ وَجَزٰهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّةً وَّحَرِيۡرًا ⑫

ترجمہ: وہ اپنی نذر پورا کرتے ہیں، اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی ⑦ وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین یتیم اور قیدی کو ⑧ اور وہ (کہتے ہیں) بیشک ہم تم کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلہ مانگتے ہیں اور نہ شکریے کا طالب ہیں ⑨ بیشک ہم اپنے ربّ سے اس دن کا ڈر رکھتے ہیں جو بڑا ترش رو اور سخت ہوگا ⑩ بچالے گا اللہ تعالیٰ لوگوں (ابرار) کو اس دن کے شر اور برائی سے، اور عنایت کرے گا ان کو تر و تازگی اور مسرت و خوشی ان کے صبر کا صلہ و جزا جنت اور جنتی ریشمی لباس کی صورت میں انہیں عطا کیا جائے گا ⑪

معارف و منازل

اَبرار کی چھ صفات:

یہ اَبرار کے چھ پاکیزہ اور حمیدہ صفات کا بیان ہوا، پہلی صفت ''نذر'' ہے، نذر منت ماننے کو کہتے ہیں، مؤمن، مکلف، عاقل، بالغ آدمی اپنے اوپر کوئی نیکی اور طاعت واجب کرے، جو اس پر پہلے سے واجب نہ ہو، مثلاً: کوئی یہ کہے کہ میرا مریض تندرست ہوا، یا میرا فلاں کام ہوگیا تو میں روزہ رکھوں گا، یا نماز نفل ادا کروں گا، یا مسجد تعمیر کروں گا، یا اتنا مال صدقہ کروں گا وغیرہ، تو جب اس کا وہ کام پورا ہوگا تو جو عمل یا صدقہ ہو اس کا پورا کرنا اس پر واجب ہوگا۔ حدیثوں میں نذر پورا نہ کرنے پر بڑی وعید آئی ہے، اور اس کو پورا کرنے پر بڑے بڑے ثواب و انعامات کا وعدہ ہے، نیز نذر جائز بھی ہوتی ہے ناجائز بھی، حلال بھی اور حرام بھی، صحیح بھی اور غلط بھی۔ تفصیل کے لئے کتب فقہ کا مطالعہ کیا جائے۔

نذر یا منت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''نذر نہ مانا کرو، کیونکہ نذر اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے کسی چیز کو رد نہیں کرتی، تقدیر میں رد و بدل نہیں کرتی، البتہ! اس نذر کے ذریعے بخیل آدمی سے مال نکالا جاتا ہے، اکثر کنجوس لوگ ہی منت مانا کرتے ہیں۔ [بخاري، مسلم، ترمذي]

عام طور پر ایسے لوگ راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے، بڑے کنجوس اور ناشکر ہوتے ہیں، مگر جب ان کا کوئی بیمار

ہوا یا مقدمہ پیدا ہوا، یا کوئی اور حادثہ پیش آ گیا تو گھبرا کر منت مانتے ہیں تو اس طرح اللہ تعالیٰ بخیل سے مال نکالتے ہیں، فی نفسہ یہ نذر پسندیدہ فعل نہیں، کیونکہ یہ ایک طرح کی قدرت کے ساتھ سودا بازی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا یہ کام کرے تو ہم اس کی رضا کے لئے یہ عمل وطاعت بجالائیں گے، یہ بہتر نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خالص اس کے لئے بغیر کسی معاوضہ کے کرنی چاہئے، تاہم اگر کوئی شخص منت مان ہی لیتا ہے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "من نذر أن يطيع الله فليطعه" (جس نے منت مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو اس کو وہ جائز کام انجام دینا چاہئے)، جائز نذر کو پورا کرنا واجب ہے، پھر فرمایا: "ومن نذر أن يعصيه فلا يعصه" (اور جس شخص نے یہ نذر مانی کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا، یعنی ناجائز منت مانی تو اس کو وہ نذر پوری نہیں کرنی چاہئے)، بلکہ توڑ دینی چاہئے، اس پر عمل کرنا حرام ہے، اور اس نذر کے بدلے وہی کفارہ ادا کرنا چاہئے جو قسم توڑنے کا کفارہ ہے۔ [بخاري، مسلم، أبو داؤد]

اس زمانے میں اکثر لوگ ناجائز اور حرام منت مانتے ہیں کہ اگر فلاں کام ہو گیا تو ہم پیروں کی قبروں اور مزاروں پر چادر چڑھائیں گے، یا دیگ پکائیں گے، یا بکرا ذبح کریں گے، یہ منت غیر اللہ کی منت اور شرک ہے، اس قسم کی منتوں کو حرام کہا گیا ہے، اور اس کا پورا کرنا حرام اور توڑنا ضروری ہے، پھر قسم کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے، یہ مذہب حضرت امام ابو حنیفہ اور امام احمد و دیگر بعض فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ ناجائز نذر واقع ہی نہیں ہوگی، اس کا توڑنا ضروری ہے، مگر کفارہ نہیں ہوگا۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک عورت نے نذر مانی کہ اگر اس کا فلاں کام ہو جائے تو وہ برہنہ سر اور پیدل حج کرے گی، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے فوراً منع فرما دیا، اور فرمایا کہ عورت کو سر کھولنا حرام ہے، اگر اس کا چوتھائی سر کھلا ہے تو تنہائی میں بھی اس کی نماز نہیں ہوتی، باقی رہی پیدل چلنے کی نذر تو آپ نے فرمایا: عورت پیدل چلنے کی طاقت نہیں رکھتی، لہٰذا وہ سوار ہو کر چلے اور سر بھی ڈھانپ لینا چاہئے، کیونکہ عورت کے بال ستر میں داخل ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نام جانور قربانی کرے۔ [أبو داؤد]

تو اَبرار کی پہلی صفت یہی ہے کہ وہ جائز نذر کو پورا کرتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنے اوپر ایک غیر واجب چیز کو واجب کرنے کے بعد پابندی کے ساتھ اس کو پورا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض وواجبات بدرجہ اولیٰ پورا کریں گے۔ امام قتادہؒ نے فرائض وواجبات پورا کرنے کو ایفاء نذر

سے تعبیر فرمایا ہے، تو اس کا بھی مطلب تقریباً یہی ہے جو مفسرین کرام نے کہا۔ مطلب یہ ہے کہ اَبرار وہ ہیں جو تمام فرائض وواجبات ادا کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ جنت کے مستحق ہوتے ہیں اور قربِ الٰہی انہیں حاصل ہوتا ہے۔

دوسری صفت: ﴿وَيَخَافُونَ يَوْماً كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيْراً﴾ (اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی پھیلی ہوئی ہوگی)، ہر آدمی پر خوف ودہشت طاری ہوگی، کوئی مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ حشر کے میدان میں ایسا وقت بھی آئے گا جب پیغمبر بھی رب سَلِّم سَلِّم پکاریں گے۔ [مسلم] اے اللہ! آج بچالے بچالے، جب انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہوگا تو عام مخلوق کا کیا کہنا، جب دنیا میں کسی شخص کے دل میں قیامت کا خوف ہوگا، تو تمام معاصی سے اجتناب ہی کرے گا، اور تمام طاعات کو بجالائے گا، یہی لوگ تو اَبرار کہلائیں گے، یہ اَبرار کی دوسری صفت بیان ہوئی۔

تیسری صفت: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْناً وَّيَتِيْماً وَّاَسِيْرًا﴾ (وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت کے ساتھ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو)، حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ: ''وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو''، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو تو ہر مالی جانی قربانی آسان ہوگی۔ اور اگر ضمیر کا مرجع طعام ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ: ''یہ طعام ان کو محبوب اور ضرورت ہے، وہ خود اس کے محتاج ہیں، مگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضاء میں ایثار کرکے خود نہیں کھاتے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور ان کو اپنے نفس وخواہشات پر مقدم سمجھتے ہیں، خود بھوکا رہتے ہیں، دوسروں کو کھلاتے ہیں، یہ ایثار ہے''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر: ۹] (اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو)۔

چوتھی صفت: ﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ (ہم تمہیں کھانا صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں)۔

پانچویں صفت: ﴿لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ یعنی (ہم نہ اس کے لئے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری یا مدح وثنا کے خواہشمند ہیں) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ کسی محتاج یا مسکین کو صدقہ بھیجتی تو خادمہ سے کہتی: معلوم کرو کہ انہوں نے صدقہ قبول کرکے کیا کہا؟ اگر ان لوگوں نے شکریہ ادا کیا اور دعا کی تو آپ بھی ان کے لئے دعا کرتی، تاکہ جانبین کی دعاء برابر ہوں اور میرا ثواب ختم نہ ہو، اور

میرا عمل خالص لوجہ اللہ ہو۔

دوسرے حضرات بھی اکثر و بیشتر بڑے محتاط رہے ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بیوہ عورت آئی اور کچھ مال کی درخواست کی، آپ نے اسے بہت کچھ عطا کیا، اس عورت نے لمبی دعا کی، امیر المؤمنین ناراض ہوئے اور فرمایا کہ آمنے سامنے شکریہ ادا کرنے والے بوجھ بنتے ہیں، آئندہ ایسا نہ کرو، میرا ثواب خراب نہ کرو، پس اس عورت کے شکریہ کے جواب میں امیر المؤمنین نے اس کے لئے لمبی دعا کی اور صدقہ قبول کرنے پر اس کا شکریہ ادا کیا، اسی طرح کا واقعہ جناب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی منقول ہے کہ وہ صدقہ قبول کرنے والوں کا شکریہ بھی ادا کرتے اور ان کے لیے دعا بھی فرماتے۔ [تفسیر عزیزی وغیرہ]

چھٹی صفت: ﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا﴾ (ہم اپنے پروردگار سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بڑا اداس، ترش رو اور نہایت سخت ہوگا)۔ ''قمطریر'' کے معنیٰ: ''بہت زیادہ سخت و نافرمان''۔ اس کی تشریح صفت دوم کے ضمن میں گزر چکی۔

اب ان صفات حمیدہ پر جو اجر و ثواب مرتب ہوگا اس کا بیان یہ ہے:

﴿فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (بچالے گا اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں (ابرار) کو اس دن کے شر اور برائی سے اور عنایت کرے گا ان کو تروتازگی اور مسرت و خوشی کے ساتھ) جیسے کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ﴾ [الغاشية:۸] (اور بہت سے منہ (والے) اس روز شاداں ہوں گے، اپنے اعمال (کی جزا) سے خوش دل ہوں گے)۔ اسی طرح ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾ [عبس:۳۹] (اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے، خنداں و شاداں)، یہ مؤمنین نیکوکار ہیں، یا یہ: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [القيامة:۲۳] (ان کے چہرے سفید، بارونق، تروتازہ، چمکدار اور پرمسرت ہوں گے)۔

﴿وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا﴾ (اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت (کے باغات) اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کرے گا)۔ مؤمن کی پوری زندگی صبر سے عبارت ہے، احکامِ الٰہی کی ادائے گی پر صبر، معاصی کے ترک پر صبر، محرومیوں پر صبر، مصیبتوں پر صبر، عبادات پر صبر، بیماریوں پر صبر، فقر و فاقہ اور بھوک پر صبر، بے کسی پر صبر، الغرض! مؤمن کی زندگی کا کوئی گوشہ و پہلو ایسا نہیں جہاں صبر کا نور و چمک نہ ہو، ہر ہر قدم پر یا شکر کی

بادشاہی ہے یا صبر کی سلطنت ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے صبر کے جزا وصلہ انہیں جنت اور ریشمی لباس ہی عطا فرمائے گا، جب یہ اَبرار استقلال وصبر پر گامزن رہے اور طاعات بجالائیں، معاصی سے اجتناب کیا، ایثار وقربانی پر گامزن رہے، یومِ آخرت سے خائف رہے، بغیر کسی بدلہ وغرض کے محض رضاءِ الٰہی کی خاطر اطعامِ طعام پر کاربند رہے۔

جب ان تمام امور میں صبر واستقامت میں شریک حال رہے تو ربّ العزّت صبر کے عوض انہیں جنت اور جنت کا ریشمی لباس عطا فرمائیں گے، اور ان کے چہروں کو تر وتازہ بارونق خوبصورت بنائیں گے، اور قیامت کے ہر شر و برائی سے انہیں نجات بخشیں گے، اور انہیں اپنے دیدار کا حقدار و مستحق قرار دیں گے۔ آگے مزید انعامات اور بخششوں کا بیان ہو رہا ہے۔

.......❁.......❁.......❁.......

مُّتَّكِـِٔيۡنَ فِيۡهَا عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوۡنَ فِيۡهَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِيۡرًا ۞۱۳ وَدَانِيَةً عَلَيۡهِمۡ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتۡ
قُطُوۡفُهَا تَذۡلِيۡلًا ۞۱۴ وَيُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّاَكۡوَابٍ كَانَتۡ قَوَارِيۡرَا ۞۱۵ قَوَارِيۡرَا۟ مِنۡ فِضَّةٍ
قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا ۞۱۶ وَيُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا ۞۱۷ عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى سَلۡسَبِيۡلًا ۞۱۸
وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُـؤۡلُـؤًا مَّنۡثُوۡرًا ۞۱۹ وَاِذَا رَاَيۡتَ ثَمَّ رَاَيۡتَ
نَعِيۡمًا وَّمُلۡكًا كَبِيۡرًا ۞۲۰ عٰلِيَهُمۡ ثِيَابُ سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّاِسۡتَبۡرَقٌ ۚ وَّحُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّةٍ ۚ وَ
سَقٰٮهُمۡ رَبُّهُمۡ شَرَابًا طَهُوۡرًا ۞۲۱ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَـكُمۡ جَزَآءً وَّكَانَ سَعۡيُكُمۡ مَّشۡكُوۡرًا ۞۲۲

ترجمہ: بہشت میں تکیے لگائے ہوئے تختوں پر بیٹھے ہوں گے، دھوپ کی شدت یا سخت سردی اس میں نہیں دیکھیں گے ⑬ اور جھکے ہوئے ہوں گے ان پر درختوں کے سائے، اور پست کردیئے جائیں گے درختوں کے پھل لٹکا کر ⑭ اور پھیرے جائیں گے ان پر چاندی کے برتن اور آبخورے جو شیشے کے ہوں گے ⑮ اور شیشہ چاندی کا ہوگا اور وہ (خدام یا جنتی) اس کا اندازہ کریں گے اندازہ کرنا ⑯ اور انہیں اس میں (بہشت میں) ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی ملاوٹ ہوگی ⑰ وہ ایک چشمہ ہے اس میں جس کو سلسبیل کہتے ہیں ⑱ اور ان کے سامنے بچے پھریں گے جو ہمیشہ رہیں گے، جب تو انہیں دیکھے گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتیوں جیسا خیال کرے گا ⑲ اور جب تو

دیکھے گا اس مقام پر تو دیکھے گا بڑی نعمت اور بڑی بادشاہی ﴿٢٠﴾ اہل جنت کے اوپر سبز رنگ کے باریک ریشم کی پوشاک ہوگی، اور موٹے ریشم کی، اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور سیراب کرے گا ان کو ان کا پروردگار شراب طہور سے ﴿٢١﴾ بیشک یہ تمہارے کئے کی جزاء ہے، اور جو محنت تم نے (دنیا میں) کی اس کی قدردانی کی گئی ہے ﴿٢٢﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیتوں میں اَبرار کے صبر اور دوسرے اعمال کے صلہ کا بیان تھا، ان آیتوں میں مزید اکرام واعزاز اور سرور وخوشحالیوں کا بیان ہو رہا ہے کہ بہشت میں تکیے لگائے ہوئے تختوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ ''اَرَائِك'' اریکہ کی جمع ہے، جس کے معنی ''ڈولی'' کے ہوتے ہیں، اس پر پردہ لگا ہوتا ہے اور عمدہ صوفہ جو اس زمانہ میں ہوتا ہے عموماً شادیوں میں نوبیاتی دلہنوں کے لئے بڑے ناز وطراز کے ساتھ بنائے جاتے ہیں، بڑی قیمتی اور نفیس قسم کے ہوتے ہیں، پس جنتی جنت میں بڑے اکرام وپورے اعزاز کے ساتھ تکیے لگا کر ان پر بیٹھے ہوں گے اور چاروں طرف نظارہ کریں گے، جیسے کہ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھے ہوں، خوشحالی اور مسرتوں میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

یہ تخت وسرور وخوشحالی اتنی مثالی اور دلکش منظر پیش کرے گی جو کہ دنیا کے ہفت اقلیم کے سربراہ بادشاہ کو بھی شاید نصیب نہ ہو، جنت اور اس کی سہولتوں اور نیرنگیوں کے سامنے کیا حیثیت ہو سکتی ہے دنیا کی بادشاہتوں کی؟ نہ دھوپ کی شدت، نہ سردی کا المیہ، چاروں طرف اتنی روشنی ہوگی جس کی مثال نہ ہو، ایک جیسا معتدل موسم کہ اس کی نظیر نہ ہو، وہاں نہ سورج ہوگا، نہ ستارے، سارا افق پوری جنت کی روشنی حضرت حق سبحانہ کے انوار سے منور ہوگا، پیغمبر کا نور، قرآن کا نور، شریعت کا نور، دنیا میں جن کو کام آئے اور انہوں نے انوار الٰہی کو سینے کے ساتھ لگا کر نورانی زندگی گزارے، آج جنت کے انوار وبرکات تک فائز ہو کر ایسے آباد ہوئے جس کی مثال نہ ہو، ''نور علی نور'' کا منظر ہوگا۔

دین حق کی معیت میں دنیا کی گرمی وسردی برداشت کرنے والوں پر آج وہ انعامات برسائے جائیں گے جن کا دنیا میں تصور تک نہ تھا، گرمیوں میں روزے کی تکلیف، سردیوں میں قیام اللیل اور وضوء کی تکلیف برداشت کرنے والوں نے آج بادشاہوں کی زندگی سے بڑھ کر زندگی پائی اور فرمایا: قریب ہوں گے جھکے ہوئے ہوں گے، ان پر سائے (یہ سکون کا سایہ ہوگا) جیسے دنیا میں کہتے ہیں کہ بچے اپنے باپ کے سائے میں پرورش پا رہے ہیں، آج

یہ کس کا سایہ اور نگہداشت ہے؟ اس سایہ پر اگر سارے جہاں کو قربان کیا جاتا شاید حق ادا نہ ہوتا۔

یہ وہ سایۂ رحمت ہے جس کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ”سبعة يظلّهم الله في ظلّه أو في ظلّ عرشه يوم لا ظل إلا ظلّه“۔ [متفق عليه] جس طرح سایہ اجرام واجسام کا یا درختوں کا ہوتا ہے، یہی جنتی درختوں کا شاید کوئی نورانی سایہ ہو، یا یہ شجر طوبیٰ کا سایہ ہو، یا سایہ سے مراد قرب الٰہی ہو، اس کے بہت سے مطالب و معانی ہو سکتے ہیں، مگر اول معنی بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ اور جو عام معنی ہے وہ یہ ہے کہ قریب یا تابع یا پست کئے جائیں گے درختوں کے سایے، پھل جھکے ہوئے ہوں گے، ان کو توڑنا، اتارنا اور حاصل کرنا نہایت آسان ہوگا۔

دنیا کے درختوں سے پھل توڑنا بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، خاص کر بڑے اونچے درختوں سے جیسے کھجور کے درخت، پھر یہاں یہ بھی ہے کہ اگر پھل توڑ دیا تو ختم ہوگیا، جنت میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہوں گی، کھڑے، بیٹھے، لیٹے جس حالت میں خیال آیا درخت جھک کر پھل خود بخود آ گیا، جتنا لیا فوراً اتنا اس میں اور پیدا ہوگیا، آبخورے میں پانی ضرورت کی مقدار میں آ گیا، پینے کے بعد آبخورہ خود بخود اپنے مقام پر جا پہنچا، پھلوں کے ذائقے مختلف، لذیذ اور خوشبودار، نہ چھلکا، نہ ہڈی، نہ اور کوئی عیب، بالکل تازہ، دلفریب و دلکش، وہاں کوئی مشقت نہیں، کپڑے میلے نہیں ہوں گے، نہ پیشاب، نہ اور کوئی غلاظت ہوگی، نہ کوئی بدبوئی اور نہ کوئی مَیل وغیرہ۔

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا﴾ (اور پھلوں کے گچھے جھکے ہوئے لٹک رہے ہوں گے) جنتی انہیں بڑی آسانی سے تناول کر سکیں گے۔

﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا﴾ (اور ان پر چاندی کے برتن پھیرے جائیں گے، اور آبخورے (گلاس) جو شیشے کے ہوں گے اور شیشہ چاندی کا ہوگا) اہل بہشت یا خدام اس گلاس کا اندازہ کریں گے، اندازہ کرنا، یعنی خواہش سے کم بھی نہ ہوگا اور نہ زیادہ ہوگا، جنتی کی خواہش کے مطابق ہوگا، اور برتن چاندی کے ہوں گے۔ دوسری جگہ سونے کا بھی ذکر ہے، تو کبھی سونے، کبھی چاندی کے ہوں گے۔ پھر عجب یہ کہ وہ چاندی شیشے کی ہوگی، شیشے کی طرح شفاف ہوگی، گویا ان برتنوں میں بیک وقت چاندی اور شیشے کی خصوصیات سب موجود ہوں گی، دنیا میں ایسا مرکب برتن اگرچہ نہیں، مگر جنت کی ہر چیز عقل سے بالاتر ہے۔

اس دنیا میں سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا مرد اور عورت سب کے لئے حرام ہے، البتہ! عورتوں کے لئے ریشم کا لباس دنیا میں جائز اور مردوں پر حرام ہے۔ برتن کے علاوہ سونے کی گھڑی اور انگشتری بدستور مردوں

پر حرام ہے۔

ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونا اور ریشم ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کے مردوں کے لئے اسے حرام قرار دیا ہے، اور عورتوں کے لئے جائز ہے۔ [أبو داؤد] البتہ مرد کے لئے صرف چاندی کی انگشتری جو ایک مثقال سے کم، یعنی تین ماشہ کی ہو جائز ہے، اور سونا مطلقاً حرام ہے۔ مزید فرمایا:

﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا﴾ (اور انہیں ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں زنجبیل کی ملاوٹ ہوگی) ادرک کو خشک کرنے سے زنجبیل اور سونٹھ تیار کرتے ہیں، یہ بہت عمدہ چیز ہے، دماغ، معدہ اور سینہ کے لئے اس کا استعمال عام ہے، خوشبودار بھی ہے، قوت حافظہ کے لئے بڑا مفید ہے۔

گزشتہ آیت میں ''کافور'' کا بیان تھا، اس آیت میں ''زنجبیل'' کا بیان ہے۔ دراصل ''کافور'' بھی جنتی چشمے کا نام تھا، اور زنجبیل بھی چشمے کا نام ہے، جس کو ''سلسبیل'' کہتے ہیں۔

﴿عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا﴾ (یہ ایک چشمہ ہے، جس کو ''سلسبیل'' کہتے ہیں) جس طرح ''کوثر'' ایک چشمہ ہے۔ ''تسنیم'' ایک چشمہ ہے، اسی طرح سلسبیل بھی ایک چشمہ ہے۔ ''البدور السافرة'' میں حاوی الارواح اور قرطبیؒ کے ''التذکرة'' وغیرہ کتب میں بہت سے جنتی چشموں کا بیان ہے۔ دنیاوی شربتوں میں روح کیوڑہ، عرق، گلاب اور روح کیلا، روح لائچی ملانے سے شربت کا فائدہ دوبالا ہو جاتا ہے، اسی پر جنتی مشروبات کو قیاس کیا جائے، مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنتی چیزوں اور دنیوی چیزوں کے ناموں میں صرف لفظی اشتراک ہوتا ہے، مزید کوئی برابری ممکن نہیں۔

﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ﴾ ان ''وِلدان'' کو ''غلمان'' کہا جاتا ہے، موتی اور جواہرات سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ہر جنتی کے لئے ایک ہزار خدام ہوں گے۔ بعض روایات میں پانچ ہزار اور بعض روایات میں ہر جنتی کے لئے دس ہزار خدام وغلمان کا ذکر ہے، یہ مختلف تعداد جنتیوں کے مراتب و درجات کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔

فرمایا: تو انہیں حسین وجمیل بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح پائے گا، اگر موتیوں کے ہار یا تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور اس کے دانے فرش پر مختلف سمت بکھر جائیں، تو کیسا خوبصورت منظر ہوگا، یہ غلمان اسی طرح میدانوں، محفلوں اور خیموں میں آپ کو بکھرے ہوئے موتی معلوم ہوں گے، جس سے جنتی فضاء کا حسن دوبالا ہوگا، یہ نہایت

خوبصورت بچے ہر وقت ان کی خدمت بجالانے کے لئے ان کے آگے، پیچھے پھرتی سے دوڑ رہے ہوں گے، اور جب وہ جنت کے مرغزاروں میں اہل جنت کی خدمت میں ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہوں گے تو یوں معلوم ہوگا کہ کوئی موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہے، اور اس کے تابندہ اور خوشرنگ رنگیلے موتی ادھر ادھر لڑھکتے چلے جا رہے ہیں، اور یہ حسین و جمیل بچے جنتیوں کی خدمت پر مامور ہوں گے۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا تذکرہ فرمایا، مگر ان کی نسل اور پیدائش کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، لہٰذا سوال ہوگا کہ یہ بچے (جن کی تعداد جنتیوں سے کہیں زیادہ ہے) کون ہیں؟ کوئی دنیوی مخلوق ہے یا حوروں کی طرح جنتی مخلوق ہے؟ تو اس کے متعلق دو قسم کی روایات پائی جاتی ہیں: ایک تصور یہ ہے کہ کفار کے وہ نابالغ بچے، جو سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں، یہ وہی بچے ہوں گے، کیونکہ وہ مکلف نہ ہونے کی وجہ سے دوزخ میں تو نہیں جائیں گے، لہٰذا انہیں جنتیوں کی خدمت پر مقرر کئے جائیں گے، مگر یہ نہایت ضعیف قول ہے، جس میں صرف لڑکوں (ذکور بچے) کو شامل کیا جاسکتا ہے، لڑکیوں کو کسی طرح شامل نہیں کر سکتے۔

دوسرا قول یہ ہے اور صحیح قول بھی یہی ہے کہ حوروں کی طرح یہ بھی ایک مستقل جنتی مخلوق ہے، جسے اسی مقصد کے لئے ربّ العزّت سبحانہ جنت میں تخلیق فرمائیں گے، اور اہل ایمان جنتیوں کی خدمت پر مامور فرمائیں گے۔

﴿وَاِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّمُلۡکًا کَبِیۡرًا﴾ (اور جب تو دیکھے گا اس مقام پر تو دیکھے گا بڑی نعمت اور بڑی بادشاہت) یعنی بہشت میں ہر شخص بادشاہ ہوگا، جس کی اپنی حکومت ہوگی اور بادشاہوں سے بڑھ کر تمام نعمتیں اسے میسر ہوں گی، یہ نعیم و ملک کبیر کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ ہر جنتی کو ہر قسم کا آرام و سکون اور ہر قسم کی اعلیٰ درجے کی بے شمار نعمتیں حاصل ہوں گی۔

دراصل یہ تمام لفظی اشتراک کے طرز پر نعمتوں کا بیان ہے، معنوی حقیقت کچھ اور ہے، جس کی نہ حد ہے اور نہ اندازہ، کیونکہ ساری دنیا کی سلطنتیں ایک ادنیٰ جنتی کی سلطنت کے سامنے ہیچ ہیں، جنتی وہاں ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کے ضابطہ و قانون کے ساتھ حکمرانی کرے گا، جو خیال میں آیا وہ فوراً موجود ہوا، دنیا کی سلطنتوں کا حال ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان کے لباس، تاج، خزانے اور تخت کانٹوں سے بھرے پڑے ہیں، کہاں دنیا کی سلطنت اور کہاں جنتی مسلمان کا مقام؟ قطرہ اور سمندر کا فرق ہے۔ جنت میں حضرت ربّ العزّت سبحانہ کی بار بار زیارت، انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، علماء، ائمہ اور صالحین کی رفاقت اور دیگر بے شمار نعمتیں جن کا احاطہ ہی مشکل ہے، ان میں سے ادنیٰ نعمت کا وہ

مقام ومرتبہ ہے کہ پوری دنیا اس کی قیمت ادا کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا کیا ہے، اس کی سلطنت کیا ہے، کانٹوں سے بھرے ہوئے بے حقیقت سرمایہ ہے، صرف چند مادیات پر مشتمل ایک تاریک گھر ہے، روحانیت سے سراسر خالی ہے، جنت الکافر اور سجن المؤمن اس کی شناخت و پہچان ہے، وغیرہ۔

البتہ! یہ مسلّم ہے کہ اعلیٰ چیز کا حصول آسان نہیں ہوتا، اس کی قیمت بھی اعلیٰ اور گراں ہوتی ہے، لہٰذا یاد رہے کہ جنت تک پہنچنا بڑا دشوار اور کٹھن ہے، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو بھائی! جنت کا سودا بڑا مہنگا ہے، اس کو تلاش کرو اور اس کے حصول کے لئے خوب کوشش کرو، یہ سودا بہشت کا سودا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ [ترمذي]

وہاں پہنچ کر حظیرۃ القدس کا ممبر بن جانا بڑی بات اور بڑا اعزاز ہے، دنیا میں اسمبلی، پارلیمنٹ، سینٹ وغیرہ کی ممبری کے لئے مسلم اور غیر مسلم دوڑ دھوپ کرتے ہیں، اور بے شمار سرمایہ ضائع کرتے ہیں، مگر ہر ایک کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے، آپ ہمت کریں، بغیر سرمایہ وخوش آمد کے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کا ممبر بنیں، قرآن و حدیث کو سینے سے لگا کر ان کو رہبر و راہنما بنائیں، ان پر خوب اخلاص کے ساتھ عمل کریں، ان شاء اللہ آپ حظیرۃ القدس کے ممبر بن جائیں گے، اور نعیم و ملک کبیر کی معطر اور خوشگوار فضاؤں میں پہنچ جائیں گے، اے ربّ کریم! ہمیں اس کا اہل بنا اور رحم فرما۔ آمین

﴿عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ﴾ (ان کے اوپر باریک ریشم کا لباس ہوگا، جو سبز رنگ کا ہوگا اور موٹے ریشم کا)۔ ریشم دنیا میں بہت مہنگا اور نایاب ہے، مردوں پر حرام اور عورتوں کے لئے جائز ہے، عرب لوگ ریشم کو سید الملابس، یعنی تمام لباسوں کے سردار کے نام سے یاد کرتے ہیں، جنت چونکہ تمام نعمتوں کا گہوارہ ہے تو جنت میں جنتیوں کی ہر قسم کی پوشاک، بلکہ ہزاروں لاکھوں اقسام پر مشتمل ہوگی، وہ دبیز، نرم و نازک لباس جو جنت میں بے حساب مہیا ہوں گے۔ سبحان اللہ

ایک حدیث میں وارد ہے کہ یہ اعلیٰ ریشمی کپڑے جنت کے درختوں کی پیداوار ہیں، سارا دن یہ سلسلہ جاری رہے گا، اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی، اگر جنتی حور جنتی ریشم کے ستر جوڑے زیب تن کرے تو یہ بآسانی کرسکتی ہے، اور ستر جوڑے کا وزن تقریباً ایک خوبصورت سامنے والے انسان کے دانت جتنا ہوگا، سبحان اللہ وبحمدہ۔ ستر جوڑے کا وزن دانت کے وزن کے ساتھ برابر ہونا انسانی عقل وفہم کے لئے کسی معمہ سے کم نہیں، مگر یاد رہے! جنت کی ہر چیز کا

ادراک نا قابل فہم ہے۔

﴿وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (اوران کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے) دوسری جگہ سونے کا بھی ذکر آیا ہے، مگر وہ مقرّبین کے لئے ہے۔ فرمایا: مقربین کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور موتیوں کے ہار ان کے گلے کی زینت بنیں گے۔ کنگن کا رواج پہلے زمانوں میں امراء وسلاطین کا محبوب وپسندیدہ رواج ہوتا تھا، عام لوگ آج اس کی جگہ گھڑی کو پسند کرتے ہیں، اور بہت ہی مہنگی گھڑی اس وقت صدور، وزراء، بادشاہ وغیرہ لوگ پہنتے ہیں، یہاں اس جنتی گھڑی کا نام شاید کنگن ہو، چونکہ جنت کی نعمتوں کی نہ کوئی حد ہے اور نہ اندازہ، اور وہاں کی زندگی انسانی عقل وتصور سے بالاتر ہے، وہاں وہ وہ نعمتیں ہیں جن کا دنیا میں نہ وجود ہے اور نہ خیال ووہم۔ اگر وہاں جنتیوں کو ہار یا کنگن پہنایا جائے تو اس ماحول کے عین مطابق ہوگا، کیونکہ ہر ماحول ومعاشرہ کی نزاکتیں اسی کے مطابق ہوتی ہیں۔

﴿وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ (اور سیراب کرے گا ان کو ان کا ربّ عزّ مجدہٗ شراب طہور سے)۔

﴿اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ (اللہ ربّ العزّت جنتیوں سے فرمائیں گے: یہ تمہارے اعمال کی جزاء ہے، تمہارے ایمان اور نیکیوں کا بدلہ ہے، جو تم نے دنیا میں کئے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا ۢ بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقة: ۲۴] (کھاؤ پیو بڑے مزے کے ساتھ، بہ سبب اپنے ان اعمال کے جو تم لوگوں نے دنیا میں بجالائے)۔ ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ [الأنعام: ۱۳۲] (ہر ایک عمل کے مطابق اس کا درجہ ہوگا)۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ ایمان جو کہ اصل درخت ہے اعمالِ صالحہ سب اس کی شاخیں ہیں، جنت کے لئے صرف رضاء الٰہی اور اس کی بخشش مقرر ہے، مگر اعمال اسباب کے درجے میں ضروری ذخیرہ ہیں۔ واللہ ولي التوفیق

فرمایا: ﴿وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ (اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر جو محنت وکوشش تم نے دنیا میں کی ہے ان کی قدردانی ہوگی) تمہارے اعمال رائیگاں نہیں گئے، ان کی بڑی قدردانی ہوگئی ہے، اور یہ بیش بہا نعمتیں تمہارے اعمال کی جزاء اور نعم البدل ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا

طَوِيلًا ۝٢٦ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ۝٢٧

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ پر قرآن پاک کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۝۲۳ پس آپ اپنے ربّ کے حکم کے سامنے صبر کریں، آپ ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکر گزار کی بات نہ مانیں۝۲۴ اور صبح وشام اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں۝۲۵ اور رات کے وقت اپنے ربّ کے سامنے سجدہ ریز ہوں، اور رات کے ایک لمبے حصے میں اس کی تسبیح بیان کریں۝۲۶ بیشک یہ لوگ دنیا کی زندگی سے محبت رکھتے ہیں، اور اپنے آگے (قیامت کا) بوجھل دن چھوڑ رہے ہیں۝۲۷

معارف ومنازل

شروع سورت میں انسان کی تدریجی پیدائش کا﴿مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ﴾ میں بیان تھا، اب سورت کے آخر میں قرآن حکیم کی تدریجی نزول کا بیان ہے، یہ دونوں تدریجی مراحل بڑی بڑی حکمتوں پر مبنی ہیں۔ دوسری جگہ اس حکمت کو یوں بیان فرمایا:﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾[الإسراء: ۱۰۶] (اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے، تا کہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ، اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اُتارا ہے)۔ انزالِ قرآن سے مقصود اصلی مطلب سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہے، جسے ''تدبر وتذکر'' کہتے ہیں، لیکن اس کے نفس الفاظ وحروف بھی نور وبرکت سے خالی نہیں جیسے کہ فرمایا:﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾[ص: ۲۹] (یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں، اور تاکہ اہل عقل نصیحت پکڑیں)۔

اسی لئے سورتیں اور آیتیں جدا جدا رکھیں، تاکہ وظیفہ کے طور پر تلاوت کرنا بھی سہل ہو، اور سننے والوں کے لئے حفظ وفہم میں بھی آسانی رہے، اور آہستہ آہستہ اس لئے اتارا کہ جیسے حالات پیش آئیں گے ان کے مناسب ہدایات حاصل کرتے رہیں، تاکہ وہ جماعت جسے آگے چل کر تمام دنیا کا معلم بننا تھا، ہر آیت وحکم کے موقع ومحل کو بخوبی ذہن نشین کر کے یاد رکھ سکے، اور آنے والی نسلوں کے لئے کسی آیت کے بے موقع استعمال کرنے کی گنجائش نہ چھوڑے۔ [تفسیر عثمانی]

عتبہ بن ربیعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دن کہا تھا کہ میں اپنی لڑکی بغیر مہر کے آپ کے نکاح

میں دوں گا، اور ولید بن مغیرہ نے آپ کو حسب منشاء بہت مال دینے کی پیشکش کی تھی، مطلب ان کا یہ تھا کہ آپ ﷺ دعوت وتبلیغ کا کام ترک کریں، اور ہمارے باطل معبودوں کی مذمت چھوڑ دیں، ساتھ ساتھ ابو جہل نے بھی یہ کہا تھا کہ اگر میں نے حضرت کو نماز پڑھتے دیکھا تو یہ کروں گا وہ کروں گا، یعنی اس کو ایذا اور تکلیف پہنچاؤں گا۔

پھر یہ لوگ ایک اجتماعی میٹنگ کر کے ابو طالب کے پاس آئے کہ آپ اپنے بھتیجے سے کہہ دیں کہ وہ اگر سرداری چاہتا ہے تو ہم سارے مل کر اس کے سر پر سرداری کی دستار باندھیں گے، اگر اس کو شادی کا شوق و رغبت ہو تو جو لڑکی وہ پسند کرے ہم اس کا مطالبہ منظور کریں گے، اگر وہ مال چاہتا ہے تو اس کے منہ مانگے مال کا ڈھیر اس کی خدمت میں پیش کریں گے، اگر وہ یہ تینوں چیزوں کا بیک وقت مطالبہ کرے تو ہم لوگ بخوشی منظور کریں گے، ہمارا صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ ہماری دل آزاری نہ کرے، اور ہمارے معبودوں کا پیچھا چھوڑ دے۔

جب ابو طالب نے یہ قومی مطالبات آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کیے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اپنے ربّ کی طرف سے مامور ہوں، یہ مال ومتاع، یہ نکاح اور سرداری میرے پروگرام میں ہیچ ہیں، میرا مشن توحید اور تکمیل دین الٰہی ہے، یہ دنیا میرے نزدیک کچھ بھی نہیں، قریش کی سرداری اور مال کیا، اگر دین الٰہی کے عوض سارے جہاں کے مال ومنال اور سرداری کی پیشکش ہو تو مجھے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں، اور نہ ہی کوئی تمنا و رغبت ہے۔ حضرت حفیظ جالندھری نے اپنی گرانقدر تالیف شاہنامہ اسلام میں اس پورے واقعہ کو نظم میں ترتیب دے کر بیان کیا ہے، وہ یہ ہے:

کفار قریش کے عزائم:

ابو جہل و امیہ، بولہب عقبہ ابو سفیان
ولید و عاص و عتبہ الغرض سارے یہ بے ایمان

یہ فرزندانِ تاریکی جو نورِ حق سے گھبرائے
ہوئے ایک دن اکٹھے اور ابو طالب کے گھر آئے

کہا ہم کو بھتیجا آپ کا بے دین کہتا ہے
ہمارے دین کو انسان کی توہین سمجھتا ہے

برا کہتا ہے وہ چھوٹے بڑے سارے خداؤں کو

ہبل کو لات کو عزی کو دیوی دیوتاؤں کو

ہمارے باپ وداداؤں کو بھی گمراہ کہتا ہے
سوا اپنے خدا کے سب کو غیر اللہ کہتا ہے

بس اب برداشت کر سکتے نہیں ہم اس کی جرأت کو
کسی دن دیکھ لیں گے اس کو اور اس کی نبوت کو

ہم اپنے دین کی توہین پر چپ رہ نہیں سکتے
تمہارے پاس آئے ہیں کہ بس اب سہہ نہیں سکتے

تم اس کا ساتھ چھوڑ دیا کرو تنبیہہ و سمجھاؤ
و اگر نہ جنگ کا سامان کرو میدان میں آؤ

یہ کہہ کر چل دیئے سب لوگ ابو طالب بھی گھبرائے
انہیں ڈر تھا مبادا قوم ہی سے جنگ چھڑ جائے

بلایا آپ کو نرمی سے بولے جان عم دیکھو
تمہیں لازم ہے ڈالو اس چچا پر بار کم دیکھو

تم اپنے دین کی تلقین کو رہنے دو اور جانے دو
بڑھاپے میں ہماری شان پر دھبہ نہ آنے دو

میں بوڑھا ہوں اکیلا کل عرب سے لڑ نہیں سکتا
میں اڑ بھی جاؤں تو سارا قبیلہ اڑ نہیں سکتا

جواب

چچا کے دامن شفقت کو بھی ہٹتا ہوا پایا
تو ہو کر آبدیدہ ہادی برحق نے فرمایا

قسم اللہ کی سارا جہاں بھی ہو اگر دشمن
یہ سب شیطان کے ساتھی بڑھیں ہو کر بشر دشمن

جفاء وظلم کی آندھی چلے طوفان آجائیں
مٹانے کو مرے شداد اور ہامان آجائیں

کسی دھمکی کسی ڈر سے میرا دل گھٹ نہیں سکتا
مجھے یہ فرض ادا کرنا ہے اس سے ہٹ نہیں سکتا

میرے ہاتھوں میں لاکر چاند وسورج بھی اگر رکھ دیں
مرے پیروں تلے روئے زمین کا مال وزر رکھ دیں

خدا کے کام سے میں باز ہرگز رہ نہیں سکتا
یہ بت جھوٹے ہیں میں جھوٹوں کو سچا کہہ نہیں سکتا

میں سچا ہوں تو بس میرے لئے میرا خدا بس ہے
کسی امداد کی حاجت نہیں اس کی رضا بس ہے

مرا ایمان ہے ہر شی پہ قادر حق تعالیٰ ہے
وہی آغاز کو انجام تک پہونچانے والا ہے

ابوطالب کا جواب وتاثر:

ابوطالب نے حیرت سے بھتیجے کی طرف دیکھا
جلال مصطفی میں نور حق جلوہ نما پایا

کہا اے جان عم میں اب کسی سے ڈر نہیں سکتا
جہاں میں کوئی تیرا بال بیکا کر نہیں سکتا

کرو تلقین نبوت کی مٹادو لات وعزی کو
میں آپ کے ساتھ ہوں آپ سے جدا ہی کر نہیں سکتا

فرمایا: میں ایک جہاں کیا سارے جہانوں کے عوض توحید الٰہی کے سودا کرنے پر رضامند نہیں، اسی پر فرمایا: ﴿فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا﴾ (آپ صبر کر کے اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کریں، اور بات نہ مانیں کسی گنہگار یا کسی ناشکر کی)۔ یہ عتبہ اور ولید وغیرہ کفار قریش آپ کو دنیوی لالچ دے کر اور چکنی چپڑی باتیں

بنا کر چاہتے تھے کہ آپ کوفرضِ تبلیغ ودعوت سے باز رکھیں، اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمادیا کہ آپ ان میں سے کسی کی بات نہ مانیں، کیونکہ کسی گنہگار یا فاسق یا ناشکر کافر کا کہا ماننے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں، ایسے شریروں اور بدبختوں کی بات پر کان دھرنا نہیں چاہئے۔[عثمانی]

سورۂ نون میں ہے کہ:﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ [القلم:۹] (یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کروتو وہ بھی نرم ہوجائیں)۔وہ کہتے ہیں کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں،شرک وکفر کی تردید نہ کریں،آپ اپنی نماز عبادت کیا کریں، ہم مداخلت نہیں کریں گے،اسی پر فرمایا:﴿ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ ﴾ کہ توحید کی اشاعت میری جان ہے اور لازمی ہے، میں کسی کافر کے ساتھ مصالحت کر کے اپنا فرض منصبی ہرگز نہیں چھوڑ سکتا، دین الٰہی کے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرسکتا۔عام فریضہ کے بعد اب ایک خاص فریضہ کا بیان ہے:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ (یاد کرلیا کرو اپنے ربّ کا نام صبح بھی شام بھی)۔بعض مفسرین حضرات نے اس سے پنجگانہ نمازیں اور ان کے اوقات مراد لئے ہیں۔بُكْرَة سے مراد صبح کی نماز اور اَصِيْلًا أصیل زوال سے غروب تک کا نام ہے، اس سے ظہر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں۔﴿وَمِنَ الَّيْلِ﴾ سے مغرب اور عشاء کی نمازیں، اور﴿وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا﴾ سے مراد نماز تہجد ہے۔تہجد کی نماز پر سورۂ مزمل میں تفصیل گزر چکی۔

فرمایا: رات دن نماز ادا کرتے رہیں، یہ تعلق باللہ کا اکسیری نسخہ ہے، اس سے مصائب ہلکے اور دور ہوجائیں گے، صبر کا جذبہ پیدا ہوگا، دشمن کا مقابلہ آسان ہوجائے گا، گناہ معاف ہوجائیں گے، گزشتہ بیان شدہ نعمتوں کا حصول ممکن ہوگا۔[کبیر]

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں اوقاتِ صلوٰۃ کے علاوہ مطلق ذکر ہی مراد ہے، جو کہ مؤمن کی قوت کا سرچشمہ اور اس کی طاقت کا راز ہے، اور ذکر اللہ کی اتنی بڑی عظمت ہے جسے شریعت میں اہم مقام ومرتبہ حاصل ہے، کیونکہ ذکر الٰہی کے لئے کوئی وضع قطع اور کوئی مقرر وقت متعین نہیں، وہ ہر حال اور ہر وقت جاری رہ سکتا ہے، بخلاف دیگر عبادات کے۔ فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝۴۱ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۴۲﴾ [الأحزاب] (اے ایمان والو! خواب زیادہ اللہ کا ذکر کرو، اور اس کی پاکی بیان کرو صبح وشام)۔اسی طرح:﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾[آل عمران:۱۹۱] (جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں)۔

حدیث میں وارد ہے: "مامن شيء أنجي من عذاب الله من ذكر الله"۔[ابن ماجة] حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں کی ابتداء اور اختتام دونوں ذکر اللہ کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔[ترمذي] پھر طول اللیل بہتر ہے کہ نمازوں، تہجد، اوراد، اذکار وتسبیحات وغیرہ طاعات میں صرف ہوں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال تک فجر کی نماز عشاء کے وضوء سے ادا فرماتے رہے، یہ عملِ صالح اور خصلتِ حمیدہ امت کے اکابرین، فقہا، علماء، صلحاء، محدثین، صوفیاء، مفسرین، حفاظ وقراء ودیگر ذاکرین خاشعین کا زندگی بھر معمول رہا۔ رحمهم الله تعالىٰ

﴿إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ﴾ (یہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں) اور دنیوی زندگی پر غرّہ وفریفتہ ہیں۔ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ مکھی کی فطرت ہے ہر وقت گندگی پر بیٹھنا، اسی طرح دنیادار لوگ دنیا کی عاجلہ گندگیوں کو پسند کرتے ہیں، اور معاصی سے خوش ہوتے ہیں، طاعات سے دور بھاگتے ہیں، دوزخی اعمال پر فخر کرتے ہیں۔

﴿وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا﴾ (یہ لوگ اپنے پیچھے قیامت کا سخت ومشکل دن چھوڑ رہے ہیں) اگر ان کو دنیا کی محبت نہ ہوتی تو قیامت کا منکر نہ ہوتے، اگر یہ قیامت پر یقین رکھتے تو دنیا سے عشق ومحبت نہ کرتے، یہ دونوں چیزیں آپس میں اضداد ہیں، یہ چند دنیاداروں کی غلط فہمی ہے کہ وہ کہتے رہتے ہیں کہ الحمد للہ ہمارے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں۔

ہارون رشید امیر المؤمنین بہ نسبت دوسرے خلفاء عباسیہ کے دیندار اور متبعِ شریعت گزرے ہیں، روزانہ ایک سو رکعت نوافل پڑھنے کا معمول تھا، ایک دن مجلس میں کہنے لگے: الحمد لله الذي جمع لنا الدنيا و الآخرة۔ لوگ احتراماً خاموش رہے، اچانک حضرت بہلول مجلس میں آپہنچے اور کہنے لگے: کیا ہورہا ہے؟ لوگوں نے واقعہ سنایا، تو فرمایا: اے بادشاہ سلامت! آپ بڑے ہیں یا ہمارے پیغمبر جناب حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم؟ بادشاہ نے کہا: مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چپل بھی بڑے محترم ہیں، میں ان کے چپل کے گرد وغبار سے بھی کمتر ہوں، کہا: اچھا جب یہ بات ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں، تو بادشاہ نے حاضرین مجلس سے پوچھا کہ کیا یہ دیوانہ ابدال صحیح کہتا ہے یا غلط؟ سب نے کہا: صحیح کہتا ہے، بس ہارون خاموش ہوئے اور اختتامِ مجلس تک کچھ نہ بولے، یہاں تک کہ مجلس برخاست ہوئی۔

یاد رہے! دنیا مال کو نہیں کہتے ہیں، دنیا نام ہے مال کے ساتھ غیر شرعی محبت اور احکامِ الٰہی سے غفلت کا، اگر

مال کی کمائی اور انفاق شرعی ہو، اور حقوق اللہ وحقوق العباد کی رعایت ہو، تو ایسے مالداروں کا شمار دنیاداروں میں نہیں ہوگا۔ بالفرض! اگر مال کچھ بھی نہ ہو، اور آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل ہو، طاعات وعبادات سے لاپرواہ ہو، تو اس مسکین کا شمار بھی دنیاداروں میں ہوگا، کیونکہ دنیا مال کا نام نہیں، بلکہ غفلت کا نام ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن ☆ نے طلا ونقرہ وفرزند زن

(مثنوی رومی)

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾
يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ: ہم نے ہی انسانوں کو پیدا کیا، اور ان کی جوڑ بندی کو مضبوط کیا، او جب ہم چاہیں گے ان کی جگہ ان جیسے اور لائیں گے ﴿۲۸﴾ بیشک یہ یاددلانے والی باتیں ہیں، پس جو چاہے اپنے ربّ کی طرف راستہ پکڑ لے ﴿۲۹﴾ اور تم نہیں چاہو گے، مگر یہ کہ اللہ چاہے، بیشک اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے ﴿۳۰﴾ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے، ظالموں کے لئے اس نے عذاب الیم تیار کیا ہے ﴿۳۱﴾

معارف ومنازل

ہم نے انسانوں کو پیدا کیا، اور جب چاہیں گے انہیں دوبارہ اٹھائیں گے، کافر کہتے ہیں کہ مرے ہوئے لوگ کبھی زندہ نہیں ہوتے، ہم نے تو مر کر دوبارہ کسی کو اٹھتے نہیں دیکھا، یہ ان کی بے عقلی اور نادانی کی بات ہے کہ وہ قیامت کے اٹھنے کو اسی دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے وقت مقرر کیا ہوا ہے، ﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ [الطلاق: ۳] (یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے)۔ دوباہ زندگی کے لئے قیامت کو مقرر کیا ہے، نہ کہ اس جہاں کو، تو یہ لوگ جو قبل از وقت کی بات کرتے ہیں یہ ان کی نادانی ہے۔

یہ سب کو معلوم اور یقین ہے کہ درخت سبز ہوتے ہیں، مگر اپنے وقت پر، وقت سے پہلے نہ درخت سبز ہوں گے نہ اور کوئی چیز، سورج کے طلوع وغروب سے کوئی منکر نہیں، مگر وہ اپنے وقت سے پہلے ممکن نہیں، پہلی مرتبہ پیدا کرنے والا

اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو دوسری مرتبہ بھی وہی ذات پاک ہے، جب اول مرتبہ کی پیدائش بغیر نمونہ ومثال کی ہوئی، جبکہ یہ نسبتاً مشکل بھی ہے تو دوسری مرتبہ تو بڑا ہی آسان ہوگا، کیونکہ مثال سابق موجود ہے۔ ﴿وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [الروم:۲۷] (اور یہ اس کو بہت آسان ہے)۔

﴿وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ﴾ (ہم نے اسے پیدا کیا اور اس کی جوڑ بندی مضبوط کی)، اس کے اعضاء، اعصاب جوڑ، پٹھے، رباط، ویرنگ، ترتیب، بناوٹ، یہ تسمے، یہ ویرنگ اعضاء اور جوڑوں میں پیوستگی مکمل کرلی، پس اس جوڑ بندی میں وہ کمال درجے کا ارتباط جوڑ کھا گیا ہے، جس کا انسانی مصنوعات میں نہ بدل ہے، نہ مثال ونمونہ۔ اسٹیل وفولاد کے کارخانہ میں ہزاروں مصنوعات مشینیں گاڑیاں اور دیگر مشینری مضبوط سے مضبوط پرزے بنتے ہیں، چند وقت کے استعمال کے بعد گھس جاتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں، ناکارہ ہوجاتے ہیں اور بار بار مرمت وتبدیلی کے باوجود پھر خراب ہوجاتے ہیں، مگر انسانی اعضاء اور جوڑ شب وروز حرکت میں رہتے ہیں، کسی کی عمر سو سال یا اسی یا ستر پچاس ساٹھ سال جیسے کے پہلے لوگوں کی عمریں ہزار سال، آٹھ نو سات سو، چھ سو سال رہی، مگر کہیں بھی اعضاء اور اعصاب اور جوڑوں کی تبدیلی کی نوبت نہیں آئی۔

عام آدمی صبح سے شام تک ہاتھوں کو ہلا ہلا کر حرکت دے کر کام کرتا ہے، اگر وہ صرف اپنے ہاتھوں کی روزانہ حرکتوں کو شمار کرے تو ہزاروں میں ہوں گے، پھر ہفتہ اور مہینے کے دنوں کے ساتھ ضرب دیدیں، تو لاکھوں اس طرح سالوں میں اور پوری عمر کے سالوں کے ساتھ تو کھربوں اور پدموں میں ہوں گے ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون:۱۴] (پس برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے)۔ صبح سے شام تک ان سارے اعضاء کی حرکت کا سلسلہ جاری ہے، پھر لطف یہ ہے کہ ان جوڑوں کی بناوٹ کا مادہ نہ اسٹیل ہے، نہ فولاد اور نہ پتھر، بلکہ نہایت نرم و نازک ہڈیوں، گوشت، رگوں، پوست، وخون سے مرکب ہیں، اگر اسی ایک قدرتی تخلیق پر کوئی ریسرچ کرے تو شاید اللہ تعالیٰ کی حقانیت سمجھ میں آجائے۔ اگلی آیت میں اس کا جواب واضح طور پر موجود ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۳۰ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۳۱﴾۔ پھر فرمایا:

﴿وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا﴾ (جب ہم چاہیں گے ان کی جگہ ان جیسے اور لے آئیں گے) یعنی اس جوڑ بندی کے مطالعہ کے بعد دوبارہ انہیں اٹھانا اور انہی جیسے اعضاء کے ساتھ اٹھانا اور پیدا کرنا کونسا مشکل ہے؟

یہ ہماری مشیت کے عین مطابق ہے، جب بھی ہم چاہیں گے قیامت برپا کردیں گے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لائیں گے اور اپنی رزیل حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے تو ہمارے لئے آسان ہے کہ انہیں ختم کریں، طوفانوں، قحط اور جنگوں کے ذریعہ یا طبعی موت کے ساتھ ان کو ختم کریں گے، اور ان کی جگہ انہی میں سے (ان کی اولاد اور قوم میں سے) نیک اور فرمانبردار لوگ لے آئیں گے، وہ لوگ فرمانبردار اور حق کے ساتھ چلنے والے ہوں گے۔

سورۂ محمد کے آخر میں فرمایا: ﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد: ۳۸] (اور اگر تم منہ پھیروگے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا، اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے) چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ سارے کذّاب صنادید تباہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اس قریش کے خاندانوں میں وہ وہ ہستیاں پیدا کیں جن پر عالم اسلام فخر کرے، اور ان کی جگہ انصارِ مدینہ کو اللہ تعالیٰ نے کھڑے کرکے ان سے اسلام کی خدمت لی۔ **الحمد للہ رب العالمین۔**

اللہ ربّ العزّت خالق کائنات کے لیے یہ سب کچھ آسان ہے، وہ فعّال لما یرید لمحوں اور اشاروں میں قیامت برپا کرکے تمام انسانوں کو پہلی والی دنیوی ترتیب کے ساتھ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے، اور اس طرح نافرمانوں کی تباہی کے بعد ان کی جگہ ایک فرمانبردار قوم پیدا فرماکر اپنی قدرتِ کاملہ کا رنگ دنیا میں دکھلاسکتا ہے۔ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ [الأنعام: ۹۵] (مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے) والی اس کی ذاتی صفت ہر وقت قائم ہے۔ ؎

چون و چرا با کارِ تو عقلِ زبون را کے رسد ☆ اے قادرِ مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

(حافظ)

﴿إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾ یہ آیات یا سورت نصیحت وتذکرہ ہے، یہ یاد دہانی کی پر از نصیحت آیتیں ہیں، ان کی حقانیت میں کوئی شبہ نہیں۔...... پدر را عسل بسیار ست ولیکن پسر گرمی دار ست ......باپ کے پاس ﴿فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ﴾ [النحل: ۶۹] (اس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے) والا شہد موجود ومہیا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ بیٹے کی طبعیت پر گرمی کا غلبہ ہے، اسی طرح قرآن پاک سرتا پا شفاء ہے، ہر جسمانی وروحانی امراض کا علاج ہے مگر نافرمان مشرکوں کو راس نہیں آتا، ویسے تو سب کو اس کے تیار کردہ خیمے میں داخل ہونے کی دعوت

ہے، مگر یہ نصیب کسی کو تب ہوگا جب اللہ تعالیٰ چاہے گا، اور اللہ تعالیٰ تب چاہے گا جب کسی میں جستجو اور طلب ہوگی، اگر کسی میں طلب نہ ہوتو وہ ہدایت کی روشنی سے محروم رہے گا۔

﴿وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ (تمہارے چاہنے سے کچھ نہ ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے چاہت نہ ہو) وہی علیم وحکیم ہے، اور علم وحکمت کے سارے خزانے اس کے ہاتھ میں ہیں، وہ مختارِکُل ہے۔

﴿يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاۗءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ﴾ جسے چاہے ہدایت سے نوازے، اور اپنی بے پناہ رحمت میں اس کو داخل کردے، جسے چاہے محروم رکھے، اس سے کون پوچھے؟ ہاں! بے انصاف اور ظالم مشرکوں کے لیے اس نے عذاب الیم (دکھ دینے والا، تباہ کن عذاب) تیار کیا ہوا ہے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا و هب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب۔ امین

توحیدِ الٰہی کا کتنا بڑا جامع پیغام وسبق ہے کہ کائنات میں صرف وہی ہوگا جسے ربّ العزّت چاہے گا، یہاں تک کہ اولوالعزم پیغمبروں علیہم السّلام کے چاہنے سے بھی کچھ نہ ہوگا، حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کے لیے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لیے، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جان نثار چچا ابوطالب کے لئے کچھ نہ کرسکے، اور پھر ہر پیغمبر یہ چاہتے رہے کہ میری قوم ہدایت یافتہ دینِ حق قبول کرنے والی بن جائے، مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

روز قیامت کئی انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ کوئی ایک امتی بھی نہیں ہوگا، اور کسی کے ساتھ صرف ایک امتی ہوگا، علیٰ ہذاالقیاس۔ پس علماء، صلحاء اور اولیاء کرام کیا کچھ کرسکتے ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں کرسکتے، اور یہ بھی اس کی بے نیازی کا نمونہ ملاحظہ کریں کہ فرعون کی بیوی جنت میں، اور حضرت نوح اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں دوزخ میں۔

الحمدللہ ''سورۃ الدہر'' کی تفسیر اپنے اختتام کو پہنچی۔

سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ

مکّیّۃٌ آیاتھا ٥٠ رکوعاتھا ٢

سورۂ مرسلات مکی ہے، اس میں پچاس (٥٠) آیتیں، اور دو (٢) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورت کا نام پہلی آیت کے پہلے کلمے "الْمُرْسَلَاتِ" سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورۃ المرسلات مکی ہے، اس کا نزول سورۃ الہمزۃ کے بعد ہے۔ اکثر مفسرین اسے مکمل مکی کہتے ہیں، مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کی بعض آیتیں مدنی ہیں۔ پہلا قول راجح ہے۔ [روح المعاني الإتقان]

تعداد آیات، کلمات وحروف:

یہ سورت پچاس (٥٠) آیتوں، ایک سو اکیاسی (١٨١) کلمات اور آٹھ سو سولہ (٨١٦) حروف پر مشتمل ہے۔ [الإتقان]

ربط ومناسبت:

اس سورت کا ماقبل "سورۃ القیامۃ اور سورۃ الدہر" کے ساتھ ایسا ربط ہے کہ مضامین تینوں سورتوں کے ایک جیسے ہیں، بلکہ اس سے بعد والی دو سورتوں "سورۂ نباء اور سورۃ النازعات" سب میں توحید، دلائلِ توحید، رسالت اور اثباتِ قیامت کے ساتھ اَبرار، شاکرین اور اشرار ومشرکین کے عاقبت وانجام کا بیان ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ''مِنیٰ'' کے ایک غار میں تھے، اچانک سورۃ مرسلات نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے جاتے تھے اور میں اس کے مبارک منہ سے سنتا یاد کرتا جاتا تھا، آپ کا دہن مبارک اس کی لذت سے رطب وتازہ ہورہا تھا۔

اسی دوران اچانک وہاں سے ایک سانپ ہماری طرف آتے ہوئے نمودار ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، مگر وہ سانپ فوراً بھاگ کر پتھروں میں غائب ہوگیا، وہ اس طرح ہم سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کے شر سے محفوظ ہوئے، وہ تمہارے شر سے محفوظ ہوگیا۔ [بخاری]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ① فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ② وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ③ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ④ فَالْمُلْقِيٰتِ
ذِكْرًا ⑤ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ⑥ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ⑦ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ⑧ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ⑨
وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ⑩ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ⑪ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ⑫ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ⑬ وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ⑭ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑮

ترجمہ: قسم ہے ان ہواؤں کی جو چھوڑی گئی ہیں نرمی سے ① پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو تیز چلتی ہیں ② اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو (بادلوں کو) اٹھا کر پھیلاتی ہیں ③ پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو پھاڑ کر جدا کردیتی ہیں ④ پھر قسم ہے ان ہواؤں کی جو نصیحت کی بات ڈالتی ہیں ⑤ عذر دور کرنے کے لیے یا مجرموں کو ڈرانے کے لئے ⑥ بیشک جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے ⑦ پس جب ستارے مٹادئے جائیں گے ⑧ اور جب آسمان پھٹ جائے گا ⑨ اور جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا ⑩ اور جب رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا ⑪ کس دن کے لئے مہلت دی گئی ہے؟ ⑫ فیصلے کے دن کے لئے ⑬ اور آپ کو کس نے بتایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ ⑭ اس دن تباہی وبربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے ⑮

☆☆☆

معارف ومنازل

پہلے کئی مقامات پر بیان ہوا کہ اللہ ربّ العزّت کی کسی چیز پر قسم کھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو مدّعا پر بطور گواہ پیش کیا جاتا ہے، اور ان چیزوں کی کوئی تعظیم مقصود نہیں ہوتی، یہاں اللہ ربّ العزّت نے پانچ چیزوں کی قسم کھا کر قیامت کے یقینی اور واقع ہونے کا ذکر فرمایا ہے، ان چیزوں کا نام قرآن حکیم میں مذکور نہیں، البتہ! ان کی جگہ پانچ صفتیں بیان ہوئیں: اَلْمُرْسَلَات ، اَلْعَاصِفَات، اَلنَّاشِرَات ، اَلْفَارِقَات ، اَلْمُلْقِيَات۔

کسی حدیث مرفوع سے یہ معلوم نہیں ہوا کہ ان پانچوں صفات کے موصوفات کیا ہیں؟ اس لئے سلف صحابہ و تابعین کی تفسیریں ان کی تعیین میں مختلف ہیں، چنانچہ بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کی مختلف جماعتیں ان مختلف صفات کی حامل ہوں۔

بعض حضرات نے ان مختلف صفات کا موصوف ہواؤں کو قرار دیا ہے، کیونکہ ہوائیں بھی مختلف انواع اور مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔

بہر حال! ہواؤں کا تنوع واختلاف بھی عام فہم ہے، بعض حضرات نے ان کا موصوف انبیاء ورُسل علیہم السلام کو قرار دیا ہے۔ بعض دیگر حضرات نے کچھ صفات کا موصوف ریاح (ہواؤں) کو، کچھ کا موصوف فرشتوں کو اور بعض کا انبیاء ورُسل علیہم السلام کو قرار دیا ہے۔

امام ابن جریر طبریؒ نے توقف کو پسندیدہ بتایا ہے، اور کسی معنی کی تعیین سے احتراز کیا ہے۔ علامہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ اول تین صفات سے مراد ریاح اور آخری دو صفات کا مصداق فرشتے ہیں۔ یہ عمدہ تأویل ہے، اس میں کوئی تکلف نہیں۔ واللہ اعلم [ابن کثیر]

بہر حال! یہ دنیا دار الاسباب بھی ہے اور راحت وسکون کے ساتھ **دار الهموم والغموم** بھی ہے، انسان ایک طرف سے اس جہاں میں خیر وشر کے اختیار کرنے میں خود مختار اور اپنے نفع ونقصان کا مالک ہے، اور دوسری طرف سے نظامِ تکوینی اور قدرتی امور کے سامنے بے اختیار بھی ہے، قدرت نے نظامِ دنیا کو چلانے کے لئے جن اسباب و دواعی کو مقرر کیا ہے وہ اکثر و بیشتر فرشتوں (مدبرات امر) کے ذریعہ ہوتا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴾ [النازعات: ۵] (پھر حکم کا انتظام کرنے والے)۔

وحی الٰہی ہو یا نطفہ انسانی کے تخلیقی تدریجی مراحل ہوں، یا نظامِ کائنات میں تبدیلیوں کا سلسلہ ہو، یا انسانی

اعمال کی ضبط و کتابت ہو، یا انسانی حفاظت کی خاطر حفظہ نگہباں فرشتے ہوں، یا میدانِ کارزار میں مسلمان مجاہدین کی فتح ونصرت ہو، یا کسی مقبول بندہ کی استغاثہ ودعوات پر اس کی نصرت وبشارت ہو، یا جنت ودوزخ میں راحت وخوشی یا عقاب وعذاب کی نگرانی ہو، یا نافرماں اقوام کی تباہی ہو، وغیرہ، یہ سارے امورنورانی فرشتوں کے ذریعہ طے پاتے ہیں، زمینی امور ہوں یا آسمانی یا فضائی، مثلاً: ہواؤں کا نظام، بادلوں کا نظام، گرج چمک، رَعدوبرق، بارش وژالہ باری ، برف، اسی طرح کوہ وجبال سمندرودریاؤں کا سارانظام انہی فرشتوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

غرض یہ کہ پورے نظامِ تکوینی پر جس مقدس مخلوق کوسرانجام دہی کی خدمات پر ماموروں مقرر کیا گیا ہے، وہ یہی فرشتے ہیں کہ آسمانوں اور ملاءِ اعلیٰ سے اگر زمین والوں پر کسی رحمت وعنایت کا نزول ہوتا ہے، یا کسی عتاب وعذاب کا مرحلہ ہوتا ہے تو یہ سارے کام انہی فرشتوں کے ذریعہ سے انجام پذیر اور مکمل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف نظامِ دنیا میں جو اکثر وبیشتر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، مثلاً: سردی، گرمی بارش یا قحط یا آبادی و بربادی دیکھا گیا ہے کہ یہ امور اگرچہ ہواؤں کے پے درپے نرمی اور سختی کے چلنے میں نمایاں معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ ہوائیں ازخود نہیں چلتی ہیں، بلکہ ان کے چلانے اور ہر قسم کی تغیرات وتبدیلی بھی فرشتوں کے ذریعہ اوران کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔

پس اگران پانچوں صفات کے لئے موصوف فرشتوں کو قرار دیا جائے تو بہتر معلوم ہوگا، البتہ! ہواؤں کو بالکل سرے سے نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا، بلکہ انہیں اسی خاطر آیات کے ترجمے میں ہواؤں کا تذکرہ ہوانہ فرشتوں کا۔ اور بعض علماء نے یہ ترجمہ کا انطباق کیا لہٰذا یہ سب درست ہیں، ضمناً وبالتبع کے درجے میں رکھنا مطلب کے خلاف نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

﴿وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں (ہواؤں) کی جو دلوں کو خوش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتوں کے ہزاروں پیغام امن وخوشحالی پر مبنی ہوتے ہیں، اور یہی کیفیت بعض ہواؤں کی بھی ہے، جیسے حدیث میں فرمایا: نصرتُ بالصباء۔ [الحديث] ﴿فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو طوفانی کیفیت کے ساتھ چل کر تباہی مچاتے ہیں، اور یہی کیفیت ہواؤں میں بھی موجود ہے۔

﴿وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو رحمت الٰہی اور انعامات پورے عالم میں پھیلاتے ہیں، اس طرح ہواؤں کی خاصیت بھی یہی ہے۔ ﴿فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو حق وباطل کی تفریق

کرتے ہیں، اور یہ صفت ہواؤں میں بھی ہے، مگر بہ نسبت فرشتوں کے کم ہے، جیسا کہ معلوم ہے۔

﴿فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو ذکر و نصیحت دلوں میں ڈالتے ہیں، یہ صفت اگرچہ ہواؤں میں بھی ہے مگر قلت کے ساتھ۔

یہ مطلب اس لئے اخذ ہوا کہ نظامِ عالم میں اور اکثر و بیشتر تغیرات کی انجام دہی میں فرشتے اور ہوائیں دونوں مأمور و کارآمد ہیں، مگر فرشتے ہوا کے تابع نہیں، جبکہ ہوا ان کی تابع اور ان کے ہاتھ میں ہے۔ فرشتے ذوی الارواح و ذوی العقول ہیں، جبکہ ریاح غیر ذوی الارواح اور غیر ذوی العقول ہیں، اور ہوا کے بعد اگر بادل مجتمع ہو کر برستا ہے، تو اس کے اجتماع میں ضرور فرشتہ کا عمل دخل ہے، اور ہر قطرہ بارش کے ساتھ فرشتہ کا نزول ہوتا ہے، اور یہ بھی اس بات پر قرینہ ہے کہ ''سورۃ النازعات'' جو بعد میں آنے والی ہے، وہاں بھی شروع سورت میں بعینہٖ اسی طرح کی پانچ صفات بغیر ذکر موصوف کے وارد ہوئی ہیں، آخری صفت:

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ ہے، اور یہ بالاتفاق فرشتوں پر صادق ہے، حتیٰ کہ علامہ ابن جریر طبریؒ کے نزدیک بھی اس سے مراد فرشتے ہیں۔ واللہ اعلم

﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا﴾ اس کا تعلق آخری جملہ ﴿فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا﴾ کے ساتھ ہے، یعنی نزول وحی (ذکر) کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ کافر و مشرک کے عذر و معذرت کا دروازہ بند ہو، کل بروز قیامت وہ یہ بہانہ اور عذر نہ کرے کہ اسے کوئی سمجھانے والا نہیں آیا تھا، یا یہ مطلب ہو کہ وہ اہل حق کی کوتاہیوں سے معذرت کا سبب بنے، اور اہل باطل کے لئے انذار کا سبب بنے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جو کلامِ الٰہی امر و نہی اور عقائد و احکام پر مشتمل ہے، وہ عذر کرنے کے واسطے ہے، تاکہ اعمال کی باز پرس کے وقت اس شخص کے لئے عذر اور دستاویز ہو کہ میں نے فلاں کام حق تعالیٰ کے حکم کے بموجب کیا، اور فلاں کام اس کے حکم سے ترک کیا، اور جو کلامِ الٰہی قصص و اخبار پر مشتمل ہو وہ عموماً منکرین کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لئے ہے، اور اس سورت میں روئے سخن بیشتر مکذبین و منکرین کی طرف تھا، اس لئے بشارت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ [تفسیر عزیزی]

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ﴾ (اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، وہ واقع ہونے والا ہے) یعنی قیامت برپا ہونے والی ہے، پس حساب و کتاب ہوگا، ہر اچھے برے کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اَبرار نعیم و جنت میں

جائیں گے ہر مصیبت سے نجات پائیں گے اَشرار تباہ ہو کر ابدی جہنم کے عذاب میں خوار و ذلیل ہو جائیں گے۔

یہ قیامت کب قائم ہوگی؟ فرمایا: ﴿فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ﴾ (جب ستارے بے نور ہو جائیں گے) مٹا دیئے جائیں گے، ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ﴿وَإِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ﴾ (جب آسمان سوراخ ہو کر پھٹ جائے گا، آرپار سب کچھ نظر آ جائے گا۔ ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ﴾ (جب پہاڑ اڑ جائیں گے) روئی کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے۔ ﴿وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ﴾ (جب رسولوں کے لئے وقت مقرر کیا جائے گا، انہیں مقرر وقت پر حاضر کیا جائے گا، باز پرس ہوگی، اپنی اپنی امتوں پر گواہی دیں گے۔

﴿لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ﴾ (کس دن کی مہلت دی گئی ہے؟) وہ کونسا دن ہے جس تک مجرمین کو مہلت دی گئی ہے کہ اس میں لازمی باز پرس ہوگی۔ فرمایا: ﴿لِيَوْمِ الْفَصْلِ﴾ (فیصلے کے دن کے لئے) انہیں مہلت دی گئی ہے، دنیا میں حقیقی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ حکمت کے تقاضوں کے خلاف تھا، آج آخری دن کا حساب و کتاب حکمت کے تقاضوں کے موافق ہوگا، کیونکہ دنیا دار العمل ہے، دار الجزاء نہیں اور آخرت دار الجزاء ہے، دار العمل نہیں۔

﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ﴾ (آپ کو معلوم ہے کہ فیصلہ کا دن کب اور کیسا ہے؟) پس یہ سمجھ لو کہ اس روز سخت بربادی و تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لئے۔ ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ﴾ (تباہی و بربادی ہوگی اس روز قیامت کے منکرین کے لئے)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ویل جہنم کے اندر ایک وادی ہے، کافر اس کے اندر چالیس سال تک پہنچے بغیر لڑھکتا رہے گا۔ [ترمذي] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ویل جہنم کی ایک وادی ہے، جس میں جہنمیوں کا کچ لہو بہتا رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اسے مکذبین کے لئے مقرر فرمایا۔ [بيهقي]

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ﴿١٧﴾ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿١٨﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٩﴾ أَلَمْ نَخْلُقكُّم مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿٢١﴾ إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢٢﴾
فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ﴿٢٣﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٤﴾ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ أَحْيَاءً
وَأَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُم مَّاءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٨﴾

ترجمہ: کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟⑯ پھر ہم ان کے پیچھے پچھلوں کو لگاتے ہیں⑰ ہم مجرمین کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں⑱ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے⑲ کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟⑳ پھر ہم نے اس کو ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا㉑ ایک مقررہ مدّت تک㉒ پھر ہم نے اندازہ کیا، پس ہم خوب اندازہ کرنے والے ہیں㉓ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے㉔ کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟㉕ زندوں کو اور مردوں کو㉖ اور ہم نے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ رکھ دیئے ہیں، اور ہم نے تمہیں پیاس بجھانے والا پانی پلایا㉗ اس دن تباہی بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے㉘

معارف ومنازل

منکرینِ قیامت سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی دنیا کہاں ختم ہوتی ہے؟ بھلا کون باور کرے گا کہ سب آدمی بیک وقت ختم ہو جائیں گے؟ اور نسل انسانی بالکل نابود ہو جائے گی؟ یہ قیامت، یہ حساب کتاب، یہ دوزخ والی باتیں، سب بناوٹی خود ساختہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ پہلے کتنے لوگ مر چکے اور صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے، اور کتنی بڑی طاقتور، عظیم الجثہ سرمایہ دار، شاہو کار قومیں اپنے گناہوں اور شرک و کفر کی پاداش میں تباہ کی جا چکی ہیں، پھر ان کے پیچھے بھی موت و ہلاکت کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

جب ہماری قدیم عادت مجرموں کی نسبت معلوم ہو چکی تو خوب سمجھ لو کہ دورِ حاضر کے کفار و مشرکین کو بھی ہم ان ہی اگلوں کے پیچھے چلتا کر دیں گے، جو ربّ غیور الگ الگ زمانوں میں بڑے بڑے مضبوط لوگوں کو مار سکتا اور طاقتور مجرموں کو پکڑ پکڑ کر ہلاک و تباہ کر سکتا ہے (جیسے کہ عاد و ثمود، قومِ لوط، قومِ نوح، قومِ شعیب، قومِ تبع وغیرہ کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ختم کیا گیا) پس ربّ تعالیٰ شانہ اس پر کیوں قادر نہ ہوگا کہ سب مخلوقات کو ایک اشارے میں فنا کر دے اور تمام مجرموں کو بیک وقت (قیامت قائم کر کے یا اس سے پہلے) عذاب کا مزہ چکھائے۔ [تفسیر عثمانی]

﴿الْاٰخِرِیْنَ﴾ سے مراد امت محمدیہ کے کفار ہیں، پچھلی امتوں کی ہلاکت اور عذاب کی خبر دینے کے بعد موجودہ کفار اہل مکہ کو آئندہ ان پر آنے والے عذاب کی خبر دینا مقصود ہے، جیسا کہ ''غزوۂ بدر'' وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر ہلاکت و عذاب نازل ہوا تھا، فرق یہ ہے کہ پچھلی امتوں پر آسمانی عذاب جو آیا تھا، مثلاً: طوفان یا عاد و ثمود اور قومِ لوط، قومِ شعیب، قومِ تبع یا قومِ فرعون، وغیرہ پر اس عذاب کی نوعیت کچھ الگ تھی، وہ سارے عذاب

استیصالی تھے، جن کے ذریعہ ہر قسم کی آبادیاں اور قومیں مکمل تباہ ہوگئیں، اور روئے زمین پر ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔

مگر امت محمدیہ کا معاملہ ایسا نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور آپ کے اکرام کی وجہ سے اس امت کے کفار پر آسمانی عذاب نہیں آئے گا، ان کا عذاب مختصر ومحدود ہے، جو کہ مسلمانوں کی جہاد وتلوار کے ذریعہ سے ہوگا، جس سے عام ہلاکت نہیں ہوگی، صرف بڑے مجرم اور سرکش مارے جائیں گے، اور قیامت کے لئے جو وقت مقرر ہے اس سے پہلے عمومی تباہی نہیں آئے گی، جزوی طور پر مختلف نوعیت کے عذاب ضرور آتے رہیں گے۔ واللہ اعلم

﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ﴾ (اس دن جھٹلانے والوں کے لئے تباہی وبربادی ہے)۔

اس کے بعد وقوعِ قیامت کے لئے بطورِ دلیل انسانوں کی پیدائش کے مختلف مدارج کا بیان ہے۔

﴿اَلَمۡ نَخۡلُقۡكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ﴾ (کیا ہم نے تم کو ایک ناپاک اور حقیر قطرۂ آب سے پیدا نہیں کیا؟)

﴿فَجَعَلۡنٰهُ فِيۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ﴾ (رحمِ مادر بچہ دانی میں اسے محفوظ رکھا) اور اس کی ہر طرف سے نگہداشت کا سامان مقرر کیا۔ ﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ﴾ (ایک مقررہ مدّت تک) یہ مقررہ مدت چھ ماہ سے دو سال تک یا نو ماہ، جو بھی ہو وہ مدّت اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے علم میں ہے، عام طور پر انسانی بچوں کی پیدائش کی مدّت نو ماہ ہے، إلا ماشاء اللہ۔

﴿فَقَدَرۡنَا فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ﴾ (پس ہم اندازہ کرتے ہیں اور ہم خوب اندازہ کرنے والے ہیں) کہ کس کو کیسا بنانا ہے؟ کیا بنانا ہے؟ اور ایک حقیر قطرے کو صورت گری کے ذریعہ کہاں تک پہنچانا ہے؟ شکل وصورت، ذکورت وانوثت، سعید وشقی، شاکر وناشکر، علم وہنر، عمر وزندگی، غنا وفقیری، یہ سارے مراحل ہماری نگرانی میں طے ہوجاتے ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ ان امور میں مداخلت کرے۔

جب حقیر نطفہ ہماری نگرانی میں ایک اعلیٰ درجے کا انسان بن سکتا ہے تو موت کے بعد اس کو دوبارہ اسی شکل وصورت میں زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ ان حقائق کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود اگر ناشکرا انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت وخالقیت اور قیامت کا اقرار نہیں کرتا، تو ﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ﴾ (اس دن جھٹلانے والوں کے لئے تباہی وبربادی ہوگی)۔

﴿اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا﴾ (اے انسان! ذرا زمین کو دیکھو! اور غور کرو کہ یہ کیا ہے؟ اور کس

منفعت کے لئے ہے؟ اور کس کے لئے ہے؟ کیا ہم نے نہیں بنائی زمین کو سمیٹنے اور جمع کرنے والی زندوں اور مردوں کے لئے) جو زندوں کو اپنے اوپر اور مردوں کو اپنے اندر سمیٹ کر ان کی حفاظت ونگہداشت پر مامور ہے۔ زمین کے اوپر کا حصہ بے شمار فوائد ومنافع کا گہوارا ہے، یہ جنگلات، بوٹیاں، حیوانات، سڑکیں، باغات، قصور وبنگلے، شہری رونقیں، غرض یہ کہ تمہارے لاکھوں منافع و بے شمار فوائد اسی کی بدولت میسر ہیں، اور اسی کی مٹی سے تمہاری تخلیق وابستہ ہے، اور مرنے کے بعد عزت وحرمت کے ساتھ اس کا پیٹ تمہارے مردوں کا گھر اور رہائش گاہ ہے۔

فرمایا: ﴿ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَ فِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ﴾ [طٰہٰ:٥٥] (اسی (زمین) سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے، اور اسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے)۔ بلکہ صرف یہ نہیں، زمین کے اندر کے خزائن معدنیات، پانی، تیل، کوئلہ، لوہا، ڈیزل، پٹرول، قدرتی گیس اور دیگر بے شمار اشیاء اور منافع اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا فرمائے ہیں، اور پھر اسی زمین پر:

﴿وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ﴾ (ہم نے زمین پر بڑے بڑے اونچے اور بلند وبالا پہاڑوں کا سلسلہ) تمہاری خاطر پیدا کیا ہے۔ یہ پہاڑ قدرتی وسائل اور ہزاروں قسم کے معدنیات، دھات، لکڑی، جڑی بوٹیوں اور دیگر مخفی خزانوں سے بھرے ہوئے ہیں، اور ان کی بلند وبالا چوٹیوں پر برف کا ذخیرہ جمع ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آہستہ آہستہ پگھل کر نیچے زمین کی طرف بڑے بڑے چشمے جاری ہوجاتے ہیں، جس سے تمام سال روئے زمین پر بے شمار میٹھے پانی کے دریا بہتے رہتے ہیں، جن سے ہزاروں قسم کی خوراک، غذائی اشیاء اور طرح طرح کے میوے اور پھل پیدا ہوتے ہیں، اور اربوں ایکڑ زمین پر فصل وکاشت کاری کا نظام جلوہ گر رہتا ہے، اور یہ پانی میٹھا اور خوشگوار تمہارے پینے کی ضرورت کو بھی پورا کرتا ہے۔

﴿وَاَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا﴾ (اور ہم نے تم کو پیاس بجھانے والا میٹھا پانی پلایا)۔ یہ پانی کی نعمت کتنی اہم ہے؟ تمام مخلوقات کی زندگی اور خوشحالی اسی پانی کے ساتھ قائم وباقی ہے، پورے جہاں کی سرسبزی اسی پانی کی مرہونِ منت ہے۔ کاش لوگ اس ایک عظیم نعمت کی اہمیت وافادیت کا بغور مطالعہ کر کے خالق عزّ شانہ کی وحدانیت کا اقرار کرتے، اور آخرت کے عذاب سے نجات پاتے۔

﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ﴾ (اس دن جھٹلانے والوں کے لئے تباہی وبربادی ہے)۔ یہ میٹھے پانی کے منبع ومراکز یہی پہاڑ ہیں، دریا ہو یا عام چشمہ پانی کا ہو، سب انہی پہاڑوں سے نکل کر پورے جہاں کو سیراب

کرتے ہیں، یہ پہاڑوں کا سلسلہ کتنا دلکش ہے، اوران کا منظر روح پرور اور عقل و دماغ پر عجیب وغریب اثر انداز ہے، ان کی پستی و بلندی اور پھران کی پیدائش، ساخت رنگ برنگ حیرت انگیزیاں، کہیں سیاہ براق، کہیں سفید، کہیں پیلا، کہیں سرخ، کہیں نیلا رنگ، کہیں سبز، کہیں مرکب کہیں، سخت اور کہیں نرم اتنے گہرے اور عجائبات سے بھرے ہوئے ہیں کہ بے ساختہ اقرار کرنا پڑتا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾[آل عمران:۱۹۱] (اے پروردگار! تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا)۔

انْطَلِقُوا إِلَى مَا كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝٢٩ انْطَلِقُوا إِلَى ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ۝٣٠ لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ۝٣١ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝٣٢ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ۝٣٣ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝٣٤ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ ۝٣٥ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۝٣٦ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝٣٧ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ۝٣٨ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُونِ ۝٣٩ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝٤٠

ترجمہ: چلو اس کی چیز کی طرف جس کو تم جھٹلاتے تھے ۝۲۹ چلو تین شاخوں والے سایے کی طرف ۝۳۰ نہ گھنی چھاؤں والا ہوگا اور نہ تپش سے بچائے گا ۝۳۱ بیشک وہ محل جتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں پھینکے گا ۝۳۲ گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں ۝۳۳ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے ۝۳۴ یہ وہ دن ہے جس دن لوگ بولیں گے نہیں ۝۳۵ اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ کوئی عذر پیش کرسکیں ۝۳۶ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے ۝۳۷ یہ فیصلے کا دن ہے، ہم نے اکٹھا کیا ہے تمہیں اور تم سے پہلوں کو بھی ۝۳۸ پھر اگر تمہارے پاس کوئی داؤ پیچ ہے تو اسے مجھ پر آزمالو ۝۳۹ اس دن تباہی و بربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے ۝۴۰

معارف ومنازل

قیامت کے روز ان جھٹلانے والوں سے کہا جائے گا: چلو اپنے جھٹلانے کا انجام ذرا دیکھ لو! یہ تین شاخوں والے سایے کی طرف چلو! تم سامنے ذرا دیکھو! جو چیز تمہیں سائبان معلوم ہو رہا ہے اس کی طرف چلو! وہ ایک تباہ کن دھواں ہے، اس کی تین شاخین ہیں، شاید اس لئے کہ تم توحید، رسالت اور قیامت کا مسلسل انکار کرتے رہے، یا اس

لئے کہ تم نے انسانی قوتوں کو انکار حق کے لئے استعمال کیا، یا اس لئے کہ منکرین کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا: اول کفار ہوں گے۔ دوم منافقین ہوں گے۔ سوم اہل بدعت وضلالت ہوں گے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ میدانِ محشر میں دوزخ سے ایک گردن نمودار ہوگی، جو دوسو سال کی مسافت سے ہر اس شخص کو پکڑ کر اٹھالے گی، جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا تھا، غرور اور تکبر میں مبتلا تھا، یا جو ظلم وزیادتی کا مرتکب ہوتا تھا۔ [درمنثور، تفسیر عزیزی] یہ گردن بعینہٖ آج کل کے کرینوں کی طرح ہوگی، جو مجرموں کو چن چن کر اٹھالے گی اور جہنم کے اندر ڈال دے گی۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دھواں تین حصوں میں منقسم ہوگا، اور منکروں کو تین طرف سے گھیر لے گا: ایک ٹکڑا ان کے سروں پر، دو ٹکڑے ان کے دائیں بائیں پر ہوں گے، اور یہ منکرین اس دھویں کے سائباں میں رہیں گے، وہ دھواں بس نام کا سایہ ہوگا ﴿لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ﴾ اندرونی حرارت وتپش اور بیرونی تمازت سے بھٹی بنا ہوا ہوگا۔ نعوذ باللہ من عذاب جھنم

﴿إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ﴾ (وہ محل جتنی بڑی بڑی چھنگاریاں پھینکے گا)۔ ﴿كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ﴾ (جیسے زرد رنگ کے بڑے نر اونٹ ہوتے ہیں)، زرد مٹیالے اونٹوں کے ساتھ تشبیہ عرب کے ذوق کے عین مطابق ہے۔ ﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ (خرابی وبربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے) میدانِ محشر ایک جیسا نہیں ہوگا، وہاں طرح طرح کے حالات ہوں گے، مختلف ادوار رونما ہوں گے، بعض اوقات ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکیں گے، کبھی بولنے پر انہیں قدرت نہیں ہوگی، کبھی بولیں گے، عذر ومعذرت کریں گے، کبھی انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا انکار کریں گے، کبھی اپنے شرک وکفر کو چھپانے کی بھی سعی کریں گے، کبھی ایسے لوگوں کو برا بھلا کہنا شروع کریں گے جو ان کی گمراہی کا سبب بنے تھے، کبھی اور قسم کے حالات پیش آئیں گے، جو وہاں کی فضاء وحالات کے ساتھ مناسب ہوں گے۔

﴿هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ﴾ (یہ وہ دن ہے جس دن لوگ بولیں گے نہیں) اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان پر ہر طرح کا اتمامِ حجت ہوگا، اور وہ اپنے جرائم کو سامنے دیکھ کر شرمندگی کے عالم میں بول نہیں سکیں گے، بولنے کی جرأت انہیں کہاں! جب ہر جرم سامنے واضح ہو، اپنے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں اور ان پر حجت قائم کریں۔

﴿وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ﴾ (اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ کوئی عذر پیش کرسکیں) ان کے جرائم اس طرح قطعی نا قابل انکار حد تک ثابت ہوجائیں گے کہ انہیں انکار اور عذر و معذرت کی گنجائش باقی نہیں رہے گی، ان کی نگاہیں شرمندگی کی وجہ سے پست ہوں گی، اور وہ اس پر دیکھنے کی ہمت و جرأت نہیں کرسکیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ [ابراهيم:٤٣] (اور لوگ) سر اٹھائے ہوئے (میدانِ قیامت کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ نہ سکیں گی اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے)۔

﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے)۔

﴿هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ﴾ (یہ فیصلے کا دن ہے ہم نے اکٹھا کیا ہے تمہیں اور تم سے پہلوں کو بھی) ابتداء آفرینش دنیا سے لے کر قیامِ قیامت تک، اگلی، پچھلی تمام مخلوقات بشمولِ یاجوج و ماجوج سب کو جمع کر کے ان کے تمام خیر و شر اعمال کی نشاندہی کے ساتھ فیصلہ کے دن اور فیصلہ کے مقام پر حاضر کر کے آج انہیں آخری فیصلہ سنایا جائے گا، ذرہ برابر بے انصافی نہیں ہوگی، اور اعمال کا پورا پورا دفتر سامنے ہوگا، رائی کے حبہ برابر کوئی چھپ نہیں سکے گا۔ ﴿وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ [الأنبياء:٤٧] (اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو لا حاضر کریں گے، اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں)۔

دنیا کی عدالتوں میں ہر طرح کی تدابیر عمل میں لا کر لوگ اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکتے تھے، طرح طرح کے حیلے بہانے سے جان چھڑا کر سکتے تھے، مگر یہاں وہی کچھ ہوگا جو دفتر اعمال میں انصاف کے ساتھ لکھا ہوا ہوگا۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ﴾ (اگر کوئی حیلہ تدبیر مکر اور چالبازی کر سکتے ہو، تو آزماؤ) ہماری گرفت سے نکلنے کی تمام ناکام تدابیر کر کے دکھاؤ، یہ محض زجر و توبیخ ہے، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی سے کچھ نہیں بن پڑے گا، سوائے محرومی اور ذلت کے۔ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے)۔ مکذّبین منکرین کے بیان مکمل ہونے کے بعد موحدین، متقین، اصحاب الجنۃ والنعیم کا مختصر بیان فرما کر آخر میں دوبارہ **أصحاب النار و أصحاب الجحیم** کا تذکرہ فرما کر تنبیہ فرمائی، ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٤١﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٤٢﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ

تَعۡمَلُوۡنَ۝۴۳ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ۝۴۴ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ۝۴۵ كُلُوۡا وَتَمَتَّعُوۡا قَلِيۡلًا
اِنَّكُمۡ مُّجۡرِمُوۡنَ۝۴۶ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ۝۴۷ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ ارۡكَعُوۡا لَا يَرۡكَعُوۡنَ۝۴۸ وَيۡلٌ
يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ۝۴۹ فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ۝۵۰

ترجمہ: بیشک متقی لوگ سایوں اور چشموں مین ہوں گے ۝۴۱ اور پھلوں میں ہوں گے جو وہ چاہیں گے ۝۴۲ کھاؤ
اور پیو خوشگوار، اس کے بدلے جو تم (عمل) کیا کرتے تھے ۝۴۳ بیشک ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ۝۴۴ اس دن
تباہی وبربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ۝۴۵ کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ تھوڑے دنوں تک، بیشک تم مجرم ہو ۝۴۶ اس دن تباہی
وبربادی ہے جھٹلانے والوں کے لئے ۝۴۷ اور جب انہیں کہا جاتا ہے: رکوع کرو، تو یہ لوگ رکوع نہیں کرتے ۝۴۸ اس دن
تباہی وبربادی ہے جھٹلانے والوں کے لیے ۝۴۹ پھر یہ مکذبین اس کلام کے بعد کونسی بات پر ایمان لائیں گے؟ ۝۵۰

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے متقین کے انعامات کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ ترہیب کے ساتھ ترغیب کا پہلو ہر موقع پر بیان ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ﴾ (بیشک متقین یعنی بچنے والے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر میں ''متقی'' وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر، شرک، تکذیب ونفاق، معاصی وغیرہ سے اجتناب کیا، ایسے لوگ قیامت کے دن ﴿فِىۡ ظِلٰلٍ وَّعُيُوۡنٍ﴾ (سایوں میں اور نہرں اور چشموں میں ہوں گے) یہ وہ چشمے ہیں جن کا ماقبل ''سورۃ الدہر'' میں تفصیلی بیان گزر گیا۔

﴿وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشۡتَهُوۡنَ﴾ (اور ہر قسم پھلوں میں ہوں گے جس قسم کے وہ چاہیں گے) انہیں محض اشتہاء کے ساتھ حسب خواہش مہیا ہو جائیں گے، اور یہ عرش عظیم کے سایہ میں راحت وآرام سے رہیں گے، حتی کہ یہ سایہ پل صراط پر گزرتے وقت بھی انہیں حاصل رہے گا۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ دنیا میں کیا ہوا صدقہ، غرباء ومساکین پر خرچ کیا ہوا مال، قیامت کے روز ایسے لوگوں کے لئے سایہ بن جائے گا، یہ سایہ محشر میں پل صراط پر اور دوسرے تمام سخت اور کٹھن مقامات پر مؤمنوں کو برابر حاصل رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ راحت وخوشی کا جو بھی سامان ہوگا حسب خواہش فراوانی کے ساتھ مؤمنین کے لئے دستیاب ہوگا، سورۃ الدہر میں تفصیل گزر چکی۔

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا﴾ ان سے کہا جائے گا کہ: (خوب کھاؤ! پیو! خوشگوار) یعنی نہ بدہضمی، نہ تخمہ، نہ بے رغبتی اور نہ بے ذوقی ہوگی۔ ﴿بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (اس کے بدلے جو تم نے ایمان کے ساتھ دنیا میں شوق و رغبت کے ساتھ نیک اعمال انجام دیئے)۔

﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (ہم نیکوکاروں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیتے ہیں) اچھے اعمال کا اچھا بدلہ ہوگا، البتہ! مکذبین اور برے لوگوں کا بدلہ برا ہی ہوگا۔ ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (تباہی و بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے)۔ ﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ﴾ (کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ تھوڑے دنوں تک بیشک تم مجرم ہو) مجرمین سے کہا جاتا ہے کہ آج ہی یعنی دنیا میں چند دن کے لئے کھاؤ! پیو! عیش وعشرت کے ساتھ مزے اڑاؤ، انجام تمہارا نہایت تلخ اور تباہ کن ہوگا، تمہاری جنت یہی دنیا کی زندگی ہوگی، آئندہ تمہیں کوئی سکون و آرام نصیب نہیں ہوگا، کیونکہ تم مجرم ہو۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا﴾ [الحجر: ٣] (ان کو اُن کے حال پر رہنے دو کہ کھالیں اور فائدے اُٹھالیں)۔ پھر فرمایا: ﴿قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ﴾ [الزمر: ٨] (آپ کہہ دیں کہ: اپنے کفر سے تھوڑا فائدہ اٹھالو، بیشک تو آگ والوں میں سے ہو)۔

﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (ہلاکت و بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے)۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ﴾ (جب انہیں کہا جاتا ہے: رکوع کرو، تو یہ لوگ رکوع نہیں کرتے) عجز وانکساری مراد ہے، یعنی تکبر وغرور چھوڑ دو، ایمان لاؤ، طہارت حاصل کرو، نماز پڑھو، رکوع وسجدہ کرو، ربّ العزّت کے حضور جھک کر پوری اطاعت کے ساتھ عبادات بجالاؤ، مگر وہ ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے اور تکذیب وانکار پر جمے رہے۔

﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (ہلاکت و بربادی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے)۔

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ (اے جھٹلانے والو! اگر اس آخری کتاب پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر اور کونسی کتاب آئے گی جس پر تم ایمان لاؤ گے؟)۔ یہ کتاب قرآن حکیم آخری کتاب ہدایت ہے، اس کتاب کا لانے والا نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم آخر الرسل خاتم الانبیاء ہیں، اور آپ کی امت آخری امت ہے، آج کے بعد قیامِ قیامت تک یہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت درخشندہ وتابندہ دنیا میں رہے گی، اور نفخِ صور تک یہی کتاب نور وہدایت کا سرچشمہ رہے گی، اس کے بعد نہ کسی نبی کی تشریف آوری ہوگی، نہ کسی کتاب کی، اگر کسی کو ایمان

لانا ہے تو اسی نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لائے ، اگر کوئی اس پر ایمان نہیں لائے گا تو قیامِ قیامت تک اس کا شمار کفار ومشرکین میں ہوگا ، کیونکہ اس کتاب کے علاوہ کوئی ایسی کتاب روئے زمین پر نہیں ہوگی کہ جس پر ایمان لانے سے نجات ممکن ہو۔

فائدہ:

اس سورت میں ﴿وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ﴾ دس مرتبہ مذکور ہے، اور یہاں بنیادی طور پر جن چیزوں کی مشرکین نے تکذیب کی ہے وہ بھی دس بنیادی امور ہیں، پس ہر ایک ویل کا تعلق اس سے پہلے متصل والے ایک کے ساتھ ہو کر تکرار نہیں ہوگا، وہ یہ ہیں:

(۱) قدرت کے مختلف کمالات	(۶) مجرمین کی زبان بندی
(۲) اقوام سابقہ کی ہلاکت اور یوم الفصل	(۷) اجتماع اولین وآخرین
(۳) انسانی تخلیقی مراحل	(۸) متقین کے انعامات کا بیان
(۴) زمین وجبال کی پیدائش	(۹) امہال المجرمین فی الدنیا
(۵) جہنم کے عذاب اور نوعیت	(۱۰) مجرمین کا اعمال سے انکار وعدم ایمان۔

حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تفسیر عزیزی میں ارشاد فرماتے ہیں کہ رکوع کا مطلب اللہ تعالیٰ کی امانت کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے پشت کو جھکا دینا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو مستقیم القامت بنایا ہے، یہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے، جانور بے چارے ہر وقت رکوع کی حالت میں ہیں، ان کی تخلیق اسی عجز وانکساری اور اطاعت کے لئے ہے، مگر انسان کو اپنے قیام اور سیدھے کھڑے ہونے پر مغرور نہیں ہونا چاہئے ، بلکہ رکوع کر کے دیگر حیوانات کی طرح اپنی پشت کو جھکا دینا چاہئے ، اور بندگی واطاعت کا ثبوت پیش کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کی پشت پر جو بھی بوجھ ڈالنا پسند کرے، اس کے اٹھانے کے لئے ایسا تیار ہوں جیسے کہ جانور تیار ہیں۔

یہ رکوع وسجدہ بطور انقیاد وعبادت یا تعظیم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں، کسی غیر اللہ کے لئے بالکل حرام اور شرک ہے، قرآن حکیم میں فرمان الٰہی ہے: ﴿فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَاعۡبُدُوۡا﴾ [النجم: ۶۲] (تو خدا کے آگے سجدہ کرو اور (اسی کی) عبادت کرو)۔

☆☆☆

نماز میں رکوع ایک، اور سجدے دو کیوں؟

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نماز میں رکوع ایک اور سجدہ دو ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ سجدہ میں انتہائی تعظیم ہے، اسی وجہ سے اس کو مکرر لایا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ پہلے سجدہ میں امتثال امر ہے، دوسرے میں اداءِ شکر ہے۔ بعضوں نے کہا کہ پہلے سجدہ میں اپنی جان کو پیش کرنا ہے، دوسرے میں آل واولاد مال ومنال کی قربانی کی پیشکش ہے۔ یا یہ مطلب ہوگا کہ بارگاہِ الٰہی میں شیطان مردود نے سجدہ سے انکاری ہوا، تو ہم فرط وعقیدت اور امتثال حکم کے علیٰ وجہ الاتم ادائےگی میں دو سجدے کرنے پر رضامند ہوئے، جیسے حاجی حج کے موقع پر **لبیک اللھم لبیک** (اے پروردگار! میں آپ کے حضور بار بار حاضری کا اعلان کرتا ہوں)، اس کو اس بار بار حاضری پر خوشی ہوتی ہے، اسی طرح نماز میں بھی بار بار سجدہ کرنے پر اظہار عقیدت اور شوق ومحبت کا اظہار ہے، جس سے لطف وسرور حاصل ہونے میں بڑا اعزاز ہے۔

بعض اولیاء کرام سے منقول ہے کہ اگر ہمیں جنت مل گئی اور ربّ العزّت فرمائیں گے: مزید مانگو! کیا مانگنا ہے؟ تو میں یہی درخواست کروں گا کہ جنت میں نماز، رکوع اور سجدہ کی منظوری ہو، تاکہ جنت میں بھی ہم لطف اندوز ہوں۔

احادیث وآثار کی روشنی میں نماز کے چند فوائد:

(۱) نماز دین کا ستون ہے۔ (۲) نماز افضل جہاد ہے۔ (۳) نماز مؤمن کی معراج ہے۔ (۴) نمازی شخص عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے۔ (۵) نماز سے قبر روشن اور کشادہ ہوجاتی ہے۔ (۶) قرب الٰہی کا سب سے بڑا سبب نماز ہے۔ (۷) نماز آدمی کو گناہوں سے بچاتی ہے۔ (۸) نمازی کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ (۹) نماز سے رزق روزی میں برکت آجاتی ہے۔ (۱۰) نماز سے خاتمہ بالخیر اور جنت کا پروانہ ملتا ہے۔ (۱۱) نمازی کے لیے فرشتے دعا کرتے ہیں۔ (۱۲) نماز سے مصائب اور آفات بند ہوجاتے ہیں۔ (۱۳) نماز سے جسمانی اور روحانی بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ (۱۴) نمازی کی دعا قبول ہوجاتی ہے۔ (۱۵) نمازی کا چہرہ دنیا اور آخرت دونوں میں نورانی سفید رہے گا۔ (۱۶) جو شخص باجماعت نمازوں پر پابندی کرے اس کے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ (۱۷) نمازی شخص شیطان کے گرفت سے بچ جاتا ہے۔ (۱۸) نمازی آدمی پل صراط سے بجلی کی طرح گزر جائے گا۔ (۱۹) ہر قسم

پریشانیوں کو دور کرنے کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ (۲۰) زندگی بھر پابندی سے نماز پڑھنے والا جہنم سے آزاد ہوگا۔ (۲۱) نمازی کا عمل نامہ دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ (۲۲) نمازی بری موت سے محفوظ رہے گا۔ (۲۳) نمازی کا حساب آسان رہے گا۔ (۲۴) نمازی کے لیے قرآن کریم زوردار شفاعت کرے گا۔ اس کے علاوہ نمازی کیلئے بہت سے دیگر مناقب وفضائل حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں۔

